

مُفْرَدَاتُ الْقُرْآنِ (اَوَّلُ)

تصنيف
إمامنا العلامة الغياثية

ترجمہ و تشریح
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سعید صاحب دہلوی مدظلہ العالی

جلد اول

اسلامی اکادمی

۱۰۲، ۷۶۰۴۵۸۵، ۱۰۲، ۷۶۰۴۵۸۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

← عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

← مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

← دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

← کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

← ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

← نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

اللَّهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ

www.KitaboSunnat.com

مفردات قرآن (اردو)

www.KitaboSunnat.com

جلداول

تصنيف
امام راہ اصفہانی

ترجمہ و حواشی
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدالمعز فریادپوری

شیخ شمس الحق

۴۷۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

اس کتاب کے جملہ حقوق نقل و اشاعت محفوظ ہیں

نام کتاب:

مفردات القرآن

مصنف:

امام راہِ اصفہانی

ترجمہ و حواشی:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد العزیز پوری

نظر ثانی:

مولانا عبدالصمد ریالوی

اہتمام: محمد رمضان محمدی، محمد سلیم جلالی

تعداد: 1000

ناشر: شیخ شمس الحق

مطبع: عرفان افضل پریس

ٹلے کا پتہ:

اسلامی اکیڈمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور

Phone: 042-7357587

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرف آغاز

قُرْأْنَا عَرَبِيًّا:

قرآن پاک نوع انسانی کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے انسانی عقل و فکر کے لیے ہر دور میں رہنما بن سکتا ہے اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیری کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اس زبان میں نازل کیا جاتا جو اس وسعت کی تحمل ہو سکے اور اس کے اعجاز بیان کو اپنے اندر سمو سکے۔

یہ ادعا نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ یہ وسعت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے فصاحت و بلاغت کے جو زاویے اس زبان میں پنہاں ہیں دوسری سامی اور ایرانی زبانوں کا دامن ان سے یکسر تہی ہے اہتقاقات اور مترادفات کی جو فراوانی عربی زبان میں پائی جاتی ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں۔ محسناً بدلیعہ کے خدوخال اور آثار جو اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ دوسری زبانیں ان سے عاری نظر آتی ہیں الغرض عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو ہر قسم کی لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور دوسری زبانوں پر فائق نظر آتی ہے۔

اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ضخیم قوامیں و معاجم لکھے گئے ہیں دوسری زبانوں میں ان کا عشر عشر بھی نہیں ملتا ان معاجم کے ملاحظہ سے عربی زبان کی فراخ و امانی اور جامعیت، بخوبی سمجھ آ سکتی ہے۔ صحاح جوہری ^① کو لےجئے کہ وہ چالیس ہزار مواد (Roots) پر مشتمل ہے۔ قاموس فیروز آبادی ^② میں ساٹھ ہزار مواد مذکور ہیں، لسان العرب میں ابن منظور افریقی ^③ نے اسی ہزار مواد سے بحث کی ہے ان کے بعد تاج العروس شرح قاموس ملاحظہ فرمائیے، جس میں سید مرتضیٰ زبیدی نے اپنے تہج سے ایک لاکھ بیس ہزار مواد جمع کر ڈالے ہیں۔ ^④

ان تصریحات کے پیش نظر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآن پاک ایسی جامع کتاب کو، جو ابدی حقائق پر مشتمل ہے، عربی زبان میں ہی نازل ہونا چاہیے تھا اور یہی زبان ایسی تھی جو لسان وحی کی ترجمان بن سکتی تھی۔ ^⑤

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے اجمال و تفصیل سے کما حقہ آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کے مفہوم و معنی کی تہ تک پہنچ جاتے تھے جیسا کہ ابن خلدون اور ان کے بالبع بعض دوسرے مؤلفین نے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ ایسی بات کہنا کسی قوم یا معاشرے کے احوال طبعی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے موجودہ دور ہی کو لےجئے کہ کسی زبان میں جو علمی کتابیں تالیف کی جا رہی ہیں کیا اس زبان کے جاننے اور بولنے والے محض اہل زبان ہونے کی بنا پر ان کتابوں کو سمجھ رہے ہیں جب یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے معرفت لسانی کے علاوہ خاص درجہ کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ تو ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانہ میں جو عام اہل عرب یا صحابہ کرام موجود تھے محض عربی ہونے کی بنا پر خود ہی قرآن سمجھ لیتے تھے اور انھیں کسی معلم یا رہنما کی

① اسماعیل بن حماد الجوهری المتوفی سنہ ۳۳۲ھ یا ۳۹۳ھ۔

② القاموس المحیط والقبوس الوسیط فیما ذہب من کلام العرب شامطیط لمحد الدین ابی طاهر محمد بن یعقوب بن محمد الشیرازی

الغیروز آبادی (۷۲۹ھ - ۸۱۶)

③ ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری (۶۳۰ھ - ۷۱۱)

④ محمد بن محمد بن عبدالرزاق الحسینی الزبیدی الملقب بمرتضیٰ (۱۱۴۵ھ - ۱۲۰۵ھ)

⑤ راجع شرح دیباچہ القاموس للعلامہ نصر الہوری، ص ۲۷۔

طرف مراجعت کی ضرورت نہ تھی۔

مزید برآں! ہم صحابہ میں سے اہل علم حضرات کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن پاک کے بعض الفاظ کے معنی کے ادراک سے بجز کا اظہار فرمایا ہے۔ علامہ سیوطی الاقان میں لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ: ﴿وَفَاكِهَةٌ وَآبَاءُ﴾ میں ”آبَا“ کے معنی سمجھنے سے بجز کا اعتراف کیا ہے۔^①
 نیز منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر آیت کریمہ أَوْ يَأْخُذْهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ تِلَاوَاتٍ فرمائی اور حاضرین سے تخوف کے معنی دریافت فرمائے۔ اس پر بنی ہذیل سے ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا ”اس آیت میں ”تخوف“ بمعنی ”تحقق“ ہے اور اس پر یہ شاہد پیش کیا۔^②

تَخَوُّفِ الرَّجُلِ مِنْهَا تَامِكًا قَرْدًا كَمَا تَخَوُّفِ عَوْدِ السَّبْعَةِ السَّفِينِ
 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ہیں مگر مجاہد رضی اللہ عنہ راوی کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿فَاطِرَ السَّمَوَاتِ﴾ کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ دو اعرابی ایک کنویں کے متعلق نزاع میرے پاس لائے ان میں سے ایک نے اپنے حق ملکیت کے ثبوت میں کہا: ﴿أَنَا فَطَرْتُهَا﴾ کہ اس کنویں کو پہلی مرتبہ میں نے کھودا ہے۔ یہ کلمہ سن کر میری مشکل حل ہو گئی اور فاطر السموات کا صحیح مفہوم میں نے سمجھ لیا۔

صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عدی بن حاتم کا قصہ مشہور ہے جو دلچسپ بھی ہے یعنی کہ جب آیت کریمہ ﴿حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرہ: ۱۸۷) نازل ہوئی تو عدی کا بیان ہے کہ میں نے سیاہ اور سفید دو عقال اپنے نیکے کے نیچے رکھ لیے کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گے تو کھانا پینا بند کر دوں گا، آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا:

((إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقَفَا إِنْ مَا هِيَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَبِيَاضِ النَّهَارِ))

کہ..... اس سے مراد تو صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی ہے۔^③

مندرجہ بالا سطور سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام کو بعض مفرد اور مرکب کلمات کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی اور وہ آنحضرت ﷺ یا اپنے رفقاء میں سے کسی دوسرے سے دریافت کرتے تھے اور قرآن فہمی میں سب یکساں صلاحیتوں کے مالک نہ تھے، ابن قتیبہ لکھتے ہیں:

عرب قرآن فہمی میں مساوی درجہ پر نہ تھے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے غریب اور تشابہات کا ادراک کر لیتا ہو بلکہ وہ مختلف مدارج کے حامل تھے۔

اسی طرح سروق کا بیان ہے:

میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجالس میں بیٹھتا رہا اور ان سے استفید بھی ہوتا رہا، میں نے دیکھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثال پانی کے جوہر کی ہے بعض جوہر وہ ہیں جو پورے علاقہ کی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں جن سے بعد مشکل ایک دو آدمی سیر ہو سکتے ہیں۔

① الجامع الفيض الخیر علی نهج التيسير، ص ۳۲-۳۳ بحث ترجمہ قرآن۔

② ملاحظہ ہو: مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۸۰۔

③ المسائل والاجوبہ، ص ۸ طبع سعادت مصر ۱۳۴۹ھ۔

اس مختصر تمہید سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے ہر مقام کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو آنحضرت ﷺ کی طرف رجوع کی ضرورت تھی اور یہ کہ علم و فضل میں سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مساوی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے بلکہ طبعی اور فطری طور پر ان میں بھی تفاوت درجات موجود تھا اس کے بعد اب ہم ان وسائل و مصادر سے بحث کرتے ہیں جو دور صحابہ میں موجود تھے جن سے بے نیازی دراصل تفسیر بالرائی کا دروازہ کھولتی ہے۔

تبع اور جستجو سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن فہمی کے چار ذرائع تھے جن سے صحابہ و تابعین مستفید ہوتے رہے اور آج بھی ان ذرائع کی وہی حیثیت حاصل ہے جو اس دور میں سمجھی جاتی تھی۔

(۱) قرآن کریم (۲) احادیث نبویہ (۳) اسرائیلیات (۴) آثار صحابہ

(۱) قرآن کریم نے اپنے اسلوب بیان میں اگر ایک مقام پر اجمال سے کام لیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بھی فرمادی ہے اور بعض آیات میں اگر اطلاق یا عموم پایا جاتا ہے تو دوسرے مقامات پر ان کی تقید و تخصیص بھی موجود ہے اس بنا پر علماء کرام نے لکھا ہے کہ بفسحوی "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" لازم ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے پہلے قرآن ہی کا مطالعہ کیا جائے جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک موضوع سے متعلقہ آیات کو یکجا کر کے مجموعی حیثیت سے ان پر غور کیا جائے۔ علمائے تفسیر نے اس طریق تفسیر کو سب سے مقدم اور بہتر قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کے لیے سب سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔^①

اس سلسلے میں اختلاف قراءات کو بھی ایک اہم مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے، صحابہ کرام اور تابعین "بعض آیات کو سمجھنے کے لیے اختلاف قراءات سے بھی استفادہ کرتے تھے، خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی قراءات بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ حضرت مجاہد بیان فرماتے ہیں:

اگر میں حضرت ابن مسعود کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوال ابن عباس سے استفادہ کے بغیر ہی حل ہو جاتے۔^② بلکہ بعض علماء نے تفسیر کے ارتقاء اور اس کے مدارج کے سلسلہ میں اختلاف قراءات کو پہلا ذریعہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہ و تابعین نے اختیار کیا، مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قراءات متواترہ تو نصوص کی حیثیت رکھتی ہیں ہاں قراءات غیر متواترہ کو تفسیر کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

مستشرقین نے اختلاف قراءات کو غلط رنگ دے کر اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے قراءات کے قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا، حالانکہ نصوص قرآن کا ایک ہی شکل پر ہونا ضروری تھا اور یہ کہ ان قراءات کے موجد صحابہ کرام ہیں مگر یہ تعصب کی ہرزہ سرائی ہے۔ اگر یہ لوگ قراءات کی صحت اور اس کی قبولیت کی شرائط پر غور کر لیتے تو کبھی بھی صحابہ کی طرف تساہل کی نسبت نہ کرتے۔

"تفسیر القرآن بالقرآن" کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں ان میں سے ایک تفسیر، امام راغب کی طرف بھی منسوب ہے، جس کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

② المذہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن، ص ۴۴۴

① تفسیر ابن کثیر: ص ۲۰

((وطرزہ انہ اور دجُملاً من الآيات ثم فسرہا تفسیراً مشبعاً))

متاخرین میں سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرز تفسیر کا اعتناء کیا ہے اور نہایت سہولت سے اسے اپنایا ہے حتیٰ کہ علماء نے ان کی تفسیر کو ”تفسیر القرآن بالقرآن“ کا منبع قرار دیا ہے ان کی یہ تفسیر نہایت صحیح اور قابل اعتماد تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ سلف کے مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے اس لیے راقم کو اس تفسیر سے خصوصی شغف ہے اور تفسیری حواشی ”اشرف الفوائد“ میں خاص طور پر اس کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری مرحوم نے بھی ”تفسیر القرآن بکلام الرحمن“ کے نام سے عربی زبان میں نہایت اہم تفسیر تالیف کی ہے جو گو مختصر ہے لیکن قابل قدر ہے جو بقرآن وغیرہ بھی اسی قسم میں داخل ہو سکتی ہیں۔

(۲) تفسیر قرآن کے سلسلہ میں سنت نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ائمہ دین نے سنت کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے قبول کیا ہے آیت کریمہ (نمل، آیت ۴۴) ﴿ وَأَنْزَلْنَا الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ ﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی تبلیغ کے علاوہ اس کی تبیین بھی لازم تھی۔ علماء نے احادیث کو مدون کر کے اس تبیین (تفسیر نبوی) کو محفوظ کر دیا ہے، علمائے بدعت نے اس تفسیر کو رد کر کے گویا ایک طرف تو تفسیر بالرأی کا دروازہ کھول دیا ہے اور دوسری طرف سنت کی حجیت کے انکار کی بھی طرح ڈال دی ہے۔ محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لیے اس کو لازم قرار دیا ہے، چنانچہ امام شافعی ”الرسالہ“ میں لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ نے جو فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے وہ قرآن ہی سے سمجھ کر صادر فرمایا ہے۔^①

امام شافعی رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات درج کی ہیں یہاں پر ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سنت قرآن کی شارح ہے اور قرآن فہمی کے لیے قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع ضروری ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے۔^②

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں ان کی تفسیر و تشریح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے، مثلاً نمازوں کی تعداد، ان کا طریق اداء، احکام نکاح و طلاق اور بیوع وغیرہ معاملات وہ ہیں کہ ان کا بیان سنت ہی سے مل سکتا ہے۔ ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

جہاں تک قرآن میں احکام کا ذکر ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں، لہذا تفسیر قرآن کے لیے سنت کی طرف رجوع ناگزیر

ہے۔^③

ایک اشکال اور اس کا حل:

یہاں پر ایک بہت بڑا اشکال لازم آتا ہے کہ تفسیری روایات اگر مستند اور قابل اعتناء ہوتیں تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسے محدث یہ نہ

فرماتے۔^④

((ثلاثة ليس لها اصل التفسير والملاحم والمغازي))

کہ تین قسم کی کتابیں یا روایات بالکل بے بنیاد ہیں یعنی تفسیر، ملاحم اور مغازی۔ مگر خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول سے

① الرسالہ، رقم ۳۰۳۔ ② مقدمہ تفسیر، ص ۳۔

③ ص ۳۳۔ ④ موضوعات ملاحم علی قاری، ص ۸۵۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے پیش نظر خاص قسم کی روایات یا کتا ہیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

((اما كتب التفسير فمن اشهرها كتابا الكلبى ومقاتل بن سليمان وقد قال احمد فى تفسير

الكلبى من اوله الى اخره كذب))

ورنہ تو امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے تفسیری روایات پر مشتمل ایک صحیفہ کی خود تحسین فرمائی ہے اور اس کے حصول کی ترغیب دی ہے۔^①

ایک اہم بحث:

بعض علمائے تفسیر مرفوع تفسیر کو تو حجت مانتے ہیں بشرطیکہ صحت کے ساتھ ثابت ہو مگر ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی تفسیر نہایت قلیل ہے

اور اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے احتجاج کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:^②

((لم يكن النبى صلى الله عليه وسلم يفسر شيئاً من القرآن الا آيات تعد - علمهن اياه

جبرئيل))

اسی طرح امام سیوطی رضی اللہ عنہ اس موضوع پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں:

((الذى صح من ذلك قليل جداً بل اصل المرفوع منه فى غاية القلة))^③

یعنی حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں

احادیث مناسبہ کو پیش کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر آیات قرآنیہ اور دلائل سے (جو آگے آرہے ہیں) ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے جس

طرح صحابہ کے سامنے پورے قرآن کی تلاوت فرمائی ہے اسی طرح ان کے سامنے قرآن کے مطالب و معانی بھی بیان کیے ہیں اور ایسا کیوں

نہ ہوتا جب کہ سورہ نحل (آیت ۲۴) میں قرآن کی تمہین کو آنحضرت ﷺ کے فرائض سے قرار دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ اور ان کے بالبع

دوسرے علماء کا بھی یہی رجحان ہے۔^④

ابو عبد الرحمن السلمی (عبد اللہ بن حبیب تابعی سنہ ۲۷۷ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ، جو ہمیں

قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے..... کا بیان ہے کہ ”جب ہم آنحضرت ﷺ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک ان کے معنی

مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملی طور پر اپنا نہ لیتے ان سے تجاوز نہ کرتے چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے:

ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی سیکھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے تھے۔ موطا میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:^⑤

((انه اقام على حفظ البقره ثمان سنوآت))

”کہ انہوں نے سورہ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے۔“

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی بلکہ اس کے

مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

① الفوز الدهلوى، ② الفرطى، ج ۱، ص ۳۱، طبرى، ص ۲۱

③ الاتقان، ج ۲، ص ۱۷۹.

④ دیکھئے رسالہ اصول تفسیر لابن تیمیہ.

⑤ ابن کثیر، ص ۳.

اور اس بات کو ہم عادتاً باور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص مثلاً حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر معنی سمجھنے کے پڑھنا آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہو سکتا ہے مگر صحابہ کرامؓ کے متعلق اس قسم کا تصور بھی بعید ہے، خصوصاً جب کہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق بھی حاصل کرنے پر حریص تھے۔

جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں ان کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت سے استدلال نہایت ہی مشکلہ خیز ہے۔ اولاً تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہے جس پر امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے۔ خود امام طبری رحمہ اللہ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

((انه ممن لا يعرف في اهل الآثار))

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرط صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد قرآن کی تفسیر کا وہ حصہ ہے جس کا تعلق مغیبات سے ہے، مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیت الہی کے خلاف تھا، جب کہ آنحضرت ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے جواب میں ”ما المسئول عنها باعلم من السائل“ کے جملہ سے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔ نیز امام طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ❶

تفسیر چار قسم پر ہے ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے اس نوع کی تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی..... تیسری قسم تفسیر کی وہ ہے جسے علماء ہی جان سکتے ہیں (جیسے تشابہات) اور چوتھی قسم وہ ہے جو علم الہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اس کا اور اک نہیں کر سکتا۔

الغرض قرآن کی تفسیر و تشریح بھی آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث و سنن میں محفوظ ہے اسی بنا پر علماء کرام نے قرآن و سنت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو بھی وحی کا حصہ قرار دیا ہے اور امام اوزاعی رحمہ اللہ، حسان بن عطیہ رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں: آنحضرت ﷺ پر قرآن کی وحی نازل ہوتی پھر حضرت جبریل علیہ السلام قرآن کی تفسیر کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے۔ ❷

یہی امام اوزاعی، مכול سے روایت کرتے ہیں:

((القرآن احوج الی السنة من السنة الی القرآن))

کہ قرآن اپنی تشریحات کے لیے جس قدر سنت کا محتاج ہے، سنت کے مطالب کی وضاحت کے لیے قرآن کی ضرورت نہیں ہے، خود آنحضرت ﷺ نے ﴿أَلَا إِنِّي أُنزِلْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ﴾ فرما کر سنت کے اصل مقام کی وضاحت فرمادی ہے کہ سنت میں مزید احکام بھی ہیں جو قرآن میں بطور نص مذکور نہیں ہیں۔ ❸

۳۔ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جاہلی عرب اہل کتاب کے عادات و اطوار اور لغت عرب کے اوضاع و اسرار سے بخوبی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن احوال و ظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے تھے پھر ان کے اذہان بھی صاف ستھرے اور گرد و پیش کی آلائشوں سے منزہ تھے۔ ان جملہ وجوہات کی بنا پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

صحابہ کرام قرآن و احوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن پاک ہم سے زیادہ سمجھتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم، علم صحیح اور عمل صالح

سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ ❹

❶ ص ۲۵ ❷ مراسیل ابی داؤد، قرطبی، ج ۱، ص ۳۷-۳۸. ❸ قرطبی، ص ۳۹. ❹ دیکھئے رسالہ امام شافعی.

اس بنا پر علمائے تفسیر نے قرآن و سنت کے بعد اقوال و آثار صحابہ کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے۔ ان کے اقوال کی بنیاد تین چیزوں پر تھی:

(۱) اسباب نزول کی معرفت۔

(۲) توراہ و انجیل (اسرائیلیات)

(۳) اوضاع لغت کی معرفت۔

اب ہم ان تینوں کی تفسیری حیثیت سے بحث کرتے ہیں، تاکہ ان سے استفادہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی ان پر کلي طور پر اعتماد کر کے قطعیت کا حکم لگایا جائے۔

۱۔ اسباب نزول:

قرآن پاک تدریجاً بحسب الحاج نازل ہوا ہے اس کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداءً موعظت و عبرت یا تشریحی احکام کے لیے نازل ہوا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اترتا ہے۔ علماء نے ان حوادث یا سوالات کو ”اسباب نزول“ سے تعبیر کیا ہے۔^① اسباب نزول کی معرفت سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے، اس لیے علم تفسیر میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور علماء نے علوم تفسیر پر جو کتابیں تالیف کی ہیں ان میں اسباب نزول کے عنوان کو مستقل جگہ دی ہے، بلکہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

((افردہ بالتصنيف جماعة اقدمهم على بن المديني شيخ البخاري رحمه))

”کہ علماء کی ایک جماعت نے اس پر مستقل تالیفات لکھی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تالیف علی بن المدینی رحمہ اللہ کی ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ ہیں۔“^②

فائدہ: امام سیوطی رحمہ اللہ نے بعض دوسری تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسن علی بن احمد سنہ ۴۲۷ھ) کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا گیا ہے مگر ساتھ ہی ”فی اعزاز“ لکھ کر طنز بھی کر دی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۸۵۳ھ) کی اسباب نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”مات عن مسوده فلم تقف عليه كالمأذون“ صاحب کشف نے اس باب میں ابن الجوزی، محمد بن اسعد القرانی اور شیخ ابو جعفر مازندرانی کی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ خود بھی اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

((وَأَلَّفْتُ فِيهِ كِتَابًا حَافِلًا مُوجِزًا مَحْرَرًا لَمْ يُولَفْ مِثْلُهُ فِي هَذَا النُّوعِ سَمِيئَةً)) (لباب النقول في

اسباب النزول.)

بہر حال ”سبب النزول“ کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ”الغزوة الکبیر“ میں اس کی معرفت کو ”مواضع صعبہ“ سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح کرنے کی کوشش کی ہے،^③ لہذا جن علماء نے اس فن کو تاریخی حیثیت دے کر اس کے ”لا طائل“ ہونے کا گمان کیا ہے ان کا یہ موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کذا قال السیوطی فی اتقانہ۔^④

دو گروہ:

بعض علماء نے اس فن کی معرفت کو تفسیر قرآن کا موقوف علیہ قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ واحدی رحمہ اللہ اپنے ”اسباب“ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

((لا يمكن معرفة تفسير الآية دون الوقوف على قصتها وبيان نزولها.))^⑤

① مقدمہ التفسیر، ص ۳۔ ② الاتقان، ج ۱، ص ۲۸۔ ۲۸ ایضاً، کشف الظنون، حاجی خلیفہ، ۳۔

③ حاجی خلیفہ سنہ ۴۶۸ھ۔ ④ ص ۱-۲۵ سلفیہ لاہور۔ ⑤ الاتقان، ص ۲۸، ج ۱۔ ⑥ ص ۳۔

اسی طرح امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے ”باب“ میں اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر پر اقدام کو حرام قرار دیتے ہیں مگر امام ابن دینق ابوالفتح قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس فن کی معرفت کو فی الجملہ معاون تسلیم کیا ہے نہ یہ کہ اس کے بغیر تفسیر ہی ممکن نہیں حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

((معرفة سبب النزول تعین علی فهم الآیة فان العلم بالسبب یورث العلم بالمسبب.))^①

اصل میں صحابہؓ یا تابعین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے جو اسباب نزول بیان فرمائے ہیں وہ دو قسم پر ہیں، اسباب نزول کی ایک قسم تو وہ ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے، مثلاً مغازی یا دوسرے واقعات کہ جب تک تفصیلی واقعات سامنے نہ ہوں متعلقہ آیات میں جو جزئیات مختصر اندک اور صحیح طور پر ذہن نشین نہیں ہوتیں اس قسم کے ”اسباب نزول کے متعلق واقعی کہا جاسکتا ہے کہ ایک مفسر قرآن کو ان کا جاننا لازم ہے جیسا کہ علامہ واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے۔ لیکن دوسری قسم اسباب نزول کی وہ ہے جسے صحابہؓ یا تابعین کسی آیت کے تحت (نزول فی کذا) یا انزل اللہ قولہ (کذا) کے الفاظ سے ذکر کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی مناسبت سے محمولہ آیات کے تحت ذکر کر دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ آیت کے مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں اس واقعہ کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

((وقد ذکر القدماء المفسرون تلك الحادثة بقصد الاحاطة بالآثار المناسبة للآیة او بقصد بیان

ما صدق علیہ العموم و لیس هذا القسم من الضروریات وکان غرضہم تصویر ما صدقت

علیہ الآیة..... الخ.))^②

پہلی قسم کے اسباب نزول میں چونکہ ان کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بنیاد روایت و سماع پر ہوتی تھی اس بنا پر علماء نے بلا اختلاف اس کو حدیث مسند کا درجہ دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((واذا ذکر سبباً نزلت عقبہ فأنہم کلہم یدخلون مثل ہذا فی المسند لان مثل ذالک لا یقال

بالرأی.))^③

اور دوسری قسم یعنی جب کوئی صحابی (نزول فی کذا) کے الفاظ استعمال کرے، میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد اور رائے پر ہے امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اپنے علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

((اذا اخبر الصحابی الذی شہد الوحی والتنزیل عن آیة من القرآن (انہا نزلت فی کذا) فانہ

حدیث مسند و مشی علی ہذا ابن الصلاح وغیرہ۔))

یعنی جب کسی آیت کے متعلق صحابی، جس نے وحی و تنزیل کا مشاہدہ کیا ہو یہ بیان کرے کہ یہ آیت فلاں حادثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ محدثین کے نزدیک مسند حدیث شمار ہوگی۔ حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل و توزیع کے قائل ہیں۔ یعنی اگر ان الفاظ سے سبب النزول مراد ہے تو تمام کے نزدیک حدیث مسند میں داخل ہے کما تر اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے، گو اس کا سبب نزول نہیں ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں مگر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس کو مساند میں شامل نہیں کیا، اکثر علماء حدیث و تفسیر کا میلان امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی طرف ہے۔ چنانچہ علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:^④

① الاتقان للسیوطی ۱/ ۴۸۔ البرہان للزرکشی ۱/ ۲۲.

② الفوز: ۴۴. ③ منہج الفرقان، ص ۳۹.

④ ج ۱، ص ۳۱-۳۲، الاتقان: ۱/ ۳۱.

((قد عرف من عادة الصحابة والتابعين ان احدهم اذا قال نزلت هذه الآية في كذا فانه يريد بذلك انها تتضمن هذا الحكم لا ان هذا كان السبب في نزولها فهو من جنس الاستدلال على الحكم بالآية لا من جنس النقل لما وقع.))

الغرض اسباب نزول کے بیان میں صحابہ کے اقوال میں براجمتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو خود صحابی کو بھی اپنے بیان پر یقین نہ ہوتا اور وہ (احسب هذه الآية نزلت في كذا) کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ لہذا اسباب نزول کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم، صحابہ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ واحدی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((لا يحل القول في اسباب نزول الكتاب الا بالرواية والسماع ممن شاهدوا والتنزيل ووقفوا على الاسباب ويحثوا عن علمها.))

سلف تو اسباب نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک صحت سند کے ساتھ اس کا صحابی سے مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ❷

((اتق الله وقل سدادا ، ذهب الذين يعلمون فيما انزل القرآن.))

لیکن ان کے بعد علماء نے تشدد کو ترک کر کے تساہل سے کام لینا شروع کر دیا، حتیٰ کہ اس سلسلہ میں کذب بیانی کی بھی کچھ پروا نہ کی گئی علامہ واحدی رحمۃ اللہ علیہ اسی قسم کے علماء پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((واما اليوم فكل احد يخترع شيئا ويختلق افكا وكذبا ملقيا زمامه الى الجهالة ، غير منكر في الوعيد للجهل بسبب الآية.))

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شان نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور رطب و یا بس سے تفسیر کو بھر دیا مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا اور امام طبری رحمۃ اللہ علیہ جیسے مؤرخ بھی ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہذا اسباب نزول کی روایات پر نقد و نظر کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی حادثہ کا صحت اسناد سے سبب ہونا ثابت نہ ہو جائے اسے قبول نہ کیا جائے اور پھر آیت کے مفہوم کو سبب نزول کے ساتھ شخص نہ کیا جائے بلکہ آیت کے معنی و مفہوم کو عموم پر رکھا جائے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ❸

”اصح یہ ہے کہ نظم قرآن کو عموم پر محمول کیا جائے اور اسباب خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے..... کیونکہ صحابہ کرام پیش آمدہ وقائع کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہیں گویا ان کے اسباب نزول خاص تھے۔“

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسباب نزول دو قسم پر ہیں۔ بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور پر آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہوتا لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو اسباب نزول کے طور پر علمائے تفسیر نے ذکر کر دیئے ہیں مگر نہ وہ درحقیقت اسباب نزول ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کرنے پر آیت کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی صعوبت پیش آتی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے الفوز میں تصریح کی ہے۔

❷ الاتقان : ۳۱ / ۱

❸ الاتقان : ۳۱ / ۱

❹ الاتقان : ۳۱ / ۱

روایات اہل کتاب یا اسرائیلیات:

قرآن پاک نے بعض مسائل اور واقعات کے بیان میں توراہ سے موافقت کی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نوح اور اسلوب بیان سے گریز کیا ہے اور قصص کی غیر ضروری جزئیات ترک کر کے صرف ان حصوں کو موضوع بحث بنایا ہے جن کا تعلق عبرت و موعظت سے تھا۔

اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اہل کتاب علماء کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایت بھی لی تاہم نقل و روایت میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث ((حدثنوا عن بنی اسرائیل ولا حرج)) کے تحت جواز کی حد تک ان سے استفادہ کیا اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن و حدیث اور اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہوں۔^❶

جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے اہل کتاب سے روایت نقل کی ہے ان میں سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی مرویات سے ہمارے دعویٰ کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔^❷

اسرائیلی روایات اور تابعین:

ابن صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین نے اہل کتاب سے اخذ و روایات میں توسع سے کام لیا چنانچہ تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہاً غالباً یہ تھی کہ اس دور میں یہود و نصاریٰ میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اس دور میں مفسرین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب یافس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنا لیا، ان میں سے مقاتل بن سلیمان (المتوفی ۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس شغف علمی نے خاصی ترقی کر لی اور ہر قسم کے خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ دو ہزار توہین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔

ایک مفسر کا فریضہ:

اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل و روایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رضی اللہ عنہ الفوز میں لکھتے ہیں:

((ان النقل عن بنی اسرائیل وسیلۃ دخلت فی دیننا))

لہذا ایک مفسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے نقل میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور و فکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل و روایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں مدد ہوں اور پھر سنت سے بھی ثابت ہوں۔^❸

ابن صحابہ رضی اللہ عنہم کے خیالات کے بیان میں متقدمین کا اختلاف ہو تو گو ایک شخص مؤلف کی حیثیت سے ان سب کو نقل کر کے ان میں

❶ مقدمہ اصول تفسیر ابن تیمیہ ص ۲۶۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ "عدالت صحابہ"

❸ دیکھیے روح المعانی ج ۱۵ ص ۹۳۔

سے صحیح بات کی نشان دہی کر سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے ایسے موقع پر اسراہیلیات کو کھینچ کر کے قرآن پاک پر تہذیب میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے جیسا کہ قرآن پاک نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف راہنمائی کی ہے۔^① شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت باریک نکتہ ہے جو طالب علم کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے:

((انہنا قد تذكرو فی القرآن قصة فی موضع الاجمال و فی موضع بالتفصیل فیمكن ان یعلم من التفصیل تفسیر الاجمال ویتقل من التفصیل الی الاجمال واللہ اعلم))

خلاصہ بحث:

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسراہیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان کی روایت کو بھی جائز سمجھا ہے تاہم ان میں حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلے میں قبول تو کیا جا سکتا ہے مگر میزان صحت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لغت و محاورات:

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب و سنت اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم سے روشنی نہ پڑتی ہو تو پھر لغت و محاورات عرب کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن نہی کے سلسلہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((الشعر دیوان العرب فاذا تعاجم علینا شیء من القرآن رجعنا الیہ))^②

مگر لغت و محاورات عرب سے قرآن نہی ہر ایک کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے عربی زبان کا خصوصی ذوق اور اہلیت شرط ہے کیونکہ معاجم و قوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ بلا اسناد جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً اشعار و امثال جن کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دیوان العرب قرار دے رہے ہیں علمائے ادبیات جانتے ہیں کہ ان کی نسبت میں اختلاف و اختلاط کا بے حد دخل ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی ایسی روایت ہوگی جس پر اعتماد ہو سکے اور پھر محاورات کے بیان میں بھی ان میں باہم اختلاف ہے اور ان علماء نے تشریحات میں عمومی محاورات کو ملحوظ رکھا ہے خاص طور پر الفاظ قرآن کی تشریحات ان کے پیش نظر نہیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عام محاورہ قرآن کے مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہو اور اگر انہوں نے قرآنی الفاظ کو پیش نظر رکھا بھی ہو تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ لوگ مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطہ نظر کے مطابق محاورات عربیہ کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لہذا لغت و محاورہ عرب سے استفادہ کے لیے چند امور کی رعایت ضروری ہے:

۱۔ لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظ مفردہ کے ان معانی کو سامنے پیش نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت مفہوم ہوتے تھے اور پھر تو ان میں اعراب و بلاغت سے اس کے ترکیبی معنی پر غور کیا جائے اور سیاق و سباق پر بھی نظر ڈالی جائے اور پھر سیاق کلام سے معنی مقصود کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((لان الكلمة الواحدة تجع فی لغة العرب لِمعان شتی))^③

۲۔ لغت و محاورہ عرب سے جو تفسیر بھی کی جائے اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی و سیرت کے بھی مطابق ہے

① الفوز الکبیر ص ۴۵-۴۶۔

② دیکھیے: مقدمہ اصول التفسیر لابن تیمیہ ۲۰۔

③ تفسیر طبری ج ۱۷ ص ۱۲۹ مذاہب التفسیر الاسلامی ۸۹-۹۰ الفوز الکبیر ص ۴۶۔

اور آپ ﷺ کے اقوال و افعال اور تفسیر صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کوئی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ یہ تمام تر غور و فکر اور مسامحہ اس بنا پر بھی ضروری ہیں کہ کتب لغت بہر حال کتب لغت ہیں ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے، وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر صورت قاصر ہیں اور جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے پر تفسیر کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں، اس کا پہلا نمونہ ابو عبیدہ کی مجاز القرآن ہے اور پاک و ہند میں جن لوگوں نے تفسیر باللغۃ کی ہے انہوں نے دراصل لغت کا سہارا لے کر مغربی افکار و نظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس طرح پہلے ایک دور میں قرآن کو اسراہیلیات کے لیے تحتہ مشق بنانے کی کوشش کی گئی تھی، تفسیر القرآن سرسید اور برہان القرآن وغیرہ کی اساس بھی اس قسم کے نظریات پر رکھی گئی ہے اور قرآن جو کتاب ہدایت تھی ان مضحکہ خیز تفاسیر نے اس کی آب و تاب کو سخ کر کے رکھ دیا ہے، اس لیے ہم سمجھتے ہیں مقاصد قرآن کی وضاحت کے لیے سنت نبوی کی طرف رجوع ضروری ہے چنانچہ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”مفردات القرآن کے معانی معلوم کرنے کے لیے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لیے بہر حال وحی الہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارہ کار نہیں۔“

ان تفسیر بیات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موارد استعمال کے تتبع سے کسی حد تک صرف مفردات کے حل میں مدد ملتی ہے ورنہ یہ ایسا ذریعہ نہیں کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفاسیر میں لغت و محاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لیے شواہد تک کو چھان مارا ہے وہ بھی اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوال صحابہ سے بے نیاز نہیں ہو سکے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے، حدیث نبوی اور اقوال صحابہ کا سہارا ضرور لیتے رہے ہیں ”الکشاف“ زمخشری کے مطالعہ سے ہر صاحب علم یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس وقت کے اعتزال اور اس زمانہ کے اعتزال میں نظر پاتی اختلاف پایا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے اسلاف تو اعتزال کے ساتھ صفات علم سے بھی متصف تھے اور معتزلہ کا موجودہ گروہ تالیس و تالیس میں تو شاطر نظر آتا ہے مگر صفات علم سے عاری ہے۔

بعض علماء نے شرح غریب القرآن کا خصوصی اعتناء بھی کیا ہے مفردات راغب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس لیے اب ہم ان کتابوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

غریب القرآن پر جن علماء نے خصوصی توجہ دی ہے ان میں سرفہرست حیر امت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ عطار رحمۃ اللہ علیہ مقدمہ الصحاح للجوہری میں لکھتے ہیں۔

((وكانوا يستعينون بالشعر وكلام العرب لبيان معاني القرآن وكان اول اتجاه للعناية

اللغوية هو رغبة دينية محضة ولهذا نسب الى ابن عباس كتاب غريب القرآن))^①

بروکلمن نے ”تاریخ ادب العرب“ میں اس کے بعض خطی نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔^② اور التفسیر الکبیر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے اس میں علی بن ابی طلحہ اور ابن الکحیمی کی روایت سے غریب القرآن کی تشریحات منقول ہیں اور علی بن لیث کی روایت سے یہ نسخہ ابوصالح کاتب الیث مصری کے پاس محفوظ تھا جسے وہ معاویہ بن ابی صالح کے واسطے سے روایت کرتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تحمیں کی ہے۔^③

ان تفاسیر کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما غریب القرآن کی

① مقدمہ الصحاح ص ۴۲۔

② ج ۱ ص ۲۲۱۔

③ فتح الباری ج ۸ ص ۲۲۲ الاتفاق للسوطی ج ۲ ص ۱۸۸-۱۸۹ منہ نسخہ بمکتبہ ”شیخ الاسلام معارف حکمت بالمینیة المنورة ۱۲۔

تشریح کے سلسلہ میں شعر اور کلام عرب سے استشہاد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے گو بعض دیگر صحابہ سے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرز پر غریب القرآن کی تفسیر جات منقول ہو۔^①

۳۔ غریب القرآن کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد ابان بن تغلب الجریری ۱۳۱ھ کا نام لیا جاتا ہے جو کہ قاری و فقیہ ہونے کے علاوہ نعت میں بھی عظیم پایہ رکھتے تھے اور علی بن علی بن حسین ابو جعفر اور ابو عبد اللہ رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں، استاذ عطار لکھتے ہیں:

((.....سمع من العرب والف غریب القرآن وذكر شواهد من الشعر))^②

اور یہ ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلم رحمہ اللہ اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے یہ گوشتیج میں غالی تھے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفصیل کے قائل تھے، تاہم رافضی نہ تھے اور پھر روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت لی ہے۔^③

ان کے بعد بہت سے علماء نے معانی القرآن، مجاز القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر جمع کیں جن کے نام فہرست ابن الندیم کشف الظنون حاشیہ اور مفتاح السعادة میں مذکور ہیں ان میں حسب ذیل ائمہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء ۲۰۷ھ

۲۔ ابو عبیدہ معمر بن العسلی التمیمی ۲۱۰ھ

۳۔ ابو علی محمد بن المستعیر المعروف بہ قطرب ۲۰۶ھ

۴۔ ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن یحییٰ الیزیدی ۲۶۰ھ

۵۔ ابو محمد عبد اللہ بن مسلم الدینوری المعروف بہ ابن خنیمہ ۲۷۶ھ

۶۔ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن السری الزجاج ۳۱۰ھ

۷۔ امام راضب اصفہانی ۵۰۲ھ

علاوہ ازیں ابو عبیدہ قاسم بن سلام اور ابن ترکمانی نے غریب القرآن کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اور ابو المعالی احمد بن علی البغدادی المعروف بابن سکین (۵۹۶ھ) کی مفردات القرآن کے متعلق امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وهو من احسن الكتب المؤلفة في هذا الشأن))

مسجستانی کی غریب القرآن حروف بحکم کی ترتیب پر ہے اس لیے اس سے اخذ و تناول میں سہولت پائی جاتی ہے حجم کے اعتبار سے تقریباً راعب کی مفردات کے برابر ہے۔^④

ابو عبیدہ کے حالات میں مذکور ہے کہ انہوں نے مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر تالیف کیں،^⑤ ان الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مستقل تین کتابیں تصنیف کی ہیں مگر بعض علماء کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تالیف کے تین نام ہیں، مثلاً زبیدی طبقات اثنوین میں لکھتے ہیں:^⑥

((سألت ابا حاتم عن غریب القرآن لابی عبیدہ الذی یقال له المجاز))

اسی طرح ابن خیر الأشعری الفہرست میں لکھتے ہیں:^⑦

① مقدمہ الصحاح ۴۷۔

② یاقوت ج ۱، ص ۱۰۸ کشف الظنون ج ۲، ص ۱۰۷ طوسی ج ۶، ص ۴۔

③ ملخص من المیزان للذہبی ص ۶۰۵۔

④ کشف الظنون مع حاشیہ کالم ۱۲۰۷-۱۲۰۸۔

⑤ الفہرست لابن الندیم ص.....

⑥ ۱۳۴.....

⑦ ص ۱۲۵۔

((واول كتاب جمع في غريب القرآن ومعانيه كتاب ابى عبيدة معمر بن المثنى وهو كتاب المجاز))
 علاوہ ازیں مجاز القرآن کے مختلف نسخوں پر نام میں اختلاف ہے جس سے ہماری تائید ہوتی ہے چنانچہ اسماعیل صاب کے نسخہ میں پہلی
 جزء پر کتاب ”مجاز القرآن“ کا عنوان ہے اور اس کے آخر میں کتاب غریب القرآن ہے اور مراد سلا کے نسخہ میں یہ عنوان ہے ”کتاب المجاز
 التفسیر غریب القرآن“

ابو عبیدہ کے معاصرین نے ان پر تنقید بھی کی ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ابو عبیدہ میں شعوبیت کے علاوہ خارجیت بھی تھی اور خالص
 عربی کلام سے قرآن کی تفسیر کے قائل تھے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ تفسیر بالرأی کی طرف مائل تھے اور محدثین و فقہاء اس کے خلاف
 تھے۔ چنانچہ فرما (۲۱۱۔) اور اصمعی نے ابو عبیدہ کی مخالفت کی ❶ اور ابو حاتم نے ان کی مجاز القرآن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور زجاج، زہری اور
 نحاس نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔ ❷

www.KitaboSunnat.com

مگر اس مخالفت کے باوجود ان کے بعد جن علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ ابو عبیدہ سے بے نیاز نہ ہو سکے۔ ابن
 قتیبہ نے اپنی ”المشکل“ اور ”الغریب“ دونوں کتابوں میں مجاز القرآن پر اعتماد کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تصحیح میں مجاز القرآن سے
 استفادہ کیا ہے۔ ❸

امام طبری (۳۱۰۔) نے اپنی تفسیر میں ان پر اعتماد تو کیا ہے مگر دوسرے علماء کے اقوال و آراء نقل کر کے مناقشہ اور مقارنہ بھی کیا ہے، طبری کے
 علاوہ ابو عبد اللہ الیزیدی الزجاج ابن درید نے ”الجمہر“ اور جستانی نے غریب القرآن میں ان سے نقل کیا ہے اور متاخرین میں سے حافظ ابن
 حجر رحمہ اللہ ہیں جنہوں نے فتح الباری میں کتاب المجاز سے استفادہ کیا ہے۔

ابن قتیبہ کی غریب القرآن جو دراصل ان کی کتاب ”المشکل القرآن“ کا تہمت ہے جیسا کہ اس کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے اس
 موضوع پر اہم کتاب ہے، مؤلف نے اپنی ان دونوں کتابوں میں اہل بدعت پر تنقید کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کو ثابت کیا ہے۔
 ابن قتیبہ نے اپنے وقت کے تمام ائمہ سے استفادہ کیا ہے حتیٰ کہ آداب میں جاہظ رحمہ اللہ سے ان کی بعض کتابوں کی اجازت بھی
 حاصل کی، بعض مخالفین نے ان پر تشبیہ اور خارجیت کی تہمت لگائی ہے مگر یہ شدتاً تعصب کی بنا پر ہے ورنہ تو ابن قتیبہ رحمہ اللہ کو اہل سنت میں
 وہی اہمیت حاصل ہے جو جاہظ کو معتزلہ میں حاصل ہے یعنی جاہظ اگر خطیب معتزلہ ہیں تو ان کے مقابلے میں ابن قتیبہ رحمہ اللہ اہل سنت کے
 خطیب مانے گئے ہیں۔

ان کی مشکل، اور غریب کو کنانی نے ”القرطین“ کے نام سے یکجا کر دیا ہے جو مصر میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، امیر قوجی نے الاکسیر
 میں ابن قتیبہ کو مفسرین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ کی مفردات اس موضوع پر اہم کتاب ہے، قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں یہ واضح کر دینا ضروری
 خیال کرتے ہیں کہ امام راغب رحمہ اللہ کے بعد بھی متاخرین نے اس موضوع پر کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے تحفۃ الارباب
 القرآن من الغریب“ لابی حیان نحوی (المتوفی ۴۵ھ) تراجم الامام تالیف زین المشائخ محمد بن ابوالقاسم الخوارزمی (۵۲۳ھ) اور مفردات
 القرآن سمین حلی (۶۵ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان سب کتابوں میں مفردات راغب کو جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسری
 کتاب کو حاصل نہیں۔

❶ تاریخ بغداد ۲۵۰/۱۲

❷ مقدمہ مجاز القرآن بحوالہ الزبیدی، ص ۱۲۵-۱۲۶

❸ تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مقالہ ”امام بخاری رحمہ اللہ اور مجاز القرآن“

مفردات میں راغب رشتہ نے تقریباً پندرہ سو نو اسی مواد سے بحث کی ہے قرآن کے بعض مواد متروک بھی ہیں تاہم وہ غیر اہم ہیں۔ مؤلف نے اپنی کتاب کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہے اور ہر کلمہ کے حروف اصلیہ میں سے اول حرف کی رعایت کی ہے۔ طریق بیان فلسفاتی ہے یعنی پہلے ہر مادہ کے جوہری معنی متعین کرتے ہیں پھر قرآن پاک میں مختلف آیات پر اس معنی کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تشریح لغت میں یہ طریق اصولی حیثیت رکھتا ہے، اصول لغت پر جن علماء نے تالیفات لکھی ہیں، انہوں نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے، تمام متعلقہ آیات کو سامنے رکھ لینے سے اس کلمہ کے صحیح معنی سمجھ میں آجاتے ہیں اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے ہر قسم کا اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔

پھر مؤلف، الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں اشعار و محاورات اور احادیث کو بھی بطور شاہد پیش کرتے ہیں اور بعض علماء نے تفسیر و لغت کے اقوال بھی بطور تائید پیش کرتے ہیں اور بعض مقامات پر وضاحت کے لیے اختلاف قراءات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

کتاب کی افادیت اور اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ اصحاب تفسیر کے علاوہ حافظ ابن حجر اور علامہ یعنی رشتہ جیسے شارحین حدیث بھی امام راغب سے استفادہ کرتے ہیں، حضرت الامیر القموجی ان کی مفردات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ومن احسنها المفردات للراغب)) ووریں باب اعتماد وجمہور مفسرین بر تحقیقات اوست

اس کتاب کا پورا نام ”المفردات فی تحقیق مواد لغات العرب المتعلقة بالقرآن“ ہے، مطبوعہ نسخوں پر ”المفردات فی غریب القرآن“ کا عنوان مرقوم ہے، ہم اس کے اردو ترجمہ کو ”مفردات القرآن“ کے نام سے پیش کر رہے ہیں، عربی ایڈیشن کے چار نئے مطبوعہ ایران و مصر راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں، طبع کراچی میں بھی مصری نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اتنی بڑی اہم کتاب کا اب تک محقق ایڈیشن شائع نہیں ہوا، ہم یہ دوسرا ایڈیشن پوری تحقیق سے شائع کر رہے ہیں، اور اس کے ترجمہ و تحقیق میں مندرجہ ذیل کو ملحوظ رکھا ہے:

۱۔ بعض اہل علم احباب کے مشورہ کے مطابق عموماً لفظی یا حرفی ترجمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاہم اس میں حتی الوسع سلاست پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ ہر آیت کے تحت آیت اور سورۃ کا نمبر دے دیا ہے تاکہ سہولت سے مراجعت ہو سکے، مثلاً (۲-۲۸) سے ہماری مراد سورۃ نمبر ۲ اور آیت نمبر ۲۸ ہے۔

۳۔ آیات کا ترجمہ عموماً مولانا فتح محمد صاحب جالندھری کا ہے لیکن بعض مقامات پر مؤلف کا مقصود ترجمہ ہی لکھ دیا گیا ہے۔

۴۔ پوری کوشش کی ہے کہ حاشیہ میں احادیث و اشعار کی مکمل تخریج آجائے۔

۵۔ کتاب کے متن کی تصحیح میں عموماً تاج العروس اور لسان العرب پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ دیگر مراجع۔ سے بھی بلا واسطہ استفادہ کی کوشش کی گئی ہے۔

۶۔ ابتداء میں یہ خیال تھا کہ متروک مواد کو آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا جائے مگر عدیم الفرستی اس میں حائل رہی اور ہم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا امور کی رعایت سے اس اردو ایڈیشن میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں جو عربی ایڈیشن میں نہیں ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کے بعد ”مفردات الحدیث“ کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

امام راغب اصفہانی

امام راغب پانچویں اور چھٹی صدی کے علماء سے شمار ہوتے ہیں، ان کا پورا نام حسین بن محمد بن منفل بن محمد ہے اور راغب اصفہانی کے

نام سے مشہور ہیں، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

((توفي سنة خمس مائة ونيّف))

یعنی ۵۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں مگر امام سیوطی رحمہ اللہ "بخية الوعاة" میں لکھتے ہیں:

((كان في اوائل المائة الخامسة))

اور امام سیوطی رحمہ اللہ اور ان کے تابع طاش کبریٰ زادہ نے ان کا نام فضل بن محمد رحمہ اللہ لکھا ہے، مگر یہ ان کی فروگزاشت ہے، صحیح نام

حسین بن محمد بنی ہے اور وفات ۵۰۲ھ ہے۔

تاریخ اخبار البشر کی غلطی:

سید حسن بن الحسنی صاحب "روضات الجنات" کے حوالہ سے اپنی کتاب اعیان الشیعہ میں لکھتے ہیں:

"صاحب "تاریخ اخبار البشر" نے امام راغب کی وفات ۵۶۵ھ نقل کی ہے مگر یہ ان کی فاش غلطی ہے کیونکہ اس کے بعد انہوں نے

خود ہی یہ تصریح کی ہے کہ امام موصوف علامہ جار اللہ زحمری سے پہلے فوت ہوئے ہیں حالانکہ علامہ رحمہ اللہ کی وفات بالاتفاق

۵۳۸ھ ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام موصوف کا سنہ وفات ۵۶۵ھ ہو۔"

علاوہ ازیں حاجی خلیفہ امام راغب رحمہ اللہ کی کتاب الذریعہ الی مکارم الشریعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

((ان الغزالی كان يستصحب كتاب الذريعة))

کہ امام غزالی مولف کی کتاب "الذریعہ" ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، اور امام غزالی کی وفات ۵۰۵ھ ہے، لہذا قرین قیاس یہ ہے کہ

امام راغب رحمہ اللہ ان سے پہلے فوت ہوئے ہیں۔

امام راغب رحمہ اللہ کی شخصیت:

مولف کی تالیفات خصوصاً مفردات القرآن اور محاضرات الادباء کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مولف جامع علوم و فنون ہونے

کے ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے چنانچہ صاحب "روضات الجنات" ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

((الراغب الاصفهانی صاحب لغة العرب والحديث والشعر والحكمة والكلام وعلوم الاوائل

وغير ذلك وفضله اشهر من ان يوصف وكفاه منقبة قبول العامة والخاصة وفيما تحقق له من

اللغة خاصة))

اسی طرح یاقوت معجم الادباء میں لکھتے ہیں:

((احد اعلام العلم بغير فن من العلوم ادبها وحكمتها له كتاب في تفسير القرآن قيل وهو

الكبير))

یعنی موصوف "کوہ علم" تھے اور ادب و فلسفہ بلکہ جملہ علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور انہوں نے قرآن پاک کی ایک بہت بڑی تفسیر

بھی لکھی ہے۔

الغرض موصوف علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے اور ان کے فضل و مرتبہ کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کا تذکرہ

"طبقات المفسرین" میں کیا ہے اور امام سیوطی رحمہ اللہ ان کو لغت و نحو کے ائمہ سے شمار کرتے ہیں، علی بن محمد رحمہ اللہ نے اپنے "تسمہ صوان

الحکمة“ میں انہیں حکماء کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور یا قوت نے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا تعارف کروایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ہمدنی امام تھے اور بیک وقت تفسیر و لغت کے امام ہونے کے ساتھ بہت بڑے حکیم اور صوفی بھی تھے۔
امام راغب رحمۃ اللہ علیہ اور شیعیت:

دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے زمانہ میں جب راقم الحروف کو ایک سلسلے میں مفردات القرآن کا استیعاب سے مطالعہ کا اتفاق ہوا کہ بعض مقامات پر امام راغب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بجائے نام امیر المؤمنین کے لقب سے ذکر کرتے ہیں جس سے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ غالباً مؤلف شیعہ ہوں گے کیونکہ علمائے شیعہ کی یہ عادت ہے کہ وہ علی رضی اللہ عنہ نام کی بجائے انہیں امیر المؤمنین لکھتے ہیں مگر یہ خیال کر کے کہ بہت سے علماء و اہل سنت بھی ایسے ہیں جو حضرت علی، حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے ساتھ علیہ السلام لکھ دیتے ہیں اس لیے ضروری نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کی بجائے امیر المؤمنین لکھنے والا ضرور شیعہ ہی ہو۔

اب جب کہ مفردات کی اشاعت کے سلسلہ میں مؤلف کے تعارف کے لیے کتب تراجم اور تذکروں کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مسلک شیعہ ہونے کی علامت ہی یہی ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کے لقب سے یاد کرے جیسا کہ صاحب ”روضات الجنات“ نے تصریح کی ہے اور پھر آخر میں لکھا ہے: ﴿(وهذه آية الفطن))﴾

کہ یہ اس کے ذہن و فطن ہونے کی علامت ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھیے، صاحب ”اعیان الشیعہ“ لکھتے ہیں:
”اکثر علماء نے تصریح کی ہے کہ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ معتزلی تھے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ بھی تھے کیونکہ معتزلہ اور شیعہ عموماً اصول میں متحد ہیں اور اصحاب تراجم معتزلہ اور شیعہ کا تذکرہ ایک ساتھ کرتے ہیں۔“
پھر صاحب روضات لکھتے ہیں:

”ان کی کتاب ”محاضرات الادباء“ کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے وہ کٹر سنی تھے۔“
پھر اس پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں مگر امام کی علمی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلک اثنی عشری شافعی تھے، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ”بغیۃ الوعاة“ میں لکھتے ہیں:

”پہلے پہل میرا گمان یہ تھا کہ امام موصوف معتزلی تھے مگر جب میں نے ”القواعد الصغریٰ“ لابن عبدالسلام کی پشت پر زکشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا پایا کہ امام فخر الدین رازی نے ”تائیس القندیس“ میں تصریح کی ہے کہ امام راغب ائمہ سنت میں سے تھے اور غزالی کے ہم پایہ تو میری یہ بدفہمی دور ہو گئی خصوصاً جب کہ امام رازی جیسی شخصیت ان کی تقدیس کر رہی ہے۔“
ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ گو امام موصوف کے متعلق لوگوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے مگر سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور ان کا آخری میلان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف علمائے سنت سے تھے۔ صاحب ”روضات الجنات“ کے الفاظ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((کان من الشافعیۃ کما استفید لنا من محاضراتہ))

تالیفات:

سید محسن نے ”اعیان الشیعہ“ میں اور بروکلین نے تاریخ ادب العرب میں ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے کل دس کتابوں کا تذکرہ

کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) **محاضرات الادب:**..... یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور ۱۵۰۲ھ میں ابراہیم بن زیدان کی تصحیح سے قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے، اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی آ گیا ہے، یہ کتاب عجائب و غرائب سے پر ہے اور نہایت دلچسپ۔ خوانشاری نے اسی کتاب کی بنا پر ان کے سنی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

(۳) **حل متشابهات القرآن:**..... نام سے ظاہر ہے کہ مؤلف نے تشابہات پر سیر حاصل بحث کی ہوگی اس موضوع پر شیخہ علماء نے بھی بہت کچھ لکھا ہے، لیکن علمائے سنت نے عموماً اہل بدعت کی تردید کی غرض سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

(۴) **الذریعہ الی مکارم الشریعہ:**..... اخلاق ناصری کی طرز پر فارسی میں ہے اس میں مؤلف نے کلیلہ و دمنہ سے بہت سی حکامات نقل کی ہیں اور عجیب و غریب اشعار نقل کیے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

زصد ہزار محمد کہ درجہاں آید یکے بمنزلہ جاہ مصطفیٰ نشود!
 وگرچہ عرصہ عالم ہزار علیؑ گردد یکے بعلم و سخاوت بہ مرتضیٰ نشود
 جہاں گرچہ زمویٰ وچوب خالی نیست یکے کلیم نہ گردد یکے عصا نشود

(۵) **درة التویل فی غرة التنزیل:**..... اس کتاب میں مؤلف نے آیات کے تکرار کی حکمت اور تشابہات کے رموز بیان فرمائے ہیں، مفردات میں بعض مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، حاجی خلیفہ اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ذکر انه صنفه بعد ما عمل کتاب المعانی الاکبر و املیٰ کتاب کتاب احتجاج القراء))

(۶) **تحقیق البیان فی تویل القرآن:**..... مصنف نے اپنی کتاب الذریعہ کے دیباچہ میں اس تالیف کا نام لیا ہے، حاجی خلیفہ اس کتاب کے تحت امام سیوطیؒ کے طبقات النحاة کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفردات القرآن ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن علماء نے الگ تالیف کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔“

(۷) **افانین البلاغة:**..... صاحب کشف الظنون نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۸) **کتاب الایمان والکفر:**..... عجیب و غریب طرز پر لکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اصول میں اشعری تھے۔

(۹) **تفصیل النشأتین:**..... یہ کتاب پہلے ۱۳۱۹ھ میں بیروت سے شائع ہوئی، پھر امرتسر سے اردو ترجمہ کے ساتھ دو کالموں میں اس کا خوبصورت ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۱۰) **المفردات فی غریب القرآن:**..... جس کا اردو ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے۔

(۱۱) **کتاب المعانی الاکبر** (۱۴) **کتاب احتجاج القراء**

هَذَا آخِرُ مَا أَرَدْنَا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيَّ خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ
 وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

محمد عبدہ الفلاح

قاسم منزل حاجی آباد لائل پور ۱۰ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَوْتُهُ عَلٰی نَبِیِّهِ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ اَجْمَعِیْنَ))

امبعد..... بندہ ناچیز شیخ ابوالقاسم حسین بن محمد بن افضل الراغب (خدا اس پر رحم فرمائے) درگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے انوار قدسیدہ سے نور ایمان عطا فرمائے جس کے ذریعہ ہم خیر و شر کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ سکیں اور حق و باطل میں کما حقہ تمیز کر سکیں حتیٰ کہ اس پسندیدہ گروہ میں شامل ہو جائیں جن کا نور ایمان قیامت کے دن ان کے سامنے اور دائیں طرف سے ضوء افشائی کرتا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں قرآن فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳-۴۸)

”وہ ذات ہے جس نے مومنین کے دلوں میں طمانیت اور تسلی نازل فرمائی۔“

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ (۲۲-۵۸)

”یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو راسخ کر دیا اور ان کی روحانی تائید فرمائی ہے۔“

قبل ازیں ہم اپنی کتاب ”الرسالة السنية على فوائد القرآن“ میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا ہے اور دین اسلام کو تمام ادیان کا ناسخ اور اسے ہر پہلو سے جامع و مکمل بنا دیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَبِتَمَّتْ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (۳-۵)

”آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور بحیثیت دین تمہارے لیے اسلام پسند کیا۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر نازل کردہ کتاب یعنی قرآن پاک میں تمام سابقہ کتب ساویہ کے مطالب و مضامین کا نچوڑ اور خلاصہ جمع کر دیا ہے چنانچہ قرآن پاک کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ﴾ (البلد)

”وہ (نبی کریم) پاکیزہ جھیفوں کی تلاوت کرتا ہے جس میں سیدھے (اور دین کو قائم رکھنے والے) نوشتے ہیں۔“

اور اس نے قرآن پاک کو یہ اعجاز بخشا ہے کہ ضخامت و حجم میں مختصر ہوتے ہوئے بھی معنوی عظمت اور مضامین کی وسعت کے لحاظ سے وہ اتنا ہمدرد ہے کہ انسانی عقل و فراست ان کے ادراک سے عاجز ہے اور اس کا نکتہ کے اسباب و وسائل اس کے مضامین کی گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہیں، چنانچہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمْدُ مِنْ بَعْدِهِمْ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ

اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (۲۷-۳۱)

”اور زمین کے جتنے بھی درخت ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سات گنا بڑھ جائیں، ان سے سیاہی کا کام لیا

جائے تو بھی اللہ کے کلمات ختم ہونے کے نہیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“
ہم نے اپنی کتاب ”الذریعة الی مکارم الشریعة“ میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن پاک کے انوار و برکات سے ہر شخص اپنی (علمی و روحانی) استعداد کے مطابق روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی تلاوت سے بقدر ظرف مستفید ہو سکتا ہے، اس لیے کہ

بقول: ❶

(۱) كَاتِبٌ مِّنْ حَيْثُ تَلَفَّتْ رَأَيْتُهُ يُهْدِي إِلَى عَيْنِكَ نُورًا ثَابِتًا

(۲) كَالشَّمْسِ فَمِنْ كَبِدِ السَّمَاءِ وَضَوْءُهَا يَغْشَى الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَمَغَارِبًا

”اس کی مثال ماہِ کامل کی ہے جس پہلو سے بھی اس کی جانب دیکھو گے وہ تمہاری آنکھوں کو نور اور پیمانے بخشنے گا دیا، سورج کی

مانند ہے جو وسط آسمان میں نمودار ہوتا ہے، مگر اس کی روشنی مشرق و مغرب تک پھیلی ہوتی ہے۔“

لیکن اس کے محاسن انوار سے صرف اصحاب بصیرت ہی مستفید ہو سکتے ہیں اور اس کے پاکیزہ معانی اور مطالب سے پاک باز اور برگزیدہ نفوس ہی فیض یاب ہوتے ہیں اور اس کے کسیری نغصوں سے صرف پاکیزہ طبائع ہی شفا یاب ہو سکتی ہیں چنانچہ قرآن پاک نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ:

﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝﴾ (۵۶-۷۸، ۷۹)

”یقیناً یہ ایک باعزت کتاب مکنون میں محفوظ ہے صرف پاک باز اور صالح لوگ ہی اس کے حقائق (ومعارف) تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔“

نیز اس کے سامعین کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءً وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى﴾ (۳۱-۳۳)

”آپ کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن پاک) ایمان والوں کے لیے ہدایت و شفا ہے اور جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں پر گرجا بنا کر رہتا ہے اور ان پر اس کے معانی غصی رکھے جاتے ہیں۔“

اور اپنے رسالہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس طرح خیر و برکت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر اور کتا موجود ہو اسی طرح بصیرت افزو اور اطمینان بخش کیفیت اس دل میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو حرص اور کبر و نخوت سے بھر چکا ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

﴿الْحَبِيبَاتُ لِلْحَبِيبِينَ وَالْحَبِيبَاتُ لِلْحَبِيبَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبَاتِ ۝﴾

(۲۳-۲۶)

”ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے اور (اس طرح) پاکیزہ عورتیں

پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے۔“

نیز اپنی کتاب میں ہم نے اس زاویہ کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں جن کے ذریعہ انسان امکانی حد تک علوم و معارف میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے اور کتاب الہی کی مدد سے آسمان و زمین کے راز ہائے سر بستہ پر آگاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اپنے کام کی توصیف میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿مَا قَرَأْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ۝﴾ (۳۸:۶) کہ ہم نے الکتاب

❶ قاله المتنبی فی مدح سيف الدولة والبيت فی دیوانه (۲۰۰۱) بشرح العکبری ومجموعة المعانی والاتقان للسيوطی ۱۲۸/۲ و بینهما ثالث کالبحر یقذف القریب جواراً جوداً و بیعت للبعید سعائياً.

میں کسی چیز (کے ذکر کرنے) میں کوتاہی نہیں برتی۔ بالکل صحیح ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کی ہدایت کا اس نے ذمہ لیا ہے اور ان کی رفاقت میں بلند مرتبہ اور عالی مقام پر فائز فرمائے اس لئے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نصیب نہ ہو اسے کوئی بھی راہ راست پر نہیں لاسکتا چنانچہ فرمایا:

﴿ إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ ﴾ (۵۶:۲۸)

”آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔“

ہم نے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ علوم قرآن میں سب سے پہلے ان علوم کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا تعلق نظم قرآن (الفاظ) سے ہے اور ان میں سب سے پہلے مفرد الفاظ کی تحقیق ضروری ہے لہذا قرآن کے مطالب و معانی کی تحقیق کے لئے مفردات قرآن کے معانی حاصل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عمارت بنانے کے لئے سب سے پہلے اینٹ (اور مسالہ) کا حصول ضروری ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مفردات قرآن کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے محض علوم قرآنی کے سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح تمام علوم شرعیہ تک رسائی میں مدد ملتی ہے اس لیے کہ قرآن مجید کے استعمالی الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا لیب لباب اور معجز ہیں احکام و مسائل اور حکم و مصالح کے استنباط میں فقہاء اور حکماء نے انہی الفاظ کو بنی قرار دیا ہے اور شعر و سخن کے شہسوار بھی انہی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ قرآن کے استعمال کردہ مواد اور ان کے مشتقات کے علاوہ جو الفاظ بھی عربی زبان میں استعمال ہیں ان کی حیثیت قرآن کے مستعمل الفاظ کے مقابلہ میں وہی ہے جو معجز اور رس کے مقابلہ میں کھٹھلی اور پھلکے کو حاصل ہے۔

چنانچہ مفردات قرآن کو حرف ہجاء کی ترتیب پر ایک جامع کتاب کی شکل میں تالیف کیلئے میں نے خدا کے حضور استخارہ کیا اس کتاب کی ترتیب میں ہم سب سے پہلے وہ کلمات لکھیں گے جن کے شروع میں الف آتا ہے اور پھر وہ جو حرف باء سے شروع ہوتے ہیں اس طرح پوری کتاب میں حروف حتمی کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی اس ترتیب میں ہم زوائد کو نظر انداز کر کے حروف اصلی (مادوں) کو پیش نظر رکھیں گے اسی طرح اس کتاب کی گونچائش کے مطابق ان تعلقات کو بھی زیر بحث لایا جائے جو مستعار الفاظ اور ان کے مشتقات میں پائے جاتے ہیں اور الفاظ کے تعلقات کے متعلق اصول و قواعد اور ان کی تحقیق کو کسی دوسری کتاب میں زیر بحث لائیں گے جو مستقل اسی موضوع پر لکھی جائے گی اور جس کا ہم جا بجا حوالہ بھی دیتے جائیں گے۔

اور اس سلسلہ میں جو کچھ ہم نے سپرد قلم کیا ہے اس پر کھلی اعتماد کر لینے سے تمام وہ دشواریاں دور ہو جاتی ہیں جو مسابقت الی الخیر کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (۲۱:۵۷) (اپنے رب کی بخشش حاصل کرنے کے لیے مسابقت کرو) کے فرمان سے ترغیب دی ہے۔ خدائے عزوجل ہمارے لئے اس راہ پر گامزن ہونا آسان فرمائے۔

انشاء اللہ بشرط زندگی اس کے بعد ایک ایسی جامع کتاب کی پیشکش کا ارادہ رکھتے ہیں جس میں الفاظ مترادف کی تحقیق اور ان کے معانی میں جو فرق پایا جاتا ہے اسے بالوضاحت بیان کیا جائے گا۔ جس سے کہ قرآن مجید کے ایک ہی مضمون میں استعمال کردہ مختلف الفاظ، مثلاً ایک جگہ قَلْبٌ دوسرے موقع پر قُلُودٌ اور تیسرے مقام پر صُدُور کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے..... کی توجیہ معلوم ہو سکے گی اسی طرح وہاں ہم یہ بھی بتائیں گے کہ ایک ہی قصہ کے خاتمے پر قرآن مجید میں ایک جگہ پر ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (۷۹:۱۶) ارشاد ہے اور دوسرے مقام پر ﴿لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (۲۱:۳۰) اسی طرح تیسرے مقام پر ﴿لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ (۲۳:۳۰) اور کہیں پر ﴿لِقَوْمٍ يَتَفَهَمُونَ﴾ مذکور ہے۔ تو اس میں کون سی لطافت پائی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قرآن میں ﴿لَا وِلِيَّ إِلَّا ابْنُ مَرْيَمَ﴾ اور ﴿لَا وِلِيَّ إِلَّا اللَّهُ﴾ وغیرہ کلمات جو مختلف مقامات پر استعمال ہوئے ہیں اور انہیں دیکھ کر سطحی اور ظاہر بین حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ انہیں مترادف الفاظ قرار دے کر بزم خود سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ﴾ کی تفسیر ﴿الشُّكْرُ لِلَّهِ﴾ یا ﴿لَا

رَبِّ ﴿ کی تفسیر لاشک سے بیان کر کے بس قرآن مجید کی تفسیر کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔
 دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے ہماری رہنمائی فرمائے اور خلوص ہمارے شامل حال رہے اور جو علم ہمیں بخشا ہے اس کے ذریعہ ہمیں
 فائدہ پہنچائے اور اسے ہمارے زادِ آخرت بنائے جس کے لیے ہمیں بدیں الفاظ تاکید فرمائی ہے۔ ﴿ وَتَزِدُّوْا قِيَانَ خَيْرِ الزَّادِ التَّقْوَى ﴾
 ﴿ (۲:۱۹۷) اور زادِ راہ تیار کرو اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔“

﴿ وَاللَّهُ الْمَوْفِقُ وَهُوَ نِعْمَ الْوَكِيلُ ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِدًا وَ مُصَلِّيًا

کتاب الهمزة

کر چکے۔

(۲) ﴿أَتَحَدَّثْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ (۸۰:۲) کیا تم

نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(۳) ﴿الَّذِينَ وَقَدَّ عَصَيْتَ قَبْلُ﴾ (۹۱:۱۰) کیا اب

(ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟ اور غیر

مخاطب کے متعلق فرمایا:

(۴) ﴿أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا﴾ (۲:۱۰) کیا لوگوں کے

لیے تعجب نیز ہے؟

(۵) ﴿أَفَأَنْتَ مَاتَ أَوْ قُتِلَ﴾ (۴۴:۳) تو کیا اگر

یہ مر جائیں یا مارے جائیں؟

(۶) ﴿أَفَأَنْتَ مِمَّنْ خَالِدُونَ﴾ (۴۳:۲) بھلا

اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟

(۷) ﴿آءَ الذَّكْرَيْنِ حَمَّ امُّ الْأُنثَيْنِ﴾ (۴۴:۶)

بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں

مادوں کو۔

اور معنی تسویۃ ۱ میں فرمایا: ﴿سَوَاءٌ عَلَيْنَا

أ: الف با معنی کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شروع

کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔

تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(۱) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے۔ اس کی چند قسمیں

ہیں:

(۱) الف الاستخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے

بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ کیونکہ اس میں

عمومیت ہے جو استفہام و انکاری، تکبیت، (زجر و توبخ)

تسویہ سب پر حاوی ہے۔ چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا:

﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾

(۳۰:۲) (انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو

نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا

پھرے اور تکبیت ۱ یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور

کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا: (۱)

﴿أَذْهَبْتُمْ طَيْبَاتِكُمْ﴾ (۲۰:۲۶) تم اپنی لذتیں حاصل

۱ ہو شامل للانکار التوبیخی والباطالی و ہما قسامان متقابلان معنی الاول ان ما بعد الهمزة واقع و ان فاعله معلوم کما یظہر من

الامثلة ۴، ۳، ۱ و معنی الثانی ان ما بعد الهمزة لم یقع و ان مدعیہ کاذب کما یظہر من ۷، ۶، ۵، ۲۔

۲ انقلبتم علی اعقابکم و بہ یتم السئال۔

۳ ولیکن علی ذکر منک ان الهمزة الثی تدخل علی جملة یصح حلول المصدر محلها یقال له همزة التسویة ولا یلزم ان یکون بعد

کلمة "سواء" کمال توہم نحو ما ابالی اقمتم ام قعدتم نعم لم یرد فی القرآن الابد کلمة "سواء" رضی علی الکافیة ج ۲ ص ۲۷۵

ذات بعد سواء او جملة لا ابالی۔

(۲) الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم کے شروع میں آتا ہے اور ”میں“ کے معنی رکھتا ہے جیسے اَسْمَعُ وَابْصُرُ یعنی میں سنتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں۔

(۳) ہمزہ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی جیسے فرمایا: ﴿أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ﴾ (۵-۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

﴿رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ يَتِيْمًا فِي الْجَنَّةِ﴾ (۶۶-۱۱) اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

(۴) الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے لیے آیا ہے جیسے فرمایا اَلْعَالَمِيْنَ (۱-۱) تمام جہانوں۔

(۵) الف نداء جیسے اَزِيْدُ (اے زید) •

(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس کی پہلی قسم الف تشبیہ ہے، (مثلاً رَجُلَانِ) اور دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے، مثلاً مُسْلِمَاتٍ وَمَسَاكِيْنٍ

(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لیے ہوتا ہے جیسے حُبْلَى اور بَيْضَاءٌ میں آخری الف یا پھر تشبیہ میں ضمیر کے لیے جیسا کہ اِذْهَبَا میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے، جیسے ﴿وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ

الظُّنُّوْنَا﴾ (۳۳-۱۰) ﴿فَاَصْلُوْنَا السَّبِيْلَا﴾ (۳۳-۶۷) تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لیے آخر میں بڑھا دیا

اَجْرِيْنَا اَمْ صَبْرَنَا﴾ (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرا میں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ (۲-۶) تم خواہ انہیں نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اَخْرَجَ (وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر نفی کے معنی نہ ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے۔ • چنانچہ فرمایا:

﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (۷-۱۷۲) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ (یعنی ضرور ہوں)

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾ (۹۵-۸) کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ یعنی ضرور ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاتِي الْاَرْضَ﴾ (۱۳-۳۱) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں؟ ﴿اَوَلَمْ تَاتِيْهِمْ بَيِّنَةٌ﴾ (۲۰-۱۳۳) کیا ان کے پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔

﴿اَوَلَا يَرَوْنَ﴾ (۹-۱۲۶) اور کیا یہ نہیں دیکھتے۔ ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ﴾ (۹-۱۲۶) اور کیا ہم نے تم کو اتنی

عمر نہیں دی؟

① ولہذا عطف المثبت علی المنفی فی سورة الانشراح (۱-۲) والضحی (۶-۷) والفیل (۲-۳) والمعانی الہمزہ غیر الاستفہام راجع امالی الشجرہ (۶۴+۲۶۸)۔

② لیس فی التنزیل نداء بغیر ما الاما قال الفراء فی الایۃ اَمَنْ هُوَ قَانَتْ اَنَاءَ اللَّیْلِ (۳۹-۱۰) ان الہمزہ فیہ للنداء خلافا للجمهور ولحوارہ وجوہ نظر المعنی لابن ہشام ج ۱، ص ۵۔

جاتا ہے (جیسا کہ آیات کے اواخر میں الف اشباع بڑھادیتے ہیں۔)

﴿خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا﴾ (۹۸-۱۱) وہ ابدالاباد

ان میں رہیں گے۔

لیکن بعض اوقات اسے ایک خاص مدت کے معنی میں لے کر اَبَادُ اس کی جمع بنا لیتے ہیں جیسا کہ اسم جنس کو بعض افراد کے لیے مختص کر کے اس کا ثننیہ اور جمع بنا لیا جاتا ہے بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ اَبَادُ جمع مُوَلَّدُ ہے۔ خالص عرب کے کلام میں اس کا نشان نہیں ملتا اور اَبْدُ اَبْدٌ وَاَبْدٌ اَبِيدٌ (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) میں دوسرا لفظ محض تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔ تَابَدَا الشَّيْءُ کے اصل معنی تو کسی چیز کے ہمیشہ رہنے کے ہیں مگر کبھی عرصہ دراز تک باقی رہنا مراد ہوتا ہے۔ اَلْاَبْسَلَةُ وحشی گائے والجمع اوابد (وحشی جانور تَابَدَّ البَعِيرُ) (واحد) اونٹ بدک کر وحشی جانور کی طرح بھاگ گیا۔ تَابَدَّ وَجْهُ فُلَانٍ وَاَبْدٌ (اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے) بعض کے نزدیک اس کے معنی غضب ناک ہونا بھی آتے ہیں۔

ا ب ق

ابق (س ص) الْعَبْدُ اَبَا قًا۔ غلام بھاگ گیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذْ اَبَقَ اِلَى الْمَلِكِ الْمَشْحُونِ﴾ (۱۰۳-۱۰۴) جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے اَبَقُ (صفت فاعلی) بھاگا ہوا غلام والجمع

ا ب ب

اَلْاَبُّ: اس گھاس کو کہتے ہیں جو جانوروں کے چرنے اور کٹنے کے لیے بالکل تیار ہو یہ اَبُّ لِكَيْدًا اَبًا وَاَبَابَةٌ وَاَبَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کوئی کام کرنے کے لیے تیار ہو جانا ہے، جیسے محاورہ ہے۔ اَبُّ اِلَى وَطَنِهِ وطن کا مشتاق ہو کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اَبُّ لِسَيْفِهِ تلوار سونٹنے کو مستعد ہو جانا اور اسی سے اَبَانٌ ذَلِكَ کی ترکیب ہے جس میں اَبَانٌ بروزن فعلان ہے، یعنی وہ زمانہ جو کسی کام کرنے کے لیے بالکل مناسب ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَوَاكِهَةً وَاَبًا﴾ (۸۰-۳۱) اور میوے اور چارہ۔

ا ب د

اَلْاَبْدُ: ایسے زمانہ دراز کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں۔ جس کے لفظ زمان کی طرح کٹڑے نہ کیے جا سکیں۔ یعنی جس طرح زَمَانٌ كَذَا (فلاں زمانہ) کہا جا سکتا ہے اَبْدُ كَذَا نہیں بولتے، اس لحاظ سے اس کا ثننیہ اور جمع نہیں بنا چاہیے۔ اس لیے کہ اَبْدٌ تو ایک ہی مسلسل جاری رہنے والی مدت کا نام ہے جس کے متوازی اس جیسی کسی مدت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ملا کر اس کا ثننیہ بنایا

① وعند البعض وزن فعّال: النون اصلية اللسان والتهابة (ابن)

② وفي حديث الحج العُغَيْبِنا هَذَا اَمْ لَا اَبْدُ قَالَ بَلْ لَا اَبْدُ اَبْدُ اللسان (ابد).

③ قال في اللسان وَاَبْدٌ عليه اَبْدًا غَضِبَ وفي اتباع في الغيب (ص ۱۱) عَيْدٌ عليه وَاَبْدٌ وهما واحد غَضِبَ عليه فهما اي العين والهمزة من الابدال والمزدوج وجمع ايضا الابدال لابي الطيب ج: ص ۱۰، ۶۱ والنوادر لابي سهل ۷۸-۱۸۷.

کا اونٹ کی طرح پانی سے بے نیاز ہونا۔ تَابَلَّ الرَّجُلُ
عَنْ امْرَأَتِهِ۔ عورت سے مقاربت ترک کرنا اَبَلَّ
الرَّجُلُ۔ بہت اونٹوں والا فلاں لا یا بَلَّ فلاں اونٹ پر
جم کر سوار نہیں ہو سکتا۔ رَجُلٌ اَبَلٌّ وَاِبَلٌّ اونٹوں کا اچھی
طرح انتظام کرنے والا اِبَلُّ مؤنثہ اکٹھے کیے ہوئے
اونٹ الابالۃ۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ ﴿اور آیت کریمہ: ﴿وَاَرْسَلْ
عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيلَ﴾ (۳۱۰۵) میں اَبَابِيل کے معنی یہ
ہیں کہ ان پر پرندے اونٹوں کی مختلف لکڑیوں کی طرح قطار
در قطار بھیجے گئے اور ابابیل کا واحد اِبِيلٌ ہے۔ ﴿

ابو

اَبٌ۔ اس کے اصل معنی تو والد کے ہیں (بجازا)
ہر اُس شخص کو جو کسی شے کی ایجاد، ظہور یا اصلاح کا سبب
ہو اسے اَبُوہ کہہ دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:
﴿النَّبِيُّ اَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهُ
اُمَّهَاتُهُمْ﴾ (۶۳۳) میں آنحضرت کو مومنین کا باپ قرار
دیا گیا ہے۔ ایک قرأت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے۔ ﴿
نیز مروی ہے کہ آنحضرت نے حضرت علیؑ کو
مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ﴿(۱) انا وانت ابو هذه

اَبَاق۔ تَابَقَ الرَّجُلُ۔ وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح
چھپ گیا اور شاعر کے قول ﴿

(۳) قَدْ اُحْكِمَتْ حَكَمَاتُ الْقَدِّ وَالْاَبَقَا

”ان گھوڑوں کے چڑے کے تھے اور جوٹ کی
کنپیاں کسی ہوئی ہیں۔“

میں بعض نے کہا ہے کہ اَبَقُّ کے معنی جوٹ یا اس
کی رسی کے ہیں۔

ابل

اَلْاِبِلُ۔ اونٹ کا گلد۔ اس کا واحد اس مادہ سے نہیں
آتا قرآن میں ہے: ﴿وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنِيْنَ﴾ (۶-۱۳۳)
اور دونوں میں سے۔

اور آیت کریمہ: ﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ
كَيْفَ خُسِفَتْ﴾ (۸۸-۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی
طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجب) پیدا کیے گئے ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ اِبِلٌ بمعنی سحاب ہے یہ قول صرف
معنی تشبیہ کے اعتبار سے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ کثرت اسفار میں
بادل اور اونٹ میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ﴿
اَبَلُّ الْوَحْشِيِّ اِبُولَا وَاِبَلُّ اَبْلًا۔ وحشی جانور

① قاله زهير بن ابي سلمى بن رباح المزني وصدرة القائد الخليل منكبوا دوابها انظر للبيوت ديوانه ۱۲ بمشرحه للاعلم الششمري

(لیدن) ۱۳۰۶) والمختارات ۴۹ ومختار الشعر، مجاهلی ج ۱ ص ۱۷۲ والعقد الثمنین ۸۵ والمحكم (حكم) والاشفاق ۷۶.

② قال ابو عمرو بن العلاء من جعله السحاب فراء الى الابل (بتشديد اللام) اعراب ثلاثين ۷۰، الكشاف ۴: ۲۰۷، والبحر المحيط (۸: ۴۶۴) واللسان (ابل) وروح المعاني ۳۰: ۱۱۶ وفي غريب القرآن للقتبي ۴ اشارة اليه.

③ وفي المثال ضغث على ابالة ومعناه البلية على اخرى الميداني رقم ۲۲۰۲.

④ وعند الفراء والاحفش لا واحده وعند الكسائي واحده ابول مثل عجاجيل وعحول ويمكن ان يكون واحده ابالة مثل دينار ودنانير رابع.

⑤ ذكر المؤلف هذا القراءة ايضا في المحاضرات (۴: ۴۳۴) وهذه قراءة ابني في مصحفه ومنقول عن ابني عباس. محاهد وعكرمة

ثم نسخ كما يعلم من رواية كثر العمال ۱۸۶۴ والدرر ۵: ۱۸۲.

⑥ لم اجده فليظن من اخرجته ۱۲.

یعقوب کے چچا تھے۔ اور کبھی استاد اور معلم پر بھی ابّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کا روحانی مربی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ﴾ (۲۳-۲۲) میں بعض نے کہا ہے ❶ کہ آباء سے مراد وہ علماء ہیں جو ان کی علمی اور روحانی تربیت کرتے تھے۔ کیونکہ دوسری جگہ آیت: ﴿رَبَّنَا إِنَّا أَعْطَعْنَا سَادَتَنَا وَكِبْرَاءَنَا فَأَصْلُونَا السَّبِيلَ﴾ (۳۳-۶۷) میں ان آباء کو سادہ اور کبراء کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ آیت: ﴿إِنِ اشْكُرْنَا لِي لَوْلَا دِينُكَ﴾ (۳۱-۱۳) میں وَالِدَيْنِ سے باپ اور معلم مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ﴾ (۳۳-۴۰) کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں میں نفی ابوة بلحاظ ولادت کے ہے۔ نیز تنبیہ کی ہے کہ متنبی حقیقی اولاد کا حکم نہیں رکھتا۔ ابّ کی جمع آباء سے کبھی بَعُوْلَةٌ اور خُثُوْلَةٌ (جمع بعل وخال) کی طرح اس کی جمع ابُوَّةٌ بھی آجاتی ہے، اصل میں ابّ (ابُو) بروزن فَعْلٌ ہے اور شاعر کے قول ❷

الامة کو میں اور تم اس امت کے باپ ہیں۔ نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا۔ ❶
کل سبب ونسب منقطع یوم القیامة الاسبی ونسبی کہ قیامت کے دن میرے تعلق درشتہ کے سوا تعلقات اور رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ اور میزبان کو ابوالاضیاف کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مہمانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

ابو الحرب - لڑائی کا بھڑکانے والا۔ بڑا جنگجو ابو عُدْرَتَهَا - مرد و شیرگی دبائے زن (مجازاً) موجود آلَبَوَان - یہ لفظ ماں باپ، باپ دادا۔ نیز باپ چچا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَالْآبَاءَ آبَاءَهُمْ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِبْرَاهِيمَ وَأَحَدًا﴾ (۲-۱۳۲) میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے (تو) انہوں نے کہا آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ، دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود کیٹا ہے۔ میں حضرت اسماعیل کو یعقوب علیہا السلام کے آباء کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے، حالانکہ وہ حضرت

❶ رواہ الدار قطنی عن ابن عباس مرفوعاً فی حدیث طویل وقال فی آخره۔ تفرّد به خارجه ولبس بشقة قال السیوطی روی له الترمذی وابن ماجه وقال ابن عدی هو ممن ینکتب حدیثه اللالی للسیوطی: ۲۶۵ والحديث فی المحجاز لابی عبیدة ۲: ۱۷۸ رواه الحاکم فی المستدرک (۳: ۱۴۲) من حدیث عمرّی قصة نکاح ام کلثوم وقال فی آخره فانما احببت ان یکون بینی وبن رسول الله صلی الله علیه وسلم سبب ونسب قال الذهبی فی تلخیص المستدرک منقطع وایضاً راجع التذکره للذهبی.

❷ قد بلغنا من المحدث غایتها۔ وفی العینی (شرح شواهد الکبری علی هوامش الخزانة ۱: ۱۳۳) انه لابی النجم ويقال انه لرؤية ولبس فی دیوانه وفی النوادر لابی زید الانصاری بروایة المفضل الضبی عن ابی الغول لبعض اهل الیمن قال السیوطی فی شرح شواهدہ ۴۸: قبل ان الرجز لرؤية وعزاه الجوهری لابی النجم وراجع للشطر الاول اللسان (ابا) والخزانة البغداية (۳: ۳۳۷) وابن عقیل (۱: ۴۱) ومعانی القرآن (المنسوب الی الزجاج) ۲۰۴ والمغنی (۱: ۱۳۱) والشطر الثاني (۱: ۳۷) واسرار الانصاری ۴۶ وعزاه صاحب التحقیق الی ابی النجم (العجل من بنی بکر بن وائل المتوفی سنه ۱۳۰ھ) وفی البلدان (ابو قیس) وذكر الیقوت بحثاً فی اعراب ابی قیس (جل فی مکة) وقال ینسب فیہ لحن الی ابی حنیفة والقصة ایضاً فی العقد الفرید (۲: ۴۸۲) والعهدہ علیہ وانظر ایضاً دفاع الکهنوی فی التعلیق الممجد (مقدمه) وقد فارها عرق العینی واطال البحث فی شرح شواهد (۱: ۱۳۸-۱۳۹).

(۳) اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا۔

جس نے (اطاعت الہی سے) انکار کیا۔

”اس کا باپ اور دادا۔“

رَجُلٌ اَبِيٌّ۔ خود دار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے اَبِيَّتَ الصَّيْرِ (مضارع تَأْبِي) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ تَبَسُّ اَبْسِي۔ وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہو پانی پی کر بیمار ہو جائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مَوْنُفٌ اَبْوَاءُ ہے۔

میں اسے قَفَا کا حکم دیا گیا ہے یعنی قَفَا کی طرح اسم مقصور سمجھ کر نصی جری حالت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے، محاورہ ہے: اَبُوْتُ الْقَوْمِ (میں قوم کا باپ بن گیا) فُلَانٌ يَأْبُوهُمْ۔ (وہ اپنے جانوروں کی باپ کی طرح حفاظت کرتا) اور ندا کی حالت میں اَبٌ پرتا زیادہ کر کے یا اَبْتِ (اے میرے باپ) کہا جاتا ہے۔ ۵ بَابُ الصَّيِّ (حکایت) پنچے نے بابا کہا۔

ا ت ي

الْاِتْيَانُ۔ (مصض) کے معنی کسی چیز کے سہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اَتْسِي کہا جاتا ہے ۵ اور اسی سے بطور تشبیہ مسافر کو اَتَاوِي کہہ دیتے ہیں۔

ا ب ي

الغرض اِتْيَانِ کے معنی ”آنا“ ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پنچے یا اس کا نظم و نسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر دشر اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ اَتَاكُمُ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ﴾ (۶-۳۰) اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آمو جو وہ اَتْسِي اَمْرُ اللّٰهِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آ ہی پہنچا۔

اور آیت کریمہ ﴿فَاَسَى اللّٰهُ بِنِيَانِهِمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ﴾ (۱۶-۲۲) میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عملاً نفوذ مراد ہے جس طرح کہ آیت وَجَاءَ رَبُّكَ (۶-۳۰) میں ہے اور شاعر نے کہا ہے۔ ۵

الْاِبَاءُ کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہذا ہر اباہ کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو اِبَاءُ نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔ ﴿وَيَأْسَى اللّٰهُ اِلَّا اَنْ يُّتِمَّ نُورَهٗ﴾ (۹-۳۲) اور خدا اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں۔ ﴿وَتَأْسَىٰ فُلُوْبُهُمْ﴾ (۹-۸) لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ ﴿اَبْسِي وَاَسْتَكْبِرَ﴾ (۲-۳۳) اس نے سختی سے انکار کیا اور تکبر کیا اِلَّا اِبْلِيسَ اَبِي (۱۵-۳۱) مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔

ایک روایت میں ہے ۵ ﴿كُلُّكُمْ فِى الْجَنَّةِ اِلَّا مَن اَبِي﴾ (کہ تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص

۱ نظر الایات (۲۷-۱۰۲) (۱۹-۴۲-۴۵)۔

۲ رواہ البخاری من حدیث ابی ہریرۃ ۱۲۔

۳ قارن السنوادر لابی مسحل وفى النهاية (۱: ۱۷) عکسہ الاتی والاتاری فی الاصل الغریب ویقال للسلیل الذی باتی من بعدی اتی واتاری ومنه قبل الطریق مسلولٌ ”میتاہ کما فی حدیث اللقطة الفائق (۱-۷)۔“

۴ انظر الکلمة السنوادر لابی مسحل (۶-۷) وهو منسوب الی اتی والقیاس اتوی کما فی عدی وعدوی زیدت فیہ الالف للنسبة اولاشباع الفتحة (۱-۱۷)؛ ۵ لم اجدہ ولعلہ للاعشى وصدرة؛ لکی یعلم الناس انی امرء..... وفى دیوانہ المعیشة بدل المروءة ففعل احد اللغظین مصحف مکان الآخر ۱۲۔

دینا کے ہیں قرآن میں ہے:

﴿وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا﴾ (۲۵-۲) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔ ﴿فَلَمَّا تَتَمَّ بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا﴾ (۲۷-۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔ ﴿وَأَتَيْنَاهُمُ مُلُكًا عَظِيمًا﴾ (۴-۵۳) اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الہی کے متعلق آتینا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اُوْتُوا (صیغہ مجہول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اُوْتُوا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتینا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے، جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ ﴿اَتُّونِي زُبْرَ الْحَدِيدِ﴾ (۱۸-۹۶) تو تم لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔ میں ہمزہ نے الف موصولہ (اَتُّونِي) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جیسیونئی کے ہیں۔

الْإِيْتَاءُ (افعال) اس کے معنی اعطاء یعنی دینا اور بخشا کے ہیں۔ قرآن پاک میں بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ﴾ (۲-۲۷) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں ﴿وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَإِيْتَاءَ الزَّكَاةَ﴾ (۲-۷۳) اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا ﴿وَلَا

(۵) اتیت المروءة من بآبها۔

تو جو امردی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كَسَالَى﴾ (۹-۵۳) میں یأتون بمعنی يتعاطون ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ: يَا تَيْسَنَ الْفَاحِشَةَ (۴-۱۵) میں الفاحشة (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا﴾ (۱۹-۲۷) فری کے متعلق مجی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں)

اور آیت (مذکورہ) میں ایک قراءت تَأْتِي الْفَاحِشَةَ بھی ہے اور یہ آتیتہ وَاَتَوْتُهُ (واوی اور یائی) دونوں طرح آتا ہے۔ چنانچہ (دودھ کے) مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر رکھن آجاتا ہے، اسے اتوة کہا جاتا ہے لیکن اصل میں اتوة اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔

أَرْضٌ كَثِيرَةٌ الْإِيْتَاءِ۔ زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا﴾ (۱۹-۶۱) بے شک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے) میں مَأْتِيًّا (فعل) اتیتہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں مَأْتِيًّا بمعنی آتیا ہے (یعنی مفعول بمعنی فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیتُ الْأَمْرَ وَآتَانِي الْأَمْرُ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔^۱ آتیتہ بكذا واتیتہ كذا۔ کے معنی کوئی چیز لانا یا

① الواو لغة هذيل يقال: ما احسن أتویدی الشاقة واتى يديها قال خالد بن زهيره يا قوم ما بال ابى۔ كنت اذا اتواته من غيب (انظر الامالي ۲۰۵-۲) واللسان (اتى)۔

② يعنى يعلى بحرف الجر وهمزة الافعال ۱۲۔

خصائل) پر استدلال ہو سکے جیسے فرمایا: ﴿فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهَرِّعُونَ﴾ (۷۰-۳۷) سو وہ انہیں کے نقش قدم پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ ﴿هُم أَوْلَاءُ عَلَىٰ آثَارِي﴾ (۸۵-۲۰) وہ میرے طریقہ پر کاربند ہیں۔

اسی سے مشہور محاورہ ہے سَمَّيْتُ الْإِبِلَ عَلَىٰ آثَارَةِ آثَرٍ مِنْ شَحْمٍ فَرَبَّ شَدْنِ شُرَّاءِ بِرَبِّهِ بِسْمِ كِه پیش ازیں بود آثَرْتُ الْبَعِيرَ۔ میں اونٹ کے تلوے پر نشان لگایا تاکہ (گم ہو جانے کی صورت میں) اس کا کھوج لگایا جاسکے۔ اور جس لوہے سے اس قسم کا نشان بنایا جاتا ہے اسے الْمِثْرَةُ کہتے ہیں۔

آثَرُ السَّيْفِ۔ تلوار کا جوہر جو اس کی عمدگی کا نشان ہوتا ہے۔ سَيْفٌ مَأْثُورٌ۔ جو ہر دار تلوار۔

آثَرْتُ (ن) الْعِلْمُ أَثْرُهُ أَثْرًا وَإِنَارَةٌ وَأَثَرَةٌ۔ کے معنی ہیں علم کو روایت کرنا دراصل اس کے معنی نشانات علم تلاش کرنا ہوتے ہیں اور آیت ﴿أَوْ أَثَارَةٌ مِّنْ عِلْمٍ﴾^۱ میں آثَارَةٌ سے مراد وہ علم ہے جس کے آثار (تاحال) روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں ایک قراءت میں أَثَرَةٌ ہے یعنی اپنے مخصوص علم سے الْآثَارُ انسانی مکارم جو نسلاً بعد نسل روایت ہوتے چلے آتے ہیں اسی سے بطور استعارہ آثَرٌ بمعنی فضیلت بھی آجاتا ہے اور الْإِنشَارُ (انفال) کے معنی ہیں (ایک چیز کو اس کے افضل ہو۔ نہ کی وجہ سے دوسری پر) ترجیح دینا اور پسند کرنا اس سے آثَرْتُهُ ہے۔ یعنی میں نے اسے پسند کیا۔ قرآن پاک میں ہے:۔۔۔۔۔

﴿وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ﴾ (۹-۵۹)

يَجِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا بِمَا آتَيْتُمُوهُنَّ ﴿۲﴾ (۲۲۹-۲) اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکواں میں سے کچھ واپس لے لو ﴿وَلَمْ يَأْتِ سَعَةَ مِنَ الْمَالِ﴾ (۲۲۷-۲) اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

ا ث ث

الْأَثَاثُ۔ وافر رخت خانہ اصل میں یہ اَثٌّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی زیادہ اور گنجان ہونا کے ہیں۔ پھر یہ لفظ (اَثَاث) ہر قسم کے فراداں مال پر بولا جانے لگا ہے اور مَتَاعٌ کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا اس کی جمع اِثَاثٌ (بکسر الہمزہ) ہے۔ نِسَاءُ اِثَاثٌ۔ پر گوشت عورتیں گویا گوشت ان پر وافر سامان کی طرح چڑھا ہوا ہے تَأَثُّتٌ فُلَانٌ۔ فلاں بہت زیادہ مالدار ہو گیا قرآن میں ہے ﴿هُم أَحْسَنُ آثَانًا وَرَثَانًا﴾ (۷۴-۱۹) وہ ساز و سامان میں زیادہ تھے اور خوش منظر بھی ﴿آثَانًا وَمَتَاعًا﴾ (۸۰-۱۶) یعنی ساز و سامان

ا ث ر

آثَرُ الشَّيْءِ (بقیہ علامت) کسی شے کا حاصل ہونا جو اصل شے کے وجود پر دال ہو اس سے فعل آثَرَ (ض) و آثَرَ (تفعیل) ہے آثَرٌ کی جمع آثارٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا﴾ (۲۷-۵۷) پھر ہم نے ان کے پیچھے اور پیغمبر بھیجے ﴿وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۱-۲۰) اور زمین میں نشانات بنانے کے لحاظ سے ﴿فَانظُرْ إِلَىٰ آثَارِ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾ (۵۰-۳۰) تم رحمت الہی کے نشانات پر غور کرو، اسی سے ان طرق کو آثار کہا جاتا ہے جن سے گزشتہ لوگوں کے اطوار و

① انظر أيضاً (۱۸-۶۴) (۲۰-۹۶)۔

﴿ذَوَاتِىْ أَكُلْنَ خَمَطًا وَّأَثَلٌ وَّشَىءٌ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ﴾ (۱۷-۳۳) ”یعنی دو ایسے باغ دیئے“ جن کے میوے بد مزہ اور جھاؤ اور کچھ سبزیاں تھیں اَثَل۔ یعنی وہ درخت جس کی جڑ خوب مضبوط ہو اسی سے شَجَرٌ مُّتَاَثَلٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ درخت جس کی جڑ اَثَل کی طرح مضبوط ہو۔ تَأَثَلٌ گند اوہ چیز اَثَل کی طرح مضبوطی سے جم گئی اس نے جڑ پکڑ لی اور آنحضرت ﷺ کا وصی کے متعلق ﴿غَيْرَ مُتَأَثَلٍ مَا لَآ﴾ (۵) فرمایا ہے ﴿یعنی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت لے اور ذخیرہ اندوزی نہ کرے﴾ یہ مال کے اذخار اور اہتمام سے کننا یہ ہے اور اسی سے بطور استعارہ نَحَتَّ أَثَلْتَهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غیبت اور بد گوئی کرنا کے ہیں۔

ا ث م

الْإِثْمُ وَالْأَثَامُ۔ وہ (اعمال و افعال) جو ثواب سے روکنے اور پیچھے رکھنے والے ہوں اس کی جمع آثَامٌ آتی ہے چونکہ اس لفظ میں تاخیر اور بُطْء (دیر لگانا) کا

دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں ﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ أَثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ (۹۱-۱۲) بخدا اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت بخشی ہے۔ ﴿بَلْ تُوْتِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ (۱۶-۸۷) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ (۵) حدیث میں ہے: سَيَكُونُ بَعْدِيْ أَثَرَةٌ ﴿میرے بعد تم میں خود پسندی آجائے گی﴾ یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے کو دوسروں سے بہتر خیال کرے گا۔ الْإِسْتِثْنَاءُ۔ یعنی کسی چیز کو اپنے لیے مخصوص کر لینا اور (محاورہ میں) إِسْتَأْثَرَ اللّٰهُ بِفُلَانٍ فُلَانٍ کی موت سے کننا یہ ہوتا ہے اس میں تشبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرف بخشی کے لیے اسے چن لیا ہے اور اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔

رَجُلٌ أَثِرٌ جو اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دے۔ لِحْيَانِيٌّ ﴿نے حکایت کی ہے خُذْ أَثِرًا مَا، وَأَثِرًا مَا، وَأَثِرٌ ذِيْ أَثِيرٍ یعنی سب سے پہلے یہ کام کرو۔﴾

ا ث ل

أَثَلٌ (جھاؤ کا درخت) قرآن میں ہے:

① قاله صلى الله عليه وسلم لانتصار والحديث باختلاف الفاظه وطرقه في البخاري ومسلم (۱-۳۳۸) طبع انصاری و لیس فی شعی من الطرق سیکون قتبہ لذلك والحديث في الكشاف ۲۰۶/۲ وفي الحديث قصة ابی قتادة مع معاوية راجع الحاكم والبيهقي (تخریج احادیث الكشاف ۸۶ رقم ۱۸۷) والحديث أيضًا في النهاية واللسان (اثر).

② ابو الحسن علی بن مبارک او ابن خازم اللحیانی من بنی لحيان بن هذیل بن مدرکه اخذ عن الکسانی و ابن زید و ابی عمرو الشیبانی و طبقتهم و عمدتهم الکسانی راجع لترجمته بغية الوعاة ۳۴۶ و الفهرست ۷۲ و ۱۲۰ طبقات زبیدی ۲۱۳ و الاصابة ۱۰۹: ۱-۲۵۵/۲، و معجم الادباء ۱۰۶/۱۴-۱۰۸.

③ راجع للكلمة المعاجم.

④ راجع للحديث الكشاف (۱: ۲۴۸) و المصنف لعبد الرزاق و الطبري عن الحسن العرنی و مسند احمد و ابن ماجه و النسائي و ابو داؤد من رواية عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده و ابن حبان من رواية صالح بن رستم عن جابر و الكامل لابن عدی (ترجمه صالح بن رستم) و ابو نعيم في الحلية في ترجمة عمر بن دينار و قال تفرده العزنان (صالح بن رستم ابو عامر الخزان) و هو من ثقاة البصريين و ضعفه ابن معين (راجع تخریج الكشاف ص ۲۸-۳۹ رقم ۳۲۳) و النهاية ۱/ ۱۹ و الفائق ۱/ ۸ و قاله صلى الله عليه وسلم في وصي اليتيم و عمرّ حين وقف ارضه لمن و ليها ايضا مجمع البحار (اثر).

(۲-۲۰۶) کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عزت نفس (اور ہٹ دھری) اسے گناہ پر اکساتی ہے اور آیت ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا﴾ (۲۵-۶۸) میں آثام سے (مجازاً) عذاب مراد ہے اور عذاب کو آثام اس لیے کہا گیا ہے کہ ایسے گناہ (یعنی قتل و زنا) عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسا کہ نبات اور ثم (چربی) کو ندی (نمی) کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ نمی سے نباتات اور (اس سے) چربی پیدا ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿طویل﴾

(۷) تَعْلَى النَّدَى فِي مَتْنِهِ وَتَحَدَّرَا

اس کی پیٹھ پر تہ برتہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور نیچے تک پھیلی ہوئی ہے۔ بعض نے آیت کریمہ میں يَلْقَى اَثَامًا کے یہ معنی بھی کیے ہیں کہ مذکورہ افعال اسے دوسرے گناہوں پر برا بھیجتے کریں گے کیونکہ (عموماً) صفائے گناہ کبار کے ارتکاب کا موجب بن جاتے ہیں اور آیت کریمہ ﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (۱۹-۵۹) کی تفسیر بھی ان ہر دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

الْاِثْمُ - گناہ کا ارتکاب کرنے والا۔ قرآن پاک میں ہے: اِثْمُ قَلْبِهِ (۲-۲۸۳) وہ دل کا گنہگار ہے۔ اور اِثْمٌ كَالْفَظِيرِ (سبکی) کے بالمقابل استعمال ہوتا

مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے شاعر نے اونٹنی کے متعلق کہا ہے۔ ﴿الْمُتَقَرَّبُ﴾

(۶) جَمَالِيَّةٌ تَغْتَلِي بِالرَّادِفِ

اِذَا كَذَبَ الْاِثْمَاتُ الْهَجِيرَا

وہ اونٹ کی طرح مضبوط ہے جب ست رفتار اونٹنیاں دوپہر کے وقت چلنے سے عاجز ہو جاتی ہیں تو یہ ردیف کو لے کر تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعٌ لِلنَّاسِ﴾ (۲۱۹:۲) میں خمر اور میسر میں اِثْمٌ کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول (اور ارتکاب) انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک لیتا ہے۔ اِثْمٌ (ص) اِثْمًا وَاِثْمًا فَهُوَ اِثْمٌ وَاِثْمٌ وَاِثْمٌ (گناہ کا ارتکاب کرنا) اور تَأْتَمُّ (تفعل) کے معنی گناہ سے نکلنا (یعنی رک جانا اور توبہ کرنا) کے ہیں جیسے تَحَوَّبَ کے معنی حوب (گناہ) اور تَحْرَجَ کے معنی حرج یعنی تنگی سے نکلنا کے آجاتے ہیں۔ ﴿

اور (الكذب) (جھوٹ) کو اِثْمٌ کہنا اس وجہ سے

ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا گناہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان کو حیوان کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حیوان کہہ دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾

① قاله الاعشى في مدح ناقته وقيل: بناحية كاتان النجيل. تقضى السرى بعد ايام عسيرا. وفي رواية تغتلى بالعين المهملة ومعناه تنهض وتطيق راجع ديوانه ۷۰ والاقضاب ۱۹۹ واللائى مع السمط (۸۳۱۱) والبحر (۲: ۵۷) واللسان (اِثْمٌ غِلَا) والاعشى هو ميمون بن قيس ادرك الاسلام.

② ههنا سقط وخرم في النسخ المطبوعة ولعل الصواب وتخرج خرج من حرجه اى ضيقة.

③ البيت لعمر بن احمير الباهلي واوله: كثور العذاب الفرد يضربه الندى وفي رواية للمتعدان بدل العذاب والبيت في اللسان (ندى) والاقضاب ۴۱۰ والصاحي ۹۵ وابن احمير هو ابو الخطاب عمرو بن احمير الباهلي شاعر فحل مخضرم مشهور بالفصاحة والغريب توفي في خلافة عثمان (قبل سنة ۳۵ هـ) راجع الشعراء ۳۱۵ والخزانة ۳: ۳۸ والبيت ايضا في الصحاح والتاج والمحکم (عذب) ۱۲.

(شعلہ نار یا اس کی شدید تپش اور حرارت) وَأَجْتَهَا وَقَدْ
أَجَّتْ - میں نے آگ بھڑکائی چنانچہ وہ بھڑک اٹھی
(وغیرہ محاورات) سے مشتق ہے۔

إِشْجَ النَّهَارُ - دن گرم ہو گیا۔ اسی (آج) سے
﴿يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ﴾ (۱۸-۹۴) (۲۱-۹۶) ہے
ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے مشتعل آگ یا
موجزن اور متلاطم پانی کے ساتھ تشبیہ دے کر یا جوج
ماجوج کہا گیا ہے۔

أَجَّ الظَّلِيمُ أَجْبَجًا - شرمغ نہایت سرعت
رفتار سے چلا۔ یہ محاورہ اشتعال نار کے ساتھ تشبیہ دے کر
بولا جاتا ہے۔

ا ج ر

الْأَجْرُ وَالْأَجْرَةُ کے معنی جزائے عمل کے ہیں
خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّ
أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (۱۱-۲۹) میرا اجر تو خدا کے
ذمے ہے۔ ﴿وَأَتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي
الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (۲۹-۲۷) اور ان کو دنیا
میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک
لوگوں میں سے ہوں گے۔ ﴿وَلَا جُرْ الْآخِرَةَ خَيْرٌ
لِّلَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۱۲-۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے
..... ان کے لیے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

الْأَجْرَةُ (مزوروی) یہ لفظ خاص کر دنیوی بدلہ پر
بولا جاتا ہے۔ اَجْرُ کی جمع اَجُورٌ ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَأَتَوْهُنَّ أَجُورَهُنَّ﴾ (۳-۲۵) اور ان کے مہر بھی

ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (۶)
(۶) أَلْبَرُ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ
فِي صَدْرِكَ ۱ کہ نیکی وہ ہے جس پر طبیعت مطمئن ہو
اور گناہ وہ ہے جس کے متعلق دل میں تردد ہو۔ یاد رہے کہ
اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے البس والاثم کی
تفسیر نہیں بیان کی ہے بلکہ ان کے احکام بیان فرمائے
ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿مُعْتَدٍ اِثْمٍ﴾ (۶۸-۱۲) میں اِثْمِ
بمعنی آثم آتا ہے اور آیت: ﴿يُسَارِعُونَ فِي الْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵-۶۲) (کہ وہ گناہ اور ظلم میں جلدی کر
رہے ہیں) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ آثم سے
آیت: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ
هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (۵-۲۴) کے مضمون کی طرف اشارہ
ہے (یعنی عدم الحکم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ كُفْرٌ) اور
عُدْوَانٌ سے آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا
أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۵-۳۵)
کے مفہوم کی طرف اشارہ (یعنی عدم الحکم بِمَا
انزل اللہ ظلم) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ اِثْمِ
عدوان سے عام ہے۔

ا ج ج

الْأَجْجُجُ کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں
قرآن پاک میں ہے: ﴿هَذَا عَذَبٌ قُرَاتٌ وَهَذَا
مِلْحٌ أُجْجُجٌ﴾ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی نہایت شیریں اور
دوسرے کا سخت گرم ہے۔ یہ (اُجْجُج) اجیجج النَّارِ

۱ کلمة من حديث وابصة الاسدي انظر (حم، طب، في الدلائل عنه حب) ذكره في كقول العمال ۳: ۲۱۸۴، ۲۱۵۸ وبعنايه
رواية واصلة ۲۱۷۷، ۲۱۸۲ و ذكره الغزالي في الاحياء في مواضع ۳/ ۴۳ بتخريج العراقي.

دونوں طرح بولا جاتا ہے، یعنی خدا سے بدلہ دے۔
 الْأَجِيرُ بوزن فَعِيلٌ بمعنی فاعل یا مفاعل ہے
 یعنی معاوضہ یا اجرت پر کام کرنے والا۔ الْأَسْتَجَارُ کے
 اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ
 لینے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ جس طرح کہ استیجاب
 (استقبال) بمعنی آجَاب آ جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:
 ﴿اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ
 الْأَمِينُ﴾ (۲۸-۲۶) اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجیے
 کیونکہ بہتر ملازم جو آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار
 ہو میں (استجَار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں
 استعمال ہوا ہے۔

اجل

الْأَجَلُ کے معنی کسی چیز کی مدت مقررہ کے ہیں۔
 قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى﴾
 (۴۰-۱۶) اور تاکہ تم (موت کے) وقت مقررہ تک پہنچ جاؤ۔
 ﴿أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ﴾ (۲۸-۲۸) ان دو
 معینہ مدتوں میں سے جوئی مدت میں پوری کر دوں۔
 محاورہ ہے دَيْنُهُ مُؤَجَّلٌ اس کے قرضہ وصول
 کرنے کے لیے ایک مدت معین ہے قَدْ أَجَلْتُهُ میں نے
 اس کے لیے مدت مقرر کر دی اور انسان کی زندگی کے لیے
 جو مدت مقرر ہوتی ہے، اسے بھی أَجَلٌ کہا جاتا ہے۔
 چنانچہ محاورہ ہے، دَنَا أَجَلُهُ یعنی اس کی موت کا وقت
 قریب آ پہنچا۔ اصل میں اس کے معنی مدت حیاة (زندگی)
 پورا کر لینا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿وَلَقَدْ أَجَلْنَا الَّذِي أَجَلْتُمْ لَنَا﴾ (۶-۱۲۹)

انہیں ادا کر دوں میں کتنا یہ عورتوں کے مہر کو اُجُورُ کہا گیا
 ہے پھر اُجْرٌ اور اُجْرَةٌ کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے
 جو کسی عہد و پیمان یا تقریباً اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا
 جائے۔ اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر
 رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے، جیسے فرمایا: ﴿لَهُمْ
 أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۲-۲۷) ان کو ان کے
 کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا۔ ﴿فَأَجْرُهُ عَلَى
 اللَّهِ﴾ (۳۲-۱۴۰) تو اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے۔

الْجَزَاءُ ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد کی وجہ
 سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں پر بولا جاتا ہے۔
 چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَزَاءُكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ جَنَّةٌ
 وَحَرِيرٌ﴾ (۶۶-۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان
 کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریں
 گے۔ ﴿فَجَزَاءٌ لَهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (۳-۹۳) اس کی سزا
 دوزخ ہے۔

محاورہ میں ہے اُجْرَ (ن) زَيْدٌ عمر آیا جُرْهُ
 اجراً کے معنی ہیں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی اور
 اجراً عمر زیداً کے معنی ہوں گے عمرو نے زید کو اجرت
 دی قرآن میں ہے:

﴿عَلَىٰ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِي حِجَابٍ﴾
 (۲۸-۷۲) کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت
 کرو۔ اور یہی معنی اُجْرَ (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس میں
 معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد (اُجْرْتُهُ) میں
 مشارکت کے معنی ملحوظ نہیں ہوتے ہاں مال کے لحاظ سے
 دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے۔ اُجْرَهُ اللَّهُ وَأَجْرَهُ

کہ ان کو طبعی موت آجاتی ہے۔ انہی دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ أَحْطَأَتْهُ سَهْمُ الرَّزِيَّةِ لَمْ تُحْطِئْهُ سَهْمُ الْمَنِيَّةِ﴾ اگر کوئی مصیبت کے تیر سے بچ بھی جائے تو موت کا تیر اس سے خطا نہیں کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ انسان کی اصل (یعنی موت) دو قسم پر ہے۔ بعض جوانی کی حالت میں (کسی حادثہ کی وجہ سے) مر جاتے ہیں اور بعض عمر کی اس انتہا کو پہنچ کر مرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی زندگی کی آخری حد مقرر کر رکھی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يَتَوَفَّى وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ آرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ (۲۲-۵) اور بعض (قبل از پیری) مر جاتے ہیں اور بعض (شیخ فانی ہو جاتے اور بڑھاپے کی نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور شاعر نے کہا ہے۔) (طویل)

(۸) رَأَيْتَ الْمَنِيَا خَبَطَ عَشْوَاءَ مِنْ نُصَبِ ثَمَّتُهُ.....

”موت اندھی اونٹنی کی طرح مجبوظ پھر رہی ہیں جس کو پہنچ جائیں اسے ختم کر ڈالتی ہیں۔“

اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے ﴿المنسرح﴾

اور (آخر) ہم اس وقت معین کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔

یہاں اجَل سے مراد حد موت ہے اور بعض نے بڑھاپے کی انتہا مراد لی ہے درحقیقت ان دونوں کا ایک مفہوم ہے (کیونکہ) جب انسان بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ جائے تو موت کے قریب ہو جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ﴾ (۲۶) میں اجل اول سے حیات دنیوی اور اجل ثانی سے بقاء اخروی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اوّل سے دنیا میں بقاء اور ثانی سے (برزخی زندگی مراد ہے جو) موت سے لے کر حشر تک کا زمانہ مراد ہے، یہ حسن سے مروی ہے۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾ (۳۹-۲۲) میں جو دو موتیں مذکور ہیں ان کی طرف اشارہ ہے یعنی اوّل اجل سے نیند اور ثانی سے موت مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں جگہ اجَل سے مراد موت ہی ہے لیکن بعض کی موت کسی حادثہ مثلاً قتل، آتش زدگی، غرق وغیرہ ناموافق اسباب کی وجہ سے جو اس کی زندگی کے خاتمہ کا باعث بنتے ہیں اور بعض ان حوادث سے محفوظ اور عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں حتیٰ

① اخرجه.

② زهير في معلقته وتكملته..... ومن تحطى يُعَمَّر فيهم راجع للبيت اللسان والمحکم (عشو، حبط) وديوانه ۲۹ وامالي المرتضى ۲۶۲: ۱ ومختار الشعر الجاهلي ۱: ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف ۳: ۳۲۹ والجمهرة (۱) والحيوان للمحافظ ۲: ۱۰۲ و ۶:

۵۰۹، والعقد الثمين ۹۶ وایام العرب ۲۷۶ وشرح المعلقات لابن الانباري ۲۸۸.

③ وتماه: للموت كأس والمرء ذائقها۔ البيت لامية بن ابي الصلت الجاهلي كما في المحکم واللسان (عبط) وراجع للبيت الكامل للمبرد ۶۶ وقال في ۲۹۷: قال ابو الحسن الاخفش الاصغر وصاعد اللغوي انه لرجل من الخوارج واخرى ان يكون هو الصواب راجع السمط للميمن والبيت ايضا في امالي المرتضى ۱- ۵۳۳، وعبون الاخبار ۲: ۳۷۴، والاغانى ۳: ۱۷۹ والقرطبي ۴: ۲۹۷، والعينى ۲: ۱۸۸ وديوانه رقم ۴۰ وذييل الامالي ۱۳۵- ۱۳۶ في ثلاثة وفيه لايد ذاتها والنقاظ ۷۳ والاديار للمؤلف ۴۸۸/۴ وفي اسد الغابة اتشدته الفادعة احت لامية بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم قصيدة لاجيه وفيها البيت.

(۲: ۲۳۳) میں بھی انقضاء عدت کی طرف اشارہ ہے یعنی اس وقت ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ﴾ (۲: ۲۳۳) ان پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ اپنے حق میں جو پسند کریں کر گزریں۔

احد

أَحَدٌ کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ کبھی صرف نفی میں اور کبھی صرف اثبات میں۔ نفی کی صورت میں ذوی العقول کے لیے آتا ہے اور استغراق جنس کے معنی دیتا ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر مجتمع ہو یا متفرق جیسے مَا فِي الدَّارِ أَحَدٌ (گھر میں کوئی بھی نہیں ہے) یعنی نہ ایک ہے اور نہ دو یا دو سے زیادہ نہ مجتمع اور نہ ہی متفرق طور پر اس معنی کی بنا پر کلام مثبت میں اس کا استعمال درست نہیں ہے کیونکہ دو متضاد چیزوں کی نفی تو صحیح ہو سکتی ہے لیکن دونوں کا اثبات نہیں ہوتا جب فی الدَّارِ وَاحِدٌ کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک اکیلے گھر میں ہونا تو ثابت ہوگا ہی مگر ساتھ ہی دو یا دو سے زیادہ کا بھی اجتماعاً و افتراقاً اثبات ہو جائے گا پھر احد کا لفظ چونکہ مَا فَوْقَ الْوَاحِدِ کی بھی نفی کرتا ہے اس لیے مَا مِنْ أَحَدٍ فَاضِلِينَ کہنا صحیح ہوگا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے ﴿فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ﴾ (۶۹: ۱۴۷) پھر تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوگا۔

کلام مثبت میں احد کا استعمال تین طرح پر ہوتا ہے، (۱) عشرات کے ساتھ ضم ہو کر جیسے أَحَدٌ عَشَرَ (گیارہ)

(۹) مَنْ لَمْ يَمُتْ عَبْطَةً يَمُتْ هَرْمًا ” جو شخص جوانی میں فوت نہ ہو آخر کار پیر فروت ہو کر مر جائے گا۔“

أَلْجَلُّ (دیر سے ہونے والا) یہ عَاجِلٌ کی ضد ہے اور ہر اس جنائیہ کو اَجَلٌ کہہ دیا جاتا ہے جس کے انجام بد کا جلد ہی اندیشہ نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہر اجل جنائیہ ہوتا ہے لیکن ہر جنائیہ اجل نہیں ہے محاورہ ہے:

فَعَلْتُ كَذَا مِنْ أَجَلِهِ میں نے فلاں کی وجہ سے یہ کام کیا۔ قرآن میں ہے: ﴿وَمَنْ أَجَلٌ ذَلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (۵-۳۲) اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا۔ یعنی اس قتل کے ارتکاب کی وجہ سے، ایک قراءت میں اَجَلٌ (بکسر الہزہ) ہے یعنی اس جرم کی وجہ سے۔

أَجَلٌ (ہاں بے شک) یہ حرف ایجاب ہے اور کسی خبر کی تصدیق کے لیے آتا ہے ﴿اور آیت کریمہ:

﴿إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَبِغْنَ أَجَلَهُنَّ﴾ اور جب تم عورتوں کو (دودفعہ) طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں..... نکاح میں رہنے دو۔ (۲-۲۳۱) میں بلوغ الاجل سے وہ مدت مراد ہے جو طلاق اور انقضاء عدت کے درمیان ہوتی ہے (نیز بلوغ اجل سے عدت کا ختم ہونا یا عدت کے ختم ہونے تک کی مدت کے قریب پہنچ جانا مراد ہے) اور آیت کریمہ: ﴿فَلَبِغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضَلُوهُنَّ﴾

① هذه قراءة ابي جعفر وحده راجع فتح القدير ۱: ۳۳ وشرح الدرر للحماد.

② وكذا جبروان راجع الرضی علی الكافیہ (۲: ۳۸۳) وابن يعیش (۷: ۱۲۴) وفيه الشواهد.

③ وابيضاً قال: وَمَا يَعْلَمَانِ مِنَ أَحَدٍ (۲: ۱۰۲).

لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعِنَا عِنْدَهُ﴾ (۷۹:۱۲) خدا پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا ہم کسی اور کو پکڑ لیں اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں، جیسے فرمایا: ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ (۲۲۵:۲) نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی ہے اور نہ ہی نیند۔

محاورہ ہے: أَخَذْتُهُ الْحُمَى (اسے بخار چڑھ گیا) قرآن میں ہے: ﴿وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ﴾ (۱۱۷:۱۱) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو چنگھاڑ (کی صورت میں عذاب) نے آ پکڑا۔

﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْأَخْزَةِ وَالْأُولَى﴾ (۲۵:۷۹) تو خدا نے اس کو دنیا اور آخرت (دونوں) کے عذاب میں پکڑ لیا۔

﴿وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ﴾ (۱۰۴:۱۱) اور تمہارا پروردگار (جب نافرمان) بستنیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اُس کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے۔ اور قیدی کو مآخوذ اور آخِذ کہا جاتا ہے اور اسی سے الْإِتْخَاذُ (اقتعال) ہے اور یہ دو مفہولوں کی طرف متعدی ہو کر جَعَلَ کے جاری مجری ہوتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ﴾ (۵۱:۵) یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ ﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ﴾ (۳:۳۹) جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔ ﴿فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سُخْرِيًّا﴾

أَحَدٌ وَعَشْرُونَ (اکیس) وغیرہ۔ (۲) مضاف یا مضاف الیہ ہو کر اس صورت میں یہ اول (یعنی پہلا) کے معنی میں ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿أَمَّا أَحَدُكُمْ فَسَيُنْفِئُ رَبُّهُ خَمْرًا﴾ (۲۱:۱۲) یعنی تم میں سے جو پہلا ہے وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا۔

يَوْمَ الْأَحَدِ ہفتے کا پہلا دن یعنی اتوار۔ (۳) مطلقاً بطور وصف استعمال ہو تو اس صورت میں یہ باری تعالیٰ کا وصف ہی ہوگا (اور اس کے معنی ہوں گے یکتا، یگانہ بے نظیر، بے مثل) جیسے فرمایا:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱:۱۱۲) کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ ہے، ایک ہے۔

أَحَدٌ اصل میں وَحَدٌ ہے لیکن وَحَدٌ کا لفظ غیر باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہے۔ چنانچہ نابغہ نے کہا ہے ﴿ع (بیض)

(۱۰) كَأَنَّ رَجُلِي وَقَدْ زَالَ النَّهَارُ بِنَا بَدَى الْجَبَلِ عَلَى مُسْتَأْنِسٍ وَحَدٍ دن ڈھلے وادی ذی الجبل میں میری اونٹنی کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جیسے میرا پالان بجائے اونٹنی کے اس گورخر پر کسا ہوا ہے جو تہما ہو اور انسان کی آہٹ پا کر ڈر کے مارے تیز بھاگ رہا ہو۔

اخذ

الْأَخْذُ کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا، جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ

① قاله السابعة يصف سرعة سيره والبيت في ديوانه وشرح العشر للثبريزي واللسان (انس- زول، وحد) وشواهد الكشاف (۳۴) وامالي الشحرية ۲: ۲۷۱ والمعاني الكبير للقبتي ۷۳۲ والخزانة البغدادية (۵۲۱:۱) ومختار الشعر الجاهلي (۷۵:۱) والمحاضرات للمؤلف (۶۶۳: ۴) والشطر الثاني في البلدان (اسم تحليل) وفي رواية اللسان والتمين ۶ يوم التحليل بدل بدى التحليل ومستوحس برل مستأنس.

جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي
الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ﴾ (۱۶:۱۱) وہ لوگ ہیں جن کے لیے
آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دَارُ کا لفظ کبھی الْآخِرَةَ کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس
کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَسَدَارُ
الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ﴾ اور یقیناً آخرت کا گھر
بہتر ہے ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔ (۳۲:۶)

﴿وَلَا جُرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾
(۳۱:۱۶) اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ اگر وہ اسے
جاننے ہوتے۔ یہ اصل میں وَلَا جُرُ دَارِ الْحَيَاةِ
الْآخِرَةِ ہے (اور دار کا لفظ الْحَيَاةِ الْآخِرَةِ کی طرف
مضاف ہے)

اور أُخْرُ (جمع الاخری) کا لفظ الْاُخْرُ (معروف باللام)
سے معدول ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں
ہے کیونکہ أَفْعَلُ مِنْ كَذَا (یعنی صیغہ تفضیل) کے ساتھ
اگر لفظ مِنْ لفظاً یا تقدیراً مذکور ہو تو نہ اس کا تشبیہ ہوتا اور نہ
جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اگر مِنْ مذکور نہ ہو تو

معرف باللام ہوتا ہے اور اس کا تشبیہ جمع دونوں آ سکتے
ہیں۔ ۱۰ لیکن لفظ اُخْرُ میں اس کے نظائر کے برعکس
الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو
معلوم ہوا کہ یہ الْاُخْرُ سے معدول ہے۔

الْتَّأَخِيرُ: یہ تقدیم کی ضد ہے (یعنی پیچھے کرنا
چھوڑنا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿بِمَا قَدَّمْ وَأَخَّرَ﴾ (۱۳:۷۵)
جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے۔

(۱۱۰:۲۳) تو تم نے اسے تسخر بنا لیا۔ ﴿أَأَنْتَ قُلْتَ
لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّي الْهَيْنَ﴾ (۱۱۶:۵) کیا تم
نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لو۔
اور آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ
بِظُلْمِهِمْ﴾ (۶۱:۱۶) میں صیغہ مفاعلہ لا کے معنی مجازات
اور مقابلہ پر تشبیہ کی ہے کہ جو انعامات خدا کی طرف سے
انہیں ملے ان کے مقابلہ میں انہوں نے شکر گزاری سے
کام نہیں لیا۔ فَلَانٌ مَا خُوذٌ وَبِهِ أَخْذَةٌ مِنَ الْجِنِّ
فلان جن کے اثرات میں گرفتار ہے۔ فَلَانٌ يَأْخُذُ
مَا أَخَذَ فَلَانٌ یعنی فلاں اس جیسا کام کرتا ہے یا اس
کے مسلک پر چلتا ہے اور اسی سے محاورہ ہے: ذَهَبُوا
وَمَنْ أَخَذَ أَخَذَهُمْ وَأَخَذَهُمْ وَهَؤُلَاءِ كَمَا هُمْ
مشر ب سب چلے گئے۔

رَجُلٌ أَخَذَ أَوْ بِهِ أَخْذٌ كُنْيَاةٌ وَه فَخْصٌ جَوْ شَوْبِ
چشم میں مبتلا ہو۔ الْإِخَاذَةُ وَالْإِخَاذُ وَه زَمِينٌ جَسَ كَوْنِي
فخص اپنے لیے خاص کر لے۔

اخر

اُخْرُ۔ اوّل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور
اُخْرُ (دوسرا) وَأَخِذٌ کے مقابلہ میں آتا ہے اور الدَّارُ
الْآخِرَةُ سے نثاءً ثانیہ مراد لی جاتی ہے، جس طرح کہ
الدَّارُ الدُّنْيَا سے نثاءً ثانیہ مراد لی جاتی ہے جس طرح
کہ ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (۶۳:۲۹)
ہمیشگی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے لیکن کبھی الدَّارُ
کا لفظ حذف کر کے صرف الْآخِرَةُ کا صیغہ استعمال کیا

۱۰ وفي القرآن او آخرون اعترفوا بذنوبهم (۱۰۵-۹) و آخر شيئاً (۱۰۵-۹) نیز فی الاخرین (۲۶-۴۳) الاستخار (استعمال) راجع
الایات (۱۰۵-۱۰۵) (۱۰۵)۔

﴿ اَيْحِبُّ أَحَدَكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا ﴾ (۱۳:۴۹) کیا تم میں سے کوئی ایسی بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

اور آیت کریمہ:

﴿ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ ﴾ (۱۱:۴) اگر میت کے بھائی بھی ہوں۔ میں اِخْوَةٌ کا لفظ بہن بھائی دونوں کو شامل ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مْتَقَابِلِينَ ﴾ (۴۷:۱۵) گویا بھائی بھائی مسہریوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں متنبہ کیا ہے کہ اہل جنت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا۔

الْأَخْتُ (بہن) یہ آخ کا مؤنث ہے اور اس میں تاء بمنزلہ عوض عن المحذوف کے ہے اور آیت کریمہ: ﴿ يَا أُخْتُ هُرُونٌ ﴾ (۲۸:۱۹) اے ہارون کی بہن میں بہن بلحاظ نسب مراد نہیں ہے بلکہ صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے مریم علیہا السلام کو اخت ہارون کہا گیا ہے۔ جس طرح کہ یَا أَخَاتِنِمْ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿ أَخَا عَادٍ ﴾ (۲۱:۴۶) میں ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان پر بھائیوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:

﴿ وَالسَّىٰ تَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ﴾ (۶۱:۱۱) اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔

﴿ وَالسَّىٰ عَادَ أَخَاهُمْ ﴾ (۵۰:۱۱) اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو بھیجا۔

﴿ وَالسَّىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ﴾ (۸۳:۱۱) اور مدین کی

﴿ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾ (۲:۴۸) تمہارے اگلے اور پچھے گناہ۔

﴿ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ﴾ (۳۳:۱۴) وہ ان کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جب

کہ (دہشت کے سبب) آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ ﴿ رَبَّنَا آخِرْنَا إِلَىٰ آجَلٍ قَرِيبٍ ﴾ (۴۳:۱۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مہلت عطا کر۔ محاورہ ہے: بِعْتَهُ

بِأَخِرَةٍ میں نے اسے تاخیر اجل کے ساتھ بیچ ڈالا یہ لفظ و

معنی نَظْرَةٍ کی طرح ہے اور أَبْعَدَ اللَّهُ الْآخِرَ میں الْآخِرَ کے معنی مُتَأَخَّرَ عَنِ الْفَضِيلَةِ او عَنْ تَحْرِي

الْحَقِّ کے ہیں یعنی اللہ فضیلت اور حق کی تحری میں کوتاہی کرنے والے کو ہلاک کرے یا اپنی رحمت کو دور رکھے۔

اخو

آخ (بھائی) اصل میں أَخُو ہے اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کا ولادت میں ماں باپ دونوں یا ان میں سے ایک کی طرف سے یا رضاعت میں شریک ہو وہ

اس کا آخ کہلاتا ہے لیکن بطور استعارہ اس کا استعمال عام ہے اور ہر اس شخص کو جو قبیلہ، دین و مذہب، صنعت و حرفت، دوستی یا کسی دیگر معاملہ میں دوسرے کا شریک ہو، اسے آخ

کہا جاتا ہے ﴿ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لَآخِرُؤَانِهِمْ ﴾ (۱۵۶:۳) ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کفر کرتے ہیں اور اپنے مسلمان

بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں۔ میں انہوں سے ان کے ہم مشرب لوگ مراد ہیں اور فرمایا: ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ (۱۰:۴۹) مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

الْأَدِيمُ شُورِ بَنَگَمَ اور اَدُّ (نام پدر قبیلہ) یا تُوْدُ سے مشتق ہے یا پھر اَدَّتِ النَّاقَةُ سے۔

ا د م

اَدْمٌ۔ ابوالبشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے کہ یہ اَدِيمٌ الْأَرْضِ سے مشتق ہے اور ان کا نام آدم علیہ السلام اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی اَدِيمِ اَرْضِ یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَدْمَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ آدم علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے، اس لیے انھیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رَجُلٌ اَدْمٌ کے معنی گندمی رنگ کے مرد کے ہیں۔ اور بعض نے آدم علیہ السلام کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ وہ مختلف عناصر اور متفرق قومی کے امتزاج سے پیدا کیے گئے تھے۔ جیسا کہ آیت ﴿ اَمْشَاجٍ بَتَّلِيْهِ ﴾ (۲: ۷۶) مخلوط عناصر سے..... کہ اسے آزماتے ہیں سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے جَعَلْتُ فُلَانًا اَدْمَةً اَهْلِيْ فِيْ فُلَانٍ کو اپنے اہل و عیال میں ملایا مخلوط کر لیا۔

بعض نے کہا ہے کہ آدم اِدَامٌ سے مشتق ہے اور اِدَامٌ (سائن و غیرہ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے طعام لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے پاکیزہ بنا دیا تھا جیسے کہ آیت ﴿ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُوْحِيْ ﴾ (۲: ۳۸) اور اس میں اپنی روح پھونک دی میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل و فہم اور فکر عطا کر کے دوسری مخلوق پر تفضیلت بھی دی ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَفَضَّلْنَا هُمْ عَلٰی كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (۱۷: ۱۷)

طرف ان کے بھائی (شعیب علیہ السلام) کو بھیجا۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا تُرِيْبُهُمْ مِّنْ اٰیةٍ اِلَّا هٰی اَكْبَرُ مِنْ اٰخِيْهَا ﴾ (۳۸: ۳۳) اور جو نشانی ہم ان کو دکھا دیتے تھے وہ اس کی بہن سے بڑی ہوتی تھی۔ میں اُخْتِهَا پہلی نشانی سے ہے اور اس کو اخت اس لیے کہا ہے کہ صحت و صداقت اور اظہار حق میں دونوں ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ كَلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَعَنَتْ اُخْتَهَا ﴾ (۳۸: ۷) جب ایک جماعت وہاں داخل ہوگی تو اپنی بہن پر لعنت کرے گی۔ میں اُخْتِهَا سے ان کے دیگر ہم شرب لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر ﴿ اَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ ﴾ (۲۵: ۲) ان کے دوست طاغوت ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر آیات میں پایا جاتا ہے۔

تَاَخِيْتُ کسی کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا اور چونکہ دو بھائی مل کر رہتے ہیں اس جہت سے اس مادہ میں لزوم اور وابستگی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اس کھونٹے کو اُخِيَّةُ الدَّابَّہِ کہہ دیتے ہیں جس سے جانور بندھا رہتا ہے۔

ا د د

قرآن پاک میں ہے: ﴿ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴾ (۸۹: ۱۹) یہ تو تم نازیب اور ناپسندیدہ بات زبان پر لائے ہو۔ اِدًّا کے معنی ہیں: نہایت ہی ناپسندیدہ بات جس سے ہنگامہ پھا ہو جائے گا۔ یہ اَدَّتِ النَّاقَةُ تُشَدُّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں اونٹنی (اپنے بچے کی جدائی میں) سخت روئی اور گر یہ کیا۔

اور ہم نے انھیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بنا پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں ﴿ ہے

(۸) لَوْ نَظَرْتِ إِلَيْهَا فَإِنَّهُ أَحْرَىٰ أَنْ يُؤَدِّمَ بَيْنَكُمَا. اگر تو اسے (اپنی مگتیر کو) ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگوار پیما ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔

ادی (و)

الْآدَاءُ کے معنی ہیں یکبارگی اور پورا پورا حق دے دینا۔ چنانچہ خراج اور جزیہ کے دے دینے اور امانت کے واپس کر دینے کو اداء کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِينَ الَّذِينَ أُؤْتِمِنَ أَمَانَتَهُ﴾ (۲۸۳:۲) تو امانت دار کو چاہیے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کرے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (۵۸:۴) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالہ کر دیا کرو۔

﴿وَأَدَّاءُ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ﴾ (۱۷۸:۲) اور پسندہ طریق سے خون بہا سے پورا پورا ادا کرنا۔ اصل میں یہ آدائے سے محاورہ ہے آدوت تَفَعَّلَ كَذَا کسی کام کے لیے جیلہ اور تدبیر کرنا اصل میں اس کے معنی ادا (کسی چیز) کو پکڑنے

اذا

إِذَا (ظرف زمان) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے ﴿ کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے ﴿ اور یہ عام طور پر نظم میں آتا ہے اور اذ (ظرف) ماضی کے لیے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اذمًا) تو معنی شرط کو مضمّن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿

(۱۱) إِذَا مَا آتَيْتَ عَلَى الرَّسُولِ فَقُلْ لَهُ.

جب تو رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

اذن

الْأُذُنُ کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو أُذُنُ الْقَدْرِ کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر أُذُنُ كَالْفَلْجِ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ. قُلْ أُذُنٌ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

(۶۱:۹) اور کہتے ہیں یہ شخص نرا کان ہے ان سے کہہ دو کہ وہ کان ہے تو تمہاری بھلائی کے لیے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَفِي أَذَانِهِمْ وَقَرَأَ﴾ (۲۵:۵۶) اور ان کے

① لفظ حدیث من روایة ابی عبیدنی غریبہ والذی فی الترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن شیبہ وابن ابی حبان والحاکم واحمد والبخاری وغیرہم فی حدیث المغیرة انه خطب امرأة فقال له صلى الله عليه وسلم انظر اليها الخ (راجع تخریج الکشاف للحافظ ص ۱۳۱ رقم: ح ۸۹) والفائق ۱۱/۱ والمنتقى بشرحه النيل (۶: ۱۰۶-۱۰۷) والاحیاء بتخریج العراقی ۳۹/۲ واللسان (ادم) قال الرمحصری فی الحدیث ابو معنی لیت فان الغرض منه الحث علی النظر ومثله قولهم لوتاتینی فتحدثنی ۱۲.

② وايضاً الاطلاق كما في التنزيل اذ ادلى عباد الله (۱۸-۴۴) ۱۲.

③ وان دخل على الماضي نحو اذا جاء نصر الله (۱/۱۱۰).

④ وتارة تدل على معنى الفجأة نحو اذا هي حية تسعني (۲۰-۲۱). قاله العباس بن مرداس يمدح النبي صلى الله عليه وسلم وتماهه حفصاً عليك اذا طمان المجلس والبيت في السيرة (۴: ۱۹۷) والكامل ۲۴۹ والكتاب السبويه (۱: ۴۳۲) قال الشنتمري والبيت مضمّن وتماهه فيما بعده والبيت ايضاً في الصحاح (اذا) وفي رواية الامير بدل الرسول وهو محرف وفي اللسان "الامين".

الْأَذْنَ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں یہ بتا دینا کہ کسی چیز میں اجازت اور رخصت ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (۶۳:۴) اور ہم نے پیغمبر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ میں اذن بمعنی ارادہ اور حکم ہے (اسی طرح فرمایا):

﴿ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّتَمَّى الْجَمْعَانَ فَبِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (۱۶۶:۳) اور جو مسیت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلے کے دن واقع ہوئی سو خدا کے حکم سے واقع ہوئی۔

﴿ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (۱۰۲:۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ﴿ وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (۱۰:۵۸) مگر خدا کے حکم کے سوا انھیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم الہی کے ہیں مگر اذن اور علم میں فرق ہے کیونکہ اذن کا لفظ خاص ہے اور اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں علم کے ساتھ مشیت بھی شامل ہو عام اس سے کہ وہ فعل پسندیدہ ہو یا پسندیدہ نہ ہو۔ لیکن علم میں مشیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُوْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (۱۰۰:۱۰) ”حالانکہ کسی شخص کو قدرت نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایمان لائے۔“

میں ظاہر ہے کہ اللہ کی مشیت اور اس کا امر دونوں پائے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾

﴿ وَالْأَذْنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (۲۷:۲۲) اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کر دو۔

﴿ وَالْأَذْنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (۲۷:۲۲) اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کر دو۔

کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہو گئے ہیں بلکہ اس سے ان کی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اور اذْن (الیہ) کے معنی توجہ سے سنا کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿ وَأَذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴾ (۵:۸۳) اور وہ اپنے پروردگار کا فرمان سنے گی اور اُسے واجب بھی ہے اور اذْن کا لفظ اس علم پر بھی بولا جاتا ہے جو سماع سے حاصل ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿ فَأَذْنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴾ (۲۷:۲) تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور رسول سے تمہاری جنگ ہے۔ اور اذْن و اذْن ہر سنی ہوئی بات کو کہتے ہیں اور ان سے علم مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا اکثر علم مسوعات پر مبنی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ ائذْنِ لِي وَلَا تَغْتَبِنِي ﴾ (۳۹:۹) مجھے اجازت دے دیجیے اور آفت میں نہ ڈالے۔

﴿ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ ﴾ (۱۶۷:۷) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا۔ اذْنَتْهُ بَكْدًا وَاذْنَتْهُ کے ایک معنی ہیں یعنی اطلاع دینا اور اعلان کرنا اور اعلان کرنے والے کو مُؤذِّن کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ ثُمَّ أَدَّ مَوْذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيسَىٰ ﴾ (۷۰:۱۲) تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو۔

﴿ فَأَذَّنَ مُؤذِّنٌ بَيْنَهُمْ ﴾ (۴۳:۷) (تو اس وقت) ان میں سے ایک پکارنے والا پکار دے گا۔

﴿ وَالْأَذْنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (۲۷:۲۲) اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کر دو۔

﴿ وَالْأَذْنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾ (۲۷:۲۲) اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کر دو۔

کے بعد آئے یا اس کے بعد فعل مضارع ہی نہ ہو تو عمل نہیں کرتا ﴿جیسے آنا اَخْرَجُ اِذْنُ قرآن میں ہے: ﴿اِنَّكُمْ اِذَا مِتْلَهُمْ﴾ (۱۳۰:۴) ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔

اذی

الْاَذَىٰ ہر اس ضرر کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو پہنچتا ہے ﴿وہ ضرر جسمانی ہو یا نفسانی یا اس کے متعلق سے ہو اور پھر وہ ضرور دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا تَبْطَلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذَىٰ﴾ (۲۶۳:۲) اپنے صدقات (و خیرات) کو احسان جتا کر اور ایزادے کر بر باد نہ کرو۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَاذُوْهُمَا﴾ (۱۶:۴) میں مار پائی (سزا) کی طرف اشارہ ہے اسی طرح سورۃ توبہ میں فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ الَّذِيْنَ يُوْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُولُوْنَ هُوَ اذُنٌ﴾ (۶۱:۹) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے۔ ﴿وَالَّذِيْنَ يُوْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (۶۱:۹) اور جو لوگ رسول خدا کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لیے عذاب الیم (تیار) ہے۔ ﴿لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اَذُوْا مُوسٰى﴾ (۶۹:۳۳) تم ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے موسیٰ کو تکلیف دی (عیب لگا کر) رنج پہنچایا۔ ﴿وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتَاهُمْ نَصْرُنَا﴾ (۳۳:۶) اور ایذا (پر صبر کرتے رہے) یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔

(۱۰۲:۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ میں مشیت من وجہ پائی جاتی ہے، کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طبعی طور پر ایسا بنایا ہے کہ دوسرے کی ضرب سے متاثر ہو اور اسے اس سے گزند پہنچے۔ وہ پتھر کی طرح نہیں ہے کہ کسی قسم کی ضرب سے اسے تکلیف نہ ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان میں اس قسم کی قوت کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہے۔ اس اعتبار سے جب کسی شخص کو ظالم کے ظلم سے تکلیف پہنچتی ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ کے اذن اور مشیت سے ہی پہنچی ہے۔ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے دوسری کتاب درکار ہے۔

اَلَا سَيَسْتَدَانُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴿ (۳۵:۹) اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

﴿فَاِذَا اسْتَاذَنُوْكَ﴾ (۶۲:۲۳) سو جب یہ لوگ تم سے (کسی کام کے لیے) اجازت مانگا کریں۔

اِذْنٌ۔ یہ جواب اور جزا کے لیے آتا ہے یعنی لفظاً یا تقدیراً جواب کو چاہتا ہے اور اس کے بعد کلام جزا کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔ جب یہ شروع کلام میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو تمہا اس کو نصب دے گا۔ اِذْنٌ اَخْرَجَ لیکن جب اثنائے کلام میں آئے اور پھر اس کے بعد فعل مضارع ہو تو فعل مضارع پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں جیسے اِنَّا اِذْنُ اَخْرَجُ وَاَخْرَجُ مگر جب فعل

① راجع للتفصیل الرضی علی الکافیة ۲۳۰/۲-۲۳۶.

② وفی حدیث شعب الایمان وادانها ماطة الاذی عن الطریق وفی العقیقة امیطو عنه الاذی ۱۲.

کی خواہش نہ رکھیں۔ میں ازبیت سے بطور کنایہ حاجت نکاح مراد ہے۔

الْأَرْبُی: بڑی مصیبت جس کے دور کرنے کے لیے تدبیر اور حیلہ کرنا پڑے۔

الْأَرْابُ (واحد ارب) وہ اعضاء جن کی انسان کو سخت ضرورت رہتی ہے کیونکہ اعضاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کے ذریعہ ہر جاندار چیز اپنی ضروریات پورا کرتی ہے جیسے ہاتھ پاؤں اور آنکھ اور دوسرے وہ جو محض زینت کے لیے بنائے گئے ہیں جیسے بھویں، داڑھی وغیرہ پھر وہ اعضاء جو حوائج کو پورا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں دو قسم پر ہیں

ایک وہ جن کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور دوسرے وہ ہیں جن کی سخت احتیاج رہتی ہے اور ان کے بغیر جسم انسانی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس دوسری قسم کے اعضاء کو

أَرْابُ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے ﴿ (۹) إِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَهُ سَبْعَةُ أَرْابٍ ﴾ کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اُس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کرتے ہیں، چہرہ، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے اور دو پاؤں اور جب کوئی شخص اپنی ضرورت کے مطابق (وافر) حصہ لے تو کہا جاتا ہے اَرْابُ نَصِيْبُهُ اَسْ نَبِيْبُهُ اور وافر۔ اسی سے

محاورہ ہے: اَرْابُ مَالُهُ اَسْ نَبِيْبُهُ اس نے اپنا مال بڑھالیا اَرْابُ الْعُقْدَةِ میں نے مضبوط گرہ لگائی۔

ارض

الْأَرْضُ: (زمین، سَمَاءُ: (آسمان) کے بالقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع اَرْضُونَ ہے۔

﴿ لِمَ تُوذُّونِي ﴾ (۵:۶۱) تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو؟

اور آیت کریمہ: ﴿ وَيَسْتَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذَى ﴾ (۲۲۲:۲) میں حیض (کے دنوں میں عورت سے جماع کرنے) کو اَذَى کہنا یا تو از روئے شریعت ہے

یا پھر بلحاظ علم طب کے جیسا کہ اس فن کے ماہرین بیان کرتے ہیں۔ اَذِيْتُهُ (افعال) اِيْذَاءٌ وَاذِيْتُهُ وَاذَى کسی کو تکلیف دینا۔

الْأَذَى: موج جو بحری مسافروں کے لیے تکلیف دہ ہو۔

ارب

الْأَرْبُ کے معنی سخت احتیاج کے ہیں جسے دور کرنے کے لیے حیلہ اور تدبیر کرنی پڑے پس اَرْبُ خاص اور حَاجَةٌ عام ہے پھر کبھی اَرْبُ کا لفظ صرف حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی محض حیلہ اور تدبیر کرنے کے لیے آتا ہے گو حاجت نہ ہو۔ مثلاً محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ذُو اَرْبٍ وَاَرْيَبُ اِفْلَاں صاحب حیلہ اور چالاک ہے۔

اَرْبُ اِلَى كَذَا، اَرْبًا وَاَرْبَةً وَاَرْبَةً وَاَرْبَةً کے معنی ہیں وہ کسی چیز کا سخت محتاج ہو۔ (مَآرِبَةٌ سخت حاجت مَآرِبُ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وِلَى فِيهَا مَآرِبٌ اٰخِرٰى ﴾ (۱۸:۲۰) اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں۔

وَلَا اَرْبَ لِيْ فِيْ كَذَا: مجھے اس کی کوئی شدید ضرورت نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ غَيْرِ اَوْلٰى الْاَرْضِيَّةِ مِنَ السَّرِّجَالِ ﴾ (۲۱:۲۳) نیز وہ خدمت گزار مرد جو غورتوں

① رواه الاربعة من حديث ابن عباس ؓ وفي الصحيحين عنه امرت ان اسجد على سبعة اعظم وفي لفظ "اعضاء" وفي ابى داؤد ايضا امرنيكم راجع تخريج الكشاف للحافظ ابن حجر ۱۷۸ رقم: ۲۳۲. والفيل ۲: ۲۶۷. والبعون باب اعضاء السجود ۱۲.

تحت کے اوپر رکھا ہو اس کی جمع آرائٹ ہے اور اسے آریگتہ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ارض یعنی دنیا میں اراک، (پیلو کی لکڑی) سے بنایا جاتا ہے جو ایک قسم کا درخت ہے اور یہ آراک بالمکان آروکاسے مشتق ہے جس کے اصل معنی کسی جگہ پر آراک (یعنی پیلو) کے پتے چرنے کے لیے ٹھہرنا کے ہیں پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ (اس لیے جنت کے چھپر کھٹوں کو جواہل جنت کی اقامت گاہ ہوں گے۔ ﴿آرائٹ﴾ (۲۱:۱۸) کہا گیا ہے۔

ارم

الارم۔ دراصل اس نشان کو کہتے ہیں جو پتھروں سے بنا دیا جاتا ہے اس کی جمع ارام ہے اور پتھروں کو ارم کہا جاتا ہے اور اسی سے غضب ناک آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ يَحْرِقُ الْاَرَمَ یعنی فلاں مارے غصے کے دانت پیتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اَرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ (۶:۸۹) ارم ستونوں والے۔ میں ارم سے بلند اور مزین ستون مراد ہیں (جو قوم عادی نے بنائے تھے) مَا يَهَا اَرَمٌ وَاَرْنِمٌ یعنی اس میں کوئی نہیں اصل میں اس کے معنی اللَّزِمُ لِلْاَرَمِ کے ہیں اور اس کا استعمال ہمیشہ (حرف) نفی کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح کہ مَا يَهَا دِيَارٌ کا محاورہ ہے اور اس کے اصل معنی مقیم فی الدار کے ہیں۔

جس کا صیغہ قرآن پاک میں نہیں ہے۔ کبھی اَرْض کا لفظ بول کر کسی چیز کا بیچہ کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح ساء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔ شاعر نے گھوڑی کے وصف میں کہا ہے ﴿(طویل)

(۱۲) وَأَحْمَرٌ كَالدِّيَابِجِ أَمَا سَمَاؤُهَا
فَرِيًّا وَأَمَا أَرْضُهَا فَمَحُولٌ
وہ دیبا کی طرح سرخ ہے اس کا اوپر کا حصہ موناگداز ہے لیکن اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں وغیرہ) خشک اور سخت ہے اور آیت کریمہ: ﴿إِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحِي
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ (۱۷:۵۷)

میں فساد کے بعد ٹکویں اور بدء کے بعد عود کی طرف اشارہ ہے وہ نظام جو عالم میں جاری و ساری ہے اسی بنا پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے دلوں کو ان کے سخت ہونے کے بعد نرم کرنا مراد ہے۔ محاورہ ہے: اَرْضُ اَرِيضَةٌ زرنیز زمین تَارَضُ السَّبْتِ نباتات زمین پر جم گئی اور زیادہ ہو گئی تَارَضُ الْجَدْيِ بکری کے بچہ نے گھاس کھائی اور اَرْضَةٌ کے معنی دیمک کے ہیں اور اَرْضَتْ الْحَشْبَةُ کے معنی ہیں لکڑی دیمک خوردہ ہو گئی اور دیمک خوردہ لکڑی کو مَارُ وِضَةٌ کہا جاتا ہے۔

ارک

الآریگتہ (مسہری) جملہ (چھپر کھٹ) جو سریر یعنی

① البيت لطيف الغنوى وفى اللسان (ارض) وسماءه بالتذكير ايضا راجع الاقتضاب ۳۳۵ وتهذيب الاصلاح (۴۰:۱) والعقد (۱۸۵:۱) ومعانى السكرى ۲: ۱۰۶) والسمط (۲: ۸۸۱) والقالى ۲: ۲۴۸) والمعانى للقبتي (۱: ۱۰۵) قال وسماء القمرس ماكان من عجب الذنب الى العذر وارضه قوائمه وارض الفرس فى غير هذاالمواضع حوافره والبيت فى ديوانه ۶۲ (ملحقاته) وقانون البلاغه ضمن رسائل البلاغه (صنعة كرد على) وامالى المرتضى (۲: ۱۶۹) وفيه كالدنيا بدل كالدبياج وهو احسن.

اور تم ان کی پوشاک ہو۔

الْأَزْرُ کے معنی قوت شدیدہ کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿أَشْدُّ بِهِ أَزْرِي﴾ (۳۱:۲۰) اس سے میری قوت کو مضبوط فرما یعنی مجھے اس سے تقویت حاصل ہوگی۔

أَزْرَةٌ - اعانت کرنا اور تقویت بخشنا۔ اصل میں یہ شَدُّ الْأَزَارِ سے ہے جس کے معنی ہیں چادر باندھنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَزْرَعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ﴾ (۲۹:۲۸) وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے) زمین سے اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا۔ محاورہ ہے:

أَزْرَتْهُ فَتَأَزَّرَ میں نے اسے تہبند پہنائی تو اس نے پہن لی۔ أَزْرَتْ الْبِنَاءَ وَأَزْرَتْهُ میں نے عمارت کی بنیاد کو مضبوط کیا تَأَزَّرَ النَّبَاتِ نبات بڑھی گئی اور مضبوط ہو گئی أَزْرَتْهُ وَاوَزْرَتْهُ میں اس کا وزیر بن گیا اصل میں یہ مثال واوی (وزر) سے ہے (جس کے معنی دوسرے کا بوجھ اٹھانا کے ہیں)

فَرَسٌ أَزْرٌ گھوڑا جس کی ٹانگیں محل ازار تک سفید ہوں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ أَسْرِبْ﴾ (۳۷:۶) اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تاریخ تھا اور آزر اسی کا معرب ہے اور بعض نے کہا کہ (یہ لقب ہے

ازر

آیت کریمہ: ﴿تَوَزَّؤْهُمْ أَزًّا﴾ (۸۳:۱۹) کے معنی ہیں کہ وہ ان کو برا بیچتے کرتے رہتے ہیں یہ آزِتِ الْفُؤْدِ سے ہے جس کے معنی ہیں: ہنڈیا میں جوش اور ابال آ گیا (اسی مناسبت سے ورغلانا یا ابھارنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) ایک روایت میں ہے:

(۷) أَنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كَانَ يُصَلِّي وَيَلْبَسُ أَزِيْزًا كَأَزِيْرِ الْمَرْجَلِ كَمَا نَحَضَرْتُمْ نَمَازٍ پڑھتے تو آپ کے اندرون سے ہنڈیا کے کھدکھانے کی (طرح رونے کی) آواز آتی۔ آزَةٌ اس کو بھڑکایا اور جھنجھوڑا۔ یہ ہڈی سے بلغ ہے۔

ازر

اصل میں ازر اور ازار کے معنی لباس (یعنی تہبند) کے ہیں ازار ازارَةٌ وَمَسْدَرَةٌ تینوں ہم معنی ہیں کنا یہ کے طور پر ازار سے عورت مراد لی جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۰ ع

(۱۳) أَلَا أَبْلُغُ أَبَا حَفْصٍ رَسُولًا

فِدَى لَكَ مِنْ أَخِي ثِقَّةً آزَارِي

ابو حفص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو میرا پیغام پہنچا دو تجھ جیسے قابل اعتماد بھائی پر میری بیوی قربان ہو۔

اور عورت کو ازار اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مرد کے لیے بمنزلہ لباس کے ہے، جیسے فرمایا: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ﴾ (۱۸:۲) وہ تمہاری پوشاک ہیں

① قاله ابو المنهال قبلة الاكبر الاشعري في قصيدة ۱۴ الى عمر عرض فيها بجملة بن عبد الله السلمي والى الكوفة والبيت القصة فى اللسان (ازر) فى ستة ابيات والموتلف للامدى ۸۲ فى خمسة ابيات وابواب مختارة او العقد الفريد (۶۳: ۲) والفايق (۱۷: ۱) والعملية (۳۱۲: ۱) فى اربعة والمشكل للقتبي ۱۰۸، ۲۰۰ فى خمسة ابيات ومجازات القرآن للشريف الرضى ۳۵۳ والاصابة ۲۸۸، ۷۲۱، رقم وكنا لعمال برواية ابن سيرين: ج ۵ رقم ۱۸۴۶ وفى الصناعتين غير منسوب ۱۲.

اَسَارِي وَاَسَارِي وَاَسْرِي ہے اور مجازاً۔ اَنَا اَسِيرٌ نِعْمَتِكَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی تیرے احسان کی رسی میں بندھا ہوا ہوں۔ اور اَسْرَةُ الرَّجُلِ کے معنی افراد خاندان کے ہیں جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ: وَشَدَدْنَا اَسْرَهُمْ (۲۷:۷۶) اور ان کی بندش کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ میں اس حکمت الہی کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی ہیبت ترکیبی میں پائی جاتی ہے جس پر کہ آیت وَفِي اَنْفُسِكُمْ اَفْلا تَبْصُرُونَ (۲۱:۵۱) میں غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اَلْاَسْرُ کے معنی ہیں: پیشاب بند ہو جانا۔ اور جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو اسے مَاسُورٌ کہا جاتا ہے گویا اس کی پیشاب کی نالی بند کر دی گئی ہے اس کے مقابلہ میں پاخانہ کی بندش پر حُصْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس اس

﴿اَسَّسَ بُنْيَانَهُ﴾ (۱۰۹:۹) کے معنی ہیں: اس نے عمارت کی بنیاد رکھی اور بنیاد کو اُسُّ وَاَسَّسٌ کہا جاتا ہے۔ اُسُّ کی جمع اَسَّاسٌ اور اَسَّاسٌ کی جمع اُسَّسٌ آتی ہے محاورہ ہے: كَمَا كَانَ ذَلِكَ عَلَى اَسِّ الدَّهْرِ (واست الدھر) (بود آں بر بھنگی زمانہ واول آن) یعنی وہ قدیم زمانہ سے ہے جیسا کہ عَلَى وَجْهِ الدَّهْرِ کا محاورہ مشہور ہے۔

اس ف

اَلْاَسْفُ: حزن اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کبھی اَسْفُ کا لفظ حزن اور غضب میں سے ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔ اصل میں اس کے معنی جذبہ:

اور ان کی زبان میں اَزَّرٌ کے معنی گمراہ کے ہیں۔

از ف

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَزَفَتِ الْاَزِفَةُ﴾ (۵۷:۵۳) یعنی قیامت قریب آچکی اَزِفٌ وَاَفَدٌ دونوں قریب المعنی ہیں قیامت کو اَزَفٌ کہنا بلحاظ ضیق وقت کے ہے جیسے کہا جاتا ہے اَزَفَ الشُّحُوصُ (کا وقت قریب آچکا) اور اَزَفٌ کے معنی ضیق وقت کے ہیں اور قیامت کو اَزِفَةٌ کہنا اس کے قرب وقت کے اعتبار سے ہے اور اسی بنا پر اس کو سَاعَةٌ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور نیز آیت کریمہ:

﴿اَتَى اَمْرُ اللّٰهِ﴾ (۱:۱۶) خدا کا حکم (یعنی

عذاب گویا) آہی پہنچا۔

میں قیامت کو لفظ ماضی کے ساتھ تعبیر کیا ہے نیز فرمایا: وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاَزِفَةِ (۸:۴) اور ان کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ۔

اس ر

اَلْاَسْرُ کے معنی قید میں جکڑ لینے کے ہیں۔ یہ اَسْرَتُ الْقَتَبِ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: میں نے پالان کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قیدی کو اَسْرَاسی لیے کہتے ہیں کہ وہ رسی وغیرہ سے باندھا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

يَتِيمًا وَاَسِيرًا (۱۷:۷۶) اور یتیموں اور قیدیوں کو۔ پھر ہر اس شخص کو جو گرفتار اور مقید ہو کر آئے الا سیر کہہ دیا جاتا ہے گو وہ باندھا ہوا نہ ہو اَسِيرٌ کی جمع

۱ قرآن پاک میں ہے وَاِنْ يَأْتُوْكُمْ اَسَارِي (۵۸:۲) وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّحْكُونَ لَهُ اَسْرِي (۸:۶۶)۔

فَقَدْ بَارَزْنِي بِالسَّحَابَةِ یعنی جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ جنگ کی۔ اور قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۸۰:۴) جو شخص رسول ﷺ کی فرمائندگی کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمائندگی کی۔ اور آیت کریمہ: ﴿عُضْبَانَ أَسِيفًا﴾ (۱۵۰:۷) میں اَسِيفُ کے معنی بھی غضب ناک ہی کے ہیں اور استعارہ کے طور پر ماتحت غلام کو نیز جس کا (بوجہ کراہت کے) نام لینا پسند نہ ہو اسے اَسِيفُ (بچارہ) کہہ دیا جاتا ہے۔ ❶

اسن

أَسْنَ (يُ) أَسْنًا پانی کا سخت بدبودار ہو جانا ماءً اَسِينٌ متغیر اور بدبودار پانی۔ چنانچہ فرمایا: مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ اَسِينٍ (۱۵:۴) اس پانی کی (نہریں ہیں) جو کبھی بدبودار نہیں ہوگا۔

أَسْنَ الرَّجُلُ پانی کی بدبو سے بیمار اور بیہوش ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۱۵) يَجْمِدُ فِي الرَّمْحِ مَيْدَ الْمَائِحِ الْأَسِينِ۔

نیزے پر اس طرح ترپتا ہے جیسے کنویں پر اترنے والا بیہوش آدمی ترپ رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے

انتقام سے ذم قلب کے جوش مارنا کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منتبض ہو کر حزن بن جاتی ہے۔ اس لیے جب حضرت ابن عباسؓ سے حزن اور غضب کی حقیقت دریافت کی گئی تو انھوں نے فرمایا: لفظ دو ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے کمزور کے ساتھ جھگڑتا ہے تو غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے اور جب اپنے سے قوی کے ساتھ جھگڑتا ہے تو اوپلا اور غم کا اظہار کرتا ہے اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے ❶ ع البسيط

(۱۳) فَحَزْنٌ كُلُّ أَحْيٍ حُزْنٌ أَحْوَالِ الْغَضَبِ کہ ہر غمزدہ کا حزن غضب کا ساتھی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَلَمَّا أَسْفُونَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ (۵۵:۴۳) کے معنی یہ ہیں کہ جب انھوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ یہاں ابو عبد اللہ الرضا کا قول ہے کہ اللہ میاں ہماری طرح خفا نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خفا ہونے سے اس کے اولیاء کا خفا ہونا مراد ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کے معنی اس کے اولیاء کے راضی ہونے کے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے: (۱) مَنْ أَهَانَ لِيْ وَلِيًّا

❶ و صدره جزاك ربك ساجداً مغفرة..... قاله المتنبى في رثاء احدث سيف الدولة في (۴۴) بيتاً مطلعها يا لحدث خيراخ يا بنت خيراخ كناية بهما عن اشرف النسب راجع ديوانه ۳۲۹ طبقة طبعة مصر ۱۳۴۲ء وبشرح العكبري (۱: ۹۴) والشطر ايضافي محاضرات المؤلف (۴: ۵۰۶ و ۲۲۳)، اصله في الصحيحين وراوه ابن ابى الدنيا في كتاب الاولياء والحكيم الترمذى في جامعه وابن مردويه حل في الاسماء وابن عساکر عنها انس انظر للحديث باختلاف الفاظه كتر العمال (ج: ۱) رقم ۱۱۵۶ و ۱۱۶۱ و ۱۱۶۲ (۱۲)۔

❷ ايضاً اَسْفَى وفي القرآن يَأْسِفُنِي عَلَيَّ يُؤْسَفُ (۲: ۱۴) ايضاً رجل اسيف اى سريع الحزن والبكاء كما في حديث عائشة: ان ابا بكر رجل اسيف راجع الفائق: ۱۹/۱۔

❸ قاله زهير السلمي و صدره = وقد اترك القرن مصفراً انامله..... وفي رواية اللسان (اسن) يغادر بدل اترك وهو الصواب لانه من صفة الممدوح اى ابن سنان راجع للبيت ملحقات ديوانه ۱۹۴ والعقد الثمين والمختارات ۵۲ والسبط (۱: ۱۹۹) والبحر (۷: ۷۰) والطبرسي (۲۶-۳۳) وفي رواية التارك القرن مصفراً انامله ويميل بدل يميد۔

طور تَأَسَّنَ الرَّجُلُ محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بیمار پڑنے کے ہیں۔

اس و

الْأُسْوَةُ وَالْإِسْوَةُ (فُدْوَةٌ أَوْ قُدْوَةٌ كِطْرَح) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری، سرور بخش ہو یا تکلیف دہ۔ اسی لیے آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (۲۱:۲۲) تمہارے لیے پیغمبر خدا میں اچھا اسوہ ہے۔ میں أُسْوَةٌ کی صفت حَسَنَةٌ لائی گئی ہے۔^۱

تَأَسَّيْتُ بِهِ: میں نے اس کی اقتداء کی۔

الْأَسَى: بمعنی حزن آتا ہے اصل میں اس کے معنی کسی فوت شدہ چیز پر غم کھانا ہوتے ہیں۔

أَسَيْتُ عَلَيْهِ أَسَى وَأَسَيْتُ لَهُ: کسی چیز پر غم کھانا قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (۶۸:۵) تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔

شاعر نے کہا ہے: ۵

(۱۶) أَسَيْتُ لِأَخْوَالِي رَبِيعَهُ.

میں نے اپنے احوال بنی ربیعہ پر افسوس کیا۔

یہ اصل میں (ناقص) واوی سے ہے کیونکہ محاورہ میں غمگین آدمی کو أَسْوَانٌ (بالفتح) کہا جاتا ہے۔ أَلَسْوُ کے معنی

زخم کا علاج کرنے کے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی ازالہ غم کے ہیں اور یہ كَرَبْتُ النَّخْلَ کی طرح ہے جس کے معنی: کھجور کے درخت کی شاخوں کی جڑوں کو دور کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے أَسْوَتْهُ: أَسْوَتْهُ أَسْوَا (ازباب نصر) یعنی میں نے اس کا غم دور کیا اس کو تسلی دی۔

الْأَسَى: صالح۔ مرہم پٹی کرنے والا۔ اس کی جمع اَسَاءٌ وَأَسَاءَةٌ ہے اور رُحَى آدی کو مَأْسِيٌّ وَأَسِيٌّ کہا جاتا ہے۔ أَسَيْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ: باہم صلح کرانا۔ أَسَيْتُهُ (مفاعد) کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ (مال وغیرہ کے ذریعہ)۔ شاعر نے کہا ہے ۵

ع

(۱۷) أَسَىٰ أَخَاهُ بِنَفْسِهِ (طویل)

جس نے خود کو اپنے بھائی پر شاکر کر دیا ہو۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ۵

(۱۸) فَأَسَىٰ وَأَدَاهُ فَكَانَ كَمَنْ جُنِي

اس نے ہمدردی کی اور سامان حرب دیا تو گویا اس نے

۱ نیز فرمایا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (۴: ۶۰)۔

۲ قطعة من البيت قاله البحري في قصيدة له في ۴۵ بيتا يمدح المتوكل ويذكر صلح بني تغلب وتماحه ان عفت مصانيفها واقوت ربوعها والبيت في الحصرى (۱: ۱۱۱) وفي رواية ديوانه ۱۲۹۸ بشرح حسن كامل صبر في - اذا عفت بدل ان عفت ومصانيفها بدل مصانيفها.

۳ قطعة من البيت من قصيدة جمهورية في ۲۵ بيتاً قالها دريد بن الصمة احد بن بكر بن جشم في رثاء اخيه عبدالله وتكلمته: قتال امرء أسى اخاه بنفسه ويعلم ان امرء غير مخلد - والبيت في الحمرة ۲/۲ والشطر الثاني في اشعار حطيفة (العمدة لابن رشيق ۱۳۷: ۲) وديدها شاعر شعاع فارس قتل يوم حنين مع المشركين (بنی هوازك) راجع المعمرين ۲۱-۲۲ والاستقائى ۱۷۷-۱۷۸ والاغانى ۹۰۲/۹ واللالى ۳۹-۴۰ والموتلف والخرزانه ۴: ۴۴۲-۴۴۷/۱۳: ۴۶۱-۴۶۲ والسيرة ۸۴۱-۸۴۲ (جوتنجن) والشعراء ۷۵-۷۶.

۴ قاله سويد المرتد الحارثى وصدرة: ولم يحنها ولكن حناها وليها - وفي البيت آواه (بالمهمله) من الاداة اى عدة الحرب آواه اصله اعده بالعين فابدل لت همزة (راجع المرزوقى ص ۸۱۷-رقم ۲۷۱، والكامل ۲۰۲ في ابیات والعيون ۱: ۱۹، والسنان (رجنى) وفى النسخ المطبوعة اذاه (بالمعجمة) مصحف .

محاورہ ہے جس کے معنی چست اونٹنی کے ہیں اور اس کے معنی دہلی اونٹنی بھی آتے ہیں اس صورت میں یہ اَشْرُتُ الْحَشْبَةِ سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی لکڑی چیرنا کے ہیں۔

اص ب ع

الإِصْبَعُ: (انگلی) کا لفظ انگلی کی بڑی ناخن بالائی سرانم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے اور بطور استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لَكَ عَلَيهِ يَدُكَ طَرَحَ لَكَ عَلَي فُلَانٍ إِصْبَعٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔

ا ص ر

الْأَصْرُ: (ض) کے اصل معنی کسی چیز میں گرہ لگانے اور اس کو زبردستی روک لینا کے ہیں أَصْرًا بِأَصْرٍ إِصْرًا فَهُوَ مَا صُوِّرَ اور مَاصِرٌ وَمَاصِرٌ بندرگاہ پر جہاز کھرا کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ﴾ (۷: ۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ اتارتے ہیں۔ یہاں اِصْرٌ سے وہ دشواریاں مراد ہیں جو خیرات اور ثواب تک پہنچنے سے ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں اور آیت:

﴿وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْهِمْ إِصْرًا﴾ (۲۸: ۲۸) میں بھی اِصْرٌ اسی معنی پر محمول ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اِصْرٌ کے معنی بوجھ کے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔

نیز اس عہد موکو کو بھی کہتے ہیں جو خلاف ورزی کرنے والے کو ثواب اور خیرات سے روک دے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

جنایت کی۔

یہاں آسُو بَرُوزِنَ فَاعْلَ يُوَاسِي سے ہے اسی طرح شاعر کے قول ۱

(۱۹) يَكْفُونَ اِثْقَالَ ثَائِي الْمَسْتَأْسِي

المستأسي برون مستفعل بھی اسی مادہ سے مگر اَلِإِسَاءَةِ (افعال) جس کے معنی تکلیف پہنچانے کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ سَاءَ (س و ع) سے منقول ہے۔

ا ش ر

الْأَشْرُ: بہت زیادہ اترنا اَشْرًا يَأْشُرُ أَشْرًا (س) اَلْأَشْرُ: بہت زیادہ اترانے والا قرآن پاک میں ہے: ﴿سَيَعْلَمُونَ عَدَا مَنِ الْكَذَّابُ الْأَشْرُ﴾ (۲۶: ۵۴) ان کو کل ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔ پس اَشْرٌ بَطْرٌ سے ابلغ ہے اور بَطْرٌ مِثْرٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اور فَرِحٌ اگرچہ عام حالات میں مذموم ہوتا ہے جس طرح کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ (۷: ۲۸) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لیکن ایسے موقع پر جب خوشی کا اظہار ضروری ہو اور وہ اظہار بھی جب ضرورت ہو تو فرحت ممدوح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾ (۵۸: ۱۰) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ کیونکہ کبھی سرور کی وجہ سے فرحت کا حصول تقاضائے عقل کے مطابق ہوتا ہے مگر اَشْرٌ اس فرحت کو کہتے ہیں جو مٹی برہوائے نفس ہو اور اسی سے بطور تشبیہ نَاقَةٌ مِثْبِثِيرٌ کا

۱ لم احده .

۲ وجمعه: اصابع راجع الایة (۱۹-۲).

کہتے ہیں میل کچیل اور ناخن کا تراشہ وغیرہ اور محاورہ میں کسی بری چیز سے اظہار نفرت کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَفِ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۶۷:۲۱) تف ہے تم پر اور جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان پر بھی۔

﴿أَفْتُمْ لِكَذَا﴾ کسی چیز سے کراہت ظاہر کرنا اُف کہنا۔ اسی سے اُف فلان کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل برداشتگی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

افق

الْأَفُقُ: کنارہ جمع آفاق قرآن پاک میں ہے: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ﴾ (۵۳:۴۱) ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق کے معنی اطراف کے ہیں اس کا واحد اُفُقٌ وَأَفُقٌ ہے • اور نسبت کے وقت اُفُقِي کہا جاتا ہے اور اُفُقٌ فُلَانٌ کے معنی آفاق (اطراف عالم) میں جانے کے ہیں اور اُفُقِ کے اطراف میں انتہائی بُعد اور وسعت سے تشبیہ کے طور پر اُفُقٌ کا لفظ انتہائی سختی پر بولا جاتا ہے۔

افک

الْأَفْكَ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بناء پر ان ہواؤں کو جو اپنا رخ چھوڑ دیں، مُؤْتَفِكَةٌ کہا جاتا ہے اور آیات کریمہ: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ﴾ (۹:۶۹) اور اللہ والی بستیوں نے گناہ کے کام کیے تھے۔

﴿وَالْمُؤْتَفِكَةُ أَهْوَى﴾ (۵۳:۵۳) اور الٹی ہوئی

﴿أَفَرَرْتُمْ وَآخَذْتُمْ عَلَيَّ دَالِكُمْ إِصْرِي﴾ (۸۱:۳) بھلا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا پختہ عہد لیا؟ الْإِصَارُ: رسی یا بیج جن کے سہارے پر خیمہ کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مَا يَأْصِرُنِي عَنْكَ شَيْءٌ مجھے تیرے پاس پہنچنے سے کوئی چیز مانع ہے۔ الْآبْصَرُ: وہ کبل جس میں خشک گھاس بھر کر اونٹ کی کوہان کے گرد لپیٹا جاتا ہے تاکہ اس پر آسانی کے ساتھ سواری ہو سکے۔

اصل

أَصْلُ الشَّيْءِ: (جز) کسی چیز کی اس بنیاد کو کہتے ہیں کہ اگر اس کا ارتقاع فرض کیا جائے تو اس شے کا باقی حصہ بھی معلوم ہو جائے قرآن پاک میں ہے: ﴿أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفُرُوعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ (۲۵:۱۲) اس کی جڑ (زمین میں) پختگی سے جمی ہے اور شاخیں آسمان میں۔ اور تَأَصَّلَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے جڑ پکڑنا ہیں اسی سے اصل اور خاندانی بزرگی مجدد کو أَصِيلٌ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا أَصْلَ لَهُ وَلَا فَضْلَ يَعْنِي نِيسَتٌ اور احسب وند زبان۔ الْأَصِيلُ وَالْأَصِيلَةُ کے معنی (عَشِيَّة) عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَبَّحُوهُ بَكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (۲۲:۳۳) اور صبح و شام اس کی تسبیح بیان کرتے رہو۔

أَصِيلٌ کی جمع أَصَالٌ اور أَصِيلَةٌ کی جمع أَصَائِلٌ ہے قرآن پاک میں ہے، ﴿بِالْعُدُوِّ وَالْأَصَالِ﴾ (۲۰۵:۷) صبح اور شام۔

افف

الْأُفُفُ: اصل میں ہر گندی اور قابل نفرت چیز کو

۱ وفی القرآن ﴿ولقد راه بالافق المسین﴾ (۸۱-۸۳) ﴿وهو بالافق الاعلی﴾ (۵۳)۔

ہو۔ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِفْكَا مفعول نہ ہو ائى الہة
مِنَ الْاِفْكَ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِفْكَا تَرِيدُونَ کا
مفعول ہو اور الہة اس سے بدل اور باطل معبودوں
کو (مبالغہ کے طور پر) اِفْكَا کہہ دیا ہو۔^۱
اور جو شخص حق سے برگشتہ ہو اسے مَافُوكُ کہا جاتا ہے
شاعر نے کہا ہے ع (منسرح)

(۲۰) فَإِنْ تَكُ عَنْ أَحْسَنِ الْمَرْوَةِ مَافُوكَا
كَأَفْئِي الْآخِرِينَ قَدْ أَفْكَوكَا

اگر تو حسن مروت کے راستہ سے پھر گیا ہے تو تم ان لوگوں
میں ہو جو برگشتہ ہو چکے ہیں۔
اِفْكَ الرَّجُلُ يُؤْفَكُ کے معنی دیوانہ اور باؤلا ہونے
کے ہیں اور باؤلے آدمی کو مانوک العقول کہا جاتا ہے۔

افل

www.KitaboSunnat.com
اَلْاَفْلُوكُ کے معنی ماہتاب اور نجوم (وغیرہ تیرات)
کے غروب ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿
فَلَمَّا أَفْلَا قَالَ لَا أَحِبُّ الْاَفْلِينَ﴾ (۱۷۶:۶)
جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے
والے پسند نہیں۔

﴿فَلَمَّا أَفْلَكْتُ﴾ (۷۸:۶) مگر جب وہ بھی غروب
ہو گیا۔ بھیڑ بکری کے چھوٹے بچوں کو اقال اور اونٹ کے
کمزور اور چھوٹے بچے کو اَفِيلُ کہا جاتا ہے۔

بستیوں کو دے پٹکا۔ (میں مستفکات سے مراد وہ بستیاں ہیں
جن کو اللہ تعالیٰ نے مع ان کے بسنے والوں کو الٹ دیا تھا)
﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنى يُّؤْفَكُونَ﴾ (۳۰:۹) خدا ان کو ہلاک
کرے۔ یہ کہاں تک پھرتے ہیں۔ یعنی اعتقاد و حق سے
باطل کی طرف اور اچھے کاموں سے برے افعال کی طرف پھر
رہے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اِفْكَ﴾
(۹:۵۱) اس سے وہی پھرتا ہے جو (خدا کی طرف سے) پھیرا
جائے۔ ﴿قَاتَسَى تُوْفَكُونَ﴾ (۹۵:۶) پھر تم کہاں تک
پھرتے ہو؟ اور ایت کریمہ: ﴿اَجِئْتَنَا لِنَاْفِكْنَا عَنْ اِلٰهِنَا
﴿(۲۳:۳۶) کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہمارے
معبودوں سے پھیرو؟

میں اِفْكَ کا استعمال ان کے اعتقاد کے مطابق ہوا ہے۔
کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں آلہ کی عبادت ترک کرنے کو حق
سے برگشتگی سمجھتے تھے
جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس
لیے اس پر بھی اِفْكَ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ
الَّذِينَ جَاءُوا بِالْاِفْكَ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ﴾ (۱۱:۲۳)
جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے سبھی لوگوں میں سے ایک
جماعت ہے۔ ﴿لِكُلِّ اَفْكَ اَنۡبۡیۡم﴾ (۷:۴۵) ہر
جھوٹے گنہگار کے لیے تباہی ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿اَنۡفَسٰكُمَا اِلٰهَةٌ دُوۡنَ اللّٰهِ تُرۡیَدُوۡنَ﴾ (۸۶:۳۷)
کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب

۱ ذکر الذمخشری ہُنَا ثَلَاثَةٌ اَوْجِهٌ مِنَ الْاَعْرَابِ اِنَّهُمَا ذَكَرَهُمَا الْمَوْلُفُ وَالثَّلَاثُ اِنْ يَكُوۡنُ اِفْكَا حَالًا مِّنْ ضَعِيۡرِ الْفَاعِلِ (۴۹۰:۴) طبع مصر.

۲ قالہ عمر ابن اذینہ و البیت فی اللسان و الصحاح (انک) و الطبری (۱۹-۲۶) و شواہد الکشاف ۸۷ و تہذیب الاصلاح (۳۴:۱) و الاصلاح ۲۳ و تہذیب الالفاظ ۵۵۲ و البحر ۳: ۵۰۶: ۷/۴۹۴: ۷ و الغریب القتی ۳۰.

اکل

يَأْكُلُ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا ﴿١٣:٣٩﴾ کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿(طویل)

(۲۱) فَإِنْ كُنْتُ مَاكُولًا فَكُنْ أَنْتَ الْكِلْبِيَّ أَرَجُّهُ
کھایا جانا ہے تو تم خود ہی کھا لو۔
مَا ذُقْتُ أَكْلًا مِثْلَ مَا ذُقْتُ فِي نَبِيٍّ كَهَائِي أَوْ رَجُلٍ
کھانے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت مال کی ہوتی
ہے اس لیے الْأَكْلُ کے معنی مال خرچ کرنا بھی آجاتے
ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ﴾
(۲۹:۳) ایک دوسرے کا مال ناحق صرف نہ کرو۔ اور
آیت ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا﴾
(۱۰:۴) میں یتیم کی مال کھانے سے اس کو ناجائز طور پر
صرف کرنا مراد ہے اور پھر بعد میں ﴿إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي
بُطُونِهِمْ نَارًا﴾ (۱۰:۴) کہہ کر تشبیہ کی ہے کہ یہ انھیں
جہنم میں لے جائے گا۔ الْأَكْلُ وَالْأَكْأَلُ (مبالغہ)
زیادہ کھانے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَكْلُونَ لِسُحْتٍ﴾ (۴۲:۵) اور (رشوت کا)
حرام مال بہت زیادہ کھانے والے ہیں۔

اِكْلٌ كِي جَعِ اِكْلَةٌ هِيَ مَحَاوِرَةٌ هِيَ هُمْ اِكْلَةٌ رَأْسٌ - یعنی
وہ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ (بکری کا) ایک سر ہی انھیں

الْأَكْلُ کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً
أَكَلَتِ النَّارُ الْحَطَبَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے
یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے
اسے أُكْلٌ (بضم کاف و سکون) کہا جاتا ہے ارشاد ہے:
أَكُلْهَا ذَاتِمٌ (۳۵:۱۳) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے
والے ہیں۔

الْأَكْلَةُ: مرة کا صیغہ ہے یعنی ایک مرتبہ کھانا اور الْأَكْلَةُ
بمعنی لُقْمَةٌ ہے۔

أَكْبَلُهُ الْأَسَدُ شِيرًا كَشَاكَارِ كَرِيًا هُوَ جَانُورٌ جَسَدُهُ وَهوَ كَمَا جَاتَا هُوَ -
الْأَكْوَلَةُ بکری جو کھانے کے لیے موٹی کی گئی ہو۔

الْأَكِيلُ: ہم پیالہ کو کہتے ہیں اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے:
فُلَانٌ مُؤَكَّلٌ وَمُطْعَمٌ (کنایہ بالدار تو نگر) ثَوْبٌ دُو
أَكْلِي: سخت بنا ہوا کپڑا، گھنی بناوت کا کپڑا۔ التَّمْرُ مَا أَكَلْتُهُ
لِفَمِّ: کھجور خوردنی چیز ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ذَوَاتِي أَكُلِ خَمِيطٍ﴾ (۱۶:۳۳) اور کبھی أَكْلٌ کا لفظ

نصیبہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فُلَانٌ دُو أَكْلِي مِّنَ
الدُّنْيَا یعنی وہ دنیا سے بہرہ یاب ہے۔ اِسْتَوْفَى فُلَانٌ
أَكَلَهُ کنایہ از موت یعنی رزق پورا لے لیا۔ أَكَلَّ فُلَانٌ
فُلَانًا اس نے فلاں کی غیبت کی اور یہی معنی أَكَلَّ لَحْمَهُ
کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿أَيُّسُحِبُّ أَحَدَكُمْ أَنْ

① قاله المزمق العبدی حينما غضب عليه النعمان بن المنذر وعمر بن هند وتماحه والافادركنى ولما مرق وفي اللسان (مزق) خير
أكلتي بدل انت اكلتي والبيت ايضا في اللسان (اكل) وذيل امالي المرتضى (۱-۳۲۵) والکامل للمبرد (۱-۱۸۰) والسيوطي: ۷ او الاصمعيات
۵۸ والاشباه النحوية (۲: ۲۲۲) في بحث الفرق بين لم ولما والبحر (۷: ۵۵) والمؤلف للأمدى ۲۸۳ وكتب عثمان ايام الفتنة الى عليّ مكتوباً
يستنجده وختمه لهذا البيت انظر العمدة (۱: ۲۶، ۴۷) وابن حشام (۱: ۳۰۹) واعراب ثلاثين ۲۰۲ والمحصري (۱: ۷۵) وامالي ابن الشعري
(۱: ۱۳۵) والعقد (۱۶۳-۱۶۴) والعيون (۱: ۳۴) وايضاً السيوطي ۲۳۳ والشاعر اسمه شاس بن نهار العبدی ولقب بالمزمق لقوله في هذا
في هذا البيت (ومما مرق) راجع الأمدى ۱۸۵، ۱۸۶.

② راجع للبحث عن حروف الهجاء المقدمه .

کو اَلْفٌ وَاَلْفٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءَ قَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ﴾ (۱۰۳:۳)
جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے
دلوں میں الفت ڈالی۔ ﴿لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ
جَمِيعًا مَا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾ (۲۳:۸) اگر تم دنیا
بھری دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت
پیدا نہ کر سکتے۔

اور مُؤَلَّفٌ اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے مختلف اجزاء کو
یکجا جمع کر دیا گیا ہو اور ہر جز کو تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے
اس کی صحیح جگہ پر رکھا گیا ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا يُلْفِ قُرَيْشٍ﴾ (۱۱۰:۶) قریش کے مالوف
کرنے کے سبب میں اِسْلَافٌ (افعال کا) مصدر ہے اور
آیت: ﴿وَالْمُؤَلَّفَةَ قُلُوبِهِمْ﴾ (۶۰:۹) ان لوگوں کا
جن کی تالیف قلوب منظور ہے۔ میں مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوبِ
سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی بہتری کا خیال رکھا جائے حتی
کہ وہ ان لوگوں کی صف میں داخل ہو جائیں جن کے
وصف میں قرآن پاک نے ﴿لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي
الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾ فرمایا
ہے یعنی مخلص مسلمان ہو جائیں۔

أَوَالْفُ الطَّيْرِ: مانوس پرندے جو گھروں میں رہتے ہیں۔
الْأَلْفُ: ایک خاص عدد (ہزار) کا نام ہے اور اسے اَلْفُ
اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعداد کے تمام اقسام جمع
ہو جاتے ہیں کیونکہ اعداد کی چار قسمیں ہیں۔ اکائی، دہائی،
سینکڑہ، ہزار تو اَلْفُ میں یہ سب اعداد جمع ہو جاتے ہیں
اس کے بعد جو عدد بھی ہو وہ مکرر آتا ہے۔

کافی ہے ۵ کبھی اَکَلٌ کے معنی خراب کرنا بھی آ جاتے
ہیں (یعنی کھانے کے بعد جو خراب سا رہ جاتا ہے) جیسے
فرمایا: كَعَصْفٍ مَّا كُوِلٌ: یعنی کھایا ہوا بھس۔
تَأْكَلُ كَذَا: کسی چیز کا خراب ہو جانا اَصَابَهُ اَكَالٌ فِي
رَأْسِهِ وَفِي اَسْنَانِهِ سر کا کھجلی اور دانتوں کا خوردہ سے
خراب ہو جانا و اَكَلَنِي رَأْسِي یعنی میرے سر کے بال
جھڑ گئے میکائیل ایک فرشتے کا نام ہے اور وہ عربی لفظ
نہیں ہے۔

ال ل

الْأَلُّ: ہر وہ صاف اور ظاہری حالت جس کا انکار ناممکن
ہو، عہد قرابت داری۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا يَرْقُبُونَ
فِي مُؤْمِنِي آلًا وَلَا ذِمَّةً﴾ (۱۰:۹) یہ لوگ کسی مؤمن
کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔
الَّ الْفَرَسُ: گھوڑے کا تیز چلنا اس کے اصل معنی چپکنے
کے ہیں اور پھر تیز روی کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا
ہے جیسے کہ بَرَقَ وَطَارَ کے الفاظ ہیں۔ الْآلَةُ چمک دار
برچھال بھاسا اس نے نیزہ یا برچھاسے مارا اور اسی سے
تیز کان کو اُذُنٌ مُؤَلَّلَةٌ کہا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ
إِلٌّ وَابِلٌ اسماء حسنیٰ سے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔
الْأَلَالُ: چھری کے دنوں پہلو۔

الف

الْأَلْفُ: حروف تہجی کا پہلا حرف ہے ۵ اور اَلْأَلْفُ
(ض) کے معنی ہیں: ہم آہنگی کے ساتھ جمع ہونا۔ محاورہ
ہے: اَلْفَتْ بَيْنَهُمْ میں نے ان میں ہم آہنگی پیدا کر دی
اور اسی سے اَلْفَةٌ (بمعنی محبت) ہے اور کبھی ہر ما لوف چیز

آیت کریمہ: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۱۰:۲) میں
 أَلِيمٌ بمعنی مُؤَلِمٌ ہے یعنی دردناک، دکھ دینے والا۔ اور
 آیت: ﴿أَلَمْ يَأْتِكُمْ﴾ (۵:۶۳) کیا تم کو..... نہیں
 پہنچی؟ میں الف استفہام کا ہے جو اَلَمْ پر داخل ہوا ہے
 (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

الہ

اللَّهُ (۱) بعض کا قول ہے کہ اللہ کا لفظ اصل میں إله
 ہے ہمزہ (تخفیفاً) حذف کر دیا گیا ہے اور اس پر الف لام
 (تعریف) لا کر باری تعالیٰ کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے
 اسی تخصیص کی بنا پر فرمایا: ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾
 (۶۵:۱۹) کیا تمہیں اس کے کسی ہمنام کا علم ہے۔

إله کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ
 معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو اِلاهۃ کہہ کر
 پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔

إله کے اہتمام میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ
 آله (ف) ياله فلان وتالله سے مشتق ہے جس کے
 معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر آله کے معنی ہوں گے:
 معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آله (س) بمعنی تھیر سے
 مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات و صفات کے ادراک
 سے چونکہ عقول، تھیر اور در ماندہ ہیں اس لیے اسے اللہ کہا
 جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المؤمنین
 حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: ﴿

((كَلَّ دُونَ صِفَاتِهِ تَحْبِيرُ الصِّفَاتِ وَضَلَّ
 هُنَاكَ تَصَارِيفُ اللِّغَاتِ .))

اے بروں از وہم وقال وقيل من

بعض نے کہا ہے کہ الف، حروف تجبی بھی اسی سے ہے
 کیونکہ وہ مبدأ نظام بنتا ہے۔ اَلْفَتْ الدَّرَاهِمَ میں نے
 درہموں کو ہزار کر دیا جس طرح مَاءٌ يَتُّ کے معنی ہیں:
 میں نے انہیں سو کر دیا۔ اَلْفَتْ دہ ہزار کو پہنچ گئے جیسے
 اَمَاتٌ سو تک پہنچ گئے۔

الک

الْمَلَائِكَةُ (فرشتے) اور مَلَكٌ اصل میں مَأَلَكٌ
 ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مَلَأَكٌ سے مقلوب ہے اور
 مَأَلَكٌ وَمَأَلَكَةٌ وَأَلْوَكٌ کے معنی رسالت یعنی پیغام
 کے ہیں اسی سے اَلْكُنْیٰ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں ”
 اسے میرا پیغام پہنچا دو۔“

الْمَلَائِكَةُ کا لفظ اسم جنس ہے اور واحد جمع دوکوں پر بولا
 جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا﴾ (۷۵:۲۲)
 خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کر لیتا
 ہے۔ ظلیل نے کہا ہے کہ مَأَلَكَةٌ کے معنی ہیں پیغام اور
 اسے مَأَلَكَةٌ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا
 ہے اور یہ فَرَسٌ يَأَلِكُ اللَّجَامَ کے محاورہ سے ماخوذ
 ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

الک

الْأَلَمُ کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے اَلَمٌ يَأَلُمُ
 (س) اَلَمًا فَهُوَ اَلِمٌ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأَنهَمُ
 يَأَلْمُونَ كَمَا تَأَلْمُونَ﴾ (۱۰۴:۳) تو جس طرح تم شدید
 درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔

اَلَمْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اور

لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ (۱۰۳:۶) وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ نیز آیت کریمہ:

﴿وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (۳:۵۷) میں ”الباطن“ کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

إِلَه: یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس کی جمع نہ لائی جائے، لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا، اس لیے إِلَهَةٌ صیغہ جمع استعمال کرتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَمْ لَهُمْ إِلَهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُونِنَا﴾ (۲۱:۳۳) کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچائیں۔

﴿وَيَدْرُكُ وَالْهَيْتَكَ﴾ (۷:۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔ ایک قرأت میں وَآلِهَاتِكَ ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں لہذا أَنْتَ۔ یہ اصل میں لِلَّهِ أَنْتَ سے ایک لام کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے۔ اَللَّهُمَّ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی يَا اَللَّهُ کے ہیں اور اس میں ميم مشدد یا حرف ندا کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اصل میں يَا اَللَّهُ اَمَّنَا بِخَيْرٍ (اے اللہ! تو خیر

خاک بر فرق من و تمثیل من اس لیے کہ انسان جس قدر صفات الہیہ میں غور و فکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بناء پر آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: ﴿(۱۱) تَفَكَّرُوا فِي آلَاءِ اللَّهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي اللَّهِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ الہ اصل میں ولاء ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر لاء بنا لیا ہے اور وَلَہ (س) کے معنی عشق و محبت میں وارفتہ اور بیخود ہونے کے ہیں ﴿ اور ذات باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان۔ اسی لیے بعض حکماء نے کہا ہے کہ ذات باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (۱۷:۲۳) مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لاء يَلُوهُ لِيَاهَا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محبوب ہے اس

① انظر للحديث اللسان (الا) و (ابو الشيخ طس، عدهب عن ابن عمر) وفي رواية في خلق الله (حل عن ابن عباس و ابو الشيخ عن ابي ذر) و روى في كل شئ (ابو الشيخ في العظمة عن ابن عباس) راجع كنز العمال ۳/ ۵۷۷-۵۸۱ ومعناه ۵۸۶-۵۸۷ (ابو الشيخ في العظمة حل عن عبدالله بن سلام).

② نسبة الطبرسي الى ابي عمرو.

امداد نہیں کریں گے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ
صیغہ افعالِ افعَلَ (مزید فیہ) سے نہیں آتا بلکہ فَعَلَ
(مجرد) سے بنایا جاتا ہے، جیسے: كَسَبَتْ سے اِكْتَسَبَتْ
اور صَنَعَتْ سے اِصْطَنَعَتْ اور رَأَيْتُ سے اِرْتَأَيْتُ
اور روایت۔^①

(۱۲) لَا ذَرِيَّةَ وَلَا اِثْتَلَيْتَ میں بھی مَا الْوَتُّهُ شَيْئًا
سے افعال کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے معنی وَلَا
اِسْتَطَعْتَ کے ہیں (یعنی تو نے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی
استطاعت ہوئی) اصل میں اِثْلَاءٌ وَ اَلْيَةُ اس قسم کو کہتے
ہیں جس پر (قسم کھانے والے کو) تکلیف اور کوتاہی کا
سامنا کرنا پڑے اور اصطلاح شریعت میں اِثْلَاءٌ اس قسم کو
کہتے ہیں جو عورت کے ساتھ جماع پر اٹھائی جائے اس قسم
کی کیفیت اور احکام کا بیان کرنا کتب فقہ کے ساتھ مختص
ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا الْآيَةَ الَّتِي كُنْتُمْ عَلَيْهَا﴾ (۷۴:۷) پس خدا کی
نعمتوں کو یاد کرو میں اِثْلَاءٌ کا واحد اَلْيٌ وَ اَلْيَةٌ ہے جس
طرح کہ اَنَا كَمَا وَاحِدَانَا وَ اِنِّي آتَا بَعْضُ نِ آيَةِ
کریمہ: ﴿وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ نَاطِرَةٌ اِلَى رَبِّهَا
نَاطِرَةٌ﴾ (۷۵:۷۴، ۷۵) اس روز بہت سے مندر و فوق
دار ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کے نمودیدار ہوں گے
میں اَلْيٌ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ کے معنی اِلَى نِعْمَةٍ رَبِّهَا
مُنْتَظَرَةٌ کئے ہیں۔ یعنی اپنے پروردگار کی نعمت کے منتظر
ہونگے لیکن بلاغت قرآن کی رو سے یہ سراسر تعسف ہے۔

کے ساتھ ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرت استعمال کی
بنا پر)..... حَيْهَلَا کی طرح مرکب کر کے اَللَّهُمَّ بنایا
گیا ہے۔^② (جیسے هَلُمَّ)
إِلَى: حرف (جر) ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی
نہایت حد بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔

الو

اَلْوَتُّ فِي الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی
کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا یہی
ہے۔ اور اَلْوَتُّ فُلَانًا کے معنی اَوْلَيْتُهُ تَقْصِيرًا (میں
نے اسے کوتاہی کا والی بنا دیا) کے ہیں جیسے كَسَبْتُهُ: اِنِّي
اَوْلَيْتُهُ كَسَبًا (میں نے اسے کسب کا والی بنا دیا) مَا
اَلْوَتُّهُ جُهْدًا: میں نے مقدر بھر اس سے کوتاہی نہیں کی
اس میں جہد اتمیز ہے جس طرح مَا اَلْوَتُّهُ نَصْحًا میں
نُصْحًا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَأْتُونَكُمُ خَبْرًا﴾ (۱۱۸:۳) یعنی یہ لوگ
تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔
اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَأْتَلُ اَوْلُوا الْفَضْلَ مِنْكُمْ﴾
(۲۲:۲۳) اور جو لوگ تم میں سے صاحب فضل
(صاحب وسعت) ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلْوَتُّ سے باب افعال ہے
اور بعض نے اَلَيْتُ بمعنی حَلَفْتُ سے مانا ہے اور کہا ہے
کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب
کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح بنی اثیمؓ کی مالی

① راجع للبحث في (اللهم) المسائل والاجوبة لابن سبويه: ۱۰۹/۱۰ معال من ص: ۲۲/۲ المطرزي على المقامات: ص ۵۳ الكناش
الكوکبي ص ۸۱ والكلام في ميم (اللهم) ومناقشته فيها: ذخائر الفصلا بن طون آخر ص ۵۱.

② رواه البخاري ومسلم من حديث انس لکن فی روایتها ولا تلبث والحديث ايضا في مسند البزار واحمد عن عبدالله بن عمرو
والطبراني في الاوسط.

اور بعیدہ یعنی نانی پر نانی وغیرہ سب کو اُم کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حواء ؑ کو اُمُّنَا کہا گیا ہے اگرچہ ہمارا ان سے بہت دور کا تعلق ہے۔ پھر ہر اس چیز کو اُم کہا جاتا ہے، جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح و تربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا مبداء بنے۔ ظلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات منظم ہو جائیں یا سما جائیں..... وہ ان کی اُم کہلاتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَأَنَّهُ فِيَّ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ (۴:۳۳) اور یہ اصلی نوشتہ (یعنی لوح محفوظ) میں ہے۔

میں اُمُّ الْكِتَابِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اسی کی طرف تمام علوم منسوب ہوتے ہیں اور مکہ مکرمہ کو اُمُّ الْقُرْیٰی کہا گیا ہے (کیونکہ وہ خطہ عرب کا مرکز تھا) اور بموجب روایت تمام روئے زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی ہے (اور یہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرْیٰی وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (۷:۴۲) تاکہ تو مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے ارد گرد رہتے ہیں۔ بد عملی کے انجام سے ڈرائے۔ اُمُّ النَّجْمِ - کبکھٹاں۔ شاعر نے کہا ہے ﴿طویل﴾

اَلَا

اَلَا یہ حرف استفہاج ہے (یعنی کلام کے ابتداء میں تشبیہ کے لیے آتا ہے)

اَلَا

اَلَا یہ حرف استثناء ہے۔
اُولَآءِ (اُولَآءِ)

یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر مؤنث کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے اس کا مفرد من لفظ نہیں آتا (کبھی اس کے شروع میں ہا تشبیہ بھی آ جاتا ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿هَا أَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّونَهُمْ﴾ (۱۱۹:۳) دیکھو! تم ایسے لوگ ہو کچھ ان سے دوست رکھتے ہو ﴿اُولَآئِكَ عَلٰی هٰذٰی﴾ (۵:۲) یہی لوگ..... ہدایت پر ہیں اور کبھی اس میں قصر (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کر لیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے

(۲۲) هُوَ اُولَآئِكَ هُوَ اُولَآءِ كَلَّا اَعْطٰیهِ
تُ نَوَا اَلَا مَحْدُوَةٌ بِمَثَال

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرافتد عطیہ دیئے ہیں۔

اُمُّ

اَلَا اُمُّ یہ اَب کا بالتقابل ہے اور ماں قریبی حقیقی ماں

۱) يكون لتوبيخ والتعنى والاستفهام عن النفي والعرض والتخصيص نحو ﴿الْأَنْجُونَ أَنْ يُغْفَرَ لَكُمْ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۲۴-۲۲) وفي معنى التنبية ﴿أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوقًا عَنْهُمْ﴾ (۷/۱۱).

۲) وقد يكون صفة بمنزلة غير نحو ﴿لو كان فيهما آية الا الله لفسدتا﴾ (الانبياء: ۲۱-۲۲) وفيه بحث وعاطفة بمنزلة الواراجع الاية (۱۵:۲) (۱۱۷۱:۲۷) وزائدة فهذه اربعة اوجه واما الانحراف تخصص اومركب من ان (ان الناصبة المحققة) راجع للبحث المعنى ج اص ۷۲-۷۸.

۳) قاله الاعشى وفي جهمرة اشعار العرب نعالا بدل نوالا ومعناه سقيتهم كاس الروى والبيت في البحر (۱۳۸/۱) او ديوانه ۱۶۷.

۴) قاله نابط شراد صدره برى الوجشة الانس الانيس ويهتدى..... والبيت في الحماسة مع المرزوقى رقم ۱۳ في تسعة ابيات والبيت في الضاعتين ۳۲۲ والالى (۲-۱۳۵) ونقد الشعر ۲۹ والحيوان (۶: ۲۵۶) في ستة ابيات وخسار القلوب ۲۰۴ وزهر الآداب (۲۱:۲) في عشرة ابيات وام النجوم المشوايك هي الشعرى والبيت في التنحان ۲۴۲ منسوب لسليك بن سلركة وراجع للبيت ايضا السمط ۷۶۲ وادباء للمؤلف (۴: ۶۱۸).

کہ اُمّ اصل میں اُمّیہ ہے کیونکہ اس کی جمع اُمّہات اور
تصغیر اُمّیہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اصل میں مضاعف
ہی ہے کیونکہ اس کی جمع اُمّات اور تصغیر اُمّیہ آتی ہے۔
بعض کا قول ہے کہ عام طور پر حیوانات وغیرہ کے لیے
اُمّات اور انسان کے لیے اُمّہات کا لفظ بولا جاتا ہے۔

الأمّة: ہر وہ جماعت جن کے مابین رشتہ دینی ہو یا وہ
جعز افیائی اور عصری وحدت میں منسلک ہوں پھر وہ رشتہ
اور تعلق اختیاری ہو یا غیر اختیاری اس کی جمع اُمّم آتی ہے
اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ
بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ﴾ (۲۸:۶) اور زمین پر
جو چلنے پھرنے والے (حیوان) دو پروں سے اُڑنے
والے پرند ہیں وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ میں
اُمّم سے ہر وہ نوع حیوان مراد ہے جو فطری اور تخیری طور
پر خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ مثلاً: مکزی جالابنتی ہے
اور سرفتہ (امور سپیدنگوں سے) اپنا گھر بناتی ہے اور چوٹی
ذخیرہ اندوزی میں لگی رہتی ہے اور چڑیا کبوتر وغیرہ وقتی غذا
پر بھروسہ کرتے ہیں الغرض ہر نوع حیوان اپنی طبیعت اور
فطرت کے مطابق ایک خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے
اور آیت کریمہ: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾
(۲۱۳:۲) (پہلے تو سب) لوگ ایک اُمّت تھے۔ کے معنی

(۲۳) بحیث اهدت ام النجوم الشوابك .
یعنی جہاں کہ کہکشاں راہ پاتی ہے۔
اُمّ الاضیاف - مہمان نواز۔ اُمّ المساکین - مسکین نواز۔
مسکینوں کا سہارا۔ ایسے ہی جیسے بہت زیادہ مہمان نواز کو
”ابوالاضیاف“ کہا جاتا ہے اور رئیس جیش کو ام الجیش۔
شاعر نے کہا ہے ﴿ (طویل)

(۲۳) وام عیال قد شہدت تقوتہم
اور وہ اپنی قوم کے لیے بمنزلہ ام عیال ہے جو ان کو رزق
دیتا ہے۔

اُمّ الكتاب - سورۃ فاتحہ کا نام ہے، کیونکہ وہ قرآن پاک
کے لیے بمنزل دیا چاہے اور مقدمہ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾ (۹:۱۰۱) ہوی یعنی
رہنے کی جگہ کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ دوزخ کے متعلق
مَا وَأَكُمُ النَّارُ (۲۹:۲۵) فرمایا ہے (اور یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ اُمّہ ہاویۃ ایک محاورہ ہو) جس طرح کہ وَبِئْسَ اُمٌّ
وَهَوَتْ اُمُّهُ ہے یعنی اس کے لیے ہلاکت ہو۔ اور اللہ
تعالیٰ نے آیت کریمہ: ﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ (۶:۲۳)
میں ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین قرار دیا ہے جس کی
وجہ بحث (آب) میں گزر چکی ہے۔ نیز فرمایا: ﴿يَابْنَ اُمَّ
﴾ (۹۳:۲۰) کہ بھائی۔

اُمّ (کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے) بعض نے کہا ہے

۱ قالہ الشنفری عمرو بن مالک الاروی (۷۰ھ - ۵۲۷ھ ق م) شاعر جاہلی من الصعاليك صاحب لامية العرب التي شرحها
الزمخشري في اعجاب العجائب و اراد بام عيال تايط شر لانهم حين غزو اجعلوا زادهم اليه فكان يفترعليهم مخافة ان تطول الغزاة
فيموتوا جوعاً والازد تسمى راس الغوم وولي امرهم اما وتمام البيت : اذا اطعمتهم او تحت واقلت والبيت من كلمة مفضلية رقم
: ۲۰ في ۳۶ بيتاً والبيت في اللسان (ام) والافاضي (۲۱: ۹۰) وفي المطبوع نفوسهم بدل تقويتهم مصحف وفي رواية اتلفت
بدل او تحت واحترتهم بدل اطعمتهم وارجح لبيت تهذيب اللفاظ ۷۲، ۵۶ و اللسان (حترام) والتاج (ام) والجمهرة (۱: ۲۱)
والمخصص ۱۳، ۱۳ وكتاب الابدال لابي الطيب والسمط ۴۱۳ والانماني (۲۱: ۱۳۴) والحزازي (۲: ۱۶) فالحماسة مع المزروقي
۷۰۷ والتبريزي (۲: ۲۳) و مجمع الامثال (۱: ۳۲۱) والعيني (۲: ۱۱۷).

کریمہ:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ﴾ (۱۶: ۱۲۰) کے
معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) عبادت الہی میں ایک
جماعت اور قوم کے بمنزلہ تھے۔ جس طرح کہ محاورہ ہے:
فَلَانٌ فِي نَفْسِهِ قَبِيلَةٌ كَفَلَانِ بِذَاتِ خُودَايَ قَبِيلَهُ
ہے۔ یعنی ایک قبیلہ کے قائم مقام ہے۔ (۱۳) وروی
انہ یحشر زید بن عمرو بن نفیل امۃ وحده۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حشر کے دن زید بن عمرو بن
نفیل اکیلا ہی امت ہوگا۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَانِمَةٌ﴾
(۱۳: ۳) وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں ان اہل کتاب میں
کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں۔

میں اُمۃ بمعنی جماعت ہے زجاج کے نزدیک یہاں
قَانِمَةٌ بمعنی استقامت ہے یعنی ذو و طریقیۃً و اِحۃً
تو یہاں مضمتر متروک ہے۔

الْأَيُّسَىٰ وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ ہی کتاب میں سے
پڑھ سکتا ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ:
﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾
(۲: ۲۲) وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں

یہ ہیں کہ تمام لوگ صنف واحد اور ضلالت و کفر کے ہی
مسک پر گامزن تھے اور آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ (۵: ۴۸) اور اگر خدا چاہتا تو
تم سب کو ہی شریعت پر کر دیتا۔ میں اُمۃً و اِحۃً سے
وحده بلحاظ ایمان مراد ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَتَكُنَّ
مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ (۳: ۱۰۴) کے معنی
یہ ہیں کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو
علم اور عمل صالح کا راستہ اختیار کرے اور دوسروں کے
لیے اسوہ بنے اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا
عَلَىٰ أُمَّةٍ﴾ (۳۳: ۲۳) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک
متفقہ دین پر پایا ہے میں اُمۃ کے معنی دین کے ہیں۔
چنانچہ شاعر نے کہا ہے ①

(۲۵) وَهَلْ يَأْتَمُنْ ذُو أُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ (طویل)
بھلا کوئی متدین آدمی رضا اور رغبت سے گناہ کر سکتا ہے
اور آیت کریمہ: ﴿وَأَدَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ﴾ (۱۲: ۴۵) میں
اُمۃ کے معنی حین، یعنی عرصہ دراز کے ہیں اور ایک قرأت
میں بعد اُمۃ (بالہاء) ہے یعنی نسیان کے بعد جب
اسے یاد آیا۔ اصل میں بَعْدَ أُمَّةٍ کے معنی ہیں ایک دور کسی
ایک مذہب کے متبعین کا دور گذر جانے کے بعد اور آیت

① قاله النابغة واوله : حلفت فلم اترك لنفسك ربية والبيت من القصيدة التي يعتذر بها الى النعمان بن المنذر عما وشت به
بنو قریع وهو فی دیوانه من السنة ۱۹ و اللسان والصحاح (اسم) وذیل مجالس ثعلب ۱/ ۵۰ و محاز القرآن لابی عبیدہ ۱۰۰ رقم
۱۲۲ مختار الشعر الجاهلی (۱: ۸۳) و البلدان (رسم: ثبوة) و العقد الذمین ۱۹ و المعانی و المشکل للقتبی ۳۴۶ و فی روایة المرئی
حلفت و لیس و داء الله للمرء مذهب - وهو اطبق لروایة الديوان (۲: ۱۷) .

② قرء بذلك ابن عباس و كان ابو الهيثم يقرء به ايضا انظر اللسان (امه) و النوادر لابی مسهل الاعرابی ۴۴۸ و الفائق (۱: ۲۶) .
③ رواه الطبرانی و فی الحديث قصة و البراز باختصار عنه و فيه المسعودی و قد احتل و بقیة رجاله ثقات و ابو یعلیٰ و كذا قال ابن
مسعود فی معاذ و قد ورد ذلك فی حدیث مرفوع راجع مجمع الزوائد : ج ۹ ص ۴۱۷ - ۴۱۸ و تحریج الكشاف للحافظ ابن حجر
رقم : ۲۶۵ - ۲۶۶ .

④ ابواسحاق ابراهیم بن السری بن سهل الزجاج توفی بین ۳۱۰ھ - ۳۱۶ھ و كان من اشهر تلامیذ المیرد استاذ الزجاجی و من مؤلفاته
طبقات زبیدی ۴۲ تاریخ بغدادی ۶: ۸۹ - ۹۳ ابن خلیکان رقم ۱۲ و اعلام زرکلی .

پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور خدا کی اس ضمانت پر کہ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ (۶:۶۷) ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لیے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القرئی یعنی مکہ مکرمہ کی طرف نسبت ہے۔^①

الْإِمَامُ وہ ہے جس کی اقتداء کی جائے خواہ وہ انسان ہو یا اس کے قول و فعل کی اقتداء کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر ہو اس کی جمع ائمتہ (أَفْعَلَةٌ) ہے اور آیت:

﴿يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ﴾ (۷۱:۱۷)
جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔ میں امام سے وہ شخص مراد ہے جس کی وہ اقتداء کرتے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ امام بمعنی کتاب ہے۔^② اور آیت کریمہ: ﴿وَجَعَلْنَا لِمَنْ يَشَاءُ إِمَامًا﴾ (۷۳:۲۵) اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ امام (مفرد) کی جمع ہے^③ اور دوسرے علماء کے نزدیک یہ دِرْعٌ دِلَاصٌ ودروع دِلَاصٌ کے باب سے ہے^④ (یعنی فَعَالٌ مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے) اور آیات: ﴿وَنَجْلَهُمُ ائِمَّةً﴾ (۵:۲۸)

سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا۔ میں اُمِّيْنَ سے یہی مراد ہے۔ قُرب ① نے کہا ہے کہ اُمِّيَّةٌ بمعنی غفلت و جہالت کے ہے اور اسی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوئی، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِي﴾ (۷۲:۲) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی کتاب سے) واقف ہی نہیں ہیں۔

یہاں اِلَّا اَمَانِي کے معنی اِلَّا اَنْ يُتْلَى عَلَيْهِمْ کے ہیں یعنی مگر یہ کہ انہیں پڑھ کر سنایا جائے۔ قُرَاءٌ ② نے کہا ہے کہ اُمِّيُونَ سے مراد ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ:

﴿الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾ (۱۵۷:۷) اور وہ جو (محمد) رسول (اللہ) نبی امی کی پیروی کرتی ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں توراہ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ اُمِّيٌ اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو جس طرح کہ عَامِيٌ اسے کہتے ہیں جو عام جیسی صفات رکھتا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اُمِّيٌ کہا اس بنا پر ہے کہ آپ نے لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب

① محمد بن المستنیر بن احمد ابو علی النحوی المعروف بقُرب (۲۰۶-۱۰۰) للفری البصری مولیٰ سالم بن زیاد لازم سیویہ وكان يدلج اليه فسماه قُربَ بارای دو یلیسۃ اللیل ۷۷ ومن تصانیفه معانی القرآن وهو أوّل من وضع المثلث فی اللغة (وفیات الاعیان : ۱/۴۹۴) طبقات النحویین ۱۰۶ بغیة الرواة ۱۰۴ الفہرست ۵۲ معجم المطبوعات ۵۱۷ نزہة الالباء ۱۱۹ .

② ابو زکریا یحییٰ بن زیاد الفراء (۳۷۰-۱۰۰) روی عن الکسانی وطبقته صاحب التصانیف بغیة الرواة ۴۱۱-۴۱۲ الفہرست ۱۰۰-۱۳۰۷ والابناء ۱/۱۰۹ و ۲/۲۵۵ و معجم الادباء ۲/۱۴ او کشف الظنون ۲/۱۹۲۰ .

③ نسب هذا القول الى الامام الباقر (انظر روح المعانی ص ۷۰ ج ۹).

④ قراءة الحسن بکتابهم (الکشاف ص : ۶۸۲ ج ۲).

⑤ کذا فی الصحاح وعند البعض جمع ام کصالم و صیام کذا فی لسان العرب والکشاف للزمخشری ص : ۲۹۶ ج ۳).

⑥ وقال الزمخشری ارادائمه فاكتفى بالواحد لدلالته على الجنس ولعدم اللبس : ص : ۲۹۶ ج ۳۰.

الشیئین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿أَمَّا أَحَدُكُمْ فَسَقِي رَبَّهُ حَمْرًا وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصَلِّبُ﴾ (۴۱:۱۲) تم میں سے ایک (جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے وہ) تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا۔ اور کبھی ابتداء کلام کے لیے آتا ہے جیسے ﴿أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّهُ كَذَّابٌ﴾۔

ام د

الْأَمَدُ: (موت، غایت) قرآن میں ہے: ﴿تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا﴾ (۲۹:۳) تو آرزو کرے گا کہ کاش اس میں اور اس برائی میں انتہائی بعد ہوتا۔ الْآمِدُ وَالْأَبْدُ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن اَبْدُ غیر متعین اور غیر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہذا اَبْدُ كَذَا (اتنی مدت) کا محاورہ صحیح نہیں ہے اور اَمَدُ غیر معین مگر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہذا اَمَدُ كَذَا (اتنی مدت) کہنا صحیح ہے جس طرح کہ زمان کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ زَمَانٌ اور اَمَدٌ کے لفظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ اَمَدٌ کا لفظ کسی مدت کی نہایت اور غایت کے لیے بولا جاتا ہے اور زمان کا لفظ کسی مدت کے لیے مبدأ اور غایت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے اَلْمَدَى وَالْأَمَدُ دونوں قریب المعنی ہیں (یعنی کسی چیز کی مدت کی غایت بیان کرنے کے لیے آتے ہیں)

ام ر

الْأَمْرُ (اسم) کے معنی: نشان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع اَمْرٌ ہے اور اَمْرٌ (ن) کا مصدر بھی اَمْرٌ آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں اَمْرٌ کا لفظ جملہ اقوال و

اور ان کو پیشوا بنائیں ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَيْمَةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ﴾ (۴۱:۲۸) اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔

میں اَيْمَةً کا واحد امام ہے اور آیت: ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ (۱۲:۳۶) اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔

الْأَمُّ (ن) کے معنی ہیں سیدھا مقصد کی جانب متوجہ ہونا (اور کسی طرف مائل نہ ہونا) اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا أَمِينَ النَّبِيَّتِ الْحَرَامِ﴾ (۲:۵) اور نہ ان لوگوں کی جو عزت والے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں۔ میں اَمِينِ اسی پر محمول ہے:

أَمَةٌ بمعنی شَجَّهَ کسی کا سر پھونز دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے اصل معنی ام دماغ پر مارنا کے ہیں۔ جیسا کہ اہل عرب کسی عضو پر مارنے کے لیے اس سے فَعَلْتُ کا صیغہ بنا لیتے ہیں جیسے رَأَسْتُهُ، رَجَلْتُهُ، كَبَدْتُهُ، بَطَنْتُهُ

ام حرف

اَمْ: جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہو تو بمعنی او ہوتا ہے، جیسے اَزِيدُ فِي الدَّارِ اَمْ عَمْرُوًّ یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بَلّ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ الْأَبْصَارُ﴾ (۶۳:۳۸) (یا) ہماری آنکھیں ان (کی طرف) سے پھر گئی ہیں۔

أَمَّا حرف

أَمَّا: یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے اور احد

تو (ہماری) بات یہی ہے کہ اس کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جاتو وہ ہو جاتی ہے۔ میں بھی امر ابداعی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے جو اہتمام ہوتا ہے اسے نہایت اختصار اور بلاغت سے اس آیت میں بیان فرمادیا ہے اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ (۵۴:۵۰) اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک (بات) ہوتی ہے۔ میں بھی سرعت ایجاد سے کننا یہ ہے اور عالم میں ایجاد و تکوین کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی تیز رفتاری کو بتانے کے لیے ایسا بلیغ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہماری قوت و اہمہ سے بھی بلند ہے اور امر بمعنی اَلتَّقدَم بِالشَّيْءِ (یعنی حکم دینا) عام ہے کہ بصیغہ امر ہو یا بلفظ خبر ہو جیسے فرمایا:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ﴾ (۲:۲۲۸) اور طلاق والی عورتیں اپنے تئیں روکے رکھیں۔ اور یا بطریق اشارہ وغیرہ ہو چنانچہ آیت کریمہ: ﴿إِنِّي أَرَىٰ فِي السَّمَاءِ آيَةً أَذْبَحُكَ فَأَنْظُرُ مَاذَا تَرَىٰ قَالَ يَا بَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ (۱۰۳:۳۷) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے انھوں نے کہا: الباجواب کو حکم ہوا ہے وہی کیجیے۔

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب میں اپنے بچے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھنے کو امر (مَا تُؤْمَرُ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

افعال کے لیے عام ہے۔ چنانچہ آیات: ﴿وَالِيَهُ يَرْجِعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ﴾ (۱۱:۱۲۳) اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔ ﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ (۳:۱۵۴) تم کہہ دو کہ بیشک سب باتیں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ یہ لوگ (بہت سی باتیں) دلوں میں مخفی رکھتے تھے جو تم پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی۔ ﴿وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ﴾ (۲:۲۷۵) اور (قیامت میں) اس کا معاملہ خدا کے سپرد۔ میں امر سے یہی معنی مراد ہیں۔ اور کبھی امر بمعنی ابداع بھی آ جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿الْأَلْهَةُ الْخَلْقِ وَالْأَمْرُ﴾ (۷:۷۴) دیکھو مخلوق اسی کے اختیار میں ہے اور ابداع بھی۔ اور امر بایں معنی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس معنی میں اس کے ساتھ شریک نہیں اور آیت:

﴿وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا﴾ (۲۱:۱۲) اور ہر آسمان میں اس (کے امر) کا حکم بھیجا۔ میں بھی امر اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور حکماء امت نے آیت کریمہ: ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ (۱۷:۱۸۵) کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ میں بھی مِنْ أَمْرِ رَبِّي کے معنی مِنْ اِبْدَاعِهِ کے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَإِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (۱۶:۴۰) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں

① وفيه لغة أَيْمًا وهو حرف شرط وتفصيل وتوكيد ولزمت الفاء بعدها وقد تحذف الفاء للضرورة والديبات التي بغیرفاء كمعاني (۱۰۶:۳) و ۳۱-۴۵) فهناك يقدر لفظة فيقال راجع للبحث المعنى ج ۱ ص ۵۷. وقد ياتي للتوكيد والشرط ويفصل بين اماو الفاء بواحد من امور ستة (۱) المتبتدا (۲) الخبر (۳) جملته الشرط (۴) اسم منصوب لفظا ومجلا بالحواب كما في سورة الضحى ۹-۱۰-۱۱ (۵) اسم منصوب معمول المحذوف يفسده بعد الفاء (۶) ظرف معمول لأمًا (راجع المعنى ج ۱ ص ۶۰-۵۹) والرضى على الكافية ج ۲ ص ۳۹۵-۴۰۰) وفيه وقد يحذف كمعاني نحو وتياك فظهر والرجز فاهجر الآية.

حال لوگوں کو حکم دیا۔ میں امر بمعنی حکم ہے یعنی ہم انہیں اطاعت الہی کا حکم دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَمَرْنَا بمعنی كَثَرْنَا ہے یعنی وہاں کے خوشحال لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔

ابو عمرو کا قول ہے کہ معنی کثرت کے لیے اَمَرْتُ (مجرد) نہیں آتا بلکہ اَمَرْتُ (تفعلیل) وَاَمَرْتُ استعمال ہوتا ہے لیکن ابو عبیدہ کا قول ہے ﴿کہ کبھی اس معنی کے لیے اَمَرْتُ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔﴾ (۱۳) خَيْرُ الْمَالِ مُهْرَةٌ مَأْمُورَةٌ وَسِكَّةٌ مَأْمُورَةٌ کہ بہتر مال پرورش کیا ہوا ٹھنڈا اور پیوند کیے کھجور کے درخت ہیں۔ تو مَأْمُورَةٌ اَمَرْتُ سے ہے ایک قرأت میں اَمَرْنَا ہے جس کے معنی ہیں: ہم ان کو امراء بنا دیتے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا اَكْبَارَ مَعْجَرِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا﴾ کہ ہم نے اسی طرح اس کے اکابر کو مجرم بنا دیا تاکہ اس میں مرو فریب کریں (۱۲۳:۶) اور ایک قرأت میں اَمَرْنَا بمعنی اَكْثَرْنَا بھی ثابت ہے۔ ﴿

الْاَيْمَارُ کے اصل معنی حکم بجالانا کے ہیں اور تَشَاوُرٌ

﴿وَمَا اَمُرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ﴾ (۹۷:۱۱) اور فرعون کا معاملہ درست نہیں تھا۔ میں امر کا لفظ فرعون کے جملہ اقوال اور افعال کو شامل ہے اور آیت کریمہ: ﴿اَتَى اَمْرُ اللّٰهِ﴾ (۱:۱۶) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آ ہی پہنچا۔ میں امر سے مراد قیامت ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ عام لفظ استعمال کیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا﴾ (۱۸:۱۲) بلکہ تمہارے لیے تمہارے دلوں نے بات کو خوشنما بنا لیا ہے۔ میں اَمْرًا سے مراد یہ ہے کہ یہ ان برے کاموں سے ہے جن پر نفس لغتارہ انسان کو اکسا رہتا ہے۔

اَصْرَ (س) الْقَوْمِ کے معنی ہیں قوم زیادہ ہوگئی کیونکہ آبادی بڑھ جائے تو امیر (حاکم) کا تقرر ضروری ہو جاتا ہے جس کے بغیر انتظام صحیح نہیں رہ سکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿(بیض)

(۲۶) لَا يَصْلُحُ النَّاسُ فَوْضَى لَا سَرَاةَ لَهُمْ
جس قوم کا رئیس نہ ہو اس کا معاملہ درست نہیں ہو سکتا۔ لہذا امر بمعنی کثرت استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ: ﴿اَمَرْنَا مَثَرِ فِيهَا﴾ (۱۶:۱۷) (تو) وہاں کے آسودہ

۱ قاله الاقوه الاودى واسمه صلاء بن عمرو ويكنى اباربيعة والبيت في العقد: (۴۳:۱۰) والسمط: (۲۷۰) والامالي: (۲۲۲:۲) قال الاستاذ العميني والبيت من كلمة ۱۷ بيتاً في نسخة ديوان الافوه (الطراف ۹-۱۰) ولا توجد كاملة في الكتب المعروفة وبعضها في آخر ديوان ابي الاسود صنعة السكري قال وقد زعم لي بعض الرواة انها للافوه ۱هـ والبيت في مجموعة المعاني ۱۹۰۱۶-۱۳۰ والشمراء ۱۷۵ ابن الحديد ۴: ۵۳۱ والصحيح واللسان (فوض) والمزهر ۱: ۱۶۴ والنوادر (۱: ۲۹۸) وروضة العقلاء ۲۴۶ والبيت ثالث ثلاثة للافوه التي ذكرها المؤلف (اس و) ص ۳۵۵.

۲ انظر لفقول ابي عبيدة في محاربه: ج ۱ ص ۳۷۲-۳۷۳ واللسان (امر) ثم القراءة بالتخفيف مروية عن الصحابة والتابعين الا الحسن فانه قراء التشديد وتبعه ابو عبیده في محاربه عن ابي العالیه الرياحی أمرنا بالتشديد ورويت عن علي ۱۲.

۳ راجع للحديث الفائق ۱: ۳۰۰ وانتهایة ۱۱/۱ واللالي ۳۱۸ والحديث اخرج ابن كثير من مسند احمد و(حم طب) عن سويد بن هبيرة والماوردی في ادب الدنيا والدين ۳۶۷ مع شرح المنهاج وهو مثل انظر البيان ۱۰/۲ والعيون والمستقصى والقالي ۲۰۴/۲ واللفاظ ۳/۶۸۳ واللسان (امر) وراجع ايضاً ذيل تفسير الكشاف ۶۵۰/۲ وفيه التخریج قال البكري وحمل الحديث على هذه اللغة الفصيحة اولی من حمل على الاتباع.

۴ هي قراءة شاذة عن ابي عثمان البهدي والبيت عن ابي عمرو و اباك بن عاصم أنظر القراءات الشاذة لابن خالويه ۷۵.

حکومت نہیں ہوتی۔ (۳) حکماء: خواص کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ (۴) دعاظ: جن کا حکم صرف عوام کے قلب ضمیر پر ہی جاری ہو سکتا ہے۔ ۵

ا م ن

الْأَمْنُ: اصل میں امن کا معنی نفس کے مطمئن ہونے کے ہیں۔ اَمْنٌ، اَمَانَةٌ اور اَمَانٌ یہ سب اصل میں مصدر ہیں اور امان کے معنی کبھی حالت امن کے آتے ہیں اور کبھی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کے پاس بطور امانت رکھی جائے، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَخُونُوا اَمَانَتِكُمْ﴾ (۲۷:۸) یعنی وہ چیزیں جن پر تم امین مقرر کیے گئے ہو ان میں خیانت نہ کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلٰى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ہم نے (بار) امانت آسمان اور زمین پر پیش کیا ہے (۷۲:۳۳) کی تفسیر میں بعض نے ”عدل و انصاف“ مراد لیا ہے۔ بعض نے حروف تہجی اور بعض نے عقل مراد لی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ معرفت توحید، عدل و انصاف کا قیام اور حروف تہجی کی معرفت عقل کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ انسان کے لیے علوم ممکنہ کی تحصیل اور افعال حسنہ کی سرانجام دہی عقل کے بغیر مشکل ہے۔ اور عقل کے باعث ہی انسان کو اکثر مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا﴾ اور جو شخص اس (مبارک) گھر میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔ (۹۷:۳) میں امن پانے سے مراد دوزخ

یعنی باہم مشورہ کرنے کو بھی اِثْتِمَار کہا جاتا ہے، کیونکہ مشورہ میں بھی ایک دوسرے کے حکم کو قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْمَالَا يٰۤاْتِمُرُهٗنَّ بِكَ﴾ شہر کے رئیس تمہارے بارے میں صلاح مشورے کرتے ہیں۔ (۲۰:۲۸) اور شاعر نے کہا ہے ۵

(۲۷) اَمَرْتُ نَفْسِيْ اَيَّ اَمْرٍ اَفْعَلُ

میں نے اپنے جی میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِمْرًا﴾ یہ تو آپ نے بڑی ناپسندیدہ بات کی (۷۱:۱۸) میں امر بمعنی منکر ہے اور یہ اَمْرَ الْاَمْرِ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی کسی معاملہ کے حد سے بڑھ جانا کے ہیں جس طرح کہ اِسْتَفْحَلَ الْاَمْرَ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَاُولٰٓئِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (۵۹:۳) اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔ میں بعض کے نزدیک عہد نبوی کے امراء مراد ہیں۔ اور بعض ائمہ اہل بیت مراد لیتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اولی الامر کے معنی الْاَمْرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ کے ہیں۔ ابن عباس کا قول ہے کہ اس سے فقہاء اور اہل علم مراد ہیں۔ جو احکام الہی کے فرمانبردار ہوں اور یہ سبھی اقوال صحیح ہیں کیونکہ اولی الامر جو لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں چار قسم پر ہیں۔ (۱) انبیاء: جن کا حکم عوام و خواص کے ظاہر و باطن پر نافذ ہوتا ہے۔ (۲) حکام: جن کا حکم صرف لوگوں کی ظاہری حالت پر جاری ہو سکتا ہے۔ دلوں پر ان کی

۱ قاله كعب بن زهير وصدره انحت قلوبى وكتلات بعينها راجع السمط (۲۰۰:۱) واللسان وكلاء ديوانه والبحر (۱۹:۶) وفى روايتهم جميعاً اى امرى بدل اى امر.

۲ لم يذكر بعده (ام س) و (ام ل) راجع المستدرک.

کی جمع ہے۔ نزول سح والی حدیث میں ہے۔ ﴿ (۱۵) وَتَقَعُ الْأَمْنَةُ فِي الْأَرْضِ أَوْ زَمِينٍ فِي الْأَرْضِ قَائِمٌ هُوَ جَائِعٌ كَمَا فِي آيَةِ كَرِيمَةٍ:

﴿ ثُمَّ أبلغَهُ مَأْمَنَةً ﴾ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو۔ (۶:۹) میں مَأْمَنَ ظرف ہے جس کے معنی ”جائے امن“ کے ہیں۔

أَمِنَ (افعال) دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) متعدی بنفسہ جیسے أَمِنْتُهُ (میں نے اسے امن دیا) اور اسی معنی کے اعتبار سے اسماء حسنیٰ میں مُؤْمِنٌ آیا ہے۔

(۲) لازم جس کے معنی ہیں پر امن ہونے والا۔

الْإِيمَانُ کے ایک معنی شریعت محمدی کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئُونَ ﴾ اور جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (۲۴:۲) میں آمَنُوا کے یہی معنی ہیں اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جو توحید و نبوة کا اقرار کر کے شریعت محمدی میں داخل ہو جائے اور بعض نے آیت: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴾ اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔ (۱۰۶:۱۲) کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

(۲) اور کبھی ایمان کا لفظ بطور مدح استعمال ہوتا ہے اور اس سے ”حق کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہو جانا مراد ہوتا ہے اور یہ چیز تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل

کی آگ سے بے خوف ہونا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان دنیوی مصائب سے بے خوف ہونا مراد ہے جو ان لوگوں کو پہنچتے ہیں جن کے بارے میں ﴿ إِنَّ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴾ خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے۔ (۵۵:۹) ارشاد فرمایا ہے اور نہ زیر بحث آیت میں خبر بمعنی انشاء ہے یعنی جو شخص حرم میں داخل ہو اسے امن دیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہلاکت سے بے خوف ہونا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اسے پر امن رہنے دیا جائے۔ جیسے محاورہ ہے: هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ یعنی اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور دوسری حرام ہے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مجرم جب تک حرم کے اندر ہے نہ اس سے قصاص لیا جائے اور نہ ہی کسی جرم میں اسے قتل کیا جائے۔ ﴿ اسی طرح آیت: ﴿ أَوْلَ كَلِمَةٍ يَرَوْنَ أَنَا جَعَلْنَا حَرَمًا مَّا آمَنَّا ﴾ دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے۔ (۶۷:۲۹) اور آیت ﴿ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ﴾ اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔ (۱۲۵:۲) میں بھی امن کے یہی معنی مراد ہو سکتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ أَمَنَةً نُّعَاسًا ﴾ تسلی (یعنی) نیند (نازل فرمائی) (۱۵۳:۳) میں أَمَنَةً بمعنی امن ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کتَبَةَ کی طرح أَمِنٌ

۱ کما روی عن عمر رضی اللہ عنہ لوظفرت فیہ باقتال الخطاب مامستہ حتی ینخرج منه (راجع الکشاف ج ۱ ص ۳۸۹)۔

۲ والحديث باختلاف الفاظه رواه ابن حبان واصحاب السنن الاربعة والشيخان والبيهقي في الاسماء والصفات وانظر تحريجه ابن كثير ۱/ ۵۷۸-۵۸۳ وللشوكاني رسالة سماها التوضيح في تواتر مجاء في المنتظر والدجال والسميح .

بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔ (۵۱:۴) میں ان کی مذمت کی ہے کہ وہ ان چیزوں سے امن و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں جو باعث امن نہیں ہو سکتیں کیونکہ انسان فطری طور پر کبھی بھی باطل پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ تو یہاں یُؤْمِنُونَ کا لفظ ایسے ہی (بطور طنز کے ہے۔ جس طرح آیت: ﴿مَنْ شَرَحَ بِالْكَفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ﴾ (بلکہ وہ جو دل سے اور دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے۔ (۱۶:۱۰۶) میں کفر کے ساتھ شرح صدر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو یہ اِيْمَانُهُ الْكُفْرُ وَتَحِيَّتُهُ الضَّرْبُ کے قبیل سے ہے۔ رَجُلٌ اَمَنَةٌ وَاَمَنَةٌ ہر ایک پر اعتماد کرنے والا۔ رَجُلٌ اَمِيْنٌ وَاَمَانٌ امانت آدی اَلْاَمُوْنُ۔ وہ اونٹنی جس کے تھک جانے اور لغزش کھانے سے سوار بے خوف ہو۔

اَمِيْن: یہ ممدود اور مقصود دونوں طرح بولا جاتا ہے اور صَئِفَةٌ وَاَمَنَةٌ کی طرح اسم فعل ہے ﴿حسن کے نزدیک آمین بمعنی استجب ہے یعنی میری دعا قبول فرما اور اَمِيْن (تفیل) کے معنی آمین کہنے کے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آمین اسماء حسنیٰ سے ہے۔ ﴿ابوعلی الفسوی فرماتے ہیں ﴿کہ اسم

باوجود اسے حاصل ہوتی ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِۦٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ (۱۹:۵۷) اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے ہیں وہی صدیق ہیں یہی وجہ ہے کہ اعتقاد، قول صدق اور عمل صالح میں سے ہر ایک کو ایمان کہا گیا ہے، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضَيِّعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یوں ہی کھودے۔ (۲:۱۳۳) میں ایمان سے مراد نماز ہے اور (۱۶) آنحضرت ﷺ نے حیا اور راستہ سے تکلیف کے دور کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور حدیث جبریل میں آنحضرت ﷺ نے چھ باتوں کو اصل ایمان کہا ہے ﴿اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ﴾ اور آپ ہماری بات کو، گو ہم سچ ہی کہتے ہوں باور نہیں کریں گے۔ (۱۲:۱۷)

میں مؤمن بمعنی مصدق ہے، لیکن ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور تردد جاتا رہے اور آیت کریمہ: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْحٰجِبِ وَالطّٰعُوْتِ﴾

① حدیث شعب الایمان فی الصحیحین مرفوعاً عن ابی ہریرۃ: الايمان بضع وسبعون شعبة اعلاها قول لاله الله وادناها اطاعة الاذى عن الطريق والحياة شعبة من الايمان والحديث ايضا في ابی داؤد وابن ماجه والنسائي وحديث جبريل مروى في الصحیحین عن عمر بن الخطاب وفيه ان تؤمن بالله وملئكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتؤمن بالقدر خيره وشره.

② راجع للبحث عن كلمة أمين الرضى على الكافي 67 ج 2 القرطبي 99-100 وزن أمين: المسائل الحليہ ص 80.

③ وفي ابن كثير 1: 31 وحكى القرطبي عن مجاهد وجعفر الصادق وبلال بن يساف ان أمين اسم من اسماء الله تعالى قال وروى عن ابن عباس مرفوعا ولا يصح قاله ابو بكر ابن العربي المالكي بل وروى ابن مردويه عن ابی هريرة مرفوعاً أمين خاتم رب العالمين وفي الدعاء لابن ابی شيبة ان جبريل لقن رسول الله وقال قل أمين فقال أمين واختلف الفقهاء في انه يستحب برفع الصوت ام باخفائه راجع كتب الخلاف.

④ ابوعلی الحسن بن احمد (او محمد) بن عبدالغفار الفسوی الفارسی الشیرازی (۲۸۸-۳۷۷) من تلامذة السراج والزجاج صاحب التصانيف الشهرة انظر الفهرست 64 ونزهة الاولياء 387 تاريخ بغداد 7/270 ابن خلكان 135 الارشاد واللياقوت

۲۹:۲۲ والکامل لابن اثیر ۹: ۳۶ شذرات ۸۸/۴-۹۹ بقیہ ۲۱۶.

اَنْ

یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اَنْ مصدر یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو نصب دیتا ہے، جیسے: اَعْجَبْنِي اَنْ تَخْرُجَ وَاَنْ خَرَجْتَ .
 (۲) اَنْ المخفضه مِنَ المثقلة یعنی وہ اَنْ جو ثقل سے خفیف کر لیا گیا ہو (یہ کسی شے کی تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے: اَعْجَبْنِي اَنْ زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ (۳) اَنْ (زائدہ) جو لَمَّا کی توكید کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا: فَكَلَّمَا اَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ جب خوشخبری دینے والا آپہنچا۔ (۹۴:۱۲)
 (۳) اَنْ مفسرہ۔ یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنی پر مشتمل ہو (خواہ وہ لفظاً ہو یا معنی جیسے فرمایا: وَاَنْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ اَنْ اَمْسُوا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو (۶:۳۸)
 یہاں اَنْ اَمْسُوا، قَالُوا کے معنی کو مضمّن ہے۔

اِنْ

اَنْ کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔
 (۱) اِنْ شرطیہ: جیسے فرمایا: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اِكران کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ (۱۱۸:۵)
 (۲) اِنْ مخففہ جو اِنْ ثقلیہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:

الہی کہنے سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بمعنی استَجِب کے ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔
 اور آیت کریمہ: ﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانَتْ اِنَاءَ اللَّيْلِ ﴾ (بھلا مشرک اچھا ہے) یا وہ شخص جو رات کے وقتوں میں عبادت کرتا ہے۔ (۹:۳۹) میں اَمَّنْ اصل میں اَمَّ مَنْ ہے اور ایک قرأت میں اَمَّنْ ہے۔ بہر حال اس کا تعلق اس مادہ سے نہیں ہے۔

اِنَّ حَرْف

اِنَّ وَاَنْ (حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنَّ جملہ مستقل پر آتا ہے اور اَنْ کا مابعد ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے: اَعْجَبْنِي اَنَّكَ تَخْرُجُ وَعَجِبْتُ اَنَّكَ تَخْرُجُ اور تَعَجَّبْتُ مِنْ اَنَّكَ تَخْرُجُ جب اِنَّ کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ ﴾ مشرک تو پلید ہیں (۲۸:۹) یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ ﴾ اس نے تم پر مہرہا جانور اور لہو..... حرام کر دیا ہے۔ (۱۷۳:۲) یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تشبیہ ہے کہ مطعومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں حرام ہیں ان میں سے یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

① تحقیق نفیس فی الفرق بینہما الروض الانف ج ۲ ص ۳۱۴ بحث انما۔ بدائع الفوائد لابن قیم ص ۱۰۲ علة تخفيف النون فی اشهد ان لا اله الا الله وتشديدها فی وان محمداً (از اھیر الریاض الربیعہ للیھقی فی اللغۃ ۱۹)۔

② رابع المعنی ج ۱ ص ۲۴-۳۵ وبحث ان ۱۷-۲۴ ایضاً۔

دیا جاتا ہے چنانچہ کمزور لوہے کو حَدِيدٌ اَيْسْتُ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۲۸).....عِنْدِي جَرَا لَا أَفْلٌ وَلَا اَيْسْتُ

میرے پاس شمشیر براں ہے جو کند اور کمزور نہیں ہے۔ اور ائٹی (مادہ) کے ساتھ تشبیہ دے کر نرم اور زرخیز زمین کو بھی ارض ائیسٹ کہا گیا ہے یہ تشبیہ یا تو محض نرمی کے اعتبار سے ہے۔ اور یا عمدہ اور پیداوار دینے کے اعتبار سے سے اسے ائیسٹ کہا گیا ہے جیسا کہ زمین کو عمدہ اور پیداوار کے اعتبار سے حرۃ اور وَلُوْد کہا جاتا ہے۔

پھر بعض اشیاء کو لفظوں میں مذکر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لیے صیغہ مذکر استعمال کیا جاتا ہے اور بعض کو مؤنث کے ساتھ تشبیہ دے کر صیغہ تانیث استعمال کرتے ہیں۔ جیسے يَدٌ، اُذُنٌ اور خُصِيَّةٌ چنانچہ خصیتین پر تانیث لفظی کی وجہ سے ائٹین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے

(۲۹) وَمَا ذَكَرْتُ وَإِنْ يَسْمَنُ قَانُثِي

اور کونسا مذکر ہے کہ اگر وہ موٹا ہو جائے تو مؤنث ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد قراد یعنی چیچر ہے کہ جب وہ بڑھ کر خوب موٹا ہو جاتا ہے تو اسے حَلْمَةٌ بلفظ مؤنث کہا جاتا ہے، اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَإِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا﴾ (۳: ۱۱) وہ خدا کے سوا جن کی بھی

إِنْ كَادَ لَيُضِلَّنَا (تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا (۲۴: ۲۵) (۳) اِنْ نَافِيَةِ اس کے بعد اکثر اَلَا آتا ہے جیسے فرمایا: اِنْ نَظْنُ اَلَا ظَنَّا ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔ (۳۲: ۳۵)

إِنْ هَذَا اَلَا قَوْلُ الْبَشَرِ (پھر بولا) یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔ (۲۵: ۷۴) اِنْ نَقُولُ اَلَا اَعْتَرَاكَ بَعْضُ اَلْهَيْتَا بِسُوْءٍ . ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسب پہنچا (کر) دیوانہ کر دیا ہے۔ (۵۳: ۱۱)

(۴) اِنْ (زائدہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لیے آتا ہے، جیسے: مَا اِنْ يَخْرُجُ زَيْدٌ۔ زاید باہر نہیں نکلے گا۔

انث

اَلْاُنْثَى (مادہ) بہ ذکر یعنی نر کی ضد ہے اصل میں ائٹی و ذکر عورت اور مرد کی شرمگاہوں کے نام ہیں پھر اس معنی کے لحاظ سے (مجازاً) یہ دونوں نر اور مادہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثَى﴾

جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت۔ (۱۲۳: ۴) اور چونکہ تمام حیوانات میں مادہ نسبت نر کے کمزور ہوتی ہے لہذا اس میں معنی ضعف کا اعتبار کر کے ہر ضعیف الاثر چیز کو ائٹی کہہ

① لصخراء لغى واوله: فيعلمه بان العقل والبيت في اللسان (انث) والبحر(۳: ۳۵۲) والاقضاب ۴۵ وقيله: وليت ميلغياتي بقولي - لقاء ابي المثلث لايرث .

② وفي التنبية للبكري قاله بياض والبيت في المحمص (۱۰۲: ۱۶) والمفضليات بشرح ابن الانباري ۳۶۰ واللسان والصحاح (ضرس) غير منسوب والاقضاب ۴۱۸ وفي روايتهم جميعاً وان يكبر بدل وان يسمن وهو الصواب راجع السمط (۱۷۵: ۱) وتماه: شديد الازم ليس بذى ضروس۔ قال البكري وكذا انشد ابو علي الفارسي وفي رواية ليس له ضروس والصواب الاول قاله ابن البري وراجع حواش الصحاح والتنبية للبكري ۳۰ والمزهر (۱: ۲۷۵) وشرح ابیات الايضاح للشنمري ۱۴۷ (مخطوطه) والمعاني للقبتي ۶۳۲ وبعده: انا وجدنا بن سلمة بمنزلة مثل القراد على حاله في الناس وبعده ابیات لغير في الشطرنج .

لیکن آیت کریمہ: ﴿وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَانًا﴾ (۱۹:۴۳) اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں (مادہ، خدا کی بیٹیاں) بنادیا۔ میں ملائکہ کو انانہ قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

ان س

الْإِنْسُ یہ جن کی ضد ہے اور اِنْسٌ (بضم الہمزہ) نُفُورٌ کی ضد ہے اور اِنْسِيٌّ۔ اِنْسٌ کی طرف منسوب ہے اور اِنْسِيٌّ اسے کہا جاتا ہے، جو بہت زیادہ مانوس ہو اور ہر وہ چیز جس سے اِنْسٌ کیا جائے اسے بھی اِنْسِيٌّ کہہ دیتے ہیں اور جانور یا کمان کی وہ جانب جو سوار یا کمانچی کی طرف ہو اسے اِنْسِيٌّ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جانب کو وَحْشِيٌّ کہتے ہیں، اِنْسٌ کی جمع اِنْسِيٌّ ہے قرآن پاک میں ہے:

وَأَنسِيٌّ كَثِيرًا (۴۹:۲۵) بہت سے (چوپایوں) اور آدمیوں کو۔ اور نفس انسانی کو اِنْسٌ کہا جاتا ہے۔

اِنْسٌ (افعال) کے معنی کسی چیز سے اِنْسٌ پانا یا دیکھنا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنِ اِنْسْتَمْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا﴾ (۶:۴) اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو۔

اِنْسْتُمْ نَارًا (۷:۲۷) میں نے آگ دیکھی۔

اور آیت کریمہ: حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا (۲۷:۲۴) کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم ان سے اجازت لے کر اِنْسٌ پیدا نہ کرو۔

الْإِنْسَانُ: انسان چونکہ فطرۃً ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم اِنْسٌ اور میل جول کے

پرستش کرتے ہیں وہ مادہ ہیں، اِنْسِيٌّ، اِنْسِيٌّ کی جمع ہے) بعض مفسرین نے احکام لفظیہ کا اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کو جن اسماء سے پکارتے تھے جیسے لات، عزلی، منات الثالثہ یہ سب مؤنث ہیں اس لیے قرآن نے انانہ کہہ کر پکارا ہے ﴿اور بعض نے معنی کا اعتبار کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر منفعل اور ضعیف چیز کو اِنْسٌ کہا جاتا ہے، جیسے کمزور لوہے پر اِنْسٌ کا لفظ بولتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ موجودات کی باہمی نسبت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔ (۱) فاعل غیر منفعل، یہ صفت صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ (۲) منفعل غیر منفعل، یہ خاصہ جمادات کا ہے۔ (۳) ایک اعتبار سے فاعل اور دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن و انس اور ملائکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے فاعل سے منفعل اور اپنی مصنوعات کے لحاظ سے فاعل ہے اور چونکہ ان کے معبود جمادات کی قسم سے تھے جو منفعل محض ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے انھیں اثاث کہہ کر پکارا ہے اور اس سے ان کی اعتقادی جہالت پر تنبیہ کی ہے کہ جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی کوئی کام سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (توحید کی طرف دعوت کے سلسلہ میں) اپنے باپ سے کہا۔ ﴿يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا﴾ (۲۲:۱۹) کہ ابا! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں

① چنانچہ حسن سے مروی ہے: لَمْ يَكُنْ حَتَّىٰ مِنْ أَحْيَاءِ الْعَرَبِ وَالْوَالِهِمْ صَنَمٌ يَعْبُدُونَهُ بِسْمُونَهُ اِثْنِي بَنِي فُلَانِ الْكُشَافِ.

اِسْتَأْنَفْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی شے کے سرے اور مبدأ کو پکڑنے (اور اس کا آغاز کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد ہے۔ ﴿مَا ذَا قَالَ اِنْفًا﴾ (۱۶:۲۷) انھوں نے ابھی (شروع میں) کہا تھا؟

ان مل

آیت کریمہ:

﴿عَضُّوا عَلَيْنَكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۱۱۹:۳) (تو) تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کھاتے ہیں۔ میں اَنَامِلُ اَنْمَلَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی انگلی کے اوپر کے پور کے ہیں جس میں ناخن ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مُّؤَمِّلُ الْاَصَابِعِ فلاں کی انگلیوں کے پور غلیظ اور چھوٹے ہیں۔ اس میں ہمزہ زائدہ ہے کیونکہ نَمِلُ الْاَصَابِعِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے صرف لفظی مناسبت کی وجہ سے ہم نے یہاں بیان کر دیا ہے۔

انسی

انسی: یہ حالت اور جگہ دونوں کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اس لیے بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی اَیْسَنَ اور كَيْفَ کے آتا ہے پس آیت کریمہ: ﴿اِنِّي بَلَكَ هَذَا﴾ (۷۳:۳) کے معنی یہ ہیں کہ کھانا تجھے کہاں سے ملتا ہے۔

انا

ضمیر واحد متکلم ہے ایک لغت میں وصل کے وقت اس کا الف حذف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿لِكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّي﴾ (۳۸:۱۸) مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا ہی میرا پروردگار ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ لِكِنَّا اصل میں لِكِنْ اَنَا ہے انا کے ہمزہ کو حذف کر کے

بغیر نہیں بن سکتا، اس لیے اسے انسان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریات زندگی کا انتظام کر سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اسی سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے انسان کہا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ انسان اصل میں اِنْسِيَانٌ بروزن اَفْعِلَانٌ ہے اور (انسان) چونکہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا اس لیے اسے انسان کہا گیا ہے۔

انف

الْاَنْفُ اصل میں اَنْفٌ بمعنی ناک ہے۔ مجازاً کسی چیز کے سرے اور اس کے بلند تر حصہ کو بھی اَنْفٌ کہا جاتا ہے، چنانچہ پہاڑ کی چوٹی کو اَنْفُ السَّجَلِ اور کنارہ ریش کو اَنْفُ السَّحِيحَةِ کہہ دیتے ہیں۔ اور حمیت و غضب اور عزت و ذلت کو انف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۵

(۳۰) اِذَا غَضِبْتَ تِلْكَ الْاَنْوْفُ لَمْ اَرْضَهَا

وَلَمْ اَطْلُبِ الْعَتَبِيَّ وَلَكِنْ اَزِيدُهَا

اور جب وہ ناراض ہوں گے تو میں انھیں راضی نہیں کروں گا، بلکہ ان کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔

اور متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ شَمَخَ فُلَانٌ بِاَنْفِهِ فلاں نے ناک چڑھائی یعنی تکبر کیا۔

تَرَبَّ اَنْفُهُ وَهُ ذَلِيلٌ هُوَ۔

اَنْفَ فُلَانٌ مِنْ كَذَا: کسی بات کو باعث عار سمجھنا اَنْفَتُهُ اس کی ناک پر مارا۔ اور اَلْاَنْفَةُ بمعنی حمیت بھی آتا ہے۔

ہمزہ مفتوح ہونے کی صورت میں اسم ممدود حطیہ نے کہا ہے (الواخر) ﴿

(۳۱) آتَيْتُ الْعِشَاءَ إِلَى سُهَيْلٍ

أَوْ الشَّعْرَى فَطَالَ بِيَ الْأَنْاءِ

میں نے سہیل یا شعرى ستارہ کے طلوع ہونے تک کھانے کو مؤخر کر دیا اور میرا انتظار طویل ہو گیا۔ آتَيْتُ الشَّيْءَ إِنْشَاءً۔ کسی کام کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر کرنا۔ ﴿ تَأْتَيْتُ: میں نے دیر کی آ لانا: علم، وقار، طمانیت، تأنی فُلَانٌ تَأْتِيًا وَأَنَّى يَأْتِي أَنِيًا (س) تحمل اور علم سے کام لینا۔ اسْتَأْتَيْتُ الشَّيْءَ میں نے اس کے وقت کا انتظار کیا نیز اس کے معنی دیر کرنا بھی آتے ہیں جیسے اسْتَأْتَيْتُ الطَّعَامَ میں نے کھانے کو اس کے وقت سے مؤخر کر دیا۔

الْأَنْاءُ: برتن۔ جمع آئِيَةٌ۔ جیسے كِسَاءٌ وَأَكْسِيَةٌ اس کی جمع الجمع الاوانی ہے۔

اهل

أَهْلُ الرَّجُلِ: ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ہم نسب یا ہم دین ہوں اور یا کسی صنعت یا مکان میں شریک ہوں یا ایک شہر میں رہتے ہوں اصل میں اهل الرجل تو وہ ہیں جو کسی کے ساتھ ایک مسکن میں رہتے ہوں پھر مجازاً آدمی کے قریبی رشتہ داروں پر اهل بیت

لِکِنِّ کے نون کو نا کے نون میں ادغام کر دیا گیا ہے ایک قرأت میں لِکِنِّ هُوَ اللَّهُ رَبِّي ہے، جس میں انا کے آخری الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اُنِّيَّةُ الشَّيْءِ وَأُنِّيَّةُ کے معنی ذات شی کے ہیں اس سے کسی شے کے وجود کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہ ترکیب عربی نہیں ہے بلکہ محدث ہے۔

انی

أَنَّ (ض) الشَّيْءُ: اس کا وقت قریب آ گیا۔ وہ اپنی انتہا اور پختگی کے وقت کو پہنچ گئی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کیا ابھی تک مومنوں کے لیے وقت نہیں آیا؟ ﴿۱۶:۵۷﴾

غَيْرَ نَاطِرِينَ إِنَاءً (۵۳:۳۳) تم کھانے کے وقت کا انتظار کر رہے ہو (انسی الحمیم۔ پانی حرارت میں انتہا کو پہنچ گیا) قرآن میں سے حَمِيمٌ آن (۴۳:۵۵) مِنْ عَيْنِ آئِيَةٍ (۵:۸۸) گرم کھولتے ہوئے چشمے سے۔

انسی (بتشلیث الهمزہ) وقت کا کچھ حصہ۔ اس کی جمع آناء ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ أَنْاءَ اللَّيْلِ (۱۱۳:۳) جورات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ ﴿وَمِنْ أَنْاءِ اللَّيْلِ فَسَبَّحْ﴾ (۳۰:۲۰) اور رات کے اوقات میں (بھی) اس کی تسبیح کیا کرو۔

انسی: ہمزہ مکسور ہونے کی صورت میں اسم مقصور ہوگا اور

① قاله حطية في قصيدة ٤٣ بيتاً يهجو فيها الزبيرقان بن بدر مطلعها: الابليغ بن عوف بن كعب فهل قوم علي خلق سواء القصيدة في ديوانه (٩٨-١٠٩) (نشر نعمان قاهره ١٣٧٨ هـ والبيت في اصداد الاصمعي ٢٧ وابن السكيت ١٨٢ واخذاد ابن الانباري ٨٢ واخذاد ابي الطيب ٦١٠ واللسان (اني) والطبري ٢٢: ٣٤ والاشباه النحوية ٤: ٤٩ وابن ولاد ٨١٧ والعمدة (٢: ١٧٠) وذيل مجالس نعلب ١: ٢٧٦ وفي رواية ابي عبيدة واكرت بدل وانيت (اللسان= كرا) واصلاح ابي يعقوب ٢٤٣ وفي رواية الاصمعي آتيت ورواه في المختارات ١٣٠ في قصيدة ٤٣ مطلعها: الاقالت امامة هل تعزى - فقلت اميم قد غلب الغزاء.

② وفي الحديث قال صلى الله عليه وسلم لقه آتيت وآزيت في رجل جاء يوم الجمعة يتخطى رقاب الناس.

فُلَانٌ أَهْلٌ لِكَذَا۔ فلاں اس کا مستحق اور سزاوار ہے اور مہمان کی آمد پر اسے خوش آمدید کے طور پر مَرْحَبًا وَاَهْلًا کہا جاتا ہے یعنی ہمارے پاس تمہارے لیے فراخی ہے اور ہم تمہارے اہل بیت کی طرح تمہارے ساتھ شفقت سے پیش آئیں گے۔ اَهْلٌ کی جمع اَهْلُونَ وَاَهَالٍ وَاَهْلَاتٌ آتی ہے۔

اوب

الْاَوْبُ: گو اس کے معنی رجوع ہونا کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے، مگر اَوْبٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے ارادۃً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ اَبٌ اَوْبًا وَاِبَابًا وَمَا بَابًا وہ لوٹ آیا قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابُهُمْ ﴾ (۲۵:۸۸) بیشک ہماری طرف لوٹ کر آتا ہے۔ ﴿ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ اِلَى رَبِّهِ مَا بَابًا ﴾ (۲۹:۷۸) پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنائے۔

الْمَابُ یہ مصدر (میسی) ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَابِ ﴾ (۱۳:۳) اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

الْاَوَابُ یہ تَوَابٌ کا (صیغہ مبالغہ) ہے یعنی وہ شخص جو معاصی کے ترک اور فعل طاعت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ لِكُلِّ اَوْابٍ حَفِیْظٌ ﴾ یعنی ہر رجوع لانے اور حفاظت کرنے

الرجل کا لفظ بولا جانے لگا ہے اور عرف میں اہل البیت کا لفظ خاص کر آنحضرتؐ کے خاندان پر بولا جانے لگا ہے کیونکہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اِنَّمَا يَرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ (۳۳:۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کی میل پچیل) دور کر دے۔

اور کبھی اہل الرجل سے بیوی مراد ہوتی ہے۔ اور اہل الاسلام کے معنی مسلمان قوم کے ہیں۔ شریعت (اسلامیہ) نے اکثر احکام میں کافر اور مسلمان کے مابین چونکہ نسبی تعلق کو کالعدم قرار دیا ہے اس لیے (نوح علیہ السلام) کے لڑکے کے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرٌ صَالِحٌ ﴾ (۴۶:۱۱) یعنی یہ تیرے خاندان سے نہیں ہے، اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اور فرمایا: ﴿ وَاَهْلِكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ ﴾ (۴۰:۱۱) اپنے اہل کو کشتی میں سوار کر لو۔ ہاں جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے اس کو سوار نہ کرنا۔

اَهْلُ الرَّجُلِ (ن ض) يَأْهَلُ اَهُوْلًا اس نے شادی کر لی۔

مَكَانٌ مَا هُوَ: آباد جگہ جہاں لوگ بستے ہوں۔ اُهْلٌ یہ وہ جگہ آباد ہوگئی۔ دَابَّةٌ اَهْلٌ وَاَهْلِيٌّ وہ چوپایہ جو کسی جگہ سے مانوس ہو (پالتو) تَأْهَلُ الرَّجُلُ اس نے شادی کر لی اس سے (بطور دعا) کہا جاتا ہے: اَهْلَكَ اللّٰهُ فِي السَّجَنَةِ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں بیوی اور اہل بخشے کہ تم ان کے ساتھ رہو۔

۱ وفی القرآن: و سار باہلہ (۲۸-۲۹)۔

۲ ایضاً اهل كتاب الذين عندهم الكتاب سماوى وفی جميع القرآن المراد بهم اليهود والنصارى .

ہے اس لیے آل فلان (علم) تو کہہ سکتے ہیں مگر آل رجل، آل زمان کذا و آل مکان کذا بولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیشہ صاحب شرف اور افضل ہستی کی طرف مضاف ہوگا اس لیے آل الخياط بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ آل اللہ یا آل السلطان کہا جائے گا۔ مگر اہل کا لفظ مذکورہ بالا میں سے ہر ایک کی طرف مضاف ہو کر آ جاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اہل زمن کذا و بلد کذا بولا جاتا ہے اسی طرح اہل اللہ و اہل الخياط بھی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ ”آل“ دراصل بمعنی شخص ہے۔ اس کی تصغیر اویل آتی ہے اور یہ اس شخص کے متعلق استعمال ہوگا جس کو دوسرے کے ساتھ ذاتی تعلق ہو مگر قریبی رشتہ داری یا تعلق والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَآلِ اِبْرٰهٖمَ وَاٰلِ عِمْرٰنَ﴾ (۳۳:۳) خاندان ابراہیم اور خاندان عمران۔ ﴿اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (۱۳۶:۲۰) فرعون والوں کو نہایت سخت عذاب میں داخل کر دو۔ آل النسبی۔ بعض نے کہا کہ آل النبی سے آنحضرت ﷺ کے رشتہ دار مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں علم و معرفت کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق حاصل ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل دین دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو علم و عمل کے اعتبار سے راسخ اور محکم ہوتے ہیں ان کو آل النبی اور ائمتہؑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا سراسر ذہن تقلیدی ہوتا ہے ان کو امت محمد ﷺ تو کہہ سکتے ہیں مگر آل محمدؐ نہیں کہہ سکتے اس سے معلوم ہوا کہ امت اور آل میں عموم و

والے کے لیے (۳۲:۵۰) ﴿اِنَّهٗ اَوْابٌ﴾ (۱۷:۳۸) بیشک وہ رجوع کرنے والے تھے۔

اسی سے اَوْبَةٌ بمعنی توبہ بولا جاتا ہے..... اَلتَّوْبٰیب۔ دن کو سفر کرنا اور شاعر کے قول ع

(۳۲) اَبَتْ يَدُ الرَّامِيْ اِلَى السَّهْمِ
تیر انداز کا ہاتھ تیر کی طرف لوٹ آیا۔

میں اَوْبٌ (لوٹنا) کی نسبت ید کی طرف کی گئی ہے جو درحقیقت تیر انداز کا فعل ہے۔ اس سے ہمارے سابق بیان پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہے کہ اَوْبٌ ارادہ اور اختیار کے ساتھ لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔

اسی طرح نَاقَةٌ اَوْوَبٌ سب رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ہاتھ پھرتی سے لوٹتے ہیں۔

اود

اَلْاَوْدُ (ن) اَدِيوُدٌ اَوْدًا وَاِيَادًا کے معنی بوجھل اور گرانبار کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا يَوَدُّهٗ حِفْظُهُمَا﴾ (۲۵۵:۲) اور آسمان و زمین کی حفاظت باری تعالیٰ کو بوجھل نہیں کرتی اور یہ بروزن قَالَ يَقُوْلُ قَوْلًا ہے اس سے واحد شکلم کا صیغہ اُدْتُ بروزن قُلْتُ ہوگا اصل میں اَدَّة کے معنی ہیں: اس نے اپنے بوجھ اور گرانباری کی وجہ اس کی گذرگاہ سے ٹیڑھا کر دیا۔

اول

اَلْاَوَّلُ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل اصل میں اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُھَيْلُ آتی ہے مگر اس کی اضافت ناظمین انسان میں سے ہمیشہ عَلم کی طرف ہوتی ہے کسی اسم نکرہ یا زمانہ یا مکان کی طرف اس کی اضافت جائز نہیں

۱. وفي القرآن: يَا جِبَالُ اَوْبِيْ مَعَهُ (۲۴-۲۵) وفي الحديث شغلونا عن الصلوة الوسطى حتى آبت الشمس راجع للتاج (اوب).

شاعر نے کہا ہے • (طویل)

(۳۳) وَ لَمْ يَبْقَ إِلَّا آلُ خَيْمٍ مُنْضِدٍّ

کہ مرتب خیموں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا۔

اور آل اس حالت کو بھی کہتے ہیں جس کی طرف انسان کا

معاملہ آخر کار لوٹ کر آئے، شاعر نے کہا ہے •

سَا حَمَلُ نَفْسِي عَلَى آيَةٍ

فَمَا عَدَيْهَا وَأَمَّا هَا

آخر الامر میں اپنی جان کو ایسے امر پر مجبور کر دوں گا وہ یا تو اس

کے لیے نقصان دہ ہوگی یا فائدہ مند۔

اور آل بمعنی سراب بھی آتا ہے یعنی وہ جو ہوا کے تہوج سے

یا ویسے بے حقیقت چیز (دوپہر کے وقت) دکھائی دیتی

ہے، لہذا یہ اصل میں آل اول سے ہے جس کے معنی لوٹنا

کے ہیں۔ آل اللَّبَنُ دودھ گاڑھا ہو گیا گویا اس میں

نقصان کی طرف رجوع ہونے کے معنی لٹوٹا ہے جیسا کہ

ناقص چیز کو راجع کہا جاتا ہے۔

التَّائِيلُ: یہ بھی اول سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی چیز

کے اصل کی طرف رجوع ہونے کے ہیں اور جس مقام کی

طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے اُسے مَوَيْلٌ (جائے بازگشت)

کہا جاتا ہے۔ پس تَسَاوَيْلٌ کسی چیز کو اس غایت کی طرف

لوٹانا کے ہیں جو اس سے بلحاظ علم یا عمل کے مقصود ہوتی

ہے۔ چنانچہ غایت علمی یا عملی کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ

خصوص کی نسبت ہے یعنی ہر آل نبی اس کی امت میں داخل ہے مگر ہر امتی آل نبی نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ

لوگ تمام مسلمانوں کو آل نبی میں داخل سمجھتے ہیں۔ تو انہوں

نے فرمایا: یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ سائل نے عرض کی یہ

کیسے؟ فرمانے لگے: غلط تو اس لیے کہ تمام امت آل نبی

میں داخل نہیں ہے اور صحیح اس لیے کہ وہ شریعت کے کما حقہ

پابند ہو جائیں تو انہیں آل النبی کہا جاسکتا ہے۔ •

اور آیت کریمہ: ﴿ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِنْ آلِ

فِرْعَوْنَ ﴾ (۲۸:۳۰) اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک

مؤمن شخص..... کہنے..... میں اس مرد مؤمن کے آل فرعون

ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ (بظاہر) تو اس کے خصوصی اہل

کاروں اور فرعون شریعت کے ماننے والوں سے تھا اور مسکن

و نسب کے اعتبار سے انہیں میں سے شمار ہونا تھا نہ اس لیے

کہ وہ لوگ بھی اسے اپنی شریعت کا پابند خیال کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جبرئیل اور میکائیل میں

رہا اہل اسماء حسنی سے ہے مگر قواعد عربیہ کی رو سے یہ صحیح نہیں

ہے کیونکہ اگر یہ اسماء مرکب اضافی ہوتے تو لفظ اہل کو

مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہونا چاہیے تھا۔

أَلُّ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کا شخص کے ہیں اور جو

دور سے مضطرب نظر آ رہا ہو۔

① وفي الحديث آل محمد كل تقى (طس) والرسالة الفثريه ص ٥٦ عن انس) انظر المجالس للشيخ الجيلاني والشفاء للقاضي عياض مع شرح نسيم الرياض وايضا الرمضة (شرح المذهب للنووي).

② قاله زهير يمدح هرم بن سنان وصدرة: ارتب بها الارواح كل عشية..... وفي رواية فلم بدل ولم والبيت في ديوانه ١٨٠ (بشرحه للشنمري طبع ليدن ١٣٠٦ هـ والعقد الثمين ٧٩ ومختار الشعر الجاهلي (٢٠٨:١) والبحر (٤٥٥:١) وفيه آل نوي بدل آل خيم وفي اللسان انظر صدرالبيت وعجزه: وسفع على آس ونوي متعاب ونسبه الى النابغة ويروي عجزه وثم على عرش الخيام غسيل وقال ورواه ابو عبيدة للنابغة وتعلب للزهير.

③ قاله خنساء في رثاء ابي عمرو والبيت في اللسان والمحكم (علاء، فوق) وايام العرب ٢٩ يوم حوذة الثاني (٨) والكمال للسبرد (١٢١٦) في ستة ابيات.

اس کا مادہ (دول) ہے اس لیے اَوَّلُ بروزن اَفْعَلَ ہوگا لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ فا اور عین کلمہ میں دو حرف یک جنس نہایت قلیل الاستعمال ہیں۔ بہت صورت میں یہ اَوَّلُ سے مشتق ہوگا جس کے معنی اصل کی طرف رجوع ہونا کے ہیں اور اَوَّلُ اصل میں اَوَّلُ ہوگا کثرت استعمال کے باعث الف ثانی کو واؤ میں ادغام کر دیا گیا ہے۔

اَوَّلُ: اصل میں صیغہ صفت ہے کیونکہ اس کی تانیث اَوَّلٰی بروزن اُخْرٰی آتی ہے ۱۰ بس اَوَّلُ وہ ہے جس پر اس کا غیر مرتب ہو اور بچہ وجوہ استعمال ہوتا ہے۔

(۱) جو دوسرے پر باعتبار زمانہ متقدم ہو جیسے عبدالملک اور ثم منصور کہ پہلے عبدالملک اور پھر منصور۔

(۲) اور مرتبہ اور ریاست کے اعتبار سے دوسرے پر متقدم ہو اور دوسرا اس کی ابتدا کرے جیسے الامیر اولام اللوزیر۔ کہ پہلے امیر اور اس کے بعد وزیر۔

(۳) وضع اور نسبت کے اعتبار سے پہلے ہو جیسے ایک شخص عراق سے روانہ ہو تو اسے کہا جائے گا القادسیۃ اولاً ثم قید۔ کہ پہلے قادسیہ آئے گا اور پھر قید۔ روانہ ہونے والے کو کہا جائے گا کہ پہلے قید اور پھر قادسیہ آئے گا۔

(۴) جو نظام صناعتی کے اعتبار سے متقدم ہو جیسے الاس اولاً ثم البناء۔ کہ پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے اس پر عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

غایت علمی کے متعلق فرمایا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ (۶:۳) حالانکہ اس کی مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور غایت علمی کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔ ۱۰

(۳۵) وَلِلنَّوَى قَبْلَ يَوْمِ النَّبِيِّ تَأْوِيلٌ

اور جدائی کے دن سے پہلے ہی جدائی کا انجام کار اور اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اور قرآن میں ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ﴾ (۵۳:۷) اب صرف وہ اس کی تاویل یعنی وعدہ عذاب کے انجام کار کا انتظار کر رہے ہیں جس دن اس وعدہ عذاب کے نتائج سامنے آ جائیں گے۔

یعنی اس دن سے جو غایت مقصود ہے وہ عملی طور پر ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

اور آیت کریمہ: ﴿ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (۵۹:۳) میں بعض نے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے احسن تاویلا ہونا مراد لیا ہے اور بعض نے آخرت میں بلحاظ ثواب کے احسن ہونا مراد لیا ہے۔

الْأَوَّلُ: (ن) کے معنی ہیں مآل اور نتیجہ پر رکھتے ہوئے سیاست اور انتظام کرنا۔ اسی سے کہا جاتا ہے: قَدْ أَلْنَا وَإِلَّ عَلَيْنَا ہم نے حکومت کی اور ہم پر حکومت کی گئی۔

الْأَوَّلُ: خلیل کے نزدیک اس کی اصل (اول) ہے اس لیے فَعَلَ کے وزن پر ہوگا بعض کا خیال ہے کہ

۱ قاله عبدة بن الطيب و صدره و للاجحة ايام مذكرها و البيت في المفضليات (۱۳۴:۱) و تفسير الطبري (۴: ۴۳) و تاريخ الطبري

(۴۳: ۴) و القصيد في منتهى الطلب (۱۸۹: ۱) (۱۹۲).

۲ وفي القرآن: وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (۱۳-۹۲) راجع أيضاً (الدخان: ۷۳۵-۵۶) النجم: ۲۵-۵۰-۵۶ (الواقعة: ۶۲)

(النارعات: ۲۵) (الاعلى: ۱۸) (الضحى: ۴).

روکنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے عموماً یہ کلمہ مکرر آتا ہے گویا اسے تشبیہ کی جاتی ہے کہ وہ انجام پر غور کر کے اس سے بچنے کی کوشش کرے۔^۱

اون

آلان: ہر وہ لمحہ جو ماضی اور مستقبل کے مابین فرض کیا جائے اسے آلآن کہا جاتا ہے۔ جیسے آلآن افععل کذا (میں اب کرتا ہوں) اور آلآن کا لفظ ہمیشہ الف لام تعریف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور افععل کذا آونۃ کا محاورہ بھی آلآن سے ماخوذ ہے۔ ہذا اوان ذالک (یہ اس کا صحیح زمانہ یا وقت ہے) سیبویہ نے کہا ہے کہ آلآن آنک کے معنی ہیں ہذا الوقت وقتک اسی سے فعل آن یؤون آوناً استعمال ہوتا ہے۔

ابوالعباس لکھتے ہیں کہ یہ "آلان" سے نہیں ہے بلکہ ایک مستقل اور علیحدہ فعل ہے۔

اواہ

آلاواہ: وہ شخص جو بہت زیادہ تاؤہ کرتا ہو اور تاؤہ کے معنی ہیں حزن و غم ظاہر کرنے کے لیے آوہ زبان پر لانا اور ہر وہ کلمہ جس سے تاسف اور حزن کا اظہار ہوتا ہو اسے تاؤہ سے تعبیر کر لیتے ہیں لہذا آواہ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو خشیت الہی کا بہت زیادہ اظہار کرنے والا ہو۔

اور جب صفت باری تعالیٰ میں ہو الاوّل کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو اور جن علماء نے اوّل کے معنی غیر محتاج یا مستغنی بضمہ کیے ہیں ان کا اشارہ بھی اسی معنی کی طرف ہے۔

اور آیت ﴿وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ (۱۶۳:۶) اور آیت ﴿وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۳۳:۷) میں اوّل کے معنی یہ ہیں کہ اسلام و ایمان میں ہی سب سے پہلے دوسروں کے لیے اسوہ اور مقتدا بننا ہوں اسی طرح آیت: ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ (۴۱:۲) کے معنی یہ ہیں کہ کفر میں پہل کر کے دوسروں کے لیے اسوہ اور پیشوا نہ بنو کہ لوگ تمہاری اقتداء کریں۔

کبھی اوّل کا لفظ بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں یعنی علی الضم ہوتا ہے، جیسے جئته اوّل۔ اور کبھی اوّل بمعنی قدیم بھی آ جاتا ہے، جیسے جئتک اوّلاً و آخراً ای قدیماً و حدیثاً یعنی پہلے بھی آیا تھا اور اب بھی۔

اور آیت کریمہ: ﴿أَوَّلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ﴾ (۳۵:۷۵) میں اولیٰ کلمہ تہدید اور تخویف ہے اور جو شخص ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو اسے تشبیہ کرنے کے لیے آتا ہے، پھر جو شخص بڑی ذلت کے بعد ہلاکت سے بچ جائے اسے دوبارہ

① قال فی اللسان الاصل فی "الآن" ان یكون لزمان الحال ثم توسعوا فيه للوصف واللام فيه للتعريف واصل "الآن" اوان حذف الهمزة ثم غیرت واوہا الی الف کما فی الراح والریاح۔

② بنصب الآن ورفع آنک قال ابن جنی وکذا قرأناه فی الكتاب لسیبویہ راجع اللسان (ابن) و الكتاب۔

③ ابوالعباس محمد بن یزید (۲۱۰ھ ۲۸۶) الشمال المعروف بالمرید امام العربیة واحد ائمة الادب والاحبار ومن کتبه المطبوعه "الکامل" وشرح لامیة العرب المطبوع مع شرح الزمخشری وله کتب اخری معرفة قال الزبیدی فی شرح خطبته القاموس المرید بفتح الراء المشددة وبعضهم یکسر راجع لاحواله الزهدة ۲۸۵ والبعیة ۱۱۶ والفهرست ۵۹ وطبقات الزبیدی رقم ۴۰ والانساب ۱۱۶ (لثمالی) والحصری

۲/۲۱۶/۲۳۷ والادباء: ۱۳۷/۷ والوجیات: ۴۹۵/۱ ولسان المیزان ۵: ۴۳۰ ومعانی العسکری: ۱۷۸/۱

الْمَاوِي ﴿١٥:٥٣﴾ میں لفظ جَنَّة کی اضافت ماویٰ (مصدر) کی طرف ہے، جیسا کہ ﴿ذَارُ الْخُلْدِ﴾ (۲۸:۳۱) میں لفظ دار کی اضافت الْخُلْد مصدر کی طرف ہے ﴿اور آیت ﴿مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (۹۷:۱۷) میں مَاوٰی کے معنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔

اَوَيْتُ لَهُ اَوْيَا وَايَةً وَمَاوِيَةً وَمَاوَاةَ کے معنی ہیں: میں نے اس پر رحم کھایا۔ اصل میں اس کے معنی رَجَعْتُ اِلَيْهِ بِقَلْبِي کے ہیں یعنی میں دل سے اس کی طرف مائل ہوا۔

اور آیت کریمہ: ﴿اَوَىٰ اِلَيْهِ اٰخَاهُ﴾ (۶۹:۱۲) کے معنی یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا اور حاتم طائی کے شعر ﴿الطويل﴾ (۳۶) اَمَاوِي اِنَّ الْمَالَ عَاِدٍ وَّرَايْحٍ .

اسے ماویہ! بے شک مال صبح شام آنے جانے والی چیز ہے۔ میں الْمَاوِيَّة عورت (بیوی) کا نام ہے چنانچہ بعض نے اسے بھی اسی باب (اویٰ) سے مانا ہے اور کہا ہے کہ گویا قبول صورت (ماوی الصوره) ہونے کی وجہ سے اسے الماویہ کہا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے: یہ ماء کی طرف نسبت ہے۔ اور اصل میں مائئیہ ہے ہمزہ کو واو کے ساتھ بدل لیا گیا ہے۔ ﴿

اور آیت کریمہ: ﴿اَوَاةٌ مُّسَيَّبٌ﴾ (۷۵:۱۱) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) مؤمن اور بہت زیادہ دعا کرنے والے تھے مال کے اعتبار سے یہ معنی بھی ما تقدم کی طرف راجع ہے۔

ابو العباس فرماتے ہیں کہ کام کے روکنے کے لیے کلمہ ”اِيْهًا“ اور ترغیب دینے کے لیے وَيْهًا کہا جاتا ہے اور اظہار تعجب کے لیے وَاَهَا کہتے ہیں۔

اوی

الْمَاوِي: یہ اوی (ض) اُوِيًا و مَاوِي کا مصدر ہے (جس کے معنی کسی جگہ پر نزول کرنے یا پناہ حاصل کرنا کے ہیں) اور اَوِي اِلَى كَذَا کے معنی ہیں کسی کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا اور اَوَاه (افعال) اِنسَاء کے معنی ہیں کسی کو جگہ دینا قرآن میں ہے: ﴿اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكُهْفِ﴾ (۱۰:۱۸) جب وہ اس غار میں جا رہے۔ ﴿قَالَ سَاوِي اِلَى جَبَلٍ﴾ (۳۳:۱۱) اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جا لگوں گا۔ ﴿وَتَسُوِي اِلَيْكَ مَن تَشَاءُ﴾ (۵۱:۲۳) جسے چاہو اپنے پاس ٹھکانا دو۔ ﴿وَفَصَّلْتَهُ الَّذِي تُوُوِيهِ﴾ (۱۳:۷۰) اور اپنا خاندان جس میں رہتا تھا۔ اور آیت کریمہ: ﴿عِنْدَهُ جَنَّةٌ

۱ فی النسخ المطبوعة كلها دار الخلود تصحيف وجاء في التنزيل يوم الخلود (۵۰-۳۴) في آية فقط واما كلمة خلد فقد جاء في آيات (۱۰-۵۲) (۲۰-۱۲۰) (۲۱-۳۴) (۲۵-۱۰) (۳۲-۱۴) .

۲ قال في شواهد الكشاف ۶۰ ان ماوية اسم ام حاتم وهي بنت عفیر و كانت تلومه في جودة بالمال واصله نسبة الى الماء لانه تشبيه في اللين والرقة وعجز البيت وبقية من المال الاحاديث والذكر انظر ديوانه ۵۰ في ۲۰ بيتاً وراجع للبيت ايضا الخزانة ۴: ۱۵۸: ۳/ ۱۹۳: ذيل الامالي ۳۰ في اربعة ابیات والعقد ۱: ۲۳۶: في ۱۵ بيتاً وقيل انه افضل ما قيل في الحدود ورايت في مقدمة ديوان (بيروت ۱۸۳۸) ان ماويه زوجة وذكر فيه قصة زواجه معه.

۳ راجع شرح شواهد الكشاف - ۶ .

ای

آی: جب استفہام کے لیے ہو تو جنس یا نوع کی تعیین اور تحقیق کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے اور یہ خبر اور جزا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ❶، چنانچہ فرمایا: ﴿أَيَّمَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾ (۱۱۰:۱۷) جس نام سے اسے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔ ﴿أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ﴾ (۱۸:۲۸) کہ میں جو کسی مدت (چاہوں) پوری کر دوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

آلایۃ: اسی کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں۔ دراصل ”آیۃ“ ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کر لیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کر لیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے، چنانچہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ اس نے راستہ پایا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہو جاتا ہے۔

آیۃ کا لفظ یا تو آی سے مشتق ہے کیونکہ یہ بھی ایک چیز کو دوسری سے تمیز دیتی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تَسَائِي (مصدر تفعّل) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز پر

ٹھہرنے اور تثبت حاصل کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: تَأَيَّ (امر) یعنی ٹھہرو اور رفیق سے کام لو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَوَى إِلَيْهِ سے مشتق ہو۔

(۱) آيۃ کا لفظ بلند عمارت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ﴾ (۱۲۸:۲۶) کہ تم پر فضا مقام پر بے کار نشان تعمیر کرتے ہو۔ (۲) اور قرآن پاک کے ہر اس حصہ کو جو کسی حکم پر دال ہو آيۃ کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ایک سورۃ ہو یا اس کی ایک فصل یا کئی فصلیں ہوں۔

(۳) اور کبھی ہر اس کلام کو جو لفظی اعتبار سے دوسرے سے الگ ہو آيۃ کہہ دیا جاتا ہے اسی اعتبار سے سُورۃ کی آیات کو آیات کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ سورۃ شمار کی جاتی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳۳:۲۹) میں آیات سے فکری دلائل مراد ہیں کہ لوگ اپنے مراتب عالیہ کے اعتبار سے ان کی معرفت میں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ﴾ (۳۹:۲۹) بلکہ یہ اہل علم کے نزدیک واضح دلائل ہیں اور ہمارے ان دلائل سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ ﴿وَكَآيِنٌ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۱۰۵:۱۲) اور آسمان و زمین میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔

پھر قرآن مجید میں کسی خاص معنی کا لحاظ کرتے، بعض موضوع میں آيۃ مفرد اور دوسرے مقامات پر آیات بصیغہ

❶ ای یکون شرطاً وقد باتی موصولاً نحو لنزوعن من کل شیعة ایہم اشد (۱۹-۶۹) وفي اعراب الآیۃ اعتراک بین العلماء ویاتی و الاعلیٰ معنی الکمال فیقع صفته للنکرة نحو زید رجل ای رجل وان یکون وصلۃ الی نداء ما فیہ ال نحو یا ایہا الناس فہذہ حمسۃ وجوہ.

ہے کہ ان کے سامنے صرف دلائل بیان ہوں گے اور انھیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا۔ ﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ﴾ (۴۷:۲۳) جس کے متعلق یہ جلدی کر رہے ہیں۔ لفظ آيَة کے وزن میں تین اتوال ہیں۔ (۱) یہ فَعْلَة کے وزن پر ہے ایسے کلمات (جن کے عین اور لام کلمہ میں حرف علت ہو) میں حق تو یہ ہے کہ ان کے لام کلمہ میں تغلیل کی جائے نہ کہ عین کلمہ میں جیسے حَيَاةٌ وَنَوَاةٌ (وغیرہ نظر موجود ہیں) لیکن عین کلمہ میں حرف یا آنے کی وجہ سے لام کلمہ میں تغلیل نہیں ہوئی، جیسے رَايَةٌ وغیرہ۔ (۲) بعض نے کہا ہے یہ فَعْلَة کے وزن پر ہے وہ حرف علت جمع ہونے کی وجہ سے پہلی یاء کو الف سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسے طَائِيٌّ اور طَيٌّ۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ آيَة دراصل اَيِيَّةٌ بروزن فَاعِلَةٌ ہے بغرض تخفیف یاء اول کو حذف کر کے آيَة بنا لیا گیا ہے مگر یہ آخری قول ضعیف ہے کیونکہ آيَة کی تصغیر اَيِيَّةٌ ہے اگر یہ اصل میں فَاعِلَةٌ کے وزن پر ہوتا تو اس کی تصغیر اَوِيَّةٌ آنا چاہیے تھی۔

اَيَانٌ

اَيَانٌ: (کب) کسی شے کا وقت دریافت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ قریب قریب ”متی“ کے ہم معنی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَيَانَ مَرْسَاهَا﴾ (۴۹:۷۹) کہ اس (قیامت) کا وقوع کب ہوگا۔ ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ اَيَانَ يُبْعَثُونَ﴾ (۲۱:۱۶) ان کو بھی یہ معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ﴿اَيَانَ يَوْمِ الدِّينِ﴾ (۱۴:۵۱) کہ جزا کا دن کب ہوگا۔ لفظ اَيَانٌ دراصل اَمِيٌّ سے

جمع لایا گیا ہے جس کی تفصیل اور توضیح اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهُ آيَةً﴾ (۵۰:۲۳) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم کو اَبْتَيْنِیْنِ (دو آیتیں) کہنے کی بجائے آيَة (ایک آیت) قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر (بحیثیت مجموعی) ایک آیت بنتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ اِلَّا تَخْوِيفًا﴾ (۵۹:۱۷) میں بعض نے کہا ہے کہ آیات سے جرات قتل، ضفادع وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جو ام سابقہ پر (بطور عذاب) بھیجی گئی تھیں۔ اور ”تخويفا“ کے لفظ سے متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کریں گے ان پر اسی طرح کے عذاب نازل ہوں گے اور یہ کہ اس قسم کی آیات کو طلب کرنا مکلفین کے خیس ترین ہونے کی دلیل ہے کیونکہ انسان فعل خیر یا تو کسی رغبت اور خوف کی وجہ سے کرتا ہے یہ سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے اور یا اچھی شہرت حاصل کرنے کے لیے۔ مگر اشرف اور اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ فضیلت کو فضیلت سمجھ کر حاصل کیا جائے اور امت محمدیہ چونکہ اشرف امت ہے جیسا کہ آیت: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (۳-۱۱۰) میں مذکور ہے اس لیے انھیں اللہ تعالیٰ نے اس (خیس) مرتبہ سے بلند قرار دیا ہے اور متنبہ کیا ہے کہ گو ان میں سے جہلاء یہ کہہ کر۔ اَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ اَوْ نُنَزِّلْ عَلَيْنَا اِذْءَابَ الْكَلْبِ۔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ان پر عمومی عذاب نہیں آئے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ آیات سے مراد دلائل ہیں اور تنبیہ کی

ا

یہ بھی مجملہ حروفِ ندا ہے، جیسے: اَزِيدُ

اِیْدُ

اَلْاَيْدُ: (اسم) سخت قوت اس سے اَيْدُ (تفعیل)

ہے جس کے معنی تقویت دینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں

ہے: ﴿اَيَّدْتَنكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾ (۱۱۰:۵) ہم نے

تمہیں روحِ قدس سے تقویت دی۔ ﴿وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ

بِنَصْرِهِ مَنْ يَّشَاءُ﴾ (۱۳:۳) یعنی جسے چاہتا ہے اپنی

نصرت سے بہت زیادہ تقویت بخشتا ہے۔ اِدْنُهُ (ض)

اَزِيدُهُ اَيْدًا جیسے بَعَثَهُ اَبِيْعَهُ بِيْعًا (تقویت دینا) اور

اس سے اَيَّدْتُهُ (تفعیل) نکشیر کے لیے آتا ہے،

قرآن میں ہے: ﴿وَالسَّمَاءُ بَنِيْنَآهَا بِاَيِّدٍ﴾

(۲۸:۵۱) اور ہم نے آسمان کو بڑی قوت سے بنایا اور اَيَّدُ

میں ایک لغت آد بھی ہے اور اسی سے امر عظیم کو مُؤَيِّدٌ کہا

جاتا ہے اور جو چیز دوسری کو سہارا دے اور بجائے اسے

اَيَّادُ الشَّيْءِ کہا جاتا ہے ایک قرأت میں اَيَّدْتَنكَ ہے جو

اَفْعَلْتُ (افعال) سے ہے اور اَيَّادُ الشَّيْءِ کے محاورہ

سے ماخوذ ہے، زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فاعلت

(مفعلہ) مثل عاوانت سے بھی ہو سکتا ہے۔

اِیْكُ

اَلْاَيْكُ: درختوں کا جھنڈ (ذوایکة) اور آیت:

﴿اَصْحَابُ الْاَيْكَةِ﴾ (۷۸:۱۵) کی تفسیر میں

بعض نے کہا ہے ۱ کہ اَلْاَيْكَةُ ان کے شہر اور آبادی

کا نام ہے۔

مشتق ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اصل اُیْ اَوَان ہے جس کے معنی ہیں ”کون سا وقت“ الف کو حذف کر کے واو کو یاء اور پھر اسے یاء میں ادغام کر کے اَيَّان بنا لیا گیا ہے۔

اَيَّا

یہ کلمہ ضمیر منصوب منفصل کے تلفظ کے لیے وضع کیا

گیا ہے جب ضمیر (منصوب) (اپنے عامل پر) مقدم ہو یا

اس پر کسی کلمہ کا عطف ڈالا جائے اور یا الا کے بعد آئے تو

اس (اَيَّا) کے ساتھ استعمال ہوتی ہے جیسے (تقدیم کی

صورت میں فرمایا) اَيَّاكَ نَعْبُدُ (۴۰:۱) اور عطف کی صورت

میں فرمایا: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاَيَّاكُمْ﴾ (۲۳:۱۷)

ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ

اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ﴾ (۲۳:۱۷) اور تیرے پروردگار

نے قطعی طور ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

اِیْ

اِیْ: حرف ایجاب سے کلام متقدم کی تحقیق اور

توثیق کے لیے وضع کیا گیا ہے ۱ جیسے فرمایا: ﴿قُلْ اِنِّیْ

وَرَبِّیْ اِنَّهُ الْحَقُّ﴾ (۵۲:۱۰) کہہ دو ہاں خدا کی قسم یہ

سچ ہے۔

اِیْ

اِیْ: یہ حرفِ ندا ہے جیسے اِنِّیْ زَیْدٌ اور کبھی (حرف

تفسیر ہوتی ہے اور) اس بات پر تنبیہ کے لیے بھی آجاتا

ہے کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کی شرح اور تفسیر ہے۔ ۲

اِیَّا

حرفِ ندا ہوتا ہے جیسے اَيَّا زَیْدٌ

۱ ای سواہ کان قبلہا خبر او استفہام وعلی کل حال یکون بعدہا القسم .

۲ وحينئذ یکون ما بعدہا عطف بیان علی ماقبلہا او بدل لاعطف نسق ابن المغنی ۸۰/۱ .

۳ راجع آیت: (۱۷۶-۲۶) (۱۳-۳۸) (۱۴-۵۰) .

ای ن

الْأَيْنُ: (ض) کے معنی تھک کے چلنے سے عاجز ہو جانا کے ہیں۔ نِزَاًنٌ يَشِينُ أَيَّنَاُ اور أَنِيُ يَأْنِيُ أَيَّنَاُ کے معنی کسی چیز کا موسم یا وقت آ جانا کے ہیں اور محاورہ میں بَلَغَ أَنَاهُ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ اُنِيُ (ناقص)

سے مقلوب ہے جیسا کہ پہلے لزر چکا ہے۔

ابوالعباس نے کہا ہے کہ اَنْ يَشِينُ أَيَّنَاُ کا ہمزہ

در اصل حاء سے مقلوب (بدلا ہوا) ہے اور اصل میں حَانَ

يَحِينُ حَيْنًا ہے اور اصل کلمہ الْحَيْنُ ہے۔



www.kitabosunnat.com

ای م

الْأَيَامِي: (۳۲:۲۳) یہ الْآيَمِ کی جمع ہے اور آمَ الرَّجُلِ وَتَأَيَّمَ کے معنی ہیں مرد رنڈوا ہو گیا۔ اور عورت کے بیوہ ہونے کے لیے آمَتِ الْمَرْءَةِ وَتَأَيَّمَتِ کہا جاتا ہے۔

إِمْرَأَةٌ أَيَّمَةٌ: بیوہ عورت رَجُلٌ أَيَّمٌ: رنڈوا مرد

الْحَرْبِ مَأَيَّمَةٌ: جنگ مرد کو عورت سے الگ کر دیتی

ہے الْآيَمِ: سانپ۔

این (ظرف)

یہ کلمہ کسی جگہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے، جیسا

کہ لفظ ”متی“ زمانہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔

کتاب الباء

www.KitaboSunnat.com

ب

الباء: (حرف جار) یہ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضر کے متعلق ہو کر استعمال ہوتی ہے پھر متعلق بفعل ظاہر دو قسم پر ہے۔

(۱) ہمزہ افعال کی طرح تعدیہ فعل کیلئے آتی ہے جیسے ذہبت بہ واذہبتہ۔ قرآن پاک میں ہے ﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ (۷۲:۲۶) جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) آلہ کے لیے ہوتی ہے ﴿جیسے قطعته بالسکین﴾ (میں نے اسے چھری سے کاٹا) اور متعلق بمضر کبھی موضع حال میں ہوتی ہے۔ جیسے خرج بسلاحه (یعنی وہ نکلا) دراں حالیکہ اس پر یا اس کے ساتھ اسلحہ بھی تھا۔ اور کبھی زائدہ ہوتی ہے جیسے فرمایا: ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (۱۷:۱۲) اور اب ہماری بات کو باور نہیں کریں گے۔

اس جگہ میں اور مَا أَنْتَ مُؤْمِنًا میں فرق ہے۔ کیونکہ منصوب ہونے کی صورت میں متکلم کے ذہن میں ایک ہی ذات کا تصور ہے جیسا کہ زَيْدٌ خَارِجٌ میں ہے مگر مجرور ہونے کی صورت میں جیسے مَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ہے وہ ذات کا تصور ہے جیسا کہ لَقِيتُ بِزَيْدٍ رَجُلًا فَاضِلًا میں ہے ﴿کہ یہاں

فَاضِلًا سے زید ہی مراد ہے مگر اسے ایسی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ایک شخص (فَاضِلًا) متصور ہوتا ہے گویا تقدیر کلام یہ ہے رَأَيْتُ بَرُوقًا لَكَ آخِرٌ وَهُوَ رَجُلٌ فَاضِلٌ اسی طرح رَأَيْتُ بِكَ حَاتِمًا فِي السَّخَاءِ کا محاورہ ہے، چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۱۴:۲۶) اور میں مومنوں کو راندنے والا بھی نہیں ہوں۔ ﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ﴾ (۳۶:۳۹) کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں ہے، مگر شیخ فرماتے ہیں کہ یہ کلام محل نظر ہے ﴿اور آیت کریمہ: ﴿تُنَبِّئُ بِاللُّدْهَنِ﴾ (۲۰:۲۳) میں بعض نے کہا ہے یہ تنبیت الدہن کے معنی میں ہے ﴿مگر اس آیت سے یہ معنی مقصود نہیں ہے بلکہ تُنَبِّئُ النَّبَاتِ وَمَعَهُ اللُّدْهَنِ کے ہم معنی ہے ﴿یعنی اس میں بالقوہ روغن موجود ہوتا ہے اور بِاللُّدْهَنِ کا لفظ لا کر اللہ تعالیٰ کے انعام پر تشبیہ کی ہے نیز اس کے نکالنے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

بعض نے کہا ہے اس میں باء حال کے معنی میں ہے یعنی درآئحالیکہ اس میں روغن موجود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہمزہ اور باء دونوں برائے تعدیہ آتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی کلمہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

۱ الباء فی الآیة للالصاق المسجازی لالتعدیة واما نوعان راجع ابن هشام : ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷ اوباء التعدیة تسمى باء النقل والاولی للمثل ذهب الله بنورهم (۱۷:۲)۔

۲ وتسمى باء الاستعانة.

۳ الاولی ان تكون الباء فیها للسبب ای بسبب لقالی اباه واصحاب المعانی یسمون مثل هذا الباء .

۴ ای الشیخ عبدالقادر الجرجانی .

۵ ای الباء زائدة .

۶ فعل هذا یكون الظرف حال من المفعول ای تنبیه التسخیر مصاحبا للدهن .

کہ یہاں بھی باؤ آلہ کی ہے اور اصل میں لا تُلْقُوا أَنْفُسَكُمْ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ہے مگر مفعول کو عدم ضرورت اور معنوی عموم کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے، اسی طرح دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اور آیات: ﴿عَيْنَا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ﴾ (۲۸:۸۳) وہ ایک چشمہ ہے جس سے (خدا کے) مقرب بندے پئیں گے۔ ﴿عَيْنَا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ﴾ (۶:۷۶) یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے خدا کے بندے پئیں گے..... میں بعض نے کہا ہے کہ باء بمعنی من ہے ﴿أَي يَشْرَبُ مِنْهَا﴾ اور بعض نے زائد کہا ہے: أَيْ يَشْرَبُهَا، لیکن صحیح یہ ہے کہ باء کو اس کے معنی پر رہنے دیا جائے اور کہا جائے کہ عینا سے پانی مراد نہیں ہے، بلکہ چشمہ کا گڑھا ہے، لہذا یہ مکاناً يَشْرَبُ بِهَا کی طرح ہوگا۔ ﴿اور آیت: ﴿فَلَا تَحْسَبَنَّاهُمْ بِمَقَارَءٍ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (۸۸:۳) میں بھی بِمَقَارَءٍ کے معنی بموضع الفوز کے ہیں یعنی ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ کسی نجات کی جگہ کے ذریعہ عذاب سے درشتکار ہو جائیں گے۔

ب ا و ر

الْبُورُ: (کنوئیں) اصل میں مہوز (الحین) ہے۔ بَأْرَتْ بُشْرًا وَبَأْرَتْ بُورَةً کے معنی گڑھا کھودنے کے ہیں۔ ۷

اور آیت کریمہ: ﴿وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾ (۲۸:۲۸) میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے ﴿اور یہ اصل میں وَكَفَى اللَّهُ شَهِيدًا ہے جیسا کہ آیت: ﴿وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ﴾ (۲۵:۳۳) میں ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے تو لازم آتا ہے آیت مقیس علیہ میں بھی ﴿وَكَفَى بِاللَّهِ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ﴾ کہنا صحیح ہو حالانکہ درست نہیں ہے کیونکہ باؤ زائدہ اسی مقام پر آتی ہے جہاں اس کے بعد منصوب موضع حال میں مذکور ہو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لہذا صحیح یہ ہے کہ یہاں کفئی کا لفظ اکتف (امر) کی جگہ لایا گیا ہے ﴿جیسا کہ أَحْسِنَ بَزِيدٍ فِي لَفْظِ احْسِنَ مَا احْسَنَ كِي جگہ لایا گیا ہے ﴿اور آیت کے معنی یہ ہیں اَكْتَفِ بِاللَّهِ شَهِيدًا اور اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَكَفَى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا﴾ (۳۱:۲۵) ﴿وَكَفَى بِاللَّهِ وَلِيًّا﴾ (۳۵:۴) اور خدا ہی کا ساز کافی ہے۔ ﴿أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا﴾ (۵۳:۴۱) کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے اور حُبِّ إِلَى بِفَلَانِ کا محاورہ بھی اسی توجیہ پر محمول ہوگا۔ اسی أَحْبَبَ إِلَيَّ بہ۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (۱۹۵:۲) میں بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے ﴿اور اصل میں لا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ ہے، لیکن صحیح یہ ہے

- ۱ قال الفراء زيدت الباء للمبالغة في المدح كما قالوا: ظرف بعد الله واقل بزيد وحسبك بصديقنا (اللسان).
- ۲ قاله الزجاج وصرح ابن هشام بان هذا التوجيه بعيد راجع الاتقان ج ۱ ص ۱۵۹ والمعنى.
- ۳ اى غير الخبر الى معنى الطلب.
- ۴ لا كره ابن هشام فى المبنى وقال الثانى: مما تزداد فيه الباء على المفعول كما فى الآية.
- ۵ قاله الفارسى والاصمعى والقبتي واين مالك (ابن هشام: ص ۱۱).
- ۶ اى الباء للاستعانة كما قاله الزمخشري فالمعنى يشرب بها الخمر.
- ۷ ومنه ابتر بمعنى ادخرونى الحديث: فلم يبتشر شيئا اى فلم يدخر (اللسان)

وقت ثابت قدم رہیں۔ ﴿بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ﴾
(۱۳:۵۹) ان کا آپس میں بزارعب ہے۔

بُؤْسٌ يَبْتُؤُسُ (بَأْسًا) بہادر اور مضبوط ہونا۔ اور آیت
کریمہ: ﴿بِعَذَابِ بَيْتِيسَ﴾ (۱۶۵:۷) میں بَيْتِيسُ
بروزن فعلیل ہے اور یہ بَأْسٌ یا بُؤْسٌ سے مشتق ہے یعنی
بڑے سخت عذاب میں اور آیت کریمہ: ﴿فَلَا تَبْتِئِسْ﴾
(۳۶:۱۱) کے معنی یہ ہیں کہ غمگین اور رنجیدہ رہنے کے
عادی نہ بن جاؤ۔ حدیث میں ہے: ﴿أَنَّهُ عَلِيٌّ
السَّلَامُ كَانَ يَكْرَهُ الْبُؤْسَ وَالتَّبَاؤُسَ وَالتَّبْتِئُسَ﴾ کہ
آنحضرت ﷺ کو یہ بات بری لگتی تھی کہ فقراء دوسروں

کے سامنے عجز و انکساری کریں یا کوئی شخص اپنے آپ کو
ذلیل کرے (اور عزت نفسی کا خیال نہ رکھے) بَيْتِيسَ: فعل
ذم ہے اور ہر قسم کی مذمت کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا
کہ نِعَمٌ ہر قسم کی مدح کے لیے استعمال ہوتا ہے ان کا اسم
اگر معرف باللام ہو یا معرف باللام کی طرف مضاف ہو تو
اسے رفع دیتے ہیں جیسے بَيْتِيسَ الرَّجُلِ زَيْدٌ وبتس
غلام الرَّجُلِ زَيْدٌ اور اسم نکرہ کو نصب دیتے ہیں جیسے
قرآن پاک میں ہے: ﴿بَيْتِيسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾
(۷۹:۵) ﴿أَيُّ بَيْتِيسَ شَيْئًا يَفْعَلُونَ﴾ یعنی بلاشبہ وہ
برا کرتے تھے۔ ﴿وَبَيْتِيسَ الْقَرَارِ﴾ (۲۹:۱۴) اور وہ برا
ٹھکانا ہے۔ ﴿فَبَيْتِيسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَبَيْتِيسَ مُعْطَلَةٌ وَقَصِيرٌ
مَّشِيدٌ﴾ (۲۵:۲۲) اور بہت سے کنویں بیکار اور محل
دیران پڑے ہیں۔

اسی سے الْمُشْتَبِرُ کا لفظ مشتق ہے جو اصل میں اس
گڑھے کو کہتے ہیں جس کا منہ اس طرح ڈھانپ دیا جائے
کہ جو شخص اس کے اوپر سے گزرے اس میں گر پڑے
ایسے گڑھے کو مغواۃ بھی کہا جاتا ہے اور کنایۃً مُشْتَبِرٌ
ایسی سخن چینی کو کہتے ہیں جو انسان کو بلا میں ڈالنے والی ہو
اس کی جمع الْمُمَابِرُ آتی ہے۔

ب و س

الْبُؤْسُ وَالْبَأْسُ وَالْبِئْسَاءُ: تینوں میں سختی اور
ناگواری کے معنی پائے جاتے ہیں مگر بُؤْسٌ کا لفظ زیادہ تر فقر
وفاقت اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے اور الْبِئْسُ وَالْبِئْسَاءُ
بمعنی نکلیہ (یعنی جسمانی زخم اور نقصان کے لیے آتا ہے،
قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ
تَنْكِيلًا﴾ (۸۳:۴) اور خدا لڑائی کے اعتبار سے بہت سخت
ہے اور سزا کے لحاظ سے بھی بہت سخت ہے ﴿فَأَخَذْنَا هُمْ
بِالْبِئْسَاءِ وَالضَّرَاءِ﴾ (۴۲:۶) پھر (ان کی نافرمانیوں کے
سبب) ہم انھیں سختیوں اور تکلیفوں میں پکڑتے رہے۔
﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبِئْسَاءِ وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ﴾
(۱۷۷:۲) اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کا رزار کے

۱ وفي اللسان (باس) اويجوز التبوؤس اي بالقصر والتشديد وكذا جاء في حديث الصلوة: ان تفجع بديك وتباس فانه كلمه من بتس بمعنى افتقر والحديث اخرجه ابو نعيم في تاريخ اصبهك وحمزه السلمى في تاريخ جرجان عن ابى هريره ان الله اذا نعم على عبد نعمة ويكره البوس والتبؤس ورواه ابو يعلى والبيهقى في الشعب وبيغض البؤس والتبؤس انظر ص ۲۳ رقم ۱۸۹ عن ۴۳ رقم ۳۶۰ عن ابى هريره مرفوعاً وفيه عن ابى سعيد وهنا عن يحيى بن عبيدة مراسلاً وبيغض بدل يكره والحديث مذکور مع حديث ان الله جميل يحب الجمال راجع تخريج الكشاف وكنز العمال ۶: ۲۵۸۶، ۵۹۲ لا يحب بدل يكره (طب) هق وايضاً عن زهير بن ابى علفمة ۲۶: ۲۶۱، ۲۶۱۲، ۲۶۱۱، ۲۶۱۰ (ابن ميسرة في اماليه - عن ابى هريره).

کہ تو اللہ تعالیٰ نے ﴿ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴾ (۳:۹۳) کا مقام بخشا ہے، کیونکہ جملہ مؤمنین آپ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کے اور آپ کے دین کے محافظ مقرر کر دیا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؑ نے فرمایا ہے ﴿ (۲۰) أَلْعُلَمَاءُ بِأَقْوَنَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ، أَعْيَانُهُمْ مَفْقُودَةٌ وَأَثَارُهُمْ فِي الْقُلُوبِ مَوْجُودَةٌ۔ علماء تا قیامت باقی رہیں گے ان کے اجسام مفقود ہوتے جاتے ہیں، مگر ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر ثبت رہتے ہیں۔ جب علماء کو یہ فضیلت حاصل ہے جو آنحضرت ﷺ کے متبعین سے ہیں تو آنحضرت ﷺ کی شان تو اس سے کہیں بلند ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ”رفع ذکر“ کا شرف بخشا ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء قرار دیا ہے۔ صلی اللہ علیہ وعلیہم افضل الصلاة والسلام۔

ب ت ک

الْبَتُّ: (ض) یہ قریب قریب بَتُّ (کاٹنا) کے ہم معنی ہے مگر بَتُّ کا لفظ اعضاء یا بال کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے، جیسے بگ شعورہ وَاذْنُهُ اس نے فلاں کے بال یا کان کاٹ ڈالے قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَلْيَبْتِكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ ﴾ (۱۱۹:۳) کہ وہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں۔

(۷۲:۳۹) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے۔ ﴿ بَشْسٌ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا ﴾ (۵۰:۱۸) ظالموں کے لیے برا بدل ہے۔ ﴿ لِبَشْسٍ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴾ (۶۳:۵) بلاشبہ وہ بھی برا کرتے ہیں۔ بَشْسٌ اصل میں بَشْسٌ (س) اور بَشْسٌ سے مشتق ہے۔

ب ا ت ر

الْبَتْرُ: یہ قریباً بَتُّ کے ہم معنی ہے مگر خاص کر دم کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پھر مجازاً قطع نسل کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور اَبْتْرَ اس شخص پر بولا جاتا ہے جس کی موت کے بعد اس کا خلف نہ ہو اور اَبْتْرَ یا اَبَاتْرَ وہ ہے جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے، نیز ﴿ رَجُلٌ أَبَاتِرٌ ﴾ قاطع رحم اور جس خطبہ کے شروع میں حمد و ثنا نہ ہو اسے بھی مجازاً خُطْبَةٌ بَتْرَاءُ کہا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے ﴿ كُلُّ أَمْرٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِذِكْرِ اللَّهِ فَهُوَ أَبْتَرٌ ﴾ (۱۷) ہر وہ کام جس کے شروع میں اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ اَبْتَرُ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ﴾ (۳:۱۰۸) میں اَبْتَرُ کے معنی یہ ہیں کہ تیرے مخالف کا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا۔ جب کفار نے طعن دیا کہ محمد ﷺ کی موت کے ساتھ ہی اس کا نام و نشان منقطع ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی نسل (اولاد) نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ تمہارا بداندیش ہی مقطوع النسل رہے گا، آپ

① والحديث اوردته العلماء بالفاظ مختلفة رواه ابو عوانة في صحيحه واصحاب السنن عن ابى هريرة بلفظ لا يبدأ فيه بحمد لله اقطع احمد في مسنده من هذا الوجه "لا يفتح بذكر الله فهو ابتر واقطع" وللخطيب في الجامع عن الزهري "لا يبدأ فيه بيسم الله الرحمن الرحيم فهو اقطع" ومارواه المؤلف فلم ارفى المراجع بهذا اللفظ راجع تخريج الكشاف ص ۲ رقم ۳.

② انظر لقول على هذا ادب الدنيا والدين نشره اويس وفا ۶۱ ولفظه: وبقي حزان العلم اعيانهم مفقودة واشخاصهم في القلوب موجودة ۱۲.

(۳۸) فَعَلَّ السَّرِيْعَةَ بَادَرَتْ جُدَادَهَا
 قَبْلَ الْمَسَاءِ تَهْمٌ بِالْإِسْرَاعِ
 جیسا کہ باندہ عورت کپڑا بنتی ہوئی اس کے دامن تک پہنچ جاتی ہے اور وہ غروب آفتاب سے قبل اسے ختم کرنے کے لیے جلدی کرتی ہے۔

ب ت ل

آیت کریمہ: ﴿وَتَبْتَلِ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً﴾ (۸:۷۳) کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص نیت اور عبادت میں سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ﴾ (۹۱:۶) کہہ دو کہ (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو چھوڑ دو۔ لہذا اس آیت یعنی ﴿وَتَبْتَلِ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً﴾ اور حدیث ﴿(۲۲) لَا رَهْبَانِيَّةَ وَلَا تَبْتَلِ فِي الْإِسْلَامِ﴾ کے درمیان منافات نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس تجمل سے منع کیا گیا ہے وہ نکاح سے کنارہ کشی انقطاع ہے اور اسی معنی میں مریم علیہا السلام کو اَلْعَذْرَاءُ الْبَتُولُ کہا جاتا ہے کیونکہ مریم علیہا السلام عمر بھرازدواجی زندگی سے کنارہ کش رہیں اور ترک نکاح شرعاً ممنوع ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ﴾ (۳۲:۲۳) کہ اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو

اسی سے سَيْفٌ بَاتِكٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی قاطع تلوار کے ہیں۔ اور جب کسی جانور کے بال یا پر پکڑ کر اس طرح کھینچے جائیں کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں تو اس معنی میں بَتَكْتُ الشَّعْرَ بولتے ہیں اور اس طرح اکھڑے ہوئے بالوں کے قطعہ کو بَتَكَّةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع بَتَكٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے ①

(۳۷) طَارَتْ وَفِي يَدِهَا مِنْ رِيْشَاهَا بَتَكٌ
 وہ (نقاۃ) اڑ گئی اور اس کے ہاتھ میں کچھ پر باقی رہ گئے اور بَتٌ کا لفظ رسی یا تعلق کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے، محاورہ ہے: طَلَّقْتُ الْمَرْءَ بَتَّةً وَبَتَلَّةً۔ میں نے عورت کو قطعی طلاق دیدی۔ بَتُّ الْحُكْمِ بَيْنَهُمَا۔ میں نے ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیا۔ ایک روایت میں ہے ②

(۲۱) لَا صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَبْتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ
 جو شخص رات کو روزہ کی قطعی نیت نہ کرے، اس کا روزہ نہیں ہے۔
 اور بَشَكٌ بھی اس کے ہم معنی ہے مگر یہ لفظ کپڑے کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے تیز روانی کو نَاقَةٌ بَشَكِيٌّ کہا جاتا ہے کیونکہ سرعت رفتار میں اونٹنی کے ہاتھ کو باندھ عورت کے ہاتھ مشابہ ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ③

① قاله زهير وصدرة: حتى اذا ما كف الغلام لها..... والمؤنث يرجع الى القطة والبيت في ديوانه والبحر ۵- ۴۳۳/۳/ ۳۴۸ و مختار الشعر الجاهلي (۱۷۷/۱) وذيل ابدال الى الطيب ۲: ۵۵ والعقد الثمين ۸۷ من قصيدة في ۳۳ بيتا قالها حين اغار بنو اسد على بابل واستاقنها.

② الحديث رواه اصحاب السنن واصله في الصحيحين.

③ قاله المسبب بن علي والبيت من كلمة مفضلية (۲: ۶۰) وايضا وامالي المرتضى (۱: ۵۰۶) وتفي المطبوع حدادها (بالحاء) مصحف والحداد معناه هذب الثوب يعني ان هذا النساچه قد قاربت الفراغ من الثواب وبلغت الى هدبه فهي تبادر للفراغ منه قبل المساء والقصيدة في ذيل الامالي ۱۳۰- ۱۳۲ في ۲۶ بيتا وذكر ان ابا جعفر المنصور استحسنها.

④ حديث النهي عن التبتل رواه الترمذی وابن ماجه عن سمرة رضی الله عنه تعالیٰ وايضا راجع الفائق ۱/ ۲۶۹ و ابو عبيدة في غريبه.

توزَعْنِي الْفِكْرُ کا محاورہ ہے یعنی مجھے فکر نے پریشان کر دیا۔

ب ج س

بَجَسَ الْمَاءُ وَأَبْجَسَ: پانی پھوٹ کر بہ نکلا یہ اِنْفَجَرَ کے ہم معنی ہے مگر اِنْبَجَسَ عام طور پر اس مقام پر بولا جاتا ہے جب کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلا ہو اور اِنْفَجَرَ کا لفظ عام ہے یعنی وہ کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور وسیع جگہ سے بھی۔

یہی وجہ ہے قرآن پاک میں ایک مقام پر ﴿فَأَبْجَسَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۱۶۰:۷) آیا ہے اور دوسرے مقام پر ﴿فَأَنْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۶۰:۲) یعنی تنگ مقام (پتھر) سے پانی بہ نکلنے پر دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مگر جہاں یہ معنی ملحوظ نہیں) جیسے ﴿وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهْرًا﴾ (۳۳:۱۸) کہ دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر بھی جاری کر دی۔ ﴿وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا﴾ (۱۲:۵۳) کہ ہم نے زمین پر چشمے جاری کر دیئے وہاں صرف فَجَّرَ کا لفظ استعمال ہوا بَجَسْنَا نہیں فرمایا۔

ب ح ث

الْبَحْتُ: (ف) کے معنی کریدنا اور تلاش کرنا کے ہیں بَحْتُ عَنِ الْأَمْرِ وَبَحْتُ كَذَا میں نے فلاں معاملہ کے متعلق کریدنی یا فلاں چیز کو تلاش کیا قرآن پاک میں ہے: ﴿فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحُثُ فِي

اور حدیث میں ہے ﴿(۲۳) تَنَّاكُحُوا تَكْثُرُوا فَانِي ابَاهِي بِكُمْ الْاَمَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَه نَكَاحِ كَرَوَاتَا كَه تَهْمَارِي كَثْرَتِ هُو قِيَامَتِ كَه دِنِ دَوْسَرُوں كَه مَقَابَلَه مِیں مَجْهِي تَهْمَارِي كَثْرَتِ تَعْدَادِ سَه فُخْرِ هُو كَا۔

نَخْلَةً مُبْتَلً - کھجور جس کے ساتھ کا چھوٹا پودا اس سے الگ ہو گیا ہو۔

ب ث ث

الْبَثُّ (ن ض) اصل میں بَثُّ کے معنی کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنا کے ہیں جیسے بَثُّ الرِّيحِ التُّرَابَ۔ ہوانے خاک اڑائی، اور نفس کے سخت ترس غم یا بھید کو بَثُّ النفس کہا جاتا ہے۔ بَثَّتُهُ فَاثْبَثَّ مِیں نے اسے منتشر کیا، چنانچہ وہ منتشر ہو گیا اور اسی سے ﴿فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًا﴾ (۶:۵۶) ہے یعنی پھر وہ منتشر ذرات کی طرح اڑنے لگیں اور آیت کریمہ: ﴿وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ﴾ (۱۶۴:۲) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے جانوروں کو پیدا کیا اور ان کو ظہور بخشا اور آیت: ﴿كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ﴾ (۴:۱۰۱) میں المبثوث سے مراد وہ پروانے ہیں جو غمخیز اور پرسکون جگہوں میں بیٹھے ہوں اور ان کو پریشان کر دیا گیا ہو۔ اور آیت: ﴿إِنَّمَا أَشْكُوا بَثْنِي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ (۸۶:۱۲) میں بَثُّ کے معنی سخت ترین اور یہ پوشیدہ غم کے ہیں جو وہ ظاہر کر رہے ہیں اس صورت میں مصدر بمعنی مفعول ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر بمعنی فاعل ہو یعنی وہ غم جس نے میری فکر کو منتشر کر رکھا ہے، جیسا کہ

① الحدیث بالفاظہ مرفوعاً فی الاحیاء مستند الفردوسی للذیلعی وابن مردودیه فی تفسیرہ موقوفاً علی ابن عمرو اسنادہ ضعیف والبیہقی فی المعرفة عن الشافعی انه بلغه راجع الاحیاء بتخریج العراقی ۲۲/۲ والنیل ۱۰۷/۶۔

جیسا کہ البَدِيعُ جو پہلے معمول نہ ہو۔
الْبَدَاةُ: وہ حصہ جس سے تقسیم کی ابتداء کی جائے، اسی سے
گوشت کے بڑے ٹکڑے کو بَدَا کہا جاتا ہے۔

بَدَر

بَدَرْتُ اليه وَبَادَرْتُ: کسی کام کے لیے جلدی
کرنا، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا حَرْبًا مِّنْ أَيْدِي
وَبَدَارًا﴾ (۶:۳) جلدی میں نہ اڑا دینا۔ یعنی اسراف
اور عجلت سے یتیم کا مال مت کھاؤ اور جو لغزش جلد بازی
میں انسان سے سرزد ہو اسے بَادِرَةٌ کہا جاتا ہے۔ بَوَادِرُ
كَانَتْ مِنْ فُلَانٍ بَوَادِرُ كَانَتْ مِنْ فُلَانٍ بَوَادِرُ
فِي هَذَا الْأَمْرِ فُلَانٌ سے اس معاملہ میں جلد بازی سے
لغزشیں ہوئی ہیں۔

الْبَدْرُ: (ماہ کامل) بعض نے کہا ہے کہ پورے چاند کو بَدْرُ
اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سورج سے پہلے طلوع ہوتا ہے
اور بعض نے بَدْرَةٌ (روپے سے بھری ہوئی تھیلی) سے اخذ
کیا ہے اور کہا ہے کہ پورا چاند بھی بَدْرَةٌ کی طرح بھر پور
ہوتا ہے اس لیے اسے بَدْرُ کہا جاتا ہے اس توجیہ کی بنا پر
یہ مصدر بمعنی فاعل ہوگا۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ بَدْرُ کو
اس باب میں اصل قرار دیا جائے۔ اور دوسرے معانی کو
بَدْرُ کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے اس پر مقرر کیا
جائے، مثلاً بَدْرُ كَذَا کے معنی ہوں گے وہ بدر کی طرح
طلوع اور ظاہر ہوا اور معنی اِمْتِلَاءُ کے لحاظ سے دراہم
سے بھری تھیلی کو بَدْرَةٌ کہہ دیتے ہیں اس طرح کھلیان کو
الْبَيْدَرُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی غلہ سے پُر ہو جاتا ہے۔
اور آیت کریمہ: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرِ وَانْتُمْ
أَذِلَّةٌ﴾ (۱۲۳:۳) اور خدا نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی

اسے مقدم کیا۔ اس کے ساتھ ابتدا کی۔
الْبَدْءُ وَالْإِبْتِدَاءُ: ایک چیز کو دوسری پر کسی طور مقدم کرنا،
قرآن پاک میں ہے: ﴿وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ
طِينٍ﴾ (۷:۳۲) اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع
کیا۔ ﴿كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ﴾ (۲۰:۲۹) اس نے کیسے
مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ ﴿اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ﴾
(۱۱:۳۰) خدا ہی نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔ ﴿كَمَا
بَدَأَكُمْ تَعْوَدُونَ﴾ (۲۹:۷) اس نے جس طرح تم کو
ابتداء میں پیدا کیا تھا، اس طرح تم پھر پیدا ہو جاؤ گے۔

مَبْدَأُ الشَّيْءِ: جس سے کوئی چیز مرکب ہو یا اس سے
بنے۔ مثلاً حروفِ تجزی کو مبداء کلام کہا جاتا ہے اور لکڑی
دروازے یا تخت کا مبداء ہے، اسی طرح نَوَاةٌ: (گٹھلی)
کھجور کا مبداء کہلاتی ہے۔ بَدْءٌ (پہلا سردار) یعنی سرداروں
کا شمار کیا جائے تو اس سے ابتدا ہو اور اللہ تعالیٰ کی صفت
میں الْمُبْدِيُّ وَالْمُعِيدُ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر
چیز کی ابتداء اور انتہا کا سبب اصلی ذات باری تعالیٰ ہی
ہے۔ رَجَعَ عَوْدَهُ عَلَى بَدْءِهِ یعنی جس راستہ پر آیا
اسی پر واپس لوٹا۔ فعل ذالک عائداً وَبَادِئاً أَوْ مُبْدِئاً
وَمُعِيداً۔ اسے سب سے پہلے کیا ابْدَأْتُ مِنْ أَرْضٍ
كَذَا۔ یعنی میں نے فلاں سرزمین سے سفر شروع کیا اور
آیت کریمہ: ﴿بَادِيَ الرَّأْيِ﴾ (۲۷:۱۱) رائے فطری
یعنی وہ رائے جو ابتداء سے قائم کر لی جائے۔

ایک قرأت میں بَادِي الرَّأْيِ بدوں ہمزہ کے ہے اس
صورت میں اس کے معنی ظاہری رائے کے ہوں گے جس
میں غور و فکر سے کام نہ لیا گیا ہو۔
شَيْءٌ بَدِيءٌ: انوکھی چیز جو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئے

كُلُّ مُحَدَّثَةٍ بِدْعَةٍ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ کہ ہر نئی رسم بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔ اَلْاِبْدَاعُ بِالسَّرِّجْلِ: سواری کے ماندہ اور دبلا ہونے کی وجہ سے رفقاء سے منقطع ہو جانا۔^❶

بَدَل

اَلْاِبْدَالُ وَالتَّبْدِيلُ وَالتَّبَدُّلُ وَالْاِسْتِبْدَالُ کے معنی ایک چیز کو دوسری کی جگہ رکھنا کے ہیں یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔ خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ﴾ (۵۹:۲) تو جو ظالم تھے انھوں نے اس لفظ کو جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا۔ ﴿وَلِيَسِدْ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اٰمَنًا﴾ (۵۵:۲۳) اور خوف کے بعد ان کو امن بخشنے گا۔ اور آیت: ﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ (۷۰:۲۵) کے معنی بعض نے یہ کیے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹادیں اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور ان کے نیک عملوں کا انھیں ثواب عطا کرے گا۔ ﴿فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ﴾ (۱۸۱:۲) تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔ ﴿وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ﴾

تھی اور اس وقت بھی تم بے سرو سامان تھے۔ میں بندر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور مقام کا نام ہے۔^❶

بَدَع

اَلْاِبْدَاعُ: کسی کی تقلید اور اقتداء کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ اسی سے نئے کھودے ہوئے کنویں کو ذَكِيَّةٌ بَدِيعٌ کہا جاتا ہے۔ جب اِبْدَاعُ کا لفظ اللہ عزوجل کے لیے استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان کے کسی شے کو ایجاد کرنا اور یہ معنی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اور اَلْبَدِيعُ بمعنی مُبْدِعٌ بھی آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ (۱۱۷:۲) اور بمعنی مُبْدِع (اس مفعول) بھی آجاتا ہے، جیسے رَكِيَّةٌ بَدِيعٌ (نیا کھودا ہوا کنواں)

اسی طرح بِدْعًا کا لفظ بھی اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ﴾ کہ میں کوئی نیا پیغمبر نہیں ہوں۔ (۹:۳۶) میں بِدْعًا بمعنی مُبْدِع بھی ہو سکتا ہے یعنی پیغمبر ایسا کہ مجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہ آیا ہو اور بمعنی مُبْدِع کے بھی یعنی میں کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ اَلْبَدِيعَةُ: مذہب میں نئی بات داخل کرنا ہوگا جس کا قائل یا فاعل صاحب شریعت کی اقتداء نہ کرے اور نہ ہی سلف صالحین اور اصول شریعت سے اس کا ثبوت ملتا ہو، ایک روایت میں ہے۔^❶

❶ راجع لتحقيقه البلدان (ومعجم الباكري).

❷ كلمة من خطبته صلى الله عليه وسلم انظر (حم، ۴، ۸۰) عن جابر وابن حبان في زوائدہ رقم ۱۰۲.

❸ والفعل منه في هذا المعنى يستعمل الامجهولاً ۱۲.

کرنے والا نہیں۔ نیز: ﴿لَا تَبْدِيلَ لِحَلْقِ اللَّهِ﴾
 فطرت الہی میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ (۳۰:۳۰) بھی ہر دو
 معانی پر محمول ہو سکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری
 آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے۔
 الْآبْدَالُ: وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے
 مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرما دیتے
 ہیں۔ ﴿در حقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنہوں نے صفات
 زمیمہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کر لیا ہو۔ اور یہ وہی
 لوگ ہیں جن کی طرف آیت: ﴿فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ
 سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ (۵:۲۵) میں ارشاد فرمایا ہے۔
 الْبَادِلَةُ: گردن اور ہنسی کے درمیان کا حصہ اس کی جمع
 بآؤں ہے ﴿ع (طویل)

(۳۱) وَلَا زَهْلٌ لِّبَاتِهِ وَبَادِلُهُ

اس کے سینہ اور بغلوں کا گوشت ڈھیلانہیں تھا۔

ب ا د ن

الْبَدْنُ: یہ جَسَدُ کے ہم معنی ہے لیکن بدن باعتبار
 عظمت جشہ کے بولا جاتا ہے اور جَسَدُ باعتبار رنگ کے،
 اسی سے رنگین کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہا جاتا ہے اور
 جسیم عورت کو اِمْرَاءٌ بَادِنٌ وَّ بَدِينٌ کہتے ہیں اسی سے
 قربانی کے جانوروں کو اس کے فریبہ ہونے کی وجہ سے
 بَدْنَةٌ کہا جاتا ہے اور بَدَنٌ وَّ بَدْنٌ کے معنی موٹا ہونے

(۱۰۱:۱۶) جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے
 ہیں۔ ﴿وَبَدَّلْنَا هُمْ بِحَسَنَتِهِمْ جَنَّتِينَ﴾ (۶:۳۴)
 ﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ﴾ (۹۵:۷)
 پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور آیت کریمہ: ﴿يَوْمَ تَبْدُلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ﴾
 (۲۸:۱۳) کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل
 کر دی جائے گی۔ ﴿أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ﴾ (۲۶:۴۰)
 کہ وہ (کہیں) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔ ﴿وَمَنْ
 يُبَدِّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ﴾ (۱۰۸:۲) اور جس شخص
 نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر اختیار کیا ﴿وَأَنْ
 تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلُونَ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۳۸:۳۷) اور اگر
 تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔
 اور آیت کریمہ: ﴿مَا يَبْدُلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ﴾

(۲۹:۵۰) ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی کا مفہوم یہ
 ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں
 ہوتا پس اس میں تنبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو
 معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہوگی وہ اس کے علم کے مطابق ہی
 وقوع پذیر ہوگی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آسکتی۔

بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں
 خلف نہیں ہوتا۔ اور فرمان باری تعالیٰ: ﴿لَا مَبْدَلَ
 لِكَلِمَاتِ اللَّهِ﴾ (۳۴:۶) تو انہیں خداوندی کو تبدیل

۱ قال علیؑ الابدال بالشام والنجاء بمصر والعصائب بالعراق (الفاائق ۱/ ۴۰) والحديث الابدال راجع مجمع الزوائد ج ۱ ص ۶۲-۶۳ من علی موقوفاً وعن عبادة بن الصامت وانس وابن مسعود مرفوعاً ولا يخلو اى حديث عن مقال.

۲ وصدرة: فتى قد قد السيف متضائل وفى اللسان وابدال ابى الطيب متازف بدل متضائل وفى الاصول ولا رهن بدل رهل وقد وقع فى نسبة هذا البيت تخليط وارتباك فى المرزوقى (۱۰۴۶-۱۰۴۹) والحمامة مع التبريزى ۳: ۶۶-۶۷. لزنب بنت الطشرية فى رثاء اخيه وكان اخوه شاعراً مقلداً كذا فى الحمامة للبحرئى ۲۷۵ والبيان (۱: ۲۱۶) والاغاني (۷: ۱۴۶) وامالى القنالى (۲: ۸۵-۸۶) لكن فى الحمامة نفسه (۲: ۱۹۳) ذكر هذا البيت مع ابيات بغير التسلولى (عجز بن عبدالله) وفى الصناعيتين ۳۵۲ بغير عزوفى روايته صدره طويل نجاد السيف لامضائل وفى السمت ۶۰۸ انه لثورين الطشرية فى رثاء اخيه يزيد وقيل لام يزيد ترثى ابنها راجع السمت وفى محاضرات المؤلف (۳: ۲۶۶) وبعضهم نسه الى الامير والرياحى (الاغاني: ۱۱۶-۱۱۷)

﴿وَبَدَّالَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ﴾
(۳۹:۳۷) اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر
ہو جائے گا، جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔

﴿وَبَدَّالَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا﴾ (۳۹:۳۷) اور ان
کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی۔ ﴿فَبَدَّتْ
لَهُمَا سَوْآتُهُمَا﴾ (۲۰:۱۲۱) تو ان پر ان کی شرمگاہیں
ظاہر ہو گئیں۔

الْبَدْوِيَّةُ: حَضْرُ كِي ضِدِّهِ اور آیت کریمہ:
﴿وَجَاءَ كُمْ مِنَ الْبَدْوِ﴾ (۱۲:۱۰۰) آپ کو گاؤں
سے یہاں لایا۔ میں بَدْوُ بمعنی بَادِيَّةُ (صحراء) ہے اور
ہر وہ مقام جہاں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہوں اور تمام
چیزیں ظاہر نظر آتی ہوں اسے بَدْوُ (بَادِيَّةُ) کہا جاتا
ہے اور الْبَادِيَّةُ کے معنی صحراء نشین کے ہیں۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿سَوَاءٌ نَالَعَاكْفُ فِيهِ وَالْبَادِ﴾ (۲:۲۵) خواہ وہ
وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔ ﴿لَوْ
أَنَّهُمْ بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ﴾ (۳۳:۲۰) کہ کاش
گنواروں میں جا رہے۔^۵

بَادِر

الْتَبْدِيرُ: (تفعلیل) کے معنی پراگندہ کرنے اور بکھیر

کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بَدَّنَ کے معنی عمر رسیدہ ہو جانا
کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ﴿(رجز)

(۲۲) وَكُنْتُ خِلْتُ الشَّيْبَ وَالتَّبْدِينَ فِي
بڑھاپے اور عمر رسیدہ ہونے کو خیال کرتا تھا، اسی معنی میں
آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿(۲۶) لَا تَبَادِرُونِي
بِالرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ فَإِنِّي قَدْ بَدَنْتُ﴾ کہ میں بوڑھا
اور سن رسیدہ ہو گیا ہوں اس لیے رکوع و سجود میں مجھ سے
سبقت نہ کیا کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّكَ
بِبَدْنِكَ﴾ (۱۰:۹۳) تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا
سے) نکال لیں گے۔ میں بَدَّنَ بمعنی جَسَدٌ ہے اور بعض
نے اس سے زہ مراد لی ہے کیونکہ زہ کو بھی جسم پر ہونے
کی وجہ بَدْنَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قیص کے بازو کو بَدْنٌ اور
اس کی انگلی اور پھجلی طرف کو ظہر اور بطن کہہ دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَالْبَدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ
اللَّهِ﴾ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے
شعائر خدا مقرر کیا ہے۔ (۲۲:۳۶) میں بَدَّنَ بَدْنَةً کی
جمع ہے جس کے معنی ہدی یعنی قربانی کے ہیں جو حرم میں
لے جا کر ذبح کی جائے۔

بَادُو

بَدَا (ن) الشَّيْءُ بَدَّوْا وَبَدَّاءُ کے معنی نمایاں
طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

① قاله حميد الارقط وتمامه: وانهم مما يذهل القرينا۔ وفي اللسان (بدن ء كون) واضداد ابى الطيب ۲۲۸ بغير عزو والبيت في

الاقضاب ۳۷۴ واصطلاح المنطق ۳۳۰ وغريب ابى عبيد ۱/۵۲ وفيه لكيميت .

② الحديث باختلاف الفاظه رواه احمد وابوداؤد وابن ماجه عن معاوية (ه) عن ابى موسى وللبهقي عن معاوية وابن سعد والبيهقي
عن ابى سعده صاحب الحيوش انظر كنز العمال : ج ۷ رقم ۲۷۸، ۲۷۸۳، ۲۸۱۳، ۲۸۱۹، وغريب ابى عبيد ۱: ۵۲.

③ الابداء (افعال ظاهرا كرنا ۲۴-۲۱) (۲-۲۳) (۲-۷۱).

(۱۷۷:۲) دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب آنحضرت ﷺ سے برّ کی تفسیر دریافت کی گئی تو آن جناب ﷺ نے جواباً یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل پائی جاتی ہے۔ ❶

بِرِّ الْوَالِدَيْنِ کے معنی ہیں ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عَقُوقٌ ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ﴾ (۸:۶۰) جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی..... کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا۔

اور برّ کے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: بَرِّفِيْ يَمِيْنِهِ۔ اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی اور شاعر کے قول ❷

(۴۳) اَكُوْنُ مَكَانَ الْبِرِّ مِثْنَهُ

میں بعض نے کہا ہے کہ برّ بمعنی فؤاد یعنی دل ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی برّ بمعنی نیکی ہے، یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔

بَرَّ اَبَاَهُ فَهُوَ بَارٌّ وَبَرٌّ صِيغَةُ صَفْتٍ جَوْكَهٖ صَائِفٌ

دینے کے ہیں، اصل میں ”تَبَذِيْرٌ“ کے معنی زمین میں بیج ڈالنے کے ہیں اور چونکہ زمین میں بیج ڈالنا ناعاقبت اندیش لوگوں کی نظر میں بظاہر ضائع کرنا ہوتا ہے، اس لیے تَبَذِيْرٌ کا لفظ بطور استعارہ مال ضائع کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيْطٰنِيْنَ﴾ (۲۷:۱۷) ﴿فَضْلٌ خَرَجَ لَوْ كَيْفَ شِطَّانٍ كَيْفَ هِيَ﴾ (۲۷:۱۷) اور ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبَذِّرًا﴾ (۲۶:۱۷) اور ﴿فَضْلٌ خَرَجِيْ مِنْ مَالٍ نَهْ اِثْرًا﴾۔

ب ا ر ر

الْبِرُّ: یہ بخر کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی کی وسعت کے اعتبار سے اس سے اَلْبِرُّ کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، جیسے ﴿اِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ﴾ (۲۸:۵۲) بے شک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔ اور کبھی بندہ کی طرف جیسے: بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّهُ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں۔ اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے اَلْبِرُّ: (نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور آیت کریمہ: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ﴾

❶ كذا فى الطبرى ۹۴/۲ وفى ابن كثير ۲۰۷: ۱ عن ابي ذر انه سال رسول الله صلى الله عليه وسلم بالايما ن؟ فتلا عليه لكنه منقطع لان محامداً لم يجدا باذر وراجع أيضاً البصائر والتاج (بر).

❷ لخدداش بن زهير كما فى التاج (بر) وفى اللسان غير منسوب لكن البيت فى رواية التاج: يكون مكان البرمنى ودونه - اجعل الى دونه واوامر.

الْبَرَبْرَةِ: بڑبڑ کرنا، یہ بھی حکایت صورت کے قبیل سے ہے۔

ب ا ر

الْبَرِّ وَالْبِرِّ وَالْتَّبَرِّ کے اصل معنی کسی مکروہ امر سے نجات حاصل کرنا کے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے۔

بَرَّتُ مِنَ الْمَرَضِ میں تندرست ہوا۔

بَرَّتُ مِنْ فُلَانٍ وَتَبَّرْتُ فِي فُلَانٍ سے بیزار ہوں۔ اَبْرَزْتُ مِنْ كَذَا وَبَرَّتُهُ میں نے اس کو ہمت یا

مرض سے بری کر دیا۔ رَجَلٌ بَرِيءٌ پاک اور بے گناہ آدمی۔ بُرَاءٌ بَرِيئُونَ: قرآن پاک میں ہے: ﴿بَرَاءَةٌ

مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۱۰۹:۱) اور اس کے رسول کی طرف سے بیزاری کا اعلان ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بَرِيءٌ مِّنَ

الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُولُهُ﴾ (۳:۹) کہ خدا مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست بردار) ہے۔

﴿اَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا اَعْمَلْ وَاَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (۲۱:۱۰) تم میرے عملوں کے جواب دہ

نہیں ہو اور میں تمہارے عملوں کا جواب دہ نہیں ہوں۔

﴿اِنَّا بَرَاءٌ مِّنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ (۳:۶۰) کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا

کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں۔ ﴿وَاذْ قَالِ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهِ اِنِّيْٓ بَرّٖءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ﴾ (۲۶:۲۳)

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔

﴿فَبَرَّءُ هُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا﴾ (۶۹:۳۳) تو خدا نے

وَصَيْفٌ وَطَائِفٌ وَطَيْفٌ کی مثل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ﴾

(۱۴:۹) اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔ ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ﴾ (۲۳:۱۹) اور مجھے اپنی ماں کے

ساتھ حسن سلوک کرنے والا (بنا)۔

بَرَّ فِىْ يَوْمِيْهِمْ فَهُوَ بَارٌّ وَاَبْرَزْتُهُ قسم پوری کرنا۔ بَرَّتْ يَحْسِبُنِيْ مِىْرِ قَسْمٍ پوری ہوگئی۔ حَجٌّ مَّبْرُورٌ حج جس میں

رفعت وفتق اور جدال نہ ہو۔

الْبَارُّ کی جمع اَبْرَارٌ وَاَبْرَرَةٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ﴾ (۱۳:۸۲) بیشک نیکوکار

نعمتوں (کی بہشت) میں ہوں گے۔ ﴿كَذٰلِكَ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّیْنَ﴾ (۱۸:۸۳) اور یہ بھی سن رکھو کہ

نیکوکاروں کے اعمالِ علیین میں ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۸۰:۱۶) جو سردار اور نیکوکار ہیں۔

میں خاص کرفرشتوں کو بَرَرَةٌ کہا ہے کیونکہ اَبْرَارٌ (جمع) سے زیادہ بلوغ ہے۔ اس لیے کہ بَرَرَةٌ، بَرُّ کی جمع ہے اور

اَبْرَارٌ بَارٌّ کی تو جیسے عَادِلٌ کی نسبت عَدْلٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے، اسی طرح بَرٌّ میں بَارٌّ سے زیادہ مبالغہ ہے۔

الْبَرِّيْرُ: خاص کر پیلو کے درخت کے پھل کو کہتے ہیں، عام محاورہ ہے: فُلَانٌ لَا يَعْرفُ الْبَرِّيْرَ مِنَ النَّهْرِ۔ (وہ

چوہے اور بلی میں تمیز نہیں کر سکتا) بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت کی صورت کے طور پر بولے جاتے

ہیں ۱ مگر اس محاورہ کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیر خواہ اور بدخواہ میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

۱ کماورد فی الساج وعن ابن الاعرابی البرسوق الغنم والهردها قاله القتيبي راجع ايضا كتاب الحيوان (۶: ۴۷۸) والمثل في

اللسان (بر) وادب الكتاب ۳۸ وكتب الامثال

ذَاتِ الْبُرُوجِ ﴿ (۱:۸۵) آسمان کی قسم جس میں برج

ہیں۔ ﴿الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا ﴿

(۶۱:۲۵) جس نے آسمان میں برج بنائے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ ﴿

(۷۸:۴) خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔ میں بروج

سے مضبوط قلعے اور محلات بھی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی

ہو سکتا ہے کہ ستاروں کی برجیں مراد ہوں اس صورت میں

بروج کے ساتھ فقط مُّشِيدَةٍ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے ﴿ (طویل)

(۴۳) وَمَنْ هَابَ أَسْبَابَ الْمَنَآيَا يَنْتَلَهُ

وَلَوْ نَالَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ يَسْلَمُ

جو شخص اسباب موت سے ڈرتا ہے تو وہ لامحالہ اس کو پالیں

گے۔ اگرچہ بیڑھی لگا کر آسمان کے اسباب پر کیوں نہ

چلا جائے۔

اگر زمین کی برجیں مراد ہوں تو یہ اسی معنی کی طرف اشارہ

ہوگا جسے دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔ ﴿ (بسیط)

(۴۵) وَلَوْ كُنْتُ فِي غَمْدَانَ يَحْرُسُ بَابَهُ

أَرَا جِبِلُّ أَحْبُوشٍ وَأَسْوَدُ أَلْفِ

(۴۶) إِذَا لَا تَنْبِي حَيْثُ كُنْتُ مَنِيَّتِي

يَحُثُّ بِهَا هَادٍ لِأَثْرِي فَانْفُ

اور اگر غمندان کے قلعے میں چلا جاؤں جس کے دروازہ پر

ان کو بے عیب ثابت کیا۔

﴿ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا ﴿

(۱۶۶:۲) اس دن (کفر کے) پیٹھوا اپنے پیروں سے

بیزاری ظاہر کریں گے۔

الْبَارِي: ﴿ (پیدا کرنے والا) یہ اسماء حسنی سے ہے۔ جیسے

فرمایا: ﴿ الْبَارِي الْمُصَوِّرُ ﴿ (۲۳:۵۹) ایجاد و اختراع

کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

﴿ فَتَوَبُّوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ ﴿ (۵۴:۲) تو اپنے پیدا کرنے

والے کے آگے توبہ کرو۔

الْبَرِيَّةُ کے معنی مخلوق کے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل

میں مہموز ہے، لیکن ہمزہ کو ترک (یا ادغام) کر دیا گیا ہے

بعض نے کہا ہے کہ یہ بَرِيَّتِ الْقَوَسِ سے مشتق ہے اور

مخلوق کو بَرِيَّةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ البسریٰ یعنی مٹی

سے پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿ خَلَقَكُمْ مِنْ

تُرَابٍ ﴿ (۱۱:۳۵) سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿

(۶:۹۸) یہ لوگ سب مخلوق سے بہتر ہیں۔

ب ا ر ج

الْبُرُوجُ یہ بُرُج کی جمع ہے، جس کے معنی قصر کے

ہیں اسی مناسبت سے ستاروں کے مخصوص منازل کو بروج

کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ وَالسَّمَاءِ

① انظر ديوانه ۳۰ وشرح العقائد العشر ۱۲۰ وابن الانباري ۲۸۳ وفي روايته اختلاف واللسان (سبب) والمشكل للفتي ۷۲۔

۳۵۷ والبحر (۵: ۱/۲۶: ۳/۴۵۶: ۲۹۹) والطبري (۸: ۷۵) والعمدة ۱: ۳۳۳ والجمعة ۱۱۰۔

② من قول ثعلبة بن عمرو العبدي وهما من كلمة مفضليه (رقم: ۷۴) في ۱۶ بيتاً وراجع الحماسة للبحرّي: ۹۷ والنقااض ۵۶۴

وفي الاغانى (۴۱۱-۱۷-۱۲۹) همايشي من الاختلاف في الرواية منسوبتان لابي الطحان القيني ولعله تمثل بها باختلاف طفيف

في ديوان اوس بن حجر (۱: ۷۴) راجع شرح شواهد على النفس معجم البكري (يمان)۔

جس کے معنی سخت ہوا کے ہیں۔

الْبَارِحُ مِنَ الظُّلْمَاءِ وَالطَّيْبِ: خاص کر اس ہرن یا پرند کو کہتے ہیں جو شکاری کے سامنے سے ایسے رخ پر گزرے کہ اس کا نشانہ ممکن نہ ہو، ایسے شکار کو منحوس سمجھا جاتا ہے، اس کی جمع بَوَارِحُ آتی ہے اس کے بالمقابل سَانِعُ اس شکار کو کہتے ہیں جو ایسے رخ سے آئے کہ اس کا شکار کرنا آسان ہو ایسے شکار کو میمون (مبارک) خیال کیا جاتا ہے۔

الْبَارِحَةُ: شب گزشتہ بَرِحَ کھلی جگہ جم کر ٹھہرے رہنا اسی سے فرمان الہی لَا أَبْرَحُ ہے، یہ لَا آزال کی طرح معنی مثبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ بَرِحَ اور زال میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور ”لا“ بھی نفی کے لیے ہوتا ہے اور نفی پر نفی آنے سے اثبات حاصل ہو جاتا ہے، اسی بنا پر فرمایا: ﴿لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ﴾ کہ ہم تو اس (کی پوجا) پر قائم رہیں گے (۹۱:۲۰) ﴿لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ﴾ (۶۰:۱۸) کہ جب تک میں دو دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ٹپنے کا نہیں۔ اور الْبَارِحُ سے معنی نحوست کا اعتبار کر کے تَبْرِيحُ اور تَبَارِيحُ کا لفظ تکلیف اور شدائد کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، جیسے بَرِحَ بِي الْأَمْرِ: مجھے فلاں معاملہ سے تکلیف پہنچی، بَرِحَ بِي فُلَانٌ فِي التَّقَاضِي: فلاں نے سخت تقاضا کیا۔

ضَرَبَهُ ضَرْبًا مُبْرِحًا سے سخت مارا۔ جَاءَ فُلَانٌ بِالْبَرِحِ۔ فلاں نے حیرت انگیز کام کیا۔ أَبْرَحْتُ رَبًّا میں اپنے رب کی تعظیم بجالایا۔ أَبْرَحْتُ جَارًا میں نے ہمسائے کی عزت کی۔ بَرِحِي (ارے) نشانہ خطا ہونے

حاشی پہرہ دے رہے ہوں تو پھر بھی موت میرے پاس پہنچ جائے، جیسے ایک قائف ہدی خواں میرے نقش قدم پر چلا جا رہا ہوگا۔ نُوبٌ مُبْرِحٌ: اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر برجوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں پھر اس میں معنی حسن کا اعتبار کر کے تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی عورت نے مزین کپڑے کی طرح آرائش کا اظہار کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَةُ کے معنی ہیں عورت اپنے قصر سے ظاہر ہوئی جیسا کہ ان دونوں آیتوں: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ (۳۳:۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت کے زمانہ میں اظہارِ تجمل کر کے اپنے محلات سے نکلا کرتی تھیں، اسی طرح اب مت نکلو زینت نہ دکھاؤ۔ ﴿غَيْرَ مُتَّبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ﴾ (۶۰:۲۴) بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں ظاہر نہ کریں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور پھر حسن و وسعت میں تشبیہ دے کر وسعتِ چشم اور حسنِ نظر کے لیے الْبُرُجُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ب ر ح

الْبَرَاحُ: اس وسیع جگہ کو کہتے ہیں جہاں عمارت درخت وغیرہ کچھ نہ ہو۔ لہذا کبھی اس میں معنی ظہور کا اعتبار لیتے ہیں، جیسے فَعَلَ كَذَا بَرَّاحًا یعنی اس نے کھلے بندوں یہ کام کیا۔ بَرِحَ الْحَفَاءُ رَاغِ فَاشٌ هُوَ غَايَا، گویا وہ کھلے میدان میں ہے، اسی سے بُرَاحُ الدَّارِ ہے، جس کے معنی گھر کے کھلے محن کے ہیں۔

بَرِحَ: کھلے میدان میں چلا جانا۔ اسی سے الْبَارِحُ ہے،

البرد اولے کی طرح جامد اور ثابت ہونا بھی آتے ہیں جس طرح حَرَّ کو حرکت لازم ہے، اسی طرح بَرْد کے ساتھ کسی چیز کا ثابت محض ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

بَرْدٌ عَلَيْهِ دَيْنٌ . اس پر قرض ٹھہر گیا۔

شاعر نے کہا ہے ﴿ (رجز)

(۳۸) اَلْيَوْمَ بَارِدٌ سُمُومُهُ .

آج یاد سوم جامد ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ﴿ (خفيف)

(۳۹) قَدِ بَرَدَ الْمَوْتُ عَلٰی مِصْطَلَاهُ

کہ اس کے ہاتھ اور چہرہ پر موت طاری ہوگی۔ لَمْ يَبْرُدْ يَبْدِي شَيْءٌ ميرے ہاتھ میں کوئی چیز قرار نہیں پڑتی۔

بَرَدَ الْاِنْسَانُ مر جانا، فوت ہو جانا۔ بَرَدَهُ اُسے قتل کر ڈالا

اسی سے سیوف کو بَوَارِدُ کہا جاتا ہے کیونکہ میت بھی فقدان روح سے سرد پڑ جاتی ہے اور اسے سکون لاحق ہوتا ہے۔

یا ظاہری طور پر جلد میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفّٰى الْاَنْفُسَ جِئْنَ مَوْتَهَا وَالتّٰى لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ﴾ (۳۹:۳۲) خدا لوگوں

پر یہ کلمہ ملامت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بالقابل لفظ ”مَرْحٰى“ ہے جو شانہ لگنے پر تحسین کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی: واہ، کیا خوب محاورہ ہے ﴿

لَقَيْتُ مِنْهُ الْبَرْحَيْنِ وَالْبُرْحَاءَ مجھے اس سے تکالیف پہنچیں بُرْحَاءُ الْحُمَى . بخار کی شدت۔

بارد

اَلْبَرْدُ: (ٹھنڈا) اصل میں یہ حَرُّ کی ضد ہے۔

محاورہ میں کبھی اس کی ذات کا اعتبار کر کے کہا جاتا ہے۔

بَرَدَ (ن ك) كَذَا: اس نے ٹھنڈا حاصل کی۔ بَرَدَ (ن) اَلْمَاءُ كَذَا: پانی نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ جیسے ﴿ (الطّويل)

(۳۷) سَتَبْرُدُ اَكْبَادًا وَتَبْكِيْ بَوَاكِيًا .

تو بہت سے کلبجوں کو ٹھنڈا کیا اور بہت سی رونے والیوں کو رلا ڈالے گی۔

اور بَرَدَ (تفعل) بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے، بعض

کے نزدیک اَبْرَدَ (افعال) بھی اس معنی میں آ جاتا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

اسی سے اَلْبَرَادَةُ ہے جس کے معنی پانی ٹھنڈا کرنے والی چیز کے ہیں اور محاورہ میں بَرَدَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے

۱ قال المرصفي: البرحين مثل الباء مع فتح الراء وكسر الحاء استعمالوه كاوضيق وقد اامتوا واحده لما ارادوا وصف الدواهي بالكثرة ذيل الكامل ۶۹۵ وانظر للكلمته ايضا تهذيب الالفاظ ۴۳ ومحاسن ثعلب: ۵۲۰-۵۲۱ وفي الفائق: هو في الاصل جمع برح جمع السلامة للمبالغة مثل بلغ وبلغين يحوز في اعرابه ان يحوز على النون وان يحوز على ما قبلها (۶۵۱۱) .

۲ قاله مالك بن ريب السمانى في رثاء نفسه وكان في جند سعيد بن عثمان بطريق فارس وصدرة: وعطل قلوبى في الركاب فانها..... والبيت في البحر ۶: ۳۱۹ من قصيدة حمهريه في ۵۲ بيتاً ۲۶۹-۲۷۲ وذيل الامالى: ۱۳۷-۱۳۸ وفيه وغير بدل وعطل وتماها في نواد البيزدي والاختيارين رقم: ۱۰۰ وفي المعجم للمرزباني ۲۹۱ مثله لجمع بن علبه الحارثي يرثي نفسه لما هوماقتله باختلاف ظفيف وقود قلوبى بينهن فانها بمتحضك مسروراً وتبكي بو كيا-وابام العرب ۵۸ وفيه وقود بدل عطل .

۳ قاله الراجز وتماه: من عجز اليوم فاللومه والشطر في الجمهرة ۱: ۲۴۰ والتبريزي ۱: ۱۹۵ وفي اللسان (برد) من جزع بدل من عجز كما في السمط ۲۵۴ والفائق (۱: ۴۷) .

۴ قاله ابوزيد الطائي في رثاء الجلاح يصف الموت وتكلمته البيت بارز ناجراه قد برد الموت على مصطلاه اي برد البيت من قصيدة حمهريه ۲۶۹-۲۷۲ في ۵۸ بيتاً والبيت في اللسان (برد) والمعاني ۸۵۹-۲۰۵ والاختيارين ۱۲۶ وجمهرة الاشعار ۲۷۲ وامالى ليزيدى .

ہے اور کبھی بمعنی مفعول آتا ہے۔ جیسے: مَاءٌ بَرُّوْذٌ (ٹھنڈا پانی) نَخْرٌ بَرُّوْذٌ (خٹک دانت) جیسا کہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والے سرمہ کو بَرُّوْذٌ کہا جاتا ہے ﴿بَرَدْتُ الْحَدِيدَ﴾ میں نے لوہے کی ریتی سے رگڑا۔ یہ بَرَدْتُہ بمعنی قَتَلْتُهُ سے مشتق ہے اور لوہہ و چون کو بَرَادَةٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْبَرْدُ: (آلہ) ریتی جس سے لوہے کو ریتتے ہیں۔ اَلْبَرْدُ یہ اَلْبَرِيدُ کی جمع ہے اور محکمہ مواصلات کی اصطلاح میں بَرُّوْذٌ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی جگہ پر پیغام رسانی کے لیے متعین رہتے ہیں۔ وہ ہر کارے چونکہ سرعت سے پیغام رسانی کا کام کرتے تھے، اس لیے ہر تیز روکے کے لیے هُوَ يَبْرُدُ کا محاورہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اور پرند کے پروں کو بَرِيدَانٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ بھی اسے برید کا کام دیتے ہیں تو یہ بِنَاءِ الْفَرْعِ عَلٰی الْفَرْعِ کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ”علم الاشتقاق“ میں بیان کیا جاتا ہے۔

بَرَز

اَلْبَرَازُ: کے معنی فضاء یعنی کھلی جگہ کے ہیں۔ اور بَرَزَ (ن) کے معنی ہیں کھلی جگہ میں چلے جانا اور بَرُوْذٌ (ظہور) کئی طرح پر ہوتا ہے۔ (۱) از خود کسی چیز کا ظاہر ہو جانا، جیسے فرمایا: ﴿وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً﴾ (۱۸: ۴۷) اور تم زمین کو صاف میدان دیکھو گے۔ اس میں تشبیہ ہے کہ زمین پر سے عمارات اور ان کے ساکنین سب ختم ہو جائیں گے، اسی سے مُبَارَزَةٌ ہے، جس کے معنی صفوف جنگ سے آگے نکل کر مقابلہ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں

کے مرنے کے وقت ان کی روئیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روئیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿لَا يَسْأَلُونَ فِيهَا بَرَدًا وَلَا شَرَابًا﴾ (۲۴: ۷۸) میں بھی بَرْدٌ بمعنی نیند ہے یعنی وہاں کسی قسم کی راحت اور زندگی کی خوشگوار نصیب نہیں ہوگی اور اس اعتبار سے کہ گرمی میں سردی سے راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے، خوشگوار زندگی کے لیے عَيْشٌ بَارِدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْبَرْدَانُ: صبح و شام۔ کیونکہ یہ دونوں وقت ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اَلْبَرْدُ کے معنی ”اوالے“ کے ہیں اور بَرْدُ السَّحَابِ کے معنی ہیں بادل نے ڈال دیا ہے۔ سَحَابٌ اَبْرَدٌ وَبَرْدٌ اَوَّلٌ بَرَسَانِ والے بادل۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ﴾ (۲۳: ۲۳) اور آسمان کے پہاڑوں سے اوالے نازل کرتا ہے۔

اَلْبَرْدِيُّ نزل کی قسم کا ایک پودا۔ یہ بَرْدِی کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ بھی پانی میں پیدا ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔ ① اَصْلُ كُلِّ دَاءٍ: اَلْبَرْدَةُ کہ بدھضمی ام الامراض ہے، بدھضمی کو بَرْدَةُ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اس برودت طبعی کی وجہ سے عارض ہوتی ہے اس سے قوت ہضم ناقابل ہو جاتی ہے۔

اَلْبَرُّوْذُ: ٹھنڈ پہنچانے والی چیز کو کہتے ہیں اور کبھی ٹھنڈی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ فَعُولٌ کبھی بمعنی فاعل ہوتا

① رواه الدارقطني في العليل: عن انس وابن السني وابونعيم في الطب عن علي وعن ابي سعيد وعن الزهري مرسلًا قال في النهاية ۸۶: ۱ واللسان (برد) البردة هي التحمة ونقل الطعام على العمدة وايضاً فارن غريب ابي عبيدة.

② وفي اللسان (برد) كان رسول الله صلى الله عليه وسلم بالبرود.

اور روک کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل یہ بَرَزَة (پردہ) سے معرب ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانُ﴾ (۲۰:۵۵) دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔^۱

اور بَرْزَخُ اس رکاوٹ کو بھی کہا گیا ہے جو آخرت میں انسان اور اس کے منازل رفیعہ تک پہنچنے کے درمیان حائل ہوگی جسے قرآن پاک نے آیت: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (۱۱:۹۰) مگر وہ گھائی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ میں عَقَبَةٌ کہا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ﴾ (۱۰۰:۲۳) اور ان کے پیچھے بَرزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہیں گے) لہذا عَقَبَةُ سے مراد وہ موانع ہیں جو بلند درجات تک پہنچنے سے روک لیتے ہیں جن تک کہ نیک لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بَرزخ سے موت اور حشر کے مابین کی مدت مراد ہے۔

ب ا ر ص

اَلْبَرَصُ: مہلہری۔ مشہور مرض کا نام ہے^۲ اور چاند کو اس سیاہ دھبہ کی وجہ سے جو اس میں نظر آتا ہے، اَبْرَصُ کہا گیا ہے۔ اور سَامُ اَبْرَصُ کے معنی چھلکی کے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر بھی بَرَصٌ جیسے دھبے ہوتے ہیں۔ اَلْبَرِیْصُ: وہ ہے جو ابرص کی طرح چمکدار ہو، یہی معنی تقریباً بصریص کے ہیں جو بَصَّ یَبْصُ بمعنی برق سے

ہے: ﴿لَبَسَ رِزْا الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلَى مَاضَا جَعِلْتُمْ﴾ (۱۵۳:۳) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ﴾ (۲۵۰:۲) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے بالمقابل میں آئے۔

(۲) دوم بَرُوْزُ کے معنی فضیلت ظاہر ہونے کے ہیں، جو کسی محمود کام میں سبقت لے جانے سے حاصل ہوتی ہے۔

(۳) کسی مستور چیز کا منکشف ہو کر سامنے آ جانا، جیسے فرمایا: ﴿وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۲۸:۱۳) اور سب لوگ خدائے یگانہ زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

﴿وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِیْعًا﴾ (۲۱:۱۳) اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ﴿یَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ﴾ (۱۶:۳۰) جس روز وہ نکل پڑیں گے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَبَرَزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغَوَّیْنِ﴾ (۹:۲۶) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی میں اس بات پر تشبیہ پائی جاتی ہے کہ انھیں دوزخ کے سامنے لایا جائے گا۔ محاورہ ہے: تَبَرَزَ فُلَانٌ کُنَا یَا از قضائے حاجت اور پاکدامن عورت کو اَمْرَاءَةٌ بَرَزَةٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس کی رفعت پاک وامنی اور عفت میں مضمر ہوتی ہے نہ یہ کہ بَرَزَةٌ کا لفظ اس معنی کا مقتضی ہے۔

ب ا ر ز خ

اَلْبَرْزَخُ: کے معنی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل

۱ وایضاً: وجعل بینہما بَرزخاً وحجراً محجوراً: ۵۳/۲۵.

۲ وفی القرآن ﴿وابراء الاکمه والابرص﴾ (۴۸-۳) ﴿وتبرئ الاکمه والابرص﴾ ۵-۱۱۰.

یا صراحی (ج) أَبَارِيقٌ • اور بَرِّقَ سے کبھی خوف کے معنی لے کر بَرِّقَ فُلَانٌ وَابْرَقَ وَارْعَدَ کے معنی دھمکی دینا بھی آجاتے ہیں۔

بَرِقَ

الْبَرِّقُ: کے معنی بادل کی چمک کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَبَرَقٌ﴾ (۱۹:۲) اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور (بادل) گرج (رہا) ہو اور بجلی کو ندر رہی ہو۔ اس سے فعل بَرِقَ وَابْرَقَ دونوں آتے ہیں اور بَرِّقَ ہر چمک دار چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے، جیسے: سَيْفٌ بَارِقٌ: چمکدار تلوار۔ بَرِّقَ وَبَرِّقَ کے معنی خوف کی وجہ سے آنکھ خیرہ ہو جانا ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ﴾ (۷۵:۷) جب آنکھیں چندھیا جائیں۔ ایک قرأت میں بَرِّقَ ہے۔

پھر کبھی بَسْرَقَ سے اختلاف رنگ کے معنی لے کر مختلف الوان کی پتھر ملی زمین کو بَسْرَقَةٌ کہا جاتا ہے۔ الْاَبْرَقُ کے معنی سیاہ سفید پہاڑ کے ہیں اسی لیے آنکھ کو بَسْرَقَاءُ کہا جاتا ہے۔

نَاقَةٌ بَرُّوقٌ۔ اونٹنی جو دم اٹھا کر حمل کو ظاہر کرے۔ الْبَرُّوقَةُ: ایک قسم کی گھاس جو ابرو کو دیکھ کر ہی سر سبز ہو جاتی ہے، اسی سے مثل مشہور ہے۔ اَشْكُرُ مِنْ بَرُّوقَةٍ وَهَ بَرُّوقِ سے بھی یادہ شکر گزار ہے۔ بَرِّقَ طَعَامَهُ بَرِّيْتَهُ۔ روٹی کو زیتون سے چڑھانا۔ الْاَبَارِقَةُ وَالْاَبِيرِقُ۔ چمکدار تلوار۔ الْبَرِّاقُ: بعض کہتے ہیں کہ یہ اس دلہہ کا نام ہے۔ جس پر آنحضرت ﷺ شب معراج کو سوار ہوئے تھے، اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ الْاَبْرِيقُ: لوٹا

بَرَكَ

الْبَرَكُ: اصل میں الْبَرَكُ کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں (جس پر وہ جم کر بیٹھ جاتا ہے) گویہ دوسروں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے سینہ کو بَرَكَةٌ کہا جاتا ہے۔

بَرَكَ الْبَعِيرُ کے معنی ہیں: اونٹ اپنے گھسنے رکھ کر بیٹھ گیا پھر اس سے معنی لزوم کا اعتبار کر کے اِبْتَسَرَ كُنُوفِي الْحَرْبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور جم کر لڑنے کے ہیں۔

بُرَاكَاءُ الْحَرْبِ وَبَرُّوكَاءُهَا: سخت کارزار جہاں بہادر ہی ثابت قدم رہ سکتے ہوں۔

اِبْتَسَرَكَتِ الدَّابَّةُ: چوپائے کا جم کر کھڑا ہو جانا بَرَكَةٌ: حوض، پانی جمع کرنے کی جگہ۔

الْبَرَكَةُ کے معنی کسی شے میں خیر الہی ثابت ہونا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْخَنَّا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ﴾ (۹۶:۷) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے۔

یہاں برکات سے مراد بارش کا پانی ہے اور چونکہ بارش کے پانی میں اس طرح خیر ثابت ہوتی ہے جس طرح کہ حوض میں پانی ٹھہر جاتا ہے اس لیے بارش کو بَرَكَاتٌ سے تعبیر کیا ہے۔

۱ وفی الواقعة ۱۸-۵۶ باکواب وباریق ویتصل بذلك لفظ استبرق (الحریر) راجع الآيات (۱۸-۳۱) (۴۴-۵۳) (۵۵-۵۴)۔

الْبُرْمَةُ اصل میں پتھری ہندیا کو کہتے ہیں۔ ج: بِرَامٌ۔
جیسے حضرہ کی جمع حضار اور یہ ضحکۃ و ہزء و کی
طرح مفعول کے اوزان سے ہے۔

بارہ

الْبُرْهَانُ: کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ
رُجْحَانٌ وَثْنَانٌ کی طرح فُعْلَان کے وزن پر ہے۔
بعض کے نزدیک یہ بَرَّہَ بَرَّہَ کا مصدر ہے جس کے معنی
سفید اور چمکنے کے ہیں۔ صفت اَبْرَہَ مَوْنُثٌ بَرَّہَاءُ ج:
بُرَّہَ اور نوجوان سپید رنگ حسین کو بَرَّہَہُ کہا جاتا ہے۔
الْبَرَّہَةُ: وقت کا کچھ حصہ لیکن بُرْہَانٌ دلیل قاطع کو کہتے
ہیں جو تمام دلائل سے زور دار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی
ہو اس لیے کہ دلیل کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) وہ جو ہمیشہ صدق کی مقتضی ہو۔ (۲) وہ جو ہمیشہ کذب
کی مقتضی ہو۔ (۳) وہ جو اقرب الی الصدق ہو۔ (۴) جو
کذب کے زیادہ قریب ہو۔ (۵) وہ جو اقتضاء صدق و
کذب میں مساوی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ
هَاتُوا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ﴾ (۱۱۱:۲)
اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔
﴿قُلْ هَاتُوا بُرْہَانَکُمْ هَذَا ذِکْرٌ مِّنْ مَّعِیَ﴾
(۲۴:۲۱) کہہ دو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو، یہ
(میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے۔ ﴿قَدْ
جَاءَ کُمْ بُرْہَانٌ مِّنْ رَبِّکُمْ﴾ (۱۷۳:۳) تمہارے
پاس دلیل (روشن) آچکی ہے۔

الَّذِیْ بَیْدَہِ الْمُلْکُ ﴿ (۱:۶۷) وہ (خدا) جس کے
ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے۔

میں تنبیہ کی ہے کہ وہ تمام خیرات جن کو لفظ تبارک کے تحت
ذکر کیا ہے، ذات باری تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بارم

الْاِبْرَامُ: کے معنی کسی معاملہ کو محکم اور مضبوط کرنا
کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَمْ اَبْرَمُوا اَمْرًا
فَاِنَّا مُبْرِمُونَ﴾ (۷۹:۳۳) کیا انھوں نے کوئی بات
ٹھہرا رکھی ہے تو ہم بھی کچھ ٹھہرانے والے ہیں۔ یہ اصل
میں اِبْرَامُ النَّحْبَلِ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی رسی کو
مضبوط بننے کے ہیں، شاعر نے کہا ہے ﴿ (طویل)

(۵۰) عَلٰی کُلِّ حَالٍ مِّنْ سَحْبِلٍ وَ مَبْرَمٍ لِّعِنٰی
ہر حالت میں (تم قابل ستائش ہو)

الْبَرِیْمُ: بمعنی مُبْرَم ہے یعنی مضبوطی ہوئی رسی محاورہ
ہے: اِبْرَمْتَهُ فَبْرَمَ فَهَوُ بَرِیْمٌ۔ اسی بنا پر کنجوس آدمی کو جو
جوانہ کھیلتا ہو بَرَمٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ بخیل کو مغلول الید
کہتے ہیں۔ اور مُبْرَمُ النَّحْبَلِ کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس
آدمی کو جو کسی معاملہ میں مصر اور بصد ہوا سے اَلْمُبْرَمِ کہا
جاتا ہے یعنی معنی اَلْبَرِیْم کے ہیں اور جو آدمی دودو کھجوریں ملا
کر کھاتا ہوا سے بھی بَرَم کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں سختی
کے ساتھ کھانا کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور رسی کبھی دو
رنگ پر ہوتی ہے، اس لیے ہر سیاہ سفید پر مشتمل لشکر اور
بکریوں کے ملے جطر یوز کو بَرِیْم کہا جاتا ہے۔

① قالہ زہیر فی معلقته واولہ : یعنی انعم السیدان وحدثنا۔ راجع للبت شرح المعلقات لابن الانباری ۲۶۰ و العشر للتبریزی ۱۰۸
والسقط (۱۲: ۱) واللسان (سہل) وشواہد الکشاف والاشیاء النحویة (۴: ۲۰۵) والمعانی للقتبی ۸۸۰ ومختار الشعر الجاہلی
بشرح السقاء (۱: ۱۵۳) والجمہرة ۱۰۷ و المعقد الثمین ۹۵ وایام العرب ۲۷۳ .

بِهَآءِ عِنْدَ الْحَلْبِ كُوجُو بغير چمکانے کے دودھ نہ دے
بَسُوْسٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے ❶
(۲۸) جَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ يَسُوْنًا عِيَالَهُمْ كَمَا اِهْلُ يَمِيْنِ
اپنے اہل و عیال کو زمی سے چلاتے ہوئے آچنچے ہیں۔

ب ا س ر

الْبَسْرُ: کے معنی کسی چیز کو قبل از وقت جلدی لے لینا
کے ہیں جیسے بَسَرَ الرَّجُلُ الْحَاجَةَ (اس نے قبل از
وقت اپنی ضرورت کو طلب کیا) بَسَرَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ
(مادہ کی خواہش کے بغیر اونٹ نے اس سے جفتی کی) مَاءٌ
بُسْرٌ بارش کا تازہ پانی جو زمین پر گرنے سے پہلے ہی لے
لیا جائے بَسِرَ الْقَرْخُ پھوڑے کو پکنے سے پہلے پھوڑ دینا
اسی سے گدری کھجور کو بَسْرٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ﴾ (۲۳: ۷۴) پھر تیوری چڑھائی
اور منہ بگاڑ لیا۔ میں بَسَرَ کے معنی قبل از وقت منہ بگاڑنے
کے ہیں اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر بَسَرَ کے یہی معنی
ہیں تو آیت: ﴿وَوَجُوهُ يَوْمَئِذٍ بِأَسْرَةٍ﴾
(۲۳: ۷۵) اور بہت سے منہ اس دن اداں ہوں گے۔
میں بِأَسْرَةٍ کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ وہاں تو قبل از
وقت منہ بگاڑنا نہیں ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ چون کہ
ان کی حالت آگ میں داخل ہونے سے قبل ہوگی، اس
لیے باسرة کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ گویا آگ میں پہنچنے سے
قبل ان کا منہ بگاڑنا محض تکلف اور قبل از وقت ہوگا، جیسا
کہ بعد کی آیت: ﴿وَتَطْمَنُّنَ أَنْ يَفْعَلَ بِهَا فَاقْرَةَ﴾
(۲۵: ۷۵) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت واقع ہونے

ب ز غ

بَزَعُ الشَّمْسِ کے معنی ہیں سورج کا طلوع ہونا۔
جب کہ اس کی روشنی پھیل رہی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسُ بَاذِعَةً﴾ (۷۸: ۶) پھر
جب سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔
﴿فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَاذِعًا﴾ (۷۷: ۶) پھر جب
چاند کو چمکے ہوئے دیکھا۔
تشبیہ کے طور پر بَزَعُ الشَّمْسِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے،
جس کے معنی اونٹ کی نیش نکل آنا کے ہیں۔ اصل میں یہ
بَزَعُ الْبَيْطَارِ الدَّابَّةِ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی جانور
کے نشتر لگا کر خون بہانا کے ہیں۔

ب ا س س

آیت کریمہ: ﴿وَسَّتِ الْجِبَالُ بَسًا﴾ (۵: ۵۶)
میں بَسَّتِ کے معنی پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانا کے ہیں
اور یہ بَسَّتِ الْحَنْظَلَةُ وَالسَّوْبِقُ بِالْمَاءِ کے محاورہ سے
ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پانی میں گندم یا جو کے ستو ڈال کر
نشاستہ نکالنے کے ہیں اور نشاستہ کو بَسَيْسَةً کہا جاتا ہے بعض
نے اس کے معنی تیز ہنکانا کیے ہیں اور کہا ہے کہ یہ اَبْسَّتِ
الْحَيْضَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سانپ کے
نہایت تیزی کے ساتھ اپنے بل کی طرف دوڑنا کے ہیں اور
اسی معنی کو دوسری جگہ ﴿يَوْمَ نُسِّرُ الْجِبَالَ﴾ (۳۷: ۱۸)
اور ﴿وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدًا وَهِيَ تَمْرٌ مَرٌّ
السَّحَابِ﴾ (۸۸: ۲۷) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔
بَسَّتِ الْأَيْلُ: اونٹوں کو ہنکاتے وقت اَبْسَّتِ

❶ الحدیث بتفصیله فی (خ) مدنیہ و (ط) راجع لشرح الحدیث غریب لابی عبید (لبس) ۸۹: ۳۔

والی ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

ب س ط

بَسَطَ الْيَدِ کے معنی ہاتھ پھیلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَتَبْنَاهُمْ بِأَسْطِ ذُرَاعَيْهِ بِأَنُوصِيدٍ﴾ (۱۸:۱۸) ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلانے ہوئے تھا۔ اور بَسَطَ الْكُفَّ (بھٹیلی پھیلانا) یہ لفظ کبھی طلب و سوال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿كَبَّاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ﴾ (۱۳:۱۳) اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے۔ اور کبھی أَخَذُ یعنی پکڑنے کے معنی میں آتا ہے، جیسے: ﴿وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيَهُمْ﴾ (۹۳:۶) اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لیے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔ اور کبھی حملہ کرنے والے اور مارنے کے معنی میں آتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَيَسْطُورًا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتُهُمُ بِالسُّوءِ﴾ (۲:۶۰) اور ایذا کے لیے تم پر ہاتھ (بھی) چلائیں اور زبانیں (بھی) اور کبھی اس کے بخشش کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُورَتَانِ﴾ (۶۴:۵) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

الْبَسَطُ: وہ اونٹنی جس کے ساتھ اس کے بچے کو چھوڑ دیا گیا ہو اور یہ بمعنی مَبْسُوطَةٌ ہے، جیسے نکتہ بمعنی منکوٹ و نقض بمعنی منقوض آجاتا ہے۔ أَبْسَطَ نَاقَتَهُ اونٹنی کو اس کے بچے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

ب س ق

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَّفِيدٌ﴾ (۱۰:۵۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گاہا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔ اَلْبَاسِقُ کے معنی ہیں بلندی میں لمبا چلا جانے والا۔ چنانچہ اسی سے

بَسَطَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور توسیع کرنے کے ہیں۔ پھر استعمال میں کبھی دونوں معنی ملحوظ ہوتے ہیں اور کبھی ایک معنی متصور ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بَسَطَ الثَّوْبَ (اس نے کپڑا پھیلایا) اسی سے اَلْبَسَاطُ ہے جو ہر پھیلائی ہوئی چیز پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا﴾ (۱۹:۷۱) اور خدا ہی نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا۔ اور بساط کے معنی وسیع زمین کے ہیں اور بَسِيطٌ الْأَرْضِ کے معنی ہیں کھلی اور کشادہ زمین۔ ایک گروہ کے نزدیک بَسِيطٌ کا لفظ بطور استعارہ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس میں ترکیب و تالیف اور نظم متصور نہ ہو سکے۔ اور بسط کبھی بمقابلہ قبض آتا ہے۔ جیسے ﴿وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ﴾ (۲۴۵:۲) خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے۔ اور کبھی بمقابلہ قدر (یعنی تنگ کر دینا) کے جیسے ﴿وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ﴾ (۲۷:۴۲) اور اگر خدا اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراخی کر دیتا۔

﴿وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ (۲۴۷:۲) اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی (بڑا) عطا کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کا بَسِيطَةٌ فی العلم یہ تھا کہ انھوں نے اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور یہ ان کا بَسْطَةٌ یعنی جو دو سخا تھا۔

پاک میں ہے: ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا﴾ (۶۰:۶) یعنی یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے سبب ثواب سے محروم کر دیئے گئے۔ بعض نے آیت کریمہ: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ (۳۸:۷۳) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے، کے پیش نظر اس کی تفسیر اڑتھان سے بھی کی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے اعمال کے بدلے گرو ہوں گے۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۵۱) وَ اِنْسَالِيْ بِنِيْ بَعِيْرٍ جُرْمٍ (وافر)

اور میرا اپنے بیٹوں کو ناحق (بنی قثیر کے پاس) گرو کرنا اور دوسرے نے کہا ہے ﴿طویل﴾

(۵۲) فَاِنْ تُقْوِيَا مِنْهُمْ فَاَنْتُمْ بَسْلٌ .

اگر تم انھیں چھوڑ کر چلے جاؤ تو وہ بہادر ہیں۔

یہاں تُقْوِيَا، اقوى الْمَكَانُ سے ہے، جس کے معنی جگہ خالی ہونے کے ہیں اور بسالة بمعنی شجاعت ہے اور بَسْلٌ بائسل کی جمع ہے اور بہادر کو بائسل یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ترش رو رہتا ہے اور یا اس لیے کہ اس کے ہمسروں پر اس کی جان حرام ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ دشمنوں کو اپنے مال سے محروم کر دیتا ہے۔

بَسَقَ فُلَانٌ عَلٰی اَصْحَابِهٖ ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساتھیوں پر فضیلت میں بازی لے جانا۔

بَسَقَ وَبَسَقَ جس کے معنی تو کناہیں اصل میں بَزَوْا، ہے، بَسَقَتِ النَّاقَةُ: اونٹنی کے تھنوں میں بغیر جفتی زر کے تھوک کی طرح معمولی سا دودھ اتر آ یا۔

ب ب س ل

الْبَسْلُ: کے معنی کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور روکنا ہے۔ اکٹھا کرنا کے مفہوم کے پیش نظر استعارہ ترش روئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ترش رو کو باسل و مبسل الوجد کہا جاتا ہے۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر حرام اور گروی چیز کو بَسْلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَذِكْرٌ بِهٖ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۶۰:۷) یعنی اس (قرآن پاک) کے ذریعے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی نفس اپنے اعمال کے ثواب سے محروم نہ رہ جائے ہلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

بسل اور حرام میں فرق یہ ہے کہ حرام عام ہے جو ممنوع عنہ حکمی اور قہری دونوں کو شامل ہے اور بَسْلٌ کالفظ صرف جبراً کسی چیز سے محروم کر دینے پر بولا جاتا ہے، قرآن

① لعوف بن الاحوص الباهلی يتحسر على تسليم ابناءه لبنى قشير رهنا في دم رجل منهم اسمه ابو الصخيفة وتماه بعونا و لا يدم سراق وبعونا من بعايبعومعوا بمعنى الجنابة والحرم والبيت في نوادر ابى زيد ۵۱ والطيبرى ۲۳۳ والقرطبي ۱۶:۷ وشواهد الكشاف ۸۳ ومعاني الكبير ۱۱۴ او مجاز القرآن ۱: ۱۹۴ رقم ۲۲۱ والبحر ۴: ۱۴۴ تهذيب الالفاظ ۴۳۳ واللسان والتاج والمحکم (بسل بعم) وفيه قال ابن البررى انه لعبد الرحمن بن الاحوص وانظر لترجمة الشاعر العجم للمزباني ۲۷۵ والسمط ۲۷۷ والمعاني ۱۱۴. ② قاله زهير بن ابى سلمى وصدرة: بلا وبها ومنتهم والفتهم هكذا الرواية في ديوانه ۹۵ بشرح الاعمم وبها انشد ابو على في المعالية ليكرن في كليهما فانهما بدل فانهم وهكذا الرواية في نوادر ابى زيد ۳ ورواية ابى سعيد حسب رواية المؤلف اى فانهم بضمير الجمع لكن فيه فان او حشت بدل فان تقويا وهى موافقة لرواية ابى الطيب عن قطرب (الاضداد اول ابى الطيب ۱۳) وصلة البيت تريض فان تقوا المرعة منهم. وداراتها لا تقو منهم اذا نخل فان تقويا منهم فان محجراً. وجزع الحسام منهم اذا قلما يخلو..... بلاء..... فان او حشت..... وهى الرواية صحيحة ان شاء الله والبيت فى الاصل ملفق فاختلفت روايته على الرواية ومعنى البيت على رواية المؤلف فانهم حرام اى حيث كانوا لا يقربهم احد ولا يغير عليهم وعلى الثانية فضمير الثنية يرجع الى الموضوعين اى بعد ذهابهم حرام على زيادتهما والبيت فى المختارات والنوادر ۳ والامالى ۲: ۸۰ وفى اللالى مع السمط ۹۲۲-۹۲۳.

ہوتا ہے اس کا شنیہ بَشْرَیْنِ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿أَنْزَمِنْ لِبَشْرَیْنِ مِثْلِنَا﴾ (۳۷:۲۳) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں انسان کی جسمانی بناوٹ اور ظاہری جسم کا لحاظ کیا ہے تو ایسے موقع پر خاص کر اسے بَشْرُ کہا گیا ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشْرًا﴾ (۵۴:۲۵) اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔

﴿إِنْسِیْ خَالِقٌ بَشْرًا مِّنْ طِیْنٍ﴾ (۷۱:۲۸) کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔

کفار، انبیاء علیہم السلام کی کسر شان کے لیے ان کو بَشْرٌ کہہ کر پکارتے تھے، جیسے:

﴿إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشْرِ﴾ (۷۵:۷۴) یہ (خدا) کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔

﴿أَبَشْرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ﴾ (۲۳:۵۳) بھلا ہم ایک ہے آدمی کی جو ہم ہی میں سے ہے۔

﴿مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشْرٌ مِّثْلَنَا﴾ (۱۵:۳۶) کہ تم (اور کچھ) نہیں مگر ہماری طرح کے آدمی (ہو)

﴿أَنْزَمِنْ لِبَشْرَیْنِ مِثْلِنَا﴾ (۳۷:۲۳) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔

﴿فَقَالُوا أَبَشْرٌ یَّهْدُونَنَا﴾ (۶:۶۳) تو یہ کہتے کہ کیا

اَبَسَلْتُ الْمَكَانَ کسی جگہ کی حفاظت کرنا اور اس شخص کو جو اسے چھیننا چاہتا ہے محروم کر دینا۔ اَبَسَلْتُ: دم جھاڑ کرنے والے کی اجرت یہ رقیہ پڑھنے والے کے قول اَبَسَلْتُ فَلَانَا سے ماخوذہ، جس کے معنی کسی شیطان، سانپ اور زہریلے کیڑوں کی مدافعت پر دلیر کرنے کے ہیں یا کسی کو ان چیزوں پر حرام کر دینے کے ہیں۔ بعض نے بَسَلْتُ الْحَنْظَلَّ کا محاورہ بھی نقل کیا ہے، جس کے معنی حنظل کو طیب بنانے کے ہیں اگر یہ حکایت صحیح ہو تو اس کے اصل معنی حنظل کی بسات یعنی شدت یا اس کی تحریم یعنی کڑوا پن دور کرنا ہوں گے جو بمنزلہ حرمت کے ہے۔

بَسَلْ ہاں۔ بس ①

ب ش ر

اَبَشْرَةٌ کے معنی انسان کے جلد کی اوپر کی سطح اور اَدَمَةٌ کے معنی باطنی سطح کے ہیں۔ عام ادباء کا یہی قول ہے مگر ابو یزید ② نے اس کے برعکس کہا ہے چنانچہ ابو العباس وغیرہ نے ان کی تردید کی ہے۔ ③

بَشْرَةٌ کی جمع بَشْرٌ وَاَبْشَارٌ آتی ہے اور اسی سے انسان کو بشر کہا جاتا ہے کہ اس کی جلد بالوں سے صاف ہوتی ہے اس کے برعکس دیگر حیوانات کی کھال پر اون، بال یا پشم ہوتی ہے۔

لفظ بَشْرٌ واحد اور جمع دونوں کے لیے برابر طور پر استعمال

① راجع للبحث عن ماده (ب س م) فی الاستدراك.

② ابو یزید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری الخرجی من تلامیذ ابی عمرو بن العلاء والمفضل الضبی وكان جدہ من الصحابة وجمع نجومًا من القرآن علی عهد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم شدید العناية یجمع اللغات واللهجات توفی ۲۱۴ھ وقد قارب المائة انظر المعارف لابن قتیبة ۲۷۰ زہتہ الاولیاء ۱۷۳-۱۷۹ تاریخ بغداد للخطیب ۷/۹-۷۷، ۸۰ الارشاد ۴-۲۳۸-۲۴۰ ابن فلکان رقم ۲۴۹ مرآة الحنجان الیافعی ۱۸۵/۲ تہذیب لاین حجر ۳/۴-۵ والبیغیة للسیوطی ۲۵۴ وکتاب النوادر من اشهر تالیفہ.

③ قالہ ان اضداد ابی الطیب ۷۳-۷۶ وقال ابو مالک من قول ابی زید انظر اللسان (بشر).

آدی ہمارے ہادی بنتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک نے: ﴿إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (۱۱۰:۱۸) کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ بلاشبہ بشری تقاضوں میں سب انسان برابر ہیں مگر معارف جلیلہ اور اعمال جلیلہ کے لحاظ سے ان میں تفاوت ترقی پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ان معارف و اعمال کے ساتھ مخصوص فرما کر سرفراز کر دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ یوحی الہی میں اس حقیقت پر تنبیہ کی ہے کہ میں تم سے صرف وحی الہی کے ساتھ ممتاز ہوں۔

﴿وَلَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ﴾ (۲۰:۱۹) مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ میں خاص کر مس بشر کی نفی کی ہے اور آیت کریمہ: ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (۱۷:۱۹) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا میں تمثال کا قائل فرشتہ ہے اور اس میں تنبیہ کی ہے کہ فرشتہ خویش صورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا اور آیت کریمہ: ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ (۳۱:۱۴) یہ آدمی نہیں۔ میں بشریت کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ تو اس سے بلند و اشرف معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر سے مرکب ہو۔

بَشَرَاتُ الْأَدِيمِ: میں نے کھال کی ظاہری سطح کو چھیل دیا جیسا کہ أَنْفَتْ وَرَجَلَتْ کا محاورہ ہے اور اسی سے بَشَرَ الْجِرَادِ الْأَرْضِ ہے جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو چٹ کر جانے کے ہیں۔

الْمُبَاشَرَةُ کے اصل معنی تو ایک کی جلد کو دوسرے کی جلد کے ساتھ ملانا کے ہیں مگر کنایہ عورت سے مجامعت کرنا کے معنی میں آجاتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تَبَاشِرُوهُنَّ﴾

وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ ﴿ (۱۸۷:۲) اور جب تم مسجدوں میں اعکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ ﴿فَالْأَن بَاشِرُوهُنَّ﴾ (۲۷:۲) اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کر لو۔ ﴿فَالْأَن مُؤَدِّمٌ مُّبَشِّرٌ﴾ فلاں ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اصل میں یہ محاورہ أَبَشَّرَهُ اللَّهُ وَأَدَمَهُ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی کھال کے ظاہر و باطن کو اچھا کرے، پھر ہر اس کامل شخص کو جو ظاہری و باطنی خوبیوں کا ملک ہو۔ اسے مُؤَدِّمٌ وَ مُّبَشِّرٌ کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی کیے ہیں۔ اس کا أَدَمَهُ (باطن) نرم اور بَشَرَهُ (ظاہر) سخت ہے۔ أَبَشَّرْتُ الرَّجُلَ وَ بَشَّرْتُهُ وَ بَشَّرْتُهُ. خوشخبری پہنچانا۔ خوش کن خبر سنانا جس سے انسان کے چہرہ پر انبساط ظاہر ہو کیونکہ انسان کو جب کوئی اچھی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کے جسم میں (دفور مسرت سے) خون اس طرح دورہ کرنے لگتا ہے جیسے درختوں میں پانی، اس لیے التبشیر کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے کن چہرہ شدت فرحت سے ٹٹما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ تبشیر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور بَشَّرْتُهُ (مجرد) عام ہے جو اچھی و بری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور أَبَشَّرْتُهُ أَحْمَدْتُهُ کی طرح لازم و متعدی آتا ہے، جیسے: بَشَّرْتُهُ فَأَبَشَّرَ (یعنی وہ خوش ہوا) اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَبْشُرُكَ﴾ (۵۲:۳) کہ خداتم کو اپنی طرف سے بشارت دیتا ہے، میں ایک قرأت یَبْشُرُكَ وَ يَبْشُرُكَ ہے نیز فرمایا: ﴿قَالُوا أَلَا تَوَجَّلُ إِنَّا نَبْشُرُكَ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فِيمَا تَبْشُرُونَ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ

﴿ يَا بَشْرِي هَذَا غَلَامٌ ﴾ (۱۹:۱۲) زہے قسمت یہ تو
(حسین) لڑکا ہے۔

﴿ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بَشْرِي لَكُمْ ﴾ (۱۲۶:۳) اور
اس مدد کو تو خدا نے تمہارے لیے (ذریعہ بشارت) بنایا۔

الْبَشِيرُ: خوشخبری دینے والا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ

بَصِيرًا ﴾ (۹۶:۱۲) جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا تو
کرتہ یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور وہ بیٹھا ہو گئے۔ اور آیت

کریمہ: ﴿ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ مُبَشِّرَاتٍ ﴾
(۳۶:۳۰) کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ خوشخبری دیتی ہیں ۱

میں مُبَشِّرَاتٍ سے مراد بارش کی خوشخبری دینے والی
ہوئیں ہیں۔

اور حدیث: ۱۰

(۲۹) انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَلَمْ يَبْقَ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ
(کہ وحی منقطع ہو گئی اور مبشرات باقی رہ گئیں) میں

مُبَشِّرَاتٍ سے مومن کی سچی خواہیں مراد ہیں جیسا کہ بعد
میں وہی الرُّؤْيَا الصَّالِحَةَ الَّتِي يَرَاهَا الْمُؤْمِنُ أَوْ

تُرَى لَهُ سے اس کی تشریح فرمائی ہے اور آیات کریمہ:
﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (۳۳:۹) ان کو عذاب

الہم کی خوشخبری سنا دو۔ ﴿ وَبَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ ﴾
(۱۳۸:۳) (۱- پیغمبر) منافقوں (یعنی دوزخی لوگوں) کو

بشارت دو کہ ان کے لیے ﴿ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُوا

بِالْحَقِّ ﴾ (۵۵:۵۳:۱۵) مہمانوں نے کہا ذریعے نہیں
ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دینے لگے، اب

کا ہے کی خوشخبری دیتے ہو، انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی
خوشخبری دیتے ہیں۔ ﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴾ (۱۷:۳۹) تو

میرے بندوں کو بشارت سنا دو۔ ﴿ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ ﴾
(۱۱:۳۶) سو اس کو مغفرت کی بشارت سنا دو۔

اِسْتَبَشَّرَ کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں
ہے: ﴿ وَيَسْتَبَشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ

مِنْ خَلْفِهِمْ ﴾ (۳۵:۳۹) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ
گئے (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے، ان کی

نسبت خوشیاں منارے ہیں۔ ﴿ يَسْتَبَشِرُونَ بِنِعْمَةٍ

مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ ﴾ (۱۷:۳) اور خدا کے انعامات اور
فضل سے خوش ہو رہے ہیں۔ ﴿ وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ

يَسْتَبَشِرُونَ ﴾ (۶۷:۱۵) اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش
خوش (دوڑے) آئے۔ اور خوش کن خبر کو بشارت اور

بُشْرَى کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ﴾ (۶۳:۱۰) ان کے لیے
دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

﴿ لَا بَشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ ﴾ (۲۲:۲۵) اس دن
گنہگاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔ ﴿ وَكَلَّمَا

جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ ﴾ (۳۱:۲۹) اور جب
ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔

۱ ہکذا الاية في النسخ المطبوعة لكن الصحيح بشرًا۔ موضع مبشرات راجع سورة الاعراف (۷-۵۷) ولعل المصنف اراد آية سورة
الروم ان يرسل الرياح مبشرات ۳۰-۴۶ فوقع الذلة من المصحح ۱۲۔
۲ الحديث باختلاف الفاظه في الترمذی وابن ماجه والحاكم والبيهقي واحمد والبخاري والکامل لابن عدی وقد اشبع الکلام علی
طرق الحديث ابن کثیر (۲/۴۲۳-۴۲۴) وابن جریر (۱/۱۳۴-۱۳۵) بروایة ابن مسعود ۱۲۔

أَبَشَرَ كَمَعْنَى هُنَّ فِي هَذَا فِي بَشَارَتِكُمْ كَمَا يَجِبُ أَنْ يَبْقَى
وَأَمْحَلٌ لَيْتَنِي اسْنِ فِي بَقْلِ وَأَمْحَلٌ لَيْتَنِي شَكْلًا سَالِيًا كَمَا يَجِبُ
قُرْآنِ پَاکِ مِیْنِ هَیْ:

﴿وَأَبَشُرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾
(۳۰:۳۱) اور اس بہشت کی خوشی مناؤ جس کا تم سے وعدہ
کیا جاتا ہے۔ أَبَشَرَتِ الْأَرْضُ كَمَعْنَى هُنَّ فِي هَذَا فِي
سَبْرَهُ زَارِ هُوَ كَمَا يَجِبُ أَنْ يَبْقَى لَيْتَنِي اسْنِ فِي بَقْلِ
مَسْعُودِ كَمَا قَوْلُهُ ۵

(۳۰) مَنْ أَحَبَّ الْقُرْآنَ فَلْيَبْشُرْ كَمَا جَاءَ فِي الْقُرْآنِ
مَحَبَّتِ هَیْ اے خوش ہونا چاہیے۔ قَرَأْتُ كَمَا قَوْلُهُ ۵ کہ
اگر میں مشدد (یعنی باب تفعیل سے) ہو تو بَشْرِي سے
ہوگا اور اگر خفیفہ یعنی مجرد سے ہو تو بمعنی سرور ہوگا جیسے
مخاورہ ہے: بَشْرَتُهُ قَبْشِرٌ مِثْلُ جَبْرَتُهُ فَجَبْرٌ سَبْوِي
نہ کہا ہے ۵ کہ بَشْرَتُهُ كَمَا مَطَاوَعُ أَبَشَرَ بَیْهِ آجَاتَا
ہے۔ مگر ابن قتیبہ کی رائے ہے کہ یہاں یعنی حدیث میں
فَلْيَبْشُرْ كَمَا لَفْظُ بَشْرَتِ الْأَدِيمِ سے ماخوذ ہے جس کے
معنی کھال کو چھیلنا کے ہیں۔ لِهَذَا فَلْيَبْشُرْ كَمَعْنَى هُنَّ فِي
تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو کمزور اور دبا کرے۔ ۵

بِعَذَابِ الْيَمِّ ﴿۳۰:۹﴾ اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ
دینے والے عذاب کی خوشخبری سناؤ۔ میں تبشیر کے لفظ
سے تشبیہ کی ہے کہ سب سے بہتر خوش کن خبر جو وہ سن سکتے
ہیں، وہ عذاب الیم ہے جس میں وہ قیامت کے روز گرفتار
ہوں گے۔ اور عذاب کے متعلق بَشْرٌ كَمَا لَفْظُ بَطُورٌ تَهْكُمُ
استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ۱ ع (وافر)
(۵۳) تَحِيَّةٌ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ.
(ان کا باہمی سلام دردناک ضرب لگاتا ہے۔)

میں ضرب و جوع کے متعلق تحیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ۲
اور آیت کریمہ: ﴿قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِن مَّصِيرَكُمْ إِلَى
النَّارِ﴾ (۳۰:۱۲) کہہ دو کہ (چند روز) فائدے اٹھالو
آخر کار تم کو دوزخ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میں لَفْظُ تَمَتَّعٌ
بھی ایسے ہی مفہوم کے پیش نظر آیا ہے، نیز فرمایا: ﴿وَإِذَا
بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلَّ
وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ (۱۷:۲۳) حالانکہ
جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو
انہوں نے خدا کے لیے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا
ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔

۱ قاله عمرو بن معدی کرب صاحب ریحانة اخت درید بن الصمة واوله : وخیل قد دلفت لها بخیل والیبت من شواهد الطبری
(۳۹۱:۱) راجع للیبت الخمرامة والاصمعیات وشواهد الکشاف ۶۸ والبحر (۶:۱۱۶۶/۲:۱۱۸) والکتاب (۱:۴۲۹:۳۶۵)
ولعمدة (۲:۲۹۲).

۲ آلاقمین باب التهکم لکن الاستشهاد بالیبت فیہ خلطه وقع لکنیر من الشراخ الذین شرحوا کلام الزمخشری لان الیبت فیہ صنة
التویع والتویع قد یأتی للتهکم قد حققه ابن فارس فی الصحابی وانظر ایضا الطراز للفتحاحی ۲۹:۳۴.
۳ راجع الفائق ۱/۵۱ واللسان (بشر والنهایة).
۴ فراء ابو زکریا حیحی بن زیاد الفراء نسبة الی بیع الضرورة.

۵ ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر المناقب سیبویه ومعناه بالفارسیة (بوئ سیب) من اشهر تلامیذ الخلیل ومصنف اول کتاب فی
النحو الذی تلقاه من شیخه ومناظرته مع الکسائی فی مسئلة الزبور (اعلان التویع للسخاوی ۳۴) مشهورة حصل الکسائی بواء
الفتح توفی ۱۱۷۷ او ۱۱۸۰ هـ راجع النزهة لابن الانباری ۸۱:۷۹ وطبقات الزبیدی رقم ۲۲ و تاریخ بغداد للخطیب ۱۲/۱۹۵-۱۹۹
والارشاد ۶: ۸۰-۸۸ و فیات لابن خلکان رقم ۴۷۷ امرأة الجنان ۱: ۳۴۸-۴۱۵ ابو الوفا ۱: ۵۴ بغیة ۳۶۶-۳۶۷ شذرات لابن
العماد ۱: ۲۵۳-۲۵۵ نغخ الطبیب للمقرئ ۲/ ۴۷۸-۴۷۹ واصح طبقات الکتاب طبعه بولائق ۳۱۶ مع تقریرات بالهامش وزید من
شرح السیرانی و فی مفسر شرح الشواهد للاعلم اشقری
۶ اصنه من البشارة بالثواب و تاویل ابن قتیبة زکرة الزمخشری بلفظه قبل بغیر عزو.

جیسا کہ مروی ہے:
(۳۱) إِنَّ وَرَاءَ نَاعِقَبَةٍ لَا يَفْقَطُهَا إِلَّا الضَّمْرُ
مِنَ الرَّجَالِ . کہ ہمارے سامنے ایک گھائی ہے جسے

دلجے آدمی ہی عبور کر سکیں گے اور شاعر کا قول ❶
(۵۴) فَأَعْنَهُمْ وَأَبْشِرْ بِمَا بُشِرُوا بِهِ
وَإِذَا هُمْ نَزَلُوا بِضَنْكٍ فَانزِلْ

ان کی مدد کرو اور جو چیز انھیں خوش لگتی ہو اسی پر خوش رہو
اور جب وہ کسی تنگ مقام پر نازل ہوں تو تم بھی وہاں اتر
پڑو۔ پہلے معنی یعنی قراء کے قول پر محمول ہے۔
تَبَاشِيرُ الْوَجْهِ وَبَشْرُهُ چہرے پر خوشی کے آثار۔ خوش
روئی۔ تَبَاشِيرُ الصُّبْحِ: آغا ز صبح: تَبَاشِيرُ النَّخْلِ:
کھجور کا پہلا پختہ پھل۔ بَشْرِي وَبُشَارَةٌ وہ عطیہ (یا
انعام) جو بشارت دینے والے کو دیا جائے۔

اور آنکھ سے دیکھنے کے لیے بَصِيرَةٌ کا لفظ استعمال نہیں
ہوتا۔ بصر کے لیے أَبْصَرْتُ استعمال ہوتا ہے اور
بَصِيرَةٌ کے لیے أَبْصَرْتُ وَبَصَرْتُ بہ دونوں فعل
استعمال ہوتے ہیں جب حاسہ بصر کے ساتھ رویت
قلبی شامل نہ ہو تو بَصَرْتُ کا لفظ بہت کم استعمال کرتے
ہیں۔ چنانچہ البصار کے متعلق فرمایا:

﴿لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ﴾ (۲۲:۱۹)

آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ
دیکھیں۔ ﴿رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا﴾ (۱۲:۳۲) اے
ہمارے پروردگار! ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا۔ ﴿وَلَوْ
كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ﴾ (۲۳:۱۰) اگرچہ کچھ بھی دیکھتے
(بھالتے) نہ ہوں۔ ﴿وَأَبْصَرَ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ﴾
(۱۵۹:۳۷) اور دیکھتے رہو یہ بھی عنقریب (متوجہ) دیکھ
لیں گے۔ ﴿بَصَرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ﴾
(۹۶:۲۰) میں نے ایسی چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی۔
﴿ادْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾

ب ب ص ر

الْبَصْرُ: کے معنی آنکھ کے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿كَلِمَةً
الْبَصْرِ﴾ (۵۰:۵۴) آنکھ کے چھپکنے کی طرح۔ ﴿وَإِذَا
زَاغَتِ الْأَبْصَارُ﴾ (۱۰۳:۳۳) اور جب آنکھیں پھر گئیں۔
نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر
بَصْرٌ اور بَصِيرَةٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن
پاک میں ہے:
﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَلِيدٌ﴾
(۲۲:۵۰) اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری
نگاہ تیز ہے۔ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى﴾

❶ قاله عبد القيس بن خفاف الرجمي ونسبه صاحب اللسان لابي عطية بن زيد الجاهلي والبيت من كلمة مفضلية رقم ۱۶ في ۱۸
بيتاً وفي رواية: واليسر بما به اى اسرع الى اجابتهم والبيت فى اللسان (بشر) وتفسير الطبرى ۳: ۲۵۱) ومعانى القرآن للقران
والاصمعيات ۸۷ وشواهد المعنى (۲۰۳/۲: ۹۵). وتهذيب اصلاح المنطق مع آخر قبله.

توحید تو یہ ہے جو انسان کے واہمہ میں بھی نہ آسکے اور فرمایا کہ جو کچھ انسان ادراک کرتا ہے وہ توحید نہیں ہے۔
الْبَاصِرَةُ کے معنی ظاہری آنکھ کے ہیں۔ محاورہ ہے: رَأَيْتَهُ لَمَحًا بَاصِرًا میں نے اسے عیاں طور پر دیکھا۔ الْمُبْصِرَةُ روشن اور واضح دلیل قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَلَمَّا جَاءَ تَهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً ﴾ (۱۳:۲۷) جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں پہنچیں۔ ﴿ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً ﴾ (۱۲:۱۷) یعنی ہم نے دن کی نشانی کو نظروں کو روشنی دینے والی بنایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَآتَيْنَا ثُمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً ﴾ (۱۹:۱۷) اور ہم نے ثمود کی اونٹنی (نبوت صالح) کی کھلی نشانی دی، میں مُبْصِرَةَ اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہاں مُبْصِرَةَ کے معنی ہیں کہ ایسی نشانی جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ جیسا کہ رَجُلٌ مُخْبِتٌ وَمُضْعَفٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اہل اور قریبی رشتہ دار خبیث اور ضعیف ہوں اور آیت کریمہ: ﴿ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بِصَائِرَ لِلنَّاسِ ﴾ (۴۳:۲۸) میں بِصَائِرُ بَصِيرَةَ کی جمع ہے جس کے معنی عبرت کے ہیں یعنی ہم نے پہلی قوموں کی ہلاکت کو ان کے لیے تازیانہ عبرت بنا دیا اور آیت کریمہ:

﴿ وَابْصُرْ فَسَوْفَ يَبْصُرُونَ ﴾ (۱۷۹:۳۷) کے معنی یہ ہیں کہ انتظار کر جتنی کہ تم سب اپنی آنکھوں سے نتارج ملاحظہ کر لو اور آیت کریمہ: ﴿ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴾ (۳۸:۲۹) حالانکہ وہ دیکھنے والے تھے، میں مُسْتَبْصِرِينَ کے معنی طالب بصیرت کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

(۱۰۸:۱۲) یعنی میں پوری تحقیق اور معرفت کے بعد تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (اور یہی حال میرے پیروکار کا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿ بَلَى الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ﴾ (۱۳:۷۵) میں عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر خود اس کے اعضاء میں سے گواہ اور شاہد موجود ہیں جو قیامت کے دن اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے، جیسے فرمایا:

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ ﴾ (۲۴:۲۴) جس دن ان کی زبانیں، ہاتھ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور کبھی ضَرِيرٌ (اندھے) کو بھی بَصِيرٌ کہہ دیا جاتا ہے اور یہ اطلاق الاسم عَلَىٰ ضِدِّهِ کے قبیل سے ہے۔ لیکن اولیٰ یہ ہے کہ اسے تَسْمِيَةُ الشَّيْءِ بِاسْمِ ضِدِّهِ کے باب سے نہ بنایا جائے، بلکہ کہا جائے کہ ضَرِيرٌ کو بصیر کہنا اس کی بصیرت قلبی کے لحاظ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مُبْصِرٌ وِابْصِرٌ نہیں کہا جاتا۔ پس اگر یہ باسم ضدہ کے قبیل سے ہوتا تو یہ اطلاق بھی جائز ہونا چاہیے تھا اور آیت کریمہ:

﴿ لَا تُذِرْكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُذِرْكُ الْاَبْصَارَ ﴾ (۱۰۴:۶) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ میں اکثر علماء نے اَبْصَارُ کے معنی آنکھ کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ظاہری آنکھ کے علاوہ ادہام و افہام کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (۳۲) اَلتَّوْحِيدُ اَنْ لَا تَتَوَهَّمَهُ . کہ (حقیقتاً)

جس سے آر پار نظر آتا ہو۔ اسی سے بَصَرْتُ الثَّوْبَ وَالْأَدِيمَ کا محاورہ ہے، جس کے معنی کپڑے یا چمڑے کا درمیانی شگاف سلائی کرنا کے ہیں۔

ب ص ل

الْبَصْلُ: پیاز قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَعَدَسِيهَا وَبَصْلِيهَا﴾ (۶۱:۴) اور مسور اور پیاز۔ اور تشبیہ کے طور پر لوہے کے خود کو بھی بَصْلٌ کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿ع (و صل)﴾ (۵۵) وَتَرَكَ كَالْبَصْلِ اور پیاز جیسی خود۔

ب ض ع

الْبِضَاعَةُ: مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لیے الگ کر لیا گیا ہو۔ ابْضَعُ وَابْتَضَعَ بِضَاعَةً۔ سرمایہ یا پونجی جمع کرنا۔ الگ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رَدَّتْ إِلَيْنَا﴾ (۶۵:۱۴) یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئی ہے۔ ﴿وَجِئْنَا بِبِضَاعَةِ مُزَجَاةٍ﴾ (۸۸:۱۴) اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں۔ اصل میں بِضَاعَةٌ بَضْعٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں گوشت کا بڑا ٹکڑا۔ بَضَعْتُهُ وَبَضَعْتُهُ گوشت کے

بطور استعارہ اسْتَبْصَرَ (استفعال) بمعنی ابْصَرَ (افعال) ہو جیسا کہ اسْتَبْجَابَةٌ بمعنی اجابة کے آجاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ تَبْصِرَةً﴾ (۷۰:۵۰) اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں میں تَبْصِرَةً کے معنی ہیں دکھانے اور سمجھانے کو اور یہ (تفعلة کے وزن پر) باب تفعیل کا مصدر ہے، جیسے قَدَمْتُهُ تَقْدِيمًا وَتَقْدِيمَةً وَذَكَرْتُهُ تَذْكَيرًا وَتَذْكَيرًا اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا يَبْصُرُونَهُمْ﴾ (۷۰:۱۰) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے، میں يَبْصُرُونَهُمْ کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے احوال و آثار سے خوب طرح واقف کر دیا جائے گا۔ بَصَرَ الْجَزْؤِ پلے نے آنکھیں کھولیں۔ الْبَصْرَةُ: ملائم چمکدار پتھر گویا وہ پینا ہے اور یا اسے بَصْرَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دور سے چمکتا ہوا نظر آ جاتا ہے اور اسے بَصْرٌ بھی کہا جاتا ہے۔ الْبَصِيرَةُ (ایضاً) خون کا دھبہ جو دور سے چمکتا ہوائی دکھائی دے، چمکدار، ڈھال، کپڑے یا مٹکیزے کے دو ٹکروں کے درمیان کا شگاف

① وَتَكْمَلَتُهُ : فحمة ذفر (ترقی بالعرى - قردمانيا..... والبيت من قصيدة لبيدنى رثاء اخيه مطلعها : ان تقوى ربنا خير نفل وبادن الله ربى وعجل (مفيد الغايه) فى ديوانه ۱۰۱-۱۱۷ والبيت فى وصف كنيته سهكه من الحديد عليها وردع محكمة فحمة اى كنيته عظيمة (ذفر او فرء) اى منة الريح من الحديد والقرومانى معرب (كروماند) اى عمل وبقى (راجع معجم استحسان ۱۰۲۲ وابن الانبارى (۴۱۶-۴۱۵) اى دروغ غليظة والتربك بيض الحديد والرتومعناه الشديد يقول انشاء الله ان هذه الكنية ملبوسة فى دروع طويلة شدت اطرافها بالعرى وسطها لثلا تنتشر وتشتت عن لابسها وعلى رؤسهم بيض الحديد مثل البصل وقيله : فمتى ينفع صراح صادق يحلبوها ذات جرس ورجل والبيت فى اللسان والصحاح (ترك رتو قردم ،ذفر) واللسان وحده (بصل) وتهذيب الالفاظ ۴۹۴ والمتوشح ۸۷ والاقضاب ۲۱۵-۴۱۹ والصناعتين (۱۰۷، ۱۹۶، ۸) رواه من روى التشبيه والاصلاح ۳۳۷. والمقاييس (۱: ۲۵۳-۴۵۰/۲۹۵) والمعانى ۸۷۴، ۲۹۶، ۱۰۳۹، ۱۰۷۱ واضداد لابن السكيت ۱۹۶ واضداد لابن الانبارى ۸۹ وابى الطيب ۲۷۹ ونوادر ابى مهسل ۲۸۸ والمعلقات لابن الانبارى (۴۱۵) (وكان عمر يامر برواية هذا القصيدة .

بڑے بڑے کٹڑے بنانا۔ اِبْتَضَعَ وَبَتَضَعَ اس کا مطاوع آتا ہے، جیسے قَطَعْتُهُ وَقَطَعْتَهُ فَاَنْقَطَعَ وَتَقَطَعَ الْمَبْضَعُ: (آلہ) نشتر جیسے مقطع کٹنا یہ کے طور بضع کے معنی عورت کی شرمگاہ بھی آجاتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے۔ مَلَكَتْ بَضْعَهَا کیا تم نے اس عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ بَاَضَعَهَا بِضَاعًا عورت سے جماعت کرنا۔ فُلَانٌ حَسَنُ الْبَضْعِ وَالْبَضِيعِ وَالْبَضَاعَةِ۔ فلاں خوب موٹا تازہ ہے۔ الْبَضِيعُ: ٹاپو۔ وہ جزیرہ جو خشکی سے بہت دور ہو۔ فُلَانٌ بَضْعَةٌ مِثْنِي: فلاں میرے جسم کا کٹڑا ہے یعنی نہایت قریبی رشتے دار ہے۔ الْبَاَضِعَةُ: زخم جو گوشت کو کاٹ ڈالے۔ الْبَضْعُ: (بکسر الباء) عدد جو دس سے الگ کیے گئے ہیں یہ لفظ تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پانچ سے اوپر اور دس سے کم پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے ۵

﴿بِضْعٍ سِتِينَ﴾ (۴۲:۱۲) چند سال۔

ب ط ر

الْبَطْرُ: وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال، حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط طور پر صرف کرنے سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَطْرًا وَّوَرَاءَ النَّاسِ﴾ (۴۷:۸) جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے۔

﴿بَطْرَتْ مَعِيشَتَهَا﴾ (۵۸:۲۸) اپنی معیشت میں

ب ط ش

الْبَطْشُ: کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطْشَتُمْ جَبَّارِينَ﴾ (۱۳۰:۲۶)

اور جب (کسی کو) پکڑتے تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔

﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ﴾ (۱۶:۴۴)

جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔

﴿وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا﴾ (۳۶:۵۳) اور لوٹنے ان کو ہماری گرفت سے ڈرایا۔

﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ (۱۲:۸۵) بیشک تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔

يَدٌ بَاطِشَةٌ. سخت گیر ہاتھ۔

ب ط ل

الْبَاطِلُ: یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

۱ قال علماء اللغة والتفسير البضع ما بين الثلاث الى التسع راجع اللسان (بضع) ورواه الطبرانی وابن مردويه عن دينار بن مكرم والترمذی عن ابن عباس مرفوعاً .

۲ ارید بالبطشة ابكرى يوم يدارو عذاب يوم القيمة (الطبرى ۱۱۶/۲۵-۱۱۸).

فَعَلَ بمعنی فاعل ہو کیوں کہ وہ اپنے دشمن کے خون کو رائیگاں کر دیتا ہے۔

بَطَلَ (ن) أَلَّرَجُلٌ بَطُولَةً: بہادر ہونا بَطَّال یعنی یہ بیکار یہ بَطَالَةٌ (بیکاری) کی طرف منسوب ہے۔ محاورہ ہے: ذَهَبَ دَمُهُ بَطَّالًا اس کا خون رائیگاں گیا۔ أَلْبَطَالُ کے معنی کسی چیز کو خراب اور نابود کرنے کے ہیں، خواہ وہ چیز حق ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ﴾ (۸:۸) تاکہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کر دے۔

کبھی اِبْطَالٌ کا لفظ بے حقیقت بات کہنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَيْنَ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ﴾ (۵۸:۳۰) اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو انہیں کہہ دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَخَيْسَرٌ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ﴾ (۷۸:۳۰) اور اہل باطل نقصان میں پڑ گئے۔

میں مُبْطِلُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ب ط ن

الْبَطْنُ: اصل میں بَطْنُ کے معنی پیٹ کے ہیں، اس کی جمع بَطُونٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَإِذْ أَنْتُمْ آجِنَةٌ فِي بَطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۳۲:۵۳) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔ بَطْنَتُهُ: میں نے اس کے پیٹ پر مارا۔

﴿ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ﴾ (۳۰:۳۱) یہ اس لیے کہ خدا کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں۔

اور باطل کا لفظ قول و فعل دونوں پہ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۷۱:۳) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ غلط ملط کیوں کرتے ہو۔

بَطَلَ: (ن) بَطُولًا وَبَطَّالًا. کسی چیز کا یونہی ضائع چلا جانا۔

أَبْطَلَهُ. ضائع کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَبَطَّلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (۱۱۸:۷) اور جو کچھ

فرعونی کرتے تھے باطل ہو گیا۔ اور ہر وہ آدمی جو دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لیے کوئی مفید کام نہ کرے اسے بَطَّال و ذُو بَطَالَةٍ کہا جاتا ہے۔

بَطَلَ (ك) دَمُهُ: خون کا رائیگاں جانا۔

بَطَلَ: بہادر جو موت سے نہ ڈرے، ایسے آدمی کے خون کو رائے گاں سمجھ کر یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے، شاعر نے کہا ہے: (طویل)

(۵۶) فَقُلْتُ لَهَا لَا تَنْكِحِيهِ فَإِنَّهُ
لَأَوَّلُ بَطَلٍ أَنْ يُلَاقِيَ مَجْمَعًا

(میں نے اس سے کہا کہ اس سے نکاح مت کیجیے کیونکہ وہ لڑائی میں بہادر کے ہاتھ سے مارا جائے گا) تو اس معنی کے لحاظ سے بَطَلٌ بروزن فَعَلٌ بمعنی مَفْعُولٌ ہے، یعنی وہ جس کا خون رائیگاں جانے والا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

۱۔ قاله تابع شرامادحاً نفسه عند ماخطب امرأة فمنعها الناس بانه سيقفل فتبين ايماً والبيت في الحامسة ۴۹۱ بشرحه المرزوقى

۱۱ بيتاً وقد احسن الشارح فى اعراب البيت وفى روايته: قالوا بدل فقلت ونصل بدل بطل والبيت فى البحر: ۳۲۵/۵.

﴿ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ﴾ (۳۲:۷) ظاہری ہوں یا پوشیدہ۔

الْبَطِينُ: کلاں شکم، الْبَطِينُ: بسیار خور۔

الْمَبْطَانُ: جس کا بسیار خوری سے پیٹ بڑھ گیا ہو۔

الْبَطْنَةُ: بسیار خوری۔ مثل مشہور ہے۔

الْبَطْنَةُ تَذْهَبُ الْفَيْطَنَةَ * بسیار خوری ذہانت ختم کر دیتی ہے۔

بَطْنُ الرَّجُلِ بَطْنًا: شکم پروری اور بسیار خوری سے

اترا جانا۔ بَطْنُ (ك) الرَّجُلِ: بڑے پیٹ والا ہوتا۔

مَبْطَنٌ تَجْكُ هُوَ بَطْنٌ وَاللَّ

بَطْنُ الرَّجُلِ: مرض شکم میں مبتلا ہوتا۔ اس سے صیغہ

صفت مفعولی مَبْطُونٌ (مریض شکم) آتا ہے۔

الْبَطَانَةُ: کے معنی کپڑے کا استر یا اس کے اندرونی حصہ

کے ہیں اور اس کی ضد ظَهْرَةٌ ہے۔ * جس کے معنی

کپڑے کا اوپر کا حصہ یا ابرہ کے ہیں اور بَطْنْتُ نَوْبِي

بِأَخْرَ کے معنی ہیں: میں نے ایک کپڑے کو دوسرے کے

نیچے لگایا۔

بَطْنُ فُلَانٍ بِفُلَانٍ کسی شخص کے اندرونی معاملات

سے واقف ہونا اور بطور استعارہ الْبَطَانَةُ کا لفظ ہر اس شخص

پر بولا جاتا ہے جو دوسرے کا راز دان ہو، چنانچہ قرآن

الْبَطْنُ: ہر چیز میں یہ ظہر کی ضد ہے اور ہر چیز کی نیچے

کی جہت کو بطن اور اوپر کی جہت کو ظہر کہا جاتا ہے اسی

سے بطور تشبیہ کہا جاتا ہے۔ بَطْنُ الْأَمْرِ (کسی معاملہ کا

اندرون) بَطْنُ النُّوَادِي (وادئ کا نشیبی حصہ) اور بطن

بمعنی قبیلہ بھی آتا ہے اس اعتبار سے کہ تمام عرب کو بمنزلہ

ایک شخص کے فرض کیا جائے اور ہر قبیلہ بمنزلہ بطن فخذ

اور کابل (کندھا) وغیرہ اعضاء کے تصور کیا جائے۔ اسی

بنا پر شاعر نے کہا ہے * (ع) (سربج)

(۵۷) النَّاسُ جِسْمٌ وَإِمَامُ الْهُدَى

رَأْسٌ وَأَنْتَ الْعَيْنُ فِي الرَّأْسِ

کہ لوگ بمنزلہ جسم اور امام ہدی بمنزلہ سر ہے، مگر تم سر میں

آنکھ ہو۔

اور ہر پیچیدہ معاملہ کو بطن اور جلی اور عیاں کو ظہر کہا جاتا

ہے۔ اسی سے بَطْنَانُ الْقِدْرِ وَظَهْرَانُهَا کا محاورہ

ہے۔ یعنی دیگ کی اندرونی اور بیرونی جانب۔

ہر اس چیز کو جس کا خاصہ بصر سے ادراک ہو سکے اسے ظاہر

اور جس کا خاصہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے اسے باطن کہا

جاتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْأَيْمِ وَبَاطِنَهُ ﴾ (۱۲۰:۶) اور

ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کر دو۔

① قاله على بن جبلة الحوك يمدح حميد بن عبد الحميد الطوسي والبيت في الكامل ۸۷۵ والعمدة (۱: ۲۶۴) وفيه صنعة التوليد وشرح الدرّة للخفاجي ۵۷ والورقة لابن الجراح ۱۰۶ وذييل الامالي ۹۶ وآخرو الطبقات لابن المعتز ۴۳۴ وفي خاص العاص للشعالبي قبله: دجلة تسقى يطبخ من تسقى من الناس ونسبه المؤلف (في محاضراته التي المنصور الضمري خلافاً لجميع المراجع الاخرى وراجع لترجمة العكوك الضريير الاغانى وطبقات لابن المعتز ۱۷۱-۱۸۰ والشعر والشعراء لابن قتيبة ومسالك الابصار وابن خلكان والفهرست وان شعرة مائة وخمسين ورقة ۱۲.

② وفي الامثال للشعالبي تافن بدل تذهب يضرب لمن غير استغناءه عقله وفسره راجع رقم ۵۳۴.

③ بطنان والجمع بطان ومن قوله تعالى: ﴿ بطانها من استبرق ﴾ (۵۵-۵۴) قال الحسن اراد ظواهرها ولذا عده العلماء من الاضداد راجع اضداد لابي الطيب ۶۷.

ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ﴾ (۸۳:۲۳) اور وہی (ایک) آسمانوں میں معبود ہے اور وہی زمین میں معبود ہے۔ اسی لیے بعض حکماء کا قول ہے کہ معرفت الہی کے طالب کی مثال اس شخص کی ہے جو اطراف عالم میں ایسی چیز کی تلاش میں سرگردان پھر رہا ہو۔ جو خود اس کے پاس موجود ہو۔ اور الْبَاطِنُ سے اس حقیقی معرفت کی طرف اشارہ ہے، جس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ہے:

(۳۴) يَأْمَنُ غَايَةَ مَعْرِفَتِهِ الْقُصُورُ عَنْ مَعْرِفَتِهِ
اسے وہ ذات جس کی معرفت کی انتہا اس کی معرفت سے در ماندگی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات (دلائل قدرت) کے لحاظ سے ظاہر ہے اور باعتبار ذات کے باطن ہے۔ اور بعض نے کہا کہ الظاہر سے اس کا تمام اشیاء پر محیط ہونا مراد ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتا۔ الْبَاطِنُ ہے۔ چنانچہ فرمان الہی ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ (۱۰۳:۲) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک مقولہ مروی ہے جس سے ان دونوں لفظوں کی تفسیر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

(۳۵) تَجَلَّى لِعِبَادِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ رَأَوْهُ وَآرَاهُمْ نَفْسَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ تَجَلَّى لَهُمْ

پاک میں ہے: ﴿لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةَ مِّنْ دُونِكُمْ﴾ (۱۱۸:۳) کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ بنانا اور بطانۃ الثوب سے استعارہ ہے، کیونکہ اسی معنی میں لَبَسْتُ فُلَانًا وَقُلَانًا شِعَارِي وَدِنَارِي بھی کہا جاتا ہے ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶

(۳۳) مَا بَعَثَ اللَّهُ مِنْ نَبِيٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلَّا كَانَتْ لَهُ بَطَانَتَانِ بَطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْخَيْرِ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ وَبَطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ . کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کسی کو خلیفہ بنایا ہے مگر ہمیشہ اس کے دو رازدان رہے ہیں ایک رازدار اسے خیر کا مشورہ اور اس کی ترغیب دیتا رہا ہے اور دوسرا اسے شر کا مشورہ اور اسی پر اسکا تار رہا ہے۔

الْبَطَانُ: تنگ جس سے جانور کا پالان کسا جاتا ہے۔ وَالْجَمْعُ أَبْطَانَةٌ وَبُطْنٌ. أَلْبَطْنَانِ پینٹ کی دو رگیں۔ الْبُطَيْنُ۔ ستارہ جو برج حمل کے لیے بمنزلہ ششم کے ہے و آں ستارہ خرد است کہ بر صورت و یک پایہا واقع شدہ) الْتَبَطُنُ: (تفعل) کسی معاملہ کی تہ تک پہنچنا۔

﴿الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (۳:۵۷) صفات الہی سے ہیں۔ اور الْآوَّلُ وَالْآخِرُ کی طرح مزدوج یعنی ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ الظَّاهِرُ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ اس معرفت کی طرف اشارہ ہے جو ہمیں بالبداہت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ انسان جس چیز کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھے اس کی فطرت کا یہی فیصلہ

❶ الحدیث فی رحم، ص ۵۰، عن ابی سعید و بمعناه (خذ، ت عن ابی ہریرۃ، ف، عن ابی ایوب و ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال ۱/۶ رقم ۳۵۱-۳۵۳-۳۵۰۳ و بمعناه زوائد ابن حبان رقم ۲۱۰۲ و فی الکنز تحضہ بدل تحثہ .

❷ هذا ذکر العلامة الماروی فی تفسیر الآیۃ تسعة اقوال فنذکر ۱۲.

میں لَبِيْطَسِّنَّ کے معنی دوسروں سے دیر لگوانا کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی بہت زیادہ سستی کرنا بھی لکھے ہیں حاصل یہ ہے کہ بعض تم میں سے خود بھی دیر لگاتے ہیں اور دوسروں سے بھی دیر لگواتے ہیں۔

ب ظ ر

ایک قرأت میں ہے:

﴿ وَاللّٰهُ اٰخِرَ جَعَلَكُمْ مِنْ بُطُوْنَ اُمَّهَاتِكُمْ ﴾ (۷۸:۱۶) اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کی شرمگاہوں سے باہر نکالا۔

بُطُوْرٍ بَطَّارَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں کے لٹکے ہوئے گوشت کے ہیں اور عورت کی شرمگاہ کے اوپر ابھرے ہوئے گوشت کو بَطَّارَةٌ کہا جاتا ہے۔ پھر مجازاً بَضْعُ کی طرح شرمگاہ پر یہ لفظ بولا جاتا

ب ع ث

اَلْبَعْتُ: (ف) اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بھیجنا کے ہیں اور اَنْبَعْتُ دراصل مطاوع ہے، بَعْتُ کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں، مثلاً بَعَثْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینے کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کر کے محشر طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳۶:۶) اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا۔

﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ﴾ (۶:۵۸) جس دن خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔

اپنے بندوں پر تجلی فرمائی بدوں اس کے کہ بندے اس کو دیکھ سکیں اور اپنی ذات کو دکھایا بدوں اس کے کہ ان کے سامنے جلوہ افروز ہو، مگر اس قول کو سمجھنے کے لیے فہم روشن اور عقل وافر کی ضرورت ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ﴾ (۲۰:۳۱) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ”ظَاہِرَةٌ“ سے نبوت اور بَاطِنَةٌ سے عقل مراد ہے اور بعض نے ظَاہِرَةٌ سے محسوس نعمتیں مراد لی ہیں اور بَاطِنَةٌ سے مقولات یعنی وہ نعمتیں مراد لی ہیں جن کا جس سے ادراک نہیں ہو سکتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ظَاہِرَةٌ سے وہ غلبہ مراد ہے، جو دشمنوں پر انسانوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ اور باطن سے وہ غلبہ مراد ہے جو فرشتوں کے ذریعہ حاصل ہوا، لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

ب ط ء

اَلْبَطُوْءُ: (ك) کے معنی چلنے میں دیر لگانے اور سستی کرنے کے ہیں اور یہ باب کرم و تفاعل و استفعال اور افعال سے استعمال ہوتا ہے، لیکن بَطُوْءُ (ك) کے معنی اس وقت بولتے ہیں جب دیر لگانے کے عادی ہو جائے اور تَبَاطًا کے معنی میں جنگف ویر کرنا اور استفعال میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اِنْطَاءٌ: (افعال) سست رفتاری کے ساتھ متصف ہونا۔ نیز بَطَّاهُ وَاَبْطَاهُ (متعدی) مؤخر کرنا اور آیت کریمہ: ﴿ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيْبَطُنَّ ﴾ (۷۲:۳) اور تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو (عمداً) دیر لگاتے ہیں۔

مبعوث کرنے اور بھیجنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا﴾ (۳۶:۱۶)

اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں: ﴿أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا﴾ (۴۳:۳۳) فرمایا ہے اور آیت: ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا﴾ (۱۲:۱۸) پھر ان کو جگا اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔ میں بَعَثْنَا کے معنی صرف (نیند سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجنے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا﴾ (۸۹:۱۶)

اور اس دن کو یاد کرو، جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَيَّ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ (۶۵:۲) کہہ دو کہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے عذاب بھیجے۔

﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾ (۲۵۹:۲) تو خدا نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ﴾ (۶۰:۲) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے، پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔ میں نیند کے متعلق تونی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک

﴿زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَّنْ يُبْعَثُوا﴾ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثَنَّ ﴿(۷۶:۲۳) جو لوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

﴿مَا خَلَقْنَاكُمْ وَلَا بَعَثْنَاكُمْ إِلَّا كَفْهًا وَآجِدَةً﴾ (۲۸:۳۱) تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص (کے پیدا کرنے اور جلا اٹھانے) کی طرح ہے۔ پس بَعَثُ دوسم پر ہے اول: بَعَثُ بَشَرِي یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے، جیسے بَعَثُ الْبَعِيرِ (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) اور بَعَثُ الْإِنْسَانَ فِي حَاجَةٍ (کسی کو کسی کام کے لیے بھیجنا)

دوم: بَعَثُ الْإِنْسَانَ یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ اعیان، اجناس اور انواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر اس نے کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔ دوم: مرووں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرمادیتا ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم مثل دوسرے انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ﴾ (۵۶:۳۰) اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔ بھیجی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ: ﴿فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۱:۵) اب خدا نے ایک کو بھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔ میں بَعَثُ بمعنی قَيَّضُ ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے تو اس کے معنی

ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔
بَعْدَ (ک) فَهُوَ بَعِيدٌ دُور ہونا، جیسے فرمایا: ﴿وَمَا هِيَ
مِنَ الظَّالِمِينَ بَعِيدٌ﴾ (۸۳:۱۱) اور وہ (بستی ان)
ظالموں سے کچھ دور نہیں ہے۔

لیکن بَعْدَ (س) کے معنی مرنا کے ہیں۔ اور عموماً اَلْبَعْدُ
ہلاک ہونا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿كَمَا
بَعَدَتْ ثَمُودٌ﴾ (۹۵:۱۱) جیسے ثمود تباہ ہو گئے۔ اور
اَلْبَعْدُ وَ اَلْبَعْدُ کبھی قرب کے مقابلہ میں استعمال ہوتے
ہیں۔ جیسا کہ تاہت نے کہا ہے ﴿بسيط

(۵۸) فِي الْاَدْنَىٰ وَفِي الْبَعْدِ

یعنی ہر قریب و بعید پر اس کے احسانات موجود ہیں اور کبھی
یہ دونوں (اَلْبَعْدُ وَ اَلْبَعْدُ) ہلاکت کے معنی میں بھی
آ جاتے ہیں۔ چنانچہ انہی معنی میں فرمایا: ﴿فَبُعْدًا
لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (۲۱:۲۳) پس ظالم لوگوں پر
لعنت ہے۔

﴿فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (۲۳:۲۳) پس جو
لوگ ایمان نہیں لاتے ان پر لعنت۔

اور آیت کریمہ:

﴿بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ
وَ الضَّلَالِ الْبَعِيدِ﴾ (۸:۲۳) بات یہ ہے جو لوگ
آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ آفت اور پرلے درجے کی
گمراہی میں (بتلا) ہیں۔

طرح کی موت ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَكِنَّ كَرَهُ
اللَّهُ اَنْبِعَانَهُمْ﴾ (۳۶:۹) لیکن خدا نے ان کا اٹھنا
(اور نکلتا) پسند نہ کیا۔ میں انبعاث کے معنی جانے
کے ہیں۔

ب ع ث ر

آیت کریمہ: ﴿وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ﴾ (۳:۸۲)
میں بُعْثِرَتْ کے معنی قبروں کی مٹی کو الٹ پلٹ کرنے اور
مردوں کو اٹھانے کے ہیں۔ جن علماء کے نزدیک رباعی اور
خماسی دو ثلاثی مادوں سے مل کر بنتے ہیں ان کے خیال میں
”بُعْثِرَ“ بُعِثَ اور اُنْبِثَ سے مل کر بنا ہے، جیسا کہ
تَهَلَّلَ وَبَسَمَلَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اور بِسْمِ اللَّهِ سے
بنے ہیں۔ اور اس میں کچھ بعد نہیں ہے کیونکہ اَلْبُعْثِرَةَ
میں ان دونوں فعلوں کے معنی موجود ہیں۔

ب ع د

اَلْبَعْدُ: کے معنی دوری کے ہیں یہ قُرب کی ضد ہے
اور ان کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ ایک ہی جگہ کے اعتبار
سے ایک کو قریب اور دوسری کو بعید کہا جاتا ہے۔

محسوسات میں تو ان کا استعمال بکثرت ہوتا رہتا ہے مگر کبھی
کبھی معانی کے لیے بھی آ جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿ضَلُّوا
ضَلًّا لَا بَعِيدًا﴾ (۳۶:۴) وہ راہ ہدایت سے بھٹک کر
دور چاڑھے۔

﴿أُولَئِكَ يَسْأَدُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ﴾ (۴۳:۴۱)

① قاله النابغة بمدح النعمان وتكلمته: فتلك تبليغ النعمان ان له فضلا على الناس والبيت في العقد الثمين ۷ وشرح العشر
للتبريزي ۲۹۵ والخزانة (۱: ۲۲) طبعة بولاق) والسيوطي ۲۸ وديوانة ۲۹ واللسان والتاج (بعد) في رواية الصحاح والمحکم
(بعد) في الادنين والبعد وايضا منله بعيد بن الابرص وتكلمته: اولاتوك بجميع لاكفاء له - قوم هم القوم راجع ديوان ابن الابرص م
شرح جالس طبعة لندن ۱۹۱۳ھ).

ب ع ض

بَعْضُ الشَّيْءِ: ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اس لیے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جیسے: بَعْضُهُ وَكُلُّهُ اس کی جمع اَبْعَاضٌ آتی ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۳۶:۲) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ ﴿وَكَذَلِكَ نُؤَيِّنُ بِبَعْضِ الظَّالِمِينَ بَعْضًا﴾ (۱۲۹:۲) اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے، ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ﴿وَيَسْلَعَنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (۲۵:۲۹) اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے اور بَعْضٌ

الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو حصوں میں تقسیم کر دینا ہیں، جیسے جَزَاءٌ تَهٌ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَبِينُ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾ (۶۳:۲۳) نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم کو سمجھا دوں۔ میں ابوسعیدہ نے کہا ہے ❶ کہ یہاں بعض بمعنی کل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❷ (کامل)

(۵۹) أَوْ يَرْتَبِطُ بَعْضُ النُّفُوسِ حِمَامُهَا

میں اَلضَّلَالِ البعید سے ویسی گمراہی مراد ہے جس کے بعد ہدایت کی طرف لوٹنا نہایت مشکل ہے۔ جیسا کہ کوئی شخصی شاہراہ سے بہت دور چلا جائے جس کے بعد دوبارہ اس کے شاہراہ کی طرف لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا قَوْمٌ لُّوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيدٍ﴾ (۸۹:۱۱) اور لوط علیہ السلام کی قوم (تو) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی گمراہی میں ان جیسے ہو، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ ان کی طرح تم پر بھی عذاب آجائے، بَعْدُ: یہ قَبْلُ کی ضد ہے، لہذا قَبْلُ کی بحث میں اس کی جمع انواع بیان کی جائیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ب ع ر

اَلْبَعِيرُ: اونٹ (جنس) لفظ انسان کی طرح مذکور مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے، اس کی جمع اَبْعِرَةٌ وَاَبَاعِرُ وَبُغْرَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ﴾ (۷۲:۱۲) اور جو شخص اس کو لے آئے اس کے لیے بارشتر (انعام) اَلْبَعْرُ۔ اونٹ کی بیگنی۔ اَلْمُبْعَرُ (جائے بعر) اَلْمُبْعَارُ: بہت زیادہ بیگنی کرنے والا اونٹ۔

❶ راجع محازبا: ج ۱ ص ۹۴ فانہ قال: وبعض يكون شيئاً من الشئى ويكون كل الشئى قال لبيد..... لكن تحت آية ولا حل لكم بعض الذى حرم عليكم (۳-۵۰) ثم قال تحت الآية (۴۳-۶۳) البحوثه: البعض ههنا الكل قال لبيد..... لان الموت لا يتعلق بعض النفوس دون بعض وابو عبيدة معمر بن العشى ۱۱۰۔ وتاريخ وفاته (۹۶/۴) مختلف. فيه الاغلب ۲۱۰-۲۱۳ كان من معاصري تلامذة الخليل لم يتأثر به تأثر مباشر اكان ابواه من يهود فارس وكان مولى لبيم قريش واخذ في شبيبة عن ابي عمرو بن العلاء ويونس بن حبيب، اتصل بالخوارج (مقالات الاسلاميين الاشعرى، ۱: ۱۲۰ او البيان للجاحظ ۱: ۳۲ كان ضعيفاً في علم النحو (مقدمة تهذيب الازهرى) صنف كتابا في مثالب العرب نقماً منهم عيب اعيب عليه نسبتة المعجم فكرهه الناس حتى لم يحضر جنازته احد من البصريين (راجع ضحى الاسلام لاحمد امين: ۲/ ۳۰۴ مع المراجع وبر كلن اومحازبه، في تفسير القرآن مشهور وعليه تعليقات للاصمعي (الارشاد لياقوت ۱۶۷/۷-۱۶۸)

❷ قاله لبيد بن ربيعة وصدرة تراك امكته ازالم ارضها..... وفي رواية "او يتعلق" بدل او يرتبط والبيت في معلقته في شرح العشر ۱۵۵ والقرطبي ۴: ۹۶ وشواهد الكشاف ۲۹۷ والمحكم واللسان (بعض) ومحالس نعلب ۵۰، ۳۶۸، والبحر ۲: ۴۶۸/ ۱۷: ۴۶۱ وذيل الجامع الكبير ۲۷ والزوزنى ۹ والشطر ايضاً فى الصاحبى ۲۵۱.

یا نفوس کو ان کی موت پالے۔
لیکن یہ ابو عبیدہ کی کوتاہ بینی ہے ❶ کیونکہ مسائل شریعت کی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا بیان کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے ایسی چیز کا بیان کرنا صاحب شریعت کے لیے جائز نہیں ہوتا۔ جیسے قیامت یا موت کا وقت کہ اس کے بتا دینے میں مفسدہ لازم آتا ہے۔

پھر جس شعر سے استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے ❷ یعنی مگر یہ کہ مجھے موت پالے۔ لیکن شاعر نے تصریح کی بجائے تعریض سے کام لیا ہے، کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ موت سے دور بھاگتا ہے۔ ظلیل نے کہا ہے کہ رَأَيْتُ غُرَبَانَا تَبْتَعُضُ الْبَعُوضُ: یعنی یہ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑ رہے ہیں اَلْبَعُوضُ: (مچھر) یہ بھی لفظ بعض سے بنا ہے۔ مچھر چونکہ دوسرے حیوانات کی بہ نسبت صغیر الحکم ہوتا ہے اس لیے اسے بَعُوضٌ کہا جاتا ہے۔

ب ع ل

اَلْبَعْلُ: کے معنی شوہر کے ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا﴾ (۷۲:۱۱) اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں۔

اس کی جمع بَعُولَةٌ آتی ہے، جیسے فَحْلٌ وَفَحُولَةٌ فرمایا: ﴿وَيَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾ (۲۲۸:۲) اور ان کے خاوند..... ان کو زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور اس تصور کے پیش نظر کہ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ اسے عورت کا منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (۳۳:۳) میں مذکور ہے بنا بریں ہر وہ چیز جو دوسری اشیاء پر فوقیت رکھتی

(۲) اور بعض چیزیں محض عقلی ہوتی ہیں جن کا ادراک نبی کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت جو کہ آسمان و زمین کی خلق میں پائی جاتی ہے تو ایسی چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر فرض نہیں ہوتا، اسی لیے قرآن پاک نے ان چیزوں کی معرفت عقول کے

پیرد کی ہے، جیسا کہ آیت: ﴿قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۰:۱۰) (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ اور آیت: ﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا﴾ (۸:۳۰) کیا انھوں نے غور نہیں کیا۔

(۳) بعض چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر واجب ہوتا ہے۔

(۴) بعض احکام فرعی ہوتے ہیں جو اصول شریعت سے مستبط ہو سکتے ہیں، جس کا بیان کرنا نبی پر واجب نہیں تو صاحب شریعت کو اختیار ہے کہ حسب موقع اسے بیان فرمادے یا سکوت اختیار کرے زیر بحث آیت میں اگر

❶ ورد علیہ ایضاً الطبری (۵۰/۲۵) والسر دو النحاس فی معانیہ (۴۲) وابن سیدہ فی المحکم (بعض) والطبری اکثر ما یرد علی ابی عبیدہ تفسیرہ ولنا مقالة (ابو عبیدہ والطبری فی تفسیر الغریب) (الامام البخاری) وقد اشبعنا الکلام فی الرد علی من یلزم البخاری انه قلدا عبیدہ فی تفسیر الغریب .

❷ راجع المبرد والقرطبی ۹۶:۴ شایع اباعبیدہ وجوزان یکون بعض بمعنی کل .

اِسْتَبْعَلَ النَّحْلُ: کھجور کا تاور ہو جانا۔
اور بَعْلُ کھجور سے ایک جگہ پر قیام اور ثبات کے معنی کا
تصور کر کے ہر اس آدمی کو جو اپنے معاملہ میں حیرت کی بنا
پر ایک جگہ پر کھڑا رہے اس کے متعلق بَعْلُ فُلَانٌ
بِأَمْرِهِ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے معاملہ میں حیران ہے،
جیسا کہ اس شخص کے متعلق جو اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہے۔
مَا هُوَ إِلَّا شَجَرٌ كَمَا مَحَاوَرَهُ اسْتِعْمَالَ هُوَ تَاوَرَهُ۔

ب غ ت

الْبَغْتُ: (ف) کے معنی کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ
سے ظاہر ہو جانا کے ہیں، جہاں سے اس کے ظہور کا گمان
تک بھی نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً﴾ (۷: ۱۸۷) اور ناگہاں تم پر
آجائے گی۔ ﴿أَوْ تَأْتِيهِمُ السَّاعَةُ﴾ (۱۲: ۱۰۷)
یا ان پر ناگہاں قیامت آجائے۔
بَغْتٌ كَذَا فَهُوَ بَاغِتٌ۔ کسی چیز کا ناگہاں آ پہنچنا،
شاعر نے کہا ہے ۵

(۶۰) إِذَا بَغَّتْ أَشْيَاءٌ قَدْ كَانَ مِثْلَهَا

قَدِيمًا فَلَا تَعْتَدَهَا بَغْتَاتٍ

ب غ ض

الْبَغْضُ: کے معنی کسی کمروہ چیز سے دل کا تنفر اور

ہو، اسے بَعْلٌ کہنے لگے ہیں چنانچہ اہل عرب اپنے بت کو
جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے
تھے، بَعْلٌ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے بلند اور برتر
سمجھتے تھے، جیسے فرمایا: ﴿أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ
أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ﴾ (۱۲۵: ۳۷) کیا تم بعل کو پکارتے
اور (پوجتے) ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے کو چھوڑ
دیتے ہو۔ محاورہ ہے: آتَانَا بَعْلٌ هَذِهِ الدَّابَّةُ اس دابہ کا
مالک ہمارے پاس آیا۔

الْبَعْلُ: (ایضاً) (۱) بلند زمین (۲) فحل نحل یعنی
شہد کی مکھیوں کا سردار ۶ (۳) ہر وہ بڑا درخت جو اپنی
جڑوں کے ذریعہ از خود زمین سے پانی جذب کر لیتا ہو اور
اسے آبیاری کی ضرورت نہ ہو۔ حدیث پاک میں ہے ۵
فِيَمَا سَقَى بَعْلًا الْعُشْرُ یعنی بَعْلٌ میں عشر (۱۱۰)
ہے اور جب عالی کی اپنی مستولی علیہ ماتحت پر گرفت بھاری
اور گراں ہو تو کہا جاتا ہے۔ أَصْبَحَ فُلَانٌ بَعْلًا عَلِيًّا
أَهْلِيهِ یعنی فلاں اپنے علوی کو وجہ اپنے اہل پر ٹھیل ہے۔ ۵
اور لفظ الْبَعْلُ سے مَبَاعَلَةٌ وَيِعَالٌ (مصدر مفاعله) بنایا
گیا ہے جس کے معنی (کنایہ) مجامعت کے ہوتے ہیں ۵
محاورہ ہے: بَعْلُ الرَّجُلِ (ن) بَعُولَةٌ وَاسْتَبْعَلَ
فَهُوَ بَعْلٌ وَمُسْتَبْعِلٌ: شوہر ہونا۔

۱ وفی اللسان فحل النحل وکذا فی اضداد ابی الطیب ۶۸-۷۳.

۲ نصب بَعْلًا عَلِيًّا الْحَالِ كَذَا فِي الْفَائِقِ ۱: ۵۵. وَ الْحَدِيثُ رَوَاهُ ابْنُ جَرِيرٍ عَنِ مَعَاذٍ وَ لَفْظُهُ: أَوْ سَقَى بَعْلًا الْعُشْرُ (کنز العمال :
۲۳۶۸/۶) وَ فِي رَوَايَةِ النَّسَائِيِّ وَ ابِي دَاوُدَ وَ ابْنِ مَاجَةَ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَوْ كَانَ بَعْلًا الْعُشْرُ وَ فِي بَعْضِ الرِّوَايَاتِ عَشْرًا بِدَلِّ بَعْلًا رَاجِعٌ
غَرِيبٌ ابْنُ عَبِيدٍ ۱: ۶۶.

۳ كَذَا فِي الْفَائِقِ ۱: ۵۵.

۴ وَمِنْهُ الْحَدِيثُ أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَيَّامُ أَكْلِ وَ شَرَبِ وَ بَعَالٍ أَيُّ مَلَاعِبَةِ الرَّجُلِ أَهْلَهُ سَبَاتِي تَخْرِيجُهُ (عُودٌ).

۵ قَالَهُ ابْنُ رُومِيٍّ يَحِثُّ عَلَى تَصَوُّرِ الْمَصَابِتِ وَ الْإِسْتِعْدَادِ لَهَا وَ الْبَيْتُ فِي مَحَاضِرَاتِ الْمَوْلَفِ فِي خَمْسَةِ آيَاتٍ وَ قَبْلَهُ وَ لَا عَوْفُصْتِ
فِي الْبَلُوئِ وَ قَدْ رَأَتْ عِظَاتٍ مِنَ الْآيَامِ بَعْدَ عِظَاتِ رَاجِعِ دِيْوَانِي ابْنِ رُومِيٍّ وَ فِي الْمَطْبُوعِ (فِي جَمِيعِ الطَّبَعَاتِ) بَعَثَ بِالْعَيْنِ الْمَهْمَلَةَ
وَ النَّاءِ الْمَثَلَةَ مَصْحُفًا.

تَبَعَّلَ الْبَعِيرُ: اونٹ کا فخر کی طرح تیز چلنا۔
کبھی فخر کی شرارت اور خباثت کے پیش نظر کینے شخص کو بھی
بَعْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

ب غ ی

الْبَغْيُ: کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی
کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کر سکے
یا نہ۔ اور بَغْيٌ کا استعمال کیت اور کیفیت یعنی قدر و وصف
دونوں کے متعلق ہوتا ہے، کہا جاتا ہے۔
بَغَيْتُ الشَّيْءِ وَابْتِغَيْتُهُ کسی چیز کے حاصل کرنے
میں جائز حد سے تجاوز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَقَدْ
اِبْتِغَوْا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۳۸:۹) یہ پہلے ہی طالب
فساد رہے ہیں۔
﴿يَبْتَغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ﴾ (۳۷:۹) تم میں فساد ڈلوانے کی
غرض سے۔

بَغْيٌ: دو قسم پر ہے۔ محمود یعنی حد عدل و انصاف سے تجاوز
کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے
تطوع بجالانا۔

۲۔ مذموم۔ یعنی حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں
واقع ہونا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿ (۳۸)
الْحَقُّ بَيْنٌ وَالْبَاطِلُ بَيْنٌ وَبَيْنَ ذَلِكَ أُمُورٌ
مُشْتَبِهَاتٌ وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمَى أَوْ شَكَ أَنْ

بیزار ہونا کے ہیں۔ یہ حُب کی ضد ہے۔ جس کے معنی کسی
پسندیدہ چیز کی طرف دل کا متجذب ہونا کے ہیں، کہا جاتا
ہے۔ بَغِضَ (س) الشَّيْءِ بَغْضًا وَبَغْضَتُهُ (ن)
بَغْضَاءً قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ (۶۳:۵)
اور ہم نے ان کے باہم عداوت اور بغض قیامت تک کے
لیے ڈال دیا ہے۔

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ
وَالْبَغْضَاءَ﴾ (۹۱:۵) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب
اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش
ڈلوادے۔ اور حدیث پاک میں ہے ﴿ (۳۷) إِنَّ اللَّهَ
يَبْغِضُ الْفَاحِشَ وَالْمُتَفَحِّشَ.﴾ بیشک اللہ تعالیٰ
بدکلام گالی دینے والے سے نفرت کرتا ہے۔ یہاں بغض کا
لفظ بول کر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ باری تعالیٰ اس سے اپنا
فیضان اور توفیق احسان روک لیتا ہے۔ ﴿

ب غ ل

الْبَغْلُ: (خچر) وہ جانور جو گدھے اور گھوڑی کے
باہم ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ (والجمع بغالة) قرآن
پاک میں ہے:
﴿وَالْحَيْلِ وَالْبِغَالِ وَالْحَمِيرِ﴾ (۸:۱۶) اور اسی
نے گھوڑے اور خچر اور گدھے۔

- ① الحدیث فی (حم الساعة) بدون الواو فی روایة لایحب (حل عن جابر و(عن عائشة) وفی (مسلم عن عائشة) لایحب الفحش والتفحش وفی (حم عن الساعة ایضاً) کل فاحش متفحش (ای بدون السلام والواو والاحادیث فی ذم الفحش کثیرة راجع الکنز للمتی (۳: ۳۳۹-۳۴۰).
- ② سقط لفظ المنع من المطبوع.
- ③ والمعروف فی الروایة الحلال بین والحرام بین راجع (ق ۴، طس - عن عمر - ق ۵ ک عن سلمان) الفتح الکبیر (۲: ۸۲-۸۳).

جگہ معنی مذموم کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا:

﴿يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۲۳:۱۰) تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

﴿إِنَّمَا بَغْيَكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ﴾ (۲۳:۱۰) تمہاری شرارت کا وبال تمہاری ہی جانوں پر ہوگا۔

﴿ثُمَّ بَغَىٰ عَلَيْهِ لِيَنْصُرَنَّهُ اللَّهُ﴾ (۶۰:۲۲) پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو خدا اس کی مدد کرے گا۔

﴿إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مَوْسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ﴾ (۷۶:۲۸) قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا۔

﴿فَإِن بَغَتْ إِحْدَهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الْأُتَىٰ تَبْغِي﴾ (۹:۳۹) اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔

اور آیت کریمہ: ﴿غَيْرِ بَاغٍ وَلَا عَادٍ﴾ (۱۷۳:۲) (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا ہی لے جتنی اسے ضرورت ہے اور حد متعین سے آگے نہ بڑھے۔

امام حسنؑ نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ نہ تو محض لذت کے لیے کھائے اور نہ ہی سدرشق (یعنی ضرورت سے) تجاوز کرے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے ۵ کہ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ کے

يَبْغَعَفِيهِ . حق بھی واضح ہے اور باطل بھی واضح ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں اور جو جانور چراگاہ کے ارد گرد کھائے گا، کچھ بعید نہیں کہ چراگاہ میں چرنے لگے اور چونکہ نبی محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی، اس لیے آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۴۲:۴۲) الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ میں عقوبت کوشی بغیر الحق کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اَبَغَيْتَكَ کسی شے کی طلب میں مدد کرنا۔ بَغَى الْجُرْحُ زخم کا بہت زیادہ بگڑ جانا۔ بَغَتْ الْمَرْءَةُ: عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور زنا کو بَغَى اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی حدود و محبت سے تجاوز کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَكْفُرْهُوَ أَفْتِيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَا نَحْصِنَا﴾ (۳۳:۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو..... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ بَغَتْ السَّمَاءُ: بادل کا ضرورت سے زیادہ برسنا اور بَغَى کے معنی تکبر کرنا بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور یہ ہر امر کے متعلق استعمال ہوتا ہے (گولفت میں بَغَى کا لفظ محمود اور مذموم دونوں قسم کے تجاوز پر بولا جاتا ہے مگر قرآن پاک میں اکثر

① راجع بقول الحسن (الطبری ۲: ۸۳) والحسن بن يسار البصرى ابو سعيد التابعى احد العلماء الفقهاء فى البصرة وعلیه كتاب لاحسان عباس (الحسن البصرى) و لقاءه لعلی ولباسه الخرقه غير محقق انكره الشاه ولى الله والامير القنوجى واثبتہ صاحب "فخر الحسن" وفى الجملة ان لباس الخرقه بدعة حقيقته فى حواشى مآثر الكرام (فارسی، بلجرامی) فراجعه (راجع التراجم الحسن تهذيب وميزان الاعتدال ۶: ۲۵۴ وامالى المرتضى ۱: ۱۰۶).

② وقول مجاهد هذا ذكر الشوكاني فى الفتح ۱: ۱۷۰ وفى اكل المصطر الميته ومال الغير اختلاف بين الفقهاء ولم ينصب من انكر اكل مال الغير طلقاً راجع القرطبي وايضا ابن كثير وامام جاهد فهو ابن جبرالمكي (۲۱-۱۰۴) تلميذ ابن عباس فى التفسير قال الذهبى شيخ القراء والمفسرين وهو وان من التفات لكن لا يعتمد على تفسيره لانه ينقل عن اهل الكتاب وراجع طبقات الفقهاء ۵ والارشاد ۶: ۲۴۲ وميزان الاعتدال ۹/۳ والمجمع بين رجال الصحيحين ۱۰ راجع الاعلام.

﴿ وَهَبْ لِي مَلَكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي ﴾
 (۳۵:۳۸) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کر میرے بعد
 کسی کو شایان نہ ہو۔ (دوسرے معنی پر محمول ہے۔ یعنی
 میرے بعد وہ سلطنت کسی کو میسر نہ ہو)

ب ق ر

الْبَقْرُ: (اسم جنس) کے معنی (تیل یا) گائے کے
 ہیں اس کا واحد بَقْرَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ إِنَّ الْبَقَرَ
 تَشَابَهَ عَلَيْنَا ﴾ (۷۰:۲) کیونکہ بہت سے تیل ہمیں
 ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ ﴿ بَقْرَةٌ لَا
 فَارِضٌ وَلَا بَكْرٌ ﴾ (۶۸:۲) کہ وہ تیل نہ تو بوڑھا ہو
 اور نہ بچھڑا۔ ﴿ بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا ﴾ (۶۹:۲)
 کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہے۔

بَقْرَةٌ کی جمع بَاقِرٌ وَبَقِيرٌ (بروزن حکیم) آتی ہے
 جیسے حَامِلٌ وَحَمِيلٌ اور بعض کے نزدیک اس کی جمع
 بَيْقُورٌ بھی آتی ہے اور تیل کو ثَوْرٌ کہا جاتا ہے، جیسے:
 نَاقَةٌ وَجَمَلٌ وَرَجُلٌ وَامْرَأَةٌ اور تیل چونکہ بھتی باڑی
 کے کام آتا ہے اس لیے زمین کو پھاڑنے اور جوتنے کے
 لیے بَقَرَ الْأَرْضَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لیے ہر
 وسیع شکاف کے متعلق یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے، چنانچہ
 محاورہ ہے۔ بَقَرْتُ بَطْنَهُ میں نے اس کا پیٹ چاک
 کر دیا۔ محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باقر کا لقب دیا گیا
 ہے ❶ کیونکہ ان کو دقاق و رموز علیہ کے متعلق گہری
 تحقیق حاصل تھی۔ بَيْقُرَ الرَّجُلِ فِي الْمَالِ وَفِي

یہ معنی ہیں بشرطیکہ وہ نہ تو امام وقت سے باغی ہو اور نہ ہی
 معصیت کا ارتکاب کر کے راہ حق سے تجاوز کرنے والا ہو۔
 الْإِبْتِغَاءُ: یہ خاص کر کوشش کے ساتھ کسی چیز کو طلب
 کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ
 کوشش بھی محمود ہوگی (ورنہ مذموم) چنانچہ فرمایا:

﴿ اِبْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ ﴾ (۲۸:۱۷) اپنے
 پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں۔

﴿ إِلَّا اِبْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ﴾ (۲۰:۹۳) بلکہ
 اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے دیتا
 ہے۔ اور یَنْبَغِي (انفعال) یعنی کا مطاوع آتا ہے اور
 يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ كَذَا کا محاورہ دو طرح استعمال ہوتا
 ہے۔ (۱) اس شے کے متعلق جو کسی فعل کے لیے مخر ہو
 جیسے النَّارُ يَنْبَغِي أَنْ تُحْرِقَ الثُّوبَ یعنی کپڑے کو جلا
 ڈالنا آگ کا خاصہ ہے۔ (۲) یہ کہ وہ اس کا اہل ہے یعنی
 اس کے لیے ایسا کرنا مناسب اور زیبا ہے، جیسے: فُلَانٌ
 يَنْبَغِي أَنْ يُعْطِيَ لِكْرَمِهِ کہ فلاں کے لیے اپنے کرم
 کی وجہ سے بخشش کرنا زیبا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ وَمَا
 عَلَّمْنَاهُ الشُّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ﴾ (۶۹:۳۶) اور ہم
 نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کو
 شایاں ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے، یعنی نہ تو آنحضرت ﷺ فطرتاً شاعر
 ہیں۔ اور نہ ہی سہولت کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں اور یہ معلوم
 ہے کہ آپ کی زبان پر شعر جاری نہ ہوتا تھا۔ اور آیت کریمہ:

❶ محمد بن علی زین العابدین الحسین ابو جعفر الباقر (۵۷ھ ۱۴۴ھ) خامس الأئمۃ الاثنی عشر عند الامامیۃ ولہ فی العلم وتفسیر القرآن آراء راجع کتباب اخبار ابی جعفر الباقر للجلودی (۲۳۰ھ) وتذکرۃ الحفاظ ۱: ۱۱۷ والذریعۃ ۱: ۳۱۵ ونزهۃ المجلس ۲: ۲۳ ومنہاج السنۃ ۲: ۱۱۴ و۱۲۳ والیعقوبی ۳: ۶۰.

ہے اور تشبیہ کے طور پر بَقْلٌ وَجْهَ الصَّبِيِّ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت ۵ کے نزدیک بَقْلٌ نَابُ البَحْرِ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کیلے نکل آئے أَبْقَلَ الْمَكَانُ فَهُوَ مُبْقَلٌ: جگہ کا سبز ہونا۔ بَقَلْتُ البَقْلُ: میں نے سبزی کاٹی اَلْمَبْقَلَةُ: (ظرف) سبزیوں کی جگہ۔

باقی

اَلْبَقَاءُ: کے معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں یہ فناء کی ضد ہے۔ یہ باب بَقِيَ (س) يَبْقَى بَقَاءً ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا باب بَقِيَ (ض) بَقِيًّا بھی آتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں ہے ۵ (۳۹) بَقِينَا رَسُولَ اللَّهِ یعنی ہم آنحضرت ﷺ کے منتظر رہے اور کافی عرصہ تک آپ کی نگہبانی میں بیٹھے رہے۔ اَلْبَاقِي: (صفت) دو قسم پر ہے ایک الباقِي بِسْتَفْسِيهِ جو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہے اور اس پر کبھی فنا طاری نہ ہو اس معنی میں یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ دوم: الباقِي بغيره اس میں سب ماسوی اللہ داخل ہیں کہ ان پر فناء اور تغیر کا طاری ہونا صحیح ہے۔ الباقِي بِاللَّهِ بھی دو

غیرہ کسی کا بہت زیادہ مال دار ہونا۔ يَبْقَرُ فِي سَفَرِهِ ملک در ملک پھرنا۔ شاعر نے کہا ہے ۵ (طویل) (۶۱) الاهل اتاهوا والحوادث جُمَّةً بان امرئ القيس يهلك بيقرا کیا اسے یہ خبر ملی ہے کہ زمانہ کی بوقلمونیوں کی وجہ سے امرئ القيس بن تملك در بدر دکھے کھارہا ہے۔ بَقَرَ الصَّبِيَانُ بچوں کا بَقِيْرِي کھیل کھیلنا یہ بچوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس میں ریت کا ڈھیر لگا کر اس کے آس پاس گڑھے کھود دیتے ہیں (فارسی میں اسے کوہاموئی کہا جاتا ہے)

اَلْبَيْقَرَانُ: ایک قسم کے گھاس کا نام ہے کیونکہ وہ جب اگتا ہے تو زمین میں شگاف ڈال دیتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی جاتی ہیں۔

باقل

قرآن پاک میں ہے:

﴿ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَاثِهَا ﴾ (۶۱:۴) کہ ترکاری اور کڑی بَقْلُ: ان سبزیوں کو کہتے ہیں، جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔ اس سے فعل مشتق کر کے بَقَلَ بمعنی نَبَت استعمال ہوتا

① قاله امرء القيس راجع الطبری ۷: ۱۳۹ ومعاني القرآن للفراء والستة ۱۳۰ ودبوانة ۴۶ (ضعة سندویي والسمط ۴۰ والانتصاب ۴۷۷ وتهذيب الالفاظ ۴۸۷ والبحر ۳: ۳۵۷ والبلدان (اسم وبيقر) وشرح السبع لابن الانباري ۴۵۹ واللسان (بيقر) والاغانى ۸: ۶۱ والمعاني ۸۷۵ وفي بعض الرويات بن تملك بدل يهلك وهي بنت عمر بن زبيد امرئ القيس.

② هو ابو يوسف يعقوب بن اسحاق بن السكيت تأدب على السكيتي والفراء واخذ عن الاصمعي واني عينة البصري واشتهر بمصنفاته وكان مؤدبا لابن المعتز توفي في رجب ۴۳-۲۴۴ هـ صنف كتاب اصلاح المنطق والالفاظ وكتاب المقصود والممدود والقلب والابدال والاضداد وقد اشترت راجع لتراجمه معجم الادباء ۲/ ۵۲ والبعية ۴۱۸-۴۱۹ شذرات ۲/ ۱۰۶ وابن خلكان ۷۹۸ والارشاد ۷/ ۳۰۲ واليعقبي ۲/ ۴۷-۱۴۹.

③ وتسامه: ذات ليلقى صلاة العشاء والحديث في الكشف ۲: ۳۷ والفاائق (۱: ۵۷) وابي داؤد بين حديث معاذ بن جبل (تخريج الكشف ۸۸ رقم ۱۹۹).

﴿بَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۸۶:۱۱) میں بَقِيَّةُ اللَّهِ کے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ ۱ اور آیت کریمہ:

﴿فَهَلْ تَرَى لَهُم مِّنْ بَاقِيَةٍ﴾ (۸:۶۹) بھلا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے۔ میں بَاقِيَةٍ کا موصوف جَمَاعَةٌ يَفْعَلُةٌ محذوف ہے یعنی باقی رہنے والی جماعت یا ان کا کوئی فعل جو باقی رہا ہو۔ اور بعض کے نزدیک بَاقِيَةٍ بمعنی بَقِيَّةٌ ہے، ان کا قول ہے کہ بعض مصادر فاعل کے وزن پر آتے ہیں اور بعض مفعول کے وزن پر لیکن پہلا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ۲

ب ک ک

بَكَّةٌ: مجاہد سے منقول ہے کہ یہ اصل میں مَكَّةٌ ہے اور اس میں باء ميم سے مبدل ہے، جیسا کہ: سَبَدَ رَأْسَهُ وَسَمَدَهُ وَضَرَبَ لَازِبٌ. وَلَا زِمٌ فِيهِ. قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةٍ مُّبَارَكًا﴾ (۹۶:۳) پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت۔

بعض کا قول ہے کہ مکہ سے اندرون مکتہ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔ اور بعض نے بیت اللہ کے اسماء سے شمار کیا ہے اور بعض نے مطاف (طواف گاہ) سے تفسیر کی ہے۔ اور یا تو تَبَاكٌ سے ماخوذ ہے، جس

قسم پر ہے۔ ایک وہ جو بَدَا تَهُ جب تک اللہ کی مشیت ہو، باقی رہے جیسے اجرام سماویہ۔ دوم: وہ جس کے افراد و اجزاء تو تغیر پذیر ہوں مگر اس کی نوع یا جنس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو۔ جیسے انسان و حیوان۔ اسی طرح آخرت میں بھی بعض اشیاء بِشَخْصِهِ باقی رہیں گی۔ جیسے اہل جنت کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہیں گے۔ جیسے فرمایا:

﴿خَالِدِينَ﴾ (۱۳۱:۴) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور بعض چیزیں صرف جنس و نوع کے اعتبار سے باقی رہیں گی۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔ ۱

(۴۰) ان اثمار اهل الجنة يقطفها اهلها وياكلونها ثم تخلف مكانها مثلها. کہ ثمار جنت کو اہل جنت چن کر کھاتے رہیں گے اور ان کی جگہ نئے پھل پیدا ہوتے رہیں گے، چونکہ آخرت کی تمام اشیاء دائمی ہیں اس لیے فرمایا: ﴿وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى﴾ (۶۰:۲۸) اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اور آیت کریمہ:
﴿وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ﴾ (۳۶:۱۸) میں وہ تمام اذکار و اعمال صالحہ داخل ہیں جن کا ثواب انسان کے لیے باقی رہے گا۔ بعض نے ان سے پانچ نمازیں مراد لی ہیں۔ اور بعض نے اس سے سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ یعنی تسبیح و تحمید مراد لی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان میں ہر وہ عبادت داخل ہے جس سے رضائے الہی مقصود ہو یہی معنی آیت کریمہ:

۱ فی الطبرانی والیزار بمعناه عن ثوبان راجع مجمع الزوائد: ۱۰/۴۱۴.

۲ راجع لاقوالہم ابن کثیر ۳: ۸۰ و اختار العموم ابن جریر الطبری و ایضاً الکشاف ۲: ۲۷۵ و اختلف ایضاً فی الآیة (۲: ۲۴۸) راجع البغوی ۱: ۲۱۶ و فی الآیة اولونبقیة (۱۱: ۱۱۶) المراد بها اهل الفضل (بیضاوی ۳۳۸۱).

۳ اولہ ابو عبیدة بالمصدر فرد علیہ المؤلف و اکثر ما یرد علیہ.

کے معنی ازدھام کے ہیں اور وہاں چونکہ طواف کے لیے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لیے اس کو بکہ کہا گیا ہے۔^۱ بعض کہتے ہیں کہ بَكَّةَ بَكُّ (ن) سے مشتق ہے، جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پھاڑ ڈالنے کے ہیں چونکہ سنت الہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد و ظلم پھیلاتا چاہتا ہے۔ اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے، اس لیے اسے اس نام سے پکارا گیا ہے۔

ب ک ر

اس باب میں اصل کلمہ بَكْرَةٌ ہے، جس کے معنی دن کے ابتدائی حصہ کے ہیں، پھر اس سے صیغہ فعل مشتق کر کے کہا جاتا ہے۔ بَكَرَ (ن) فُلَانٌ بَكُورًا کسی کام کو صبح سویرے نکلتا۔ اَلْبَكُورُ (صیغہ مبالغہ) بہت سویرے جانے والا۔

بَكَرَ فِي حَاجَةٍ وَابْتَكَّرَ وَبَاكَرَ مُبَاكَرَةً. صبح سویرے کسی کام کے لیے جانا اور بَكْرَةٌ (دن کا پہلا حصہ) چونکہ دن کے باقی حصہ پر متقدم ہوتا ہے، اس لیے اس سے شنبی کے معنی لے کر ہر اس شخص کے متعلق بَكَرَ (س) فعل استعمال ہوتا ہے، جو کسی معاملہ میں جلد بازی

۱ لان الباء والميم من حرزوف الابدال راجع ابدال والى الطيب. قارن محاز القرآن لابی عبیدة (۱: ۷۹۷) وغریب القرآن للسخستانی ۳۵ واللسان (بکر) وثلاثون الاربعة والاشتقاق فی الفتح للشوکانی (۱: ۳۶۲).

۲ البيت لضمرة بس ضمرة النهشلی انشده ابو زيد التوزی وابو حاتم فی ان البسل من الاضداد والبيت فی النوادر لابی زيد والسمط ۹۲۲ والامالی ۲: ۲۷۹) والذرة مع شرح الخفاجی ۱۹۳ والاقتضاب ۴۲۸ وفيه ان لفظه بکر قد بانی مثلاً للتعجيل كما فی هذا البيت وفي رواية الكامل ۸۴۲ هبت بدل بکرت والبيت فی الفاظ ۷۹۱ والاضداد لابی حاتم رقم ۱۴۳ ص ۱۰۳ ولباب الآداب وطبقات السیرانی ۵۷ والوحشیات رقم ۲۴ فی خمسة آيات والبيت ارلها والمجالس ۴۶۸ وابدال ابی الطیب (۲: ۵۳۶) وفي روايته ام عمرو يدل بعدهم وبعده: أضرها وبنی عمرو ساغب فكفكف من ابته علی وعاب راجع اضداد للحستانی وابن الانباری ۶۲ واضداد ابی الطیب ۳۲ واعراب ثلاثين لابن خالويه واللسان (بسل) والظیری.

۳ ولله اشارة الى تفسير الآية ولهم رزقهم فيها بكرة وعشيا (۱۹-۱۱) وههنا سقط والله اعلم.

۴ قاله الرازي وبعده: أصبحت منى كذراع من عضد - والشطر فی اللسان (بکر) وفي الصحاح بغير عزو (بکر) والبحر دا: (۲۴۸) واضداد لابن الانباری ۲۳۴۶ واضداد ابی الطیب ۹۱ وامالی القالی (۱: ۲۴).

آنسو بہانے اور رونے کے ہیں اگر آواز غالب ہو تو اسے بُكَاءٌ (ممدود) کہا جاتا ہے جیسے رُعَاءٌ وَتُعَاعٌ اور اس نوع کے دیگر اوزاں جو صوت کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور اگر غم غالب ہو تو اسے بُكْيٌ (بالقصر) کہا جاتا ہے۔
الْبَاكِيُّ رونے والا۔ غم اور اندوہ سے آنسو بہانے والا اس کی جمع بَاكُونَ وَبُكْيٌ آتی ہے، قرآن میں ہے: ﴿خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا﴾ (۵۸:۱۹) تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔

اصل میں بُكْيٌ (بُكُوِيٌّ بروزن فُعُولٌ ہے، جیسے سَاجِدٌ وَسُجُودٌ وَرَاكِعٌ وَرُكُوعٌ وَقَاعِدٌ وَقُعُودٌ وَوَاوُكُوبَاءٌ سے تبدیل کر کے یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے، جیسے جَاثٌ وَجُثْيٌ وَعَاثٌ وَعَثِيٌّ نيز: بُكْيٌ کے اصل معنی تو غم کے ساتھ آنسو بہانا کے ہوتے ہیں، مگر کبھی صرف آنسو بہانے اور کبھی صرف غم کھانے کے لیے بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا﴾ (۸۲:۹) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا نہن لیں اور (آخرت میں)..... بہت سارونا ہوگا۔

میں مطلق خوشی اور غم کے معنی مراد ہیں اور حُكٌّ کے ساتھ قہقہہ اور بکاء کے ساتھ آنسو بہانا ضروری نہیں ہے۔ یہی معنی آیت کریمہ:

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ﴾ (۲۹:۲۳) پھر ان پر نہ تو آسمان اور زمین کورونا آیا۔

میں مراد ہیں ہاں جو لوگ آسمان اور زمین کے لیے زندگی اور علم ثابت کرتے ہیں وہ اسے حقیقی معنی پر حمل کرتے ہیں اور جو زندگی کے قائل نہیں ہیں وہ نسبت مجازی قرار دیتے

ابھی تک کوئی بچہ نہ دیا ہو۔ اور بُكْبُكٌ کے اعتبار سے دو شیزہ کو بھی بکْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اسے مجامعت کے لیے شیب پر ترجیح دی جاتی ہے۔ بکْرٌ کی جمع ابْكَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا﴾ (۵۶:۳۵، ۳۶) ہم نے ان (حوروں) کو پیدا کیا تو ان کو کنواریاں بنایا۔
الْبَكْرَةُ چھوٹی سی چرخی۔ کیونکہ وہ تیزی کے ساتھ گھومتی ہے۔

ب ک م

الْأَبْكَمُ، پیدائشی گونگا اور آخرس عام گونگے کو کہتے ہیں، لہذا الْبَكْمُ عام اور آخرس خاص ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمٌ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ﴾ (۶:۱۶) اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گونگا اور (دوسرے کی ملک) ہے (بے اختیار و ناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور أَبْكَمٌ کی جمع بَكْمٌ آتی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿صُمُّ بَكْمٌ﴾ (۱۸:۲) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اور جو شخص ضعف عقلی کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گونگے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بَكْمٌ عن الْكَلَامِ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

ب ک ی

بَكْيٌ، بَكْيٌ کا مصدر بُكْيٌ وَبُكْيَةٌ یعنی ممدود اور مقصور دونوں طرح آتا ہے اور اس کے معنی غم کے ساتھ

ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔

اور دوسری صورت میں ما قبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کے متعلق فرمایا:

﴿فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ
وَنَعَّمَهُ ۖ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ
فَقَدَّرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ
لَأَتُكْسِرُمُونَ الْيَتِيمَ ۝﴾ (۸۹: ۱۵، ۱۷) مگر انسان
(عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزما تا
ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا)
میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری
طرح) آزما تا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا
ہے کہ (ہائے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا نہیں
بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے۔

یعنی رزق کی فراخی یا تنگی، اکرام یا اہانت کی دلیل نہیں ہے
(بلکہ یہ پروردگار کی طرف سے آزمائش ہے) مگر لوگ اس
حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ یہ مال کو بیجا صرف کر رہے
ہیں اور اسی طرح آیت ﴿ص ۝ وَالْقُرْآنُ ذِي الذِّكْرِ
بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ ۝﴾ (۳۸: ۲۰)
قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے (کہ تم حق پر
ہو) مگر جو لوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔ میں
وَالْقُرْآنُ ذِي الذِّكْرِ کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن
تذکیر یعنی نصیحت حاصل کرنے کی کتاب ہے اور کفار کا اس
کی طرف متوجہ نہ ہونا اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کا اعراض

ہیں یعنی ان سے آسمان اور زمین کے باشندے مراد ہیں ۱

بَلْ (حرف)

بَلْ: حرف استدراک ہے اور تدارک کی دو صورتیں
ہیں۔ (۱) جبکہ بل کا مابعد اس کے ما قبل کی نفیض ہو تو اس
صورت میں کبھی تو اس کے مابعد حکم کی تصحیح سے ما قبل کی
تردید مقصود ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس ما قبل کی تصحیح
اور مابعد کے ابطال کی غرض سے بل کو لایا جاتا ہے۔
چنانچہ پہلی صورت کے متعلق فرمایا:

﴿وَإِذَا تَسَلَّىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ
كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝﴾
(۸۳: ۱۴) جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا
ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں دیکھو یہ جو (اعمال
بد) کر رہے ہیں ان کا ان کے دلوں پر رنگ بیٹھ گیا ہے۔
تو بَلْ کا معنی یہ ہیں کہ آیات الہی کو اساطیر کہنا صحیح نہیں
ہے بلکہ یہ ان کی جہالت ہے، پھر رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
کہہ کر ان کی جہالت پر تنبیہ کی ہے۔ اسی طرح حضرت
ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: ﴿قَالُوا ۗ أَنْتَ
فَعَلْتَ هَذَا بِالْهَيْتَانِيَا إِبْرَاهِيمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ
كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْتَلَوْهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْظِقُونَ ۝﴾
(۲۱: ۶۲) (جب ابراہیم علیہ السلام آئے تو) ان بت
پرستوں نے کہا کہ ابراہیم بھلا یہ کام ہمارے معبودوں کے
ساتھ تم نے کیا ہے؟ (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا (نہیں) بلکہ
یہ ان کے اس بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) اگر یہ بولتے

۱ قال الحسن ای اهل السماء والارض كما في قوله تعالى حتى تضع الحرب اوزارها (۴۷-۴۸) ويمكن ان يكون المراد المبالغة في وصف القوم بالصغر في القدر او كناية عن عدم عملهم الصالح في الارض يرفع الي السماء كما روى عن ابن عباس وقال السدي لما قتل الحسين بن علي بكت السماء عليه وبكاءها حمرة اطرافها لكن الرواية غير ثابت والله اعلم.

پریشان (باتیں ہیں جو) خواب (میں دیکھ لی) ہیں (نہیں)، بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنایا ہے (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے) جو اس شاعر (کا نتیجہ طبع) ہے۔

یہاں متنبہ کیا ہے کہ اذلا انھوں نے قرآن کو خیالات پریشان کہا پھر اس پر اضافہ کر کے اسے افتراء بتلانے لگے پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق (نعوذ باللہ) کذاب ہونے کا ادعاء کرنے لگے کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں شاعر فطرۃ کاذب کو کہا جاتا ہے اور آیت:

﴿لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكْفُونُ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ﴾ (۴۰، ۳۹: ۲۱)

اے کاش! کافراں وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں پر سے (دوزخ کی) آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا، بلکہ قیامت ان پر ناگہاں آواقع ہوگی اور ان کے ہوش کھو دے گی۔

بھی اس معنی پر محمول ہے کہ کاش وہ اس کے علاوہ دوسری بات کو جانتے ہوتے جو پہلی بات سے زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ قیامت ان پر ناگہاں آواقع ہوگی۔ قرآن پاک میں جتنی جگہ بھی بَلْ آیا ہے ان دونوں معنی میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے اگرچہ بعض مقامات ذرا وضاحت طلب ہیں ۱ اور ان کے پیچیدہ ہونے کی بنا پر بعض علما نے نعوذ باللہ غلطی سے کہہ دیا ہے کہ قرآن پاک میں بل صرف معنی

محض غرور اور مخالفت کی وجہ سے ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ۝ بَلْ عَجِبُوا﴾ (۲۱: ۵۰)

قرآن مجید کی قسم (کہ محمد ﷺ پیغمبر ہیں) لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے، یعنی ان کا قرآن پاک پر ایمان نہ لانا قرآن کے بزرگ ہونے کے منافی نہیں ہے بلکہ محض ان کی جہالت ہے۔ بَلْ عَجِبُوا کہہ کر ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کیونکہ کسی چیز پر اسی وقت تعجب ہوتا ہے جب اس کا سبب معلوم نہ ہو۔ نیز فرمایا:

﴿مَا عَرَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا ۝ بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالذِّبَانِ ۝﴾ (۹۰، ۸۲: ۸۶)

پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا۔ اور (تیری قامت کو) معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا جوڑ دیا۔ مگر بیہات تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو۔

یعنی رب کریم کے بارے میں کوئی چیز سوائے اس کے دھوکے میں ڈالنے والی نہیں ہے کہ وہ دین کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲) تذکر کی دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری کلام کے ذریعہ پہلی کلام کی وضاحت اور اس پر اضافہ مقصود ہوتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (۵: ۲۱) بلکہ (ظالم) کہنے لگے کہ (یہ قرآن)

۱ قال فی المغنی: بل حرف اضراب فان تلاها جملة كان معنى الاضراب اما الباطل ای الاول واما الانتقال من غرض الی آخر وہی فی ذالک کلمة حرف ابتداء لاعاطفة علی الصحیح وان تلاها مفرد فہی عاطفة ثم ان تقدمها امر او ايجاب فہی تجعل مقابلها کالمسکوت عنه واثبات الحکم لما بعدہا وان تقدمها نفی او نفی فہی لتقیر مقابلها علی حاله و جعل ضده لما بعدہ (راجع ۱۱۹: ۱-۱۲۰).

قمر سے ایک منزل کا نام ہے اور تشبیہ کے طور پر ابرو کے درمیان کی جگہ اور اونٹ کے سینہ کو بھی بَلْدَةٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شہر کی طرح محدود ہوتے ہیں اور بطور استعارہ انسان کے سینہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اثر یعنی نشان کے معنی کے اعتبار سے بجلدہ بَلْدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اس کی کھال پر نشان ہے اس کی جمع أَبْلَادٌ آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۵

(۶۳) وَفِي النُّحُورِ كُلُّوْمٌ ذَاتُ أَبْلَادٍ .

اور ان کے سینوں پر زخموں کے نشانات ہیں۔

أَبْلَدُ الرَّجُلِ: شہر میں چلا جانا جیسا کہ أَنْجَدَ وَأَنْجَدَهُمَ کے معنی نجد اور تہامہ میں چلے جانے کے ہیں۔ بَلْدُ الرَّجُلِ کے معنی شہر میں مقیم ہونے کے ہیں اور کسی مقام پر ہمیشہ رہنے والا اکثر اوقات دوسری جگہ میں جا کر متحیر ہو جاتا ہے اس لیے متحیر آدمی کے متعلق بَلْدٌ فَسَى أَمْرِهِ وَأَبْلَدٌ وَتَبَلَدٌ وغیرہا کے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۵

(۶۵) لَا بَدَّ لِلْمَحْزُونِ أَنْ يَتَبَلَدَا

کہ وہ اندوہ گین لازماً متحیر رہے گا۔

اجڈ لوگ عام طور پر بلید یعنی کند ذہن ہوتے ہیں اس لیے ہر جسم آدمی کو أَبْلَدٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتَهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبِثَ لَا يَخْرِجُ إِلَّا نَسْكَدًا﴾ (۵۸: ۷) (جو زمین

ثانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ۵

ب ل د

الْبَلْدُ: (شہر) وہ مقام جس کی حد بندی کی گئی ہو اور وہاں لوگ آباد ہوں۔ اس کی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے، اور آیت:

﴿لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ﴾ (۱: ۹۰) هَذَا الْبَلَدِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے، دوسری جگہ فرمایا: ﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا﴾ (۳۵: ۱۳) کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لیے) امن کی جگہ بنا دے۔ ﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ﴾ (۱۵: ۳۳) پاکیزہ شہر ہے۔

﴿فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا﴾ (۱۱: ۴۳) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کر دیا۔

﴿فَسَقْنَا إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ﴾ (۹: ۳۵) پھر ہم ان کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ (۲۶: ۲) پروردگار! اس جگہ کو امن کا شہر بنا۔

میں بھی مکہ مکرمہ مراد ہے لیکن ایک مقام پر اسے معرفہ اور دوسرے مقام پر نکرہ لانے میں جو لطافت اور نکتہ ملحوظ ہے، اسے ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے اور بَلْدٌ کے معنی بیابان اور قبرستان بھی آتے ہیں کیونکہ پہلا وحشی جانوروں دوسرا مردوں کا مسکن ہوتا ہے۔ الْبَلْدَةُ: منازل

۱ کما قال ابن مالك في شرح الكافية (راجع ابن هشام (۱: ۱۲۰)).

۲ قاله القشامی واوله: ليست تجرح فراراً ظهورهم والبيت في اللسان والتاج والصاح (بلد) وتهذيب الالفاظ ۱۰۸ والاصلاح ۴۱۰ وفي النسخ المطبوعة النجوم بدل النحور مصحف والتصويب من المراجع.

۳ وفي مصارع العشاق (۷۵-۷۶) مثله لحياة مع تغيير قالته حين مر يزيد بها ورأته متغيراً أو رواية البيت: الا لآلئمه اليوم ان يتبلدا. فقد منع المحزون ان يتجلدا. والبيت في اللسان (بلد) في اربعة منسوبة الى الاحوص.

کو نگل لینا کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:
﴿ يَا أَرْضُ اَبْلَعِي مَاءَكَ ﴾ (۴۳:۱۱) کہ اے زمین!
اپنا پانی نگل جا۔

اسی سے بَلُوعَةٌ ہے، جس کے معنی بدر اور گندی نالی یا
چوچہ کے ہیں۔ سَعْدٌ بَلَعٌ ایک ستارے کا نام بَلَعٌ
الشَّيْبُ فِي رَأْسِهِ سر میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔

ب ل غ

الْبَلُوعُ وَالْبَلَاغُ: (ن) کے معنی مقصد اور منتهی
کے آخری حد تک پہنچنے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ مقصد
کوئی مقام ہو یا زمانہ یا اندازہ کیے ہوئے امور میں سے
کوئی امر ہو، مگر کبھی محض قریب تک پہنچ جانے پر بھی بولا
جاتا ہے گوانتہا تک نہ بھی پہنچا ہو۔ چنانچہ انتہا تک پہنچنے
کے معنی میں فرمایا: ﴿ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ اَشُدَّهُ وَبَلَغَ
اَرْبَعِينَ سَنَةً ﴾ (۱۵:۴۶) یہاں تک کہ جب خوب
جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔

﴿ قَبْلَغْنِ اَجْلَهُنَّ فَلَا تَعْضَلُوهُنَّ ﴾ (۲۳۲:۲)
اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو ان کو..... مت روکو۔
﴿ وَمَا هُمْ بِبَالِغِيهِ ﴾ (۵۶:۴۰) اور وہ اس کو پہنچنے
والے نہیں۔

﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ ﴾ (۱۰۲:۳۷) جب وہ ان
کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

﴿ لَعَلِّي اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴾ (۳۶:۴۰) تاکہ میں
(اس پر چڑھ کر) رستوں پر پہنچ جاؤں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ اَمْ لَكُمْ اِيْمَانٌ عَلَيْنَا بِالْعَةِ ﴾ (۳۹:۶۸) یا تم
نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو چلی جائیں گی۔ یہاں

پاکیزہ ہے) اس میں سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفس
بی) نکلتا ہے اور جو خراب ہے۔ اس میں سے جو کچھ نکلتا
ہے ناقص ہوتا ہے) میں بلد کے طیب اور خبیث ہونے
سے کنایۃً نفوس کا طیب اور خبیث ہونا مراد ہے۔

ب ل س

الْاِبْتِلَاسُ: (افعال) کے معنی سخت ناامیدی کے
باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ اَبْلَسَ وہ مایوس ہونے کی
وجہ سے مغموم ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے
ابلیس مشتق ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَيَوْمَ نَقُومُ
السَّاعَةَ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ﴾ (۱۲:۳۰) اور جس دن
قیامت برپا ہوگی، گنہگار مایوس و مغموم ہو جائیں گے۔
﴿ اَخَذْنَا هُمْ بِغَتَّةٍ فَاِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ﴾ (۴۳:۶)
تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر
رہ گئے۔

﴿ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُنزَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ
لَمُبْلِسِيْنَ ﴾ (۴۹:۳۰) اور بیشتر تو وہ مینہ کے اترنے
سے پہلے ناامید ہو رہے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا
ہے اور اسے کچھ سوجھا نہیں دیتا اس لیے اَبْلَسَ فُلَانٌ
کے معنی خاموش اور دلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

بَلَسَتْ السَّنَاقَةُ فَهِيَ مِبْلَاسٌ آواز نہ کرنا قہ از
غایت خواہش کش اور بِلَاسٌ بمعنی ٹاٹ فارسی (پلاس)
سے معرب ہے۔

ب ل ع

بَلَعْتُ (ف) الشَّيْءَ وَابْتَلَعْتُهُ کے معنی کسی چیز

بَالِغَةً سے انتہائی مودت میں مراد ہیں۔

آیت کریمہ:

﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ﴾ (۲:۶۵)

پھر جب وہ اپنی میعاد (یعنی انقضائے عدت) کو پہنچ

جائیں تو، یا تو ان کو (زوجیت میں) رہنے دو۔ میں بلوغ

اجل سے عدت طلاق کا ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا مراد

ہے۔ کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو خاوند کے لیے

مراجعت اور روکنا جائز ہی نہیں ہے۔ بَلَّغْتُهُ الْخَبَرَ

وَأَبْلَغْتُهُ کے ایک ہی معنی ہیں مگر بَلَّغْتُ (تفعل) زیادہ

استعمال ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿أَبْلَغْتُكُمْ رَسُولَاتِ

رَبِّي﴾ (۶۲:۷) تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا

ہوں۔

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾

(۶۷:۵) اے پیغمبر! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر

نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ

إِلَيْكُمْ﴾ (۵۷:۱۱) اگر تم روگردانی کرو گے تو جو پیغام

میرے ہاتھ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمہیں

پہنچا دیا ہے۔

اور قرآن پاک میں ایک مقام پر:

﴿بَلَّغْنِي الْكَبِيرَ وَأَمْرًا تَنِي عَاقِرٌ﴾ (۳۰:۳) کہ

میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

آیا ہے یعنی بلوغ کی نسبت کِبَر کی طرف کی گئی ہے۔

اور دوسرے مقام پر ﴿وَقَدْ بَلَّغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا﴾

(۸:۱۹) ”اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔“

ہے۔ یعنی بلوغ کی نسبت متکلم کی طرف ہے اور یہ اذکر کنی

الْبَلَاغُ کے معنی تبلیغ یعنی پہنچا دینے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿هَذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (۵۲:۱۴) یہ (قرآن)

لوگوں کے نام (خدا کا) پیغام ہے۔

﴿بَلَاغٌ مَّفْهَلٌ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ﴾

(۳۵:۴۶) (یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک

ہوں گے جو نافرمان تھے۔

﴿وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (۱۷:۳۶) اور

ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾

(۴۰:۱۳) تمہارا کام (ہمارے احکام کا) پہنچا دینا ہے اور

ہمارا کام حساب لینا ہے۔

اور بَلَاغُ کے معنی کافی ہونا بھی آتے ہیں، جیسے: ﴿إِنَّ

فِي هَذَا بَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ﴾ (۱۰۶:۲۱)

عبادت کرنے والے لوگوں کے لیے اس میں (خدا کے

حکموں کی) پوری پوری تبلیغ ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَأَنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ

رِسَالَتَهُ﴾ (۶۷:۵) اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام

پہنچانے میں قاصر رہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے یہ

یا کوئی دوسرا حکم جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے نہ پہنچایا تو

گو یا تم نے وحی الہی سے ایک حکم کی بھی تبلیغ نہیں کی یہ

اس لیے کہ جس طرح انبیاء کرام کے درجے بلند ہوتے

ہیں اسی طرح ان پر احکام کی بھی سختیاں ہوتی ہیں اور وہ

عام مومنوں کی طرح نہیں ہوتے جو اچھے اور برے ملے

جلے عمل کرتے ہیں اور انہیں معاف کر دیا جاتا ہے اور

کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہہ کر دیا اور آیت کریمہ:
﴿هُنَالِكَ تَبْلَوْا أَمْحُلُ نَفْسٍ مَّا أَسْأَلْتُمْ﴾ (۳۰:۱۰)
وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں
گے آزمائش کر لے گا۔

میں ایک قرأت تَبْلَوْا (بصیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی
یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہچان لیں
گے اور اسی سے أَبْلَيْتُمْ فُلَانًا کے معنی کسی کا امتحان کرنا
بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بَلَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو
گھلا کر لاغر کر دیتا ہے۔ قرآن پاک میں:

﴿وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾ (۴۹:۲)
اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت)
آزمائش تھی۔

﴿وَلَنْبَلُو نَكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ (۱۵۵:۲)
اور ہم کسی قدر خوف..... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔
﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُنِينُ﴾ (۱۰۶:۳۷)
بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

اور تکلیف کو کئی وجوہ کی بنا پر بَلَاءٌ کہا گیا ہے۔ ایک اس
لیے کہ تکالیف بدن پر شاق ہوتی ہیں اس لیے انہیں بَلَاءٌ
سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تکلیف بھی ایک طرح سے
آزمائش ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَنْبَلُو نَكُمْ حَتَّى

نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَنَعْلَمَ الْمُشْبِرِينَ﴾ (۳۱:۴۷)
اور ہم تم لوگوں کو آزمائشیں گے تاکہ جو تم میں لڑائی
کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں، ان کو معلوم کریں۔

سوم اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو خوش حالی سے
آزماتے ہیں کہ شکر گزار بنتے ہیں یا نہیں اور کبھی تنگی کے

الْجَهْدُ وَأَذْرَكْتُ الْجَهْدَ کے مثل دونوں طرح جائز
ہے، مگر بَلَعْنِي الْمَكَانَ يَا أذْرَكْنِي کہا غلط ہے۔

الْبَلَاغَةُ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے، ایک یہ کہ وہ کلام
پڑا لیتے بَلِغٌ ہو اور اس کے لیے اوصاف ثلاثہ کا جامع ہونا
شرط ہے یعنی وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، معنی
مقصود کے مطابق ہو اور فی الواقع سچی بھی ہو اگر ان اوصاف
میں کسی ایک وصف میں بھی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا
ہے۔ دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ یعنی متکلم اور مخاطب
کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مانی الضمیر کو خوبی
سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے اور آیت
کریمہ: ﴿وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا﴾
(۶۳:۴) اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر
اثر کر جائیں۔

میں ”قول بلیغ“ ان ہر دو معنی پر محمول ہو سکتا ہے اور بعض
نے اس کے جو یہ معنی کیے ہیں کہ: ”ان سے کہہ دو کہ اگر تم
نے اپنے مانی الضمیر کو ظاہر کیا تو قتل کر دیئے جاؤ گے یا یہ
کہ انہیں ان پر نازل ہونے والے مصائب سے ڈراؤ“ تو
یہ اس کے عام مفہوم میں سے بعض پہلوؤں کی طرف
اشارہ ہے۔

الْبَلَاغَةُ: اتنی مقدار جس سے گذر اوقات ہو سکے۔

ب ل وری

بَلَى الثَّوْبُ۔ بَلَى وَبَلَاءٌ کے معنی کپڑے کا
بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں۔ اسی سے بَلَاةُ السَّفَرُ
ای بَلَاةٌ کا محاورہ ہے۔ یعنی سفر نے اسے لاغر کر دیا
ہے اور بَلَوْتُهُ کے معنی ہیں: میں نے اسے آزمایا۔ گویا

أَبْنَاءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَ كُمْ ﴿٣٩:٢﴾ (تمہارے بیٹوں کو) تو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ میں مشقت کا بیان ہے اور فرعون سے نجات میں نعمت کا تذکرہ ہے اسی طرح آیت:

﴿وَأَتَيْنَاهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ﴾ (٢٣:٢٣) اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جس میں صریح آزمائش تھی۔ میں دونوں قسم کی آزمائش مراد ہے۔ جیسا کہ کتاب اللہ کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ الَّذِي آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءً وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى﴾ (٢٣:٢١) ابتلیٰ فُكُلَانُ وَأَبْلَاهُ (کسی کا امتحان کرنا) یہ دوسرا مرحلہ مضمّن ہوتا ہے (۱) تو اس شخص کی حالت کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا مقصود ہوتا ہے، دوسرے (۲) اس کی اچھی یا بری حالت کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو یہ دونوں معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی مقصود ہوتا ہے۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو صرف دوسرے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی اس شخص کی خوبی یا نقص کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ ذات باری کی شان عَلَامُ الْعَيْبُوبِ ہے، اسے کسی کی حالت سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں، لہذا آیت کریمہ: ﴿وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ﴾ (٢٣:٢) اور پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ دوسرے معنی پر محمول ہوگی۔ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود تھا)۔

ذریعہ امتحان فرماتے ہیں کہ ان کے صبر کو جانچیں۔ لہذا مصیبت اور نعمت دونوں آزمائش ہیں۔ محنت صبر کا تقاضا کرتی ہے اور مَنَحَةٌ یعنی فضل و کرم شکرگزاری کا ہوتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کما حقہ صبر کرنا کما حقہ شکرگزاری سے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لیے نعمت میں بہ نسبت مشقت کے بڑی آزمائش ہے، اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (٣٣) بُلَيْبِنَا بِالصَّرَاءِ فَصَبْرُنَا وَبُلَيْبِنَا بِالسَّرَاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ کہ تکالیف پر تو صابر رہے لیکن فراخ حالی میں صبر نہ کر سکے اور حضرت علی فرماتے ہیں: (٣٥) مَنْ وَسِعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ فَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ قَدْ مَكْرَبَهُ فَهُوَ مَخْدُوعٌ عَنْ عَقْلِهِ۔ کہ جس پر دنیا فراخ کی گئی اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ آزمائش کی گرفت میں ہے تو دفریب خوردہ اور عقل و فکر سے محروم ہے، قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنَبَلُّوكُم بِالسَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ (٣٥:٢١) اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

﴿وَلِيَبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءٌ حَسَنًا﴾ (١٤:٨) اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمالے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾ (٣٩:٢) اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔ میں بَلَاءٌ کا لفظ نعمت و مشقت دونوں طرح کی آزمائش کو شامل ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿يُدَّبِحُونَ

بلی (حرف)

تَعْمَلُونَ ﴿ (۱۶:۲۸) تو مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کہ ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے کیوں نہیں! جو کچھ تم کرتے تھے خدا سے خوب جانتا ہے۔ ﴿ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ط قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ ﴿ (۳:۳۳) اور کافر کہتے ہیں کہ (قیامت کی) گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ دو کیوں نہیں (آئیگی) میرے پروردگار کی قسم۔ ﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا قَالُوا بَلَىٰ ﴿ (۱۱:۳۹) تو جہنم کے خازن ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے پروردگار کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنا تے اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں۔ ﴿ قَالُوا أَوَلَمْ نَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلًا بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ ﴿ (۵۰:۳۰) وہ کہیں گے کہ تمہارے پاس تمہارے پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے، کیوں نہیں۔

ب ب ن

الْبَنَانُ (واحد بَنَانَة) کے معنی انگلیاں (یا ان کے اطراف) کے ہیں۔ یہ اَبَسَّ بِالْمَمَّكَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت پزیر ہونے کے

حرف ایجاب ہے، (پہلی بات میں ﴿ نئی کی تردید کے لیے آتا ہے، جیسا کہ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ کے بعد فرمایا: ﴿ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ﴿ (۸۱:۲) کیوں نہیں! جو برے کام کرے۔ اور یا اس استفہام کے جواب میں آتا ہے جو نفی پر واقع ہو، جیسے:

﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ ﴿ (۱۷۲:۲) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں! وہ کہنے لگے: کیوں نہیں۔ نَعَمْ اور بَلَىٰ میں فرق یہ ہے کہ نَعَمْ صرف استفہام (یعنی بدوں نفی) کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَكُمْ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوا نَعَمْ ﴿ (۲۳:۷) بھلا جو وعدہ تمہارے پروردگار نے تم سے کیا تھا تم نے بھی اسے سچا پایا؟ وہ کہیں گے: ہاں!۔

یہاں پر بَلَىٰ کا استعمال صحیح نہیں ہے ﴿ نیز جب کوئی شخص مَّا عِنْدِي شَيْءٌ (کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں) کہے تو اس کے جواب میں اگر ”بَلَىٰ“ کہا جائے تو اس کی تردید ہوگی، یعنی غلط کہتے ہو اور اگر نَعَمْ سے جواب دیں تو آپ نے نفی کا اقرار کر لیا یعنی بیشک تمہارے پاس کچھ نہیں ہے ﴿ قرآن پاک میں ہے: ﴿ قَالِقُوا السَّلَامَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ بَلَىٰ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ

① حرف جواب تختص النفي وتفيد ابطاله سواء كان مجرداً او مقروناً بالاستفهام ، وسواء كان الاستفهام حقيقياً او توبيخياً او تقريرياً (راجع المعنى بحث بلى) .

② هذا وان كان متفقاً عليه عند العلماء العربية لكن وقع في كتب الحديث ما يقتضى انها يجب بها الاستفهام المحرد ففى صحيح البخارى انه عليه السلام قال لاصحابه اترضون ان تكونوا ريع اهل الجنة؟ قالوا بلى! وفى صحيح مسلم أيسرك ان يكونوا لك فى البرسوة! قال: بلى! وايضاً قال عليها السلام لرجل: انت الذى يقتنى بمكة فقال بلى! - ولكنه قليل .

③ وبذلك قال جماعة من الفقهاء لكن فى المسئلة خلاف راجع المعنى (۱: ۱۲۱) .

يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ ﴿١١:٩﴾ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (موجب) غلجان رہے گی۔ ﴿كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُومٌ ﴿٩:٦١﴾ کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ ﴿قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا ﴿٩٤:٣٤﴾ وہ کہنے لگے کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ۔ سے معلوم ہوتا ہے؛ بعض کے نزدیک یہ بُنْيَانَةُ کی جمع ہے اور یہ: شَعِيرٌ وَشَعِيرَةٌ وَتَمْرٌ وَتَمْرَةٌ وَنَحْلٌ وَنَحْلَةٌ کی طرح ہے (یعنی جمع اور مفرد میں تا کے ساتھ فرق کرتے ہیں) اور جمع کی اس قسم میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔ ﴿لَهُمْ عُرْفٌ مِّنْ فَوْقِهَا عُرْفٌ مَّيْبُتَةٌ ﴿٢٠:٣٩﴾ ان کے لیے اونچے اونچے گل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔

بِنَاءٌ: (مصدر بمعنی مفعول) عمارت جِ اَبْنِيَةُ اَلْبِنِيَّةِ سے

بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے ❶

اَلْبِنِيَّةُ یہ اصل میں بَنَوُہ ہے ❷ کیونکہ اس کی جمع اَبْنَاءٌ اور تصغیر بِنِيَّ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَا بَنِيَّ لَا تَفْضُصْ رُؤْيَاكَ عَلٰى اٰخَوْتِكَ ﴿٥:١٢﴾ کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔

﴿يَا بَنِيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ ﴿١٠٢:٣٤﴾ کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں۔

﴿يَا بَنِيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴿١٣:٣١﴾ کہ بیٹا خدا

ہیں اور چونکہ کسی جگہ اقامت کے لیے ضروریات زندگی کی اصلاح بھی انگلیوں سے ہوتی ہے، اس لیے ان کو بَنَانٌ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِيَ بِنَانَهُ ﴿٣:٤٥﴾ ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں۔ میں انگلیوں کی درنگی پر اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح آیت:

﴿وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بِنَانٍ ﴿١٢:٨﴾ اور ان کا پور پور مار (کرتوز) دو۔ میں خاص کر ان کے پور پور کاٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت اور مقاتلہ کا واحد ذریعہ ہیں۔

اَلْبِنِيَّةُ: بو، اچھی یا بری۔ کیونکہ اس میں کسی چیز کے ساتھ لازم ہو۔ کی وجہ سے ٹھہرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

ب ن ي

بَنِيْتُ اَبْنِي بِنَاءٍ وَبِنِيَّةٍ وَبِنِيَّةٍ كَمَعْنٰى تَعْيِيْرُ كَرْنِ

کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَبَنِيْنًا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿٢:٤٨﴾ اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔ ﴿وَالسَّمَآءَ بَنِيْنَاهَا بِاَيْدٍ ﴿٢٤:٥١﴾ اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔

﴿وَالسَّمَآءَ وَمَا بَنَاهَا ﴿٥:٩١﴾ اور آسمان اور اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔

اَلْبِنْيَانُ: یہ واحد ہے جمع نہیں ہے، جیسا کہ آیات: ﴿لَا

❶ يقال: لا واجب هذه البنية (كغنية) وقد كثر قسمهم بها (راجع التاج: ب ن ي).

❷ هذا وان كان في اصله خلاف لكن رجح في التاج ان اصله (محركة بيايه قال دنا مفضينا انه من الباء لان بني يبنى اكثر في كلامهم من يبنى.

کے ساتھ شرک نہ کرنا۔

گھروالوں میں ہے۔

﴿إِنَّ ابْنَكَ سَرَقٌ﴾ (۸۱:۱۴) کہ لہا! آپ کے

﴿يَا بَنِيَّ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ﴾ بیٹا شیطان کی عبادت

صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔

نہ کرنا۔ اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے،

ابن کی جمع ابتاء اور بنون آتی ہے۔ قرآن میں ہے:

اس لیے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً﴾

اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تخلیق میں باپ بمنزلہ معمار

(۷۲:۱۶) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا

کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسری کے سبب اس کی

کے۔

تر بیت، دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہو اسے اس کا ابن

﴿يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ﴾ (۶۷:۱۴)

کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہو اسے بھی اس کا

کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔

ابن کہہ دیا جاتا ہے، جیسے: فُلَانٌ ابْنُ حَرْبٍ۔ فلاں

﴿يَا بَنِيَّ آدَمُ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾

جنگجو ہے۔ ابْنُ السَّبِيلِ: مسافر۔ ابْنُ اللَّيْلِ: چور۔

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین

ابْنُ الْعِلْمِ: پروردہ علم۔

کیا کرو۔

شاعر نے کہا ہے ❶

﴿يَا بَنِيَّ آدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ﴾ (۲۷:۷)

(۶۶) اُولَآئِكَ بَنُو خَيْرٍ وَشَرٍّ كَلَيْهِمَا

اے بنی آدم! (دیکھنا کہیں) شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔

یہ لوگ خیر و شر یعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔

اور ابن کی مؤنث اِنَّةً وِبِنْتٌ اور ان کی جمع بَنَاتٌ آتی

فُلَانٌ ابْنُ بَطْنِهِ: پیت پرست۔ فُلَانٌ ابْنُ فَرْجِهِ:

ہے، قرآن پاک میں ہے:

شہوت پرست۔ ابْنُ يَوْمِهِ: جو کل کی فکر نہ کرے۔ قرآن

﴿هُوَ لَأَبْنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ (۷۸:۱۱) یہ

میں ہے:

(جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں، تمہارے لیے (جائز

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزِيرُ بْنُ إِلَهُ وَقَالَتِ

اور) پاک ہیں۔

النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ﴾ (۳۰:۹) اور یہود

﴿لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَالَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقِّ﴾

کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ

(۷۹:۱۱) کہ تمہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت

مسخ خدا کے بیٹے ہیں۔

نہیں۔ بعض کہتے ہیں ❷ کہ حضرت لوط علیہ السلام نے

﴿إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي﴾ (۳۵:۱۱) میرا بیٹا بھی میرے

❶ قال مسافع بن حذيفة العبسی (کما فی شرح التبریزی) وتمامه: جميعاً ومعروف الم ومنكر - كذا فی الصاعيتين ۳۱۳ مع آخر وفى ۷۸ والبيت فى الحماسة مع المرزوقى ۳۷۶ فى اربعة ابیات والاشباه ۱۲۳:۳ مع اختلاف فى بعض الرواية وفى بعض النسخ وابتاء معروف بدل جميعاً ومعروف وفى الحيوان (۸۹:۲) قاله العتبى وفى رواية لكن بدل اولاك والعتبى هو محمد بن عبدالله من بنى عتبة بن ابي سفیان ومسافع بن حذيفة شاعر فارسى من شعراء الجاهلية (راجع الخزانة: ۲/۳۶۰).

❷ مروى عن قتاده (الطبرسى ۱۲: ۱۹۷).

سراجم دیا جائے۔ مثلاً ہاتھ سے کسی ناروا چیز کو پکڑنا یا کسی عمل شنیع کا ارتکاب کرنے کے لیے اس کی طرف چل کر جانا۔ جَاءَ بِالْبَهِيَّةِ: اس نے جھوٹ بولا۔

ب ہ ج

الْبَهِيَّةُ: خوش نمائی۔ فرحت و سرور کا ظہور۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَدَّ أَثْقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ﴾ (۶۰:۲۷) سرسبز باغ۔

بَهْجٌ (ک) خوشنما اور تروتازہ ہونا۔ اور خوشنما چیز کو بَہِجَ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ﴾ (۷:۵۰)

اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔

اور بَهِجٌ بھی صیغہ صفت ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۱

(۶۷) ذَاتُ خَلْقٍ بَهِجٍ

اور اس سے بَهِوْجٌ بروزن فَعُولٌ استعمال نہیں ہوتا۔

إِبْتَهَجَ بَكْدًا کسی چیز پر اس قدر خوش اور سرور ہونا کہ چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ اِبْتَهَجَهُ خوش کرنا۔

ب ہ ل

الْبَهْلُ: (ف) اس کے اصل معنی کسی چیز کا اس

حال میں ہونا ہے کہ اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے اسی سے

الْبَاهِلُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پائے بند یا نشان لگائے

بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے یا وہ اونٹنی جسے تھن باندھے بغیر

چھوڑ دیا ہو، چنانچہ کسی عورت نے اپنے خاوند سے کہا:

أَتَيْتُكَ بِسَاهِلٍ غَيْرِ ذَاتِ صِرَارٍ کہ تمہیں پوری

آزادی ہے جس طرح چاہو لطف اندوزی کرو اور الْبَاهِلُ

اکابر قوم کو خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں پیش

کی تھیں۔ مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی کی شان سے

بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر کے سامنے پیش

کرے اور بعض نے کہا ہے ۲ کہ بَنَاتِي سے ان کی قوم

کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بَنَاتِي اس لیے کہا ہے کہ ہر

نبی اپنی قوم کے لیے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے بلکہ والدین

سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اَبِّ کی تشریح میں

گزر چکا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَيَجْعَلُونَ لِّهُ

الْبَنَاتِ﴾ (۱۶:۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں

تجویز کرتے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی

بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

ب ہ ت

بِهْتٌ (س) حیران و ششدرہ جانا بِهْتَهُ (ف)

اسے مبہوت کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَبِهْتِ الَّذِي كَفَرَ﴾ (۲۵۸:۲) یہ سن کر کافر حیران

رہ گیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ﴾ (۱۶:۲۳) یہ تو (بہت) بڑا

بہتان ہے۔ میں بہتان کے معنی ایسے الزام کے ہیں جسے

سن کر انسان ششدر و حیران رہ جائیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَأْتِينَ بُهْتَانَ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ

وَأَرْجُلِهِنَّ﴾ (۱۲:۶۰) نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی

بہتان باندھ لائیں گی۔

میں بہتان زنا سے کنایہ ہے۔ بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ

اس سے ہر وہ عمل شنیع مراد ہے، جسے ہاتھ اور پاؤں سے

۱ قاله محاهد و سعيد بن جبیر (الطبرسی ۱۲: ۱۹۷)۔

۲ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

الْبَهِيمَةُ: چوپایہ، جانور کیونکہ اس کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ مگر عرف میں درند اور پرند کے علاوہ باقی جانوروں کو بہیمہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَحَلَّتْ لَكُمْ بِهَيْمَةَ الْأَنْعَامِ﴾ (۱:۵) تمہارے لیے چار پائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔

كَيْلٌ بِهَيْمٍ: سیاہ رات فَعِيلٌ بمعنی مُفَعَّلٌ ہے اور تاریکی کے باعث اس کا معاملہ بھی چونکہ مبہم ہوتا ہے اس لیے اسے بِهَيْمٌ کہا جاتا ہے یا فَعِيلٌ بمعنی مُفَعَّلٌ کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ بِهَيْمٍ: ایک رنگ گھوڑا جس کی اچھی طرح پہچان نہ ہو سکے اسی سے ایک روایت میں ہے۔ ❶

(۴۱) يُحْشِرُ النَّاسَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بُهْمًا کہ قیامت کے دن لوگ ننگے بدن اٹھیں گے، بعض نے کہا ہے کہ دنیاوی زیب و زینت اور آرائش سے عاری ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

الْبَهْمُ: بھیڑ بکری کے بچے۔ واحد بَهْمَةٌ۔ الْبَهْمِيُّ: ایک قسم کی گھاس جس کے پچدار ہونے کی وجہ سے اس کی جڑیں معلوم نہیں ہو سکتیں کہ کہاں ہیں اَبْهَمَتِ الْأَرْضُ: زمین میں بھمی گھاس کا بکثرت ہونا۔ جیسا کہ اَعَشَبَتْ وَأَبْقَلَتْ کے معنی گھاس اور بھری کے بکثرت ہونے کے ہیں۔

ب و ب

الْبَابُ: ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

اونٹ کے ساتھ تشبیہ دے کر اَبْهَلْتُ فُلَانًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی کو اس کی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دینا کے ہیں۔

الْبَهْلُ وَالْأَبْتِهَالُ فِي الدُّعَاءِ: کھل کر عاجزی سے دعا کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ نَبْتَهَلْ فَتَجْعَلْ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ (۶۱:۳) پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

جن لوگوں نے یہاں اِبْتِهَالُ کے معنی لعنت کیے ہیں وہ محض اس بنا پر کیے ہیں کہ یہاں دعا لعنت کے لیے ہے ❶

شاعر نے کہا ہے ❷ ع (رمل)

(۶۸) نَظَرَ الدَّهْرُ إِلَيْهِمْ فَأَبْتَهَلُ

یعنی زمانہ ان کی طرف تیزی سے چلا اور انھیں فنا کر دیا۔

ب ہ م

الْبَهْمَةُ: کے معنی ٹھوس چٹان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر بہادر آدمی کو بَهْمَةٌ کہا جاتا ہے نیز ہر وہ حسی یا عقلی چیز جس کا عقل و حواس سے ادراک نہ ہو سکے اسے مَبْهَمٌ کہا جاتا ہے۔

أَبْهَمْتُ كَذَا: مبہم کرنا اس کا مطاوع اِسْتَبْهَمَ ہے۔ اَبْهَمْتُ الْبَابَ: دروازے کو اس طرح بند کرنا کہ کھل نہ سکے۔

❶ قال ابو عبيدة في مجازة (۹۶:۱) ثُمَّ نَبْتَهَلُ اِي نَلْتَعْنَ يَقَالُ سَالَهُ بِهَا اللّٰهُ وَيَقَالُ عَلَيْهِ بِهَلَةَ اللّٰهُ رَاجِعُ اَيْضًا الْكُشَافُ وَالْفَرُطِيُّ ۴: ۱۰۵۔

❷ هذا عجزيت للبيد وصدرة في قوم سادة من قومه انظر ديوانه ص ۱۸۰ طبع ليدان ۱۸۹۱ هـ والبيت مما استشهد به الطبري في تفسيره (۲۹۸:۳) وامالي المرتضى (۴۵:۱) والبحر (۲: ۴۷۰)۔

❸ وتام الحديث حفاة، عراة بهما راجع الفائق ۱: ۶۴ والنهاية واللسان (بهم) ومعنى البهم صحيحة الاعضاء كما في النهاية۔

﴿فَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۲۳:۶) تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

﴿لَهُ بَابٌ بِأَطْنَةِ فِيهِ الرَّحْمَةُ﴾ (۱۳:۵۷) جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے، اس میں تو رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابوابِ جَنَّةٍ اور ابوابِ جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ﴾ (۷:۳۹) کہ دروازوں کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاؤَهَا وَفَتَحَتْ أَبْوَابَهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ﴾ (۷:۳۹) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے داروغے ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لیے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ هَذَا مِنْ بَابَةِ كَذَا۔ کہ یہ اس کے مناسب ہے۔ اس کی جمع بابات ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ بَابَةٌ كَالْفَرْحِ (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے۔^۱ بَوَّبْتُ بِبَابٍ۔ میں نے دروازہ بنایا۔

أَبْوَابٌ مُّبَوَّبَةٌ: بنے ہوئے دروازے، قائم کیے ہوئے

دراصل امکنہ: جیسے شہر، مکان، گھر، وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔ اس کی جمع ابواب ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ﴾ (۲۵:۱۲) اور دونوں دروازوں کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے (پکڑ کر جو کھینچا تو) پھاڑ ڈالا۔ اور دونوں کو دروازوں کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

﴿لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ﴾ (۶۷:۱۲) ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ اور اسی سے (مجازاً) علم میں باب کذا کا محاورہ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے: هَذَا الْعِلْمُ بَابٌ إِلَى الْعِلْمِ كَذَا کہ یعنی یہ علم فلاں علم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا:

(۳۲) أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلَىٰ بَابِهَا..... یعنی میں علم کا شہر ہوں۔ اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے^۲ (بجہ)

(۶۹) آتَيْتَ الْمَرْوَةَ مِنْ بَابِهَا

تم نے جو امرودی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

^۱ مروی عن علیؑ فی الترمذی وابن عباس مرفوعاً فی المستدرک وقال صحیح الاسناد و ذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات واورده السیوطی فی اللالیسی واستوعب طرقة و ذکر نفود العلماء علی هذا الحدیث راجع (۱: ۳۲۹-۳۳۶) وفی تخریج الاحیاء للعراقی (۲: ۱۹۰) قال ابن حبان لا اصل له وقال ابن ظاهر موضوع هذا فی الفتح الکبیر (۱: ۲۷۶) عقی، عد، طب، نك۔ عن ابن عباس (عد، نك) (عن جابر وفی الترمذی عن علیؑ انا دار الحکمة وعلیؑ بابها وقال غریب.

^۲ قدمرفی (اتی)

^۳ قال المتنبی: وبابة كل غلام حتى

رَجُلٌ حَائِرٌ بِأَيْرٍ مَرْدٍ رَشِيقَةٍ خُودِرَائَةٍ۔

جمع کے لیے حَوْزٌ بُورٌ کہا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:
﴿ حَتَّى نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ﴾
(۱۸:۲۵) یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو بھول گئے اور یہ
ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

میں بُورٌ بِأَيْرٍ کی جمع ہے ۱۰ بعض نے کہا ہے کہ بُورٌ
مصدر ہے اور واحد جمع دونوں کی صفت واقع ہوتا ہے،
جیسے: رَجُلٌ بُورٌ وَقَوْمٌ بُورٌ۔ شاعر نے کہا ہے ۱۰ ع
(۷۰) يَا رَسُولَ الْمَلِيكِ إِنَّ لِسَانِي
رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ إِذَا أَنَا بُورٌ
اے اللہ کے رسول! جو گناہ میں نے کفر کی حالت میں کئے
اب ان سے تابع ہوتا ہوں۔

بَارَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کے اصل معنی نر شتر کا مادہ کو یہ معلوم
کرنے کے لیے سو گھنا کہ آیا حاملہ ہے یا نہیں اور استعارة
کسی چیز کا امتحان کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا
ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: بُرْتُ كَذَا مِثْلِي فِي فُلَانٍ شَيْءٌ
آزمادیکھا۔

ب و و

الْبَوَاءُ کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی

دروازے۔ اَلْبَوَابُ: دربان۔ تَبَوَّنْتُ بَابًا: میں نے
دروازہ بنایا۔

بَابٌ اصل میں بَوَّبٌ ہے اور اس میں الف واو سے
مبدل ہے۔

ب و ر

الْبَوَارِ: (ن) اصل میں بَارَ الشَّيْءُ يَبُورُ، بَوْرًا
وَبَوْرًا کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ مندا پڑنے کے ہیں
اور چونکہ کسی چیز کی کساد بازاری اس کے فساد کا باعث ہوتی
ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ كَسَدَ حَتَّى فَسَدَ۔ اس لیے
بَوَارٌ بمعنی ہلاکت استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک
میں ہے: ﴿ تِجَارَةٌ لَّنْ تَبُورُ ﴾ (۲۹:۳۵) اس تجارت
(کے فائدے) کے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔

﴿ وَمَكْرُ أُولَئِكَ هُوَ يَبُورُ ﴾ (۱۰:۳۵) اور ان کا مکر
تابود ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے ۱۰ ﴿ نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ بَوَارِ
الْآيِمِ : کہ ہم بیوہ کے مندا پڑنے سے پناہ مانگتے ہیں یعنی یہ
کہ اس کے لیے کہیں سے پیغام نکاح نہ آئے۔

﴿ أَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴾ (۲۸:۱۳) اور اپنی
قوم کو تباہی کے گھراتارا۔

① انظر للحديث، للسان (بور) والنهاية ۱: ۹۸ و غريب القرآن للعتبي ۳۱۱ والصغير للطبراني ۲۱۸ وفيه تفرد وفي كتر العمال ۲: رقم ۲۲۳۸ عن ابن عباس (زن) و ۲۱۸۳ عن مجاهد مرفوعا.

② وقال تعالى: وكنتم قوماً بوراً (الفتح ۱۳) ای هلكى عن ابن عباس ومجاهد وغير واحد وقيل قوماً فاسدين عن قتادة (الطبري: ۵۹/۲۶) وابن كثير (۱۸۹:۴).

③ قاله عبدالله بن الزبير السهمي القرشي وفي اللسان (بور) الأله بدل المليك والبيت من كلمة قالها حين قدم على النبي صلى الله عليه وسلم مسلماً وكان هاربا من في النحران قال السهيلي (فتت) ای فی الدین فكل اثم فتق وكل توبة رتق۔ اوانابور ريريد اذا انا كافر ها لك ۱۱ راجع الروض ۲: ۲۷۹) والسوتلف ۱۳۲ والسقط ۳۸۸۔ ۳۹۰، ۸۳۳، واصلاح المنطق ۱۲۵ والسيرة (جو تنجس ۸۲۷) والطبري (۱۳: ۳۰/۱۳۰: ۲۶۶) وتاريخ الطبري (۲: ۳۳۹) فی اربعة ابيات وفي (۱۲۲: ۳) والجمهرة (۱: ۲۵۸) والقرطبي (۱۱: ۱۳) والطبرسي (۲۶: ۵۸) واللسان والشاح والمقاييس (بور) ومحاز القرآن لابی عبیده (۱: ۳۴۰ رقم ۳۹۰) والاتباع لابی الطيب ۲۳ والمخصص (۳: ۴۸) والاغانى (۱: ۱۷/۲۳: ۳۰) والامالى (۲: ۲۱۰) والاقتضاب ۱۱ وانثريسي (۲: ۳۱۸) وابن خالويه ۲۳ وغريب القرآن للعتبي ۳۱۱ وشرح السبع لابن الانباري ۳۸۹، ۵۹۴، واسد الغابة (۳: ۱۶۰) فی ستة ابيات.

بَوَّأْتُ الرُّمَحَ: میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔ ایک حدیث میں ہے: ❷

مَنْ كَذَّبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ - جو عدا مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے۔ ❸

(۷۱) لَهَا أَمْرُهَا حَتَّى إِذَا مَا تَبَوَّأَتْ
بِأَخْفَاءِهَا مَا وَى تَبَوَّأَتْ مَضْجَعًا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لیے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آکر سو جاتا ہے۔

اور تَبَوَّأْتُ فُلَانًا (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بَنِي بَاهِلَةَ وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بَوَّأْتُ كَالْفَهْمِ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانًا بَوَّأْتُ لِفُلَانٍ۔ وہ فلاں کا ہمسرہ ہے یعنی رشتہ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ﴾ (۱۶:۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بِغَضَبٍ موضع حال میں ہے، جیسے خَرَجَ بِسَيْفِهِ میں ہے اور مُرٌّ بَزِيدٍ کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بِغَضَبٍ پر باء لاکر

(اور سازگار موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ تَبَوَّأْتُ کی ضد ہے جس کے معنی اجزاء کی ناہمواری (ناسازگاری) کے ہیں۔ لہذا مَكَانٌ بَوَّأْتُ اس مقام کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔

بَوَّأْتُ لَهُ مَكَانًا: میں نے اس کے لیے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تَبَوَّأْتُ اس کا مطاوع ہے، جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأُوا لِقَوْمِكُمْ بِمِصْرَ بَيْوتًا﴾ (۸۷:۳) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ۔ ﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مَبُوءَ صَدِيقٍ﴾ (۹۳:۱۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کے رہنے کو عمدہ جگہ دی۔ ﴿تَبَوَّأُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (۱۲۰:۳) ایمان والوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔

﴿يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ﴾ (۵۶:۱۲) وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے، رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے ❶ (۲۵) اِنَّهُ كَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتَّبِعُ لِسُولِهِ كَمَا يَتَّبِعُ لِمَنْزِلِهِ . کہ آنحضرت ﷺ پیشاب کرنے کے لیے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے، جیسے کوئی شخص اقامت کے لیے جگہ تلاش کرتا ہے۔

❶ رواہ فی (طس - عن ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال (۱۷ رقم ۱۹۶)۔

❷ من حدیث ابی ہریرۃ رواہ احمد ۵۰۱:۲ رقم ۱۵۲۰ وابن ماجہ ۱۰:۱ والحديث باختلاف الفاظہ فی مسلم ۵:۱ والحاکم ۱۰۲:۱ اور مسند احمد رقم ۸۲۴۹ و ۸۷۶۱ و ۸۷۶۱ و ۹۳۰۵ و ۹۳۳۹ و ۱۰۰۵۷ و ۲۰۷۳۹ و ۲۲۱/۳۶۰، ۴۱۰، ۴۱۳، ۴۶۹، ۵۱۹ والشافعی فی الرسالة ۱۰۹۱ راجع لتخریجہ ایضاً کنز العمال ۳۰۵:۳-۳۰۷ رقم ۳۱۱۰، ۳۱۰ و لاتحد فی غیرہ .

❸ قالہ الراعی واسمہ عیبید بن حصین بن معاویہ من بنی غیر یکنی اباجندل شاعر اسلامی وقبلہ :خذ اهل ان یتبع الريح مرة يدعها ويخف الصوت حتى ترفعها راجع للبيت اللاتي ۵۰ السمط ۷۶۵ والامالي ۱۲۷:۲) وفي رواية لاخفافها مرعى بدل باخفافها ماوى وامالى المرتضى (۱: ۲۲۲) والفايق (۱: ۲۲۴) فيه قصة الشبيعي مع السائل حين سئل عن رجل لطم عين رجل فشرقت بالام فقال البيت فضربه مثلاً للعين المضروبة اى لادية فيها حتى يذهب ضوئها.

کہ وہ مٹی یا پتھر سے بنایا گیا ہو یا اون اور بالوں کا بنا ہوا ہے اس کی جمع بیوت اور آیات آتی ہے مگر پہلی جمع ممکن کے لیے مختص ہے اور دوسری بیت بمعنی شعر کے ساتھ۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتِلْكَ بَيُوتُهُمْ خَاوِيَةٌ بِمَا ظَلَمُوا﴾ (۵۲:۲۷)

یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب خالی پڑے ہیں۔
﴿وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً﴾ (۸۷:۱۰) اور اپنے

گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھہراؤ۔

﴿لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ﴾ (۲۷:۲۳)

دوسرے لوگوں کے گھر میں داخل نہ ہوا کرو۔ اور تشبیہ کے طور پر ایک شعر کو بیت کہہ دیتے ہیں۔ اور ہر چیز کے مکان کو (عجازاً) اس کا بیت کہا جاتا ہے۔

اور أَهْلُ الْبَيْتِ کا لفظ آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں

متعارف ہو چکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۳۱)

سَلْمَانٌ مِّنْ أَهْلِ الْبَيْتِ (سلمان ہمارے اہل بیت سے

ہے) فرما کر متنبہ کر دیا ہے کہ غلام کی نسبت اس کے آقا

کی طرف ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے ﴿ (۳۶)

مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَأَبْنُهُ مِنْ أَنْفُسِهِمْ . کہ کسی قوم کا

غلام انہی میں سے ہے اور اس کا لڑکا بھی ان ہی سے ہے۔

بَيْتُ اللَّهِ وَالْبَيْتُ الْعَتِيقُ: کعبہ۔ قرآن میں

ہے: ﴿وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (۲۹:۲۲) اور

تشبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں ہونے کے باوجود وہ غضب الہی میں گرفتار ہے تو نا موافق جگہ میں بسا الا ولی اس پر غضب ہوگا۔ لہذا یہ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ كِمْش ہے اور آیت کریمہ: ﴿لَئِي أُرِيدَ أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ﴾ (۲۹:۵) میں تبوء بِإِثْمِي کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت کے ساتھ ہمیشہ رہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿ (طویل)

(۷۲) أَنْكَرْتُ بِأَظْلَمِهَا وَبَوْتُ بِحَقِّهَا

میں نے اس کے باطل کا انکار کیا اور اس کے حق پر اقرار

کیا۔

www.KitaboSunnat.com جن لوگوں نے اس کے معنی اقرارت بحقہا (یعنی اس

کے حق کا اقرار کیا) کیے ہیں تو یہ تفسیر مقتضی لفظ کے مطابق

نہیں ہے۔ اَلْبَاءُ ة کنا یہ از جماع خلف الاحمر سے منقول ہے

کہ حَيَّكَ اللَّهُ وَيَاكَ اللَّهُ مِيں بِيَاكَ وصل میں بَوَّءَكَ

منزل ہے، جیسا کہ اَتَيْتَهُ الْغَدَايَا وَالْعَشَايَا مِيں ہے۔

یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

بیت

الْبَيْتُ: اصل میں "بیت" کے معنی انسان کے رات

کے ٹھکانہ کے ہیں۔ کیونکہ بَات كَالْفَرْ رات کو کسی جگہ

اقامت کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے ظَلَّ كَالْمَعْنَى دن

گزارنے کے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ مطلق مسکن اور

مکان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے، عام اس سے

① قاله لبيد وعجزه: عندي ولم يفخر على كرامها - والبیت فی اللسان والتاج والصحاح (بوء).

② الحديث رواه الطبرانی فی الكبير والحاکم فی المستدرک عن عمرو بن عوف الفتح الكبير ۱۵۹:۲.

③ وفي روايته من انفسهم راجع له (حم، د، ن، ح، ك، ت) عن ابی رافع دخ - عن انس واحمد من حديث عتبة بن غزوان وابی

موسى والطبرانی من حديث ابی سعيد فتح الباری ۵: ۴۳۱ وطب - عن مولی رسول الله صلی الله عليه وسلم وطب والبيهقي - عن

ابن عباس والبقوی والبارودی وابن عساکر عن طهمان مولی رسول الله صلی الله عليه وسلم كنز العمال ۶: ۱۹۲۸، ۱۹۳۵،

۱۹۳۷، ۱۹۴۲، ۱۹۵۱ واما لفظه وابنه من انفسهم فلم اجدھا فی شیبی من المراجع.

خانہ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ﴾ (۹۶:۳) پہلا بیت جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۱۲۵:۲) اور جب ابراہیم علیہ السلام..... بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى﴾ (۱۸۹:۲) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ (احرام) کی حالت میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔

ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو احرام کے بعد اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے سے پرہیز کرتے اور اسے احرام کے منافی سمجھتے تھے، لہذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کی رسومِ بصر کے منافی ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ.....﴾ (۲۴:۲۳) اور فرشتے (بہشت کے) ہر ایک دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔

میں ”مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ“ سے ہر قسم کی مسرتیں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِي بُيُوتٍ أُذِنَ لِلَّهِ أَنْ تُرْفَعَ﴾ (۳۶:۲۴) ان گھروں میں (ہے) جن سے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کیے جائیں۔

میں بقول بعض اس سے بیوت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد

ہیں۔ جیسا کہ آیت:

﴿لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ﴾ (۵۳:۳۳) پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو، مگر اس صورت میں کہ تم کو اجازت دی جائے۔ میں صراحت کے

ساتھ مذکور ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فی بُيُوت سے آپ کے اہل بیت اور قوم مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک قلب یعنی دل کی طرف اشارہ ہے۔ بعض حکماء نے حدیث ❶ (۴۷) لَا تَدْخُلُ الْمَلَكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ کے تحت لکھا ہے کہ یہاں بیت سے مراد دل اور کلب سے مراد حرص ہے۔ کیوں کہ كَلْبٌ فُلَانٌ کے

معنی بہت زیادہ حرص کرنے کے ہیں اور کتا حرص میں ضرب الہل ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ أَحْرَصُ مِنَ الْكَلْبِ (فلاں کتے سے زیادہ حریص ہے) اور آیت: ﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا إِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ﴾ (۲۶:۲۴) جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو مقرر کیا۔

میں مَكَانَ الْبَيْتِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ (۱۱:۲۶)

اے میرے پروردگار! میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔ میں جنت میں گھر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ جنت میں داخل ہونا میرے لیے آسان کر دے۔ اور

آیت کریمہ:

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأَ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً﴾ (۸۷:۱۰)

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی

❶ متفق علیہ من حدیث ابی طلحة زید بن سہل الانصاری وابن ماجہ من حدیث علیؑ ایضاً فی سنن ابی داؤد والنسائی وزوائد ابن حبان رقم: ۴۸۴۱ لکن بزيادة لفظ "ولا جنب" وهذه الزيادة وردت بطرق ضعاف عون المعبود: ۹۰:۱۵

اور بَيْتَ الْأَمْرِ کے معنی ہیں رات کے وقت کسی کام کی تدبیر کرنا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِذْ يَسْتَوْنَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ﴾ (۱۰۸:۴)

حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے ﴿(۲۸) لَا صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَبَيْتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ﴾ کہ جو شخص رات سے روزہ کی پختہ نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور بَاتَ فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا کے معنی رات بھر کوئی کام کرنا کے ہیں جیسا کہ ظن کے معنی دن بھر کام کرنا آتے ہیں اور یہ دونوں افعال عادات سے ہیں۔^۱

ب ی د

بَاد (ض) الشئُ يَبِيدُ بَيَادًا کے اصل معنی بَيَدَاءَ یعنی بیابان میں کسی چیز کے متفرق اور پراگندہ ہونے کے ہیں اور اسی اعتبار سے کامل تباہی اور بربادی کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا﴾ (۳۵:۱۸) کہ میں خیال نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو۔

الْبَيْدَاءُ کے معنی لق و دق صحراء کے ہیں اس کی جمع بَيْدٌ ہے اور مادہ خروشی کو آتَانَ بَيْدَانَةً کہا جاتا ہے۔

ب ی ض

الْبِيَاضُ: سفیدی۔ یہ سَوَادٌ کی ضد ہے۔ کہا

کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہراؤ۔ میں گھروں کو قبلہ ٹھہرانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر مسجد اقصیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (۳۶:۵۱) اور اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

میں ایک گھر سے ایک خاندان مراد ہے جو ایک گھر میں سکونت پذیر تھے۔ جیسا کہ قریہ بول کر اہل قریہ مراد لیے جاتے ہیں۔

الْبَيَاتُ وَاللَّيَالِيَّتُ کے معنی رات میں دشمن پر حملہ کرنے یعنی شیخون مارنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ﴾ (۹۷:۷) کیا امتیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو واقع ہو اور وہ (بے خبر) سو رہے ہوں۔ ﴿بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ﴾ (۴:۷) (رات کو) آتا تھا جب کہ وہ سوتے تھے یا (دن کو) جب وہ قیلولہ (یعنی دن کو آرام) کرتے تھے۔

الْبَيُوتُ: وہ معاملہ جس پر رات بھر غور و خوض کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَيْتَ طَاغُفَّةٍ مِنْهُمْ﴾ (۸۱:۴) ان میں بعض لوگ رات کو مشورے کرتے ہیں۔

① والحديث بلفظه في النسائي عن حفصة راجع تخريج الكشاف ۲۱ والفاوق ۱: ۳۳ رفع روايته لمن لم يبيت واصحاب السنن من حديث حفصة بلفظ "لم يجمع" واختلاف الفاظه في (ك- عن حفصة) قطع هق عن عائشة وبمعناه في (هـ، ح، ۳، ۴، ۵) عن حفصة.

② في المطبوع ههنا اعوجاج والتسديد من المراجع.

اسی طرح آیت:

﴿ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ﴿٤٥﴾ (٢٢: ٤٥) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔ اور آیت: ﴿ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَّاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٨٠﴾ (٣٨: ٨٠) اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے اور خوش اور مسرور نظر آئیں گے۔ میں بھی نَضْرَةَ اور اسْفَار سے مراد سرت ہی ہوگی۔ شاعر نے کہا ہے ﴿ (منسرح) (٤٢) أُمُّكَ بَيْضَاءُ مِنْ فُضَاعَةٍ یعنی تم عقیف اور نخی سردار ہو۔

اسی معنی میں فرمایا:

﴿ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ﴿٣٤﴾ (٣٦: ٣٤) جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہوگی۔ اَلْبَيْضُ: یہ بَيْضَةَ کی جمع ہے اور انڈے کے سفید ہونے کی وجہ سے اسے بَيْضَةَ کہا جاتا ہے۔ انڈا سفید اور پروں کے نیچے محفوظ رہتا ہے، اس لیے تشبیہ کے طور پر بَيْضَةَ بول کر خوبصورت عورت مراد لی جاتی ہے۔ بَيْضَةَ الْبَلَدِ ﴿ یہ لفظ تعریف اور مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب کلمہ تعریفی ہو تو اس سے رئیس شہر مراد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے: ﴿ (کامل) (٤٣) كَانَتْ فُرَيْشٌ بَيْضَةً فَتَقَلَّقَتْ

جاتا ہے: اَبْيَضٌ، اَبْيَضًا وَّيَبِيضًا فَهُوَ مُبْيَضٌ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ﴿١٠٦: ٣﴾ جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ۔ ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اَبْيَضَتْ وُجُوهُهُمُ ﴿١٠٤: ٣﴾ اور جن کے منہ سفید ہوں گے۔ اور اَبْيَضُ کے ایک رنگ کا نام بھی ہے جو سفید رنگ ہونے کی وجہ سے ابیض کہلاتی ہے۔

اہل عرب کے ہاں چونکہ سفید رنگ تمام رنگوں میں بہتر خیال کیا جاتا تھا، جیسے کہا گیا ہے: اَلْبَيَاضُ اَفْضَلُ وَالسَّوَادُ اَهْوَلُ وَالْحُمْرَةُ اَجْمَلُ وَالصَّفْرَةُ اَشْكَلُ اس لیے بیاض بول کر فضل و کرم مراد لیا جاتا ہے اور جو شخص ہر قسم کے عیب سے پاک ہو اسے اَبْيَضُ اَلْوَجْهُ کہا جاتا ہے، اس بنا پر آیت مذکورہ میں اَبْيَضًا اَلْوَجْهُ سے سرت اور اسْوَدَادُ اَلْوَجْهُ سے غم مراد ہوگا، جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِاَلْاُنْثَىٰ طَلَّ وَّجْهُهُ سُوْدًا ﴿١٦﴾ (٥٨: ١٦) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے۔

اور جیسے اَبْيَضًا اَلْوَجْهُ خوشی سے کنایہ ہوتا ہے،

① قاله ابن قيس المرقيات وتماه في ال بيت الذي يستظل في طينه - راجع اللسان (بيض) وشرح ديوان زهير ٥٢ وديوانه ٨٣ وازداد ابى الطيب ١٣ بغير عز وروذ كربعهم تكلمته قد تمت لها الوالدات والنضد - راجع معاني الكبير للفتي ٥٤٣ والمرزوقى ١٥٠ وفيه يستكن بدل يستظل وفي ص ٤١٩ عزاه في حواشى المرزوقى لابن قيس الرقيات والشاهد ايضا.

② مثل عند الجرمانى ١٠٩. والعسكرى ٦٢: ١٦٤. والميدانى ١: ٦٤، ٨٤، ٨٧. والكلام عليه مستوفى فى الاضداد لابن الانبارى ٦٤ والسجنانى ١١٧ وذكره فى السمط كلالا المعنيين ٥٤٩.

③ البيت فى اللسان والتاج والصحاح (مع) والسيرة (١: ٩٤) وابن ابى الحديد (٣: ٤٥٣) والعينى (٤: ١٤٠) منسوب الى ابن الزبيرى وبنى اكثر الروايات فالخ (بالمهمله) وفى رواية اللسان وحدها "خالصها" راجع الامالى المرتضى ٢: ٨٠ و٢٦٨ ونسبه الى مطر وبن كعب الخزاعى وفى ٥٤٩ وذكر قصه وتاريخ الطبرى ٢: ١٤) فى ترجمة ابن عبدمناف وازداد ابن الانبارى ٧٨ وابى الطيب ٥٥ والتبئيه للبيكرى ٧٥ ومثله لحمان بن ثابت (ديوانه ١١٤ طبعه دارصادر) لكن فى عبدالداربدل عبدمناف ١٢.

لَا يَسِينَنَّ أَحَدُكُمْ عَلَىٰ بَيْعِ أَخِيهِ كَمَا كُوِيَ أَهْلُ بَهَائِي كِي خَرِيدٍ بِرُخْرِيدٍ نَهْ كَرِي -

أَبَعْتُ الشَّيْءَ: كَسِي خَرِيدٍ كَوَيْعٍ كَلِي لِي لِي بِشَرِي كَرِنَا - شَاعِرُ نِي كَاهِي ❶ (كامل)

(٤٥) فَرَسًا فَلَيْسَ جَوَادُنَا بِمُبَاعٍ

لِي نِي هَمُ عَمْدِي هُوُزِي فَرُوخت كَلِي لِي بِشَرِي نِي كَرِي كِي -
الْمُبَايَعَةُ وَالْمَشَارَةُ: خَرِيدٍ فَرُوخت كَرِنَا -

﴿ وَأَحَلَّ اللَّهُ النَّبِيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبُوْعَ ﴾ (٢٤٥:٢)
حَالَانَكِي سُوْدِي كُو خَدَانِي حَلَالِي كَاهِي اور سُوْدُو كُو حَرَامِي -

﴿ وَذَرُّوا النَّبِيْعَ ﴾ (٩:٦٢) اور (خَرِيدٍ فَرُوخت تَرَكُ كَرُو) - ﴿ لَا بَيْعُ فِيْهِ وَلَا خِلَالٌ ﴾ (٣١:١٣)

جَسُ مِي نِي نِي (اعْمَالِي كَا) سُوْدُو هُو كَانِي دُو سُو (كَامِي آئِي كِي)
بَايَعِ السُّلْطَانَ (بَادشَاهِي كِي بِيْعَتِي كَرِنَا) اس قَلِيلِي مَالِي

كَلِي عُوْضِي جُو بَادشَاهِي عَطَا كَرْتَا هِي اس كِي اطَاعَتِي كَا اَقْرَارِي
كَرِنَا - اس اَقْرَارِي كُو بِيْعِيَّةِي يَامُبَايَعِيَّةِي كَاهِي جَاتَا هِي اور آيْتِي

كَرِيْمِي:

﴿ فَاسْتَبَشِرُوا بِنَيْبِكُمْ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ﴾ (١١١:٩)
تُو جُو سُوْدُو تَمُ نِي اس سِي كَاهِي اس سِي خُوْشِي

رِي هُو - مِي بِيْعَتِي رِضْوَانِي كِي طَرَفِي اِشَارِي هِي جَسُ كَا ذَكْرِي
آيْتِي:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَايَعُوْكَ
تَحْتَ الشَّجَرَةِ ﴾ (١٨:٢٨) (اِي بِيْعِيْمِي) جَبِي

فَالْمُنْعُ خَالِصُهُ لِعَبْدٍ مُنَافٍ

قَرِيْشِي اِيكِي اَنْدِي كِي مُثَلِي تَحِي - جُو ثُوْنَا تُو عِبْدِي مُنَافِي كَلِي
حِصِي مِي خَالِصِي مَخِ آئِي -

اور جَبِي مَذْمَتِي كَلِي لِي اِسْتِعْمَالِي هُو تُو اس سِي ذَلِيلِي آوِي
مَرَادِي لِيَا جَاتَا هِي، جِي سِي جَنْجَلِي مِي پُرِي هُوئِي اَنْدِي كِي
طَرَحِي هَر اِيكِي تُو رُكْسَكْتَا هِي اور مُثَلِي وَرَنَكِي مِي مُشَابَهَتِي كِي
وَجَدِي سِي خِصِيَّتِي كُو بِيْعِيَّتَا الرَّجُلِي كَاهِي جَاتَا هِي - بَاضَتِي
الدَّجَاجِيَّةِ: مَرغِي كَا اَنْدِي دِيْنَا - بَاضِي كَذَا: كَسِي جَلَكِي پَرِي
مُتَمَكِّنِي هُوْنَا - شَاعِرِي نِي كَاهِي ❶

(٤٣) بَدَا مِنْ ذَوَاتِ الضَّغْنِ يَأُوِي
صُدُوْرُهُمْ فَعَشِي ثُمَّ بَاضِي

بَاضِي الْحَرِي: غَرْمِي نَحْتِي هُوْنَا -

بَاضَتِي يَدِي الْمَرءِي: عَمُورَتِي كَلِي هَاتِي پَرَا نَدِي كِي
طَرَحِي وَرْمِي هُوْنَا - دَجَاجِيَّةِي بِيُوْضِي وَدَجَاجِي
بِيُوْضِي اَنْدِي دِي نِي مَرغِي نِي بِيُوْضِي .

ب ي ع

الْبَيْعُ كَلِي مَعْنِي بِيْعِي اور شِرَاءُ كَلِي مَعْنِي خَرِيدُنِي كَلِي
هِي - لِيكِنِي يِي دُوْنُو لَفْظِي اِيكِي دُورِي كَلِي مَعْنِي مِي اِسْتِعْمَالِي

هُوتِي هِي اور يِي قِيْمَتِي اور مَبِيْعِي كَلِي لَظَا سِي هُوْتَا هِي، اِسي مَعْنِي
مِي فَرَمَايَا: ﴿ وَشَرُوْهُ بِشَمْنِي بَخْسِي دَرَاهِمِي ﴾ (٢٠:١٢)

اور اس كُو تَهُوْزِي سِي قِيْمَتِي (لِي نِي) مَعْدُوْدِي چنْدُرِي هُوْنُو پَرِنِي
ذَالَا - اور آنْخُضْرَتِي عَلِيهِ السَّلَامِي نِي فَرَمَايَا ❶ (٣٦)

❶ لم اجدہ فی المراجع.

❷ رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ ط، خ، ف، ہ، ع، عن ابن عمر وعنه ایضاً حم، ق، د، ت.

❸ واولہ فرضیت آلاء الکمیت فس بیع - والبیع فی اللسان (بیع) والاقتضاب ٤٠٥ واصلاح یعقوب ٢٣٥ وحواشی المقایس

٢٧: ١) قالہ اجدع بن مالک الہمدانی وفی روایۃ اذلاء الکمیت بدل آلاء لکمیت وراجع لترجمۃ الشاعر الاشتقاق (٢: ٤٢٥) و

المؤلف ٦١.

محاورہ ہے بَانَ كَذَا کسی چیز کا الگ ہو جانا اور جو کچھ اس کے تحت پوشیدہ ہو، اس کا ظاہر ہو جانا۔ چونکہ اس میں ظہور اور انفصال کے معنی ملحوظ ہیں اس لیے یہ کبھی ظہور اور کبھی انفصال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور گہرے کنویں کو يَبُونُ کہا جاتا ہے کیونکہ پانی نیچے اتر جانے کے سبب اس سے پانی نکالتے وقت رسی کو ہاتھ سے جدا کرنا پڑتا ہے، تو اس میں انفصال کا معنی ملحوظ ہے۔

بَانَ الصُّبْحُ: صبح نمودار ہوگی اور آیت کریمہ: ﴿لَقَدْ نَقَطَعَ بَيْنَكُمْ﴾ (۹۵:۶) آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے۔

میں بَيْنَ کے معنی رشتہ اور تعلق کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ تمہارے اموال، قبیلہ اور اعمال جن پر تم اعتماد کرتے تھے۔ سب ضائع ہو گئے جس کی طرف کہ آیت: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ (۸۸:۲۶) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے اور یہی معنی آیت:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَى﴾ (۹۴:۶) ایسے ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے۔ کے ہیں۔ واضح رہے کہ لفظ بَيْنَ کبھی اسم بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی ظرف۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں دو قراءتیں ہیں جو اسے اسم قرار دیتے ہیں وہ بَيْنَكُمْ (بضم نون) پڑھتے ہیں اور جن کے نزدیک ظرف ہے وہ بَيْنَكُمْ (فتح نون) پڑھتے ہیں اور ظرف غیر متمکن ہونے کی بنا پر اسے مفتوح رہنے دیتے ہیں ﴿چنانچہ آیات:

مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ﴾ (۱۱۱:۹) میں پایا جاتا ہے۔

الْبَاعُ: (دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار جو تقریباً ۶ فٹ ہوتی ہے) یہ مادہ واوی سے ہے کیونکہ بَاعَ فِى السَّيْرِ يَبُوعُ کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی گھوڑے کے لمبے لمبے قدم رکھنا کے ہیں۔ ﴿

ب ی ل

أَبَالُ: اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے اور یہ مَا بَالَيْتُ بِكَذَا بَالَةً کے محاورہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پرواہ نہ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَفَرَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ (۲:۴۷) ان سے ان کے گناہ دور کر دیئے اور ان کی حالت سنوار دی۔ ﴿فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَى﴾ (۵۱:۲۰) تو پہلی جماعتوں کا کیا حال ہے ﴿اور انسان کے دل اور دل میں گزرنے والے خیال کو بھی بَالُ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

خَطَرَ كَذَا بِبَالِي. میرے دل میں یہ بات کھٹکی۔

ب ی ن

الْبَيْنُ کے معنی دو چیزوں کا درمیان اور وسط کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زُرْعًا﴾ (۳۲:۱۸) اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔

① وايضاً البيعة معبد النصارى - لَهْدَمَتْ صَوَامِعُ وَيَبِعُ (۴۰:۲۲).

② وايضاً فَمَا بَالُ الْبَيْتَةِ الَّتِي قَطَعْنَ أَبْيَدِيَهُنَّ (۵۰:۱۲).

③ قرآنة الرفع منسوب الى حمزة الكوفي احد القراء السبعة والفتح قراءة نافع والكسائي وحفص (راجع اضداد ابى الطيب ۸۳) و بحر المحيط لابی حيان ۴: ۱۸۲).

ہے: هَذَا الشَّيْءُ بَيْنَ يَدَيْكَ: یعنی یہ چیز تیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿ثُمَّ لَا يَنْبَغُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ﴾ (۱۷:۷) پھر ان

کے آگے..... (غرض ہر طرف سے) آؤنگا۔ ﴿لَهُ مَا

بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا﴾ (۶۳:۱۹) جو کچھ ہمارے

آگے ہے اور جو پیچھے..... سب اسی کا ہے۔ ﴿وَجَعَلْنَا

مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾

(۹:۳۶) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی۔ اور

ان کے پیچھے بھی۔

﴿مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْ مِنَ التَّوْرَةِ﴾ (۲۶:۵)

جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔

﴿ءَ أَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا﴾ (۸:۳۸) کیا ہم

سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے اور

آیت کریمہ:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ

وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۳۱:۳۳) اور جو کافر ہیں وہ

کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان

(کتابوں) کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔ میں بَيْنَ يَدَيْهِ

سے انجیل اور دیگر کتب سماویہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ (۱:۸)

خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی

رشتوں کا لحاظ کرو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں

اور بَيْنَ کے بعد مَا یا الف کا اضافہ کر کے حین کے معنی

﴿لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۱:۴۹)

(کسی بات کے جواب میں) خدا اور اس کے رسول سے

پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ ﴿فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ

صَدَقَّةً﴾ (۱۴:۵۸) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین

کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

﴿فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ﴾ (۲۴:۳۸) تو آپ ہم میں

انصاف کا فیصلہ کر دیجیے۔ ﴿وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ

بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ﴾ (۹۷:۴) اور اگر مقتول

ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو۔

میں بَيْنَ طرف واقع ہوا ہے اور آیت:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا﴾ (۶۱:۱۸) جب ان

کے ملنے کے مقام پر پہنچے۔

میں بَيْنَ کا لفظ اسم ظرف بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی مصدر بھی

یعنی جب وہ ان کے الگ ہونے کے مقام پر پہنچے۔ اور یہ

بھی یاد رہے کہ بَيْنَ کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔

جہاں مسافت پائی جائے جیسے بَيْنَ الْبَلَدَيْنِ (دو شہروں

کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ چیزیں موجود

ہوں۔ جیسے: بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ بَيْنَ الْقَوْمِ اور واحد کی

طرف مضاف ہونے کی صورت میں بَيْنَ کو مکرر لانا

ضروری ہوتا ہے۔ ❶ جیسے فرمایا:

﴿وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ﴾ (۵:۴۱) اور

ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا﴾ (۵۸:۴۰) تو

ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔ اور کہا جاتا

❶ امایة لانفرق بین احد من رسلہ ففیہا لفظہ احد بمعنی الجمع فلا اعتراض (نوی ۱: ۷)۔

﴿وَلَا يَبِيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾
(۶۳:۲۳) نیز اس لیے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف
کر رہے ہو تم کو سمجھا دوں۔

﴿أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ
إِلَيْهِمْ﴾ (۴۳:۱۶) ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی
ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان
پر ظاہر کر دو۔

﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾ (۳۹:۱۶)
تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر
کر دے۔

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ﴾ (۹۷:۳) اس میں کھلی ہوئی
نشانیوں ہیں۔

﴿شَهْرٌ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى
لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ﴾ (۱۸۵:۲) (روزوں کا مہینہ)
رمضان کا مہینہ ہے، جس میں قرآن (اول اول) نازل
ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے۔

اور بیان کرنے والے کے اعتبار سے آیت کو مبینہ بھی کہا
جاتا ہے، جیسے آیۃ مبینة ومبینات ومبینات البینة
کے معنی واضح دلیل کے ہیں۔ خواہ وہ دلالت عقلیہ ہو یا
محسوسہ اور شاہد ان (دو گواہ) کو بھی مبینہ کہا جاتا ہے۔
جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے ﴿(۴۷) الْبَيِّنَةُ عَلَيَّ

میں استعمال کر لیتے ہیں ﴿جیسے بَيِّنًا زَيْدٌ يَفْعَلُ كَذَا
وَبَيِّنًا نَفْعَلُ تو یعنی درآئیں گے زید یہ کام کر رہا تھا۔ شاعر
نے کہا ہے ﴿ع (کامل)
(۷۶) بَيِّنًا تَعَيَّنَهُ الْكُمَاةُ وَرَوْعَةٌ
يَوْمًا أُتِيحَ لَهُ جَرِيٌّ سَلْفَعُ

اس حال میں کہ وہ ایک روز بہادروں سے مقابلہ اور مراد
کر رہا تھا کہ اس کے لیے ایک دلیر بہادر مقصد ہو گیا۔
بَانَ وَاسْتَبَانَ وَتَبَيَّنَ کے معنی ظاہر اور واضح ہو جانے
کے ہیں اور بَيِّنَتُهُ کے معنی کسی چیز کو ظاہر اور واضح کر دینے
کے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ﴾ (۴۵:۱۴) اور تم
پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح
(کا معاملہ) کیا تھا۔

﴿وَقَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ مَسَاكِينِهِمْ﴾ (۳۸:۲۹)
چنانچہ ان کے (ویران) گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے
ہیں۔ ﴿وَلَسْتَبَيِّنَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۵۵:۲)
اور اس لیے کہ گنہگاروں کا راستہ ظاہر ہو جائے۔

﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (۲۵:۲) ہدایت
صاف طور پر ظاہر (اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ الْآيَاتِ﴾ (۱۱۸:۳) ہم نے تم کو اپنی
آیتیں کھول کھول کر سنادیں۔

① ويسمى هذه الف الكافة وقال بعض مالكة وقيل اشباع وبين مضافة الى الحملة (المعنى لابن هشام ۱: ۴۱۱)

② قاله ابو ذؤيب المخضرمي في رثاء بنه والسنطرا الاول في المطبوع مصحف والتسدید من المراجع والبيت في اللسان والناج (بين) والمعنى لابن هشام: رقم ۶۹۸ والسيوطي ۹۲-۲۶۷ وفي روايتهم جميعا تعانقه والبيت في الخزائن ۳: ۱۸۳ والتبريزي شرح الحماسة (۴: ۲۹۴) والمرزوقی ۱۷۸۴ واستشهد به الاصمعي وكثير من النحاة بان لفظة بينا وبينا ياتيان للمفاجأة ولا يلزم ان تقع بعدهما اذ او اذا بخلاف ساذب اليه سيوريه راجع للبحث الكتاب لسبيويه والبيت ايضا في الاشباه التنويه ۱: ۱۶۶) والحمرة ۲۴۷ في ۶۲ بيتا وديوان الهذليين (۱: ۱۸) وشرح الدرر للحمفاجي ۹۷.

③ رواه الترمذی عن ابن عمرو ولكن لفظة واليمين على المدعى عليه وفي البيهقي وابن عساکر عن ابن عمر - على من انكر (راجع الفتح الكبير ۲: ۲۰).

نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اور ان پیغمبروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (۲۴:۱۶) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے وہ ان پر ظاہر کر دو۔

اور کلام کو بیان کیا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿هَذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (۳۸:۳) یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بیان صریح ہے۔ اور مجمل و مبہم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے۔ جیسے: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ (۱۹:۷۵) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

بَيِّنَةٌ وَآبَتُنَّ کسی چیز کی شرح کرنا۔ جیسے فرمایا: ﴿لِتُبَيِّنَ لِّلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (۲۴:۱۶) تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے وہ ان پر ظاہر کر دو۔ ﴿نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (۲۶:۶۷) کھول کر ڈرانے والا ہوں۔ ﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ﴾ (۱۰۶:۳۷) بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

﴿وَلَا يَكَاذِبِينَ﴾ (۵۲:۲۳) اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔

﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ (۱۸:۲۳) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔



الْمُدْعَىٰ وَالْيَمِينُ عَلَىٰ مَنْ أَنْكَرَ۔ کہ مدعی پر گواہ لانا ہے اور مدعا عالیہ پر حلف۔ قرآن میں ہے:

﴿أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ﴾ (۱۷:۱۱) بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل (روشن) رکھتے ہیں۔

﴿لِيَهْلِكَ مَن هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَن حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ﴾ (۲۴:۸) تاکہ جو مرے بصیرت پر (یعنی یقین جان کر) مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر (یعنی حق پہچان کر) جیتا رہے۔

﴿جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ﴾ (۱۰۱:۷) ان کے پاس ان کے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے۔

الْبَيِّنَاتُ کے معنی کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔ کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بھی بَيَانٌ کہہ دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ”بَيَانٌ“ دو قسم پر ہے۔ ایک بَيَانٌ بِالْتَّخْيِيزِ یعنی وہ اشیاء جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دال ہوں۔ دوسرے بَيَانٌ بِالْاِخْتِيَارِ اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا يَصُدُّنَكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ (۶۲:۲۳) اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ

دے وہ تو تمہارا اعلانیہ دشمن ہے۔ یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔ اور بیان بالا اختیار کے متعلق فرمایا: ﴿فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ﴾ (۲۴:۲۳) اگر تم

کتاب التاء

فضل و کرم کرتا رہا۔

اور کسور ہو تو واحد مؤنث حاضر کی ضمیر پر دلالت کرتا ہے۔
جیسے ﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا فَرِيًّا﴾ (۱۹-۲۷) یہ تو تم نے
برا کام کیا۔

ت ب ب

التَّبُّبُ وَالتَّبَابُ (ض) کے معنی مسلسل خسارہ
میں رہنے کے ہیں، کہا جاتا ہے تَبَّأَهُ اللَّهُ اسے خائب و
خاسر کرے) تَبَّ لَهُ وَتَبَّتْهُ كَيْسَى سے ”تَبَّأَ لَكَ“ کہنا۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ﴾ (۱۱۱-۱) ابولہب کے ہاتھ
ٹوٹیں یعنی وہ ہمیشہ خسارے میں رہے۔ یہی مفہوم ﴿ذَلِكَ
هُوَ الْحُسْرَانُ الْمُبِينُ﴾ (۱۱-۲۲) میں پایا جاتا ہے۔
﴿وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ﴾ (۱۱-۱۰) نقصان
میں ڈالنے (یعنی تباہ کرنے) کے سوا ان کے حق میں اور
کچھ نہ کر سکے۔

﴿وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ﴾ (۳۰-۳۷)
اور فرعون کی تدبیر تو بیکار تھی۔

ت ب تہ

التَّابُوتُ کے معنی صندوق کے ہیں۔ اور آیت
کریمہ: ﴿أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ﴾ (۲-۲۴۸) کہ

ت (حرف جار)

شروع کلمہ میں قسم کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے
فرمایا: ﴿وَتَسَالُتُهُ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ﴾ (۲۱-۹۷)
اور اللہ کی قسم..... میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔
(۲) فعل مستقبل کے شروع میں مخاطب پر دلالت کرتا
ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ﴾ (۱۰-۹۹)
تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو۔ نیز صیغہ تانیث
ہونا ظاہر کرتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿تَنْزَلُ عَلَيْهِمُ
الْمَلَائِكَةُ﴾ (۳۱-۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے۔

(۳) اور آخر کلمہ میں یا تو زائدہ علامت تانیث کے طور پر
آتا ہے۔ اور یہ کبھی تو حالت وقف میں ہا بن جاتا ہے۔
جیسے ”قَائِمَةٌ“ اور کبھی وقف اور وصل دونوں حالتوں میں
ثابت رہتا ہے۔ جیسے أَخْتُ وَبِنْتُ اور (۲) یا جمع
مؤنث سالم کے آخر میں الف کے بعد آتی ہے، جیسے
مُسْلِمَاتٍ وَمُؤْمِنَاتٍ۔

(۴) فعل ماضی کے آخر میں جب مضموم ہو تو ضمیر منقطع
کہلاتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا﴾
(۷۳-۱۲) اور جس کو ہم نے مال کثیر دیا۔

اور مفتوح ہونے کی صورت میں ضمیر مذکر مخاطب ہوتی ہے،
جیسے فرمایا: ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (۱-۶) جن پر تو اپنا

① والانسب ذکرہ فی (ت، دب) لانه وزنه فعلوت لان فاعولاقليل وغير معروف فهو اذا فعلوت من التوب وهو الرجوع
(سلخصامن الكشاف: ۱: ۲۹۳ ج ۱) لكن صاحب اللسان حج كونه (ت، ب، ت) كما ذكره المؤلف وقال الصواب ان وزنه
فاعولا لان تاءه اصلية ۱۲۔

رَبِّكُمْ ﴿ (۷-۳) (لوگو!) جو (کتاب) تم پر تمہارے

پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے، اس کی پیروی کرو۔

﴿ وَاتَّبِعْكَ الْأَرْذَلُونَ ﴿ (۲۶-۱۱) اور تمہارے پیرو

تو ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ ﴿ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي ﴿

(۱۲-۳۸) اور اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلتا

ہوں، ﴿ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ ﴿

فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿

(۳۵-۱۸) پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے رستے پر (قائم)

کر دیا ہے تو اسی (رستے) پر چلے چلو اور نادانوں کی

خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔

﴿ وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ ﴿ (۲-۱۰۲) اور ان

(ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو..... شیاطین پڑھا کرتے

تھے۔

﴿ فَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوبَاتِ الشَّيْطَانِ ﴿ (۲-۱۲۸) اور

شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴿

(۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا

کے رستے سے بھٹکا دے گی۔

﴿ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ ﴿ (۱۸-۶۶) اگر

آپ اس میں سے مجھے سکھائیں تو میں آپ کے ساتھ

رہوں۔ ﴿ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ﴿

(۳۱-۱۵) اور جو شخص میری طرف رجوع لائے، اس کے

راستے پر چلنا۔ اتَّبِعَهُ کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿ فَاتَّبِعُوهُمْ مَّشْرُقِينَ ﴿

تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ وہ صندوق لکڑی کا تھا،

جس میں حکمت کی کتابیں تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ

تابوت سے مراد دل ہے اور اس میں سکینت سے مراد علم

ہے، اسی لیے دل کو سَفَطُ الْعِلْمِ وَبَيْتُ الْحِكْمَةِ

وَتَابُوتُ الْعِلْمِ وَصندوقہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا

گیا ہے:

اجْعَلْ سِرِّكَ فِي وَعَاءٍ غَيْرِ سَرَبٍ . کہ اپنے بھید کو

ایسے برتن میں رکھو جو ٹپکتا نہ ہو اور دل کا نام تَابُوتُ

ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کے

متعلق فرمایا ﴿ (۴۷) هُوَ كَتِيفٌ مِّلِيَّ عِلْمًا وَهُوَ

ایسا برتن ہے جو علم سے پر ہے۔

ت ب ع

تَبِعَهُ وَاتَّبَعَهُ کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے

ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے، جیسے

فرمایا: ﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿ (۲-۳۸) تو جنہوں نے میری

ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غمناک

ہوں گے۔ ﴿ قَالَ يَقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ . اتَّبِعُوا

مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا ﴿ (۳۶-۲۱، ۲۰) کہنے لگا کہ

اے میری قوم! پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسے کہ جو تم سے

صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔ ﴿ فَمَنْ

اتَّبَعَ هُدَايَ ﴿ (۲۰-۱۲۳) تو جو شخص میری ہدایت کی

پیروی کرے گا۔ ﴿ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُمْ مِنْ

۱ قازن مجازا القرآن لابی عبیدہ (۲: ۲۰۹) وزادو موضع تبع الحاهلیة موضع الخليفة في الاسلام وحم ملوك العرب الاعاظم (ايضا

ت ا ب ر

التَّبَرُّ: (ض) کے معنی توڑ دینے اور ہلاک کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ نَبْرَةٌ وَتَبْرَةٌ اس نے ہلاک کر ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ هُوَ لَأَمْتَبِرٌ مَّا هُمْ فِيهِ﴾ (۷-۱۳۹) یہ لوگ جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونے والا ہے۔ ﴿وَكَلَّا تَبَرَّنَا تَتَّبِرًا﴾ (۱۷-۱۷) اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔

﴿وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا﴾ (۱-۲۸) اور ظالم لوگوں کے لیے اور زیادہ تباہی بڑھا۔

ت ا ر

تَرَرَىٰ یہ مُوَاتَّرَةً سے فَعَلَىٰ کے وزن پر ہے، جس کے معنی کسی چیز کے یکے بعد دیگرے آنے کے ہیں۔ اصل میں یہ وَتَرَرَىٰ واو کے ساتھ ہے۔ تَرَاثٌ اور تَبْصَاهُ کی طرح اس کی واؤ سے تبدیل ہو گئی ہے ۵ کے نزدیک یہ منصرف ہے وہ الف زائد بنا ہے ۴ اور جن کے نزدیک غیر منصرف ہے۔ ان کے نزدیک الف تائید ہے۔ ۵

قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا﴾ (۲۳-۲۳) پھر ہم بے درپے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔

(۲۶-۶۰) تو انھوں نے سورج نکلنے ہی جایا۔

﴿ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا﴾ (۱۸-۸۹) پھر اس نے دوسرا راستہ پایا۔ ﴿وَاتَّبَعْنَاهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً﴾ (۲۸-۲۲) اور اس دنیا میں ہم نے ان کے ساتھ لعنت لگا دی۔ ﴿فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ﴾ (۷-۱۷۵) اس نے اسے پایا۔ ﴿فَاتَّبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا﴾ (۲۳-۲۳) تو ہم بھی بعض کو بعض کے پیچھے لگاتے (یعنی ہلاک کرتے) رہے۔ اتَّبَعْتُ عَلَيْهِ (قرض) دوسرے کے حوالہ کرنا۔ دوسرے پر اتارنا۔ احاطہ کرنا۔ اتَّبِعْ فُلَانٌ بِمَالٍ مال اس پر حوالہ کیا گیا۔

التَّبْيِيعُ: پچھڑا جوا بھی تک گائے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔ التَّبَسُّعُ: چار پائے کی ٹانگ۔ گویا دوڑتے وقت اس کی ٹانگیں اُن لوگوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو طلب انتقام میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوتے ہیں۔ التَّمْتِيعُ وہ چوپایہ جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔ تَبَّعُ رُؤْسَاءُ (بمن) کا لقب تھا کیونکہ وہ سیاست و ریاست میں ایک دوسرے کی اتباع کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ تَبَّعُ مُيُک بادشاہ کا لقب ہے، جس کی رعیت اس کی مطیع اور فرمانبردار تھی، اس کی جمع تَبَاعَةٌ ہے ۱ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَهْمُ خَيْرٌ أَمْ قَوْمٌ تُبَّعُ﴾ (۳۲-۳۷) بھلا یہ اچھے ہیں یا تبع کی قوم۔ التَّبُّعُ: (ایضاً) سایہ کیونکہ وہ دھوپ کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

۱ ولذا ذكره المؤلف ايضاً في (وتر).

۲ اى على خلاف القياس ومثلها فى احد وآنة والسماء.

۳ ان كانت للاحق كمافى اوطنى بنون نكرة لامعرفة وان كانت اصلية بنون دائما.

۴ وفى شرح الكتاب للسمرانى (۲: ۹۰) وجعل بعضهم الفها للتائيد فيقرء بغير تنوين وهى قرأة الجمهور وقرء ابن كثير وابو عمرو بالتونين فوزنه فعل وللفتح بدل من التنوين وخط المصحف يؤيد الانصراف والتنوين.

۵ والفراء.

دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے۔)

﴿تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ تُدِيرُ وَنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ (۲-۲۸۲)
سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ فُلَانٌ تَاجِرٌ بِكَذَا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

ت ح ت

تَحْتٌ: (اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَكُلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمَنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾ (۵-۶۶)
تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

﴿جَنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (۲-۲۵)
(نعت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔
﴿فَسَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا﴾ (۹-۲۳) اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔

تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو جیسے: **الْمَالُ تَحْتَهُ** (مال اس کے نیچے ہے) **أَسْفَلُهُ** **أَغْلَظُ** **مِنْ أَعْلَاهُ** (اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے۔)

حدیث پاک میں ہے ﴿ (۳۸) لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَظْهَرَ النُّحُوتُ ﴾ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تا وقتیکہ مینے لوگ غلبہ حاصل نہ کر لیں۔ بعض نے کہا ہے کہ

فراء کہتے ہیں کہ رُفْعِي اور جَرِي حالت میں تَنْسَرِي اور نَصِي حالت میں تَنْتَرَا ہے اور الف تنوین کے عوض میں آیا ہے۔ ثعلب کے نزدیک یہ تَفْعَلُ کے وزن پر ہے۔ ابوعلی الغبوری کہتے ہیں ﴿ کہ یہ سراسر غلط ہے کیونکہ صفت کا کوئی صیغہ تَفْعَلُ کے وزن پر نہیں آتا۔

ت ج ر

تَجَرَّ (ن) تَجَرًّا وَتِجَارَةً کے معنی نفع کمانے کے لیے اس المال کا روباہر میں لگانے کے ہیں۔ صیغہ صفت تَاجِرٌ وَتَجَرٌّ جیسے صَاحِبٌ وَصَحْبٌ یاد رہے کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس میں تاء (اصلی) کے بعد جیم ہو۔ رہا تَجَاهٌ تو اصل میں وَجَاهٌ ہے اور تَجُوبٌ وغیرہ میں تاء اصلی نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ: -
﴿هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ﴾ (۶۱-۱۷) میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دے۔

میں لفظ تِجَارَةِ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت: **تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ** **الآيَةِ**، میں بیان فرمادی ہے۔ نیز فرمایا: **﴿اشْتَرَوْا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى فَمَا رَبَحَتِ تِجَارَتُهُمْ﴾** (۲-۱۶) ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا۔

﴿إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ (۳-۲۹) ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین

① کتاب میں خوال نہیں ہے۔

② کلمة من حدیث طویل ذکرہ ابن حبان فی زوائدہ فی امارات الساعة اثناء حدیث ابی ہریرة رقم ۱۸۸۶ والحافظ فی الفتح ۱۶: ۱۲۱) من الطبرانی فی الاوسط وایضاً من طریق ابی علقمة عن ابی ہریرة وعبداللہ بن مسعود راجع الزمخشری فی الفائق ۱: ۶۹ (تحت) قال و ذکرہ مثلاً للاء (ذ).

﴿ لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ ﴾
 (۱-۶۰) تم میرے اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔
 ﴿ لَوْ شِئْتَ لَا تَتَّخِذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ﴾ (۱۸-۷۷)
 اگر آپ چاہتے تو ان سے (اس کا) معاوضہ لیتے تاکہ
 کھانے کا کام چلتا)

حدیث میں آیت کریمہ:
 ﴿ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ وَاللَّيْلُ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ﴾
 (۸۳-۴) اور جب یہ زمین ہموار کر دی جائے گی اور جو
 کچھ اس میں ہے، اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ کے
 مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

ت خ ذ

تَخَذَ: (س) بمعنی أَخَذَ یعنی پکڑنے کے آتا
 ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿ ع (طویل) ﴾
 (۷۷) وَقَدْ تَخَذَتْ رِجْلِي إِلَىٰ جَنْبِ عَرَزَهَا
 نَسِيْفًا كَأَفْحَوْصِ الْقَطَاةِ الْمُطَوَّقِ
 اس کے رکاب کے پہلو میں انڈا دینے والی قطا کے گڑھے
 جیسے نشان کو میرے پاؤں چھو رہے تھے۔

التَّرَابُ کے معنی مٹی کے ہیں۔ قرآن پاک میں
 ہے: ﴿ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ﴾ (۳۰-۲۰) کہ اس
 نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔
 ﴿ يَلِيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا ﴾ (۷۸-۴۰) کہ اے کاش کہ
 میں مٹی ہوتا۔

تَسْرَبَ کے معنی فقیر ہونے کے ہیں کیونکہ فقیر بھی انسان کو
 خاک آلودہ کر دیتا ہے۔ فرمایا: ﴿ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴾
 (۹۰-۱۶) یا فقیر خاکسار کو۔ یعنی جو بوجہ فقر وفاقہ کے
 خاک آلود رہتا ہے۔ اَتَسْرَبَ (افعال) کے معنی مال دار
 ہونے کے ہیں۔ گویا اس کے پاس مٹی کی طرح مال ہے۔
 نیز تَسْرَبَ کے معنی زمین کے بھی آتے ہیں اور اس میں
 اَلتَّيْرَابُ (ج) تَيَارِبُ اور اَلتَّوْرَابُ وَالتَّوْرَبُ
 وَالتَّوْرَابُ وغیرہ دس لغات ہیں۔ ﴿
 رِيْحٌ تُرْبَةٌ: خاک اڑانے والی ہوا۔ اسی سے آنحضرت

اسی سے اَتَّخَذَ (فعال) ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿ اَفْتَتَّخِذُوْنَهُ وَذُرِّيَّتَهُ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي ﴾ (۱۸-۵۰)
 کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو۔
 ﴿ قُلْ اَتَّخِذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا ﴾ (۲-۸۰) ان سے
 پوچھو کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے۔
 ﴿ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّیٰ ﴾ (۲-۱۲۵)
 جس مقام پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، اس کو نماز
 کی جگہ بنا لو۔

① وغریب ابی عبیدۃ: ۳: ۱۲۵ قالہ الممرق العبدی واسمہ شاس بن نهار والبیث فی اللسان (طرق) وفی روایتہ لقد بدل وقد راجع
 ایضاً التاج واللسان (تخذ، فحص، طرق، نسف،) والصاح (طرق) والمحکم (فحص) والاصمعیات ۷۷ والجمہرۃ ۲: ۶، ۱۶۳،
 ۳۹: ۳/۳۷۲) والعینی (۴: ۵۹۰) ومحاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۴۱۱) والطبری (۱۰: ۲۹۱) وشواہد الکشاف والسیوطی ۲۳۳
 والاشبایہ النحویہ ۱: ۳، ۱۰۹: ۴۱) والشاعر جاہلی قدیم ترجمہ لہ فی الشعراء ۲۳۶ والمؤتلف ۱۸۵ والمزبانی ۴۹۵ والاشتقاق
 ۱۹۹ والبیث ایضاً فی الحيوان (۵: ۵۸۱) والقطاه المطرق التي حان خروج بیضها والنسیف اثر ركض الرجل بحینی البعیر اذا
 فحص عنه الوبروفی المطبوع المطوق بالواو بدل الراء مصحف والبیث ایستشهد به علی ان تحذیاتی بمعنی اتخذ.

② راجع المعاجم.

ت ر ث

تُرَاثٌ: (ورثہ) یہ اصل میں وراثت مثال واوی ہے۔
(جیسا کہ ورث میں بیان ہوگا۔) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا﴾ (۸۹-۱۹) اور
میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

ت ر ف

الْتَرَفَةُ: عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔
کہا جاتا ہے: اُتْرِفَ فُلَانٌ فَهُوَ مُتْرِفٌ وہ آسودہ حال اور
کثرت دولت کی وجہ سے بدست ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۲۳-۳۳) اور
دنیا کی زندگی میں ہم نے اس کو آسودگی دی رکھی تھی۔
﴿وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ﴾ (۱۱-۱۱۶)
اور جو ظالم تھے وہ ان ہی باتوں کے پیچھے لگے رہے جن میں
عیش و آرام تھا ﴿وَأَرْجِعُوا إِلَيَّ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ﴾
(۱۳:۲۱) اور جن (نعمتوں) میں تم عیش و آسائش کرتے تھے
ان کی طرف لوٹ جاؤ۔ ﴿أَخَذْنَا مَثَرًا فِيهِمْ بِالْعَذَابِ﴾
(۲۳-۶۲) ہم نے ان میں سے آسودہ حال لوگوں کو
پکڑ لیا۔ ﴿أَمَرْنَا مَثَرًا فِيهَا﴾ (۱۲-۱۲) تو وہاں کے
آسودہ لوگوں کو بڑھادیتے ہیں۔ اور یہی وہ مترفین ہیں جن
کے متعلق دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا
ابْتَسَلَ رَبَّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ﴾ (۸۹-۱۵) مگر انسان

ﷺ کا فرمان ہے ﴿(۵۰) عَلَيْنَكَ بِذَاتِ الدِّينِ
تَرَبَّتْ يَدَاكَ﴾ کہ شادی کے لیے دیندار عورت تلاش کرو۔
تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اس میں تشبیہ ہے کہ دیندار
عورت تیرے ہاتھ سے نہ جانے پائے، ورنہ تمہارا مقصد
حاصل نہیں ہوگا اور تم غیر شعوری طور پر فقیر ہو جاؤ گے۔ ﴿
بَارِحٌ تَرَبَّتْ خَاكُ اِثْرَانِ وَالِي هُوَا۔

تَرَائِبُ سینہ کی پسلیاں (مفرد تَرِيْمَةٌ) قرآن پاک میں
ہے: ﴿يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ جو پیٹھ
اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اور آیت
کریمہ: ﴿أَبْكَارًا عُرْبًا اَتْرَابًا﴾ (۵۶-۳۷)
کنواریاں اور شوہروں کی بیاریاں اور ہم عمر۔ ﴿وَكَوْا عِبَ
اَتْرَابًا﴾ (۴۸-۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔ ﴿وَعِنْدَهُمْ
قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ﴾ (۳۸-۵۳) اور ان
کے پاس نیچی نگاہ رکھنے والی (اور) ہم عمر (عورتیں) ہوں
گی۔ میں اتراب کے معنی ہیں ہم عمر جنہوں اکٹھی تربیت
پائی ہوگی گویا وہ عورتیں اپنے خاوندوں کے اس طرح
مساوی اور مماثل یعنی ہم مزاج ہوں گی جیسے سینوں کی
ہڈیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور یا اس لیے کہ گویا
زمین پر بیک وقت واقع ہوئی ہیں اور بعض نے یہ وجہ بھی
بیان کی ہے کہ وہ اکٹھی مٹی میں ایک ساتھ کھیلتی رہی ہیں۔

- ۱ راجع للحدیث النہایہ (ترب) واللسان (ترب) واضداد ابی الطیب ۱۱۶ و اختلف فی تاویلہ انظر اعراب ابن خالویہ ۹۳ واصل الحدیث متفق من حدیث ابی ہریرۃ راجع تحریج العراقی الاحیاء (۱: ۳۷) والنیل للشوکانی ۶: ۱۱۲-۱۱۳، شرح الترمذی للشیخ المبارکبوری وادب الدنیا والذین علماء روی ۲۷۴ وفی روایۃ ابی سعید الخدری تربت یعینک کما فی زوائد ابن حبان رقم ۱۲۳۱۔
- ۲ قالی القالی فی الذلیل وحملہ اکثر العلماء علی التنبیہ والاخراء وان کان لفظہ الدعاء علیہ (راجع اضداد ابی الطیب ۱۱۶-۱۱۸ والذلیل ۵) ومن حملہ علی الدعاء علیہ قال معناه: ان احترت غیر ذات الدین وخالفت الوصیۃ۔ وھنھا محمل آخر للحدیث وھوان اترب من الاضداد یاتی بمعنی الفقر وبمعنی الغنی فمعناه الدعاء لہ بالغناذا اقبل وصیئہ۔

کہ میں نے اسے اس حال میں چھوڑا کہ وہ اکیلا تھا۔
التَّسْرِیْکَةُ کے اصل معنی جنگل میں پڑے ہوئے انڈا کے
ہیں اور (مجازاً) لوہے کے خود کو بھی تَسْرِیْکَةُ کہا جاتا ہے،
جیسے کہ اس پر بَيْضَةُ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

ت س ع

تَسْعَةٌ: (نو) اور تَسْعُونَ (نوے) اسماء عدد سے
ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَسْعَةَ رَهْطٍ﴾ (۲۷-۲۸) تو شخص۔ ﴿تَسْعُ
وَتَسْعُونَ نَجْجَةً﴾ (۲۳-۲۸) نانوے دنیاں۔
﴿عَلَيْهَا تَسْعَةَ عَشَرَ﴾ (۳۰-۴۲) اس پر انیس
داروے ہیں۔ ﴿ثَلَاثَ مِائَةِ سِنِينَ وَأَزْدًا
تَسْعًا﴾ (۲۵-۱۸) نو اوپر تین سو سال۔

التَّسْعُ: (ایضاً) نودن کے پیا سے اونٹ۔ التَّسْعُ ہر ماہ
کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ (ان تین دنوں) کو
تُسْعُ کہا جاتا ہے۔ تَسَعْتُ الْقَوْمَ قوم کے مال سے
نوال حصہ وصول کرنا میں ان میں نواں تھا۔

ت ع س

التَّعَسُّ: اصل میں تَعَسَّ کے معنی ہیں لغزش کھا کر
گرنے اور پھر اٹھ نہ سکتا، پستی میں گر کر کسی چیز کا ٹوٹ جانا،
اور یہ تَعَسَّ (س) تَعَسًا وَتَعَسَةً کا مصدر ہے۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿فَتَعَسَا لَهُمُ﴾ (۸-۴۷) ان کے لیے ہلاکت
ہے۔

(عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزما رہا ہے
کہ اسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے۔

ت ر ق

التَّرْقُوتَةُ کے معنی ہنسی کی ہڈی کے ہیں (ج)

التَّرَاقِيُّ: قرآن پاک میں ہے:

﴿كَأَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِي﴾ (۲۶-۴۵) دیکھو
جب جان گلے تک پہنچ جائے۔

ت ر ك

تَرَكَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے
ہیں۔ خواہ وہ چھوڑنا ارادہ و اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً
چنانچہ ارادہ اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا:
﴿وَتَرَكَنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ﴾
(۱۸-۹۹) اس روز ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ (روئے
زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔ ﴿وَاتَرَكَ
الْبَحْرُ رَهْوًا﴾ (۲۳-۲۴) اور دریا سے (کہ) خشک
(ہو رہا ہوگا) پار ہو جاؤ۔

اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا: ﴿كَم
تَرَكَوْا مِنْ جَنَابٍ﴾ (۲۵-۴۴) وہ لوگ بہت سے
باغ چھوڑ گئے۔

اسی سے جب کوئی شخص اپنی موت کے بعد مال چھوڑ جاتا
ہے تو اس کو تَرَكَتُ کہا جاتا ہے اور کبھی ہر عمل کے متعلق جو کسی
حالت پر منتہی ہو۔ تَرَكَتُهُ كَذَا یا اس کے ہم معنی جَعَلْتُهُ كَا
محاورہ استعمال کر لیتے ہیں، جیسے: تَرَكَتُ فُلَانًا وَحِيدًا

① ذکرہ بعض اصحاب اللغۃ فی (رق ی) والصحیح انہ من (ت رق) کماہنا قال فی اللسان (ت رق) علی وزن فعلوۃ .

② قد بآئی فی معنی ابقی کما فی الآیۃ : وتَرَكَنا علیہ فی الآخرین (۳۷-۷۸) ای ابقینا النشاء علیہ ۱۲ .

③ تعس - والفعل منه تعس مثل وضع کما فی القاموس . وتعسا له منصوب علی المصدر ففعل یجب اضمارہ (راجع الکشاف)

وقال الخفاجی فی الدرۃ ۱۲۷ ینال فی الدعاء علی العائر والفعل منه بکسر العین ۱۲ .

ت ف ث

﴿ مُتَكَبِّرِينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ ﴾ (۱۶-۵۶) آئے
سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

ت ل

الْتَلُّ: اصل میں نَلُّ کے معنی بلند جگہ یعنی ٹیلہ کے
ہیں اور تَلِيلٌ گردن کو کہتے ہیں اور ﴿ تَلَّهُ لِمَجْبِينِ ﴾
(۱۰۳-۳۷) کے معنی ٹیلے پر لٹادینے کے ہیں۔ جیسے:
تَرَبَّهٗ (کسی کو زمین پر گرانا) بعض نے کہا ہے کہ اس کے
معنی تَلِيلٌ یعنی گردن اور رخسار کے بل لٹادینا ہیں جیسا کہ
جبین (پٹ پڑی) کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے۔

مِثَلٌ: نیزہ وغیرہ جسے مار کر کسی کو پچھاڑا جاتا ہے، (سیدھا
اور سخت نیزہ)

ت و

تَلَاةٌ: (ن) کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح
چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی چیز حائل نہ ہو یہ
کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا
اتباع کرنے سے۔ اس معنی میں اس کا مصدر تَلَوُ اور تَلَوُ
آتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قرأت (پڑھنے)
اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے غور و فکر کرنے کی صورت
میں ہوتی ہے، اس معنی کے لیے اس کا مصدر تَلَاوَةٌ آتا
ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿ وَالْقَمَرَ إِذَا تَلَاهَا ﴾
(۲-۹۱) اور چاند کی قسم! جب وہ سورج کا اتباع کرتا ہے۔
میں سورج کا اتباع بلحاظ اقتداء اور مرتبہ مراد ہے، اور یہ
جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا
ہے اور وہ سورج کے لیے بمنزلہ خلیفہ کے ہے۔ چنانچہ بعض

الْتَفُّٹُ کے اصل معنی ناخن وغیرہ کی میل پچیل کے
ہیں، جسے بدن سے دور کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ ثُمَّ لِيَقْضُوا تَفَثَهُمْ ﴾ (۲۲-۲۹) پھر چاہیے کہ اپنا
میل پچیل دور کریں۔

یہاں لِيَقْضُوا قَضَى الشَّيْءِ سے ہے جس کے معنی
کسی چیز کو قطع اور زائل کرنے کے ہیں ایک اعرابی کا قول
ہے۔ مَا أَنْفَقْتُ وَمَا أَدْرَنْكَ تَوْكُسَ قَدْرَمِيلًا كَيْلًا هَـ۔

ت ق و

الْتَفْوَى: تفویٰ کی تاء واو سے مبدل ہے، اس پر
اس کے باب (وقی) میں بحث آئے گی۔

ت ک ء

الْمُتَكَا: (اسم مکان) سہارہ لگانے کی جگہ۔ تکیہ
جس پر ٹیک لگائی جائے اور آیت کریمہ: ﴿ وَأَعْتَدَتْ
لَهُنَّ مِتْكَأً ﴾ (۱۲-۳۱) اور ان کے لیے ایک مظل
مرتب کی۔ میں مُتَكَاً کے معنی ترنج کے ہیں اور بعض
نے کہا ہے کہ مراد کھانا اور یہ اِتِّكَاً عَلَى كَذَا فَأَكَلَهُ کے
محاورہ سے مشتق ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰-۱۸) یہ میری
لاٹھی ہے، جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔
﴿ مُتَكَبِّرِينَ عَلَى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ ﴾ (۵۲-۲۰)
تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔
﴿ عَلَى الْأَرَائِكِ مُتَكِبُونَ ﴾ (۳۶-۵۶) تختوں پر
تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔

① قال القنبي المتكأ الطعام قال ابو عبيدة في محازة ۱: ۳۰۹) وزعم قوم انه لاترج وهذا بطل باطل في الارض لكن رد عليه ابو عبيدة في غريبه وقال الفقهاء اعلم بالتاويل منه قال الطبري لكن الصحيح مقال ابو عبيدة واحذه البخاري راجع فتح الباري (۸: ۲۷۰) ۱۲۔

قرأت تَتَلَوْاْ اُھمی ہے یعنی وہاں ہر شخص اپنے عمل نامے کو پڑھ کر اس کے پیچھے چلے گا۔

﴿وَإِذَا تَنَلَسُواْ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا﴾ (۲۵-۲۵) اور ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔

﴿أَوَلَمْ يَكْفِيهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ﴾ (۵۱-۲۹) کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

﴿قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْكُمْ﴾ (۱۶-۱۰) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا (تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر نہ سنا تا۔

﴿وَإِذَا تُتْلِيتُ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (۲-۸) اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تِلَاوَةٌ بمعنی قرأت کے ہے اور یہی معنی آیات ذیل میں ہیں۔

﴿وَأَنْزَلُ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابٍ رَبِّكَ﴾ (۱۸-۲۷) اور اپنے پروردگار کی کتاب کو جو تمہارے پاس بھیجی جاتی ہے، پڑھتے رہا کرو۔

﴿وَأَنْزَلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَىٰ آدَمَ بِالْحَقِّ﴾ (۵-۲۷) اور (اے محمد) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل قاتیل) کے حالات (جو بالکل سچے ہیں) پڑھ کر سنا دو۔ ﴿وَالنَّالِيَاتِ ذِكْرًا﴾ (۳-۳۷) پھر ذکر (یعنی قرآن) پڑھنے والوں کی۔

اور آیت کریمہ: ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ (۲-۱۲۱) وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے پڑھ کر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿ذَلِكَ تَنْزِيلُ رَبِّكَ عَلَيْكَ

نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا﴾ (۵-۱۰) میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ضیاء بمعنی نور کے معنی زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اور لفظ ضیاء کے اندر نور کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر نور کے اندر ضیاء کا مفہوم نہیں آتا۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِنْهُ﴾ (۱۱-۱۷) اور ان کے ساتھ ایک (آسانی) گواہ بھی اس کی جانب سے ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا شاہد جو اس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ﴿يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ﴾ (۳-۱۳) وہ آیات الہی کی تلاوت کرتے ہیں۔

التِّلَاوَةُ: بالخصوص خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو تِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ اتباع ان کی قرأت (پڑھنے) کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی ان کے اوامر و نواہی (احکام) ترغیب و ترہیب، اور جو کچھ ان سے سمجھا جاسکتا ہے، ان کی اتباع کی صورت میں، مگر یہ لفظ قرأت (پڑھنے) سے خاص ہے، یعنی تِلَاوَةٌ کے اندر قِرَاءَةٌ کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر تِلَاوَةٌ کا مفہوم قِرَاءَةٌ کے اندر نہیں آتا، چنانچہ کسی کا خط پڑھنے کے لیے تَلَوْتُ رُفِعَتْكَ نہیں بولتے بلکہ یہ لفظ صرف قرآن پاک سے کچھ پڑھنے پر بولا جاتا ہے، کیونکہ اس کے پڑھنے سے اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ﴾ (۱۰-۳۰) وہاں ہر شخص اپنے (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کر لے گا۔ میں ایک

دیا جاتا ہے ❶ جیسا کہ مَوْزُورَات ہے۔ یعنی وہ بغیر اجر کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹیں۔ ❷

ت م م

تَمَامُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے اس حد تک پہنچ جانے کے ہیں، جس کے بعد اسے کسی خارجی شے کی احتیاج باقی نہ رہے اس کی ضد ناقص ہے، یعنی وہ جو اپنی ذات کی تکمیل کے لیے هنوز خارج شے کی محتاج ہو اور تمام کا لفظ معدودات کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور مقدار وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً عَدَدٌ تَامٌ وَكَيْلٌ تَامٌ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ (۷-۱۲۷) (۶-۱۵)، (۱۱-۱۱۹) اور تمہارے پروردگار کا وعدہ پورا ہوا۔

﴿وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ﴾ (۸-۶۱) حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔
﴿وَأَتَمَمْنَاهَا بِعَشْرِ فَنَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ﴾ (۷-۱۳۲) اور دس (راتیں) اور ملا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا تو اس کے پروردگار کی میعاد پوری ہوگئی۔ ❶

ت و ب

الْتَوْبُ: (ن) کے معنی گناہ کے باحسن وجوہ ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ

مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿ (۳-۵۸) یہ ہم تم کو (خدا کی) آیتیں اور حکمت بھری نصیحتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ میں تَسْلُوهُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں۔ کیونکہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی نازل کرنا ہی ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاتَّبِعُوا مَا تَسْلُوا الشَّيْطَانُ﴾ (۲-۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو..... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ میں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہنا ان کے اس ادعا کی بنا پر ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ کر سناتے وہ کتب الہیہ کا حصہ ہے۔

الْتَّلَاوَةُ وَالتَّلِيَةُ (قرض وغیرہ کا) باقی ماندہ حصہ سے وصول کرنے کے لیے پیچھا کرنا پڑتا ہے۔ اَتَلَيْتُهُ کے معنی کسی کے پیچھے لگانے کے ہیں۔ جیسے اَتَلَيْتُ فُلَانًا عَلَى فُلَانٍ بِحَقِّ یعنی میں نے اس کا قرضہ فلاں کے حوالہ کر دیا۔ فَلَا يَتَلُوا عَلَى فُلَانٍ وَيَقُولُ عَلَيْهِ یعنی وہ فلاں پر جھوٹ بولتا اور اس پر غلط بیانی کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ﴾ (۳-۷۸) اور خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: لَا أَذْرِي وَلَا أَتْلِي أَوْ لَا تَلَيْتَ وَلَا دَرَيْتَ تو یہاں پر تَلَيْتَ اصل میں تَلَوْتُ ہے، قانون مزاجت کی وجہ سے تَلَيْتَ کہہ

❶ کما فی الاتباع لابی الطیب (۳۰) وفی الفائق (۱-۷۲) وفی حدیث المنکر فیقول لادریت ولاتلیت ومعناه لاقرأت ولادرست قال فی النہایة (تلام) والمحدثون یرون کذالک والصواب لا اتلیت والكلمة افعال من الوت.

❷ وذكروا من امثله الازدواج ایضاً حدیث غیر خزایا ولانلمی (راجع فتح الباری ۱: ۱۴۰) والغدایا والعشایا والافتضاب (۲۷۸) والبحث فی ابن جنی علی تصریف المازنی ۶۱۶-۶۱۷) وشرح الدرہ: للحنفا جی ۷۹ وفی الشریعی ۲: ۳۲۲) ان التشدید فی باء۔ الشعی للمزاجه مع العلی والكلام علی الازواج۔ ابن الطیب علی الاقتراح ۱۲۰۲.

❸ ایضاً تماماً (۶: ۱۰۴) والنذر (۱۱: ۴۰) (۲۳-۲۷).

بندہ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے اور اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، اس لیے تَائِبٌ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ التَّوَابُ: یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صورت ہو تو اس کے معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے چھوڑتے بالکل گناہوں کو ترک کر دے اور جب تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ إِنَّهُ هُوَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ ﴾ (۲-۳۷) بیشک وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴾ (۲۵-۷۱) کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابٌ ﴾ (۱۳-۳۰) میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

تور

التَّوْرَةُ: آسمانی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی یہ وَرَى سے مشتق ہے اور تاء واو سے مبدل ہے۔ علمائے کوفہ کے نزدیک یہ وَرَاةٌ بروزن تَفْعَلَةٌ ہے اور بعض کے نزدیک تَفْعَلُ کے وزن پر ہے، جیسے: تَنْفَلُ لیکن کلام عرب میں تَفْعَلُ کے وزن پر اسم کا صیغہ نہیں آتا۔

علماء بصرہ کے نزدیک یہ وَرَى بروزن فَوَعَلَ ہے جیسے حَوْقَلُ قرآن پاک میں ہے:

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ﴾ (۵-۲۴) بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی، جس میں ہدایت اور

ہے کہ عذر کتندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لَمْ أَفْعَلْهُ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لیے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلانے، الغرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ کہا جاتا ہے مگر شرعاً اسے توبہ جب کہیں گے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پر نادم ہو اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔

تَابَ إِلَى اللَّهِ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا ﴾ (۲۴-۳۱) سب خدا کے آگے توبہ کرو۔

﴿ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ ﴾ (۵-۷۴) توبہ کیوں خدا کے آگے توبہ نہیں کرتے۔

تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ: اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ اسی سے فرمایا:

﴿ لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ ﴾ (۹-۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین پر۔ ﴿ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ﴾ (۹-۱۱۸) پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔

﴿ فَتَابَ عَلَيْهِمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ﴾ (۲-۷۲) سواس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگزر فرمائی۔

التَّائِبُ: (اسم ناعل) توبہ کرنے والا۔ توبہ قبول کرنے والا

پہاڑوں کے نام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کھانے کی دو چیزیں ہیں، ان کے مقام ورود اور اختصاص کی تحقیق اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ت ی ہ

تَآهَ: (ض) کے معنی متحیر ہونے کے ہیں اور یہ باب تَآهَ يَتَوَهُ (واوی) بھی آتا ہے، قصہ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۶-۵) چالیس برس تک..... اور (جنگل کی) زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے۔ تَوَهُهُ وَتِيَهُهُ حِرَانُ كَرْنَا اور پھینک دینا۔ وَقَعَ فِي التِّيهِ وَالتَّوَهُ وَرَطَهُ حِيرَتٍ میں پھنس گیا۔ مَفَازَةٌ تِيَهُاءُ وہ جنگل جس میں مسافر بھٹک جائیں۔



روشنی ہے۔ ﴿ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ﴾ (۲۸-۲۹) ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔

ت ا رة

تارۃ کے معنی ایک مرتبہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى﴾ (۲۰-۵۵) ہم دوسری مرتبہ نکالیں گے۔ بقول بعض یہ تَارَ الْجَرْحِ سے مشتق ہے، جس کے معنی زخم کا بھر جانا اور منڈل ہو جانا کے ہیں۔

ت ی ن

﴿وَالزَّيْتُونَ﴾ (۱-۹۵) انجیر کی قسم اور زیتون کی۔ بعض کے نزدیک تین اور زیتون دو

کتاب النباء

ث ب ت

صدق نبوت کو دلائل سے ثابت کیا۔ فُلَانٌ أَثْبَتَ مَعَ
اللَّهِ إِلَهَا آخَرَ: فلاں نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود
ثابت کیا اور آیت کریمہ: ﴿لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ﴾
(۸-۳۰) تاکہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں۔
میں لِيُثْبِتُوا کے معنی قید کرنے یا درطہ حیرت میں ڈالنے
کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿يُثْبِتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا﴾ (۱۳-۲۷) خدا مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور
کچی) بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے۔

میں ”قول ثابت“ سے دلائل تو یہ مراد ہیں اور آیت: ﴿وَلَوْ
أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ
وَآسَدًا تَنَبَّيْنَا﴾ (۳-۲۶) اور اگر یہ اس نصیحت پر
کار بند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر
اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔

میں آسَدًا تَنَبَّيْنَا کے معنی علم و ایمان کے لحاظ سے مضبوطی
بھی مراد ہو سکتی ہے اور اعمال کی پائیداری اور ان کا ثمرہ
حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی تثبیت مراد ہو سکتی ہے۔ یعنی
یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جن کے اعمال کی
ناپائیداری بیان کرتے ہوئے، قرآن پاک نے کہا ہے:

﴿وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً
مَّنثُورًا﴾ (۲۵-۲۳) اور جو انھوں نے عمل کیے ہوں گے

الْتِبَاتُ: یہ زوال کی ضد ہے اور ثَبَّتَ (ن) ثَبَاتًا کے معنی
ایک حالت پر جمے رہنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا﴾
(۸-۲۵) مومنو! جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا
مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔

رَجُلٌ ثَبَّتُ وَثَبَّتْ فِي الْحَرْبِ لِرَأْيِي فِي ثَابِتِ
قدم رہنے والا مرد۔ أَثْبَتَ السَّهْمَ فِيهِ اس میں تیر آ رہا
پار کر دیا۔ اور ثَابِتٌ کا لفظ اس پر بھی بولا جاتا ہے جو
نظروں کے سامنے موجود ہو اور اس پر بھی جو کسی دلیل سمعی
کی رو سے صحیح ہو، مثلاً: فُلَانٌ ثَابِتٌ عِنْدِي فلاں حکم
میرے نزدیک دلیل کی رو سے صحیح ہے۔ نُبُوَّةُ النَّبِيِّ
(صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ثَابِتَةٌ: آنحضرت کی
نبوت ثابت ہے، یعنی ارزوئے دلائل صحیح ہے۔

الْإثْبَاتُ وَالتَّثْبِيتُ: (انفعال و تفعیل) کے معنی کبھی تو
کسی چیز کو فی الواقع موجود کرنے کے ہوتے ہیں، مثلاً:
أَثْبَتَ اللَّهُ كَذَا (اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو موجود کر دیا)
اور کبھی ثبوت حکمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے
أَثْبَتَ الْحَاكِمُ عَلَى كَذَا: (قاضی نے فلاں پر یہ حکم
لگایا) اور کبھی اثبات باعتبار قول مراد ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات
نفس الامر میں حق ہو یا باطل جیسے:

أَثْبَتَ التَّوْحِيدَ وَصِدْقَ النُّبُوَّةِ اس نے توحید اور

میں ابن عباسؓ نے مَثْبُورًا کے معنی ناقص العقل کیے ہیں کیونکہ نقصان عقل سب سے بڑی ہلاکت ہے۔ تیسرے مکہ کی ایک پہاڑی کا نام۔

ث ب ط

ثَبَّطَهُ الْمَرَضُ وَانْبَطَهُ: اسے مرض نے روک دیا اور اسے لازم ہو گئی۔ قرآن پاک میں ہے: فَثَبَّطَهُمْ (۲۶-۹) تو ان کو ہلنے جلنے نہ دیا۔

ث ب ی (و)

ثَبَّةٌ کے معنی الگ جماعت کے ہیں اس کی جمع ثَبَاتٌ وَثَبِينٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأَنْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوْ أَنْفِرُوا جَمِيعًا﴾ (۷۱-۳) پھر یا تو جماعت جماعت ہو کر نکلا کرو یا سب اکٹھے کوچ کیا کرو۔ شاعر نے کہا ہے: ﴿الوافر﴾

(۷۸) وَقَدْ أَعْدُوا عَلَيَّ ثَبَّةً كِرَامٍ

اور میں شریف لوگوں کی جماعت کے پاس جاتا ہوں اور اسی سے ثَبَّيْتُ عَلَيَّ فُلَانٍ کا محاورہ ہے، جس کے معنی کسی کے متفرق محاسن بیان کرنے کے ہیں۔ ثَبَّةٌ کی تفسیر ثَبَّةٌ ہے، لہذا اس میں یاء محذوف ہے ﴿ لیکن ثَبَّةٌ الْحَوْضِ جس کے معنی وسط حوض ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے یہ اجوف سے ہے اور اس میں عین کلمہ محذوف ہے۔ ﴿

ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے۔ محاورہ ہے: ثَبَّئْتُ: میں نے اسے استحکام بخشا، ثابت قدم رکھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ لَا أَنْ تَبَّتْكَ﴾ (۷۳-۱۷) اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے۔

﴿فَقَاتُوا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۱۲-۸) تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

﴿وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۶۵-۲) اور خلوص نیت سے۔ ﴿وَتَبَّتْ أَقْدَامَنَا﴾ (۱۳۷-۳) اور ہم کو ثابت قدم رکھ۔

ث ب ر

الْتَبُّورُ: (مصدر) کے معنی ہلاک ہونے یا (زخم کے) خراب ہونے کے ہیں اور الْتَبُّورُ کسی کام کو مسلسل کرنے والا تَابَرْتُ عَلَيَّ الْأَمْرَ سے (ام فاعل کا صیغہ) ہے۔ جس کے معنی کسی کام کو مسلسل کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿دَعُوا هُنَالِكَ ثُبُورًا ۝ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَّادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا﴾ (۱۴۰-۲۵) تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے، آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَأَنَّى لَا تَتَنَبَّأُ بِفِرْعَوْنَ مَثْبُورًا﴾ (۱۰۲-۱۷) اے فرعون! میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

۱ ای مقررین بانہا معايشب اللہ علیہا (الرحاج)۔

۲ زهير و تسامه: نشاوی و احدین لمانشاء راجع دیوانہ مع شرح الاعلم الشنمری ۵۸ (طبعة ليدان والعقد الثمين ۷۷ والطبری ۵: ۱۶۴ واللسان (نشو، محجاز القرآن رقم ۱۵۶ مختار الشعر الجاهلی ۲۵ (حلیبة) و ابن الانباری ۴۰۰ و مجموعة المعانی ۱۹۸ و معاهد التضيض ۵۳: ۲ فی رواية علی شرب بدل ثبة فلاشاهد.

۳ والمختار عندالمحققین انه ثبته من الواو واصلها ثبوته وبه قال ابن جنی والمؤلف انه من الیاء.

۴ ذهب الجوهري وبعض علماء اللغة انها من ثبة الحوض والذاهبة الواو من وسطه وبه قال ابواسحاق بدلیل ثوبية لكن الاكثر علی النقص ۱۲.

(۴۷-۴۸) جب ان کو خوب قتل کر چکے تو (جو زندہ پکڑ لیے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔

تَّشْرِبُ

التَّشْرِبُ (تفعلیل) کے معنی ہیں کسی کو اس کی غلطی پر سرزنش اور زبردستی کرنا، قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا تَّشْرِبْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (۱۲-۹۲) (یوسف نے) کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (ولامت) نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے ﴿(۵۱)

إِذَا زَلَّتْ أُمَّةٌ أَحَدِكُمْ فَلْيَجْلِدْهَا وَلَا يَثْرِبْهَا. کہ جب کوئی لوٹھی زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے اور صرف ملامت پر اکتفا نہ کرے۔

اور عربی زبان میں اس سے صرف تَّشْرِبُ کا لفظ معروف ہے، جس کے معنی باریک اور تگی سی چربی کے ہیں ﴿(جو) انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے) اور آیت کریمہ: ﴿يَا أَهْلَ يَثْرِبَ﴾ (۳۳-۱۳) اے اہل مدینہ! میں ہو سکتا ہے کہ یَثْرِبُ اسی مادہ سے ہو اور اس میں یا زائد ہو۔ ﴿

تَّعَبُ

تَّعَبَ (ف) تَعَبًا الْمَاءُ کے معنی ہیں اس نے پانی بہایا فَا تَتَّعَبُ اس کا مطاوع ہے، جس کے معنی ہیں، چنانچہ وہ بہ نکلا۔ اسی سے تَّعَبُ الْمَطْرِ ہے (جس کے معنی بارش کا بہتا ہوا پانی یا برساتی نالہ کے ہیں) اور ہو سکتا

تَّجَّجُ

تَّجَّجُ (ن) تَّجَّجًا الْمَاءُ: پانی کا زور سے بہنا یا برستا محاورہ ہے: آتَى الْوَادِي بِشَجِيحِهِ: زبردست سیلاب آنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً تَجَّجًا﴾ (۷۸-۱۲) اور نچرے بادلوں سے موسلا دھار میں برسایا۔ حدیث میں ہے ﴿(۵۰)

أَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالتَّجُّ يَعْنِي أَفْضَلَ حَجٍّ وَهُوَ، جس میں زور زور سے لہیک پکارا جائے اور کثرت سے قربانی کا خون بہایا جائے۔

تَّخَنَ

تَّخَنَ (ك) التَّخِيءُ: کے معنی ہیں کسی چیز کا گاڑھا ہو جانا، اس طرح کہ بننے سے رک جائے، اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

أَفْخَتْهُ ضَرْبًا وَاسْتِخْفَافًا: میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکا، قرآن پاک میں ہے: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يَتَّخِنَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۸-۶۷) پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔

﴿حَتَّى إِذَا أَتَّخْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَتَانَ﴾

① الترمذی والنسائی من حدیث عمرو ابن ماجة من حدیث محمد بن المنکدر عن جابر کر، حق عن ابی بکر ع۔ عن ابن مسعود

راجع کنز العمال رقم اور اراجع لشرحہ غریب ابی عمید ۳: ۱۴۰۔

② اصل الحدیث متفق علیہ رواہ احمد و ابو داؤد و من حدیث ابی ہریرة و لفظ الحدیث کما فی المراجع اذ ازنت امة احد فتبین زناھا فلیحدها الحد ولا یثرب علیھا و فی رواة النسائی ولا یغنیھا.

③ و فی الحدیث ان المنافع یوخر العصر حتی اذا صارت الشمس کثرت البقرة صلاھا.

④ ام فدیمة للمدینة باسم اول من سکنها من ولد سام بن نوح و قد نهی النبی ، ان یقال لها یثرب و سماھا طیبة و طابة لان فی مادة ثرب معنی الفساد ۱۲۔

یا کسی کام کے کرنے میں حذاقت اور مہارت سے کام لینا۔ اسی سے اَلْمُشَاقَّةُ کا لفظ مستعار ہے۔ (جس کے معنی ہتھیاروں کے ساتھ باہم کھیلنے کے ہیں اور سیدھے نیزے کو رُمُحٌ مُتَّفَعٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَلشِّقَافُ اس آلہ کو کہتے ہیں، جس سے نیزوں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔

تَقَفْتُ كَذَا کے اصل معنی مہارت نظر سے کسی چیز کا نگاہ سے ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مجازاً محض کسی چیز کے پالینے پر بولا جاتا ہے، خواہ اس کے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقِفْتُمُوهُمْ﴾ (۲-۱۹۱) اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔

﴿مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا تَقِفُوا أَخَذُوا وَقَتَلُوا تَقْتِيلًا﴾ (۳۳-۶۱) پھٹکارے ہوئے، جہاں پائے گئے پڑے گئے۔ اور جان سے مار ڈالے گئے۔

ث ق ل

اَلثَّقَلُ: یہ خِصَّةٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی بھاری اور انبار ہونا کے ہیں اور ہر وہ چیز جو وزن یا اندازہ میں دوسری پر بھاری ہو اسے ثَقِيلٌ کہا جاتا ہے۔ اصل (وضع) کے اعتبار سے تو یہ اجسام کے بھاری ہونے پر بولا جاتا ہے، لیکن (مجازاً) معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے:

أثْقَلَهُ الْعُرْمُ وَالْوِزْرُ اسے تاوان یا گناہ کے بوجھ نے دبا لیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَّغْرَمٍ مُثْقَلُونَ﴾ (۵۲-۴۰) (اے پیغمبر!) کیا تم ان سے صلہ مانگتے ہو کہ

ہے کہ آیت کریمہ: ﴿فَلَا ذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُبِينٌ﴾ (۲۶-۳۲) تو وہ اسی وقت صریحاً اُتْر دیا بن گئی۔

میں ثُعْبَان (اُتْر دیا) بھی ثَعَبْتُ الْمَاءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہو سانپ بھی چونکہ زمین پر اس طرح چلتا ہے۔ جیسے پانی بہ رہا ہوتا ہے، اس لیے اسے ثُعْبَان کہا گیا ہو۔ ثُعْبَةٌ: خبیث قسم کا گرگٹ ج ثَعَبٌ یہ بھی چونکہ شکل و صورت میں سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس لیے اسے ثُعْبَةٌ کہا جاتا ہے اور جسم میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کے لفظ میں اختصار کر لیا گیا ہے۔

ث ق ب

اَلثَّقَابُ: اتنا روشن کہ جس چیز پر اس کی کرنیں پڑیں اس میں چھید کرتی پار گزار جائیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاتَّبَعَهُ شُهَابٌ ثَائِبٌ﴾ (۳۷-۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ ان کے پیچھے لگتا ہے۔

﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝﴾ (۸۶-۳) آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم، اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا۔ اَلثَّقَابُ: اصل میں ثُقْبَةٌ سے ہے، جس کے معنی سوراخ کے ہیں۔ اَلْمِثْقَابُ: پہاڑ میں سخت اور دشوار گزار راستہ گویا وہ سوراخ کی مثل ہے۔ ابو عمر کا قول ہے کہ صحیح لغت مَثْقَبٌ (فتح المیم) ہے ۱ محاورہ ہے: ثَقَبْتُ النَّارَ: میں نے آگ بھڑکائی۔

ث ق ف

اَلثَّقْفُ: (س ك) کے معنی ہیں کسی چیز کے پالینے

ان پر تادان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔
اور عرف میں انسان کے متعلق ثقیل کا لفظ عام طور تو بطور
ذمت کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مدح بھی آجاتا
ہے ۱ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ۲ (الوافر)
(۷۹) تَخِفُ الْأَرْضُ إِذَا مَا زَلَّتْ عَنْهَا
وَتَبْنِي مَا بَقِيَتْ بِهَا تَفِيئًا
(۸۰) حَلَّتْ بِمُسْتَقَرِّ الْعِزِّ مِنْهَا
فَتَمَنَعُ جَانِبَيْهَا أَنْ تَبِيئًا

کہ جس سر زمین سے تم چلے جاؤ وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور وہ
اسی وقت تک بھاری رہتی ہے جب تک تم اس پر رہو۔ تم
زمین میں عزت کے مقام پر فروکش ہو اور تمہاری وجہ سے
اس میں توازن قائم ہے، کہا جاتا ہے۔
فِي أذُنِهِ نَقْلٌ یعنی اس کی قوت ساعت کمزور ہے۔
(ضد فی اذنه خيفة) گویا جو بات اس سے کی جاتی
ہے اس کو سمجھنے میں گرانی محسوس کرتا ہے اور کسی بات کا سننا
ناگوار محسوس ہوتا کہا جاتا ہے۔ نَقْلُ الْقَوْلِ چنانچہ
اسی معنی میں قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿تَقَلَّتْ فِي
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۷-۱۸۷) وہ آسمان اور
زمین میں ایک بھاری بات ہوگی۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا﴾ (۲-۹۹) اور
زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی۔ میں بعض
نے کہا ہے کہ زمین کے دینے مراد ہیں اور بعض نے حشر

سے روک دیں گے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:
﴿لِيَسْحَمُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ
أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلِيسَاءَ مَا
يَزِرُونَ﴾ (۱۶-۲۵) (اے پیغمبر! ان کو بکنے دو) یہ
قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ اٹھائیں
گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی
اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ:
﴿انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا﴾ (۹-۲۱) تم سبسا رہو یا
گرانبار گھروں سے نکل آؤ۔

میں بعض نے خفاف اور ثقاف سے جوان اور بوڑھے
مراد لیے ہیں اور بعض ۳ نے خفاف سے نادر اور ثقاف
سے غنی لوگ مراد لیے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان سے
غریب الوطن اور مقیم لوگ مراد ہیں۔ اور بعض نے خفاف
سے چست اور ثقاف سے ست مراد لیے ہیں۔ لیکن آیت
اپنے عموم کے اعتبار سے ان جملہ معانی کو شامل ہے کیونکہ

۱ ومنه قوله تعالى: ايها الثقلان (۳۱-۵۵) للجن والانس لما خصابه من العقل والتميز من سائر الحيوان (راجع اللسان منقل).
۲ قاله زهير بن ابي سلمى والشطر الثاني في الثاني من اجازة ابنه كعب وفيه قصة راجع امانى المرتضى (۱: ۹۷) وفيه الاول: تزان
الارض اذا سامت خيفا وتحى ما حبيت بها ثقيلا وفيه نزلت بدل حلت ديوانه والعقد التمس ۱۷۳ محاضرات المؤلف وفي روايته
اختلاف يسير.

۳ قال العماد (۲: ۳۵۹) والامالى حمله على العموم ۱۲.

ث ل ل

الثَّلَّةُ: (فتح الثا) کے اصل معنی اون کے ڈھیر کے ہیں اس لیے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھی ثَلَّة کہا جاتا ہے اور معنی اجتماع کے اعتبار سے آدمیوں کی جماعت کو ثَلَّة۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿ثَلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثَلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ﴾
(۵۶-۳۹، ۴۰) (یہ) بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہیں اور بہت سے پچھلوں میں سے۔

ثَلَلْتُ كَذَا: میں نے اس سے کافی مقدار لی۔ ثَلَّ عَرَشُهُ اس کی حکومت برباد کر دی۔ اس کی عزت ضائع کر دی۔ الثَّلَلُ: دانتوں کا گرنا۔ اسی سے اَثَلَّ فَمُهُ کا محاورہ ہے، جس کے معنی دانت گرنے کے ہیں۔ تَثَلَّلَتِ الرَّكِيَّةُ کنواں منہدم ہو کر پٹ گیا۔

ث ل ث

الثَّلَاثَةُ، تَمِين (مؤنث) ثَلَاثُونَ تَمِين (مذکر و مؤنث) ثَلَاثَةُ الْأَقْيَابِ: تین ہزار (مذکر و مؤنث) الثَّلَاثُ: تہائی (مثنیہ ثَلَاثَانِ اور جمع ثَلَاثَاتُ) قرآن میں ہے: ﴿فَلَا وَه الثَّلَاثُ﴾ (۱۱-۳) تو ایک تہائی مال کا حصہ۔ ﴿وَوَاعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً﴾ (۱۳۲-۷) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔ ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُمْ رَاٰبِعُهُمْ﴾ (۵۸-۷) (کسی جگہ) تین (مخصوص) کا (مجمع) سرگوشی نہیں کرتا مگر وہ ان میں چوتھا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ﴾ (۲۳-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے (کے)

قرآن پاک کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے کہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی ہر حال میں تمہیں جہاد کے لیے چل کھڑے ہونا چاہیے۔

الْمِثْقَالُ: ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے، جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے، چنانچہ ہر بات کو مثقال کہہ سکتے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝﴾ (۹۹-۷، ۸) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور آیت کریمہ:

﴿وَأَمَّا مَنْ حَقَمْتَ مَوَازِينَهُ﴾ (۸۱-۸) اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے۔

میں وزن کے ہلکا نکلنے سے اعمالِ حسنہ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ثَقِيلٌ اور خَفِيفٌ کے الفاظ دو طرح استعمال ہوتے ہیں ایک بطور مقابلہ کے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے اعتبار سے ثَقِيلٌ یا خَفِيفٌ کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور دوسرے یہ کہ جو چیزیں (طبعاً) نیچے کی طرف مائل ہوتی ہیں، انہیں ثَقِيلٌ کہا جاتا ہے، جیسے حجر مدرد وغیرہ اور جو چیزیں (طبعاً) اوپر کو چڑھتی ہیں، جیسے آگ اور دھواں انہیں خَفِيفٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿إِنَّا قَلَبْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (۹-۳۸) تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔ میں زمین پر گرنا دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔

(اسی طرح) آلا رِبْعَاءُ: بدھوار۔ ان میں الف ہا کے عوض ہے (جیسے: حَسَنَةٌ وَحَسَنَاءُ) اور یہ ایام کے ساتھ مخصوص ہیں۔

ثَلَّثَ الْبُسْرُ: گدڑ کھجوریں دو تہائیں پک گئیں۔

اسی طرح ثَلَّثَ الْعِنَبُ کا محاورہ ہے، یعنی انگور دو تہائی پختہ ہو گئے۔ ثَوْبٌ ثَلَاثِيٌّ تین گز کپڑا۔

ث م م

ثُمَّ • یہ حرف عطف ہے اور پہلی چیز سے دوسری کے متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے، خواہ یہ تاخیر بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ اور یا باعتبار وضع کے ہو، جیسا کہ قَبْلُ اور اَوَّلُ کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿

ثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ امْتَمَّ بِهِ الْتَنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ﴾ (۵۱-۱۰) کیا جب وہ آتے ہوگا، تب اس پر ایمان لاؤ گے (اس وقت کہا جائے گا کہ) اب (ایمان لائے) اس کے لیے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

﴿ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ (۵۲-۱۰) پھر ظالم لوگوں سے کہا جائے گا۔

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾ (۵۲-۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔

ثُمَّامَةٌ: ایک قسم کی گھاس جو نہایت چھوٹی ہوتی ہے اور ثَمَّتِ الشَّاةُ کے اصل معنی بکری کے ثُمَّامہ گھاس چرنا کے ہیں جیسے درخت چرنے کے لیے شَجَرَتٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، پھر ہر قسم کی گھاس چرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ثَمَمْتُ الشَّيْءَ اس چیز کو اکٹھا اور درست

ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تین اوقات ستر کے ہیں۔

﴿وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ﴾ (۱۸-۲۵)

اور اصحاب کہف اپنے غار میں (نواو پر) تین سو سال رہے۔

﴿بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنَزَّلِينَ﴾ (۳-۱۳۲)

تین ہزار فرشتے نازل کر کے تمہیں مددے۔ ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ﴾ (۳-۲۰) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم.....

(کبھی) دو تہائی کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی)

تہائی رات قیام کرتے ہو۔

﴿مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبْعَ﴾ (۳-۴) دو دو یا تین تین یا چار چار۔

ثَلَّثْتُ الشَّيْءَ: تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔

ثَلَّثْتُ الْقَوْمَ میں نے قوم کے مال سے ایک تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثَلَّتُهُمْ: دو میں شامل ہو کر تین بنا دیا۔ مال سے تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثَلَّتُ الدَّرَاهِمَ: تین درہم کر دیئے (یعنی دو سے تین کر دیئے)

اَثَلَّتُ الْقَوْمَ: وہ تین ہو گئے۔ حَبْلٌ مَثْلُوْتُ تین بوں سے بنی ہوئی رسی۔ رَجُلٌ مَثْلُوْتُ جس کے مال سے تہائی لے لی گئی ہو۔ ثَلَّثْتُ الْفَرَسَ وَرَبْعَ (دوڑ میں) گھوڑے کا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آنا، محاورہ ہے:

أَثَلَاةٌ وَثَلَاثُونَ عِنْدَكَ أَوْ ثَلَاثٌ وَثَلَاثُونَ:

یعنی کیا تمہارے پاس ۳۳ مرد ہیں یا عورتیں؟ جَاؤَا ثَلَّثَ وَ مَثَلَّتْ وہ تین تین آئے۔ نَاقَةٌ ثَلُوثٌ: جس کے تین تھنوں سے دودھ دوہیا جائے۔ اَلثَّلَاةُ: منگوار

۱ حرف عطف بقتضی ثلاثة امور التثريك في الحكم والترتيب والمهلة وفي كل منها خلاف راجع المعنى ۱: ۱۲۴).

۲ قال الطبري: معناه أمثالك وليست ثم التي تأتي للعطف قال ابن هشام وهذا وهم منه .

آتی ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ﴾ (۳۲-۲) اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع واقسام کے میوے پیدا کیے۔

﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ﴾ (۱۶-۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

﴿أَنْظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ﴾ (۶-۹۹) ان کے پھلنے اور پکنے پر غور کرو۔^۱

﴿وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾ (۱۳-۱۱، ۱۶، ۳) اور ہر طرح کے میوے۔

ثَمَرٌ اور ثِمَارٌ کے ایک ہی معنی ہیں، بعض نے کہا ہے کہ ثِمَارٌ، ثَمَرٌ کی جمع ہے، پھر بطور کنایہ ثمر کا لفظ ہر قسم کے کمائے ہوئے مال پر بولا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ﴾ (۱۸-۳۳) (اس طرح) اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔ میں ابن عباسؓ نے ثمر کے یہی معنی کیے ہیں۔

مجاورہ ہے: ثَمَرَ اللّٰهُ مَالَهُ اللّٰهُ تَعَالَى اس کا مال بڑھائے اور مجازاً ہر چیز کے نفع پر ثمر کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ثَمَرَةُ الْعِلْمِ الْعَمَلُ الصَّالِحُ کہ علم کا ثمرہ نیک عمل ہیں۔ وَثَمَرُ الْعَمَلِ الصَّالِحِ الْجَنَّةُ۔ اور نیک عمل کا ثمرہ جنت ہے۔

اور صوری مشابہت اور نیچے کی طرف لٹکنے کے اعتبار سے چابک کے سر کی گرہ کو بھی ثَمَرَةُ السَّوْطِ کہا جاتا ہے۔

کیا۔ اسی سے مجاورہ ہے: كُنَّا أَهْلَ ثُجَيْمٍ وَرُمَيْةٍ ہم اس کی اصلاح و مرمت کے اہل تھے۔
الْثَّمَةُ خَشْكٌ گھاس کا مٹھا۔

ثَمٌّ (وہاں): اسم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور اس کے بالمقابل هُنَالِكَ اسم اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ دونوں لفظ دراصل اسم ظرف ہیں^۱ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا﴾ (۷۶-۲۰) اور بہشت میں (جہاں) آنکھ اٹھاؤ گے، کثرت سے نعمت..... دیکھو گے۔ میں ثَمَّ مفعول واقع ہوا ہے۔^۲

ث م د

ثَمُودٌ: (حضرت صالحؑ کی قوم کا نام) بعض اسے معرب بتاتے ہیں اور قوم کا علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے اور بعض کے نزدیک عربی ہے اور ثَمْدٌ سے مشتق ہے (بروزن فَعُولٌ) اور ثَمْدٌ (بارش کے) تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو جاری نہ ہو۔

اسی سے رَجُلٌ مَثْمُودٌ کا مجاورہ ہے، یعنی وہ آدمی جس میں عورتوں سے کثرت جماع کے سبب مادہ منویہ باقی نہ رہے۔ نیز مَثْمُودٌ اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جسے سوال کرنے والوں نے مفلس کر دیا ہو۔

ث م ر

الْثَّمْرُ: اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جاسکے، اس کا واحد ثَمْرَةٌ اور جمع ثَمَارٌ وَثَمَرَاتٌ

۱ ای ظرف لا یتصرف ۱۲۔

۲ قال ابن هشام وغلط من اعرابه مفعولاً لرأيت في هذا الآية ۱۲۔

۳ وفي النسخ المطبوعة القديمة والكراشي "كلوا من ثمره" مصحف ۱۲۱۲۔

میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا۔
 محاورہ میں: اَثْمَنْتُ الرَّجُلَ بِمَتَاعِهِ وَأَثْمَنْتُ لَهُ
 کے معنی کسی چیز کی زیادہ قیمت دینے کے ہیں۔ اور قیمتی چیز
 کو شئیءٌ ثَمِينٌ کہا جاتا ہے۔
 ثَمَانِيَةٌ: آٹھ (مذکر) ثَمَانُونَ: اسی (مذکر مؤنث)
 الثَّمْنُ آٹھواں حصہ۔

ثَمَنْتُهُ آٹھواں ہونا۔ کسی شخص کے مال سے آٹھواں حصہ
 لینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ﴾
 (۶-۱۳۳) (یہ بڑے چھوٹے چار پائے) آٹھ قسم کے
 ہیں۔ ﴿سَبْعَةٌ وَتَأْمِينُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸-۲۲) وہ
 سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

﴿عَلَىٰ أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَةَ حِجَجٍ﴾ (۲۸-۲۷)
 اس (عہد) پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو۔ الثَّمِينُ:
 بمعنی ثَمْنٌ یعنی آٹھواں حصہ۔ شاعر نے کہا ہے ۱۰ طویل
 (۸۱) فَمَا صَارَ لِي فِي الْقَسَمِ إِلَّا ثَمِينُهَا
 اس مقاسمہ میں میرا آٹھواں حصہ تھا۔

قرآن پاک میں ہے:
 ﴿فَلَهُنَّ الثَّمْنُ مِمَّا تَرَكَتُمْ﴾ (۳-۱۲) تو جو مال تم
 (مرد) چھوڑو تو اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔

ث ن ی

الثَّنِيُّ وَالْإِثْنَانُ: یہ دونوں ان تمام کلمات کی اصل
 ہیں جو اس مادہ سے بنتے ہیں یہ کبھی معنی عدد کے اعتبار سے

کیونکہ وہ بھی اسی طرح چاہے سے نیچے لگتی ہوئی نظر آتی
 ہے، جیسے درخت سے پھل کا گچھا لٹک پڑتا ہے۔
 الثَّمِيرَةُ: مکھن کے بلبے جو دودھ کو بلونے سے اس پر نظر
 آتے ہیں۔ صوری تشابہ کی وجہ سے ان کو ثَمِيرَةُ اللَّبَنِ کہا
 جاتا ہے اور پھر وہ دودھ سے حاصل بھی ہوتا ہے، جیسے پھل
 درخت سے۔

ث م ن

الثَّمْنُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو فروخت
 کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے،
 خواہ وہ زر نقد ہو یا سامان۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمْنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ﴾ (۱۲-۲۰) اور وہ
 اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالا۔ اور وہ
 کچھ جو کسی چیز کے عوض میں حاصل ہو وہ اس کا ثمن کہلاتا
 ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا
 قَلِيلًا﴾ (۳-۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی
 قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی سی
 قیمت حاصل کرتے ہیں۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ (۱۲-۹۵)
 اور خدا سے جو تم نے عہد کیا تھا (اس کو تم بیچو اور) اس
 کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوا بِأَيْتِي ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ (۵-۴۳) اور

۱ قاله يزيد بن الطشرية (والطشرية امه وهو احد الشعراء الذين اشتهروا بامهاتهم واسم ابياها الصمة) واوله: والقيت سهمي
 وسطهم حين اوحشوا والبيت في اللسان (ثمن والاقتضاب ۶۵) في خمسة ابيات وتهذيب الالفاظ ۵۸۹ والدرة مع الحفاجي ۸۹
 وادب الكتاب ۵۷؛ وقبله - ارى سبعة يسعون للوصل كلهم - له عند ليلتي دينة يستدنيها - ومعنى اوحشوا ردوا سهام الميسرفي
 خربطتها والقسم بمعنى المقاسمة ۱۲.

اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی قرأت یثنونٰی صُدُوْرَهُمْ ہے۔
جو اثنونئیث کا مضارع ہے۔ ❶

اور آیت کریمہ: ﴿ثَانِي عَطْفِهِ﴾ (۲۲-۹) (اور تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے۔

میں گردن موڑنے سے مراد تکبر اور اعراض کرنا ہے جیسا کہ لَوٰی سِدْقَهُ وَتَأٰی بِجَانِبِهِ كَمَا حَوَّارُهُ ہے۔ اَلثَّنِي (ایضاً بکری) جو دوسرے سال میں داخل ہو (اونٹ) جس

کے ثنیہ دانت گر گئے ہوں اور اس معنی میں فعل اثنیٰ ہے۔

ثَنَيْتُ الشَّيْءَ اَثْنِيَهُ۔ کسی کو ثنائین رسی کے ساتھ باندھنا۔ یہ غیر مہموز ہے بعض نے اس کے غیر مہموز ہونے

کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ کلمہ ثنیہ ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا واحد ثناء نہیں بولا جاتا۔ ❷

الْمُثَنَّنَاتُ: دوسری رسی۔

الثَّنِيَانُ: سادات کے شمار کے وقت دوسرے درجہ کا سردار۔ ثنِيَةٌ فرومایہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ثَنِيَةٌ اَهْلُ بَيْتِهِ فُلَانُ اپنے اہل میں ثنیہ یعنی سب سے کم مرتبہ ہے۔

ثَنِيَّةٌ: وہ پہاڑ جسے عبور کرتے وقت اوپر چڑھنا اور نیچے

استعمال ہوتے ہیں اور کبھی تکرار معنی کے لحاظ سے جو ان کے اصل مادہ میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں عدد و تکرار دونوں ملحوظ ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثَانِي اَثْنِيْنَ﴾ (۹-۴۰) دو میں دوسرا۔ ﴿اِثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۲-۶۰) بارہ چشمے۔ مَشْنِيٌّ وَثُلُثٌ وَرَبَاعٌ (۳-۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔ کہا جاتا ہے:

ثَنِيَّتُهُ ثَنِيَّةٌ: میں دوسرا تھا، میں نے اس کا نصف مال لے لیا۔ ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا کر دینا۔

اَلثَّنِي: جس کا دوسرا تہا عہد ہو حدیث میں ہے: ❶

لَا اِثْنِي فِي الصَّدَقَةِ یعنی صدقہ سال میں دو مرتبہ نہ لیا جائے۔ شاعر نے کہا ہے ❷ (طویل)

(۸۲) لَقَدْ كَانَتْ مَلَامَتَهَا ثَنِيٌّ "بے شک اس نے بار بار ملامت کی۔" اِمْرَأَةٌ ثَنِيٌّ: جس عورت نے دو

بچے جنے ہوں اس دوسرے بچے کو ثنی کہا جاتا ہے۔

حَلَفَ يَمِيْنًا فِيْهَا ثَنِيٌّ وَتَنَوٰی وَثَنِيَّةٌ وَمَثْنِيَّةٌ اس نے استثناء کے ساتھ قسم اٹھائی۔ ثَنَا (ض) ثَنِيًّا۔ اَلثَّنِيَّةُ کسی چیز کو موڑنا، دوہرا کرنا پلینٹا قرآن پاک میں ہے:

﴿اَلَا اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ﴾ (۱۱-۵) دیکھو یہ

❶ والحديث في الصحاح (ثني) والفاق ۱: ۸۳ والديلمی والنهاية واموال ابی عبید عن علی راجع كنز العمال رقم ۱۹۹۵ و ۱۳۲۲) او غریب ابی عبید/ ۹۸.

❷ قاله كعب بن زهير في امره ته حين لامته في بكر وتكلمة البيت أفي جنب بكر قطعتني ملامة لعمرى والبيت في اللسان (ثني) وديوانه ۱۲۸ والبحر (۷: ۴۳۵) ونسبه الصاحي ۱۳۴ الى اوس بن حجر وجمعه الدكتور محمد يوسف نجم في مختلط شعره راجع ديوانه ۱۴۱ وفي روايته خزاية بدل ملامة وضبطه الجامع بالرفع والصواب النصب على التمييز وفاعل قطعتني امرء ته وقبله وهو مطلع القصيدة: الا بكرت عرسى توائم من لحي - واقرب باحلام النساء من الروي.

❸ راجع ابن كثير ۴۳۶/۲ من اثنوني (افعال) كما حلولي من الحلاوة -

❹ ذكره الجوهري في الصحاح وكذا في النهاية في شرح حديث عمرو بن دينار رأيت ابن عمر ينحر بدنته وهي باركة مشية بشنائب وبعده: قال الاصمعي وان مده ماذ لكان صواباً فنجوز الاصمعي ثنائان كمنقول كسانان لكن النحا اتفقوا على ترك الهمزة في الثنائين وقد روى الزهري باليسط في تهذيبه على من همزة فتدبر ۱۲.

بار اعادہ سے اس کے عجائب و غرائب منقطع نہیں ہوتے اور ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے وصف میں ایک روایت مروی ہے۔ ﴿٥٣﴾ لَا يَبْعُوجُ فَيَقْوَمُ وَلَا يَزِيغُ فَيَسْتَعْتَبُ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ. کہ اس میں کبھی نہیں آئے گی کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے اور نہ اس میں زلیغ پیدا ہوگا کہ اس کا ازالہ کرنا پڑے اور اس کے عجائب و غرائب کبھی منقطع نہیں ہونگے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مثنائی ثناء سے مشتق ہو تو اس سے اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ قرآن پاک سے ہمیشہ ایسے مضامین ظاہر ہوتے رہیں گے جو اس کی، اس کو پڑھنے والوں، اس کا علم حاصل کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کی تعریف کا موجب ہوں گے اور اسی معنی میں قرآن پاک کو آیت: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾ (۵۶-۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔ میں کرم کے ساتھ متعصب کیا ہے اور آیت:

﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ﴾ (۸۵-۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ اس کے وصف میں مجید کا لفظ ذکر کیا ہے۔

الْأَسْتِثْنَاءُ کے معنی کلام میں ایسا لفظ لانے کے ہیں جو پہلے عام حکم سے بعض افراد کی تخصیص یا اس عام حکم کے کلیہ مرتفع ہونے کا فائدہ دے، چنانچہ عموم حکم سے بعض افراد کی تخصیص کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ لَا أَجِدُ فِي

اترنا پڑے گویا دوہرا سفر کرنا پڑ رہا ہے، شکل و صورت اور صلابت کے لحاظ سے پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دے کر سامنے کے چار دانت (دواز فوق دواز تحت) میں سے ہر ایک کو ثنّیۃ کہا جاتا ہے، (جمع ثنایا)

الْتَّنِيَا: (من الجزور) ذبح کیے گئے اونٹ کا سر اور صلب جو قصاب اپنے لیے مستثنیٰ کر لیتا ہے۔^۱ اور ان کو ثنّوی بھی کہا جاتا ہے۔

الْتَّنَاءُ: کے معنی بار بار کسی کی خوبیاں بیان کرنے کے ہیں اور اثنیٰ علیہ کے معنی کسی کی شاکر کرنے کے ہیں۔ تَنَنِي (تفعل) فِي مِثْيَتِهِ: تکبر سے لڑکھڑا کر چلنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ أَتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي﴾ (۸۷-۱۵) اور ہم نے آپ کو سات مثنائی (سورتیں) عطا کیں۔ میں قرآن کی سورتوں کو مثنائی کہا ہے۔^۲ کیونکہ مرور ایام کے ساتھ بار بار ان کا ذکر اور اعادہ ہوتا رہے گا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر آئے گا اور نہ ہی دوسری اشیاء کی طرح یہ زوال پذیر ہیں۔ اسی بنا پر فرمایا: ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ (۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دوہرائی جاتی ہیں۔ اور قرآن پاک کو مثنائی کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بار

۱ و مافی المعاجم من الراس والقوائم و ذکرہ بعضہم معہما لفظ الصلۃ ۱۲.

۲ راجع للبحث علی المثنائی التاج (ثنی) و غریب ابی عبید ۳: ۱۴۵-۱۴۷.

۳ کلمۃ من حدیث طویل فی فضل القرآن راجع المصاحف لابن النباری ک، ۵، ب عن ابن مسعود، ش، و محمد بن نصر (کنز العمال ۱: رقم ۲۳۵۶).

مقصود ہوتی ہے، اس تک پہنچ جانا کے ہیں۔ چنانچہ حکماء کے اس قول اَوَّلُ الْفِكْرَةِ اٰخِرُ الْعَمَلِ میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی آغاز فکر ہی انجام عمل بنتا ہے۔ چنانچہ اول معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔

ثَابَ فُلَانٌ اِلَى دَارِهِ: فلاں اپنے گھر کو لوٹ آیا۔ ثَابَتْ اِلَى نَفْسِي: میری سانس میری طرف لوٹی اور کنوئیں کے منہ پر جو پانی پلانے کی جگہ بنائی جاتی ہے، اسے مَثَابَةٌ کہا جاتا ہے اور غور و فکر سے حالت مقدرہ مقصود تک پہنچ جانے کے اعتبار سے کپڑے کو ثَوْبٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ سوت کا تنے سے غرض کپڑا بننا ہوتا ہے، لہذا کپڑا بن جانے پر گویا سوت اپنی حالت مقصودہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔ یہی معنی ثواب العمل کا ہے۔ اور ثَوْبٌ کی جمع اَثْوَابٌ وَثِيْبٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَتِيَابِكَ فَطَهَّرَ﴾ (۴۷-۴۸) اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ میں بعض نے ثِيَاب سے اس کے حقیقی معنی یعنی کپڑے پاک رکھنا مراد لیا ہے ❶ اور بعض نے کہا ہے کہ ثِيَاب سے (کنایت) نفس مراد ہے ❷ (یعنی نفس کو زائل سے پاک رکھنا مراد ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❸

(طویل)

(۸۳) ثِيَابُ بَنِي عَوْفٍ طَهَارِي نَقِيَّةٌ

کہ بنی عوف کے نفوس پاک و صاف ہیں۔

مَا اَوْحَى اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَيَّ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ مِيْتَةً ﴿ (۶-۱۳۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، میں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا جو اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو۔

اور پہلے کلام کی کلیتہاً نفی جیسے:

وَاللّٰهُ لَا فَعْلَانَ كَذَا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ: میں یہ کام ضرور کروں گا ان شاء اللہ۔

اِمْرًا تَهْ طَالِقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ: اس کی عورت کو طلاق ہے، ان شاء اللہ۔

عَبْدُهُ عَتِيْقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ: اس کا غلام آزاد ہے، ان شاء اللہ۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِذَا قَسَمُوا لِيْضْرَ مِنْهَا مُضِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَشْنُوْنَ﴾ (۶۸-۱۸، ۱۷) جب انھوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے۔ اور ان شاء اللہ نہ کہا۔ میں وَلَا يَسْتَشْنُوْنَ سے بھی یہی مراد ہیں۔

ثَوْب

ثَوْبٌ کا اصل معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آنا کے ہیں یا غور و فکر سے جو حالت مقدر اور

❶ نسبہ ابن کثیر ۴: ۴۴) (الیٰ محمد بن سیرین ورجحہ ابن جریر.

❷ نقل عن ابن عباس واكثر التابعين ويؤيده كلام العرب .

❸ قاله امرء القيس في مدح بني عوف وتمامه : واوجهيم بيض المسافر غران (مفيد القافية من كلمة ۱۶ بيتاً ولا توجد تامة عند غير ابن الانباري ۴۳۶ وفي رواية والسمط ۹۱) يوم الكربيه بدل بيض المسافر والبيت في اللسان والصحاح (ثوب ، غرر) وديوانه ۱۱۵ والعقد الثمين ۱۶۱ وايام العرب ۵۰ وشرح السبع لابن الانباري ۴۶ وفيه عند المشاهد بدل بيض المسافر والمعاني للقبتي ۴۸۵-۸۱ والسيوطي ۱۳۹ والصناعيتين ۳۵۳ ومختار الشعر ۲۳ والعمدة ۱: ۴۸ افي اربعة ابيات والشطر في حواشي تهذيب الالفاظ ۴۸۳ والبحر (۲: ۴۱۶) والشطر الثاني في البحر (۳: ۲۲/۸-۳۷۱).

جزائے بد کے لیے مَثُوبَةً کا بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جزائے خیر کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَآتَقُوا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ﴾ (۲-۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

الْإِثَابَةُ: (افعال) کے معنی بھی جزا دینے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَأَنبَاهَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (۵-۸۵) تو خدا نے ان کو ان کے کہنے کے عوض (بہشت کے) باغ عطا فرمائے، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَأَنبَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّمْ﴾ (۲-۱۵۲) تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا۔ میں بری جزا کو ثواب قرار دینا بطور استعارہ ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

التَّشْوِيبُ: (تفعیل) قرآن پاک میں: لفظ صرف بری جزا کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا: ﴿هَلْ ثَوَابَ الْكُفَّارِ﴾ (۸۳-۲۶) تو کافروں کو پورا پورا بدلہ مل گیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾ (۲-۱۲۵) اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے کی جگہ مقرر کیا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ مَثَابَةٌ کے معنی جائے ثواب کے ہیں اور خانہ کعبہ کو مَثَابَةٌ اِس لیے کہا ہے کہ وہاں ثواب اعمال لکھا جاتا ہے۔ التَّيِّبُ: بیوہ یا مطلقہ عورت کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خاوند سے جدا ہو کر (گویا پہلی حالت کی طرف) لوٹ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَيِّبَاتٍ وَأَبْكَارًا﴾ (۲۶-۵) بن شوہر اور

اسی طہارت نفسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (۲۳-۲۳) (اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

الْثَّوَابُ: انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے۔ اس تصور پر کہ وہ جزا گویا عین عمل ہی ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ (۵۹-۷) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ میں جزا کو نفس عمل ہی قرار دیا ہے اس لیے یہاں يَسْرَ جَزَاءً ہ نہیں کہا حالانکہ مراد یہی ہے۔

گو لغوی اعتبار سے ثَوَابٌ کا لفظ خیر و شروئوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے، لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (۳-۱۹۵) (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

﴿فَأَتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ﴾ (۳-۱۳۸) تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ (دے گا)۔ اسی طرح لفظ مَثُوبَةٌ بھی زیادہ تر جزائے خیر پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذَلِكَ مَثُوبَةٌ عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ﴾ (۵-۱۶۰) کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے والے کون ہیں۔ میں

اس پر حملہ کر دیا۔

الْتَّوْرُ: نیل کیونکہ اس سے زمین جوتی جاتی ہے۔ یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے، جیسا کہ ضَمِيفٌ وَطَيْفٌ بمعنی ضَائِفٌ وَطَائِفٌ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:

سَقَطَ تَوْرُ الشَّفَقِ: یعنی شفق کی سرخی غروب ہوگئی۔
الْتَّوْرُ کے معنی ”خون کا بدلہ“ کے ہیں، یہ اصل میں مہوز لعین ہے اور اس مادہ سے نہیں ہے۔

ثَوِي

الْتَّوَاءُ: (ص) کے اصل معنی کسی جگہ پر مستقل طور پر اقامت کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے: ثَوِي ثَوِي تَوَاءً وہ اقامت پذیر ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَأْوِي فِي أَهْلِ مَدْيَنَ﴾ (۲۸-۳۵)
اور نہ تم مدین والوں میں رہ رہے تھے۔

﴿أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوَى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (۳۹-۶۰)
کیا غرور والوں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے۔

﴿وَالنَّارُ مَثْوَى لَهُمْ﴾ (۳۷-۱۲)
دوزخ ہے۔ ﴿أَدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَبئسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (۷۶-۳۰)

(اب) جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ متکبروں کا کیسا برا ٹھکانا ہے۔

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ﴾ (۶-۱۲۸)
خدا فرمائے گا (اب) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔

مَنْ أُمَّ مَثْوَاكَ (کنایہ) تمہارا میزبان کون ہے۔
الْتَّوِيَةُ: بھیڑ بھریوں کے باڑہ کو کہتے ہیں۔

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

کنواریاں۔ الْتَّوِيَةُ کے معنی بار بار منادی کرنے کے ہیں، اسی سے تَوِيْبُ فِي الْأَذَانِ ہے (یعنی فجر کی اذان میں حَيَعَلْتَيْنِ کے بعد الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہنا)

تَوِيْبَاءُ: (غشی) کیونکہ وہ بھی دورہ کے ساتھ بار بار طاری ہوتی ہے۔

الْتَّوِيَةُ: جماعت کیونکہ اس کے افراد بھی بظاہر ایک دوسرے کی طرف لوٹتے ہیں، قرآن میں ہے: ﴿فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوْ انفِرُوا جَمِيعًا﴾ (۳-۷۱) شاعر نے کہا ہے:

وَقَدْ اغد وعلی ثبة كرام.

ثبة الحوض: حوض کا وسط جس کی طرف پانی لوٹ کر آتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

تَوْر

تَوْر (ن) تَوْرًا وَتَوْرَانًا۔ الغبارُ والسحابُ کے معنی غبار یا بادل کے اوپر اٹھنے اور پھیلنے کے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَثِيرُ سَحَابًا﴾ (۳۰-۳۸) تو وہ بادل کو اوپر اٹھاتی ہیں۔

﴿أَنَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا﴾ (۳۰-۵) انہوں نے زمین کو جوڑنا اور اس کو..... آباد کیا۔

اور غبار کے منتشر ہونے کے ساتھ تشبیہ دے کر تَوْرَاتِ الْحَصْبَةِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی کنکر کے پھیل جانے کے ہیں اور اسی طرح (یعنی مجازاً) تَوْرَ شَمْرًا (شرکی آگ بھڑکانا) کہا جاتا ہے۔

تَوْرَ تَوْرَةً (کنایہ) یعنی وہ غضب ناک ہو گیا۔ تَوْرَةَ

کتاب الجیم

ج و ر

الْجُؤَارُ: (ف) کے اصل معنی وحشیات جیسے ہرن وغیرہ کے گھبراہٹ کے وقت زور سے آواز نکالنے اور چیخنے کے ہیں، پھر تشبیہ کے طور پر دعا اور تضرع میں افراط اور مبالغہ کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْيَوْمِ تَجْتَرُونَ﴾ (۱۶-۵۳) تو تم اسی کے سامنے آہ و گریہ کرتے رہو۔ ﴿إِذَا هُمْ يَجْتَرُونَ﴾ (۲۳-۶۳) تو اس وقت چلا میں گے۔ ﴿لَا تَجْتَرُوا الْيَوْمَ﴾ (۲۳-۶۵) آج مت چلاؤ۔

ج ب ب

الْجُبُّ: کنواں جو پختہ یا لپا ہوا نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْقَوُوهُ فِي غَيْبِ الْجُبِّ﴾ (۱۲-۱۰) کسی گہرے گڑھے میں ڈال دو۔

اور اس کنوئیں کو جُبُّ یا تو اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ جَبُّوب یعنی سخت زمین میں کھدا ہوا تھا اور یا اسلئے کہ وہ گہرا گڑھا سا تھا۔^①

اصل میں الْجَبُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اس کے اصل سے کاٹ دینے کے ہیں، جیسے جَبُّ النَّخْلِ کھجور کو گھا بھا دینا اور زَمَنَ الصِّرَامِ کی طرح زَمَنَ الْجَبَابِ کا محاورہ

بھی مشہور ہے جس کے معنی کھجور کو گھا بھنے کا موسم کے ہیں۔

بَعِيرٌ أَجَبٌ شَرُّ كُوهَانٍ بَرِيدٍ أَوْ نَاقَةٍ جَبَاءٍ جِيسَا كِه مَرْدٍ مَقْطُوعِ الْيَدِ كُورِ جُلِّ أَقْطَعُ كِهَا جَاتَا هِے اُور اِيسِي عَمُورَتِ كُورِ قَطْعَاءُ كِهْتِهِي هِيں۔

مَجْبُوبٌ: وہ مرد جس کا آلہ تناسل جڑ سے قطع کر دیا گیا ہو۔ اسی سے جُبَّةٌ (نوعے از پیرا بن) ہے اور تشبیہ کے طور پر نیزہ کے اس پور کو بھی جُبَّةٌ کہا جاتا ہے جس میں بھلا پیوست ہوتا ہے۔ الْجُبَابُ لُفْكُ شَيْرٍ شَرِّ كِه مَسْكِه مَانِدِ جَبَّتِ الْمَرْءَةُ النِّسَاءَ حُسْنًا: حسن میں برتر ہونا غالب رہنا یہ بھی جُبُّ بمعنی قطع سے مستعار ہے، جیسا کہ منازعت (بحث و مباحثہ) میں غالب ہونے کے لیے قَطَعْتُهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جَبَّجَةٌ جس کے معنی طبل یا چرم میں زنبیل کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ محض اس صوت کی وجہ سے اسے جَبَّجَةٌ کہا جاتا ہے جو اس سے مسومع ہوتی ہے۔

ج ب ت

الْجَبْتُ جَبْتُ اُور جَبْسْتُ اِس دھوون كو كِهْتِهِي هِيں جو كُسي كَام كَانِه اُور اِبْعَضُ نِه كِهَا هِے كِه دَر اَصْلِ جَبْسُ كِه سِيْنِ كُوتَا هِے سِه تَبْدِيلِ كِر لِيَا گِيَا هِے۔ تَا كِه مَعْنِي مَبَالِغِه پَر دِلَالَتِ كِرے۔ شَاعِر نِه كِهَا هِے۔^② (رجز)

① علی اثنی عشر میلامن طبریہ او بین سنجل و نابلس (التاج).

② انشد فی الامالی (۲: ۶۷) ثلاثة اشطار عن القراء: يافق الله نبي السعلات - عمرو بن يربوع شرار النات ليسوا الاعضاء ولا اكيات راجع للشطر النوادر لابی زيد ۲۰ وفيه الاقاتل الله بدل يافتح الله والجمهرة لابن دريد ۳: ۳۳) قال الاستاذ الميمني في طرته على اللاتي والاشعار في القلب ايضاً وراجع ابدال ابى الطيب (۱: ۱۷) واللسان تا، س) والخصائص لابن جنى ۴۵ وسرا الصناعة ۱۱۹ والمخصص لابن سيده ۳: ۳۶) ومبادئ اللغة للاسكاني وتفسير الطبرى (۸: ۲۲۲) والصباحى (۱۰۹) وفيه عمر بن مسعود والمفصل ۲۶۸ والشطر منسوب لعلاء بن ارقم الشكرى كمانى اللامى واللسان (تا) وهو شاعر جاهلى قديم.

تنبیہ کرنا مقصود ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ نے دین کی اصلاح کی ابتداء کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچا دیا کیونکہ فَعَلَ کا صیغہ جس طرح کسی کام کو شروع کرنے کا معنی دیتا ہے اسی طرح اس کے معنی کسی کام کو سرانجام دے کر اس سے فارغ ہو جانا بھی آتے ہیں اور اس سے مبالغہ کے معنی یا تکلف کو ظاہر کرنے کے لیے تَجَبَّرَ (تفعّل) کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿طویل﴾ (۸۵) تَجَبَّرَ بَعْدَ الْأَكْلِ فَهُوَ غِيْضٌ

گھاس چرانے کے بعد دوبارہ ہری ہو گئی ہے۔

پھر جبر کا لفظ کبھی صرف اصلاح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؑ کا قول ہے۔ (۵۳) يَا جَابِرَ كُنْ كَسِيْسِرٍ وَمُسَهِّلٍ كُلِّ عَسِيْرٍ اے ہر شکتہ کی اصلاح کرنے والے اور ہر مشکل آسان کرنے والے اور اسی معنی میں روٹی کو جَابِرِ بن حَبَّة کہا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ کبھی محض استبداد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ آپ علیہ السلام کا فرمان ہے۔ ﴿(۵۵) لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ﴾ کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ کلی طور پر مختار۔ علم ریاضی کی اصطلاح میں الجبر کے معنی ہیں کسی چیز کی

(۸۴) عمرو بن یربوع شرار النَّاتِ یعنی عمرو بن یربوع تمام لوگوں سے ناکام ہے۔ نیز ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے وہ جَبْتٌ کہلاتی ہے اور ساحر کا ہن کو بھی جَبْتٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْجَبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ (۴-۵۱) کہ بے اصل باتوں اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

ج ب ر

الْجَبْرِ: اصل میں جبر کے معنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے جَبْرَةٌ (ن) فَالْجَبْرُ وَالْجَبْرَةُ: بعض نے جَبْرَةٌ فَجَبْرٌ بھی نقل کیا ہے، یعنی جَبْرٌ غُضْلٌ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿(رجز)﴾ (۸۵) قَدْ جَبَرَ الدِّيْنَ اِلَالَهُ فَجَبْرٌ

یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کو درست کیا تو وہ درست ہو گیا۔

یہی قول اکثر ائمہ لغت کا ہے، لیکن بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں فَجَبْرٌ (افعال) یعنی لازم نہیں ہے بلکہ متعدی ہے اور تکرار سے اصلاح اور اس کی تکمیل پر

- ① نصف مطلع من ارجوزة العجاج في نحو مائتي اشطار وهي موقوفة مفيدة بمدح بهما عمر بن عبد الله بن معمر وكان عبد الملك وجهه لقتال ابي فديك البخارجي فاق به و باصحابه فذالك ذكر الجبار الدين وبعده: وعور الرحمن من ولي العور وقد جمع الشعاعيين اللزوم والواقع راجع له الخزانة ۱: ۱۰۳ و الطبری ۶: ۱۷۴ (العمدة ۱: ۸۹) واصلاح يعقوب ۲۸۸) واللسان (جبر) والاقطاب ۴۰۷.
- ② قاله امرء القيس في قصيدة ۲۵ بيتا مطلعها: أمن ذكر سلمى اذ تأتلك تنوص. فتقتصر عنها خطوة وتبوص و صدر البيت: وياكلن من قول عامر وربة وفي رواية الديوان نميص بدل غيض (كما في بعض الطباعة) وهو مصحف والتصويب من المراجع وهي موافقه لهافى اللسان (جبر، نمص) قال السند بي ونميص ذاهب الشعروفي اللسان: النميص: النبات حين طلع ورقه راجع للبيت اللسان (جبر) والعقد الثمين ۱۳۷ وديوانه ۷۸ (صناعة السند وبي) والجمهرة لابن دريد ۳: ۸۹) وابدال ابي الطيب ۲: ۳۸۸) وغريب ابي عبيد ۱: ۱۶۶.
- ③ ورد عن علي موقوفا في خطبة طويته انظر (حل) كنز العمال رقم ۱۵۶۸ رواه الشافعي.

ضدی نامراد رہ گیا۔

﴿وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ (۱۹-۳۲) اور

مجھے سرکش اور بد بخت نہیں بنایا۔

﴿إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ﴾ (۵-۲۲) وہاں تو بڑے

زبردست لوگ (رہتے) ہیں۔

﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُنْكَرٍ

جَبَّارٍ﴾ (۴۰-۳۵)..... اسی طرح خدا ہر منکر سرکش

کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

یعنی جو شخص قبول حق اور اس پر ایمان لانے سے بالاتر

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کبھی کبھی محض دوسرے پر استبداد کرنے والے کو جَبَّارِ کہا

جاتا ہے، اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ﴾ (۵۰-۴۵) اور تم ان

پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔

اور ہمسروں پر تَعَلَّىٰ کے معنی کے لحاظ سے بلند کھجور یا

اُونٹنی کو جَبَّار کہا جاتا ہے اور جو حدیث میں آیا ہے ①

ضُرَّاسُ الْكُفَّارِ مِثْلُ أَحَدٍ وَكَشَافَةُ جِلْدِهِ

أَرْبَعُونَ ذِرَاعًا بِذِرَاعِ الْجَبَّارِ کہ دوزخ میں کافر کی

ڈاڑھ کا حجم مثل احد کے ہوگا اور اس کی کھال کی کثافت

اصلاح کے لیے اس کے ساتھ کچھ الحاق کر دینا اور الْعَجِبُ

بمعنی بادشاہ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ②

(۸۷) وَأَنْعَمُ صَبَاحًا أَيُّهَا الْعَجِبُ

کہ اے بادشاہ سلامت! تم خوش رہو۔

بادشاہ کو جبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کے

مطابق لوگوں کو مجبور کر لیتا ہے یا اس لیے کہ وہ ان کے

امور کی اصلاح کرتا ہے۔

الْإِجْبَارُ: (افعال) اس کے اصل معنی کسی کو مجبور کرنا کہ وہ

دوسرے کی اصلاح کرے۔ لیکن عرف میں محض اکراہ کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے أَجْبَرْتُهُ عَلَى كَذَا

(کسی کام پر مجبور کرنا) اور جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ

تعالیٰ انسان کو گناہ پر مجبور کرتا ہے، انھیں متکلمین کی اصلاح

میں مُجْبِرَةٌ کہا جاتا ہے اور متقدمین انہیں جَبْرِيَّة یا

جَبْرِيَّة کہتے ہیں۔ ③

الْجَبَّارُ: انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں

ناجائز تَعَلَّىٰ سے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرنا۔

بدیں معنی اس کا استعمال بطور مذمت ہی ہوتا ہے۔ جیسے

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ﴾ (۱۳-۱۵) تو ہر سرکش

① قاله ابن احمر واوله : واسلم بر اووق حيث به قال ابن جنى ولم يسمع بالجبر الملك الا فى شعر ابن احمر والبيت فى اللسان

(جبر) والمعانى للقبتي ٤٥٥ قال والجبر الرجل اصله سريانى .

② خلاف القدرية قال الحافظ فى التفسير وهو طريق متعلمى الشافعية وفى البصائر وهذا قول المقتدمين وامانى عرف المتكلمين

فيقال لهم المحيرة (كذا فى التاج) ابو عبيد هو كلام مولد وهم فرقة اهل اهواء منسوبون الى شيخهم الحسين بن محمد النجار البصرى

(فى التاج) قلت هو ابو عبد الله الحسين بن محمد بن عبد الله النجار وكان جملة المحيرة ومتكلميهم وله مع النظام محالس

ومناظرات وله كتب فى القضاء والقدر وراجع الفهرست لابن النديم ٢٥٤ والجواهر لمضيه ١٦٤ وايضاً التبصير ص ٦١ .

③ فى رواية الترمذى عن ابى هريرة اثنا واربعون ذراعاً وليس فيه ذكر ذراع الجبار وفى مسند احمد من حديث ابى عمر سبعون

ذراعاً وامالفة ضرس الكافر مثل احد فرواه مسلم وفيه غلظ جلده مسيرة ثلاث راجع تخريج الاحياء للعراقى ٤ : ٥٣٣) وذكر ذراع

الجبار ورد فى الفائق ١ : ٨٦ وفيه وكان هذا الملك من ملوك العمم تام الذراع وكذا قال القبتي (راجع التاج).

جبار کے چالیس ذراع کے برابر ہوگی..... تو اس حدیث کی

تفسیر میں ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ یہاں جَبَّار سے مراد بادشاہ ہے اور اس ذراع کو ذِرَاعُ الشَّاةِ کہا جاتا تھا۔^①

اور جب الجبار باری تعالیٰ کی صفت ہو، جیسے فرمایا: ﴿الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ (۵۹-۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔ تو اس کے اشتقاق میں اہل لغت سے دو قول منقول

ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَبَّرْتُ الْفَقِيرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی فقیر کی حالت کو درست کرنے

اور اسے بے نیاز کر دینا کے ہیں اور باری تعالیٰ بھی چونکہ اپنے فیضانِ نعمت سے لوگوں کی حالتیں درست کرتا اور ان

کے نقصانات پورے فرماتا ہے، اس لیے اسے الْجَبَّار کہا جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے سامنے مقہور کر لیتا ہے، اس لیے اسے الْجَبَّار کے نام

سے پکارا جاتا ہے۔

لیکن بعض ارباب لغت نے بحیثیت لفظ اور صیغہ کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے کہ أَفَعَلْتُ سے صِيغَةُ فَعَّالٍ

(مبالغہ) قیاساً نہیں آتا۔ لہذا الْجَبَّار کا صیغہ اجبار (افعال) سے نہیں بن سکتا۔^② لیکن اس کا جواب یہ ہے

کہ یہ جَبَّرَ سے بنا ہے نہ کہ اجبار سے اور جَبَّرَ کے معنی بھی مجبور کرنا آ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے^③

لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيضَ. (کہ نہ مجبور کرنا ہے اور نہ

سونپ دینا)

اور معتزلہ کی ایک جماعت نے معنوی لحاظ سے

اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ بندوں کو مجبور کرے، حالانکہ یہ کوئی

قابل اعتراض بات نہیں ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (تکوینی طور پر) بندوں کو بہت سی زنجیروں میں

جکڑ رکھا ہے جن سے رہائی پانا ان کے اختیار سے باہر ہے اور جبر کے یہ معنی مقتضائے حکمت الہیہ کے عین مطابق

ہیں نہ کہ اس کے خلاف جیسا کہ جاہل اور گمراہ لوگوں کا خیال ہے، مثلاً مرض، موت بعث بعد از موت وغیرہ۔ اسی

طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خاص صنعت اور اعمال و اخلاق میں کوئی طریقہ اختیار کرنے پر مسخر کر رکھا ہے اور

اسے مجبور بصورت مختار بنایا ہے کہ ہر انسان جس دھن میں لگا ہے اس میں لگن ہے یا اس سے بیزار ہے لیکن بادل

نخواستہ اسے کیا چلا جا رہا ہے کہ گویا اس کے بدلہ میں کوئی اور کام اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:

﴿فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبْرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ (۲۳-۵۳) تو پھر آپس میں اپنے

کام کو متفرق کر کے جدا جدا کر دیا جو چیز جس فریقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہو رہا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۳۳-۳۲) ہم نے ان میں ان کی میشت کو

① وکذا فی التاج (حبر).

② قاله القتيبي كما في التاج وجوزه الفراء وقال: لم اسمع فقال الامس افعل الانى حرفين وهو جبار من اجبرت ودرآك من ادرکت وايضاً وافقه الازهرى.

③ قد مر الآن تحريجه وايضاً الشاهد في ارجوزة العجاج وسياتي من قول عليّ.

ج ب ل

دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

الْجَبَلُ: پہاڑ۔ جَاجِبَالٍ وَجِبَالٍ
قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ نَجَعَلْنَا الْأَرْضَ مَهْدًا
وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا﴾ (۷۸-۷۶، ۷۷) کیا ہم نے
زمین کو چھوٹا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو (اس کی) میخیں
(نہیں) ٹھہرایا؟
﴿وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا﴾ (۷۹-۳۲) اور اس پر
پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔

اس معنی میں الْجَبَّارُ اللہ تعالیٰ کی صفت ہونا ظاہر ہے،
کیونکہ اگر وہ کسی پر جبر کرتا ہے تو اقتضائے حکمت کے
مطابق کرتا ہے، جیسا کہ حضرت علیؑ سے مروی ہے ①
(۵۶) يَا بَارِيَّ الْمَسْمُوكَاتِ وَجَبَّارِ الْقُلُوبِ
عَلَىٰ فِطْرَتِهَا شَقِيهَا وَسَعِيدِهَا . کہ اے روحوں کو
پیدا کرنے والے اور دلوں کو ان کی اچھی یا بری فطرت پر
جوڑنے والے۔

﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ
أَلْوَانُهَا﴾ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ
رنگوں کے قطعات ہیں۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلوں کو علم و عرفان کے لحاظ سے ان کی
اصلی فطرت پر جوڑ دیا ہے اور یہ ماتقدم کے عموم میں داخل
ہے۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي
نَسْفًا﴾ (۲۰-۱۰۵) اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں
دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اللہ ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔
﴿وَتَسْحُتُونَ مِنَ الْجِبَالِ الْيُنُوتَا فَارْهِنِي﴾
(۲۶-۱۳۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر
گھر بناتے ہو۔

الْجَبْرُوتُ: (قدرت) طاقت، عظمت۔ یہ تجبر
(تفعل) سے فَعْلُوْتُ کے وزن پر ہے۔
إِسْتَجَبْرْتُ حَالَهُ، میں نے اس کی حالت درست
کرنے کے لیے اس کی دیکھ بھال کی۔

اور پہاڑ کی مختلف صفات کے اعتبار سے استعارۃً ہر صفت
کے مطابق اشتقاق کر لیتے ہیں، مثلاً معنی ثبات کے اعتبار
سے کہا جاتا ہے۔ قُلَانٌ جَبَلٌ لَا يَتَزَحَّزَحُ . کہ فلاں
نہ ہلنے والا پہاڑ ہے۔ جَبَلَهُ اللَّهُ عَلَى كَذَا . اس کی
فطرت ہی ایسی ہے، یعنی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ قُلَانٌ ذُو
جَبَلِيَّةٍ . فلاں بھدے جسم کا ہے۔ تَوْبٌ جَبَلِيَّةٌ

أَصَابَتْهُ مُصِيبَةٌ لَا يَجْتَبِرُ: اسے اتنی بڑی مصیبت پہنچی
کہ وہ اس کے جبر کا قصد نہیں کر سکتا۔ اور جَبْرُ الْعَظْمِ
(ہڈی کو جوڑنا) الْجَبِيْرَةُ سے مشتق ہے، جس کے معنی
اس پٹی کے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اور
الْجَبَارَةُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی
جاتی ہے۔ الْجَبِيْرَةُ کی جمع الْجَبَائِرُ آتی ہے۔ نیز تشبیہ
کے طور پر کنگن اور بازو بند کو بھی جَبَارَةُ کہا جاتا ہے اور
الْجَبَارُ جس کی دیت ساقط ہو۔ ②

① وفي الفائق ۱: ۹۳ عن سلامة الكندي كان عليّ يعلّمنا الصلوة على النبيّ ونقله بتمامها قريباً في سبعة اسطر.

② ومنه في الحديث المعدان جبار والبئر جبار والعجماء جبار۔ ای المرح والدم في هذه الثلاثة هدر لا يارشق فيها هذا وفي المطبوع من الارض مكان من الارض مصحف والتسديد من المراجع ۱۲.

الْجِبْنُ: (بزولی) دل کا ایسے موقع پر کمزوری کا اظہار کرنا جہاں اسے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ جَبَانٌ: بزول (مذکورہ مؤنث) اَجْبَتْهُ بزول پانا کسی پر بزولی کا حکم لگانا۔ الْجَبْنُ (ایضاً) پیڑ تَجَبَّنَ اللَّبْنُ: دودھ پیڑ بن گیا یا پیڑ کی طرح جم گیا۔

ج ب ہ

الْجَبْهَةُ: (ماتھا، پیشانی) سر کا وہ حصہ جو سجدہ کی حالت میں زمین پر لگتا ہے، اس کی جمع جِبَاهٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَتَكْوِي بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ﴾ (۹-۳۵) پھر ان سے ان (بخیلوں) کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو دانا جائے گا۔

اور جَبْهَةٌ کے معنی ثریا ستارہ کے بھی آتے ہیں۔ گویا وہ بھی برج اسد کے لیے بمنزلہ پیشانی کے ہے۔ جَبْهَةُ الْقَوْمِ: سرداران قوم جیسا کہ انھیں وُجُوهُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے اور جَبْهَةُ کے معنی گھوڑے بھی آتا ہے، جیسا کہ مروی ہے ﴿۵۷﴾ أَنَّهُ لَيْسَ فِي الْجَبْهَةِ صَدَقَةٌ. یعنی گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

ج ب ی

جَبِيٌّ: (ض) جَبَايَةٌ، الْمَاءُ فِي الْحَوْضِ: حوض میں پانی جمع کیا اور بڑے حوض کو جَبَايَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع جَوَابٍ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

عمدہ اور مضبوط بنا ہوا کپڑا۔

اور بڑائی و عظمت کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے بڑی جماعت کو جَبَلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا﴾ (۶۲-۳۶) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

ایک قرأت میں جُبَلًا تشدید کے ساتھ ہے۔ تَسْوِزِي نے کہا ہے کہ جُبَلًا وَجَبَلًا وَجَبَلًا وَجَبَلًا کے ایک ہی معنی ہیں۔ ۱

اور دوسرے علماء نے کہا ہے جِبِلَّةٌ کی جمع ہے اور اسی سے آیت: ﴿وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأُولِينَ﴾ (۲۲-۱۸۳) میں جبلة سے مراد ان کے وہ احوال ہیں جن پر ان کو پیدا کیا تھا اور وہ راستے جن پر چلنے کے وہ فطرۃ پابند تھے۔ جس کی طرف آیت کریمہ: ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾ (۱۷-۸۳) کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جَبَلٌ فَلَانٌ فلاں پہاڑ کی طرح غلیظ الخس ہے۔

ج ب ن

الْجَبِينُ: پیشانی کا کنارہ۔ اور پیشانی کے دونوں طرف کے کناروں کو جَبِينَانٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ﴾ (۳۷-۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹالیا۔

۱) فیہ اربع قراءت جبالاً نسبة الضبرى الى روح وزيد وقال هو قراءة الحسن والاعرج والزهرى راجع الطبرسى ۲۳: ۳۴ التفسیر للدانی ۸۴ او توزی ہوا ابو محمد عبداللہ بن محمد التوزی من علماء البصرة - (۲۳۰) راجع البغیہ ۲۹۰ والابانہ ۲: ۱۲۶۔
۲) وفى الفائق ۱: ۸۶ وسمیت بذلك لانها خياها اليها والمحدث باختلاف الفاظه فى (البيهقى عن ابى هريرة والحاكم فى امكنى عن الحسن عن عبدالرحمن بن سمره وفى مراسله والبيهقى ايضا عن الحسن مرسلًا وابو عبيد فى غريبه راجع لتخريجه (بخيل).

(۶-۸۷) ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔

﴿ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ﴾ (۲۰-۱۲۲)
پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔

﴿يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ﴾ (۳۲-۱۳)
جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے، اسے اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے۔

اس اجتباء کو دوسرے مقام پر اخلاص سے تعبیر فرمایا ہے۔
﴿إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ﴾ (۳۸-۴۶)
ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

ج ث ث

جَثَّةٌ (ن) جَثًّا کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں اور اِنْجَثَّ اس کا مطاوع آتا ہے، جیسا کہ جَسَّ کا مطاوع اِنْجَسَّ آتا ہے قرآن پاک میں ہے ۱
﴿اجْتَسَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ﴾ (۱۳-۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔
الْمُجْتَثَّةُ: ہر وہ آلہ جس سے درخت کو اکھاڑا یا کھودا جائے۔

جَبَّئَةُ الشَّيْءِ کے معنی کسی کے ابھرے ہوئے شخص کے ہیں اور اَلْجُبْتُ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے، جو زمین سے بلند ہو جائے، جیسے ٹیلہ وغیرہ۔

﴿وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ﴾ (۳۴-۱۳) اور لگن جیسے بڑے بڑے حوض۔ اور اسی سے بطور استعارہ جَبَّيْتُ الْخَرَاجَ جَبَايَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی مال خرچ جمع کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يُجْبَىٰ إِلَيْهِ نَمْرُتٌ كُلُّ شَيْءٍ﴾ (۲۸-۵۷)
جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔

الْاجْتِبَاءُ: (انتقال) کے معنی انتخاب کے طور پر کسی چیز کو جمع کرنے کے ہیں۔ لہذا آیت کریمہ: ﴿وَإِذَا لَمْ تَأْتِيهِمْ بَايَةٌ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا﴾ (۷-۲۰۳) اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنی طرف) سے کیوں نہیں بنائی۔ میں لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا کے معنی یہ ہوں گے کہ تم خود ہی ان کو تالیف کیوں نہیں کر لیتے، دراصل کفار یہ جملہ ظنوا کہتے تھے کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ بلکہ تم خود ہی اپنے طور بنا لیتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اسے اپنے فیض کے لیے برگزیدہ کر لیتا ہے، جسے گونا گوں نعمتیں جدوجہد کے بغیر حاصل ہو جاتی ہیں، یہ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے اور صدیقیوں اور شہیدوں کے لیے جو ان کے قریب درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ﴾ (۱۲-۶) اور اسی طرح خدا تمہیں برگزیدہ (وممتاز) کرے گا۔

﴿فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (۶۸-۵۰)
پھر پروردگار نے ان کو برگزیدہ کر کے نیکوکاروں میں کر لیا۔
﴿وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

۱. وفي الحديث قال رجل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ما هذه الکساءة الا اشجرة التی اجثت من فوق الارض فقال لایل (من المن) (التاج) ۱۲.

ج ح د

جَحَدًا (ف) جَحَدًا وَجُحُودًا: (جان بوجھ کر انکار کر دینا) کے معنی دل میں جس چیز کا اقرار ہو، اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اقرار کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ﴾ (۱۳-۲۷) اور ان سے انکار (کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے۔ ﴿بِأَيَّتِنَا يَجْحَدُونَ﴾ (۷-۵۱) اور ہماری آیتوں سے منکر ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ جَحْدٌ یعنی کنجوس اور قلیل الخیر آدمی جو فقر کو ظاہر کرے۔

أَرْضٌ جَحْدَةٌ: خشک زمین جس میں روئیدگی نہ ہو۔ محاورہ ہے: جَحْدًا لَّهُ وَنَكْدًا. (اسے خیر حاصل نہ ہو) أَجْحَدًا. (افعال) انکار کرنا۔ منکر ہونا۔

ج ح م

الْجَحْمَةُ: آگ بھڑکنے کی شدت اسی سے الْجَحِيمُ (فعلیل) ہے، جس کے معنی دوزخ یا دہشتی ہوئی آگ کے ہیں۔ اور جَحْمَةُ النَّارِ سے بطور استعارہ جَحْمٌ (س) وَجْهُهُ مِنْ شِدَّةِ الْغَضَبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی غصہ سے چہرہ جل بھن جانے کے ہیں، کیونکہ غصہ کے وقت بھی حرارت قلب بھڑک اٹھتی ہے، کہا جاتا ہے:

جَحْمٌ (ف) (أ) أَسَدٌ بِعَيْنَيْهِ شِرْكِي آنکھیں بھی آگ

الْجَحِيثَةُ: کھجور کا پودا جو اکھاڑ کر لگایا گیا ہو۔
الْجُجَجَاتُ: ایک قسم کا گھاس۔ ایک کڑوا خوشبودار زرد درخت جس میں بابونہ کی طرح پھول ہوتے ہیں۔

ج ث م

جَثَمٌ (ض ن) جَثْمًا وَجَثْوَمًا: الطائر پرند کا زمین پر سینہ کے بل بیٹھنا اور اس کے ساتھ چٹ جانا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر فرمایا: ﴿فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ﴾ (۷-۹۱) اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔
الْجُثْمَانُ: بیٹھے ہوئے انسان کا شخص۔ رَجُلٌ جُثْمَةٌ وَجَثْمَةٌ بہت سونے والا ست آدمی۔

ج ث و

جَثًا (ن) جُثْوًا وَجَثِيًّا. الرَّجُلُ: گھٹنوں کے بل بیٹھنا یہ عَتَا (ن) عَتَوًا وَعَيْتًا کی طرح (باب نصر سے آتا ہے) جَاثٍ (صیغہ صفت) جُثِيٌّ جِيسَ بَاكٍ وَبِكِيٍّ. اور آیت کریمہ:
﴿وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جَثِيًّا﴾ (۱۹-۷۲) اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔ میں جَثِيًّا، جَاثٍ کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور مصدر بمعنی اسم فاعل بھی اور آیت کریمہ: ﴿وَنَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً﴾ (۲۵-۲۸) اور تم ہر ایک فرقے کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوگا۔ میں ”جَاثِيَةً“ جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے: جَمَاعَةٌ قَائِمَةٌ أَوْ قَاعِدَةٌ

۱ فی الطبوع ”بعد طحنه“ مصحف والصحيح بعد قلعه كما في المعاجم.

میں جَدُّ کا واحد جُدَّةٌ ہے، جس کے معنی کھلے راستہ کے ہیں اور یہ طَرِيقٌ مَجْدُوْدٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ راستہ جس پر چلا جائے، اسی سے جَادَةُ الطَّرِيقِ ہے، (جس کے معنی شاہراہ یا ہموار اور راستہ کے درمیان حصہ کے ہیں، جس پر عام طور پر آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔)

الْجَدُّوْدُ وَالْجَدَاءُ: خشک تھنوں والی بھیڑ بکری اور سب و شتم کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جُدُّ نُدَى اُمِّہِ اس کی ماں کے پستان خشک ہو جائیں اور جَدُّ کا لفظ فیض الہی پر بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَأَنَّهُ تَعَالَى جَدُّ رَبِّنَا﴾ (۲-۳) اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا فیضان بہت بڑا ہے۔

میں جَدُّ بمعنی فیض الہی ہی کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت کے ہیں ۱ لیکن اس کا مرجع بھی معنی اول کی طرف ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اختصاص ملک کے طریق سے ہے اور حظوظ دنیوی جو اللہ تعالیٰ انسان کو بخشتا ہے پر بھی جَدُّ کا لفظ بولا جاتا ہے، جس کے معنی بخت و نصیب کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: جُدِّدْتُ وَحَظِّدْتُ خوش قسمت اور صاحب نصیب ہو گیا اور حدیث (۵۸) وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی مال و جاہ سے آخرت میں ثواب حاصل نہیں ہو سکے گا، بلکہ آخری ثواب کے حصول کا ذریعہ صرف طاعت الہی ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿مَنْ كَانَ يَرْيِدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا

کی طرح روشن ہوتی ہیں۔

ج د د

الْجَدُّ: (مصدر) اصل معنی ہموار زمین پر چلنے کے ہیں۔ اسی سے جَدَّ فِي سَبِيلِهِ ہے جس کے معنی تیز روی کے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے معاملہ میں محنت اور جانفشانی سے کام کرے تو کہا جاتا ہے: جَدَّ فِي أَمْرِهِ اور أَجَدَّ (افعال) کے معنی صاحب جد ہونے کے ہیں اور جَدَّدْتُ الْأَرْضَ سے کسی چیز کو کاٹنے کا معنی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جَدَّدْتُهُ (میں نے درست کرنے کے لیے اسے کاٹا) اور نَسَبٌ جَدِيدٌ کے اصل معنی قطع کیے ہوئے کپڑا کے ہیں اور چونکہ جس کپڑے کو کاٹا جاتا ہے وہ عموماً نیا ہوتا ہے، اس لیے ہرنی چیز کو جَدِيدٌ کہا جانے لگا ہے اس بنا پر آیت: ﴿بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (۵۰-۱۵) میں خلق جدید سے نشاۃ ثانیہ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونا مراد ہے، کیونکہ کفار اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے:

﴿ءَا إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ﴾ (۵۰-۳) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو پھر زندہ ہوں گے؟) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے۔ اور جدید (نیا) خلق یعنی پرانا کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، اس اعتبار سے رات دن کو جَدِيدٌ اور أَجَدُّ ان کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَّدٌ بَيْضٌ﴾ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں پر سفید رنگ کے قطعات ہیں۔

۱ راجع غریب القرآن للقتبی ۱۹۔ اخرجه مسلم فی صحیحہ ۱: ۹۰ من حدیث ابی سعید الخدری (ابن عباس) (باب الدعاء بعد الرکوع) والنسائی عن معاویة: ما یقول اذا انصرف من الصلوة کثر العمال ۲: رقم (۲۰۸۹) ۱۲۔

جَدَفُ بھی کہا جاتا ہے۔^۱

جِذْر

الْجِذَارُ کے معنی حَائِط (دیوار) ہی کے ہیں، لیکن اس اعتبار سے کہ وہ زمین سے اونچی اور بلند ہوتی ہے، اسے جِذَار کہا جاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اسے حَائِط کہا جاتا ہے۔ جِذَار کی جمع جُذُر آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ﴾ (۱۸-۸۲) اور وہ جو دیوار تھی سودو ویتیم لڑکوں کی تھی۔

﴿جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقُصَ فَاَقَامَهُ﴾ (۱۸-۷۷) ایک دیوار (دیکھی) جو (جھک کر) گرا چاہتی تھی۔ خطر نے اس کو سیدھا کر دیا۔

﴿أَوْ مِنْ وَّرَاءِ جُدِرٍ﴾ (۵۹-۱۳) یاد دیواروں کی اوٹ میں۔ اور حدیث پاک میں ہے ﴿(۵۹) حَتَّى يَبْلُغَ الْمَاءُ الْجُدْرَ﴾ (جب تک کہ پانی دیواروں تک نہ پہنچ جائے۔)

جَدَرَتِ الْجِدَارُ: دیوار کو اونچا کر دیا۔

اور اس میں معنی ارتفاع کے اعتبار سے جَدَر الشَّجَرُ کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں، چنے کے دانے کی طرح درخت کے کوپل نکل آئے اسی طرح وہ روئیدگی جو زمین پر ظاہر ہو۔ اسے جِذْر کہا جاتا ہے، اس کا واحد جِذْرَةٌ ہے اور أَجْدَرَاتِ الْأَرْضِ کے معنی ہیں زمین

نَشَاءً ﴿ کے بعد فرمایا:

﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾ (۱۷-۱۹) اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوششیں کرے۔ جتنی اسے لائق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ (؟.....؟) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔

الْجَدُّ (ایضاً) دادا۔ نانا۔

بعض نے کہا ہے کہ لَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ کے معنی یہ ہیں کہ اسے آبائی نسب فائدہ نہیں دے گا اور جس طرح کہ آیت: ﴿لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ میں اولاد کے فائدہ بخش ہونے کی نفی کی ہے، اسی طرح حدیث میں آباؤ اجداد کے نفع بخش ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

جَدَث

جَدَثٌ: قبر۔ ج: أَجْدَاثٌ۔ قرآن میں ہے:

﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ (۷۰-۴۳) اس دن یہ قبر سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے۔

اور سورہ یٰسین میں ہے: ﴿فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَى رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ﴾ (۳۶-۵۱) یہ قبروں سے (نکل کر) اپنے پروردگار کی طرف دوڑیں گے۔ اور قبر کو

۱ راجع کتاب الابدال لابی الطیب ۱: ۱۹۲۔

۲ قال صلى الله عليه وسلم في شراج الحرة حين اختصم اليه الزبير بن العوام وحاطب بن ابي بلتمه فقال يا زبير اسق ثم ارسل الماء الى حارك فغضب الانصاري وقال: ان كان ابن عمك فقال صلى الله عليه وسلم اسق يا زبير ثم احبس الماء حتى يرجع الى الحدرد الحديث والكشاف ۱: ۲۷۸) وابن ابي الجاتم عن سعيد بن المسيب وفي الصحيحين من طريق الزهري عن عروة (راجع تخریج الكشاف ۴۵ رقم ۷۲ وغریب ابي عبيد ۴: ۲۰۱ والفائق ۱: ۶۵۲)۔

سبزہ زار ہوگئی۔

الْمَجْدَلُ: مضبوط محل۔

اسی سے اَلْمَجْدَلُ (جھگڑنا) ہے، کیونکہ جھگڑنے والے بھی ایک دوسرے کو اس کی رائے سے اس طرح پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسی کو پتھریا دیا جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اصل میں جَدَال کے معنی صِرَاع یعنی ایک دوسرے کو جِدَالَة یعنی سخت زمین پر پھچاڑ دینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَادِلْهُمْ بَالِئْسَىٰ هِيَ أَحْسَنُ﴾ (۱۶-۱۲۵) اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔ ﴿الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِی آيَاتِ اللّٰهِ﴾ (۳۵-۳۰) جو لوگ..... خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

﴿وَإِنْ جُدَلْتُمْ فَقُلْ اللّٰهُ اَعْلَمُ﴾ (۲۲-۶۸) اور اگر یہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ..... اللہ ان سے خوب واقف ہے۔

﴿قَدْ جَدَلْنَا فَاكْثَرْتَ جِدَالِنَا﴾ (۱۱-۳۲) تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا۔ ایک قرأت میں جَدَلْنَا بھی ہے۔

﴿مَا ضَرَبُوهُ لَكَ اِلَّا جَدَالًا﴾ (۲۳-۵۸) انھوں نے (عیسیٰ کی) جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (۱۸-۵۴) لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑا لہو ہے۔

﴿وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِی اللّٰهِ﴾ (۱۳-۱۳) اور وہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

﴿يُجَادِلُنَا فِی قَوْمِ لُوطٍ﴾ (۱۱-۷۴) وہ قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے۔

جَدِر (ن) الصَّبِيُّ وَجَدِرٌ (بچے کو چپک نکل آئی) یہ محاورہ درخت کے کوئیل کے ساتھ تشبیہاً بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَدْرِيُّ وَالْجَدْرَةَ کے معنی عدو یا آبلہ کے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتا ہے، اس کی جمع اَجْدَارٌ ہے۔ شَاةٌ جِدَارٌ گو سپند آبلہ زدہ۔

اَلْجَدِيدُ کوتاہ قد۔ یہ بھی جدار سے مشتق ہے، لیکن بطور تحکم اس میں یا زائدہ کر دی گئی ہے۔ حقارت کو ظاہر کرنے کے لیے اس میں یا بڑھادی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی کتاب ”اصول الاشتقاق“ میں بیان کر چکے ہیں۔

اَلْجَدِيدُ: (سزاوار) اس کے معنی منہی کے ہیں۔ کیونکہ اس تک کسی امر کی انتہا ہوتی ہے۔ جیسا کہ دیوار تک پہنچ کر کوئی چیز رک جاتی ہے اور جَدِر (ك) بَکْدَا کے معنی کسی چیز کے لائق ہونے کے ہیں۔ اس سے صیغہ صفت جَدِيدٌ آتا ہے۔

مَا اَجْدَرَهُ وَاَجْدِرُ بِهِ: (صیغہ تعجب) وہ اس کے لیے کس قدر زیبا ہے۔

جدل

اَلْجِدَالُ: (مفاعلة) کے معنی ایسی گفتگو کرنا کے

ہیں، جس میں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں، اصل میں یہ جَدَلْتُ الْحَبْلُ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں رسی کو مضبوط بنا، اسی سے بٹی ہوئی رسی کو اَلْجَدِيلُ کہا جاتا ہے۔ جَدَلْتُ الْبِنَاءَ: مضبوط عمارت بنانا۔ دِرْعٌ مَجْدُوْلَةٌ مضبوط ترہ۔

اَلْاَجْدَلُ شُكْرًا کیونکہ اس کا بدن بھی گٹھا ہوا ہوتا ہے۔

ج ذ و

الْجَدْوَةَ وَالْجَدْوَةَ: (انگارہ) جلے اور شعلہ ختم ہو جانے کے بعد جو ایندھن باقی رہ جاتا ہے، اسے جَدْوَةٌ کہا جاتا ہے۔ جِ جَدِي وَجَدِي. قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوْ جَدْوَةٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (۲۸-۲۹) یا آگ کا انگارہ۔ خلیلؑ نے کہا ہے کہ جَدًا اور جَسًا ہم معنی ہیں یعنی چٹ جانا، مگر جَدًا میں شدت لزوم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:

جَدًا الْقُرَادُ فِي جَنْبِ الْبَعِيرِ. کہ چھڑی اونٹ کے پہلو میں سختی کے ساتھ چٹ گئی۔

أَجْدَتِ (افعال) الشَّجَرَةَ دَرَخْتَ كَأَجْرٍ كَظْرٍ لَيْنًا۔ حدیث میں ہے۔^۱

(۶۰) كَمَثَلِ الْآرَزَةِ الْمُجْدِيَةِ. اس کی مثال مضبوط جڑ والے صنوبر کے درخت کی ہے، (یعنی جو ہوا کے جھکولوں سے ادھر ادھر نہیں جھکتا)

رَجُلٌ جَائِدٌ: مرد کوتاہ دست و کوتاہ ارش۔ مؤنث جَائِدِيَّةٌ: کوتاہ ہونے میں اس کے دونوں ہاتھ گویا پارہ آتش ہیں۔

ج ذ ع

جَرَحَهُ (ف) جَرَحًا زَمِيًّا كَمَا صَفْتِ مَفْعُولِي جَرِيحٍ وَمَجْرُوحٍ (زخمی) جُرْحٌ (اسم) ج: جُرُوحٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ﴾ (۵-۳۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔

﴿وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ﴾ (۳۰-۵) اور بیہودہ (شبهات سے) جھگڑتے رہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنُ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ﴾ (۲۲-۳) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کی شان میں..... جھگڑتے ہیں۔

﴿وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (۲-۱۹۷) توج (کے دنوں) میں..... نہ کسی سے جھگڑے۔

ج ذ ن

الْجَدُّ: (ن) کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں اور پتھر یا سونے کے ریزوں کو جَدَاذ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿فَجَعَلَهُمْ جُدَاذًا﴾ (۲۱-۵۸) پھر ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔

﴿عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْدُوذٍ﴾ (۱۱:۱۰۸) یہ (خدا کی) بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔

محاورہ ہے: مَا عَلَيْهِ جُدَّةٌ. یعنی اس کے بدن پر چھینٹھا بھی نہیں ہے۔

ج ذ ع

الْجِدْعُ: درخت کا تنہا۔ ج: جُدُوعٌ. قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي جُدُوعِ النَّخْلِ﴾ (۲۰-۷۱) جَدْعُهُ (ف) شاخ یا تنے کی طرح کاٹ ڈالنا۔ الْجِدْعُ (من الابل) شتر بسال پنجم (من الشاة) گوسفند بسال دوم اور چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دے کر زمانہ کو بھی جَدْعُ کہا جاتا ہے (کیونکہ زمانہ بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔)

۱ راجع الفائق ۱: ۱۸۶ و لفظہ الحدیث متفق علیہ من حدیث کعب بن مالک فی أثناء حدیث: مثل المؤمن الحدیث راجع مسلما مع النووی ۲: ۳۷۵ طبقہ الهند وضبط النووی المحذبة بالباء من اجذب والبخاری مرضی۔ توحید و "دی" افاق (حم) ۲: ۴۲۳-۵: ۱۴۲ وغریب ابی عبید ج ۱ ص ۱۱۶-۱۱۷۔

کے معنی ٹڈی کے ہیں۔ اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اصل ہو اور اس سے جَرَدُ الْأَرْضِ مشتق ہو۔ جس کے معنی ہیں ٹڈی زمین پر سے گھاس چٹ کر گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جراد خود جَرَدُ سے مشتق ہو، جس کے معنی ننگا کرنے کے ہیں اور چونکہ ٹڈی زمین کی روئیدگی کو کھا کر اسے ننگا اور صاف کر دیتی ہے، اس لیے ٹڈی کو جراد کہا گیا ہے اور اَرْضٌ مَجْرُودَةٌ اس زمین کو کہا جاتا ہے جس کی نباتات کو ٹڈیوں نے کھا کر صاف کر دیا ہو۔

فَرَسٌ أَجْرَدٌ بے بال یا چھوٹے بالوں والا گھوڑا۔ ثَوْبٌ جَرْدٌ۔ پرانا کپڑا۔ کیونکہ اس کی روئیں چھڑ جاتی ہیں اور کمزور ہو جاتا ہے۔ تَجَرَدَ عَنِ الثَّوْبِ ننگا ہونا۔ کپڑے اتار دینا۔

جَرَدَةٌ (عن الثَّيَابِ) ننگا کرنا۔
إِمْرَأَةٌ حَسَنَةٌ الْمُتَجَرِّدِ یعنی خوب صورت بدن است وقت برہنگی ایک روایت میں ہے۔
(۶۱) جَرَدُوا الْقُرْآنَ: قرآن کو علیحدہ رکھو یعنی اس کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ کرو۔

إِنجَرَدَ بِنَا السَّيْرِ دِرا زگر دید سفر۔
جَرَدِ الْإِنْسَانُ: خراج برآورد پوست انسان از خوردن مَلُخ یعنی مَلُخ کے کاٹنے سے جسم پر پتی اچھلنا۔

ج ر ز

جُرُزٌ: وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو، نیز فرمایا: ﴿صَعِيدًا جُرُزًا﴾ (۸-۱۸) بخر میدان.....

اور زخم کے ساتھ تشبیہ دے کر گواہ پر بحث کرنے کو بھی جَرَحٌ کہا جاتا ہے اور کتے، چیتے اور پرندے شکاری جانوروں کو جَارِحَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع جَوَارِحُ ہے اور شکاری جانوروں کو جَوَارِحُ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتے ہیں اور یا اس لیے کہ وہ کما کر لاتے ہیں ان ہر دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر اعضاء کا سبب یعنی ہاتھ پاؤں کو جَوَارِحُ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ﴾ (۴-۵)
(اور وہ شکار بھی حلال ہے) جو تمہارے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو۔ جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔ الْإِجْرَاحُ (جرائم کا ارتکاب کرنا) اصل میں جَرَّاحَةٌ سے ہے جیسا کہ اَقْتَرَفَاكَ لِنَفْظِ قَرْفِ الْفَرَّحَةِ سے مشتق ہے، جس کے معنی زخم کے چھیلنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿إِمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ﴾ (۲۴-۲۵)
جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ خیال کرتے ہیں۔

ج ر د

الْجَرَادُ: ٹڈی۔ اس کا واحد جَرَادَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ﴾ (۱۳۳-۷)
ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں..... بھیجیں۔

﴿كَانَهُمْ جَرَادٌ مُّتَشِيرٌ﴾ (۷-۵۴) الغرض جَرَادٌ

① موقوفہ علی ابن مسعود و تمامہ لیربو فیہ صغیر کم و لاینبای عنہ کبیر کم فان الشیطان یخرج من بیت تفرقہ فیہ سورۃ البقرۃ الفائق ۹۶:۱ و فی تاویلہ قولان: اراد رضی اللہ عنہ تحریدہ عن النقط و العشور لثلاثا تشانشوہ فیری انہا من القراق و قبل ہو حث علی ان لا يتعلم غیر مالی خصوہ بالتعلم غریب ابی عبید ۴: ۴۶-۴۹)۔

الْجَرَعُ وَالْجَرَعَاءُ: ریگستان جس میں کچھ نہ اگے۔ گویا وہ بیج کو نکل لیتا ہے۔

یعنی جس پر گھاس درخت وغیرہ کوئی چیز نہ ہو۔
أَرْضٌ مَجْرُوزَةٌ: زمین جس سے گھاس چر کر ختم کر دیا گیا ہو۔

ج ر ف

قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلَى شَفَا جُرْفٍ هَارٍ﴾ (۹-۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر۔
الْجُرْفُ: دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو کٹ کٹ کر نیچے گر رہا ہو۔ محاورہ ہے: جَرَفَ الدَّهْرُ مَالَهُ. حوادثِ زمانہ نے اس کے مال کو تباہ کر دیا۔

الْجَرُوزُ: جو دسترخوان کو صاف کر ڈالے۔ مثل مشہور ہے: لَا تَرْضَى شَأْنِيهِ إِلَّا بِجِرْزِهِ. یعنی اس کے دشمن اس کا استیصال کیے بغیر خوش نہیں ہوں گے۔

الْجَارِزُ: سخت کھانسی (اس میں معنی جرز کا تصور پایا جاتا ہے)

رَجُلٌ جَرَّافٌ: مرد بسیار جماع شادماں۔ گویا وہ اس شغل میں بہ رہا ہے۔

الْجَرَّازُ: تلوار سے کاٹنا۔ سَيْفٌ جَرَّازٌ شمشیر بڑاں۔

ج ر ء

جَرَءَ (ف) جَرَعًا. الْمَاءُ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینا۔ اور بقول بعض جرع (س) آتا ہے۔
تَجَرَّعَهُ (تفعل) تکلف سے گھونٹ گھونٹ کر کے پی گیا۔ گویا اس کا پینا طبیعت پر ناگوار گذر رہا ہے۔ قرآن میں ہے:

الْجَرْمُ: (ض) اس کے اصل معنی درخت سے پھل کاٹنے کے ہیں یہ صیغہ صفت جَارِمٌ جِ جِرَامٍ۔
تَمْرٌ جَرِيمٌ: خشک کھجور۔ جُرَامَةٌ رُدِّي کھجوریں جو کاٹتے وقت نیچے گر جائیں۔ یہ نُفَايَةُ کے وزن پر ہے (جو کہ ہر چیز کے ردی حصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے)۔

﴿يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُبَسِّغُهُ﴾ (۱۳-۱۷) وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔ جَرَءَةٌ ایک مرتبہ گھونٹ سے لگانا۔ مثل مشہور ہے: أَفَلَتِ بُجْرِيْعَةُ الدَّقْنِ. وہ ہلاکت کے قریب پہنچ کر بیچ نکلا۔

أَجْرَمَ: (افعال) جرم والا ہونا۔ جیسے أَتَمَرَ وَأَتَمَرَ وَالْبَيْنَ اور استعارہ کے طور پر اس کا استعمال اکتسابِ مکروہ پر ہوتا ہے۔ اور پسندیدہ کسب پر بہت کم بولا جاتا ہے۔ اس کا مصدر جَرَمٌ ہے، شاعر نے عقاب کے متعلق کہا ہے: ⑤

نُوقُ مَجَارِيْعُ: وہ اونٹنیاں جن کا دودھ تقریباً خشک ہو گیا ہو۔

(۸۸) جَرِيْمَةٌ نَامِصٌ فِي رَأْسِ نَيْقٍ

① افلت يكون لازما ومتعديا والباء بمعنى مع وجرعة تصغير جرعة والمراد منه النفس ای خلص مع جرعة اللقن ای فيه بقية ارواحه بقدر جرعة فی الفم راجع لتفصيله المبدائی ۶۹-۷۰ وابدال ابی الطیب ۳-۲۷۳-۲۷۴ واللسان (جرع).

② قاله ابو حراش المهری بصف عقابا شبه فرسه بهاترزق فرخها وتمامه: ترى لعظام ماجمعت صلیاً وفي اللسان (جرم) صلب) والاساس (جرع) ناهض بدل نامص والبيت فی الاقتضاب ۳۱۷ والمعانی للقبتي ۲۸-۴۱۵ وغرب القرآن للقبتي ۱۳۹ واصلاح يعقوب وادب الکاتب ۶۶ والد ولبحر ۵: ۲۱۳ والحیون ۶: ۳۳۷ واشعار الهذليين ۲: ۵۷).

یہاں اگر یَجْرِمَنَّكُمْ فِتْحَیَا کے ساتھ پڑھا جائے تو بَغِیْتَهُ مَآلاً کی طرح ہوگا اور اگر ضَمَّہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو اَبَغِیْتَهُ مَآلاً (یعنی میں نے مال سے اس کی مدد کی) کے مطابق ہوگا۔

﴿لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ (۵-۸) اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَعَلٰی اِجْرَامِیْ﴾ (۱۱-۳۵) تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر۔ میں ہو سکتا ہے کہ اِجْرَامِ (بکسر الہزہ) باب افعال سے مصدر ہو اور اگر اِجْرَامِ (فتح الہزہ) پڑھا جائے تو جَرَمٌ کی جمع ہوگی۔ ۱

اور جَرَمٌ بمعنی قطع سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے: جَرَمْتُ صُوفَ الشَّاةِ: میں نے بھیڑ کی اُون کاٹی۔ تَجَرَّمَ اللَّیْلُ: رات ختم ہوگئی۔

الْجَرَمُ: (جسم) اصل میں یہ بمعنی مَجْرُومٌ ہے یعنی قطع کیا ہوا۔ جیسے: نَفَضُ وَنَقَضُ بمعنی منقوض و منقوض کے آتا ہے۔

پھر یہ جسم پر بولا جاتا ہے اور فَلَانٌ حَسَنُ الْجَرَمِ کے معنی ہیں کہ خوبصورت ہے، جیسا کہ حَسَنُ السَّخَا کا محاورہ ہے اور حَسَنُ الْجَرَمِ کے معنی حسن صوت بھی آتے ہیں اور اس میں درحقیقت جرم سے محل صوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے نہ کہ نفس صوت کی طرف لیکن اس سے آواز کی خوبصورتی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، اس لیے اس کے معنی حسن صوت کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ اسی

جیسا کہ (عقاب) بلند پہاڑ کی چوٹی پر اپنے بچوں کے لیے روزی کما کر ان کو کھلاتا ہے۔

یہاں شاعر کا ”شاہین کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کا جرم کہنا“ یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ پرندوں کو شکار کر کے لاتا ہے اور یا اس کو ایسا شخص فرض کیا ہے جو اپنی اولاد کی خاطر گناہ کرتا ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ ہر صاحب اولاد خواہ بہائم ہی کیوں نہ ہوں اپنی اولاد کے لیے ضرور ہی جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

قرآن مجید میں اِجْرَامِ (افعال) اور جَرَمِ (ض) دونوں فعل استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ اِجْرَامِ کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ﴾ (۸۳-۲۹) جو گنہگار (یعنی کفار) ہیں وہ (دنیا میں) مومنوں سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

﴿كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ﴾ (۷۷-۴۶) (اے جھٹلانے والو!) تم کسی قدر کھا لو اور فائدے اٹھا لو تم بیشک گنہگار ہو۔

﴿اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰكٍ وَّسَعْرِ﴾ (۵۴-۴۷) بیشک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (بتلا) ہیں۔

﴿اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ﴾ (۴۳-۷۴)

اور جَرَمِ (ض) کے متعلق فرمایا:

﴿لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِیْ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ﴾ (۱۱-۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے کہ..... تم پر واقع ہو۔

۱ قال الزمخشری وینصر الجمع ان فسرہ الاولون بانای (الکشاف ۳۹۲ ج ۲)۔

ہے۔ اس کی تفسیر میں اور بھی بہت سے اقوال منقول ہیں۔^۱ لیکن ان میں سے اکثر تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾ (۱۶-۲۲، ۲۳) تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپاتے ہمیں اور ظاہر کرتے ہیں خدا ضرور اس کو جانتا ہے۔ ﴿لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُونَ﴾ (۱۶-۱۰۹) کچھ شک نہیں کہ یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

ج ر ی

جَرَی (ض) جَرِيَّةٌ وَجَرِيًّا وَجَرِيَانًا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔^۲ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي﴾ (۴۳-۵۱) اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہ رہی ہیں کیا میری نہیں ہیں؟

معنی میں طَيْبُ الْحَلْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ حلق سے موت مراد لی جاتی ہے نہ کہ بذات خود حلق مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا جَرَمَ﴾ (۱۶-۱۰۹) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے لا اصل میں محذوف پر داخل ہوا ہے، جیسا کہ لا اَقْسِمُ میں لا آتا ہے اور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے^۳ ع (متقارب) (۸۹) لَا وَأَيْبُكَ ابْنَةُ الْعَامِرِيِّ اور جَرَمَ فعل ماضی ہے، جس کے معنی اَكْسَبَ وَجَنَى کے ہیں اس کے بعد اَنَّ لَهُمُ النَّارُ (جملہ) موضع مفعول میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے لیے (دوزخ کی) آگ حاصل کی۔

بعض نے کہا ہے کہ جَرَمَ اور جُرْمَ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن لا کے ساتھ جَرَمَ آتا ہے، جیسا کہ قسم کے ساتھ عَمَرُ و كَالْفَرْخِ مَخْضُحٌ ہے اگرچہ عَمَرٌ وَعُمُرٌ کے معنی ایک ہی ہیں اور معنی یہ ہے کہ ان کے لیے آگ کا ہونا کسی کا جُرْم نہیں ہوگا بلکہ یہ ان کے عملوں کی سزا ہوگی اور انہوں نے خود ہی اسے اپنے لیے حاصل کیا ہوگا، جیسا کہ آیت:

﴿وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَهَا﴾ (۴۱-۴۲) اور جو برے کام کرے گا۔ تو ان کا ضرر اسی کو ہوگا۔ میں اشارہ پایا جاتا

۱ قاله امرؤ القيس يخاطب ابنه عمه فاضمه ولبيبت من مطلع قصيدة عدتها ٤٢ بيتاً وتمامه لا يدعى القوم ابي افر- والبيت في الحماسة مع الزروق - راجع الخزانة ١: ٣٣٧-٤٨٩: ٤ والعين ١: ٩٦٠ وشرح المفضليات والعلاقات لابن الاتباري ٤٤ والعقد النسيم ١٢٦ والسيوطي ٢١٧ والطبري ٢٧-١٣١) والفخر ٣٠-٢١٤) والبيت ايضاً من شواهد الكشاف ٤٥ قال المسحب وقيل البيت لربيعه بن جشم اليمنى وايضاً المغنى ١: ٢٧٦ وديوانه ٩٤.

۲ وقيل "ان في موضع رفع وجرم بمعنى وجب ان لهم النار وانهم مفرطون بحث الفالي في نوادره في لاجرم" ومنه اخذ ابن الاتباري وغيرهم معظم هذا الباب ولم يخرج المؤلف مما هنالك وذكر وافية وجوه ذهب الفراء تبعاً للكسائي ان جرم اسم لا وذهب سيويه في الكتاب بانه فعل ماضى راجع للبحث النوادر ٢١٢-٢١٣ الخزانة ٤: ٣١١ والصحاح والتاج (جرم) وامالي المرتضى ١: ١١٠) والفاخر لابي طالب ١٩٩ واعراب القرآن المنسوب الى الزجاج ١١٧-١١٨ وفي ابن كثير ٤: ٨٠) قال السدي وابن جرير "لاجرم" معناه حقاً وقال الضحاك لا كذب وقال علي بن طلحة عن ابن عباس لاجرم معناه بلى وفي التاج ومايجرى جريه وفي المطبوع ومايجرى بحريه ١٢.

اور معنی یہ ہوں گے کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست مت بنو گویا یہ آیت کریمہ:

﴿فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ﴾ (۷۶-۳) شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا:

﴿إِنَّمَا ذَلِكَمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ﴾ (۱۷۵-۳) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

ج زء

جُزءُ الشَّيْءِ: چیز کا ٹکڑا جس سے وہ چیز مل کر بنے۔ جیسے اجزاء السَّفِينَةِ اجزاء البَيْتِ اور حساب میں اجزاء الجُمَّلَةِ (یعنی کل مجموعہ کے اجزاء) وغیرہ محاورات بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ (۲۶۰-۲) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھو اور۔

﴿لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ﴾ (۴۳-۱۵) ہر ایک دروازے کے لیے ان میں ایک حصہ تقسیم کر دیا گیا ہے۔

﴿وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا﴾ (۱۵-۳۳) اور انھوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لیے اولاد مقرر کی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ جُزءٌ اسے مراد اَنَاتٌ ہیں، میں انھوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا اور یہ اجزائت المرءۃ کے محاورہ سے مشتق ہے، جس کے معنی مادینہ اولاد کو جنم دینا کے ہیں۔

جُزءٌ الْإِبِلِ مَجْزءٌ وَجُزءٌ: اونٹ ترگھاس کھانے کی

﴿جَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (۲۵-۲) بارغ، میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

﴿وَلِتَجْرِيَ الْفُلُكُ﴾ (۳۶-۳۰) اور تاکہ..... کشتیاں چلیں۔ ﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ﴾ (۱۲-۸۸) اس میں چشمے بہ رہے ہوں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ (۱۱-۲۹) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔

میں جَارِيَةٌ سے مراد کشتی ہے، اس کی جمع جَوَارِ آتی ہے جیسے فرمایا: ﴿الْجَوَارِ الْمُنشآت﴾ (۲۳-۵۵) اور جہاز جو..... اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ﴾ (۳۲-۳۲) اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز، میں (جو) گویا پہاڑ ہیں۔

اور پرند کے سنگدانہ کو جَرِيَّةٌ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لیے کہ وہ طعام کا بھری بنا ہے۔ الْاَجْرِيَا: عادت جس پر انسان چلتا ہے۔

الْجَرِي: وکیل۔ یہ لفظ رسول اور وکیل سے انحص ہے۔ اور جَرِيَّتٌ جَرِيَا کے معنی وکیل بنا کر بھیجنے کے ہیں۔ اور حدیث میں ہے ﴿۶۲﴾

لَا يَسْتَجْرِبَنَّكُمْ الشَّيْطَانُ یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہو سکتا ہے، یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور اطاعت میں بہہ جانے پر تمہیں برا سمجھتے نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جَرِيٌّ بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو

① الحديث في النهاية وقبله قولوا بقولكم..... وذلك انهم مدحوه فذكر لهم المبالغة في المدح اي لاتتكلفوا في المدح فيتحذركم الشيطان جريا اي وكيلا: ۲۶۴/۱.

ج ز ی

الْجَزَاءُ: (ض) کافی ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا﴾ (۲۸:۲)
کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَارٍ
عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا. کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام
آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا۔ الْجَزَاءُ:
(اسم) کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو، جیسے خیر کا بدلہ خیر سے اور
شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا جاتا ہے۔ جَزَيْتُهُ كَذَا
بِكَذَا میں نے فلاں کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿وَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى﴾ (۲۰-۷۶) اور یہ
اس شخص کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔

﴿قَلَّ جَزَاءُ الْحَسَنَى﴾ (۱۸-۸۸) اس کے
لیے بہت اچھا بدلہ ہے۔

﴿وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ مِثْلُهَا﴾ (۳۲-۴۰) اور برائی
کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔

﴿وَجَزَاءُهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا﴾ (۷۶-۱۲)
اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت (کے باغات) اور
ریشم (کے) ملبوسات عطا کرے گا۔

﴿جَزَاءُكُمْ جَزَاءٌ مَوْفُورًا﴾ (۱۷-۶۳) اور وہ
پوری پوری جزا ہے۔

﴿أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا﴾ (۲۵-۷۵)
ان (صفات) کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے
اونچے محل دیئے جائیں گے۔

﴿وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۳۷-۳۹)

وجہ سے پانی سے بے نیاز ہو گئے۔ محاورہ ہے: أَلْتَحْمُ
السَّمِينُ أَجْزَاءً مِنَ الْمَهْزُولِ: موٹا گوشت دبلے
گوشت سے زیادہ کفایت کرنے والا ہوتا ہے۔
جُزْءَةُ السَّكِينِ. چھری کا دستہ کیونکہ وہ اس کا ایک
حصہ ہوتا ہے۔

ج ز ع

الْجَزَعُ: بے صبری۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَوَاءٌ
عَلَيْنَا أَجْرٌ عَلَيْنَا أَمْ صَبْرًا﴾ (۱۳-۲۱) اب ہم
گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے حق میں برابر ہے۔ یہ
حزن سے خاص ہے کیونکہ جَسَعٌ خاص کر اس غم کو کہتے
ہیں جو انسان کو جس چیز کے وہ درپے ہو اس سے پھیر دے
اور اس سے تعلق قطع کر دے۔

اصل میں جَسَعٌ (ف) کے معنی رسی کو نصف سے
کاٹ دینے کے ہیں اور انْجَزَعَ (انفعال) اس کا مطاوع
آتا ہے، جیسے جَزَعْتُهُ فَأَنْجَزَعُ میں نے اسے کاٹنا چنانچہ
کٹ گیا۔ اور معنی انقطاع کے تصور کی بنا پر وادی کے موڑ کو
جَسَعُ الْوَادِي کہا جاتا ہے اور تغیر سے بھی چونکہ اصل
رنگ کٹ جاتا ہے، اس لیے تلوں خرمبرے کو جَسَعٌ کہتے
ہیں اسی سے لَحْمٌ مُجْزَعٌ کا محاورہ مستعار ہے، جس کے
معنی دو رنگ کے گوشت کے ہیں اور ریشم پختہ کھجور کو مُجْزَعٌ
کہا جاتا ہے۔ الْجَزَاعُ شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے
وسط میں ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے چھوٹے شہتیر آ
آ کر اس پر مل جاتے ہیں تو اسے جَزَاعٌ یا تو اس لیے کہا
جاتا ہے کہ بوجھ اٹھانے کی وجہ سے گویا وہ بے صبر ہو رہا
ہے اور یا اس لیے کہ کمرے کے درمیان میں ہونے کی وجہ
سے گویا وہ اسے دو حصوں میں قطع کر دیتا ہے۔

ج س ن

اَلْحَسَدُ: (اسم) جسم ہی کو کہتے ہیں مگر یہ جسم سے انحصار ہے، غلیل فرماتے ہیں کہ جسد کا لفظ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق پر نہیں بولا جاتا۔ نیز جسد رنگدار جسم کو کہتے ہیں مگر جسم کا لفظ بے لون اشیاء مثلاً پانی، ہوا وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ﴾

(۲۱-۸) کہ ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں..... سے غلیل کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ نیز قرآن پاک میں ہے:

﴿عَجَلًا جَسَدًا لَّهُ خَوَارٌ﴾ (۲۰-۸۸) ایک پھڑپھڑا یعنی قالب، جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

﴿وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ﴾

(۳۸-۳۳) اور ان کے تخت پر ہم نے ایک دھڑ ڈال دیا، چنانچہ انھوں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ اور لون کے اعتبار سے زعفران کو جسد کہا جاتا ہے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے کو ثوبٌ مُجَسَّدٌ کہتے ہیں۔

اَلْحَسَدُ: کپڑا جو بدن سے متصل ہو۔ اَلْحَسَدُ وَالْحَاسِدُ وَالْحَسِيدُ خَشْكُ خُونٍ۔

ج س م

اَلْحِسْمُ: وہ ہے جس میں طول، عرض اور عمق پایا جائے اور اجزاء جسم خواہ کتنے ہی لطیف کیوں نہ ہوں اجسام ہی کہلاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَادَهُ بَسْطَةُ فِي الْعِلْمِ وَالْحِسْمِ﴾ (۲-۲۳۷)

اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی

اور تم کو بدلا ویسا ہی ملے گا، جیسے تم کام کرتے تھے۔

اَلْحِزْيَةُ: وہ ٹیکس جو ذمیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ اور اسے حِزْيَةُ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے جان و مال کی حفاظت کے بدلہ میں ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ يُعْطُوا الْحِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾

(۹-۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

محاورہ ہے: جَازِيكَ فُلَانٌ یعنی فلاں تجھے کافی ہے۔

جَزَيْتُهُ بِكَذَا وَجَازِيْتُهُ: میں نے اسے بدلہ دیا۔ قرآن

پاک نے جَزَى (ض) کا لفظ استعمال کیا ہے اور

جَازَى (مفاعلة) استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ مجازاة کے

معنی مکافات کے ہوتے ہیں یعنی کسی کے احسان (نعمت)

کے بدلے میں اسی قسم کا احسان کرنا۔ یہ چیز دو آدمیوں

کے درمیان تو باہم مشترک ہو سکتی ہے۔ لیکن نعمت الہی کی

کوئی شخص مکافات نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

کے بارے میں مکافات کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے۔ یہ بات

بالکل واضح ہے، (جس کی دلیل کی ضرورت نہیں۔)

ج س م

اَلْحَسُّ: کے اصلی معنی ہیں رگ کو چھونا اور نبض دیکھ

کر معلوم کرنا کہ بیمار ہے یا تندرست۔ یہ حَسُّ سے

خاص ہے۔ کیونکہ حَسُّ کے معنی قوۃ احساس سے کسی چیز کا

ادراک کرنا کے ہیں۔ لیکن حَسُّ کسی اندرونی حالت کے

معلوم کرنے کو کہتے ہیں اور لفظ حَسُّ سے جَاسُوسٌ کا

لفظ مشتق ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَجَسَّسُوا﴾ (۳۹-۱۲) اور ایک دوسرے کے

اندرونی حالات کا تجسس نہ کیا کرو۔

(بڑا عطا کیا ہے۔)

ہے۔

(۲) بمعنی أَوْجَدَ (یعنی ایسا اور پیدا کرنا) اس صورت

اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ﴾ (۴-۳۶)

میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدي ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾ (۶-۱۱) اور

اور جب تم ان (کے تناسب اعضا) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں (کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

اندھیرے اور روشنی بنائی۔

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ﴾

میں اس بات پر تشبیہ کی گئی ہے کہ بظاہر ان کی شکل و صورت اگرچہ جاذب نظر آتی ہے، لیکن ان کے اندر کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہے۔

(۱۶-۷۸) اور اس نے تم کو کان، آنکھیں اور دل (اور

اس کے علاوہ اور اعضاء) بخشنے۔

(۳) ایک شے کو دوسری شے سے پیدا کرنا اور بنانا جیسے

فرمایا: ﴿جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا﴾

الْجِسْمَانُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کے شخص کے ہیں لیکن کسی شخص کے اجزاء ضروری نہیں کہ تقطیع اور تجزیہ کے بعد بھی ان کو شخص ہی کہا جائے مگر جسم کے اجزاء کو خواہ کتنا ہی باریک کیوں نہ کر دیا جائے وہ جسمیت سے خارج نہیں ہوتے۔

(۲۲-۱۱) اسی نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے۔

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا﴾ (۱۶-۸۱)

اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں۔

﴿وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا﴾ (۲۳-۱۰) اور اس

میں تمہارے لیے رستے بنائے۔

(۴) بمعنی تصییر یعنی کسی شے کو ایک حالت سے دوسری

ج ع ل

جَعَلَ: (ف) یہ لفظ ہر کام کرنے کے لیے بولا

جاسکتا ہے اور فَعَلَ وَصَنَعَ وغیرہ افعال کی نسبت عام ہے۔ اور یہ پانچ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

حالت میں تبدیل کروینا۔ جیسے فرمایا:

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا﴾ (۲-۲۲)

جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا..... بنایا۔

﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا﴾ (۱۶-۸۱)

اور اللہ ہی نے تمہارے (آرام کے) لیے اپنی پیدا کی

(۱) بمعنی صَارَ وَطَفِقَ اس صورت میں متعدی نہیں ہوتا جیسے جَعَلَ زَيْدٌ يَقُولُ كَذَا (یعنی زید یوں کہنے لگا) شاعر نے کہا ہے (الوافر)

(۹۶) فَقَدْ جَعَلَتْ قُلُوصُ بَنِي سُهَيْلٍ

مِنَ الْأَكْوَارِ مَرْتَعًا قَرِيبًا

اب بنی سہیل کی اونٹنی اکوار (جمع کور) کے قریب چرنے لگی

ہوئی چیزوں کے سائے بنائے۔

① قاله رجل من يحتر بن عتود والبيت في الحماسة رقم ۹۹ مع المرزوقي في ثلاثة بغير عزو والبيت من شواهد الحزانة ۴: ۹۶) وفي رواية "ابن زياد" ولم اراحد من الشرح نسبهاالى قائلها ووجدت نسبتها عندالصاغاني في العباب (العجل) والبيت في اللسان (جعل) والعين والحزانة ۲: ۳۳۶: ۱۲.

لیے کسی کام کے عوض مقرر کیا جائے۔ یہ اجرت اور ثواب سے اعم ہے۔

كَلْبٌ يُجْعَلُ (کنایہ) کتے کا جفتی کی خواہش کرنا۔
الْجُعَلُ: گبریلا۔ سیاہ جھونڑا۔ ج جَعْلَانٌ۔

ج ف ن

الْجَفْنَةُ: پیالہ۔ خاص کر کھانے کے برتن کو کہتے ہیں۔ ج جَفَانٌ۔ قرآن میں ہے:

﴿وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ﴾ (۳۳-۱۳) اور لگن جیسے بڑے حوض۔ حدیث میں ہے:

(۶۳) وَأَنْتِ الْجَفْنَةُ الْغَرَاءُ تُمَسَّحِي سِرْدَارَهُو۔ اور لگن کے ساتھ تشبیہ دے کر چھوٹے کنوئیں کو بھی جَفْنَةٌ کہا جاتا ہے۔

الْجَفْنُ: اس کے معنی خاص کر تلوار کی نیام یا آنکھ کے پونے کے آتے ہیں۔ ج: أَجْفَانٌ اور انگور کی تیل کو بھی جَفْنٌ کہا جاتا ہے گویا وہ انگور کے لیے بمنزلہ برتن کے ہے۔

ج ف و

الْجُفَاءُ: وہ کوڑا کرکٹ جو وادی کے دونوں کناروں پر رہ جاتا ہے یا ہانڈی کا میل کچیل جو ابال آنے سے ادھر ادھر گر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے أَجْفَاتُ الْقَدْرِ زَبَدَهَا ہنڈیانے اپنا ابال پھینک دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾ (۱۳-۱۷) سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے۔

﴿وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا﴾ (۷۱-۱۶) اور چاند کو ان میں (زمین کا) نور بنایا۔

﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾ (۳۳-۳) کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔

(۵) کسی چیز پر کسی چیز کے ساتھ حکم لگانا عام اس سے کہ وہ حکم حق ہو یا باطل، حق کی مثال جیسے:

﴿إِنَّا رَأَوُوهُ إِلَيْكَ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾ (۲۸-۷) ہم ان کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور (پھر) اسے پیغمبر بنا دیں گے۔

اور باطل کی مثال جیسے:

﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا﴾ (۶-۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ﴾ (۱۶-۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ﴾ (۱۵-۹۱) یعنی قرآن کو (کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے سے) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

الْجَعَالَةُ: چولہے سے دیگ اتارنے کا چیتھڑا۔ ہنڈیا اتارنے کا رومال۔

الْجُعْلُ وَالْجَعَالَةُ وَالْجَعِيلَةُ: جو چیز کسی شخص کے

① راجع التاج والمعروف محفل والفعل اجعل (افعال) والبحث في الحيوان للحافظ ۵: ۳۵۰۔

② النهاية افانث الحفنة الغراء وفي الكامل للمبرد: قول رسول الله صلى الله عليه انما الحفنة الغراء وفي النهاية واللسان انه قيل له انت كذا وانت الحفنة الغراء وفي الفائق ۱: ۱۰۲) من قول عبد الله بن الشخير حين قدم على رسول الله صلى الله عليه وسلم كذا في التاج وراجع النهاية واللسان (حفن) قال في حاشية الكامل ولم ار هذا الحديث ۷۷۹ وفي المطبوع وانت الحفنة الغراء اي الطعام مصحف والتسدید من المراجع والحملة من تحية الجاهلية لم لو كهم .

تعالیٰ کو اَلْجَلِيلُ* یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑی بڑی عظیم الشان چیزوں کو پیدا کیا ہے جن سے اس کی ذات بابرکت پر استدلال ہو سکتا ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی ذات اَلْجَلِيلِ اس لیے ہے کہ وہ احاطہ سے بلند ہے اور یا اس لیے کہ اس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

اصل وضع کے اعتبار سے جَلِيلِ کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے، جو جسامت کے اعتبار سے بڑی بھی ہو اور غلیظ یعنی موٹی اور سخت بھی پھر معنی غلظت کے اعتبار سے یہ دقیق کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگا ہے اور عظیم کا لفظ صغیر کے مقابلہ میں، چنانچہ کہا جاتا ہے جَلِيلِ و دقیق و عظیم و صغیر اور باہم مقابلہ کے اعتبار سے اونٹ کو جلیل اور بھیڑ بکری کو حقیر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:*

مالہ جَلِيلِ وَلَا دَقِيقِ (کہ اس کے پاس نہ اونٹ ہے اور نہ بھیڑ بکری) مَا اَجَلْنِي وَلَا اَدَقَّنِي (اس نے مجھے نہ اونٹ دیئے اور نہ بھیڑ بکری)..... یہ اس کے اصل معنی ہیں..... پھر یہ لفظ ہر بڑی اور چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے۔

اَلْجَلَالَةُ: خاص کر کلاں جسم اونٹنی کو کہتے ہیں اور اَلْجَلَالَةُ کلاں سال کو۔ اَلْجَلَلِ ہر بڑی چیز۔ کار بزرگ۔ جَلَلْتُ كَذَا: میں نے اس کا بڑا حصہ لے لیا۔ تَجَلَلْتُ البعير* میں نے کلاں جسم اونٹ یا ان کی بڑی مقدار لی۔ اَلْجَلَلِ* (ایضاً)

اور بے فائدہ اور بے کاریز کو جَفَاءَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: اَجْفَأَتِ الْأَرْضُ زَمِينَ جَفَاءً یعنی جھاگ کی طرح ناکارہ اور بے خیر ہو گئی۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناقص واوی ہے۔ لہذا جَفَتِ الْقَدْرُ وَأَجْفَتَ کہا جائے گا۔ اور اسی سے اَلْجَفَاءُ بمعنی ظلم ہے۔ اور جَفَاءُ (ن) جَفْوَةٌ وَجَفَاءُ کے معنی ہیں کسی پر ظلم کرنا اور اسی سے محاورہ ہے۔ جَفَا السَّرَّحَ عَنْ ظَهْرِ الدَّابَّةِ (گھوڑے کی پشت سے زین کو اٹھا دیا۔)

ج ل ل

اَلْجَلَالَةُ کے معنی ہیں عظیم القدر یعنی قدر و منزلت میں بڑا یعنی بلند مرتبہ ہونا کے ہیں اور (ج) کے بغیر اَلْجَلَالِ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عظمت کی آخری حد جس کے بعد اور مرتبہ نہ ہو۔ اسی لیے یہ اللہ تعالیٰ کی وصف کے ساتھ مختص ہے۔ اور دوسروں کے حق میں استعمال نہیں ہوتا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (۲۷-۵۵) صاحب جلال و عظمت۔

اَلْجَلِيلُ: اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ اللہ

① وفي القرآن: تحافى جنوبهم عن المضاجع (۱۶-۳۲).

② الزيادة ” من التاج قد سقط في المطبوع .

③ وفي التاج مالہ جلیلة ولا دقیقه ولا اجلنی ولا احسانی .

④ فی المطبوعه تحللت البقر خلاف جميع الاصل وفي الاصول وفي التاج قال الراغب تحللت البعيراه وعلیه اعتمدنا.

⑤ وفي المطبوع الحلل المتناول من البقروفي التاج قال الراغب من البعير وتصحف والاسف ان المفردات للراغب لم

يطبع الى الان طبعاً محققاً مقابلاً بالاصول وانا اكلت جوادى في تسديده وساحرومه والحمد لله على ذلك.

لا تارہ۔

اور حدیث ۵ (۶۸) لَا جَلْبَ (یعنی جلب جائز نہیں ہے) کے دو معنی بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ مصدق یعنی زکوٰۃ جمع کرنے والا چراگاہ سے کہیں دور بیٹھ جائے اور وہاں جانوروں کو حاضر کرنے کا حکم دے اور گھڑ دوڑ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوڑ میں اپنے گھوڑے پر چبھنے کے لیے ایک آدمی کو مقرر کرے تاکہ وہ آگے بڑھ جائے۔

الْجُلْبَةُ: پوست جراحی کہ خشک شدہ باشد۔

الْجُلْبُ: پتلا سا بادل جو زخم کے پردہ کی طرح ہوتا ہے۔
الْجَلَالِيْبُ: اس کا واحد جَلْبَابٌ ہے جس کے معنی چادر یا تیس کے ہیں۔

ج ل ت

جَالُوْتُ: یہ اسمِ نجی ہے، عربی میں اس کی اصل نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوْتُ وَجُنُودِهِ﴾ (۲-۲۵)
اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل میں آئے۔

ج ل د

الْجِلْدُ: کے معنی بدن کی کھال کے ہیں اس کی جمع جُلُودٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

جو بیگنی اٹھائی جائے۔ اسی سے کنایہ ہر حقیر چیز کو جمل کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۵

(۹۱) كَلْ مَصِيْبَةٍ بَعْدَهُ جَلَلٌ

کہ ہر مصیبت اس کے بعد حقیر ہے۔

الْجُلُّ کے معنی مصحف کے غلاف کے ہیں پھر اس سے مصحف کو مَجْلَّةٌ کہا جانے لگا ہے۔ ۵ الْجُلُجَلَةُ جس کے معنی حکایت صوت کے ہیں وہ اس مادہ سے نہیں ہے اور اسی سے سَحَابٌ مُجَلَّجُلٌ کا محاورہ ہے، جس کے معنی گرجنے والے بادل کے ہیں۔ ہاں سَحَابٌ مُجَلَّلٌ کا محاورہ اس مادہ سے ہے، جس کے معنی عام بارش برسانے والے بادل کے ہیں۔ گویا وہ پانی اور نباتات سے زمین کو چھپا دیتا ہے۔

ج ل ب

الْجَلْبُ: (نض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ہٹانے اور چلانے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۵
(۹۲) وَقَدْ يَجْلِبُ الشَّيْءَ الْبَعِيْدَ الْجَوَابُ
کبھی جواب دور کی چیز کو کھینچ کر لے آتا ہے۔
أَجْلَبَ (افعال) عَلَيْهِ: کسی پر چلا کر زبردستی اسے آگے بڑھانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ﴾
(۱۷-۶۳) اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کو چڑھا کر

۱ لم اجدہ ومثله يوجد في شعراء القيس: الاكل شيء، سواء جلل وفي المزروقي ۴: ۲۰۰ (۱۰) قال زويهر بن الحرث فكل الذي لا يقيت من بعد جلل وايضا انشد ابن دريد: فعظيم كل مصيبة جلل.

۲ وفي التاج قال الراغب الجلل مكان الجلل والمصحف مكان الصحف وعليه اعتمدنا لان الجلل بالفك لم يرد في الاصول بهذا المعنى.

۳ لم اجدہ ويرجى.

۴ الحديث في الفائق ۱: ۱۰۴ والنسائي والضعاء عن ابن عمرو (حم ق، ن وابن حبان في زوائدہ رقم ۱۱۷۰ عن عمران بن حصين والطبراني عن انس وش عن عطاء ومرسلًا وش عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده راجع كنز العمال ۶: ۱۳۲۶ و ۱۳۲۸ و ۱۳۳۷ و ۱۳۳۹. في غريب القرآن للقبتي ۳۸۹ ولحذاري السدي والفراء وغيرهما ۱۲.

جَلَدَهُ: (ض) کسی کے چڑے پر مارنا۔ جیسے: بَطْنَهُ وَظَهْرَهُ اور اس کے دوسرے معنی دُرے لگانا بھی آتے ہے، جیسے: عَصَاہُ (یعنی لاشھی کے ساتھ مارنا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً﴾ (۲۳۲-۲۴) تو ان کو اسی (۸۰) درے مارو۔

الْجِلْدُ وَالْجِلْدُ: اونٹنی کے بچہ کی بھس بھری ہوئی کھال۔ جِلْدٌ (ك) جِلْدًا کے معنی قوی ہونے کے ہیں۔

صیغہ صفت جِلْدٌ وَجَلِيدٌ ہے اور اس کے اصل معنی اِكْتِسَابُ الْجِلْدِ قُوَّةً یعنی بدن میں قوت حاصل کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے: مَالَهُ مَعْقُولٌ وَلَا مَجْلُودٌ: اس میں نہ عقل ہے نہ قوت۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اَرْضٌ جَلْدَةٌ کہا جاتا ہے اس طرح قوی اونٹنی کو نَاقَةٌ جَلْدَةٌ کہتے ہیں۔

جَلَدْتُ كَذَا میں نے اس کی جلد باندھی۔

فَرَسٌ مَجْلَدٌ: مار سے نہ ڈرنے والا گھوڑا یہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ مُجَلَّدٌ شخص کو کہتے ہیں جسے مارنے سے درد نہ ہو۔ اَلْجَلِيدُ: پالا، بخ گویا صلابت میں چڑے کے تشابہ۔

ج ل س

الْجَلْسُ: اس کے اصل معنی سخت زمین کے ہیں۔ اسی لحاظ سے نَجْدٌ یعنی بلند زمین کو جَلْسٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے ﴿(۶۳) اَعْطَاهُمُ الْمَعَادِنَ الْقَبْلِيَّةَ عَوْرِيهَا وَجَلْسَهَا.....﴾ کہ آنحضرت نے

﴿كُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَلْتَهُمْ جُلُودًا﴾ (۵۶-۳) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے اس سے روکتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔

میں جُلُود سے مراد ابدان اور قلوب سے مراد نفوس ہیں اور آیت کریمہ:

﴿حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءَ وَهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا الْيَوْمَ لَئِن لَّمْ يَشْهَدْتُمْ عَلَيْنَا.....﴾ (۴۱-۲۱، ۲۰) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چڑے (یعنی دوسرے

اعضا) ان کے خلاف ان کے اعمال کی شہادت دیں گے اور وہ اپنے چڑوں (یعنی اعضا) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ جُلُودٌ سے فروج یعنی شرمگاہیں مراد ہیں۔

۱ وفی الفائق ۱: ۱۰۴ اعطی بلال بن الحارث معاون القبيلة جلسیها وغوریها والحديث فی (دق)، کرعن ابن عباس (دق) کثیر بن عبداللہ المزنی عن ابیہ عن جدہ (طب ک)، عن بلال بن الحارث راجع کثیر العمال ۳: ۳۹۸۷.

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا﴾ (۵۹-۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلاوطن کرنا نہ لکھ دیا ہوتا تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دے دیتا۔ اسی سے جلالی خبّر (کسی خبر کا ظاہر ہونا) وخبّر جلی (واضح خبر) وقیاس جلی (اور واضح قیاس) کے محاورات ہیں اور صیغہ صفت (فاعل) جلال مسوع نہیں ہے۔

جَلَوْتُ الْعَرُوسَ جُلُوءَ (وَجِلَاءً) دَہن کو بناؤ سنگھار کر کے پیش کرنا۔

جَلَوْتُ السَّيْفَ جِلَاءً تلوار کو میٹھل کیا۔ اَلسَّمَاءُ جَلُوءًا: آسمان بے ابر اور صاف ہے۔ رَجُلٌ أَجْلِيٌّ وہ شخص جس کے سر کے بال اڑ گئے ہوں۔ اَلتَّجْلِيُّ کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور ہویدا ہونا اور جلوہ بار ہونا اور یہ (تجلی) کبھی بالذات ہوتی ہے، جیسے: ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى﴾ (۹۲-۲) اور دن کی جب نمایاں طور پر روشنی ہو جائے۔

اور کبھی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے۔ ﴿جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ﴾ (۷-۱۳۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ افروز ہوا۔ کہا جاتا ہے: ﴿فَلَانُ ابْنُ جَلَاءٍ..... یعنی فلاں مشہور و معروف ہے ﴿

انھیں (ہلال بن حارث) قَبْلِيَّةَ کا میں نشیبی اور بلند سب کی سب (بطور جاگیر) عطا کر دیں۔

اصل میں جَلَسَ کے معنی انسان کے اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھنے کے ہیں۔ پھر محض بیٹھنے کو جُلُوس اور بیٹھنے کی جگہ کو مَجْلِس کہا جاتا ہے اور مَجْلِس کی جمع مَجَالِسُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۵۸-۱۱) جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کر خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

ج ل و

اَلجَلُوءُ: (ن) کے اصل معنی کسی چیز کے نمایاں طور پر ظاہر ہوجانا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَجْلَيْتُ النُّقُومَ عَنْ مَنَازِلِهِمْ فَجَلُوءًا عَنْهَا (یعنی) میں نے انھیں جلاوطن کیا تو وہ چلے گئے اور جِلَاءُ (متعدی) بھی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿ع

(۹۲) فَلَمَّا جَلَاهَا بِالْأَيَّامِ تَحَيَّرْتُ بُنَابٍ عَلَيْهَا ذُلُّهَا وَآكْتَابُهَا جب اہل گنیمت گیرندہ نے شہد کی مکھیوں کو دھواں کے ذریعہ سے دور ہٹایا تو وہ ٹکڑیاں ہو کر غم و اندوہ کے ساتھ ایک طرف سڑ گئیں

www.KitaboSunnat.com

۱ وفی التاج: واحلی يتعدى ولا يتعدى كلاهما ومن التالی المتعدی حدیك الحوض فيجلون عنه ای يتفون ويطردون .

۲ قاله ابو ذؤيب الهذلي يصف مشتاراً وفي رواية تحيرت بالراء المهمله والبيت في اللسان (جلا، ايم،) والاقضاب ۴۰۳ والبحر

۴۰۳ والبحر ۲۹۰:۳ والمعاني ۶۱۹ وفي رواية الديوان ايضاً تحيرت قال في التاج وبرى: فلما اجتلاها مكان جلاها.

۳ وقال الزجاج ان طهر وبان وهذا مذهب اهل السنة والمؤلف مال الى التاويل فزاع.

۴ قال سحيم بن وثيل الرياحي انا ابن جلا وطلاع الثنايا حتى اضع العمامة تعرفوني وقد تمثل الحجاج بقوله .

میں نہ رہنا یہ نشاط اور مَسْرَح سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر کسی آدمی کے سرکشی کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴾ (۹-۵۷) رسیاں تڑاتے ہوئے۔ الْجَمَاحُ: بے پھل کا تیز جس سے بچے کھیلنے ہیں اس کے سرے پر غلیبہ سا لگا ہوتا ہے۔

ج م ع

الْجَمْعُ: (ف) کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔ محاورہ ہے: جَمَعْتُهُ فَاجْتَمَعَ: میں نے اسے اکٹھا کیا، چنانچہ وہ اکٹھا ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَجَمَعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرَ ﴾ (۹-۷۵) اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔ ﴿ وَجَمَعَ فَأَوْعَى ﴾ (۷۰-۱۸) اور (مال) جمع کیا اور بند رکھا۔

﴿ جَمَعَ مَا لَا وَعَدَدَهُ ﴾ (۳-۱۰۴) مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ ﴿ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۶-۲۶) ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ ﴿ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴾ (۳-۱۵۷) تو جو (مال و متاع) لوگ جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش اور رحمت کہیں بہتر ہے۔

﴿ قُلْ لَّيْنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ ﴾ (۱۷-۸۸) کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں۔ ﴿ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴾ (۱۸-۹۹) تو ہم سب کو جمع کر لیں گے۔ ﴿ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُؤْمِنِينَ ﴾

أَجَلُوا عَنْ قَيْبِلٍ: وہ مشمول سے الگ ہو گئے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

ج م ج

الْجَمُّ: کے معنی ہر چیز کی کثرت اور زیادتی کے ہیں یہ جُمَّةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے اور جُمَّةُ الْمَاءِ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہت بڑی مقدار میں جمع ہو جاتا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَتَجُوبُونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴾ (۸۹-۲۰) اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

اصل میں الْجَمَام سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں راحت کے لیے کسی جگہ پر ٹھہر جانا اور محنت و مشقت چھوڑ دینا۔

جَمَامُ الْمَكْكُوكِ دَقِيقًا: آٹے سے لبالب بھرا ہوا موک جس میں مزید گنجائش نہ ہو۔ اور معنی کثرت کے لحاظ سے جُمَّةُ كَالْفَرْسِ لَوُغُوں کی اس بڑی جماعت پر بولا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جمع ہوں۔ نیز جُمَّةُ کے معنی ہیں، پیشانی کے مجتمع بال۔

جُمَّةُ الْبَيْرِ: پانی سے بھرا ہوا کنواں گویا کئی دنوں سے اس میں پانی جمع ہو رہا ہے اور متواتر اور سخت دوڑنے والے گھوڑے کو جَمُومُ الشَّدِيدِ کہا جاتا ہے۔

الْجَمَاءُ الْغَفِيرُ وَالْجَمُ الْغَفِيرُ: بجوم۔ لوگوں کی بڑی جماعت۔ شَأَةُ جَمَاء: بے سینگ کے بکری یہ جُمَّةُ النَّاصِيَةِ سے ہے۔

ج م ج

جَمَحَ (ف) جَمَحًا وَجَمَاحًا وَجَمُوحًا:

گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اور سوار کے قابو

جائیں گے۔

الْجُمَاعُ: مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہوں۔

شاعر نے کہا ہے ﴿ (سربلج)

بِجَمْعٍ غَيْرِ جُمَاعٍ (۹۳)

ایسا مجمع جو مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل نہ تھا۔ اور اَجْمَعْتُ

كَذَا عام طور پر اس عزم و ارادہ کے متعلق استعمال ہوتا

ہے، جس تک غور و فکر سے پہنچا جائے۔ جیسے فرمایا:

﴿ فَأَجْمَعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ﴾ (۱۰-۱۱) تم

اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر ایک کام (جو میرے بارے

میں کرنا چاہو) مقرر کر لو۔ اور شاعر نے کہا ہے ﴿ (رجز)

(۹۴) هَلْ اغْزُونَ يَوْمًا وَأَمْرِي مُجْمَعٌ

کیا میں کسی روز جنگ کروں گا اور میرا سامان حرب فراہم

ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ﴾ (۶۳-۲۰) تو تم (جادو کا)

سامان اکٹھا کرو۔

أَجْمَعَ الْمُسْلِمُونَ عَلَى كَذَا: کسی معاملہ پر امت

مسلمہ کا اتفاق ہو جانا۔ نَهَبٌ مُجْمَعٌ: لوٹ جو نہایت فکر و

تدبر سے حاصل کی جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ ﴾ (۳-۱۷۳) کے

بعض نے یہ بھی معنی کیے ہیں کہ انھوں نے تمہارے خلاف

تدبیر پر اتفاق کر لیا ہے۔ اور بعض نے لشکر کثیر جمع کرنا مراد

(۳-۱۴۰) کچھ شک نہیں کہ اللہ منافقوں..... کو جمع کرنے

والا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَى أَمْرٍ جَامِعٍ ﴾ (۲۳-۶۲)

اور جب کبھی ایسے کام کے لیے جو جمع ہو کر کرنے کا ہو،

پیغمبر خدا کے پاس جمع ہوں۔ میں امر جامع کے معنی اہم

معاملہ کے ہیں جس کے لیے لوگ جمع ہوں تو گویا اس

معاملے نے ان کو جمع کر لیا ہے۔

﴿ ذَلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَهُ النَّاسُ ﴾ (۱۱-۱۰۳) یہ

وہ دن ہوگا جس میں سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے۔

جیسے فرمایا:

﴿ يَوْمَ الْجَمْعِ ﴾ (۲۲-۷) قیامت کے دن کا۔

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ﴾ (۶۳-۹) جس

دن وہ تم کو اکٹھا ہونے (یعنی قیامت) کے دن اکٹھا

کرے گا۔

اور مَجْمُوعٌ، جَمْعٌ، جَمِيعٌ اور جَمَاعَةٌ کے ایک

ہی معنی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّقْيِ الْجَمْعِ ﴾ (۳-۱۶۶)

اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے دن

واقع ہوئی۔

﴿ وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴾

(۳۶-۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کیے

① قاله ابو القيس بن اسلم اسلمی يصف الحرب واوله : حتى انتهينا ولناغاية وفي الرواية اللسان (عم) من بين جمع بدل

بجمع وثم تحلت بدل انتهينا والبيت من كلمة مفضلية ۲: ۸۵ في ۲۴ بيند وراجع للبيت ايضاً المرزوقى ۱۰۸۶ والافتضاب ۳۵۸

وتهذيب الالفاظ ۳۷ والمحکم (جمع والجمهرة ۲۳۵ وفيه حتى التقينا وفي الفائق ۱: ۱۱۰) من بين وغير جماع.

② قاله الراجز واوله "باليست شعري والمنى لاتنفع فى اللسان" (جمع وفيه اغزون بدل اغزون راجع الطبرى

۱۸۳: ۱۱/۱۴۱) والسبوتى ۲۷۴ وشرح السبع لابن الانبارى ۴۵۲ وشواهد الكشاف (۷۰) وفي اصلاح يعقوب ۲۶۳

غير منسوب وامالى المرتضى ۱: ۵۵۹) والبحر ۵: ۱۷۹).

لیا ہے۔ جَمَعُوا کے معنی نماز جمعہ ادا کرنے یا جامع یا جماعت میں حاضر ہونے کے ہیں۔ اَتَانُ جَامِعٌ: حاملہ گدھی۔ قَدْرٌ جَامِعٌ: بڑی دیگ۔ اِسْتَجَمَعَ الْفَرَسُ جَرِيًّا کے معنی ہیں گھوڑا سر پٹ دوڑا، پوری قوت سے بھاگا۔ اس میں جمع کے معنی ظاہر ہیں۔ مَاتَتِ الْمَرْءَةُ بِجُمُعٍ: حمل کی حالت میں مر گئی۔ یہ محاورہ بھی عورت اور اس کے حمل میں اجتماع کے تصور پر استعمال ہوتا ہے۔ هِيَ مِنْهُ بِجُمُعٍ: (وہ اپنے خاوند سے) ابھی حالت دو شیرگی میں ہے۔ میں یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کے خاوند نے جماعت کر کے اس کے پردہ بکارت کو زائل نہ کیا ہو۔

ضَرَبَهُ بِجُمُعٍ كَفَّهُ اس نے اسے مکارا۔ اَعْطَاهُ مِنَ الدَّرَاهِمِ جُمُعَ الْكُفِّ: اسے مٹھی بھر درہم دیئے، اَلْجَوَامِعُ: زنجیر، طوق، کیونکہ اس سے ہاتھ پاؤں باندھے جاتے ہیں۔

(ج م ل)

اَلْجَمَالُ کے معنی حسن کثیر کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔

(۱) خوبی جو خاص طور پر بدن، نفس یا عمل میں پائی جاتی ہے۔

(۲) وہ خوبی جو دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اسی معنی میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ①

جَمِيعٌ وَاَجْمَعُ وَاَجْمَعُونَ: یہ تینوں الفاظ کسی امر پر اجتماع کی تاکید کے لیے استعمال ہوتے ہیں لیکن اَجْمَعُونَ کا لفظ ہمیشہ اسم معرفہ کی صفت بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی بھی حال بن کر منسوب نہیں ہوتا، جیسے فرمایا: ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُونَ﴾ (۳۸-۷۳) تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ ﴿وَاَتُونِي بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِينَ﴾ (۱۲-۹۳) اور اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔

اور جَمِيعٌ کا لفظ کبھی منسوب علی الحال ہو کر تاکید کا فائدہ دیتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ (۲-۲۸) تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ ﴿فَكَيْدُنِي جَمِيعًا﴾ (۱۱-۵۵) تم سب مل کر میرے بارے میں (جو) تدبیر (کرنی چاہو) کرو۔

اور جمعہ کے دن کو يَوْمُ الْجُمُعَةِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں لوگ نماز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۶۲-۹) جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (یعنی نماز) کے لیے جلدی کرو۔

اور مسجد الجامع کی اصل مَسْجِدُ الْاَمْرِ الْجَامِعِ او الوقت الجامع ہے۔ لہذا یہاں جامع مسجد کی صفت

① وفي الحديث اي امرأة ماتت بجمع اولم تطمث دخلت الجنة راجع النهاية ۱: ۲۰۶) والفاق ۱: ۲۱۱ واللسان (جمع) وغريب ابی عبيد ۱: ۱۲۵) والحديث في (د) جناز (ن) جناز (جم) ۳۰۵: ۵.

② وفي اضداد ابی الطيب ۱۷۸: ومنه قول الدهناء بنت مسهل: افي منه جمع.

③ الفائق ۱: ۱۰۵) والحديث باختلاف الفاظه البيهقي وابو يعلى عن ابی سعيد ومسلم والترمذی من رواية عبدالله ابن مسعود والطبرانی عن ابی امامة: و (ك) عن ابن عمر راجع للتفصيل الفتح الكبير نهانی ۱: ۳۳۱) وتخریج الكشاف ص ۴۳ رقم ۳۶۰ و كنز العمال.

اور فقہانے مجمل کی تعریف میں جو یہ کہا ہے کہ الْمُجْمَلُ مَا يَحْتَاجُ إِلَى الْبَيَانِ کہ مجمل وہ ہوتا ہے جو بیان کا محتاج ہو تو یہ مُجْمَلُ کی تحدید یا تفسیر نہیں ہے، بلکہ صرف اس کی ایک حالت کا ذکر ہے جو بعض لوگوں کو پیش آتی ہے اور شے کی تحدید میں اس کے کسی کو پیش آتی ہے، اور شے کی تحدید میں اس کے کسی ایسے ذاتی وصف کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے، جس سے وہ ممتاز ہو جائے اور مجمل درحقیقت وہ ہے جو بہت سی اشیاء کے ایسے مجموعہ پر مشتمل ہو جن کی تلخیص نہ کی گئی ہو۔

الْجَمَلُ: جوان اونٹ، جو کم از کم پانچ سال کا ہو۔ اس کی جمع جَمَالٌ وَاجْمَالٌ وَجَمَالَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۴-۳۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور آیت کریمہ ہے: ﴿كَأَنَّهُ جِمَلَةٌ صُفْرٌ﴾ (۴۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ میں جِمَلَةٌ جَمَالَةٌ کی جمع ہے اور جَمَالَةٌ جَمَلٌ کی اور ایک قرأت میں جَمَالَاتٌ بضم جیم ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی جوان اونٹیوں کے ہیں اَلْجَاوِلُ: اونٹوں کا گلہ جن کے ساتھ ان کا چرواہا بھی ہو یہ باقر کی طرح ہے اور اَتَّخَذَ اللَّيْلُ جَمَلًا (کہ اس نے رات کو اونٹ بنا لیا) محاورہ مجاز پر محمول ہے جس کے معنی ہیں: اس نے ساری رات سفر کیا۔ جیسا کہ رَكِبَ اللَّيْلُ کا محاورہ ہے اور اونٹ کو جَمَلٌ کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عرب لوگ اونٹ کو اپنے لیے باعث زینت اور فخر سمجھتے تھے جیسا کہ آیت: ﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ﴾

(۶۶) إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے خیرات کثیرہ کا فیضان ہوتا ہے لہذا جو اس صفت کے ساتھ متصف ہوگا۔ وہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوگا۔ اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ﴾ (۱۶-۱۶)

اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو..... تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔

اور جَمِيلٌ وَجَمَالٌ وَجَمَالٌ: مبالغہ کے صیغے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ (۱۲-۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے) ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا﴾ (۵۰-۵) تو تم (کافروں کی باتوں کو) حسن صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہو۔ جَا مَلْتُ فُلَانًا۔ کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا تو اضع اعساری سے پیش آنا۔ اَجْمَلْتُ فِي كَذَا: کسی کام کو عمدگی سے سرانجام دینا۔ اعتدال اختیار کرنا جَمَالَكَ: یعنی اعتدال سے کام لو۔ پھر اس سے کثرت کے معنی کا اعتبار کر کے ہر مجموعہ اشیاء کو جملہ کہتے ہیں اسی سے مجموعی حساب کو بھی جس کی تفصیل نہ کی گئی ہو جملہ کہا جاتا ہے۔ اور جس کلام کی تفصیل بیان نہ کی گئی ہو اسے مُجْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اَجْمَلْتُ النِّحْسَابَ وَاجْمَلْتُ فِي الْكَلَامِ کے معنی حساب یا کلام کو اجمال سے بیان کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً﴾ (۲۵-۳۲) اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن پاک ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔

(۶۳-۲) انہوں نے اپنی قسوں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔
اور حدیث میں ہے ﴿(۶۵) اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ﴾ کہ روزہ
ڈھال ہے۔

اَلْجَنَّةُ: ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ
آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿لَقَدْ
كَانَ لِسَبَّأٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ
وَسِمَالٍ﴾ (۳۳-۱۵) (اہل) سبائے کے لئے ان کے
مقام بود و باش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک
دائیں طرف اور (ایک) بائیں طرف۔

﴿وَلَوْ لَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ﴾ (۱۸-۳۹) اور (بھلا)
جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو..... کیوں نہ۔
بعض نے کہا ہے کہ ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا
ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اسی معنی میں شاعر نے
کہا ہے ﴿ (بیٹ)

(۹۵) مِنَ النَّوَاضِحِ تَسْقِيْ جَنَّةٍ سَحِيْحًا
اور نخلستان کو سیراب کرنے والی سدھائی ہوئی اونٹنی پر
رکھے ہوتے ہیں۔

اور بہشت کو جنت یا تو ونیوی باغات سے تشبیہ دے کر
کہا گیا ہے، اگرچہ دونوں میں بون بید ہے اور یا اس لئے
کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں، جیسا کہ
فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ
أَعْيُنٍ﴾ (۳۲-۱۷) کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ جَمَلْتُ الشَّحْمَ: چربی
گھلانا اور گھلائے ہوئی چربی کو اَلْجَوِيْلُ کہا جاتا ہے اور
اَجْتَمَالُ کے معنی چربی کو بطور تیل ملنے کے ہیں، ایک
عورت نے اپنی لڑکی سے کہا:
تَجَمَّلِيْ وَتَعَفَّفِيْ: یعنی چربی گھلا کر کھایا کرو۔ اور
عفافہ یعنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ پیا کرو۔

(ج ن ن)

اَلْجَنَّ (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ
کرنے کے ہیں، چنانچہ محاورہ ہے: جَنَّةُ اللَّيْلِ وَالْجَنَّةُ
اسے رات نے چھپالیا۔ جَنَّ عَلَيْهِ: اسے جنون ہو گیا۔
پس جَنَّةُ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں، اور اَجَنَّةُ
کے معنی چھپانے کے لئے کوئی چیز دینے کے ہیں، جیسے:
قَبْرَتُهُ وَأَقْبْرَتُهُ وَسَقِيَّتُهُ وَأَسْقِيَّتُهُ جَنَّ عَلَيْهِ
کذا۔ کسی چیز نے اسے چھپالیا۔

قرآن پاک میں ہے۔
﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا﴾ (۶-۷۷)
جب رات نے ان کو (پردہ تاریکی سے) چھپا دیا تو انہوں
نے ایک ستارہ دیکھا۔

اَلْجَنَانُ: دل کیونکہ وہ حواس سے مستور ہوتا ہے۔
اَلْمَجْنُ وَالْهَجَجَةُ: ڈھال۔ کیونکہ اس سے انسان
اپنے آپ کو بچاتا اور چھپاتا ہے۔
قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اتَّخَذُوا اِيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾

① ای یقی صاحبہ من الشهوات انظر للحديث النهاية ۱: ۲۱۴ واللسان (جنن) وزوائد ابن حبان - عن كعب بن عميرة انظر رقم

۲۵۰۳ و ۲۶۱ و ۱۵۶۹.

② قاله زهير بن ابي سلمى واوله - كان عمي في غربي مقلته والبيت في ديوانه مع شرح الاعلام الشنتمري ۱۱۷ طبعة ليدان ۱۳۰۶
والعقد الثمين ۸۴ واللسان (قتل) شواهد الكشاف ۸۲ ومختار الشعر الجاهلي ۱: ۱۷۱ والبحر ۳/۱۳۰۵/۳۴۷.

- کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جَنَاتِ جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔^①
- (۱) جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ
(۲) جَنَّةُ عَدْنِ
(۳) جَنَّةُ النَّعِيمِ
(۴) دَارُ الْخُلْدِ
(۵) جَنَّةُ الْمَأْوَى
(۶) دَارُ السَّلَامِ
(۷) عِلِّيِّينَ
- الْجَنِّينَ: بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں رہے اسے جَنِّينَ کہا جاتا ہے، اس کی جمع اَجِنَّةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ ﴿وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۵۳-۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔
- اور یہ یعنی جنینِ فعیل بمعنی مفعول سے ہے یعنی چھپا ہوا۔ الْجَنِّينَ: قبر کو بھی کہتے ہیں۔ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ یعنی چھپانے والی۔
- الْجِنُّ: جن (اس کی جمع جِنَّةٌ آتی ہے اور) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔
- (۱) انسان کے مقابلہ میں ان تمام روحانیوں کو جن کہا جاتا ہے جو حواس سے مستور ہیں۔ اس صورت میں جن کا لفظ ملائکہ اور شیاطین دونوں کو شامل ہوتا ہے۔ لہذا تمام فرشتے جن ہیں لیکن تمام جن فرشتے نہیں ہیں، اسی بنا پر ابوصالح نے کہا ہے کہ سب فرشتے جن ہیں۔
- (۲) بعض نے کہا ہے کہ نہیں۔ بلکہ جِنُّ روحانیوں کی ایک قسم ہیں کیونکہ روحانیت تین قسم ہیں۔
- (۱) اَخْيَارُ (نیک) اور یہ فرشتے ہیں۔
- (۲) اَشْرَارُ (بد) اور یہ شیاطین ہیں۔
- (۳) اَوْسَاطُ جن میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔
- اور یہ جن ہیں۔ چنانچہ سورت جن کی ابتدائی آیات: ﴿قُلْ أَوْحَىٰ إِلَيَّ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ﴾ (۴۲-۴۱) اور یہ کہ ہم بعض فرمانبردار ہیں اور بعض (نافرمان) گنہگار ہیں۔
- اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔
- الْجِنَّةُ: جنوں کی جماعت قرآن میں ہے: ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ (۱۱۳-۶) (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔ ﴿وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ (۳۷-۱۵۸) اور انہوں نے خدا میں اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا۔
- الْجِنَّةُ: (ایضا) جنوں۔ دیوانگی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَا بَصَابِحِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ﴾ (۷-۱۸۳) کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو (کسی طرح کا بھی) جنوں نہیں ہے۔
- اور دیوانگی کو جنوں اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے دل اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ جُنَّ فُلَانٌ۔ اسے جن لگ گیا۔
- امراض کے معانی میں دوسرے افعال کی طرح یہ بھی فعل

② وفى الفتح ۴: ۲۸: ملح المؤلف (البخاری) ههنا باسماء الجنة وهما عشرة وتزيد سبعة المذكورة (۸) دارالمقامة (۹) المقام الامين و(۱۰) مقعد صدق و(۱۱) الحسنیٰ وكلها فى القران وزاد بعضهم دارالحيوان احدًا من الایة وفيه نظر.

﴿فَتَكُونُ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ﴾ (۹-۳۵)
پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو..... دانگے
جائیں گے۔

﴿تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ (۳۲-۱۶)
ان کے پہلو بچھوڑوں سے الگ رہتے ہیں۔

پھر بطور استعارہ پہلو کی سمت کے معنی میں استعمال ہونے لگا
ہے۔ جیسا کہ یمن، وشمال اور دیگر اعضا میں عرب لوگ
استعارات سے کام لیتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ع
(اکامل)

(۹۶) وَمَنْ عَنِ يَمِينِي مَرَّةً وَأَمَامِي

کبھی دائیں جانب سے اور کبھی سامنے سے اسی سے
جَنْبُ الْحَائِطِ وَجَانِبِهِ كَامْحَارُوهُ ہے۔ یعنی دیوار کی
جانب۔

اور ﴿الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ (۳-۳۶) کے معنی
قریبی دوست کے ہیں، اور آیت کریمہ: ﴿يَحْسُرَتِي
عَلَىٰ مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ﴾ (۳۹-۵۶)
کہ (ہائے ہائے) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا
کے حق میں کی۔

میں جَنْبِ اللَّهِ سے خدا تعالیٰ کے اوامر اور حدود مراد
ہیں جو اس نے ہمارے لئے مقرر فرمادئے ہیں۔

سَارَ جَنْبِيَّةً وَجَنْبِيَّتَهُ وَجَنْبِيَّةً وَجَنْبِيَّتَهُ اس کے
پہلو پر چلا و جَنْبِيَّتَهُ میں اس کے پہلو پر مارا جیسے کبڈتہ

جھول ہی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے زُكْمٌ (اسے زکام
ہو گیا) لُفْيَ (اسے لٹوہ ہو گیا) حُمٌ (اسے بخار ہو گیا)
وغیرہ بعض نے کہا ہے کہ جُنُ فُزَانٍ کے معنی ہیں: اس کے
قلب کو عارضہ ہو گیا۔ اور بعض نے کہا کہ دیوانگی نے اس
کی عقل کو چھپا لیا اور آیت کریمہ: ﴿مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ﴾
(۳۳-۱۳) کے معنی ہیں کہ اسے وہ جن چمٹا ہوا ہے جو
اسے تعلیم دیتا ہے اور یہی معنی آیت: ﴿إِنَّمَا لَسَارِ كُورًا
الْيَهْتَنَّا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٌ﴾ (۳۷-۳۶) کہ بھلا ایک
دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ
دینے والے ہیں۔ میں شاعر مجنون کے ہیں۔

جُنُ التَّلَاحِ وَالْأَفَاقِ: یعنی نیلیوں اور ان کے گرد و نواح کو
گھاس نے چھپا لیا، اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَالْجَانَّ خَلَقْنَا
مِنْ قَبْلِ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾ (۱۵-۲۷) اور جان کو اس
سے بھی پہلے بے دہوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔
میں جَانٌّ سے بھی جنون کی ایک قسم مراد ہے۔ لیکن
آیت کریمہ: ﴿كَأَنَّهُمَا جَانٌّ﴾ (۲۷-۱۰) میں جَانٌّ
سے ایک قسم کا سانپ مراد ہے۔

(ج ن ب)

الْجَنْبُ: اصل میں اس کے معنی پہلو کے ہیں، اس کی جمع
جُنُوبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قِيَامًا وَقُعُودًا
وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ (۳-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے اور
پہلوؤں پر لیٹے ہوئے۔

① الحان ابو الحسن عن ابن عباس وابليس عن قتادة وعند بعض ابو الشيطان ابليس راجع عثمان ۵۳: ۴.

② البيت لقطري بن فحاة الماني احد زعماء الخوارج في زمان مصعب بن الزبير ۶۶۶ هـ سنة ۷۶ واسمه حجر بن مزك وصدرة :
فلقاراني للاماح وريفة والبيت في الحماسة مع المزروقي رقم ۲۰ والشجری ۲۵۴: ۲ و۲۲۹) والقالی (۲: ۱۸۶) والخزانة
۲۵۸: ۴ وابن عقيل ۱: ۲۳۴ وابن هشام رقم ۲۶۵ واستشهد به النجاة على ان لفظه "من قد تكون اسماً بمعنى جانب قال ابن هشام
وذلك يتعين في ثلاثة مواضع احدها ان يدخل عليها من وهو كثير كقول الشاعر .

معنی یہ ہیں کہ انہوں نے طاعت کی عبادت بیکسر ترک کر دی اس طرح وہ طاعت سے دور رہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۵-۹۰) سوان سے بچنے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ اور یہ یعنی اجتنبوا ہنسبت اُترکوا کے زیادہ بلوغ ہے۔

جَنَّبَ بَنُو فُلَانٍ بِرِشْدَانِ توم۔

جَنَّبَ فُلَانٌ خَيْرًا - فلاں خیر سے محروم ہو گیا۔

جَنَّبَ شَرًّا - وہ شر سے دور رہا۔ چنانچہ قرآن پاک میں نار جنم کے متعلق ہے:

﴿وَسَيَجْزِيهَا الْآلِئِيُّ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى﴾

(۹۲-۱۷، ۱۸) اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اس (نار) سے

بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے، تاکہ پاک ہو، لیکن اگر

مطلق یعنی بغیر کسی متعلق کے جَنَّبَ فُلَانٌ کہا جائے تو

اس کے معنی خیر سے محروم ہونا ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح

دعائے خیر کے لئے بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور

آیت کریمہ ہے:

﴿وَاجْتَنِبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾ (۱۳-۳۵)

اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش

کرنے لگیں، بچائے رکھ۔

میں اُجْنَبْنِي، جَنْبَتُهُ عَنْ كَذَا سے ماخوذ ہے جس

کے معنی کسی چیز سے دور رکھنے اور بچانے کے ہیں۔ بعض

نے کہا ہے کہ یہ جَنْبَتُ الْفَرَسِ کے محاورہ سے ماخوذ

میں نے اس کے کلیجے پر مارا فَأَدَّتْهُ: میں نے اس کے

فؤاد یعنی دل پر مارا۔ جُنِبَ الرَّجُلُ..... پہلو کے درو

میں مبتلا ہونا جیسے كَبِدَ وَفُؤَادَ اور جَنْبُ سے فعل دوم معنوں

کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک، کسی کی سمت مخالف کو جانایا

اس سے دور ہونا۔ دوم سمت موافق کو آنا یا اس کے قریب

ہونا۔ اول معنی کی مثال جیسے جَنْبَتُهُ وَأَجْنَبْتُهُ میں نے

اسے جانب مخالف یعنی دور کر دیا۔ اسی سے۔ ﴿الْجَارِ

الْجُنْبِ﴾ (۳-۳۶) ہے جس کے معنی اجنبی یعنی دور

کے ہمسایہ کے ہیں، شاعر نے کہا ہے ﴿الطَّوِيلِ﴾

(۹۷) فَلَا تَحْرِمْنِي نَائِلًا عَنْ جَنَابِيَّةِ

تو مجھ جیسے غریب الوطن کو دور ہی سے عطا سے محروم نہ کر

رَجُلٌ جَنْبٌ وَجَانِبٌ اجنبی آدمی۔

الْأَجْنَابُ: (افتعال) بچنا، یکسو رہنا، پہلو تہی کرنا،

قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ

عَنْهُ﴾ (۳-۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جس

سے تم کو منع کیا جاتا ہے۔ اجتناب رکھو گے۔

﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ﴾ (۵۳-)

(۳۲) جو..... بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب

کرتے ہیں۔

﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾ (۲۲-۳۰) اور جھوٹی

بات سے اجتناب کرو، اور آیت کریمہ: ﴿وَاجْتَنِبُوا

الطَّاعُونَ﴾ (۱۷-۳۹) میں بتوں سے اجتناب کے

① قاله علقمة بن عبدة التميمي المعروف بعلقمة الفحل صاحب امرء القيس يخاطب به الحارث بن جبلة يمدحه وكان قد اسرأخاه

شاسا في تسعين رجلا من بني تميم وتمامه..... فأنى امرء وسط انقباب غريب والبيت في ديوانه من السنة ۱۰۷ والمفضليات

(۱۹۴: ۲) والكامل ۷۲۳ والزجاج ۷۱: ۱ مخطوطة (والششمري ۲: ۴۲۳) والقرطبي ۵: ۱۳/۱۸۳ (۲۵۷: ۲) واللسان والتاج

(جيب) ابو عبيدة ۲: ۱/۹۸۰ (۱۲۶: ۱) وشواهد الشافيه ۴۹۴ ومختار الشعر الجاهلي ۱: ۳۲۳) والبحر ۳: ۲۳۰) وامالي التجريه

(۱۴: ۱) والعمدة ۱: ۵۷) والعقد الثمين ۱۰۷-وايام العرب ۵۸.

مجاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی اس کا بازو توڑ دینا کے ہیں،
قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا طَائِرٌ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (۶-۲۸) یادو
پرندوں سے اڑنے والا جانور ہے۔

پھر کسی چیز کے دونوں جانب کو بھی جَنَاحَيْنِ کہہ دیتے ہیں۔
مثلاً جَنَاحَا السَّفِينَةِ (سفینہ کے دونوں جانب) جَنَاحَا
العَسْكَرِ (لشکر کے دونوں جانب) اسی طرح جَنَاحَا
الْوَادِي وادی کے دونوں جانب اور انسان کے دونوں پہلوؤں
کو جَنَاحَا الْإِنْسَانِ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَضْمُ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ﴾ (۲۰-۲۲) اور اپنا
ہاتھ اپنے پہلو سے لگا لو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَأَضْمُ
إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (۲۸-۳۲) اور خوف
دور ہونے (کی وجہ) سے اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑ لو۔

میں جَنَاحٌ بمعنی يَدٌ کے ہے۔ کیونکہ پرند کا بازو اس کے
لیے بمنزلہ ہاتھ کے ہوتا ہے، اسی لئے جَنَاحَا الطَّيْرِ
کو يَدَا الطَّيْرِ بھی کہا جاتا ہے، اور آیت کریمہ:

﴿وَأَخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾
(۱۷-۲۴) اور عاجز و نیاز سے اٹکے آگے جھکے رہو۔

میں ذُلٌّ کے لئے جَنَاحٌ بطور استعارہ ذکر کیا گیا ہے
کیونکہ ذُلٌّ یعنی ذلت و انکساری دو قسم پر ہے، ایک ذلت
وہ ہے جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرا دیتی ہے اور دوسری
وہ ہے جو انسان کے مرتبہ کو بلند کر دیتی ہے، اور یہاں
چونکہ ذلت کی دوسری قسم مراد ہے، جو انسان کو اس کے
مرتبہ سے گرانے کی بجائے بلند کر دیتی ہے، اس لئے

ہے جس کے معنی کوتل ہانکنا کے ہیں۔ اور گویا حضرت
ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اپنے لطف
و کرم اور اسباب مخفیہ کے ذریعہ اسے شرک کی
جانب سے کھینچ لائے اور اسی طرح اس سے دور رکھے۔

الْجَنَبُ: (ایضاً) پیدائشی طور پر پاؤں کا ایک دوسرے سے
دور ہونا اور آیت کریمہ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾
(۵-۶) کے معنی یہ ہیں کہ جب تم حالت جنابت میں
ہو کر تو غسل کر لو۔ اور شرعاً جَنَابَةٌ کا لگنا یا تو
انزال یعنی خروج منی سے ثابت ہوتا ہے، اور یا دو وقتوں
کے التقاء یعنی مرد کے عضو تناسل کے عورت کی شرم گاہ
میں داخل ہونے سے اور جنسی ہونے کے معنی میں جَنَبٌ
(ك، ن، س) وَتَجَنَّبَ وَاجْتَنَّبَ تینوں باب
استعمال ہوتے ہیں، اور جَنَابَةٌ کو جنابت اس لئے کہا گیا
ہے، کہ یہ شرعاً نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہے۔

الْجَنُوبُ: (جنوبی ہوا) اس میں کعبہ کی جانب سے
آنے اور اس کی جانب جانے دونوں معنی کا اعتبار ہو سکتا
ہے کیونکہ اس میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں،
جَنُوبٌ سے جَنَّبَتِ الرِّيحُ کا مجاورہ لیا گیا ہے، جس
کے معنی جنوبی ہوا چلنے کے ہیں۔

أَجْنِبْنَا: ہم جنوب میں داخل ہوئے۔ جُنَيْبًا ہمیں جنوبی
ہوا لگی۔ سَحَابَةٌ مَجْنُوبَةٌ وہ بادل جسے جنوبی ہوا چلا کر
لائی ہو۔

(ج ن ح)

الْجَنَاحُ: پرند کا بازو۔ اسی سے جَنَحَ الطَّائِرِ کا

① ایضاً جنب بمعنی بعيد كما فى قوله تعالى فبصرت به عن جنب ۲۸-۱۱ عن بعد ۱۲۔

② وفى الحديث عن عائشة: اذا مس الختان فقد وجب الغسل وفى رواية جاوزو هذا يوضح المراد راجع العون ۱: ۱۲)۔

(ج ن د)

الْجُنْدُ کے اصل معنی سلستان کے ہیں بمعنی غلظت اور شدت کے اعتبار سے لشکر کو جُنْدُ کہا جانے لگا ہے۔ اور مجازاً ہر گروہ اور جماعت پر جُنْدُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے (حدیث میں ہے ﴿﴾ الْآرَوَاحُ جُنُودٌ مُّجَنَّنَةٌ: کہ ارواح کے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں، قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ (۱۷۳-۳۷) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

﴿إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُونَ﴾ (۲۳-۲۳) (تمہارے بعد) ان کا تمام لشکر ڈبو دیا جائے گا۔

اور جُنْدُ کی جمع اَجْنَادٌ وَجُنُودٌ آتی ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَجُنُودٌ اِنْلِيسَ اَجْمَعُونَ﴾ (۹۵-۲۶) اور شیطان کے لشکر سب کے سب داخل جہنم ہوں گے۔

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ (۳۱-۷۴) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور آیت کریمہ: ﴿اُذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ (۹-۳۳) خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں پہلے جُنُود سے مراد کفار کی فوجیں ہیں اور

جناح کا لفظ بطور استعارہ (یعنی معنی رفعت کی طرف اشارہ کے لئے) استعمال کیا گیا ہے، گویا کہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ رحمت الہی حاصل کرنے کے لئے اس کے سامنے ذلت کا اظہار کرتے رہو، اور یا یہ معنی ہیں کہ ان پر رحمت کرنے کے لئے ذلت کا اظہار کرو۔

جَنَحَتِ الْعَيْرُ فِي سَبِيلِهَا: قافلہ تیزی سے چلا۔ گویا وہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑ رہا ہے۔ جَنَحَ اللَّيْلُ: رات کی تاریکی چھا گئی، اَلْجُنْحُ: رات کا سیاہ حصہ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَنَّ جَنَحُوا لِّلسَّلْمِ فَاَجْنَحَ لَهَا﴾ (۶۱-۸) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔

میں جَنَحُوا کے معنی مائل ہونے کے ہیں یہ جَنَحَتِ السَّفِينَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کشتی کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ اسی لئے ہر وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کر دے اسے جُنْحٌ کہا جاتا ہے، پھر عام گناہ کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے، قرآن پاک میں متعدد مواضع پر لَاجِنَاحَ عَلَيْكُمْ آیا ہے۔

جَوَانِحُ الصُّدُورِ (دوپلیٹیاں جن کے سرے سینے کے وسط میں باہم متصل ہوتے ہیں۔ اس کا واحد جَانِحَةٌ ہے اور ان پلیٹوں کو جَوَاحِ اسی لئے کہا جاتا ہے، کہ ان میں میلان یعنی خم ہوتا ہے۔

① وتمامہ: فماتعارف منہما اتسلف وماتناكرمنہما اختلف محاضرات للمؤلف ۳: ۵۳) والحديث اخرجه مسلم من حديث ابى هريرة والبخارى تعليقاً من حديث عائشة والطبراني من حديث ابن مسعود وبمعناه اخرجه الطبراني في الاوسط من حديث علي وفيه قصة امرء تيس المكية والمدينه اخرجه الحسن بن سفيان في مسنده بسند حسن والديلمي والحزائطي في التلاف القلوب عن علي ومسند عن عمرو بمعناه السلفي في انتخاب حديث الفراء راجع تحريج الاحياء للعراقي ۲: ۱۶۶-۱۶۷ وادب الدنيا والدين للماوردي ۲۹۱ بشرح حنان زاده وكنز العمال ۹ رقم ۳۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۹۲۱ و ۹۲۳۔

اس معنی میں آتا ہے۔

دوسرے سے فرشتوں کے لشکر مراد ہیں، جو انہیں نظر نہیں آتے تھے۔

(ج ۵ د)

الْجَهْدُ وَالْجُهْدُ کے معنی وسعت و طاقت اور تکلیف و مشقت کے ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ الْجَهْدُ بفتح جیم کے معنی مشقت کے ہیں اور الْجُهْدُ (بضم جیم) طاقت اور وسعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ الجهد کا لفظ صرف انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ﴾ (۹-۷۹) اور جنہیں اپنی محنت و مشقت (کی کمائی) کے سوا کچھ میسر نہیں ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ﴾ (۱۶-۳۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑی زور زور سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ اس میں اپنی انتہائی کوشش صرف کریں گے۔

الْأَجْتِهَادُ: (اتعمال) کے معنی کسی کام پر پوری طاقت صرف کرنے اور اس میں انتہائی مشقت اٹھانے پر طبیعت کو مجبور کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: جَهَدْتُ رَأْسِي وَأَجْهَدْتُهُ میں نے غور و فکر سے اپنی رائے کو مشقت اور تعب میں ڈالا۔

الْجِهَادُ وَالْمُجَاهَدَةُ: دشمن کے مقابلہ اور مدافعت میں اپنی انتہائی طاقت اور وسعت خرچ کرنا۔ اور جہاد تین قسم پر ہے (۱) ظاہری دشمن یعنی کفار سے جہاد کرنا۔ (۲) شیطان اور (۳) نفس سے مجاہدہ کرنا۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ (۲۲-۷۸) کہ اللہ کی راہ میں پوری طرح جہاد کرو..... تینوں قسم

(ج ن ف)

الْجَنَفُ: اس کے اصل معنی فیصلہ میں ایک طرف مائل ہونے (یعنی جانبداری یا ظلم کرنے) کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصِنَ جَنَفًا﴾ (۲-۱۸۲) اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری کا اندیشہ ہو۔ میں صریح طور پر جانب داری مراد ہے، اسی طرح فرمایا: ﴿غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِأَيِّمٍ﴾ (۵-۳) (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو۔

(ج ن ی)

جَنَيْتُ (ض) جَنِئًا - الثَّمَرَةَ وَاجْتَنَيْتُهَا میں نے درخت سے پھل توڑا۔
الْجَنِيُّ وَالْجَنِيَّةُ: چنے ہوئے پھل، چھتہ سے نکالا ہوا شہد لیکن عام طور پر جَنِيَّةُ تازہ پھل کو کہتے ہیں جو حال ہی میں توڑا گیا ہو، قرآن پاک میں ہے: ﴿تَسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِيًّا﴾ (۱۹-۲۵) تم پر تازہ کھجوریں چھڑ پڑیں گی۔

﴿وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ﴾ (۵۵-۵۴) اور دونوں بانگوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔
الْجَنِيُّ الشَّجَرُ: درخت کے پھل پک گئے توڑنے کے قابل ہو گئے۔ أَجْنَسَتِ الْأَرْضُ - زمین زیادہ پھلوں والی ہو گئی۔ اسی سے یعنی پھل توڑنے کے معنی سے بطور استعارہ جَنِيٌّ فَلَانٌ جِنَايَةٌ گناہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اجترَمَ کا محاورہ بطور استعارہ

طور پر خدا دکھا دو۔

اور اسی معنی سے جَهْرَ الْبِئْرِ وَاجْتَهَرَهَا ہے، جس کے معنی ہیں اس نے کنواں (کو صاف کر کے) اس کا پانی ظاہر کر دیا۔ محاورہ ہے مَا فِي الْقَوْمِ أَحَدٌ يَجْهَرُهُ عَيْنِي۔ قوم میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو میری نظر میں بڑا معلوم ہوتا ہو۔

الْجَوْهَرُ: یہ بھی اسی مادہ سے فَوْعَلٌ کے وزن پر ہے اور جوہر اسے کہتے ہیں جس کے بطلان سے اس کے جملہ محمولات کا بطلان لازم آتا ہو، اور اسے جوہر اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ حاسہ بصر یعنی نظر کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

اور حاسہ کے سامنے ظاہر ہونے کے متعلق فرمایا: ﴿سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسَرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ﴾ (۱۰-۱۳) کہ تم میں سے کوئی چپکے سے بات کہے یا آواز بلند پکار کر (اس کے نزدیک) دونوں برابر ہیں، ﴿وَأَنْ تَجْهَرُوا بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى﴾ (۷-۲۰) تم پکار کر بات کہو وہ تو چھپے ہوئے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

﴿وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ﴾ (۱۳-۶۷) اور تم پوشیدہ بات کرو یا ظاہر۔

﴿وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ (۲-۳۹) اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے سامنے بات کرتے ہو (اسی طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔

کے جہاد پر مشتمل ہے۔ نیز فرمایا: ﴿وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۹-۳۱) کہ خدا کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو۔ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۹-۲۰) جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرتے رہے۔ اور حدیث میں ہے۔ ﴿۶۶﴾

جَاهِدُوا أَهْوَاءَ كُمْ كَمَا تُجَاهِدُونَ أَعْدَاءَ كُمْ کہ جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کیا کرو۔

اور مجاہدہ ہاتھ اور زبان دونوں کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿۶۷﴾ جَاهِدُوا الْكُفْرَ بِأَيْدِيكُمْ وَالنِّسْتَكُمْ کہ کفار سے ہاتھ اور زبان دونوں کے ذریعہ جہاد کرو۔

(ج ۵)

الْجَهْرُ: (ف) اس کے اصل کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رَأَيْتُهُ جَهَارًا کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَرَى اللَّهَ جَهْرَةً﴾ (۲-۵۵) کہ جب تک ہم خدا کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿أَرَأَى اللَّهُ جَهْرَةً﴾ (۴-۱۵۳) ہمیں نمایاں اور ظاہر

① حوالہ نہیں ہے۔

② الحدیث باختلاف لفظہ فی اللامی عن انس وایضاً ابن حبان والنسائی وصحیحہ ورجال اسنادہ رجال الصحیح ۱۲۔

خلاف سرانجام دینا اس سے کہ اس کے متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیدہ دانستہ نماز ترک کر دے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت: ﴿اَتَّخِذْنَا هُزُؤًا قَالِ اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (۶۷-۲) میں ہُزُؤًا کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَتَبَيَّنُوا اَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ﴾ (۶-۳۹) تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مباردا) کہ تم کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔

اور جاہل کا لفظ عموماً بطور مذمت بولا جاتا ہے۔ مگر کبھی بطور مذمت نہیں بھی آتا۔ چنانچہ آیت: ﴿يَخْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ اَعْيَاءً مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲-۲۷۳) کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔

میں الجاہل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کی حالت سے ناواقف ہیں لہذا یہاں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں ہے۔

الْمَجْهَلُ: (سبب جہالت) ہر وہ معاملہ یا عادت یا زمین جو کسی چیز کے متعلق واقع کے خلاف اعتقاد قائم کر لینے کا سبب بنے اسے مَجْهَلُ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَجْهَلَتِ الرِّيحُ الغُصْنَ۔ ہوائے شاخ کو اس طرح زور سے ہلایا گویا وہ اسے جہالت پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ کس قدر عمدہ استعارہ ہے۔

كَلَامٌ جَهْوَرِيٌّ: بلند گفتگو اور بلند آواز شخص کو جھپیر کہا جاتا ہے، نیز جھپیر کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنے حسن و جمال سے نظر کو خیرہ کر دے۔

(ج ۵ ن)

الْجَهَّازُ: ساز و سامان جو تیار کر کے رکھا جائے۔ قرآن پاک میں ہے، ﴿فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَّازِهِمْ﴾ (۱۲-۵۹) جب ان کے لئے ان کا سامان تیار کر دیا۔

التَّجْهِيْزُ: (تفعیل) تیار کردہ سامان کو لادنا یا بھیجنا ضَرَبَ الْبَعِيْرُ بِجَهَّازِهِ: اونٹ نے اپنا سامان (پالان اور بوجھ) نیچے پھینک دیا اور بدک کر بھاگ گیا۔ جَهِيْزَةٌ: ایک احمق عورت ۹ نیز مادہ گرگ جو دوسرے کے بچے کو دودھ پلاتی ہو، اسے بھی جَهِيْزَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ج ۵ ل)

الْجَهْلُ: (جہالت، نادانی) جہالت تین قسم پر ہے۔

(۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا منقضی بھی یہی معنی جہالت ہے۔

(۲) کسی چیز کے خلاف واقع یقین و اعتقاد قائم کر لینا۔

(۳) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہیے اس کے

① مثل بضرب عنداظهار النفور عن شيء راجع الميداني رقم ۲۲۰ وفيه جهازه وفي من صلة المعنى اى صار عارثاً فى جهازه .

② وفي المثل قطعت جهيرة قول كل خطيب انظر المثل والقصة الميداني رقم ۳۸۳۰ .

③ وفي الحيوان ۲: ۷۹ يقال واحمق سن جهيره لانها تترك ولدها وترضع ولد الضبع راجع للمثل المعاني للفتي ۲۱۲ واللسان (جهير) وجهيرة الامثال ۱: ۳۶۴ .

④ وايضاً الاية : الجاهلية الاولى (۳۳-۲۳) فيقال على العادات التي كانت فيهم قبل الاسلام وفي الاية ۲۵-۶۳) جاء لفظة الجاهلون في مقابلة عباد الرحمن ۱۲ .

قوم کے لوگ (بولے تو) یہ بولے اور اس کے سوا ان کا جواب نہ تھا۔

پھر جواب کا لفظ سوال کے مقابلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سوال دوم پر ہے۔

(۱) گفتگو کا طلب کرنا۔ اس کا جواب گفتگو ہی ہوتی ہے۔

(۲) طلب عطا یعنی خیرات طلب کرنا اس کا جواب یہ ہے کہ اسے خیرات دے دی جائے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا: ﴿أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ﴾ (۳۶-۳۱) خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول کرو۔ ﴿وَمَنْ لَّا يُجِيبْ دَاعِيَ اللَّهِ﴾ (۲۶-۳۲) اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول نہ کرے۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے فرمایا: ﴿قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمْ مَا فَاسْتَقِيمَا﴾ (۱۰-۸۹) کہ تمہاری دعا قبول کر لی گئی تو تم ثابت قدم رہنا اِلَّا اسْتَجَابَهُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اِجَابَهُ (افعال) کے ہے اصل میں اس کے معنی جواب کے لئے تحریر کرنے اور اس کے لئے تیار ہونے کے ہیں لیکن اسے اِجَابَهُ سے تعبیر کر لیتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ لِلرَّسُولِ﴾ (۸-۲۳) کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو۔

﴿أُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۲۰-۶۰) کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ (۳-۱۹۵) تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی۔ ﴿وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ (۳۲-۲۶) اور جو ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کی دعا قبول فرماتا۔ ﴿وَالَّذِينَ

(ج ۵ ن م)

جَهَنَّمَ: روزخ کا نام ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل میں فارسی لفظ جہنم سے مرعرب ہے۔ واللہ اعلم۔

(ج ۹ و)

الْجَوُّ: کے معنی فضا کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ﴾ (۱۶-۷۹) کہ فضا میں ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے اور یرامہ کو جو بھی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

(ج و ب)

الْجَوْبُ: (ض) اس کے اصل معنی جَوْبَةٌ قطع کرنے کے ہیں اور یہ پست زمین کی طرح (زمین میں گڑھا سا) ہوتا ہے۔ پھر ہر طرح زمین کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَمُودَ الَّذِي جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (۸۹-۹) اور تمود کے ساتھ کیا کیا جوادی (قری) میں پتھر تراشتے (اور مکانات بناتے تھے۔

(الْجَائِئَةُ: پھیلنے والی) محارہ ہے: هَلْ عِنْدَكَ مِنْ جَائِئِيَّةٍ خَبِيرٍ؟ کیا تمہارے پاس کوئی نثر ہونے والی خبر ہے۔

جَوَابُ الْكَلَامِ: اور کسی کلام کے جواب کو بھی جواب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قائل کے منہ سے نکل کر فضا کو قطع کرتا ہو اسامع کے کان تک پہنچتا ہے مگر عرف میں ابتداء کلام کرنے کو جواب نہیں کہتے ہیں بلکہ کلام کے لوٹانے پر جواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا﴾ (۶۷-۵۶) تو ان کی

جَوْدٌ: زیادہ بارش۔ اور گھوڑے میں جو تیز رفتاری کی صفت ہوتی ہے اسے جَوْدَةٌ کہتے ہیں اور سخاوت مال کو جَوْدٌ کہا جاتا ہے۔

جَادٌ (ن) السَّيِّءُ جَوْدَةٌ: کسی چیز کا عمدہ اور چید ہونا اس سے صیغہ صفت جَوْدٌ آتا ہے اشیاء میں جو عمدگی (جوود) پائی جاتی ہے۔ اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْفَهُ ثُمَّ هَدَى﴾ (۲۰-۵۰) کہ اس نے ہر چیز کو اس کی (مناسب) شکل و صورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

(ج و ر)

الْجَارُ: (پڑوسی۔ ہمسایہ) ہر وہ شخص جس کی سکونت گاہ دوسرے کے قرب میں ہو وہ اس کا جَارٌ کہلاتا ہے۔ یہ "اسماء متضایفہ" یعنی ان الفاظ سے ہے جو ایک دوسرے کے قائل سے اپنے معنی دیتے ہیں جیسا کہ أَخٌ اور صَدِيقٌ کے الفاظ ہیں (کہ اخوت اور صداقت دونوں جانب سے ہوتی ہے) کیونکہ کسی کا پڑوسی ہونا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے کہ جب دوسرا بھی اس کا پڑوسی ہو۔ چونکہ ہمسائے کا حق عقلاً اور شرعاً بہت بڑا حق سمجھا گیا ہے اس بنا پر ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہو یا وہ کسی دوسرے کے حق کو بڑا خیال کرتا ہو اسے اس کا "جَارٌ" کہہ دیتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿الْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنْبِ﴾ (۳۶-۳) اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایوں۔

اسْتَجْرَتْهُ فَأَجَارَنِي: میں نے اس سے پناہ طلب کی چنانچہ اس نے مجھے پناہ دے دی ﴿چنانچہ آیت کریمہ

اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ﴾ (۸۲-۳۸) اور جو اپنے رب کا فرمان قبول کرتے ہیں۔ ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَانِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي﴾ (۲-۱۸۶) اور اے پیغمبر! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو تمہارے پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں۔ ﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (۳-۱۷۲) جنہوں نے باوجود زخم کھانے کے خدا اور رسول کے حکم کو قبول کیا۔

(ج و د)

الْجُودِيُّ: اس پہاڑی کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان واقع ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ﴾ (۱۱-۳۴) اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری۔ یہ دراصل الْجُودِ کی طرف منسوب ہے اور الْجُودِ کے معنی مقتنیات (ذخائر) کو صرف اور خرچ کرنے کے ہیں عام اس سے کہ وہ ذخیرہ علم ہو یا ذخیرہ مال کا ہو۔

رَجُلٌ جَوَادٌ: سخی آدمی۔ فَرَسٌ جَوَادٌ (تیز رفتار عمدہ گھوڑا) جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے اس کی جمع الْجَوَادُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿بِالْعَشِيِّ الصَّافِنَاتُ الْجَوَادُ﴾ (۳۸-۳۱) (جب ان کے سامنے) شام کو خاصے کے گھوڑے (پیش کئے گئے)۔

اسی سے جَاَزَ الشَّيْءُ ہے جو کسی چیز کے جائز یا خوشگوار ہونے کی تعبیر ہے گویا۔ اس نے وسط طریق کو لازم پکڑا۔
جَوْزُ السَّمَاءِ: وسط آسمان۔ الْجَوْزَاءُ: آسمان کے ایک برج کا نام ہے کیونکہ وہ بھی وسط آسمان میں ہے۔
شَاةُ جَوْزَاءُ: سیاہ بھیر جس کے وسط میں سفیدی ہو۔

(جَاوَزَهُ) کسی چیز کے وسط سے آگے گزر جانا) قرآن میں ہے: ﴿فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ﴾ (۲-۲۳۹) پھر جب وہ (حضرت طالوت علیہ السلام) اس دریا کے وسط سے آگے گزر گئے یعنی پار ہو گئے، ﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ﴾ (۱۰-۹۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔

جُرُتُ الْمَكَانِ: کسی جگہ میں گزرنا۔ أَجْرَتُهُ میں نے اسے نافذ کر دیا اس کو پیچھے چھوڑ دیا ﴿إِسْتَجَزْتُ فُلَانًا فَجَازَنِي﴾: میں نے اس سے (جانوروں یا کھیتی کے لئے) پانی طلب کیا چنانچہ اس نے مجھے دے دیا۔ یہ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی لفظ کا حقیقی معنی وہ ہوتا ہے جو اپنے وضعی معنی میں استعمال ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے ﴿اور نہ اسے مجاز کہتے ہیں۔

(ج و س)

آیت کریمہ: ﴿فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ﴾ (۱۷-۵) میں جَاسُوا کے معنی ہیں کہ وہ تمہارے دیار کے اندر گھس گئے اور ان میں خوب پھرے (غارت گرمی اور قتل سے کنایہ ہے) اور وَاَسُوا کے معنی بھی اسی (جَاسُوا) کے قریب قریب ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ الْجَوسُ کے معنی کسی چیز کو استقصار کے ساتھ طلب کرنا کے ہوتے

ہے: ﴿وَرَأَيْ جَارَ لَكُمْ﴾ (۸-۲۸) اور میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں۔ میں جَارُ اسی معنی پر محمول ہے نیز فرمایا: ﴿وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ (۲۳-۸۸) اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے بالمقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اور جَارٌ میں معنی قرب کے تصور کی بنا پر جَارَهُ وَجَاوَرَهُ وَتَجَاوَرَ (افعال) استعمال ہونے لگے ہیں، یعنی کسی کے قرب و جوار میں رہنا قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۳۳-۶۰) وہ اس (شہر) میں عرصہ قلیل کے سوا تمہارے ہمسایہ بن کر نہیں رہ سکیں گے۔ ﴿وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ﴾ (۱۳-۴) اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطععات ہیں۔

اور معنی قرب کے اعتبار سے جَارَ عَنِ الطَّرِيقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی (صلعن کی وجہ سے راستہ سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں پھر مطلقاً حق سے عدول کرنے کے لئے اس کو اصل قرار دے کر اس سے الْجَوْرُ بمعنی ظلم بنایا گیا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَمِنْهَا جَائِرٌ﴾ (۱۶-۹) اور بعض راستے سیدھی راہ سے ایک جانب مائل ہو رہے ہیں (جو باری تعالیٰ تک نہیں پہنچتے) بعض نے کہا ہے کہ الْجَائِرُ (جور سے صیغہ فاعل) انسانوں میں سے ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو احکام شریعت کے التزام سے رک جائے (اور اسی کا نام ظلم ہے)

(ج و ز)

جَوْزُ الطَّرِيقِ کے معنی راستہ کے وسط کے ہیں

۱ وفي الحديث الصراط فاكون انا وامتي اول من يحيز عليه .

۲ ههنا التواء ففكر - ۱۲ .

ہیں۔
 الْمَجُوسُ: ایک معروف فرقے کا نام ہے۔
 اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آ پہنچا۔

(ج و ع)

الْجُوعُ: وہ تکلیف جو کسی حیوان کو معدہ کے طعام سے خالی ہونے کی وجہ پہنچتی ہے۔
 الْمَجَاعَةُ: خشک سالی کا زمانہ۔ کہا جاتا ہے: رَجُلٌ جَائِعٌ: بھوکا آدمی اور جب بہت زیادہ بھوکا ہو تو اسے جَوْعَانٌ کہا جاتا ہے۔

(ج و ل)

جَاثُوتُ: ایک سرکش بادشاہ کا نام ہے جسے حضرت داؤد عَلَیْهِ السَّلَامُ نے قتل کیا تھا۔ چنانچہ آیت: ﴿وَقَتَلَ دَاوُدُ جَاثُوتَ﴾ (۲۱-۲۵) میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ج ی ع)

جَاءَ (ض) جِيئَةً وَمَجِيئًا: یہ الِاتِيَانِ کے ہم معنی ہے جس کے معنی آنا کے ہیں، لیکن مَجِيئًا کا لفظ اِتِيَانِ سے زیادہ عام ہے کیونکہ اِتِيَانِ کا لفظ خاص کر کسی چیز کے سہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اِتِيَانِ کے معنی کسی کام کا مقصد اور ارادہ کرنا، بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو۔

لیکن مَجِيئًا کا لفظ اس وقت بولا جائے گا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جَاءَ کے معنی مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں، خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالامر اور پھر یہ لفظ اعیان و اعراض دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ، کام یا وقت کا قصد کرے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَاءَ

﴿اِذْ جَاءَ وَكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ﴾ (۱۰-۳۳) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے۔
 اور آیت کریمہ: ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (۱۲-۸۹) میں پروردگار کے آنے سے اس کے حکم کا آجانا مراد ہے۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے اور یہی معنی آیت ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ﴾ (۱۰-۷۶) میں الحق کے آنے کے ہیں۔

یہ افتراز پر دار اپنی بات کی تصدیق کے لئے چار گواہ کیوں نہیں لائے۔

﴿وَجِئْتِكَ مِنْ سَيِّئَاتِنَا يَاقِينُ﴾ (۲۷-۲۲) اور میں تمہارے پاس شہر سہا سے ایک سچی خیر لے کر آیا ہوں۔ اور جو چیز لائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے جَاءَ بِكَذَا کے معنی بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

(ج ی ب)

الْحَبِيبُ: کے معنی گریبان کے ہیں، (مجازاً سینہ) اس کی جمع الْحَبِيبُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلْيَضْرِبَنَّ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ﴾ (۳۳-۳۱) ان کو چاہئے کہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھا کریں۔



جَاءَهُ بِكَذَا وَأَجَاءَهُ (متعدی، بحرف جار و ہمزہ) وہ اسے لے آیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ (۱۹-۲۳) تو درد زہ ان کو کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔ بعض نے یہاں آجَاءَ کے معنی الْجَاءَ یعنی مجبور اور لاچار کرنا بھی کئے ہیں مگر یہ جَاءَ سے (ہمزہ تعدیہ) متعدی بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سے مثل مشہور ہے۔ ﴿شَرٌّ مَا أَجَأَكَ إِلَىٰ مُحَّةٍ عُرْقُوبٍ﴾ یعنی انتہائی فقر ہی تمہیں عرقوب سے رخ جوئے کے لئے لے آیا ہے شاعر نے کہا ہے ﴿(الوافر)

(۹۸) أَجَاءَ تَهُ الْمَخَافَةُ وَالرَّجَاءُ

اسے امید و بیم تمہارے پاس لے آئی ہے

جَاءَ بِكَذَا اس نے لا حاضر کیا قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوْ لَا جَاؤَا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةٍ شُهَدَاءَ﴾ (۲۳-۱۳)

① راجع للمثل الميداني رقم ۱۹،۷ وفيه يبيّنك بدل اجاءك واللسان (عرتب و يضرب للمضطر وذلك لان العرقوب لا مخ له والعرقوب ايضاً اسم رجل ومواعيد عرقوب مثل في خلف الوعد.

② قاله زهير بن ابي سلمى واوله : وجاء سار معتمدا اليكم۔ قال الفراء اصله من جئت وقد جعلته بمعني الجاء راجع اللسان والتاج والبيوت من شواهد الطبري ۱۶-۶۴) ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۱۹۶) والبحر ۶: ۱۸۲) والعقد الثمين ۷۷ ومحاضرات للمؤلف (۲۶۸: ۱) ومحاز القران ۲: ۴ وديوانه ۷۷ والقرطبي ۱۱-۹۲) ۱۲.

كِتَابُ الْحَاءِ

(ح ب ب)

جائے دانوں کے ساتھ تشبیہ دے کر حَبُّ الْإِنْسَانِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دانوں کی ہمواری اور موزونیت کے ہیں۔ اسی طرح شکل و صورت میں حبوب کے ساتھ تشبیہ دے کر پانی کے بلبلہ کو حَبَابُ الْمَاءِ کہا جاتا ہے۔ حَبَّةُ الْقَلْبِ: سیدائے قلب۔ یہ بھی ہیئت میں تشبیہ کے اعتبار سے ہے۔

حَيْثُ فَلَانَا اصل معنی تو یہ ہیں کہ میں نے اس کے حَبَّةُ الْقَلْبِ پر مارا جیسا کہ كَبَدْتَهُ فَادَّتَهُ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اَحْبَبْتُ فَلَانَا اصل معنی تو یہ ہیں کہ میں نے اپنا دل اس کی محبت کے لئے پیش کیا مگر عرف میں مَحَبَّتِ کی جگہ پر محبوب بھی استعمال ہوتا ہے۔ الْمَحَبَّةُ کے معنی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے اور چاہنے کے ہیں، اور محبت تین قسم پر ہے۔ (۱) محض لذت اندوزی کے لئے جیسے مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿وَيُطْعَمُونَ﴾ الطَّعَامَ عَلَىٰ حِبِّهِمْ مَسْكِينًا ﴿۷۲﴾ میں اسی نوع کی محبت کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) محبت نفع اندوزی کی خاطر جیسا کہ انسان کسی نفع بخش اور مفید شے سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ﴾ (۶۱-۱۳) اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی تمہیں

الْحَبُّ وَالْحَبَّةُ: (فتح حاء) گندم، جو وغیرہ مطعومات کے دانہ کو کہتے ہیں اور خوشبودار پودوں اور پھولوں کے بیج کو حَبٌّ وَحَبَّةٌ کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ، فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ﴾ (۲۶۱) (ان کے مالوں) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک ہالی میں سو دانے ہوں۔

﴿وَلَا حَبَّةٌ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ﴾ (۶۲-۵۹) اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى﴾ (۶۲-۹۵) بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (ان سے درخت اگاتا ہے۔) اور آیت کریمہ ہے: ﴿فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ﴾ (۵۰-۹) اور اس باغ سے دبستان اگائے اور اناج۔ میں حَبُّ الْحَصِيدِ سے گندم وغیرہ مراد ہے جو کاٹا جاتا ہے، اور حدیث میں ہے ﴿۶۹﴾ كَمَا تَنْبُتُ الْحَبَّةُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ۔ جیسے گھاس پات کے بیج جو سیلاب کے بہاؤ میں اُگ آتے ہیں۔

الْحَبُّ: (محبوب، عاشق) جس کی محبت حد سے بڑھ

۱ قطنہ من حدیث طویل ورد فی اهل النار بعد ما یخرجون منها ویلقون فی نهر الحیاة راجع البخاری مع الفتح ۱۴: ۲۵۵ وفی روایة مسم لقتادة بدل الحبة وحملة السيل بدل حمیل السیل والحديث فی الفائق ۲: ۲۶۶ وغرب ابی عبیده وھناک تخریجہ ۱۲۔

ذَكَرَ رَبِّي ﴿ (۳۸-۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ میں نے گھوڑوں سے اس طرح محبت کی جس طرح کہ مجھے خیر سے محبت ہے۔ (اس طرح میں اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۲-۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ کے توابین اور متطہرین سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ثواب دے گا اور ان پر فضل و کرم فرمائے گا اور آیت کریمہ: ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَتَيْنُمْ﴾ (۲-۲۷۶) اور آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (۱۸-۲۱) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب سے انسان اس قدر سرکش ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے کا نام نہیں لیتا اور جب توبہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ان معنوں سے محبت نہیں کرتا جن معنوں میں کہ وہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے، یعنی انعام و افضال کرنا اور ثواب سے نوازنا۔

حَبَّبَ اللَّهُ إِلَيَّ كَذَا: فلاں چیز اللہ نے مجھے عزیز کر دی قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ﴾ (۴۹-۷) لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا۔

أَحَبَّ الْبَعِيرُ: اونٹ کا ماندہ اور بیمار ہو کر ایک جگہ پڑے رہنا۔ گویا اسے اس جگہ سے محبت ہے۔ حَبَابُكَ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا یعنی تیری انتہائی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم ایسا کرو۔

(ج ب ر)

الْحَبِيرُ: وہ نشان جو عمدہ اور خوبصورت معلوم ہو

خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح حاصل ہوگی۔ (۳) کبھی یہ محبت محض فضل و شرف کی وجہ سے ہوتی ہے، جیسا کہ اہل علم و فضل آپس میں ایک دوسرے سے محض علم کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ اور بعض نے مثل آیت: ﴿فِيهِ رَجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّطَهَّرُوا﴾ (۹-۱۰۸) میں محبت کی تفسیر ارادہ سے بھی کی ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ لفظ محبت میں نسبت ارادہ کے معنوی طور پر زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے، کیونکہ ہر محبت میں ارادہ تو پایا ہی جاتا ہے مگر ہر ارادے کو محبت نہیں کہہ سکتے۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنْ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ﴾ (۹-۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں اور پسند کریں۔ اصل میں اسْتَحَبُّوا کے معنی کسی چیز میں ایسا معنی تلاش کرنے کے ہیں جس کی بنا پر اس سے محبت کی جائے مگر یہاں علی (صلو) کی وجہ سے اس میں ایثار اور ترجیح کے معنی پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَأَمَّا تُمُودٌ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ﴾ (۱۱-۴۱) کے معنی بھی یہ ہیں کہ انہوں نے اندھا پن کو ہدایت پہ ترجیح دی۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ (۵-۵۲) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور جسے وہ دوست رکھیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے سے مراد ان پر انعام کرنا ہے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنی ہیں ”بندہ تقرب الہی حاصل کر نیکی طلب میں لگا رہے“ اور آیت کریمہ: ﴿إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ

بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کے عہد (معاہدہ میں آجائیں میں متنبہ کیا گیا ہے کہ کافر کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے دو قسم کے عہد و پیمان کی ضرورت ہے ایک عہد الہی اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص اہل کتاب سے ہو اور کسی ساوی کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔ ورنہ تو اسے اس کے دین پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور نہ ہی اسے ذمہ اور امان مل سکتا ہے دوسرا عہد وہ ہے جو لوگوں کی جانب سے اسے حاصل ہو۔

الْحَبَائِلُ: خاص کر صیاد کے پھندے کو کہا جاتا ہے اسکی جمع حَبَائِلُ ہے۔ ایک حدیث میں ہے ﴿(۷۱) أَلْتَسَاءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ كَهَوْرَتِمْ شَيْطَانِ كَهَجَالِمْ﴾۔
الْمُحْتَبِلُ وَالْحَابِلُ پھندا لگانے والا۔ ضرب المثل ہے ﴿وَقَعَ حَابِلُهُمْ عَلَي نَابِلِهِمْ﴾ یعنی انہوں نے آپس میں شرفساد پیدا کر دیا یا ان کا اول آخر پر گھوم آیا۔ الْحَبْلَةُ جو چیز ہار میں ڈالی جائے۔

(ح ت م)

الْحَتْمُ کے معنی قضاء مقدر کے ہیں ﴿الْحَاتِمُ كَالَاكُورِ﴾ جو اہل عرب کے خیال کے مطابق کائیں کائیں کر کے جدائی ڈال دیتا ہے۔

حَتَّى (حرف)

کبھی تو ”الی“ کی طرح یہ حرف جر کے طور پر استعمال

اصل میں یہ بَعِيرٌ مَحْبُوكٌ الْقَوِيُّ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی وہ اونٹ جس کے جوڑ بند نہایت مضبوط ہوں۔
الْأَحْتِيَاكُ: (افتعال) کس کر اور مضبوطی سے باندھنا۔

(ج ب ل)

الْحَبْلُ۔ کے معنی رسی کے ہیں قرآن پاک میں ہے ﴿فِي حَبْلِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ﴾ (۱۱۱-۵) اس کے گلے میں کھجور کی رسی ہوگی۔

پھر چونکہ رگ بھی شکل و صورت میں رسی سے ملتی جلتی ہے اس لئے شرگ کو حَبْلُ الْوَرِيدِ (۵۰-۱۶) اور حَبْلُ الْعَاتِقِ کہتے ہیں اور ریت کے لمبے ٹیلے کو حَبْلُ الرَّمْلِ کہا جاتا ہے۔ استعارتاً حَبْلٌ کے معنی ملا دینا بھی آتے ہیں، اور ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز تک پہنچ جائے حَبْلٌ کہلاتی ہے اس لئے آیت کریمہ: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ (۳-۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا، میں حَبْلُ اللَّهِ سے مراد قرآن پاک اور عقل سلیم وغیر ہا اشیاء ہیں جن کے ساتھ تمسک کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور عہد و پیمان کو بھی حَبْلٌ کہا جاتا ہے، اور آیت کریمہ ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ أَيَّمَا ذُلِّهَا وَالْأَبْحَابُ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلِ مَنْ النَّاسِ﴾ (۳-۱۱۲) یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت کو دیکھو گے کہ ان سے چمٹ رہی ہے

① قاله ابن مسعود راجع المیدانی ۲: ۳۴۰) وفي الاحياء ۳: ۹۶۶ مرفوعاً وتهامة: ولولا هذه الشهوة لما كان للنساء سلطنة على

الرجال قال العراقي في تخريجه الاصفهاني في الترغيب والترهيب من حديث خالد بن زيد الجهني باسناد فيه جهالة.

② راجع للمثل اللسان والصحاح (حبل).

③ وفي التنزيل: وكان على ريث حتما مقضيا (۱۹-۱۷).

ماقبل کے خلاف ہوتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا جُنْبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّى تَغْتَسِلُوا﴾
(۴-۴۳) اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس
نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کرو۔ وہاں اگر بحالتِ سفر
رستے چلے جا رہے ہو (اور غسل نہ کر سکو تو تیمم سے نماز پڑھ
لو۔

مگر کبھی اس طرح نہیں بھی ہوتا جیسے مردی ہے ﴿(۷۲)
إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا﴾ پس اس
حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمہارے تھک جانے کے
بعد ذات باری تعالیٰ بھی تھک جاتی ہے۔ بلکہ معنی یہ ہیں
کہ ذات باری تعالیٰ کو کبھی ملال لاحق نہیں ہوتا۔

(ح ح ج)

الْحَجُّ: (ن) کے اصل معنی کسی کی زیارت کا قصد
اور ارادہ کرنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(طویل)
(۹۹) يَحْجُونَ بَيْتَ الزَّيْبِقَانِ الْمُعْصَفَرَا
وہ زبیرقان کے زرد رنگ کے عمامہ کی زیارت کرتے ہیں۔
اور اصطلاح شریعت میں اقامت نسک کے ارادہ سے
بیت اللہ کا قصد کرنے کا نام حج ہے۔ الْحَجُّ: (فتح الحاء)
مصدر ہے اور الْحَجُّجُ (بکسر الحاء) اسم ہے اور آیت
کریمہ: ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ (۹-۳) میں حج اکبر
سے مراد یومِ نحر یا یومِ عرفہ ہے۔ ایک روایت میں ہے ﴿

ہوتا ہے لیکن اس کے مابعد غایت ماقبل کے حکم میں
داخل ہوتا ہے اور کبھی عاطفہ ہوتا ہے اور کبھی استیناف کا
فائدہ دیتا ہے۔ جیسے أَكَلْتُ السَّمَكَةَ حَتَّى رَأْسَهَا
(عاطفہ) رَأْسَهَا (جارہ) رَأْسَهَا (متانفہ) قرآن
پاک میں ہے: ﴿لَيْسَ جُنْبُهُ حَتَّى حِينَ﴾ (۱۲-۵۳)
کچھ عرصہ کے لئے انہیں قید ہی کر دیں۔

﴿حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (۹۷-۵) طلوعِ صبح
تک..... جب یہ فعل مضارع پر داخل ہوتے ہیں اور ان
میں ہر ایک کی دو وجہ ہو سکتی ہیں نصب کی صورت میں
حَتَّى بِمَعْنَى (۱) إِلَى أَنْ (۲) كَيْ ہوتا ہے
اور مضارع کے مرفوع ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ
حتی سے پہلے فعل ماضی آ جائے جیسے:

مَشَيْتُ حَتَّى أَدْخُلَ الْبَصْرَةَ (یعنی میں چلا حتی کہ
میں داخل ہوا) دوسری صورت یہ ہے کہ حتی کا مابعد حال
واقع ہو جیسے مَرِضٌ حَتَّى لَا يَرْجُونَ (وہ بیمار ہوا اس
حال میں کہ سب اس سے ناامید ہو گئے) اور آیت کریمہ:
﴿حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ﴾ (۲-۲۱۳) یہاں تک کہ
پیغمبر..... پکاراٹھے۔ میں يَقُولُ پر فتح اور نصب
دونوں منقول ہیں اور ان ہر دو قرأت میں دونوں معنی
بیان کئے گئے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ حتی کا مابعد اس کے

① قطعة من حديث طويل لعائشة متفق عليه وفي الموطأ بلاغاً راجع لشرح الزرقاني ۱: ۲۴۳-۲۴۴.

② قاله المخيل السعدي كمافي المعاني الكبير للقتبي ۱: ۴۷۸ واصلاح يعقوب ۲۷۲ وصدرة واشهد من عوف حلولاً كثيرة وفي اللسان (سب) والطبري ۲: ۱۹۴ (المزغفر بدل المعصفر قال في ذيله هكذا ورد البيت في الاصول المطبوعة والمخطوطة لكن استدرك مصحح اللسان على قول "بيت" وقال الصواب "سب" بسين مهمله مسكورة وباء موحدة ومعناه العمامة وهو المناسب لقوله المزغفر او المعصفر وقال قطرب معناه الاست لانه كان مقرئ ونسب الى الابنة راجع الجمهرة ۱: ۳۱) والبخاري ۳: ۴۲۸) وفيه خلاف انظر المهيلى ۲: ۳۳۵) وتهذيب الالفاظ ۶۳ ھ والبيت في الغرب للقتبي ۳۲ والصاحي ۸۱ بغير عزو والبيان ۳: ۵۱) والسمط ۹ والصحاح والاساس والمحکم (حج) والتاج واللسان (سب).

③ رواه الشافعي في الام (راجع الشوكاني).

کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔ میں ان کے باطل جھگڑے کو حجت قرار دیا گیا ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (۲۲-۱۵) اور ہم میں اور تم میں کچھ بحث و تکرار نہیں ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ ظہور بیان کی وجہ سے بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

الْمُحَاجَّةُ: اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَحَاجَّهٖ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِي فِي اللّٰهِ﴾ (۶-۸۰) اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا بحث کرتے ہو۔

﴿فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ (۳-۶۱) پھر اگر یہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

﴿لِمَ تَحَاجُّونَ فِي اٰیٰتِنَا﴾ (۳-۶۵) تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

﴿هَآئِنَّمْ هُوَ لَآءٍ حَآجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ فَلِمَ تَحَاجُّونَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾

(۷۳) الْعُمْرَةُ الْحَجُّ الْأَصْغَرُ: عمر حج اصغر ہے۔ الْحُجَّةُ: اس دلیل کو کہتے ہیں جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے اور تقيہین میں سے ایک کی صحت کی مقتضی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾ (۶-۱۳۹) کہہ دو کہ خدای ہی کی حجت غالب ہے۔

﴿لَيْتَلَّآ يَكُوْنُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ (۲-۱۵۰) (یہ تاکید) اس لئے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ لگا سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں۔ اس آیت میں ظالموں کے احتجاج کو چیز سے مستثنیٰ کیا ہے جو اصولاً وہ حجت میں داخل نہیں ہے۔ پس یہ استشہاد ایسا ہی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ۱ (طویل)

(۱۰۰) وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ غَيْرَ اَنْ سِيُوْفَهُمْ بِهِنَّ فُلُوْا مِنْ قِرَاعِ الْكِتٰبِ
ان میں صرف یہ عیب پایا جاتا ہے کہ لشکروں کے ساتھ لڑنے سے ان کی تلواروں پر دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اس احتجاج کو حجت قرار دینا ایسا ہی ہو۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَٰخِضَةً عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۳۲-۱۶) اور جو لوگ خدا کے بارے میں بعد اس کے کہ اسے مومنوں نے مان لیا ہو، جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار

۴ قاله النابغة في مدح ملوك غسان وهذا البيت مشهورته اورده العلماء في تصانيفهم وقد اورد العلماء البديع شاهداً لتأكيد المدح بما يشبه الذم انظر لكلمة الفصل على البيت الخزائة ۳: ۲۲۹) واللسان (فلل) وشواهد الكشاف ۱۰ والكامل للمبرد ۴۸-۳۰۰) والعمدة ۲: ۴۱۱) وذيله ۱: ۳۱۶) ودويوانه ۶ والصناعتين ۴۰۸ ومختار الشعرا الجاهلي ۱: ۸۷) والبحر ۵: ۶/۷۲: ۳/۲۰۲: ۵۱۶ والكتاب ۱: ۳۶۷) ومحاضرات المؤلف ۳: ۱۵۶) والحيوان ۴: ۲۷۴) والعقد الثمين ۳ والصاحي ۲۶۷ والمعاني الكبير ۳۶۰ والسيوطي ۲۱ (شواهد بيذا) ۱۲.

الرَّحْمَةَ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿٥٤﴾
 (۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی
 اس کے باطن میں رحمت ہوگی اور بظاہر اس طرف عذاب
 ہوگا۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿مَا كَانَ لِيُبَشِّرَ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ
 وَرَاءِ حِجَابٍ ﴿٣٢﴾ (۵۱-۳۲) اور کسی آدمی کے لئے ممکن
 نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے)
 سے یا پردے کے پیچھے سے۔ میں پردے کے پیچھے سے
 کلام کرتے ہیں، وہ ذات الہی کو دیکھ نہیں سکتا اور آیت
 کریمہ: ﴿حَتَّىٰ تَوَارَّتْ بِالْحِجَابِ ﴿٣٨﴾ (۳۲-۳۸)
 کے معنی ہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔

الْحَاجِبُ: دربان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ تک پہنچنے
 سے روک دیتا ہے۔

اور حَاجِبَانِ (ستنیہ) بھوس کو کہتے ہیں کیونکہ وہ
 آنکھوں کے لئے بمنزلہ سلطانی دربان کے ہوتی ہیں۔
 حَاجِبُ الشَّمْسِ: سورج کا کنارہ اس لئے کہ وہ بھی
 بادشاہ کے دربان کی طرح پہلے پہل نمودار ہوتا ہے اور
 آیت کریمہ:

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ﴿٨٣﴾
 (۱۵-۸۳) کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز تجلی الہی کو
 ان سے روک لیا جائے گا (اس طرح وہ دیدار الہی سے
 محروم رہیں گے) جس کے متعلق آیت کریمہ: ﴿فَضْرِبَ

(۳-۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا
 جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے
 ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔
 ﴿وَإِذْ يَتَحَفَّضُونَ فِي النَّارِ ﴿٣٠﴾ (۲۷-۳۰) اور جب
 وہ دوزخ میں جھگڑیں گے۔

اور حَجَّجُ کے معنی زخم کی گہرائی ناپنا بھی آتے ہیں۔ شاعر
 نے کہا ہے ﴿الْبَسِيطُ﴾
 يَحْجُجُ مَا مُمُومَةٌ فِي مَعْرَهَا لَجَفُفٌ
 وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا قطر نہایت
 وسیع ہے۔

(ح ج ب)

الْحَجَبُ وَالْحِجَابُ: (ن) کسی چیز تک پہنچنے
 سے روکنا اور درمیان میں حائل ہو جانا اور وہ پردہ جو دل
 اور پیٹ کے درمیان حائل ہے اسے "حجاب الجوف"
 کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ﴿٥﴾
 (۳۶-۵) اور ان دونوں (بہشت اور دوزخ) کے
 درمیان پردہ حائل ہوگا۔ میں حجاب سے وہ پردہ مراد نہیں
 ہے جو ظاہری نظر کو روک لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ آڑ
 ہے جو جنت کی لذتوں کو اہل دوزخ تک پہنچنے سے مانع
 ہوگی اسی طرح اہل جہنم کی اذیت کو اہل جنت تک پہنچنے
 سے روک دے گی۔ جیسے فرمایا:

﴿فَضْرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ

① قاله غداة بن درة الطائي وتماهه: فاست الطيب فذاها كالمغاريد - انظر التاج واللسان والمخكم (حج) والكامل للمبرد ٩٨،
 ٤٢٢ والمعجم للباقر (١٥: ٧٣-٧٤) حيث الكلام طويل على البيت والحيوان (٣: ٤٢٥) والمحفص ١٣: ١٨٢ ولمعنى
 بالعجزان الطيب يحزع من هولها فالقدي يتساقط من استه كالمغاريد وهو جمع مغرود ومعناه كصافار قال القتي في المعاني
 ٩٧٧ يحج اي يصلح ولحف ان يذهب في احد الناحيتين فالطيب ممايري من هولها تقدي استه كالمغادير وهذا آخر ما قيل في شرح
 البيت ١٢.

بَيْنَهُمْ بِسُورٍ ﴿۱﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(ح ج ر)

الْحَجَرُ: سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع أَحْجَارٌ وَحِجَارَةٌ آتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَقُوْدُهَا السَّنَاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲-۲۳) جس کا ایںدھن آدی اور پتھر ہوں گے۔ میں بعض نے یہی مراد لئے ہیں اور اس سے آگ کی ہولناکی پر تشبیہ کی ہے کہ وہ پتھروں اور انسانوں سے بھڑکائی جائے گی بخلاف دنیا کی آگ کے کہ یہ جلنے کے بعد پتھروں پر تھوڑا بہت اثر کرتی ہے۔ لیکن انہیں جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سگدل ہیں جیسے پتھر چٹانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (۲-۷۴) گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔

الْحَجَرُ وَالتَّحْجِيرُ کے معنی کسی جگہ پر پتھروں سے احاطہ کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَجَرْتُهُ حَجْرًا فَهُوَ مَحْجُورٌ وَحَجْرَتُهُ تَحْجِيرٌ فَهُوَ مُحَجَّرٌ اور جس جگہ کے ارد گرد پتھروں سے احاطہ کیا گیا ہو۔ اسے حَجْرٌ کہا جاتا ہے اس لئے عظیم کعبہ اور دیار شہود کو حَجْرٌ کہا گیا ہے ﴿قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحَجَرِ الْمُرْسَلِينَ﴾ (۱۵-۸۰) اور (وادئ) حجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کی

مکذیب کی۔ اور حَجْرٌ (پتھروں سے احاطہ کرنا) سے حفاظت اور روکنے کے معنی لے کر عقل انسانی کو بھی حَجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی انسان کو نفسانی بے اعتدالیوں سے روکتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ﴾ (۵-۸۹) (اور) بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک تم کھانے کے لائق ہیں۔

مبرد (لغوی) نے کہا ہے کہ گھوڑی کو بھی حَجْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پیٹ کے اندر حمل روکے رکھتی ہے۔ اور حَجْرٌ حرام چیز کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کا تناول ممنوع ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ﴾ (۶-۳۸) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جو چوپائے اور بھکتی حرام ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا﴾ (۲۵-۲۲) میں حِجْرًا مَّحْجُورًا ایک محاورہ ہے جاہلیت کا دستور تھا کہ جس کسی کے سامنے کوئی ایسا شخص آجاتا جس کی اذیت کا خوف ہوتا تو حِجْرًا مَّحْجُورًا کہ دیتا (یعنی ہم تمہاری پناہ چاہتے ہیں) یہ الفاظ سن کر دشمن اسے کچھ نہ کہتا) تو قرآن پاک نے یہاں بیان کیا کہ کفار بھی (عذاب کے) فرشتوں کو دیکھ کر (حسب عادت) یہ الفاظ کہیں گے کہ شاید عذاب سے پناہ مل جائے ﴿اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا﴾ (۲۵-۵۳) اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔

① ناحية الشام عند وادی القرئی وهم قوم صالح النبی صلی اللہ علیہ وسلم اماحجر (بفتحہ جیم معروف) فقصته الیسامة.

② وبهذا فسر اللیث وابن جریر وردہ الازهري وقال ان علماء التفسیر الذی یعتمدون، علی خلاف ذلك وفانوا ان ذلك كله من قول الملائكة راجع الطبری (۱۹-۳) والتاج واللسان (حجر).

﴿حَجَزَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا﴾ (۲۷-۶۱) اور
(کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنا دی۔

اور حَجَزَ کو بھی حجاز اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شام اور
بادیہ کے درمیان حائل ہے اور آیت کریمہ: ﴿فَمَا
مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ﴾ (۶۹-۷۲) پھر تم
میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہیں ہے۔ میں
حَاجِزِينَ ، أَحَدٍ کی صفت ہے کیونکہ احد کا لفظ معنی جمع
ہے نیز حجاز اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی کلائی میں ڈال
کر اسے اس کی کمر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں (تا کہ بل
نہ سکے) پھر حجر میں معنی منع کے پیش نظر اَحْتَجَزَ فَلَانٌ
عَنْ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی
کسی چیز کے رک جانے کے ہیں اَحْتَجَزَ بِإِزَارِهِ
تہبند باندھنا۔ اسی سے حُجْزَةُ السَّرَاوِيلِ ہے جس
کے معنی ازار بند کے بیفہ کے ہیں * مشہور محاورہ ہے۔
إِنْ أَرَدْتُمْ الْمُحَاجَزَةَ فَاقْبَلِ الْمُنَاجَزَةَ یعنی ایک
دوسرے کو روکنے اور صلح کرنے کا موقع لڑائی سے قبل ہوتا
ہے۔ *
حَجَازِيكَ یعنی ان کے درمیان حائل ہو جائیے۔

(ح د)

الْحَدُّ: دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جو ان کو باہم
ملنے سے روک دے۔ حَدَدْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز
کے لئے حد میز مقرر کر دی۔ حَدُّ الدَّارِ مکان کی حد،

میں ”حَجَزَ آمَهْجُورًا“ سے مراد ایسی مضبوط رکاوٹ
ہے جو دور نہ ہو سکے۔

فُلَانٌ فِى حَجْرِ فُلَانٍ: وہ فلاں کے زیر نگرانی ہے۔
یعنی اس کی طرف سے اس کے مال اور دیگر اختیارات پر
پابندی ہے اس کی جمع حُجُورٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے
﴿وَرَبَّائِكُمُ اللَّاتِي فِى حُجُورِكُمْ﴾ (۳-۲۳)
اور وہ لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے ہو۔
حَجْرُ الْقَمِيصِ: یعنی قمیص کا اگلا حصہ جس میں کوئی چیز
رکھ لی جاتی ہے اور حجر سے احاطہ کے معنی لے کر کہا
جاتا ہے۔

حُجْرَتُ عَيْنِ الْفَرَسِ یعنی گھوڑی کی آنکھ کے گرد
داغ دیا گیا۔ حُجْرَةُ الْقَمَرِ: چاند کے گرد ہالہ ہونا۔
الْحُجُورَةُ: ایک قسم کا بچوں کا کھیل جو وہ خط مستدیر کھینچ
کر کھیلتے ہیں۔ اسی سے مَحَجَّرُ الْعَيْنِ کا محاورہ ہے
جس کے معنی خانہ چشم کے ہیں تَحَجَّرَ كَذَا اسی چیز کا
پتھر کی طرح سخت ہو جانا اَلْأَحْجَارُ: بنی تمیم کے چند
بطون (جو اس نام سے مشہور ہوئے) اَحْجَارُ: کیونکہ
ان کے بزرگوں کے نام جنندل حجر اور صخر
وغیرہ تھے۔ *

(ح ح ز)

الْحَاجِزُ: (نض) کے معنی دو چیزوں کے درمیان روک
اور حد فاصل بنانے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

① كذافى اللسان والتاج (حجر) قال و اباهم عنى الشاعر بقوله و كل انى حملت احجاراً.

② ومنه الحديث و انا اخذعجزكم .

③ كذافى التاج (حجر) و فى الميدانى المثل بروى عن اكنم بن صيفى قال ابو عبيد معناه : رنج بنفسك قبل لقاء من لا تقاومه
(الميدانى رقم ۱۶۹) ۱۶۲.

جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔
میں يُحَادُّونَ کے معنی اللہ رسول کی مخالفت کے ہیں اور
اس مخالفت کو يُحَادُّونَ کہنا یا تو روکنے کے اعتبار سے ہے
اور یا الحدید کے استعمال یعنی جنگ کی وجہ سے۔ حَدِيدٌ:
لوہا۔ قرآن میں ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ
شَدِيدٌ﴾ (۵۷-۲۵) اور لوہا پیدا کیا اس میں اسلحہ جنگ
کے لحاظ سے پُرخطر بھی شدید ہے۔

حَدَدْتُ السِّكِّينَ: میں نے چھری کی دھارتیز کی۔ اور
أَحَدَدْتُهُ اس کے لئے حد مقرر کر دی پھر ہر وہ چیز جو بلحاظ
خلقت یا بلحاظ معنی کے ایک ہو۔ جیسے نگاہ اور بصیرت اس
کی صفت میں الحدید کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے۔ هُوَ
حَدِيدُ النَّظَرِ (وہ تیز نظر ہے) هُوَ حَدِيدُ الْفَهْمِ
(وہ تیز فہم ہے) قرآن میں ہے: ﴿فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ
حَدِيدٌ﴾ (۵۰-۲۲) تو آج تیزی نگاہ تیز ہے۔ اور
جب زبان بلحاظ تیزی کے لوہے کی سی تاثیر رکھتی ہو تو
صَارِمٌ وَمَا ضِئِصٌ کی طرح اس کی صفت حدید بھی آجاتی
ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿سَلَقُواكُمْ بِالْيَسِينَةِ
حَدَادٍ﴾ (۳۳-۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے
بارے میں تیز زبانی کریں۔ اور روکنے کے معنی کے پیش
نظر دربان کو حَدَادٌ کہا جاتا ہے اور بدنصیب اور محروم
آدی کو رَجُلٌ مَحْدُودٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح د ب)

حَدَبٌ (س) حَدَبًا - الرَّجُلُ وَأَحَدَبٌ
واحد و دَبٌ کہڑا ہونا۔ ہو سکتا ہے کہ حَدَبُ الظَّهْرِ
کا لفظ اس مادہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہو جس کے معنی
کہڑی پیٹھ کے ہیں۔ پھر تشبیہ کے طور پر لاغر اونٹنی کو جس

جس کی وجہ سے وہ دوسرے مکان سے میز ہوتا ہے حَدُّ
السَّيِّءِ: کسی چیز کا وہ وصف جو دوسروں سے اسے ممتاز
کر دے اور زنا و شراب کی سزا کو بھی حد اس لئے کہا جاتا ہے
کہ وہ اس کا دوبارہ ارتکاب کرنے سے انسان کو روکتی ہے۔
اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے
روک دیتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتِلْكَ حُدُودُ
اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ﴾ (۶۵-۱)..... اور یہ خدا
کی حدیں ہیں۔ جو خدا کی حدود سے تجاوز کرے گا۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا﴾ (۲-۲۲۹)
یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے تجاوز مت کرو۔
اور آیت کریمہ: ﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا
وَأَجْدَرُ أَنْ لَا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾
(۹-۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور
اس قابل نہیں کہ جو احکام (شریعت) خدا نے نازل فرمائے
ہیں ان سے واقف (ہی) ہوں۔
میں بعض نے حدود کے معنی احکام کئے ہیں اور بعض نے
کہا ہے کہ حقائق و معانی مراد ہیں۔
جملہ حدود الہی چار قسم پر ہیں۔

(۱) ایسے حکم جن میں نقص و زیادہ دونوں ناجائز ہوتے ہیں
جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے
مقرر کر دی ہیں ان میں کمی بیشی قطعاً جائز نہیں ہے۔
(۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو لیکن کمی جائز نہ ہو۔
(۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہیں یعنی
ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔
(۴) اور آیت کریمہ ہے:
﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۵۸-۲۰)

بجالت بیداری۔ قرآن میں ہے: ﴿وَإِذَا أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا﴾ (۲۶-۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

﴿هَلْ آتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ (۸۸-۱۰) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت) کا حال معلوم ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ﴾ (۱۲-۱۰) اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا میں احادیث سے زویا مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ﴾ (۵۲-۳۳) تو ایسا کلام بنا لائیں۔

﴿أَفَمَنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْبُونَ﴾ (۵۳-۵۹) (اے منکرین خدا) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو، ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾ (۲-۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟

﴿حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ﴾ (۶-۵۹) یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔ ﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ﴾ (۲۵-۶) تو یہ خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا﴾ اور خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

اور حدیث میں ہے ﴿(۷۴) إِنْ يَكُنْ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ مُحَدَّثٌ فَهُوَ عَمْرٌ﴾ کہ اگر اس امت میں کوئی

کے سرینوں کی ہڈیاں نمایاں ہوں، نفاقہ حذباء کہہ دیتے ہیں اور اسی سے (مجازاً) بلند اور سخت زمین کو حذب کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَذَبٍ يَنْسَلُونَ﴾ (۲۱-۹۶) اور وہ (یا جوج ماجوج) بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

(ح د ث)

الْحُدُوثُ: (ن) کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو۔ عام اس سے کہ وہ جو ہر ہو یا عرض اور اِحْدَاثُ صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مُحَدَّثٌ (صیغہ صفت مفعولی) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا اِحْدَاثُ کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے: أَحْدَثْتُ مِلْكًا میں نے نیا ملک حاصل کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحَدَّثٌ﴾ (۲۱-۲) ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی (میں اسی دوسرے معنی کے اعتبار ذکر کو محدث کہا گیا ہے) اور ہر قول و فعل جو نیا نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی محدث کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتَّىٰ أَحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾ (۱۸-۷۰) جب تک میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات نہ کروں۔

﴿لَعَلَّ اللَّهُ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا﴾ (۲۵-۱) شاید اللہ اس کے بعد کوئی (رجعت) کی سبیل پیدا کر دے۔ ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہوا

۱ اخرجہ البخاری من حدیث ابی ہریرة ولفظه لقد كان فيما قبلكم من الامم محدثون فان بك في امتي احد فانه عمر رواه مسلم من حدیث عائشة الفتح ۶: ۴۰۰) وايضا في مناقب عمرو هناك الكلام عليه وتخرج الاحياء ۳: ۲۴ وبمعناه المستدرک للحاكم (۸۶: ۲) عن عائشة والفايق ۱: ۲۳).

اس سے دور رہا۔ قرآن میں ہے:

﴿يَحْذَرُ الْآخِرَةَ﴾ (۹-۳۹) آخرت سے ڈرتا ہے۔

﴿أَنَا الْجَمِيعُ حَذِرُونَ﴾ (۵۶-۲۶) اور ہم سب

باساز و سامان ہیں۔

ایک قرأت میں حَذِرُونَ ہے۔

﴿هُمْ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ﴾ (۴-۲۳) یہ (تمہارے

دشمن ہیں ان سے محتاط رہنا۔

﴿إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ

فَاحْذَرُوهُمْ﴾ (۱۳-۶۵) تمہاری عورتوں اور اولاد میں

سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

حَذَرَ: کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔ قرآن میں

ہے:

﴿وَيُحَذِرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ﴾ (۳-۲۸) اور خدا تم کو

اپنے (غضب) سے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

الْحَذَرُ: بچاؤ اور آیت کریمہ: ﴿خُذُوا حِذْرَكُمْ﴾

(۴-۷۱) (جہاد کے لئے) ہتھیار لے لیا کرو۔ میں

حِذْر سے مراد السلمہ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن

سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ حِذَارِ (اسم فعل بمعنی امر)

بچو جیسے مَنَاعُ بمعنی اِمْنَعُ۔

(ح ر ر)

الْحَرَارَةُ: یہ برؤدۃ کی ضد ہے اور حرارت دو قسم

پر ہے۔

(۱) وہ حرارت جو گرم اجسام سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی

ہے جیسے سورج اور آگ کی گرمی۔

(۲) وہ حرارت جو عوارض طبعیہ سے بدن میں پیدا ہو جاتی

ہے۔ جیسے محبوم (بخار زدہ) کے بدن کا گرم ہونا کہا جاتا ہے۔

محدث ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے اور محدث سے آپ کی مراد وہ

شخص ہے جس کے دل میں ملاً اعلیٰ کی طرف سے

القاء ہوتا ہو۔ اور آیت کریمہ ہے: ﴿فَجَعَلْنَا هُمْ

أَحَادِيثَ﴾ (۱۹-۳۳) تو ہم نے (انہیں نابود کر کے)

ان کے افسانے بنا دیئے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی داستا میں

ہی باقی رہ گئی ہیں۔ جو بطور مثال کے ذکر کی جاتی ہیں۔

الْحَدِيثُ: (ایضاً) تازہ پھل رَجُلٌ حَدُوْتُ یعنی خوش

گفتار آدمی۔ هُوَ حَدِيثُ النِّسَاءِ وہ عورتوں سے باتیں کرنے

کا عادی ہے۔ حَدِيثُهُ وَتَحَدَّثَتْهُ وَتَحَادَّثُوا: باہم بات

جیت کرنا۔ صَارَ أَحَدُوْنَهُ وہ افسانہ بن چکا ہے۔

رَجُلٌ حَدَثٌ وَحَدِيثُ النِّسَاءِ نُوْعْرَا دَمِي۔

حَادِثَةٌ: مصیبت۔ اس کی جمع حَوَادِثٌ آتی ہے۔

(ح د ق)

الْحَدِيقَةُ: (مرغزار) وہ قطعہ زمین جس میں پانی

جمع ہو اور ہیئت و صورت اور پانی کے ہونے کی وجہ سے

اسے حَدَقَةُ الْعَيْنِ (آنکھ کی پتلی) کے ساتھ تشبیہ دے

کر اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع حَدَائِقُ آتی

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَدَائِقُ ذَاتِ بَهْجَةٍ﴾ (۶۰-۲۷) سرسبز باغ۔ اور

حَدَقَةُ کی جمع حَدَائِقُ وَآحْدَاقُ آتی ہے حَدَقَ

النَّظْرَ: گھور کر دیکھنا نظر جما کر دیکھنا۔ حَدَقُوا بِهِ

وَآحْدَقُوا۔ انہوں نے اس کے گرد احاطہ کر لیا یہ معنی بھی

حَدَقَةُ الْعَيْنِ کے گھمانے سے لئے گئے ہیں۔

(ح ذ ر)

الْحَذَرُ: (س) خوف زدہ کرنے والی چیز سے

دور رہنا۔ کہا جاتا ہے: حَذَرَ حَذْرًا وَحَذِرْتُهُ: میں

(۱) جو کسی کا غلام نہ ہو جیسے فرمایا: ﴿الْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ (۲)۔

۱۷۸) کہ آزاد کے بدلے آزاد۔

(۲) جسے صفات ذمیہ یعنی حرص، لالچ دنیوی مال و متاع کا غلام نہ بنادیں۔

ضد عبودیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(۷۲) تَعَسَّ عَبْدُ الدِّرْهِمِ تَعَسَّ عَبْدُ الدِّيْنَارِ﴾ (درہم و دینار کا بندہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ع

(۱۰۲) وَرِقُّ ذَوِي الْأَطْمَاعِ رِقٌّ مُخَلَّدٌ

حریص اور لالچی لوگ ہمیشہ غلام رہتے ہیں۔

مثل مشہور ہے۔ (مثل)

عَبْدُ الشَّهْوَةِ أَذْلُ مِنْ عَبْدِ الرِّقِّ - کہ شہوت کا بندہ غلام سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔

التَّحْرِيرُ کے معنی کسی انسان کو آزاد کرنا کے ہیں۔ چنانچہ تحریر کے اول معنی کے پیش نظر فرمایا: ﴿فَتَّحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ﴾ تو ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا چاہیے اور

دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا: ﴿نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا﴾ (۳۵-۳) جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں۔ چنانچہ بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ اپنے بیٹے سے کسی قسم کا دنیوی فائدہ حاصل نہیں کرے گی۔ جس کی طرف آیت:

﴿بَنِينَ وَحَفَدَةً﴾ (۱۶-۷۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ خالص عبادت الہی کے لئے وقف رہے گا۔

حَرَّ (س) حَرَارَةُ الْيَوْمِ أَوْ الرِّيحُ: دن یا ہوا گرم ہو گئی۔ ایسے دن کو مَحْرُورٌ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حَرَّ الرَّجُلِ کا محاورہ ہے قرآن میں ہے: ﴿لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا﴾ (۹-۸۱) کہ گرمی میں مت نکلتا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔

الْحَرُورُ: گرم ہوا، لو، ارشاً ہے۔ ﴿وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ﴾ (۲۱-۳۵) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ کی تپش۔

اسْتَحْرَّ الْقَيْظُ: گرمی سخت ہو گئی۔

الْحَرَرُ: بیہوشت جو شدت پیاس کی وجہ سے جگر میں پیدا ہو جاتی ہے۔ الْحَرَّةُ: (اسم مرۃ از حَرَّ) کہا جاتا ہے۔ ۱

(مثل) حَرَّةٌ تَحْتِ قِرَّةٍ: یعنی سخت پیاس سردی کے ساتھ (بد دعا) الْحَرَّةُ: (ایضاً) پتھر جو گرمی کی شدت سے سیاہ ہو جائے۔ اسی سے اسْتَحْرَّ الْقَتْلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کشت و خون کا معرکہ گرم ہونے کے ہیں۔

حَرُّ الْعَمَلِ: کام کی شدت، صعوبت عمل۔

مشہور ہے (مثل) إِنَّمَا تَوَلَّى حَارًّا هَا مِنْ تَوَلَّى قَارًّا..... جس نے اس کی ٹھنڈک سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہی اس کی گرمی برداشت کرے۔

الْحُرُّ: عبد کی ضد کہا جاتا ہے۔ حُرٌّ بَيْنَ الْحُرُورِيَّةِ أَوْ الْحَرُورَةِ: وہ آدمی جس کی شرافت نمایاں ہو۔ حُرِّيَّةٌ: (آزادی) یعنی آزادی دو قسم پر ہے۔

① انظر فی (ق، ر، د)۔

② مرّ تحریرہ فی (عبد)۔

③ لم اجدہ فی المراجع ۱۲۔

سے مشتق ہے کہا جاتا ہے: حُرَبُ الرَّجُلِ: اس کا سامان چھین لیا گیا۔ فَهُوَ حَرِيبٌ یعنی لٹا ہوا۔ التَّحْرِيْبُ: لڑائی کا بھڑکانا۔ رَجُلٌ مَحْرَبٌ جنگجو گویا وہ لڑائی بھڑکانے کا آلہ ہے۔ اَلْحَرْبَةُ: برچھا۔

اصل میں یہ حَرْبٌ یا حِرَابٌ سے فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے اور مسجد کے محراب کو محراب یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان اور خواہشات نفسانی سے جنگ کرنے کی جگہ ہے اور یا اس لئے کہ اس جگہ میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے والے پر حق یہ ہے کہ دنیوی کاروبار اور پریشان خیالیوں سے یک سو ہو جائے۔

بعض کہتے ہیں کہ اصل میں ”محراب البيت“ صدر مجلس کو کہتے ہیں اسی بنا پر جب مسجد میں امام کی جگہ بنائی گئی تو اسے بھی محراب کہ دیا گیا۔

اور بعض نے اس کے برعکس محراب المسجد کو اصل اور محراب البيت کو اس کی فرع مانا ہے۔ اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَ تَمَاثِيلٍ﴾ (۱۳-۳۴) وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی محراب اور جھنڈے۔

اَلْحَرْبِيَاءُ: گرگٹ۔ کیونکہ وہ سورج کے سامنے اس طرح بیٹھ جاتی ہے گویا اس سے جنگ کرنا چاہتی ہے نیز زرہ کے

اسی بنا پر شععی نے مُحَرَّرًا کے معنی مخلصا کے ہیں اور مجاہد نے مُحَرَّرًا کے معنی خادم معبد کے ہیں۔ امام جعفر نے کہا ہے۔ کہ امور دنیوی سے آزاد ہوگا۔ لیکن مال کے لحاظ سے سب کا حاصل ایک ہی ہے۔ حَرَرْتُ الْقَوْمَ: میں نے انہیں قید خانہ سے رہا کر دیا۔ صَرُّ الْوَجْهِ: وہ شخص جو احتیاج کے بیچہ میں گرفتار نہ ہوا ہو۔

حُرُّ الدَّارِ گھر کا درمیان۔
أَحْرَارُ البَقْلِ: وہ ترکاریاں جو بکچی کھائی جاتی ہیں۔
اور شاعر کا قول ۱۰۳ (الکامل)

(۱۰۳) جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بَكْرِ حُرَّةٍ
موسم بہار کی پہلی موسلا دھار بارش نے اس پر سخاوت کی ہے۔
بَاتَتْ الْمَرْءَةُ بِكَيْلَةِ حُرَّةٍ ﴿شَبَّ زَفَافٌ كَشَوْبِ
درآں بکارت نواں زائل کرد۔﴾ یہ سب استعارات ہیں۔
اَلْحَرِيْرُ: (ریشمی کپڑا) ہر ایک باریک کپڑے کو حریر کہا جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيْرٌ﴾ (۲۲-۲۳) وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔

(ح ر ب)

اَلْحَرْبُ: جنگ کا رزار۔ اور فتح را کے ساتھ معنی لڑائی میں کسی کا مال چھیننے کے ہیں پھر ہر قسم کے سلب کو حَرْبٌ کہا جاتا ہے اور حَرْبٌ معنوی لحاظ سے حَرْبٌ

۱ قاله عنبرة وتماه: فتكون كل فرارة كالدرهم۔ وفي رواية الامالي (۲: ۲۹۷) عين فرة بدل بكر حرة وحديقة بدل فرارة وكذا في معلقته (العشر للتبريزي ۲۶۸) وفي شرح التبريزي (۱۸۰) كما ههنا والسبط (۹۴۵) والصحاح واللسان (حر) والمحکم (حدق) والکامل ۶ والصناعتين (۲۸۲) والمختار الشعر الجاهلي (۱: ۱۸۲) ونقد ۶۸ والبحر ۵: ۱۷۰/۷/۱۷۲) والحيوان (۲: ۳۱۲) والعقد الشمسين ۴۵ وطراز المحالس ۱۶ وفي البيت بحث يتعلق بلفظ كل والبيت في ديوانه ۴۵ وابن هشام (۱: ۲۱۷) بحث كل والحمة ۱۶۳ وابن الانباري ۳۱۲۔

۲ انظر للمثل المعاني للقبتي ۵۰۸ والمعداني ۵۰۱۔

سے سچا نام حارث ہے کیونکہ اس میں کسب کے معنی پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے ﴿ (۷۵) أُحْرُثُ فِي دُنْيَاكَ لِأَخْرَجِكَ كَمَا اس وِنْيَا فِي آخِرَتِ كَلِّ لِنِي كَاشِتِ كَرَلُو۔

حَرْثُ الْأَرْضِ: (زمین کاشت کرنا) سے تھسیج بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حَرْثُ النَّارِ کہا جاتا ہے میں نے آگ بھڑکائی اور جس لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے محرث کہا جاتا ہے کسی کا قول ہے۔ ﴿ أُحْرُثُ الْقُرْآنَ: یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام لو۔ حَرْثٌ نَاقَتَهُ: اونٹنی کو کام اور محنت سے دہلا کر دیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے؟ تو انہوں نے جواب دیا ﴿ حَرَّثْنَا هَا يَوْمَ بَدْرٍ کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دہلا کر دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿نِسَاءٌ كُمْ حَرَّثَ لَكُمْ فَأَتَوْا حَرَّثَكُمْ أَنِي شِئْتُمْ﴾ (۲۲۳-۲) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔

میں استعارہ عورتوں کو حَرْثُ کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی کی بقا کا مدار ہے۔ اس طرح نسوع انسان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يُهْلِكُ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو

حلقہ یا میخ کو بھی صوری مشابہت کی بنا پر حَرْثُ کہا جاتا ہے جیسا کہ ضَبٌّ اور كَلْبٌ کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے بعض حصوں کو ضَبَّةٌ اور كَلْبٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح ر ث)

الْحَرْثُ: (ن) کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حَرْثٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَنْ اَعْدُوا عَلَيَّ حَرْثَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ﴾ (۲۸-۲۲) کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔ اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوتی ہے اس لئے حرث بمعنی آبادی آجاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ﴾ (۲۲-۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔ اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے۔ اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اور ہم اپنی کتاب مکارم الشريعة میں دنیا کے کھیتی اور لوگوں کے کسان ہونے اور اس میں بیج بونے کی کیفیت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ ایک روایت میں ہے ﴿ (۷۲) اَصْدَقُ الْأَسْمَاءِ الْحَارِثُ کہ سب

① النہایة (حرث).

② الحدیث ورد بالفاظ مختلفة راجع النہایة ۱: ۳۵۹.

③ عن حدیث عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ النہایة ۱: ۳۹.

④ راجع النہایة ۱: ۳۰.

میں لایَکُنْ فعلِ نہی کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور..... جملہ دعاویہ بھی۔ بعض نے اسے جملہ خبریہ کے معنی میں لیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿الْمَنْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۹۴-۱) سے مفہوم ہوتا ہے۔

الْمُنْحَرَجُ: (صفت فاعلی) گناہ اور تنگی سے دور رہنے والا جیسے مُنْحَوِبٌ، حُوبٌ (یعنی گناہ) سے بچنے والا۔

(ح رد)

الْحَرْدُ: (ض) تیزی اور غصہ کے ساتھ کسی چیز کو روکنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَعَدُوا عَلَيَّ حَرْدٍ قَادِرِينَ﴾ (۶۸-۲۵) اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پینچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔ یعنی وہ اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ مسکینوں کو اپنے بارغ میں آنے سے روک دیں۔

نَزَلَ فُلَانٌ حَرِيدًا: یعنی فلاں قوم سے الگ تھلک اترنا۔ هُوَ حَرِيدُ الْمَحَلِّ: یعنی الگ تھلک رہنے والا۔ حَارَدَتِ السَّنَةُ: یعنی امسال بارش نہیں ہوئی۔ حَارَدَتِ النَّاقَةُ اَوْثُنِي نَعْدَدُ دودھ روک لیا۔ (یعنی اس کا دودھ کم یا خشک ہو گیا) حَرْدٌ: (س) غضبناک ہونا۔ حَرْدَةٌ كَذَابٌ: فلاں چیز نے اسے غضبناک کر دیا۔ بَعِيرٌ أَحْرَدٌ: اونٹ جس کی اگلی ٹانگ کا پٹھا ڈھیلا ہو۔ الْأَحْرَدِيَّةُ: سرکنڈے کا باڑہ۔

(ح رس)

الْحَرَسُ وَالْحَرَأْسُ: (جمع) پاسبان۔ اس کا واحد حَارِسٌ ہے ﴿قرآن پاک میں ہے۔

دو نسلوں اور انسانوں اور حیوانوں کی نسل کو ناپود کر دے۔

(ح رج)

الْحَرَجُ وَالْحَرَاجُ: (اسم) کے اصل معنی اشیاء کے مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے اس لئے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَجٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا﴾ (۶۵-۴) اور..... اپنے دل میں تنگ نہ ہوں۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (۴۸-۲۲) اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔

حَرَجٌ (س) حَرَجًا - صَدْرَةٌ - سینہ تک ہو جانا قرآن پاک میں ہے: ﴿يَجْعَلُ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾ (۶۵-۲۵) اس کا سینہ تک اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ ایک قرأت میں حَرَجًا ہے ﴿یعنی کفر کی وجہ سے اس کا سینہ گھٹتا رہتا ہے اس لئے کہ عقیدہ کفر کی بنیاد ظن پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو کبھی سکون نفس حاصل نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَيَّ قُلُوبِهِمْ﴾ (۷۲-۷) سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ﴾ (۷۲-۷) اس سے تم کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیے۔

① قراءۃ ابن عباس وعمرؓ.

② قال فی التاج: والحرسى لا تفل حارس لانه قد صار اسم جنس الا ان يذهب به الى معنى الحراسة ۱۲.

حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے ۵۔ ابو عبیدہ کا قول ہے کہ الحریسة بمعنی محروسة ہے نیز الحریسیة بمعنی مسروقة بھی آجاتا ہے یعنی چوری کیا ہوا مال اور اس معنی میں باب حرس (ض) یحرس حرساً آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ الحریسة سے بنا ہے کیونکہ اہل عرب سے الحریسیة کے بمعنی سرقہ یعنی چوری بھی منقول ہے۔

(ح ر ص)

أَلْحَرِصُ: شدت آرزو (حرص) یا فرط ارادہ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنْ تَحَرَّصْ عَلٰی هٰذَا هُمْ﴾ (۱۶-۳۷) یعنی ان کی ہدایت کے لئے تمہارے دل میں شدید آرزو اور خواہش ہو۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَيَاةٍ﴾ (۲-۹۶) بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی پر کہیں زیادہ حریص دیکھو گے۔

﴿وَمَا أَكْثَرَ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۲-۱۰۳) اور بہت سے آدمی گوتم (کتی ہی) خواہش کرو۔ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اصل میں یہ حَرَصَ الْقَصَارُ الثَّوْبَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دھوبی نے کپڑے کو پتھر پر مار مار کر پھاڑ دیا۔

﴿فَوَجَدْنَا هَا مُلْتَمِتٌ حَرَسًا شَدِيدًا﴾ (۸-۷۲) تو اس کو مضبوط چوکیداروں..... سے بھرا ہوا پایا۔

أَلْحَرَسُ: (ض) اور أَلْحَرَزُ کے جس طرح الفاظ ملتے جلتے ہیں ایسے ہی ان کے معنی بھی قریب قریب ایک ہی ہیں ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ حَرَزُ کا استعمال زیادہ تر نقدی اور سامان کی حفاظت کے لئے آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۵ (الکامل)

(۱۰۴) فَبَقِيْتُ حَرَسًا قَبْلَ مَجْرَى دَاحِسٍ لَوْ كَانِ لِلنَّفْسِ اللَّجْوُجُ خُلُودٌ میں داحس کی دوڑ سے پہلے اس کی حفاظت کرتا رہا کاش سرکش نفس کے لئے ہمیشہ رہنا ہوتا۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں حَرَسًا کے معنی دھرا کے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر صرف اس شعر کی بنا پر حرس کے معنی زمانہ کئے گئے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شعر مذکور میں ہو سکتا ہے کہ حرس مصدر بمعنی فاعل موضع حال میں ہو ای بقیث حارساً: اب رہا اس کا زمانہ یا مدت کے معنی پر دلالت کرنا تو یہ لفظ حرس کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ مقتضائے کلام سے مفہوم ہوتے ہیں۔

أَحْرَسَ: صاحب حراست ہونا۔ (اس میں صاحب ماخذ ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں جیسا کہ باب افعال کا خاصہ ہے۔

حَرِيْسَةُ الْجَبَلِ: وہ مال جو رات کے وقت پہاڑ میں

۱ قاله ليبيد كمانى اللسان والتاج (جرى) والعمرين ۶۳ وفى رواية وغنيت سبتاً بدل بقيث حرساً وفى محاز الفران ۲۸۹:۱ رقم ۳۲۲ والمحكم والمرزوقى ۷۱۴: وعمرت حرسا والبيت فى ديوانه (۲۵:۱) واصلاح يعقوب ۱۰ ونهذيب الاصلاح (۱۶:۱) مع آخر قبله والبحر ۲۴۰:۱.

۲ ومنه فى الحديث فى حريسة الجبل (التاج) لانه ليس فى حرس.

أَحْرَضَتْهُ: (افعال) کسی چیز میں خرابی پیدا کر دینا۔ جیسے
أَقْدَيْتُهُ: کسی چیز کو قذا آلود کرنا ہوتے ہیں۔

(ح ر ف)

حَرْفُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے کنارہ کے
ہیں حَرْفٌ کی جمع أَحْرَافٌ وَحُرُوفٌ آتی ہے اور پہاڑ
کشتی اور تلوار کے کنارہ کو حَرْفٌ کہا جاتا ہے اور
حَرْوُفٌ النِّهْجَاءِ کے معنی اطراف کلمہ کے ہیں اور
اصطلاح نحماء میں أَحْرُوفُ الْعَوَامِلِ ان حروف کو کہا
جاتا ہے جو کلموں کے اطراف میں واقع ہوتے ہیں اور ان
کو باہم مرتبط کرتے ہیں اور حَرْفُ الْجِبَلِ یعنی پہاڑ
کے کنارے اور باریکی میں حرف کے ساتھ تشبیہ دے کر
لاغر اونٹنی کو حرف کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ﴾

(۱۱-۲۲) اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں۔ جو کنارے

پر (کھڑا ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں..... میں علیٰ
حَرْفٍ کے معنی خود قرآن پاک نے ہی بعد میں فَاِنَّ
اَصَابَهُ خَيْرٌ الْاَيَةِ سے بیان کر دیئے ہیں یعنی جب تک
اطاعت و عبادت میں کچھ دنیاوی فائدہ نظر آتا ہے تو اس کو
کرتا رہتا ہے اور جب کوئی تکلیف نظر آتی ہے تو چھوڑ
بیٹھتا ہے۔ اور یہی معنی آیت:

﴿مُذَبَّذِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ﴾ (۳-۴۳) کے ہیں۔

اِنْحَرَفَ عَنْ كَذَا وَتَحَرَّفَ: کسی چیز سے کنارہ کرنا

أَلْحَرِصَةُ: وہ زخم جو جلد کو پھاڑ ڈالے۔

أَلْحَارِصَةُ وَالْحَرِصَةُ اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی
بارش سے زمین کی بالائی سطح کو کھرچ ڈالے۔

(ح ر ض)

الْحَرَضُ: اس چیز کو کہتے ہیں جو ٹکمی ہو جائے اور
درخور اعتناء نہ رہے اس لئے جو چیز قریب بہ ہلاکت
ہو جائے اس کے متعلق حَرَضٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا﴾ (۱۲-۸۵) یا تو قریب بہ
ہلاکت ہو جاؤ گے۔ اور أَحْرَضَهُ کے معنی گھلا دینے اور
قریب بہ ہلاکت کر دینے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔^①

(۱۰۵) اِنْسِي اَمْرًا نَابِيَنِي هَمًّا فَاَحْرَضْنِي:

میں وہ آدمی ہوں جسے تمہارے غم نے گھلا دیا ہے۔

أَلْحَرَضَةُ: گھٹیا قسم کا آدمی جو خود ایک دام بھی خرچ نہ
کرے بلکہ جوئے بازی کا گوشت مفت کھانے کا عادی
ہو۔

التَّحْرِيفُ: کے معنی ازالہ الحرض کے معنی میں ہیں یعنی
کسی چیز سے بگاڑ اور خرابی کو دور کر دینا جیسے مَرَضَةٌ اور
قَدَيْتُهُ کے معنی مرض اور تنکے کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔

تَحْرِيفُ کے معنی کسی کو مزین کر کے اور اسے آسان
صورت میں پیش کر کے اس پر برا بیچنے کرنے کے ہیں۔^②

① قاله العرجي عبدالله بن عمر بن عبدالله وتامه: حتى بليت وحتى شقى السقم - والبيت في اللسان والصحاح والتاج (حرض) ومجاز القرآن ۱: ۳۱۷ رقم ۳۶۶ والطبري ۱۳: ۴۲) وفي رواية لبي حب بدل نابي هم والقرطبي ۹: ۲۵۰) والشطر في فتح

الباري ۸: ۲۷۳) وراجع الترجمة الشاعر الاغانى ۱: ۳۸۳) والاشتقاق ۸ والسمط ۴۲۲) والبحر ۵: ۳۲۷) .

② وفي التنزيل حرض المؤمنين على القتال ۴: ۸۴) .

چرچاہٹ والا کھانا۔ ایک روایت میں ہے۔ ﴿٥٦﴾
 نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلَيَّ سَبْعَةَ أَحْرَفٍ كَقُرْآنِ سَاتِ
 حروف پر نازل ہوا ہے۔
 اس کی تحقیق ہمارے رسالہ المنبہة علی فوائد
 القرآن میں ملے گی۔

(ح ر ق)

أَحْرَقَ كَذَا: (کسی چیز کو جلانا) اِحْتَرَقَ: (جلنا)
 الْحَرِيقُ: (آگ) قرآن میں ہے:
 ﴿ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾ (۳-۱۸۱) کہ عذاب
 (آتش) سوزاں کے مزے چکھتے رہو۔

﴿فَأَصَابَهَا أَعْصَارُ فِيهِ نَارًا فَاحْتَرَقَتْ﴾ (۲-۲۶۶)
 تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا گولہ چلے اور وہ جل
 کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے۔
 ﴿قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا إِلَهَتِكُمْ﴾ (۲۱-۲۸)
 تب وہ کہنے لگے..... تو اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی
 مدد کرو۔

﴿لَنَسْحَرِّقَنَّهُ﴾ (۲۰-۹۷) ہم اسے جلا دیں گے۔ ایک
 قرأت میں لَنَحْرُقَنَّهُ ہے ﴿پس حَرْقُ الشَّيْءِ﴾ کے
 معنی کسی چیز میں بغیر اشتعال کے جلن پیدا کرنے کے ہیں
 جیسے دھوبی کے پٹنے سے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔

حَرْقَ (ن) الشَّيْءِ رَيْتِي سے رگڑنا اسی سے حَرْقَ

ایک جانب مائل ہونا۔ اَلْأَحْرَفُ: کوئی پیشہ اختیار کرنا۔
 اَلْحَرْفَةُ: (فعل) پیشہ، پیشے کی حالت جیسے قَعْدَةٌ وَ
 جِلْسَةٌ۔
 اَلْمُحَارَفُ: وہ شخص جو خیر سے محروم اور اس کے کنارہ پر
 ہو (کم نصیب)

اَلتَّحْرِيفُ: (الشَّيْءُ) کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک جانب
 مائل کر دینا۔ جیسے تَحْرِيفُ الْقَلَمِ قَلَمٌ كُؤِيزٌ هَا قَطَلَا۔
 اور تَحْرِيفُ الْكَلَامِ کے معنی ہیں کلام کو اس کے موقع
 و محل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔
 قرآن پاک میں ہے:

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ﴾ (۵-۱۳) یہ
 لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے
 ہیں۔ اور دوسرے مقام پر ہے: ﴿مَنْ بَعْدَ مَوَاضِعِهِ﴾
 (۵-۳۱) یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔
 ﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ
 يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ﴾ (۲-۷۵) (حالانکہ)
 ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر
 اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر) بدل دیتے
 رہے ہیں۔
 اَلْحَرْفُ: وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو۔ گویا وہ
 حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔ طَعَامٌ حَرِيفٌ:

① کذا فی غریب ابی عبید ۳: ۱۵۹-۱۶۲ وتمامہ کلھا شاف کاف۔ وبعضہم یرویہ فاقروا کما علمتم راجع الفائق ۱: ۳۴۵
 والصحیح انزل بدل نزل والحديث باختلاف الفاظه فی (حم ق) عن عباس والسخري فی الابانة عن زيد بن ثابت و(هب) عن عمرو
 ابن العاص (د) عن ابی بن کعب (حم طب) عن عبادة بن الصامت (حم م ک) عن ابی بکر و عمر (حم) عن ابی جهم (حم ف)
 عن ابی حم عن حذيفة وطب عن معاذ و عن ابن مسعود وابن الضريس عن ابن عباس وابن جرير عن ابن مسعود وابن عمر (حم وابن
 جرير طب) و ابو نصر السخري فی الابانة راجع کنز العمال ج ۲: ۱۸۶-۲۲۵) وفي بعضها ثلاثة احرف وفي بعضها اربعة احرف
 لكن حديث سبعة اكثر واصلح فلها الاعتبار.

② وهي قرأة علی رضی اللہ عنہ.

جس بستی والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا حال ہے کہ وہ دنیا کی طرف رجوع کریں۔

کو بھی اسی معنی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک آیت: ﴿فَإِنَّهَا مُحْرَمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً﴾ (۵-۲۶) کہ وہ ملک ان پر چالیس برس تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔

میں بھی تحریم تخیری مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منع جبری پر محمول ہے اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ (۵-۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا۔ خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔

میں بھی حرمت جبری مراد ہے اسی طرح آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيَّ الْكَافِرِينَ﴾ (۷-۵۰) کہ خدا نے بہشت کا پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے۔

میں تحریم بواوسطہ منع جبری ہے اور حرمت شرعی جیسے (۷۷) آنحضرت ﷺ نے طعام کی طعام کے ساتھ بیچ

میں تفاضل کو حرام قرار دیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذْ يَأْتُوكُمْ أَسَارَىٰ نَفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحْرَمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ﴾ (۲-۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلا دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا۔

میں بھی تحریم شرعی مراد ہے کیونکہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ نیز تحریم شرعی کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ لَا آجِدُ فِيمَا أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحْرَمًا

النَّابِ كَمَا حَوَّرَهُ هِيَ جَس كَعْمَعْنِ دَانَت مِئِنِي كِي هِي۔

محوارہ ہے۔ يَحْرُقُ عَلَيَّ الْأَرْمُ: یعنی وہ مجھ پر دانت پیتا ہے۔ حَرِيقِ الشَّعْرُ اس کے اشعار مشہور ہو گئے۔

مَاءٌ حَرَّاقٌ: بہت کھاری پانی جو کھاری پن سے جلاؤالے الْأَحْرَاقُ: کسی چیز کو جلاانا اسی سے استعارہ جب کہ بہت زیادہ ملامت کر کے اذیت پہنچائے تو کہا جاتا ہے۔

أَحْرَقْنِي بَلْوَمِهِ یعنی اس نے مجھے ملامت سے جلاؤالا۔

(ح ر ك)

الْحَرَكَةُ: یہ سکون کی ضد ہے اور جسم کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جسم کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو حرکت کہا جاتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز میں تغیر ہونے یا اس کے اجزاء میں کمی بیشی واقع ہونے پر بھی تحريك كذا کہہ لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ﴾ (۱۶-۷۵) اور (۱) محمد ﷺ) وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو۔

(ح ر م)

الْحَرَامُ: وہ ہے جس سے روک دیا گیا ہو خواہ یہ ممانعت تخیری یا جبری، یا عقل کی رو سے ہو اور یا پھر شرع کی جانب سے ہو اور یا اس شخص کی جانب سے ہو جو حکم شرع کو جلاتا ہے۔ پس آیت کریمہ ہے۔

﴿وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ﴾ (۱۲-۲۸) اور ہم نے پہلے ہی سے اس پر (دائیوں کے) دودھ حرام کر دیئے تھے۔ میں حرمت تخیری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَحَرَامٌ عَلَيَّ قَرْيَةٌ أَهَلَّكُنَّا هَا﴾ (۲۱-۹۵) اور

① متفق عليه من حديث عمر بن الخطاب ورواه النسائي وابن ماجه وابوداؤد من حديث عباد بن الصامت راجع النيل (۲۰: ۵)۔

اور آیت کریمہ: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ﴾ (۲۸-۲۷)۔
 (۲۷) بلکہ ہم (برگشتہ نصیب) بے نصیب ہیں ان کے محروم ہونے سے بد نصیبی مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿لِلنَّاسِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (۵۱-۱۹)۔
 مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) میں محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خوشحالی اور وسعت رزق سے محروم ہو اور بعض نے کہا ہے کہ المحروم سے کتا مراد ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ محروم کتے کو کہتے ہیں جیسا ان کی تردید کرنے والوں نے سمجھا ہے بلکہ انہوں نے کتے کو بطور مثال ذکر کیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر کتے کو لوگ دور ہٹاتے ہیں اور اسے کچھ نہیں دیتے۔

الْمَحْرَمَةُ وَالْمَحْرَمَةُ کے معنی حرمت کے ہیں۔
 اسْتَحْرَمَتِ الْمَاعِزُ: بکری نے زکری خواہش کی (یہ حرمۃ) سے ہے جس کے معنی بکری کی جنسی خواہش کے ہیں)

(ح ر ی)

حَرَى (ض) الشَّيْءِ وَتَحَرَّاهُ کے معنی کسی چیز کے حَرَى یعنی جانب کا قصد کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأُولَئِكَ تَحَرَّوْا رَشْدًا﴾ (۲۲-۱۳) یہی لوگ ہیں جنہوں نے سیدھی راہ کا قصد کیا۔ اور حَرَى الشَّيْءِ حَرَبًا کے معنی کسی چیز کے کم ہونے کے ہیں گویا وہ ایک جانب پڑی رہی اور پھولی پھولی نہیں شاعر نے کہا ہے ﴿الکامل﴾

عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ ﴿ (۶-۱۳۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھاتا ہو حرام نہیں پاتا۔

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرِ﴾ (۶-۱۳۶) اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے۔

سَوَاطٍ مَّحْرَمٍ: بے دباغت چمڑے کا کوزا۔ گویا دباغت سے وہ حلال نہیں ہوا جو کہ حدیث ﴿كُلُّ إِهَابٍ دُبِغٍ فَقَدْ طَهَّرَ كَاتِقْتَضَى﴾ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مَحْرَمٍ اس کوزے کو کہتے ہیں جو نرم نہ کیا گیا ہو۔

الْحَرَمِ: کو حرام اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر بہت سی ایسی چیزیں حرام کر دی ہیں جو دوسری جگہ حرام نہیں ہیں اور یہی معنی الشهر الحرام کے ہیں۔ رَجُلٌ حَرَامٌ وَمَحْرَمٌ: یعنی وہ شخص جو حالت احرام میں ہو اس کے بالقابل رَجُلٌ حَلَالٌ وَمُحَلٌّ ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تَحْرِمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ (۱-۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ تم اس چیز کی تحریم کا حکم کیوں لگاتے ہو جو اللہ نے حرام نہیں کی کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کی ہو وہ کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ آیت: ﴿وَأَنعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا﴾ (۶-۱۳۸) اور بعض چار پائے ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ میں مذکور ہے۔

① اخرجہ هذا اللفظ الطبرانی عن ابن عباس والمعروف من لفظ الحديث ايما بدل كل راجع (حم ن ۵) والمسلم عن ابن عباس وكذا في مسند احمد ورواه الشافعي وابن حبان والدارقطني ورواه الخطيب في تلخيص المنشابه من حديث جابر وفي رواية الدارقطني عن عائشة مرفوعاً ظهراً كل اديم دباغها راجع النبيل (۷۵: ۱) وكذا العمال ۹ رقم ۲۱۴۴، ۲۱۲۹ بالفاظ وطرق.

② لسلمة بن عويه بن ربيعة الضبي من قصيدة طويلة وصدرة حتى كاتي خاتل قضا ونسبه المرتضى ۱: ۲۴۴ عن الجاحظ لذي الاصبغ ونسبه القالي (۱۶۶: ۲) بيتا لسلمى بن غزويه قال الامتاذ العيمى وهو غوية بن سلمى انظر السط ۳۲۲ ومجالس ثعلب ۱: ۲۴۵ واللانى ۷۹ وقد ذكره المرزبانى فى معجمه فى حرف العين المهملة وقال لا يقال غويه بالمعجمة (فى البحرى ۲۹۶) لغزويه بن سلمى.

اس کے بعد تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا:

﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ﴾ (۲۲-۳۳)

(ح ز ن)

الْحَزْنُ وَالْحَزْنُ کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔

نیز غم کی وجہ سے جو بے قراری سی طبیعت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اسے بھی حَزْنُ یا حُزْنُ کہا جاتا ہے اس کی ضد فَرَح ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہونے کے لئے خَشِنْتُ بِصَدْرِهِ بھی کہا جاتا ہے۔ حَزْنُ (س) غمزدہ ہونا۔ حَزْنَةٌ (ن) وَاخْرَجْتَهُ: غمگین کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَكَيْلًا تَحْزِنُوا عَلٰی فَا تَكْتُمُ﴾ (۱۵۳-۳) تاکہ

جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے..... اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔

﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ﴾ (۳۵-۳۳)

کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔

﴿تَوَلَّوْا وَاَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾

(۹۲-۹) تو وہ لوٹ گئے اور..... ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

﴿اِنَّمَا اَشْكُوْا بَيْنِيْ وَحِزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ﴾ (۱۲-۸۶)

کہ میں تو اپنے غم و اندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَحْزِنُوْا﴾ (۱۳۹-۳۰) اور نہ کسی طرح کا غم

کرنا۔

اور ﴿لَا تَحْزِنُ﴾ (۴۰-۹) کہ غم نہ کر۔

(۱۰۶) وَالْمَرْءُ بَعْدَ تَمَامِهِ يَحْرِي

انسان کامل ہونے کے بعد ہلنا شروع ہو جاتا ہے۔

رَمَاهُ اللّٰهُ بِأَفْعٰی حَارِيَةٍ ۝ (مثل)

اللہ تعالیٰ اس پر بوڑھا اڑدھا مسلط کرے۔

(ح ز ب)

الْحِزْبُ: وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اٰی الْحِزْبَيْنِ اٰخِصٰی لِمَا لَبَسُوْا اَمَدًا﴾ (۱۲-۱۸) دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔

﴿اَوَلَيْكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ﴾ (۱۹-۵۸) یہ (جماعت)

شیطان کا لشکر ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَمَّا رَأَى

الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ (۲۲-۳۳) اور جب مومنوں نے کافروں کے لشکر کو دیکھا۔ میں احزاب سے وہ

لوگ مراد ہیں جو (مختلف قبائل سے) آنحضرت ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ﴾ (۵۶-۵) اور

خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔ میں حزب اللہ سے انصار اللہ یعنی دین الہی کی مدد کرنے والے لوگ مراد

ہیں۔

﴿يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا وَاِنْ يَّاتِ

الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا وَاَلَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِى

الْاَغْرَابِ﴾ (۲۰-۳۳) (خوف کے سبب) خیال

کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں اور اگر لشکر آ جائیں تو تمنا

کریں کہ (کاش!) گنواروں میں جا رہیں۔

① انظر السمت ۴۹۰ والقالی ۲: ۱۷۲، ۱۷۰، وذیل الامالی ۵۵ فی مبحث "وعاء العرب" قال والحاریة التي رجع سمها فيها قاحرقها فهوا شد لضربتها والميداني ۱: ۲۷۱، ۲۰۸، ۲۸۲، والحيوان ۴: ۲۴۴، والمثل في حل المعاجم.

(۲) کسی کے حاسہ پر مارنا۔ جیسے كَبَدْتُهُ وَفَادْتُهُ اور حاسہ پر مارنے سے کبھی انسان قتل ہو جاتا ہے۔ اس لئے حَسَسْتُهُ بمعنی قَتَلْتُهُ آ جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذْ تَحْسَبُوهُمْ بَادِئِينَ بِأُذُنِهِ﴾ (۳-۱۵۲) جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔

اور حَسِينَس بمعنی قَتِيل بھی آتا ہے اور اسی سے پکی ہوئی جراد کو جَرَادٌ مَحْسُوس کہا جاتا ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں حَسَّ الْبَرْدُ النَّبَاتُ: پالے نے نبات کو جلا ڈالا۔

إِنْحَسَّتْ أَسْنَانُهُ: اس کے دانت گر گئے۔ اور

حَسِسْتُ (س) فَهَمْتُ وَعَلِمْتُ کے ہم معنی ہے

مگر یہ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جو بذریعہ

حواس کے معلوم ہو۔ اور حَسِسْتُ میں ایک سین کو یا سے

تبدیل کر دیا گیا ہے اور أَحْسَسْتُهُ کے اصل معنی بھی کسی

چیز کو محسوس کرنے کے ہیں اور أَحَسْتُ بھی أَحْسَسْتُ

ہی ہے مگر اس میں ایک سین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا

ہے جیسا کہ ظَلَمْتُ (میں ایک لام محذوف ہے) اور آیت

کریمہ:

﴿فَلَمَّا أَحَسَّ مِنْهُمْ الْكُفْرَ﴾ (۳-۵۲) جب

عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے نافرمانی اور نیت قتل

دیکھی۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس قدر

برملا طور پر کفر کیا کہ عقل و فہم کی بجائے وہ ہر ایک کو محسوس

ہو رہا تھا اور یہی معنی آیت:

میں اندر تکین ہونے سے منع نہیں کیا اس لئے کہ مغموم ہونا کسی انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے۔ جس سے منع کرنے کی ضرورت پیش آئے بلکہ یہاں دراصل ان کاموں کے کرنے سے منع کرنا مقصود ہے جو غم و اندوہ کا باعث بنتے ہیں

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے ۱

(۱۰۸) مَنْ سَرَّهُ أَنْ لَا يَرِيَ مَا يَسُوهُ ۱

فَلَا يَتَّخِذُ شَيْئاً يِيَالِي لَهٗ فَقَدْ ۱

(جسے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی چیز اسے غمگین نہ کرے تو وہ

ایسی چیز حاصل نہ کرے جس کے غم ہونے کا اندیشہ ہو)

نیز انسان کو دنیا کے نظام پر غور کرنا چاہیے (کہ یہاں کس

طرح سلسلہ اضداد قائم ہے) تاکہ جب اس پر اچانک

کوئی مصیبت آپڑے تو اس سے زیادہ پریشان نہ ہو اور یہ

بھی ضروری ہے کہ انسان معمولی مصیبتیں برداشت کرنے

کا عادی بن جائے تاکہ بڑے مصائب کو بھی برداشت

کر سکے۔

(ح س س)

الْحَاسَةُ: اس قوت کو کہتے ہیں جس سے عوارض

حَسِينَةٍ کا ادراک ہوتا ہے اس کی جمع حَوَاسٌ ہے جس

کا اطلاق مشاعر غم (یعنی سمع، بصر، شم، ذوق، اور لمس)

پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ:

حَسَسْتُ (ن) وَحَسِيتُ وَأَحْسَسْتُ: محسوس کرنا

اور أَحْسَسْتُ (افعال) دو طرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) قوت حس سے کسی چیز تک پہنچنا (محسوس کرنا) جیسے

عَتْنَهُ وَرَعْتَهُ ۱

۱ قالہ عبد اللہ بن طاہر وغذہ الثعالبی فی خاص الخاص ۱۰۶ من ظریف شعرہ و قبلہ الم تر ان الدھر یهدم ما بنی - و یاخذ ما عدی و یفسد ما اسدی.

﴿قَلَمًا أَحْسُوا أَبَا سَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ﴾ (۱۲-۲۱) جب انہوں نے ہمارے (مقدمہ) عذاب کو دیکھا تو لگے اس سے بھاگنے۔

میں مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ أَحَدٍ﴾ (۲۰-۹۸) کے معنی یہ ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی ان میں سے محسوس کر سکتے ہو۔

الْحَسِيسُ وَالْحِسُّ: حرکت، آہٹ کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا﴾ (۲۱-۱۰۲) (یہاں تک کہ) اس کی آہٹ بھی تو نہیں سنیں گے۔

الْحَسَّاسُ: سوء خلق یہ زکام وسعال کی طرح (فعال) کے وزن پر ہے (جو بیماری یا عیب کے معنی کے ساتھ خاص ہے)۔

(ح س ب)

الْحِسَابُ کے معنی گننے اور شمار کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَسَبْتُ (ض) أَحْسِبُ حِسَاباً وَحُسْبَاناً قرآن پاک میں ہے:

﴿لَتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابِ﴾ (۱۴-۱۲) اور برسوں کا شمار اور حساب جان لو۔

﴿وَجَاعِلُ اللَّيْلِ سَكَنًا وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ حُسْبَانًا﴾ (۶-۹۶) اور اسی نے رات کو (موجب)

آرام (ٹھہرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔

بعض نے کہا کہ ان کے حُسبان ہونے کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۱۸-۴۰) اور وہ تمہارے بارخ پر آسمان سے آفت بھیج دے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حُسباناً کے معنی آگ اور عذاب کے ہیں اور حقیقت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔

حدیث ۵ میں ہے (۷۷) آخضرت ﷺ نے آندھی کے متعلق فرمایا: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا وَحُسْبَانًا کہ الہی اسے عذاب یا حُبان نہ بنا اور آیت کریمہ:

﴿فَحَاسِبْنَهَا حِسَابًا شَدِيدًا﴾ (۶۵-۸) تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا۔ میں حدیث ۵ (۷۸)

مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ عَذِبَ (کہ جس سے حساب میں سختی کی گئی اسے ضرور عذاب ہوگا)۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (۲۱-۱) لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آ پہنچا (اپنے مضمون میں) وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ کی طرح ہے اور آیت

۱ ہی قرآء الاكثر وفي قرآء الكوفة جعل (فعل ماضی) وكلاهما قرئتاك مستفيضتان (الطبري) ۲۸۳:۷ والدانی ۱۰۵ وحسباناً جمع حساب مثل شهاب وشهاب قاله الاخفش والفتح للشوكاني وايضاً أبو عبيده في محازة ۲۰:۱ وقيل هو مصدر (الطبرسي) ۱۳۸:۷.

۲ راجع غريب ابي عبيد ۲۰:۱:۱ و ابو داؤد (جناز) والترمذی في التفسير والمستدرک ۴۸:۶.

۳ من عديت عائشة وفي المطبوع معذب والتصحيح من الاصول راجع للحديث ومحارة عائشة رضی اللہ عنہا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم في الفتح للحافظ ۱۶:۱۹۱-۱۹۳ والحديث في الفائق ۲:۲۸۸ والنهاية واصله في الصحيحين ۱۲.

ہو جاتے ہیں۔

(۳) بغیر کسی تنگی کے دیتا ہے۔ اور یہ حَاسِبْتُهُ سے ہے جس کے معنی ضَايِقْتُهُ یعنی تنگی کرنا آتے ہیں۔

(۵) لوگوں کے عام اندازہ سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔

(۶) اپنی مصلحت کے مطابق عطا فرماتا ہے کہ لوگوں کے حساب کے مطابق جیسا کہ آیت:

﴿وَلَوْ لَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا

لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ﴾ (۲۳-۳۳) اور اگر یہ خیال

نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا سے انکار کرتے ہیں۔ میں سزا فرمائی ہے۔

(۷) مومن کو جو کچھ دیتا ہے اس پر محاسبہ نہیں کرے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن دنیا میں بقدر کفایت حاصل کرتا ہے اور وہ بھی جائز طریقہ سے اور حسب ضرورت اور اسی

طریق سے خرچ کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے آپ پر محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس سے اس

طرح حساب نہیں لے گا جس سے کہ اسے نقصان پہنچے

جیسا کہ حدیث میں ہے۔ (۷۹) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ

فِي الدُّنْيَا لَمْ يُحَاسِبْهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ کہ جو

شخص دنیا میں اپنے نفس پر محاسبہ کرتا رہے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے حساب نہیں لے گا۔ (یعنی جس سے کہ اسے نقصان پہنچے)۔

(۸) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے استحقاق

سے زیادہ بدلہ عطا فرمائے گا۔ جیسے فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي

يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا

كَثِيرًا﴾ (۲-۲۳۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے

کہ وہ اس کے بدلے اسکو کئی حصے زیادہ دے گا۔

کریمہ: ﴿وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِي﴾ (۶۹-۲۶) اور مجھے

معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْقٍ حِسَابِي﴾ (۶۹-۲۰) مجھے

یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (و کتاب) ضرور ملے گا۔

میں ”و“ وقف کی ہے جیسا کہ مَالِيَهُ وَسُلْطَانِيَّةٍ میں ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ (۱۵-۵۱) بے شک

خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا﴾ (۷۸-۳۶)

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام کثیر۔ میں

بعض نے کہا ہے کہ حِسَابًا کے معنی کَافِيًا کے ہیں

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ

إِلَّا مَا سَعَى﴾ (۵۳-۳۹) کے مضمون کی طرف اشارہ

ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۲)

(۲۱۲) اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔ میں

بغیر حساب کی متعدد توجیہات ہو سکتی ہیں۔

(۱) استحقاق سے زیادہ عطا فرماتا ہے۔

(۲) جسے چاہے عطا فرماتا ہے اور پھر اس سے واپس نہیں

لیتا۔

(۳) اس قدر عطا فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اس کا احصاء

ممکن نہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

(۱۰۹) عَطَايَاهُ يُحْصَى قَبْلَ إِحْصَائِهَا الْقَطْرُ

کہ بارش کے قطروں سے بھی اس کے عطایا زیادہ

اور آیت کریمہ:

﴿فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۰-۳۰) تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔

﴿هٰذَا عَطَاءٌ نَّافٍ مُنْ أَوْ أَمْسِكَ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۸-۳۹) یہ ہماری بخشش ہے (چاہو) تو احسان کرو یا (چاہو) تو رکھ چھوڑ دو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔

میں بغیر حساب کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اس میں اس شخص کی طرح تصرف کرو جسے محاسبہ کا خوف نہ ہو۔ یعنی (مومن کی طرح) واجب طریق سے بوقت ضرورت اور بقدر کفایت لیا کرو اور پھر اسی طریق سے خرچ کرتے رہو۔ الْحَسِيبُ وَالْمُحَاسِبُ کے اصل معنی حساب لینے والا یا حساب کرنے والا کے ہیں۔ پھر حساب کے مطابق بدلہ دینے والے کو بھی حَسِيبُ کہا جاتا ہے۔ (اور) یہی معنی اللہ تعالیٰ کے حسیب ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا﴾ (۲-۶) تو خدا ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔ میں حسیب بمعنی رقیب ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نگہبانی کے لئے کافی ہے جو ان سے محاسبہ کرے گا۔

حَسْبُ: (اسم فعل) بمعنی کافی جیسے فرمایا: ﴿حَسْبُنَا اللَّهُ﴾ (۹-۵۹) ہمیں اللہ کافی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ﴾ (۵۸-۸) ان کو دوزخ (ہی کی سزا کافی ہے) اور آیت کریمہ: ﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ

مِنْ شَيْءٍ﴾ (۶-۵۲) ایسے ہی ہے جیسے کہ آیت:

﴿عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ (۵-۱۰۵) اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور

آیت: ﴿وَمَا عَلِمْنَا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ إِنْ حَسَابُهُمْ إِلَّا عَلَى اللَّهِ﴾ (۲۶-۱۱۳:۱۱۳) مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں ان کا حساب (اعمال) میرے پروردگار کے ذمہ ہے۔ کے مفہوم کے مطابق ہے بعض نے آیت مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ کے یہ معنی کئے ہیں کہ ان کو کافی ہونا تمہارا کام نہیں ہے۔ بلکہ تیرے اور ان کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿عَطَاءٌ حِسَابًا﴾ (۷۸-۳۶) میں حساب بمعنی کافی ہے اور یہ حَسْبِي كَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ حِسَابِهِمْ سے ان کے اعمال مراد ہیں یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے تجھ پر گرفت نہیں ہوگی اور اعمال کو بلحاظ مال کے حساب کہا گیا ہے۔

إِحْتَسَبَ ابْتِئَالَهُ: یعنی اس نے اپنے بیٹے کی موت پر یہ سمجھ کر صبر کیا کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس کے عمل کو حِسْبَةً کہا جاتا ہے۔

اور آیات:

﴿الَّذِينَ أَحْسَبَ النَّاسُ﴾ (۲۹-۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں۔

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ﴾ (۲۹-۲۹) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهُ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ﴾

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ (۱۱۳-۵)

اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے۔

(ح س ر)

الْحَسْرَةُ: (نض) کے معنی کسی چیز کو ہنگاماً کرنے اور اس سے پردہ اٹھانے کے ہیں کہا جاتا ہے حَسْرَتٌ عَنِ الدَّرَاعِ: میں نے آستین چڑھائی الْحَاسِرُ: بغیر زہرہ ما بغیر خود کے۔
الْمَحْسَرَةُ

فُلَانٌ كَرِيمٌ الْمَحْسِرُ: کنایہ یعنی ناقص حَسِيرٌ تنہا ہوئی اور کمزور اونٹنی جس کا گوشت اور قوت زائل ہو گئی ہو اس کی جمع حَسْرَى ہے۔

الْحَاسِرُ: تھکا ہوا۔ کیونکہ اس کے قوی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ عاجز اور در ماندہ کو حَاسِرٌ بھی کہتے ہیں اور مَحْسُورٌ بھی۔ حَاسِرٌ تو اس تصور کے پیش نظر کہ اس نے خود اپنے قوی کو ہنگاماً کر دیا اور مَحْسُورٌ اس تصور پر کہ در ماندگی نے اس کے قوی کو ہنگاماً کر دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَنْقَلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ حَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ (۶۷-۳) تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

میں حَسِيرٌ بمعنی حَاسِرٌ بھی ہو سکتا ہے اور مَحْسُورٌ بھی ﴿فَتَقَعْدَ مَلُومًا مَحْسُورًا﴾ (۱۷-۳۹) کہ ملامت زدہ اور در ماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ الْحَسْرَةُ: غم جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر پشیمان اور نادم ہونا گویا وہ جہالت اور غفلت جو اس کے ارتکاب کی باعث تھی وہ اس

(۱۳-۲۲) اور (مومنو) مت خیال کرو کہ یہ ظالم جو عمل کر رہے ہیں خدا ان سے بے خبر ہے۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفاً وَعْدِهِ رُسُلَهُ﴾ (۱۳-۲۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے اس کے خلاف کرے گا۔

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ (۲-۲۱۳) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

میں سب کا مصدر الْحَسْبَانُ ہے اور الْحَسْبَانُ کے معنی یہ ہیں کہ تقیہ میں سے کسی ایک کے بارے میں اس طرح حکم لگایا جائے کہ دوسری کا دل میں خیال تک بھی نہ آنے پائے اسی کو گنتی میں لائے اور اس پر ہی انگلی کو گرہ لگائے مگر اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہو اور یہی معنی تقریباً ظن کے ہیں مگر ظن کی صورت اور پھر ایک کو دوسری پر غلبہ دے کر حکم لگایا جاتا ہے۔

(ح س د)

الْحَسَدُ: (ن) کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے۔ بسا اوقات اس میں اسی مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ایک روایت میں ہے ﴿(۸۰) الْمُؤْمِنُ يُغِيظُ وَالْمُنَافِقُ يَحْسَدُ﴾ کہ مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ﴾ (۲-۱۰۹) اپنے دل کی جلن سے۔

۱ کذا ذكر الزغالی فی الاحیاء مرفوعاً قال العراقی فی تحریحہ ۲: ۱۸۹ لم اجده اصلاً مرفوعاً وانما هو من قول الفضیل بن عیاض کذا رواه ابن ابی الدنیا فی ذم الحسد راجع لمعنی الحسد والغبطة النہایة تحت حدیث لاحسد فی اثنتین الخ (۱: ۳۸۳) ۱۲.

لگاتا رہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ ان کے گھروں کے نشانات مٹا دینے والی ریح مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نام و نشان مٹا دینے والی مراد ہے اور بعض نے ان کی عمروں کو قطع کر دینے والی مراد لی ہے اور یہ سب معانی حَسُوْمٌ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

(ح س ن)

الْحَسَنُ: ہر خوش کن اور پسندیدہ چیز کو حَسَنٌ کہا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔

- (۱) وہ چیز جو عقل کے اعتبار سے مستحسن ہو۔
- (۲) وہ جو خواہش نفسانی کی رو سے پسندیدہ ہو۔
- (۳) صرف نگاہ میں بھلی معلوم ہو۔

الْحَسَنَةُ: ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا اس کی کسی حالت میں حاصل ہو کر اس کے لئے مسرت کا سبب بنے حَسَنَةٌ کہلاتی ہے اس کی ضد سَيِّئَةٌ ہے اور یہ دونوں الفاظ مشترکہ کے قبیل سے ہیں اور لفظ ”حیوان“ کی طرح مختلف انواع کو شامل ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَإِنْ تُصِيبَهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ﴾ (۴-۷۸) اور ان لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے۔

میں حَسَنَةٌ سے مراد فراخ ولی، وسعت اور کامیابی ہے اور سَيِّئَةٌ سے قسط سالی، تنگی اور ناکامی مراد ہے اور یہی معنی آیت:

﴿فَإِذَا جَاءَ تَهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ﴾ (۷-۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں، میں مراد ہیں اور آیت: ﴿مَا أَصَابَكَ

سے دور ہوگئی یا فریظ غم سے اس کے قومی ننگے ہو گئے یا اس کو تابی کے تدارک سے اسے در ماندگی نے پایا قرآن میں ہے:

﴿لِيَجْعَلَ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (۳-۱۵۶) نیز یہ کافروں کے لئے (موجب) حسرت ہے۔

﴿يَا حَسْرَتِي عَلَىٰ مَا فَرَطْتُ فِي جَنبِ اللَّهِ﴾ (۳۹-۵۶) اس تفسیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

﴿كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ﴾ (۲-۱۶۷) اسی طرح خدا ان کے اعمال انہیں حسرت بنا کر دکھائے گا۔

﴿بِحَسْرَةٍ عَلَى الْعِبَادِ﴾ (۳۶-۳۰) بندوں پر افسوس ہے۔ اور فرشتوں کے متعلق فرمایا:

﴿لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ﴾ (۲۱-۱۹) وہ اس کی عبادت سے نہ کنیاتے ہیں اور نہ در ماندہ ہوتے ہیں۔ اس میں لَا يَحْسِرُونَ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ح س م)

الْحَسْمُ: (ض) کے معنی کسی چیز کے نشان کو زائل کرنے اور مٹا دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ قَطَعَهُ فَحَسَمَهُ یعنی اسے قطع کیا اور پھر اس کا نشان تک مٹا دیا۔ پھر اس اعتبار سے تلوار کو حَسَامٌ کہا جاتا ہے۔

حَسْمُ الدَّاءِ: زخم کو مسلسل داغ دے کر اس کے نشان کو مٹا دینا اور جب نحوست انسان کے نشان کو مٹا ڈالے تو کہا جاتا ہے نَالَهُ حَسُوْمٌ اور آیت کریمہ:

﴿ثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حَسُومًا﴾ (۶۹-۷) آٹھ دن

کہ جس چیز میں تجھے شبہ ہو اسے ترک دے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (۲-۸۳) اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ میں حُسن سے اچھی بات مراد ہے اسی طرح فرمایا:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾ (۲۹-۸)
 ﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسَيْنَيْنِ﴾
 (۹-۵۲) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ (۵-۵۰) اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟

میں اگر اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو بہر حال اچھا ہے خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے تو پھر ”لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ“ کی تخصیص کیوں کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں بلکہ ظہور حسن کا قصد اور اس پر مطلع ہونا مراد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حکم الہی کا حسن اسی شخص کے سامنے ظاہر ہوگا۔ جو پاکیزہ نفس ہو اور حکمت الہی پر اس کی نظر ہو ورنہ جہاں پر تو یہ راز منکشف نہیں ہو سکتا۔

الْإِحْسَانُ: (افعال) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا، کہا جاتا ہے: أَحْسَنَ إِلَيَّ فُلَانٌ اس نے فلاں پر انعام کیا۔ دوم یہ کہ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسن علم اور حسن عمل سے پیدا ہوتی ہے اسی معنی میں امیر المؤمنین نے فرمایا ﴿ (۸۲)

مِنْ حَسَنَةٍ فَمَنْ اللَّهُ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ﴿ (۳-۷۹) (اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔

میں حَسَنَةٍ سے ثواب اور سَيِّئَةٍ سے عتاب مراد ہے۔
 الْحَسَنُ وَالْحَسَنَةُ: اور الْحُسْنَى: (یہ تین لفظ ہیں اور ان میں فرق یہ ہے کہ حَسَنٌ اعیان و اعراض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح حَسَنَه جب بطور صفت استعمال ہو تو دونوں پر بولا جاتا ہے اور اسم ہو کر استعمال ہو تو زیادہ تر اَحْدَاث (احوال) میں استعمال ہوتا ہے اور حُسْنَى کا لفظ صرف احداث کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اَعْيَان کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور الْحَسَنُ کا لفظ عرف عام میں اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلی معلوم ہو جیسے کہا جاتا ہے رَجُلٌ حَسَنٌ حَسَانٌ وَاِمْرَأَةٌ حَسَنَةٌ وَحَسَانَةٌ۔ لیکن قرآن پاک میں حَسَنٌ کا لفظ زیادہ تر اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو عقل و بصیرت کے رو سے اچھی ہو اور آیت کریمہ:

﴿الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾ (۳۹-۱۸) جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں، میں أَحْسَن سے وہ بات مراد ہے جو شک و شبہ سے دور (اور بالا) ہو، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے ﴿ (۸۱) إِذَا شَكَّكْتَ فِي شَيْءٍ فَدَعْ

① ولم اجد بهذا اللفظ وحديث دع ما يريك معروف وسياتي في (ريب) واورده الغزالي في الاحياء ۹۵ وقد عقده الشافعي مع ثلاثة: اخراقت الشبهات وازهد ودع ما ليس يعينك واعملن بالنية (العاهر ۲: ۸).

② انظر في ادب الدنيا والدين للماوردي قال الشارح معناه اى ابتاه ما يسبون اليه من العلوم والصنائع فيقال مثلاً فلان العالم وفلان المحاهد وفي معناه قول عائشة راجع المحاضرات للمؤلف ۳: ۳۱.

الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۹﴾ اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۲-۱۹۵) بے شک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾ (۹-۹۱) نیکوکاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔

﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ﴾ (۳۹-۱۰) جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے

بھلائی ہے۔

ح ش ر

الْحَشْرُ: (ن) کے معنی لوگوں کو ان کے ٹھکانہ سے مجبور کر کے نکال کر لڑائی وغیرہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔ ﴿الْحَشْرُ لَا يُحْشَرُونَ﴾ کہ عورتوں کو جنگ کے لئے نہ نکالا جائے اور یہ انسان اور غیر انسان سب کے لئے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ حَشْرَتِ السَّنَةِ مَالِ بَنِي فُلَانٍ: یعنی قحط سالی نے مال کو ان سے زائل کر دیا اور حَشْرٌ كَالْفِظِ صرف جماعت کے متعلق بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَابْعَثْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ﴾ (۲۶-۳۶) اور شہروں میں ہر کارے بھیج دیجئے۔

﴿وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً﴾ (۳۸-۲۹) اور پرندوں کو بھی جمع رہتے تھے۔

﴿وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ﴾ (۸۱-۱۹) اور جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔

النَّاسُ أَبْنَاءُ مَا يُحْسِنُونَ: یعنی لوگ اپنے علم و فضل اور اعمال حسنیہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ﴾ (۳۲-۷) جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) اس کو پیدا کیا۔

إحسان انعام سے اعم ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ﴾ (۱۷-۷) اگر تم نیکوکاری کرو گے تو اپنی جان کے لئے کرو گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرٍ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۱۶-۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان

کرنے کا حکم دیتا ہے۔ میں اشارہ ہے کہ احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق

پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم

لیا جائے لہذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل و انصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے

مگر احسان مندوب ہے اسی بنا پر فرمایا:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۳-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا

ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَإِذَا الْيَهُودُ بِإِحْسَانٍ﴾ (۲-۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونبھا) کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ

① راجع للحديث النهائية ۱: ۳۸۹ وفيه: لا يحشرون ولا يحشرون ۱۲.

وَحَصَّصَ (خلائی و رباعی) دونوں طرح آتا ہے۔
جیسے كَفَّ وَكَفَّفَ وَكَبَّ وَكَبَّكَبَ - هَصَّ (ن)
کسی چیز سے ایک حصہ کاٹ لینا۔ یہ کاٹنا خواہ حقیقی طور پر
ہو یا حکمی طور پر حقیقی کی مثال جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ۵

ع (سرج)

(۱۱۹) قَدْ حَصَّصَتِ الْبَيْضَةَ رَأْسِي

یعنی مسلسل خود پینے رہنے کی وجہ سے میرے سر کے بال
جھڑ گئے۔

اسی سے رَجُلٌ أَحْصُ كَمَا حَوْرَهُ (یعنی مرد مومے
رفتہ از سر) مَوْنُثٌ حَصَّاءٌ رَجُلٌ أَحْصُ: منخوس مرد، جو
اپنی نخوست کی وجہ سے لوگوں سے خیرات کو قطع کر دے۔

الْحَصَّةُ کے معنی کل میں سے ایک ٹکڑہ کے ہیں اور بمعنی
بہرہ یعنی نصیب کے استعمال ہوتا ہے۔

(ح ص د)

الْحَصَدُ وَالْحَصَادُ کے معنی کھیتی کاٹنے کے
ہیں یہ زَمَنَ الْحَصَادِ وَالْحَصَادِ یہ زَمَنَ الْجِدَادِ
وَالْجِدَادِ کی طرح (بکسرہ حا و فتحہا) دونوں طرح آتا
ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (۶-۱۳۱) اور جس

دن (پھل توڑ و اور کھیتی) کا ٹو تو خدا کا حق بھی اس میں
سے ادا کرو۔

میں وہ کھیتی مراد ہے جو اس کے صحیح وقت میں کاٹی

﴿مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَلَا وَالْحَشِيرِ﴾ (۵۹)۔
(۲) حشر اول کے وقت تمہارے خیال میں بھی نہ تھا۔ کہ نکل
جائیں گے۔

﴿وَحَشِيرٌ لِّسَلِيمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ
وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ﴾ (۲۷-۱۷) اور سلیمان علیہ السلام
کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے
گئے اور قسم دار کئے جاتے تھے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ
كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً﴾ (۳۶-۱۶) اور جب لوگ جمع کئے
جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔

﴿فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا﴾ (۴-۱۷۲) تو خدا
سب کو اپنے پاس جمع کر لے گا۔

﴿وَحَشِرْنَا هُمْ فَلَمْ نَعَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا﴾ (۱۸)۔

(۴۷) اور ان لوگوں کو ہم جمع کر لیں گے۔ تو ان میں سے کسی
کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور قیامت کے دن کو یَوْمَ
الْحَشْرِ بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ اے يَوْمَ الْبَعْثِ اور
يَوْمَ النُّشُورِ کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔
رَجُلٌ حَشِرٌ الْأَذْنِينَ لَطِيفٌ اور باریک کانوں والا۔

(ح ص ص)

﴿حَصَّصَ الْحَقُّ﴾ (۱۲-۵۲) کے معنی حق
بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی اب اس دباؤ کے
دور ہونے کی وجہ واضح ہو کر سامنے آگئی اور حَصَّصَ

۱ قاله اخو الاوس ابو القيس بن الاسلت وتامه فما اطعم يوماً غير تهجاع وفي رواية الضبي غمضاً بدل يوماً والبيت
من كلمة مفضلية ۲: ۸۴ بيتاً جمهورية ۲۳۴- ۲۳۶ بتقدم وتاخر والبيت في اللسان والصحاح والتاج والمحکم (حصص والموشح
۲۴۶ والكامل ۱۵۵ وابن اثير ۱: ۲۸۴: ۱ والاغانى والحزانة ۲: ۴۸- ۵۳۴ والتنبیه للبکری والکنز اللغوی ۱۷۷ والمزروقی ۱: ۱۰۶
والجمحی ۸۸ والحماصة للبحتری ۳۴ وشواهد الکشاف ۷۶ ومحاضرات المؤلف ۳: ۱۶۶: ۳۳۵ والحيوان للجاحظ
۴۱۹: ۶ وایام العرب ۸۲.

گئی ہو۔ ۱۰ مگر آیت۔
﴿حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازْبَيَّتْ
وَوَطَّنَ أَهْلَهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا
لَيْلًا وَنَهَارًا فَجَعَلْنَهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تُغْنِ
بِالْأَمْسِ﴾ (۲۳-۱۰) یہاں تک کہ زمین بزرے سے
خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ
اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات کو یادن کو ہمارا
حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کرایا کر)
ڈالا گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ میں حصید سے مراد
وہ کھیتی ہے جو بیوقت افساد اور تباہی کی غرض سے کاٹی گئی
ہو۔ اور اسی سے حَصَدُ هُمْ السَّيْفُ کا استعارہ ہے
یعنی تلوار نے انہیں تباہ کر دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿سَنُهَا
قَاتِمٌ وَحَصِيدٌ﴾ (۱۱-۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی
ہیں اور بعض کا تہس نہس ہو گیا۔

(ح ص ر)

الْحَصْرُ: (ن) کے معنی تضييق یعنی تنگ کرنے
کے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاحْصُرْهُمْ﴾ (۹-۵) اور
گھیر لینی انہیں تنگ کرو۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا﴾ (۸-۱۷)
اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے۔
میں حَصِيرٌ کے معنی مہاد یعنی بچھونے کے ہیں گویا ان
کے نزدیک اس سے حَصِيرٌ مرمول یعنی چٹائی مراد ہے
اور چٹائی کو حَصِيرٌ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ریشے
ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں، اور لہید کے
شعر ۱۰ (الکامل)۔

(۱۱۰) وَمَعَالِمِ غُلَبِ الرِّقَابِ كَأَنَّهُمْ
جِنٌّ لَدَىٰ بَابِ الْحَصِيرِ قِيَامٌ

میں حَصِيدٌ سے تباہ و بربادی ہوئی بستیاں مراد ہیں۔
جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ
ظَلَمُوا﴾ (۶-۲۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور حَبُّ
الْحَصِيدِ سے مراد اناج ہے اور حدیث میں ہے ﴿۸۴﴾
وَهَلْ يَكُوبُ النَّاسُ عَلَىٰ مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ
إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ: لوگوں کو دوزخ میں اوندھے
منہ صرف وہی گرائے گا جو ان کی زبانوں نے کاٹا ہوگا۔

۱) وفي المطبوع المحمود مصحف والصواب المحصود ۱۲.

۲) اخرجہ الترمذی و صححه وابن ماجہ والمحقق من حدیث معاذ بن جبل وقال صحیح علی شرط الشيخین راجع تخريج الاحياء العلوم للغزالي ۱۰۹:۳.

۳) وفي رواية قماقم بدل ومقامة وهي جمع قماقم بضم القاف ومعناه الرئيس الجواد والبيت في الطبری ۱۵: ۴۵ والسقط ۹۵۵
في ثلاثة ابيات والامالي ۲: ۳۰۸ والقرطبي ۱۰: ۲۲۴ والصحاح واللسان والتاج حصر ومجاز القرائن ۱: ۳۷۱ رقم ۴۳۳ والبحر
۶: ۶۰۱، ۱۱: ۶۰۰ وفي رواية الديوان ۲: ۲۹ طرف الحصير بدل باب الحصير قال في الصحاح وهذه رواية غير ابي عبيدة وفي
المطبوع (مصر وكراتشي) ومعالم وهذا تصحيف في قماقم ۱۲.

میں رکے بیٹھے ہیں۔ میں بھی احصار کے عام معنی مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿أَوْ جَاؤُكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ﴾ (۴-۹۰) یا اس حال میں کہ ان کے دل رک گئے ہوں تمہارے پاس آ جائیں۔

میں نکل بزدلی وغیرہ کی وجہ سے سینوں کا تنگ ہونا مراد ہے اور ان کو حصر کے ساتھ تعبیر کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ ان معانی کو ضیق الصدر کے لفظ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور ان کے اضداد (جو در شجاعت وغیرہ پر) الْبَسْرُ اور الْكَسْعَةُ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(ح ص ن)

الْحَصْنُ: (قلعہ) اس کی جمع حُصُونٌ آتی ہے

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا نَعْتَمُ حُصُونَهُمْ مِنَ اللَّهِ﴾ (۲-۵۹) کہ ان

کے قلعے ان کو خدا (کے عذاب) سے بچالیں گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي

قُرَى مُحَصَّنَةٍ﴾ (۵۹-۱۳) یہ سب جمع ہو کر بھی تم سے

(بالمواجہہ) نہیں لڑسکیں گے۔ مگر بستیوں کے قلعوں

میں۔

میں مُحَصَّنَةٍ سے مراد وہ بستیاں ہیں جو قلعوں کی طرح

محفوظ اور محکم بنائی گئی ہوں۔

تَحَصَّنَ کے اصل معنی تو قلعہ کو مسکن بنا لینے کے ہیں مگر

مجازاً ہر قسم کا بچاؤ حاصل کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی

سے دِرْعُ حَصِينَةٍ (زرہ محکم) اور قَرَسٌ حِصَانٌ

(سپ زرنجیب) کا محاورہ ہے۔ کیونکہ زرہ بدن کے لئے

اور بہت سے موٹی گردنوں والے بہادر ہیں جو بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے جنات معلوم ہوتے ہیں۔ میں

حصیر کے معنی بادشاہ کے ہیں اور بادشاہ کو حصیر یا تو

اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ محصور رہتا ہے جیسا کہ

اسے مُحَجَّبٌ کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ جسے

چاہے اسے اپنے پاس آنے سے روک سکتا ہے اور آیت

کریمہ: ﴿وَسَيِّدًا وَحَصُورًا﴾ (۲-۳۹) اور

سردار ہوں گے۔ اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے۔

میں حصوراً کے معنی عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والا

کے ہیں خواہ یہ نامردی کی وجہ سے ہو خواہ عفت اور ازالہ

شہوت میں مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر۔ مگر یہاں

دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں کیونکہ یہ لفظ ان (بجلی علیہ السلام)

کے لئے بطور مدح کے استعمال ہوا ہے۔

الْحَصْرُ وَالْإِحْصَارُ: دونوں کے معنی حج سے روک

دینے کے ہیں۔ مگر احصار (ظاہری اور باطنی) دونوں

قسم کی رکاوٹ کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے دشمن کا آڑے

آ کر روک دینا یا مرض وغیرہ کی وجہ سے رک جانا مگر جب

وہ رکاوٹ باطنی اسباب جیسے مرض وغیرہ کی بنا پر ہو تو اس

موقع پر حَصْرٌ ہی بولا جاتا ہے۔ پس آیت کریمہ:

﴿فَإِنْ أَحْصَرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾

(۲-۱۹۲) اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی

قربانی میسر ہو کر (کردو)

میں دونوں قسم کی رکاوٹیں مراد ہیں اسی طرح آیت:

﴿لِلْمُقْرَأِ الَّذِينَ أَحْصَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾

(۳-۲۴۳) ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ

کر لینے کی وجہ سے اور یا اپنے شرف اور حریت کی وجہ سے محفوظ ہو اور عورت کو مُحْصِنٌ (بصیغہ فاعل) بھی کہا جاتا ہے اور مُحْصَنٌ (بصیغہ مفعول) بھی اول یعنی صیغہ فاعل اس تصور کی بنا پر ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی حفاظت کرتی ہے اور اسم مفعول دوسرے کی جانب سے حفاظت کی وجہ سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَأَتَوْهُنَّ أَجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ الْمُحْصَنَاتِ غَيْرِ مُسَافِحَاتٍ..... فَإِذَا أَحْصَنَ فَإِنَّ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (۳-۲۵)۔ اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کر دو۔ بشرطیکہ عقیقہ ہوں نہ ایسی کھلم کھلا بدکاری کریں..... پھر اگر نکاح میں آ کر بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) کے لئے ہے اس کی آدھی ان کو دی جائے۔

میں اول مُحْصَنَات سے شوہروالی عورتیں مراد ہیں گویا خاوند ان کی حفاظت کرتے ہیں اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی مُحْصَنَات کا لفظ آیا ہے وہاں فتح اور کسرہ دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے لیکن جہاں حُرْمَت کے بعد آیا ہے وہاں صرف فتح صاد کے ساتھ ہی پڑھا جائے گا کیونکہ شوہر دار عورتوں کے ساتھ ہی نکاح حرام ہے نہ کہ عقیقہ کے ساتھ۔

اور گھوڑا اپنے سوار کے لئے ایک طرح سے بمنزلہ قلعہ کے ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر نے کہا ہے ﴿ع (الکامل)﴾ (۱۱۱) إِنَّ الْحِصُونَ الْخَيْلَ لَا مَدَنَّ الْقُرَى کہ حقیقی قلعے تو نجیب گھوڑے ہیں نہ کہ شہر اور قصبے اور آیت کریمہ:

www.KitaboSunnat.com

﴿إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا يَحْصُونَ﴾ (۱۲-۳۸) صرف وہی تھوڑا (سارہ جائے گا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔ میں مُحْصُونَ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ قلعے جیسی محفوظ جگہوں میں حفاظت سے رکھ چھوڑو۔ کہا جاتا ہے۔

إِمْرَأَةٌ حِصَانٌ وَحَاصِنٌ: (عقیقہ عورت) حِصَانٌ کی جمع حُصْنٌ اور حَاصِنٌ کی جمع حَوَاصِنٌ آتی ہے اور حِصَانٌ کے معنی پاکدامن یا معزز عورت کے ہوتے ہیں ﴿قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَرْيَمُ ابْنَةَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (۱۴:۲۶) اور (دوسری) عمران کی بیٹی مریم کی جنہوں نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

أَحْصَنَتْ وَحِصْنَتْ کے ایک ہی معنی ہیں۔ ﴿فَإِذَا أَحْصَنَ﴾ (۳-۱۲۵) یعنی جب نکاح کر لیں اور أَحْصِنَ (مجبور) ہو تو نکاح کر دی جائیں۔ أَلْحِصَانُ کے معنی مُحْصَنَاتِ عورت کے ہیں خواہ وہ إِحْصَانُ پاک دامنی کی وجہ سے ہو یا کسی کے ساتھ نکاح

① العجز للاشعر بن حمران الجعفی قاله بعد ما اخذ نار ابیه واتخذ الخیل یذکر فضلها واوله : ولقد علمت علی توفی الردی وفی روایة الاصمعی علی تجنب الردی راجع اللسان (حصن) والبیوت من شواهد الکشاف ۴۷ وفی المطبوع مود القری والتسدید من المراجع والبیوت من کلمة اصمعیة فی الوحشیات رقم ۵۸ فی ۳۵ بیتاً والطبری ۱۲: ۲۴ والمحاضرات للمؤلف ۴: ۴۳۶ (۴) والحيوان للمحافظ ۱: ۳۴۶ وکتاب الخیل لمعمر بن المثنی فی ثمانية آیات وکتاب العرب للقتبی ۳۴۹ ضمن رسائل البلغاء (صنعة کرد علی).

② وقال حسان فی عائشة رضی الله عنها حصان رزان تزک بریة وتصبح غرثی من لحوم الغوافل ۱۲.

ح ص ل

﴿وَأَخْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾ (۷۲-۷۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گن کر رکھا ہے۔ اور اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک حدیث میں ہے ﴿(۸۵) مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ﴾ کہ جو شخص ان (اسمائے حسنیٰ) کا احصاء کر لے گا (یعنی یاد کر لے گا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔ نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿(۸۶) نَفْسٌ تُنْجِيهَا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ إِمَارَةٍ لَا تُحْصِيهَا﴾ کہ ایک جان کو ہلاکت سے بچالینا اس امارت سے بہتر ہے جسے تم نباہ نہ سکو۔ قرآن پاک میں ہے ﴿عَلِمَ أَنَّ لَنْ تُحْصَوهُ﴾ (۷۳-۷۴) اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔ ایک اور روایت میں ہے ﴿(۸۷) اسْتَقِيمُوا وَلَكِنْ تُحْصُوا﴾ کہ سیدھے رہو اور تم پوری طرح استقامت حاصل نہیں کر سکو گے۔

التَّحْصِيلُ: (تفعیل) کے معنی چھلکے سے گودہ اور مغز نکالنے کے ہیں۔ مثلاً معدن کے پتھروں سے سونا نکالنا یا بھوسے اور گندم کے دانوں کو الگ الگ کرنا پس آیت کریمہ: ﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ﴾ (۱۰۰-۱۰۱) کے معنی یہ ہیں کہ جو بھید سینوں میں ہیں وہ اس طرح نکال کر جمع کر دیئے جائیں گے جس طرح کہ چھلکے سے مغز الگ کر لیا جاتا ہے۔ یا جیسے حساب کا حاصل ظاہر کیا جاتا ہے اور حُثَالَةٌ (یعنی جھان وغیرہ) کو تحصیل کہا جاتا ہے۔ حَصَلَ الْفَرَسُ گھوڑے کا خثالہ وغیرہ کھانے کی وجہ سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہونا اور پرند کے پوٹے یا سنگدانے کو حَوْصَلَةُ الطَّيْرِ کہا جاتا ہے۔

ح ص ی

استقامت کے احصاء اور تحصیل کے محذور اور مشکل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق صرف ایک ہے اور باطل کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بلکہ حق کی مثال بنسبت باطل کے دائرہ کے اجزاء ہیں ایک نظر کی ہے یا کسی ہدف میں نشانہ لگانے کی جگہ کی ہے۔ اس لئے اسے حاصل کرنا نہایت کٹھن کام ہے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ

الإحصاء: (افعال) کے معنی عدد کو حاصل کرنا، کہا جاتا ہے أَحْصَيْتَ كَذَا: میں نے اسے شمار کیا۔ اصل میں یہ لفظ حَصَى (کنگر پوں) سے مشتق ہے اور اس سے گننے کا معنی اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب لوگ گنتی میں کنگر پوں پر اس طرح اعتماد کرتے تھے جس طرح ہم انگلیوں پر کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

- ① الحديث متفق عليه والترمذی عن ابی ہریرة وابن عساکر عن عمرو ابیاً ابن مردويه وابو الشيخ معاً فی التفسیر وابو نعیم فی الاسماء الحسنی راجع کنز العمال رقم ۱۹۳۴-۱۹۴۰.
- ② ذكره الغزالی فی الاحیاء فی محادثة عبدالرحمن بن عمرو مع ابی جعفر المنصور فقال قد سال جدك العباس النبی صلی اللہ علیہ وسلم امارة مكة والطائف فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یاعباس یاعبم النبی اخرجہ ابن ابی الدنیا هكذا معضلاً بغير اسناد رواه البيهقي من حديث جابر متصلًا من رواية المنكدر مرسلًا وقال هذا هو المحفوظ مرسلًا راجع تخريج العراقي ۳۵۰: ۲ وادب الدنيا للماوردي بشرح خان زاده ۳۸۲ وفي العقد ۱: ۲۴ تحيها وولاية بدل امارة ۴: ۱۳۰ في خطبة لعبدالله بن مسعود.
- ③ الحديث فی ابن ماجه والمحاکم والدارمی والطبری فی الصغیر ۲۱۰ والبراز عن ثوبان وفي بعض طرقه انقطاع الكافي ۹۵ والنهية ۱: ۲۳۴-۲۳۵ واللسان (قوم) والفتح الكبير ۱: ۱۸۱ وابن قتيبة في غريبه ۳۸۹ وفي كنز العمال باستيعابه ۳: ۳۴۶ وايضاً تخريج الكشاف للحافظ ۲۵۹.

کی لکڑی کو محضب کہا جاتا ہے اور ﴿حَصْبُ جَهَنَّمَ﴾ (۲۱-۹۸) میں ایک قرأت حَصْبُ جَهَنَّمَ (دوزخ کا ایندھن) بھی ہے۔

(ح ض ر)

الْحَضْرُ: یہ البدو کی ضد ہے اور الْحَضَارَةُ حاء کے فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے جیسا کہ بَدَاوَةٌ وِبَدَاوَةٌ اس کے اصل شہر میں اقامت کے ہیں۔ پھر کسی جگہ پر یا انسان وغیرہ کے پاس موجود ہونے پر حَضَارَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۲-۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے۔

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ﴾ (۳-۸) اور جب تم میراث کی تقسیم کے وقت آ موجود ہوں۔

﴿وَأَحْضَرَتِ الْإِنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۳-۱۲۸) اور طبائع میں بخل ودیعت کر دیا گیا ہے۔

﴿عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرْتُ﴾ (۸۱-۱۳) تب ہر شخص معلوم کر لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَأَعُوذُ بِكَ رَبِّ أَنْ يَحْضُرُونُ﴾ (۲۳-۹۸) میں کنایہ ہے کہ اے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں کہ جن و شیاطین میرے پاس آ حاضر ہوں۔

نے فرمایا: ﴿(۸۸) مجھے سورہ ہو اور اس کی مثل دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا تو صحابہ نے عرض کی کہ ان میں کوئی آیت ہے جس نے آپ ﷺ کو بوڑھا کر دیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿فَاسْتَقِمَّ كَمَا أُمِرْتُ﴾ (۱۱۲-۱۱) ہے۔ یعنی جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق پوری استقامت سے رہو۔

اہل لغت نے یہاں لَنْ تُحْصُوا کے معنی لَا تُحْصُوا تَوَابَهُ کئے ہیں۔ یعنی تم اس ثواب کو شمار میں نہیں لاسکو گے۔

(ح ض ض)

الْحَضُّ: (ن) کے معنی حَتُّ کی طرح کسی کام پر ابھارنے اور برا بھانتہ کرنے کے ہیں۔ مگر حَتُّ کا لفظ سواری وغیرہ کو تیز چلانے کے لئے آتا ہے۔ اور حَضُّ کا لفظ سواری ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برا بھانتہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اصل میں حَضُّ کے معنی جانور کو الحَضِيض یعنی نشیب زمین کی طرف ہانکنے کے ہیں (پھر ابھارنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يَحْضُضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ﴾ (۳۹-۳۳) اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔

(ح ض ب)

الْحَضْبُ: کے معنی ایندھن کے ہیں اور آگ کریدنے

① الحدیث باختلاف الفاظ فی الترمذی والدارقطنی والدلائل للبيهقي وابن سعد في الطبقات وابن عدی فی الكامل راجع ایضاً فی

الْفَرَسِ: میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ حَاضِرْتُهُ مُحَاضِرَةٌ وَحَضَارًا: باہم جھگڑنا، مباحثہ کرنا۔ یہ یا تو حَضُور سے ہے گویا ہر فریق اپنی دلیل حاضر کرتا ہے اور یا حَضْر سے ہے جس کے معنی تیز دوڑ کے ہوتے ہیں جیسا کہ..... جَارِيْتَهُ کہا جاتا ہے۔

الْحَضِيرَةُ: لوگوں کی جماعت جو جنگ میں حاضر کی جائے اور کبھی اس سے پانی پر حاضر ہونے والے لوگ بھی مراد لئے جاتے ہیں۔ الْمَحْضَرُ (اسم مکان) حاضر ہونے کی جگہ اور حَضْرَتْ (فعل) کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔

(ح ط ط)

الْحَطُّ: (ن) کے معنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حَطَطْتُ الرَّحْلَ (میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا) جَارِيَةٌ مَحْطُوطَةٌ الْمَتْنِ (دختر پست شکم کہ پشت دی دراز وہ مواری باشد) اور آیت کریمہ: ﴿وَقُولُوا حِطَّةً﴾ (۲-۵۸) اور حطہ کہنا۔ میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنی ہیں ”اے اللہ ہمارے گناہ تم سے اتار دے“ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی قُولُوا صَوَابًا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

(ح ط ب)

الْحَطْبُ: (ایندھن) ہر وہ چیز جو آگ جلانے کے لئے تیار کی جائے۔ حَطْبٌ کہلاتی ہے۔ اور حَطْبٌ (ل) حَطْبًا وَاحْتَطَبَ کے معنی ایندھن جمع کرنا کے

اور بطور کتابیہ مخون اور قریب المرگ شخص کو مُحْتَضِرٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (۵۰-۱۶) اور آیت کریمہ: ﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ﴾ میں اس معنی پر متنبہ کیا گیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿مَا عَمِلْتُمْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا﴾ (۳-۳۰) کے معنی یہ ہیں کہ انسان جو نیکی بھی کرے گا۔

قیامت کے دن اس کا اس طرح مشاہدہ اور معاینہ کر لے گا جیسا کہ کوئی شخص سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَسَأَلْنَهُمْ عَنِ الْقُرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾ (۷-۱۲۳) اور ان سے اس گاؤں کا حال پوچھو جو لب دریا پر واقع تھا۔ میں حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کے معنی دریا کے قریب (یعنی ساحل کے ہیں) اور آیت کریمہ: ﴿تَجَارَةَ حَاضِرَةَ﴾ (۲-۲۸۲) میں حَاضِرَةَ کے معنی نقد کے ہیں نیز فرمایا: ﴿وَأَنْ كُلُّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ﴾ (۳۶-۳۲) اور سب کے سب ہمارے زور و حاضر کئے جائیں گے۔

﴿فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ﴾ (۲۰-۱۶) وہ عذاب میں ڈالے جائیں گے۔ اور آیت کریمہ: ﴿كُلُّ شَرِبٍ مُحْتَضِرٌ﴾ (۵۳-۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔ میں پانی کی باری کے محض ہونے کے معنی یہ ہیں کہ باری والے اس گھاٹ پر موجود ہوں۔

الْحَضْرُ: خاص گھوڑے کی تیز دوڑ کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے: أَحْضَرَ الْفَرَسُ: گھوڑا تیز دوڑا۔ اسْتَحْضَرْتُ

① وہی مصدر من حَطَّ عذابتوننا رفع حکایة (راجع الطبری ۱: ۲۳۰) ومحجازی عبیدة ۱: ۴۱ وفتح الباری ۸: ۲۲۹) ۱۲.

سَاتِقٌ حُطْمٌ: بے رحم چرواہا۔ جو اونٹوں کو سخت ہنکا کر ان پر ظلم کرے ۱ اور دوزخ کو حُطْمَةَ کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فِي الْحُطْمَةِ وَمَا أَذْرَكَ مَا الْحُطْمَةَ﴾ (۵۰:۴-۱۰۴) حطمہ میں..... اور تم کیا سمجھے کہ حطمہ کیا ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بہت زیادہ کھانے والے کو بھی حُطْمَةَ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے پیٹ کو تنور کے ساتھ تشبیہ دی ہے ۲ ()

() كَأَنَّمَا فِي جَوْفِهِ تَنْوُرٌ

گویا اس کے پیٹ میں تنور ہے۔

دِرْعٌ حُطْمِيَّةٌ: زرہ بننے والے یا استعمال کرنے والے کی طرف منسوب ہے اور حَطِيمٌ وَزَمْرُمٌ (حرم میں) دو جگہوں کے نام ہیں۔

الْحُطَامُ: جو خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ يَهْبِجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا﴾ (۲۱-۳۹) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو (کہ زرد ہو گئی ہے) پھر اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔

(ح ظ ظ)

الْحَظُّ کے معنی معین حصہ کے ہیں کہا جاتا ہے کہ حَظُّظٌ وَأَحَظُّظٌ فَهُوَ مَحْظُوظٌ۔

حَظٌّ کی جمع أَحَاطِظُ وَأَحَظُّظُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ (۱۳-۵) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ

ہیں۔ قرآن میں ہے: ﴿فَكَانُوا الْجَهَنَّمَ حَطْبًا﴾ (۱۵-۷۷) تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

اپنی گفتگو میں رطب و یابس ملانے والے کو حَاطِبٌ لَيْلٍ کہا جاتا ہے کیونکہ رات کو لکڑی جمع کرنے والا بھی یہ نہیں دیکھتا ہے کہ رسی میں کیا باندھ رہا ہے۔

حَطَبٌ لِفُلَانٍ حَطْبًا: کسی کے لئے کام کرنا۔ مَكَانٌ حَطِيبٌ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں۔ (صفت از حَطَبِ الْمَكَانِ)

نَاقَةٌ مُحَاطِبَةٌ (ناقہ کہ خارشنگ خورد)

اور آیت کریمہ: ﴿حَمَلَةَ الْحَطَبِ﴾ (۳-۱۱۱) جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔

میں سخن چینی سے استعارہ ہے اور حَطَبٌ فُلَانٌ بِفُلَانٍ کے معنی کسی کی چغلی کھانا کے ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ يُوقِدُ بِالْحَطَبِ الْجَزَلَ (مش) فلاں بہت بڑا چغلی خور ہے۔

(ح ط م)

الْحَطْمُ: کے اصل معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں جیسا کہ الْهَشِيمُ وغیرہ الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر کسی کو ریزہ ریزہ کر دینے اور روندنے پر حَطْمٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ﴾ (۱۸-۲۷)

ایسا نہ ہو کہ سلیمان (ﷺ) اور اس کا لشکر تم کو پھیل ڈالیں۔ کہا جاتا ہے کہ حَطْمَتُهُ فَانْحَطْمَ (میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ چیز ٹوٹ گئی)

۱ ومنه الحديث شر الرعاء الحطمة وفي رواية بغيرهاء (النهاية).

۲ لم احده.

ڈالے ہوئے ہیں۔ یعنی اس کے دونوں جانب کو گھیرے ہوئے ہیں ایک حدیث میں ہے ﴿(۸۹) تَحْفُهُ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا: اس کو کہ فرشتے اس پر اپنے پروں کے ساتھ گھیرا ڈال لیتے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے ﴿ع (طویل)

(۱۱۳) لَهُ لَحَطَاتٌ فِي حَقَا فِي سَرِيرِهِ

اس کی نظریں اس کے تخت کے دونوں جانب لگی رہتی ہیں۔

حَقَا کی جمع أَحَقَّةٌ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فُلَانٌ فِي حَقْفٍ مِّنَ الْعَيْشِ یعنی تنگ حال ہے ﴿گویا وہ خوشحالی سے ایک جانب میں ہے۔ اس کے برعکس خوشحالی کے لئے کہا جاتا ہے۔ هُوَفَىٰ وَاسِطَةَ مِّنَ الْعَيْشِ

اسی سے محاورہ ہے ﴿(مثل)

مَنْ حَقْنَا أَوْ رَفْنَا فَلَيْقَتَصِدْ: یعنی جو شخص ہماری تعریف کرے اسے چاہیے کہ میانہ روی سے کام لے (نہایت)

حَفِيفُ الشَّجَرِ وَالْجَنَاحِ: درخت کے ٹٹے پر پرند کے پروں کی سرسراہٹ۔ یہ حکایت صوت ہے۔

الْمُحَفُّ: شامہ باندھہ و تہن آں (کیونکہ اس سے حرکت

فراموش کر دیا۔

﴿لِلذَّكْرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيْنِ﴾ (۱۱-۳) کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

(ح ظ ر)

الْحَظْرُ: (ن) کے معنی کسی چیز کو حَظِيرَةٌ یعنی احاطہ میں جمع کرنے کے ہیں اور ممنوع کو مَحْظُور کہا جاتا ہے۔ الْمُحْتَظَرُ: باڑہ بنانے والا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ (۵۳-۳۱) تو وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑوالے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

جَاءَ فُلَانٌ بِالْحَظْرِ الرَّطْبِ (مثل) یعنی اس نے بہت قبیح جھوٹ بولا۔

(ح ف ف)

الْحَفُّ: (ن) کے معنی کسی چیز کو حافقتین یعنی دونوں جانب سے گھیرنے یا احاطہ کر لینے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَفَفْنَا هُمَا بِتَحْلِ﴾ (۱۸-۳۲) اور ان کے گرد گرد بھوروں کے درخت لگادیئے تھے۔

﴿وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَاقِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾ (۳۹-۷۵) اور تم فرشتوں کو دکھو گے کہ عرش کے گرد گھیرا

① الحديث باختلاف الفاظ في فضيلة مجلس الذكر عن ابي هريرة وغيره رواه مسلم والغزالي في الاحياء العلوم راجع تخريج العراقي ۳۰۲: ۱ ونهاية ابن الاثير ۱: ۴۰۸.

② قاله ابراهيم بن هرمة في مدح المنصور واجازه به عشرة الاف كمافي ذيل الامالي (۴۰) وتماه اذاكرها فيها عقاب ونائل - راجع للبيت الحيوان ۱۳۴: ۳ والاغاني ۱۰۹: ۶ وعبون الاخبار ۱: ۲۹۴ وفي روايتهم جميعاً عن حفافي وفي العقد ۴: ۳۲۹ عن خفاء سريره وفي العمدة ۲: ۱۰۹ عن حفافي وفي الحصرى ۲: ۲۶۲ من بدل عن وفي العقد ۱: ۳۷۰ عذاب بدل عقاب وبعده: فام الذي امتت آمنة الردى وام الذي اوعدت بالكل ناكل وفي رواية حاولت والبيت في البحر (۴۲۷: ۷) من غير عزو.

③ ومنه الحديث انه عليه السلام لم يشبع من الطعام الاعلى حفف اي ضيق وقلة (نهاية ۱: ۴۰۸).

④ مثل وفي رواية فليترك راجع للمثل الميداني ۲: ۱۷۶، ۲۲۱، ۲۳۷، والعسكري ۱۸۴، ۱۹۱: ۲ وشرح الدرر للخفاجي ۸۳.

کے وقت آواز آتی ہے۔) مفعول کے معنی میں ہے) جیسا کہ نَفَضَ بمعنی

منقوض آجاتا ہے۔

(ح ف د)

الْحَفْرَةُ وَالْحَفِيرُ: گڑھا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (۱۰۲-۳) اور تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ الْمَحْفَارُ وَالْمَحْفَرُ وَالْمَحْفَرَةُ: بیچلو وغیرہ جس سے گڑھا کھودا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کو حافر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دوڑتے وقت اپنے سم سے مٹی اڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ﴾ (۷۹-۱۰) کیا ہم اگلے پاؤں پھروٹیں گے؟

میں مَرْدُودٌ فِي الْحَافِرَةِ - ایک مثل ہے اور یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو جہر سے آئے اسی طرف لوٹا دیا جائے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَافِرَةٌ سے مراد وہ زمین ہے جس میں ان کی قبریں بنائی گئی تھیں اور حَافِرَةٌ یہاں موضع حال میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے اس حال میں کہ قبروں میں ہوں گے۔ محاورہ ہے۔ رَجَعَ عَلَيَّ حَافِرَتِهِ أَوْ رَجَعَ الشَّيْخُ إِلَىٰ حَافِرَتِهِ: یعنی بوڑھا ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يَرُدُّ إِلَىٰ أَرْدَلِ الْعُمُرِ﴾ (۷۰-۱۰)

الْحَافِدُ: ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو تیرے تیزی کے ساتھ خدمت بجالائے خواہ وہ اجنبی ہو یا رشتہ دار۔ اسی کی جمع حَفْدَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَجَعَلْ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً﴾ (۱۶-۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

مفسرین کا قول ہے کہ یہاں حَفْدَةٌ سے مراد اسباب یعنی پوتے، نواسے وغیرہم ہیں۔ کیونکہ ان کی خدمت زیادہ سچی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿الْكَالِ﴾ (۱۱۳) حَفَدَ الْوَالِدُ بَيْنَهُنَّ فَلَانَ مَحْفُودًا فَلَانٌ مَحْدُومٌ ہے۔

الغرض حَفْدَةٌ کا اطلاق سر اور اولاد دونوں طرف کے رشتہ داروں پر ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے ﴿إِلَيْكَ نَسْعَىٰ وَنَحْفِدُ﴾ ہم تیری طرف دوڑتے ہیں۔

سَيْفٌ مُحْتَفِدٌ: قاطع تلوار۔ اصمعی کہتے ہیں کہ اصل میں حَفْدٌ کے معنی پھرتی اور جلدی کرنا کے ہیں۔

(ح ف ر)

الْحَفْرُ: وہ مٹی جو گڑھے سے نکالی جاتی ہے (یہ اسم

① تکملة البيوت واسلمت باكفهن لزمة الاحمال البيوت من شواهد ابى عبيدة فى مجاز ۱: ۳۶۴ ونسبه لحميل بن عبدالله العزرى والبيت فى الطبرى ۱۴: ۱۴۴-۱۴۶) واللسان والتاج (حذف) والانصاف (۹۷) والبحر المحیط ۵: ۵۰) بغير عزو و المحمهرة ۲: ۱۲۳ والقرطبي ۱۰: ۱۴۳ ونسبه ابن دريدالى الفرزدق ومسائل نافع بن الازرق (ترتيب فوائد عبدالباقى) قال مرتبه ولادرى كيف اضبطه وحميل هو حميل بن عبدالله الحارثى العذرى من شعراء الدولة الاموية له ترجمة فى الشعراء والانعمانى (۷: ۷۲) والحزانة (۱: ۹) وغريب ابى عبيد ۳/ ۳۷۴ ونسبه الى الاخطل وليس فى ديوانه ۱۲. ② كلمة من دعاء القنوت فى الوتر راجع غريب القرآن للقتبي ۲۴۷ واللسان (حذف) والطبرى ج ۱۴ ونسبه ولتخريجه فى (قنت) وهناك الموعودان شاء الله .

آیا ہے۔ نمازیں پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

﴿وَالَّذِينَ هُمْ يُعْرَفُونَ﴾ (۲۳-۵) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ﴾ (۳۳-۳۳)

(۳۵) اور اپنے ستر کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ میں حفظ فرج عفت اور پاک

دامنی سے کٹنا یہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿حَفِظْتُ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ﴾ (۴-۳۴) اور

ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے شوہروں کی

غیر حاضری میں ان کے عہد کی حفاظت کرتی ہیں اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے ۵

اور ایک قرأت میں حَفِظَ اللَّهُ، اللہ پر نصب کے ساتھ ہے اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ وہ اللہ کے حق کی نگہبانی

کے لئے حفاظت کرتی ہیں نہ کہ کسی قسم کی ریا کاری اور تصنع کے طور پر۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ

حَفِظًا﴾ (۴-۸۰) تو اے پیغمبر! تمہیں ہم نے انکا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا میں حَفِظَ بمعنی حافظ یعنی نگہبان کے

ہیں جیسا کہ: ﴿وَمَا آنتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ﴾ (۵۰-۵۰) اور ﴿وَمَا آنتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ﴾ (۶-۱۰۸) میں

فَعَالٍ اور فَعِيلٍ بمعنی فاعل ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿قَالَتْهُ خَيْرٌ حَافِظًا﴾ (۱۲-۶۴) تو خدا ہی بہتر نگہبان ہے۔

اور جو چیز نقد و خت کی جائے اس کے متعلق عرب لوگ کہتے ہیں ۵ (مثل) النَّقْدُ عِنْدَ الْحَافِرَةِ۔ اور اصل

میں یہ گھوڑے کی بیج کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے:

لَا يَزُولُ حَافِرُهُ أَوْ يُنْقَدُ ثَمَنُهُ۔ کہ اس کا اسم یہاں سے جدا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی قیمت نقد ادا نہ کی

جائے۔

الْحَفَرُ تَأْكُلُ الْأَسْنَانَ دانتوں کی زردی ان کو کھا جاتی ہے۔

حُفْرَ قُوَّةٍ حَفْرًا: اس کے دانت خراب ہو گئے أَحْفَرُ الْمُهْرُ: بچھڑے کے ثنائی یا رباعی دانت گر گئے۔

(ح ف ظ)

الْحَفِظُ: کا لفظ کبھی تو نفس کی اس ہیئت (یعنی

قوت حافظہ) پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ جو چیز سمجھ میں آئے وہ محفوظ رہتی ہے اور کبھی دل میں یاد رکھنے کو حفظ کہا

جاتا ہے اس کی ضد نسیان ہے، اور کبھی قوت حافظہ کے استعمال پر یہ لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔

حَفِظْتُ كَذَا حِفْظًا: یعنی میں نے فلاں بات یاد کر لی۔ پھر ہر قسم کی جستجو، نگہداشت اور نگرانی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے۔

﴿وَأَنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (۱۵-۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

﴿حَافِظُوا عَلَيَّ الصَّلَاةِ﴾ (۲-۲۳۸) سب

۱ کذافی اللامی ۱: ۱۲۱، والقالی ۱: ۲۶۶-۲۷ (۲۷) وفی مجالس ثعلب یقال عند السبق ای عند اول قدم یضع الفرس رجله اذا سبق

راجع المیدانی ۲: ۲۶۴ نقلاً عن ثعلب وقد اسهب اللسان فی شرحه (حفظ) ۱۲۔

۲ ای فی مہورہن والزمام از واجہن النفقۃ علیہن۔ قالہ الزجاج (الطبری ۵: ۹۵)۔

ہیں۔ اور قوت حافظہ چونکہ اسباب عقل سے ہے اس لئے اس کی تفسیر میں لوگوں نے وسعت سے کام لیا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

الْحَفِيظَةُ: کے اصل معنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے غصہ اور حسیت سے کام لینے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ محض غصہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے کہا جاتا ہے۔

أَحْفَظُنِي فَلَا نَ يَعْنِي فَلَا نَ لِي فِي مَجْهٍ غَضَبٍ دَلَايَا۔

(ح ف و)

الْأَحْفَاءُ: کے معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے یا کسی کی حالت دریافت کرنے لئے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے أَحْفَيْتُ السُّؤَالَ وَأَحْفَيْتُ فَلَانَا فِي السُّؤَالَ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔

﴿إِنْ يَسْأَلُكُمْ هَا فَيَحْفِكُمْ تَبَخَّلُوا﴾ (۲۷-۳۷) اگر وہ تم سے مال طلب کرے اور تمہیں تنگ کرے تو تم بخل کرنے لگو۔

اصل میں یہ أَحْفَيْتُ الدَّابَّةَ (اے سادہ گردانیدم پائے ستور را) سے ہے جس کے معنی گھوڑے یا اونٹ کو زیادہ چلا کر اس کے سم یا پاؤں کو گھسا ہوا کر دینے کے ہیں اور حَفِي حَفَاً وَحَفْوَةً کے معنی زیادہ چلنے سے پاؤں کے چھل جانے کے ہیں۔ اسی سے أَحْفَيْتُ الشَّارِبَ (نیک برید بردت را) ہے جس کے موٹھوں کو اچھی طرح کاٹ کر صاف کر دینے کے ہیں۔

الْحَفِي: نیکو کار اور نہایت مہربان قرآن میں ہے: ﴿إِنَّهُ كَانَ بِنِي حَفِيًّا﴾ (۱۹-۲۷) بے شک وہ مجھ پر نہایت

میں ایک قرأتِ حَفِظًا ہے یعنی اس کی حفاظت دوسروں سے بہتر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ﴾ (۴-۵۰) اور ہمارے پاس تحریری یادداشت بھی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب ان کے اعمال کی حفاظت کرنے والی ہے تو یہاں بھی حَفِيظُ بمعنی حافظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اللَّهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ﴾ (۶-۱۰۸) میں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حَفِيظُ بمعنی محفوظ ہو یعنی وہ کتاب ضائع نہیں ہوگی۔

جیسے فرمایا:

﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسِي﴾ (۲۰-۵۲)

الْمَحَافِظَةُ وَالْحِفَاطُ: (مفاعله) ایک دوسرے کی حفاظت کرنا اور آیت کریمہ: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (۷۰-۳۳) اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات اور اس کے ارکان کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یعنی وہ انہیں بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (۲۹-۳۵) کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

التَّحْفِظُ: (تفعّل) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عقل کی کمی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی قوت حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تکلف سے کسی چیز کو یاد کرنے کے

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا
وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ..... مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا
بِالْحَقِّ﴾ (۱۰-۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن
اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں..... یہ
(سب کچھ) خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا:

﴿وَيَسْتَنبِئُونَكَ أَحَقُّ هُوَ قُلُوبِي وَرَبِّي إِنَّهُ
لَسَحَقٌ﴾ (۱۰-۵۳) اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا
یہ سچ ہے کہ وہاں خدا کی قسم سچ ہے۔ ﴿وَتَكْتُمُونَ
الْحَقَّ﴾ (۳-۷۱) اور حق کو کیوں چھپاتے ہو۔ نیز فرمایا:
﴿الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ (۳-۶۰) (یہ بات) تمہارے
رب کی طرف سے حق ہے۔

﴿وَأَنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ (۲-۱۳۹) بے شک وہ
تمہارے رب کی طرف سے حق ہے۔

(۳) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا جیسا
کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ بعثت،
ثواب و عقاب اور جنت و دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد
حق ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ
الْحَقِّ لِئَلَّا يَذَّوْبَهُ﴾ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ
اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس
کی راہ دکھا دی۔

(۴) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس
کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس
مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی

مہربان ہے۔

کہا جاتا ہے اَحْفَيْتُ بِفُلَانٍ وَتَحْفَيْتُ بِهِ: میں نے
اس کے اعزاز و اکرام کے بجالانے میں کوئی دقیقہ
فر و گذاشت نہیں کیا۔

الْحَفِي: (ایضاً) کسی چیز کا اچھی طرح جاننے والا۔

(ح ق ق)

الْحَقُّ: (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت

کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس
طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں
گھومتی رہتی ہے۔ اور لفظ ”حق“ کئی طرح پر استعمال ہوتا
ہے۔

(۱) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو
ایجاد کرے۔ اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا
ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ
مَوْلَاهُمُ الْحَقُّ﴾ (۶-۶۲) پھر (قیامت کے دن تمام)
لوگ اپنے مالک برحق خدا تعالیٰ کے پاس واپس بلائے
جائیں گے۔ نیز فرمایا:

﴿قَدْ آتَيْنَاكَ اللَّهُ رَبُّكُمْ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ
إِلَّا الضَّلَالُ فَإِنِّي تُصْرَفُونَ﴾ (۱۰-۳۲) یہی خدا
تمہارا پروردگار برحق ہے اور حق بات کے ظاہر ہونے کے
بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا؟ تو تم کہاں پھرے جاتے
ہو۔

(۲) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی
ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے
قرآن پاک میں ہے۔

حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔ خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (۶۱-۹) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے دیگر سب دینوں پر غالب کرے۔ اور آیت کریمہ: ﴿الْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ﴾ (۶۹-۲۷۱) سچ سچ ہونے میں قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ یَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور قیامت کو حَاقَّةُ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جزائے اعمال واقع ہوگی۔

کہا جاتا ہے: حَاقَّتُهُ فَحَقَّتُهُ: میں نے حق کے متعلق اس سے جھگڑا کیا اور اس پر غالب رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے۔ (۹۰)

”إِذِ السِّبَاءُ بَلَّغْنَ نَصَّ الْحِقَاقِ فَالْعَصْبَةُ أُولَىٰ فِى ذَٰلِكَ“ جب عورتیں بالغ ہو جائیں تو عصبہ زیادہ حق دار ہیں۔

فُلَانٌ نَزِقُ الْحِقَاقِ: فلاں معمولی باتوں میں جھگڑا کرتا ہے اور کبھی لفظ حق واجب، لازم اور لائق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنَجِّى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۰-۱۰۳) اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳۰-۲۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم ہے۔

اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ﴾ (۱۰-۳۳) سی طرح خدا کا ارشاد..... ثابت ہو کر رہا۔
﴿حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ﴾ (۳۲-۱۳) میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو..... بھر دوں گا۔

اور آیت کریمہ:
﴿وَلَوْ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ﴾ (۲۳-۷۱) اور اگر (خدائے) برحق ان کی خواہشوں پر چلے۔
میں الحق سے مراد ذات باری تعالیٰ بھی ہو سکتی ہے۔ اور وہ حکم بھی ہو سکتا ہے جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ کہا جاتا ہے۔

احْقَقْتُ كَذَا: میں نے اس کا حق ہونا ثابت کر دیا یا اس پر حق ہونے کا حکم لگایا۔ اور آیت کریمہ: ﴿لِيُحَقِّقَ الْحَقَّ﴾ (۸-۸) تا کہ سچ کوچ کر دے۔ میں احقاقِ حق دو طرح ہو سکتا ہے۔

(۱) ادلہ اور آیات کے اظہار سے جیسے فرمایا: ﴿وَأُولَٰئِكَ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا﴾ (۳-۹۱) یعنی ہم نے تمہیں ان پر حجت قویہ عطا فرمائی۔

(۲) شریعتِ حقہ کی تکمیل اور لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کے ذریعہ جیسے فرمایا:

﴿وَاللَّهُ مِتِّمٌ نُّورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (۲۱-۸)

۱ کذا نسبه المؤلف ای عمرؓ والذی فی اللسان ومختار الصحاح للرازی ۲۹۸ وغریب ابی عبیدہ ۳: ۴۵۷ والفائق ۲: ۲۷۷ والنہایۃ (حق) انہ من قول علی وفی روایۃ نص الحقائق والمراد بنص الحقائق الادراک یعنی ما دامت الحارۃ صغیرۃ فامہا اولیٰ بہا فاذا بلغت فالعصبۃ اولیٰ من امہانظر ایضاً کتبر العمال ۱۱ رقم ۱۶۵.

اور بقا صرف آخرت کو ہے۔

فقہا اور متکلمین کے نزدیک حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی لفظ اصل لغت کے لحاظ سے اپنے معنی موضوعہ میں استعمال ہو۔

الْحَقُّ: وہ اونٹ جو بار برداری کے قابل ہو جائے مونث حَقَّةٌ حَقَاقٌ اور کہا جاتا ہے۔
أَتَتْ النَّاقَةَ عَلَى حِقِّهَا: یعنی وہ وقت آ گیا ہے جس میں گزشتہ سال اس پر اونٹ بٹھایا گیا تھا۔

(ح ق ب)

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَبِثْنَا فِيهَا أَحْقَابًا﴾ (۷۸-۲۳) اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ أَحْقَابٌ کا واحد حَقْبٌ ہے جس کے معنی زمانہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حَقْبَةٌ کا لفظ اسی سال کی مدت پر بولا جاتا ہے * اس کی جمع حَقْبٌ آتی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ مدت غیر معینہ پر بولا جاتا ہے۔

الْأَحْقَابُ: (اعتقاد) سوار کا اپنے پیچھے تھمبہ یعنی سامان سفر کا تھیلا باندھنا، چنانچہ کہا جاتا ہے۔ أَحْقَبَهُ وَأَسْتَحْقَبَهُ: اس نے اسے پالان کے پیچھے باندھ لیا۔ حَقَبَ الْبَعِيرُ: شتر کے غلاف نہرہ میں اس کے تنگ کے داخل ہونے کی وجہ سے پیشاب کارک جانا یا تکلیف سے آنا۔

الْأَحْقَبُ: سرخ رنگ کا گورخر بعض نے کہا ہے کہ أَحْقَبُ ایسے گورخر کو کہتے ہیں جس کے دونوں پہلو

﴿حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ لَا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ.....﴾ (۷-۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ کہوں سچ ہی کہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حقیق بمعنی جَدِيدٌ (یعنی سزاوار) ہے اور بعض نے بمعنی واجب لکھا ہے ایک قرأت میں حَقِيقٌ عَلَىٰ بھي ہے۔ نیز فرمایا: ﴿وَبَعُولْتُهُنَّ أَحَقُّ بِرِدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ﴾ (۲-۲۲۸) اور ان کے خاوند..... اس (مدت) میں ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔

اور الْحَقِيقَةُ کا لفظ کبھی اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جسے ثبات اور وجود حاصل ہو جیسے آنحضرت ﷺ نے حارث بن النعمان سے پوچھا * تھا (۹۱) کہ لِكُلِّ حَقٍّ حَقِيقَةٌ فَمَا حَقِيقَةُ إِيْمَانِكَ کہ ہر حق چیز کو کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی یہ کیسے معلوم ہوا کہ جس چیز کے تم مدعی ہو وہ حق ہے۔ فُلَانٌ بِحُجْمِي حَقِيقَتُهُ یعنی وہ اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت اس پر واجب ہے۔ کبھی حَقِيقَةُ کا لفظ اعتقاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور کبھی عمل اور قول کے متعلق جیسے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ لِيَعْمَلَهُ حَقِيقَةً: فلاں کا فعل صحیح ہے یعنی وہ ریا کار نہیں ہے۔ وَاقُولُهُ حَقِيقَةً: یعنی وہ نہ رخصت پر عمل کر رہا ہے اور نہ زیادتی سے کام لے رہا ہے۔ اس کے برعکس معنی میں متجوز، متوسع یا متفصح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، کہا گیا ہے۔ الدُّنْيَا بَاطِلٌ وَالْآخِرَةُ حَقِيقَةٌ کہ دنیا فانی ہے

۱ وفی تاریخ الطبری قال شیخ من بنی عامر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل قول حقیقة فانبتنی بحقیقة قولک وبدء شانک ۱: ۵۷۵.

۲ روی ذلک عن ابن عمر وابی ہریرة وعن الحسن انه سبعون سنة وقال الفراء انه سنة بلغة قریش (راجع التاج).

شاعر نے کہا ہے ﴿الوافر﴾

(۱۱۶) ابْنِي حَنِيفَةَ أَحْكَمُوا سُفَهَاءَكُمْ

اے بنی حنیفہ! اپنے سفہاء کے منہ میں لگام دو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْفَى الشَّيْطَانِ ثُمَّ يَحْكُمُ اللَّهُ
أَيْتَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (۲۲-۵۲) توجو (دوسرے)
شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے پھر خدا اپنی
آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔

أَلْحُكْمُ: کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کا نام حکم ہے
یعنی وہ اس طرح ہے یا اس طرح نہیں ہے خواہ وہ فیصلہ
دوسرے پر لازم کر دیا جائے یا لازم نہ کیا جائے۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا
بِالْعَدْلِ﴾ (۳-۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے
لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔
﴿يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۵-۹۵) جسے تم
میں سے دو معتبر شخص مقرر کرو۔

شاعر نے کہا ﴿ع (البسيط)﴾

(۱۱۷) فَاحْكُم كَحُكْمِ قِتَاهِ الْحَيِّ إِذْ نَظَرَتْ

باریک ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ سفید پہلوؤں والے
گورخر کو کہا جاتا ہے اس کا موٹ حقباء ہے۔

(ح ق ف)

الْحِقْفُ: منحنی تودہ ریت۔ اس کی جمع أَحْقَافٌ ہے۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ﴾
(۲۱-۳۶) کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف
میں ہدایت کی۔ ظَبْيُ حَاقِفٌ: وہ ہرن جو ریت کے
تودوں میں رہتا ہو۔ أَحْقَوْقَفٌ: مائل ہو کر ریت کے تودہ
کی طرح ہو جانا شاعر نے کہا ہے۔ ﴿ع (رجز)﴾

(۱۱۵) سَمَاوَةٌ الْهَلَالِ حَتَّى أَحْقَوْقَفًا

چاند کو راتیں تدریجاً کم کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہ کمان کی
طرح خمیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

(ح ک م)

حَكَمَ کے اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لئے
اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی بنا پر لگام کو حَكْمَةٌ
الدَّابَّةِ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتا ہے)
کہا جاتا ہے۔ حَكَمْتُ الدَّابَّةَ: میں نے اسے لگام
دی۔ اسی طرح حَكَمْتُ السُّفِينَةَ وَأَحْكَمْتُهَا بھی
کہا جاتا ہے۔

۱ قالها العجاج راجع لتخريجه (زلف).

۲ قاله جرير وتمامه اني اخاف عليكم ان اغضبا راجع للبيت البحر المحيط ۵: ۴/۲۰۰ (۳۳۷) وديوانه ۷ والفاثق ۱:
۱۴۱ والسحکم (حکم).

۳ قاله نابغة وقال بعضهم انه ليس من الحكم في شيى بل معناه كن حكيمًا وانظر للبيت ديوانه ۳۳ بشرح البطلوسى وادب
الاکتاب ۲۲ والاقنصاب ۲۹۴ وشواهد الكشاف ۳۳ ومختار الشعر الجاهلى ۱: ۷۸ والفخر ۲۱: ۱۹۱ والجمعي ۱۸۵
والكتاب ۱: ۸۵ والعقد الثمين والعشر للثريزي ۲۹۷ والمعاني للقبتي ۲۹۹ والعيني ۲: ۴۵۴ والسيوطي ۲۸ وذيل الامالي ۱:
۲۲۹ ولسن الشجرى ۲: ۲۸۹ والصناعتين ۱۴۷ فى خمسة ابيات وفى رواية شراع كمانى الحيوان ۳: ۲۲۱) وهى رواية الاصمعي
كمانى الخزانة ۱: ۳۰۰ لكن روايته انب.

جاتا ہے۔ تَحَاكَمْنَا إِلَى الْحَاكِمِ: ہم حاکم کے پاس فیصلہ لے گئے قرآن پاک میں ہے:

﴿يُرِيدُونَ أَن يُتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ﴾ (۴-۶۰)
اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

حَكَمْتُ فَلَانًا: کسی کو منصف مان لینا قرآن میں ہے۔

﴿حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (۳-۶۵)
جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ حَكَمَ بِالْبَاطِلِ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے باطل کو بطور حکم کے جاری کیا اَلْحِكْمَةُ کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حقائق کی دریافت کر لینے کے ہیں لہذا حکمت الہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ ان کو موجود کرنا ہے اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سر انجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ﴾ (۳۱-۱۲) اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔

میں حکمت کے یہی معنی مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔ لہذا جب اللہ تعالیٰ کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا:

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ﴾ (۹۵-۸) کیا اللہ تعالیٰ سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

اور قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت

إِلَى حَمَامٍ سَرَّاعٍ وَارِدِ الثَّمَدِ
اس نوجوان عورت کی طرح عدل و انصاف سے فیصلہ کرو جس نے پانی پر وارد ہونے والی کبوتروں کی ٹکڑی کو دیکھ کر (ان کی صحیح تعداد بتادی تھی) اور بعض نے اس کے معنی کن حَكِيمًا كُنْ ہیں نیز فرمایا: ﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ (۵-۵۰) کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہاں ہیں۔ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟

اور جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اسے حاکم کہا جاتا ہے اس کی جمع حُكَمَاءُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ﴾ (۲-۱۸۸) اور نہ اس کو (رہو) حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

اور حَكَمٌ (منصف) ماہر حاکم کو کہا جاتا ہے اس لئے اس میں لفظ حاکم سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿أَفَعَيِّرَ اللَّهُ أَبْنِي حَكَمًا﴾ (۶-۱۱۳) (کہو) کیا میں خدا کے سوا اور منصف تلاش کروں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا﴾

(۳-۳۵) تو ایک منصف، مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف، عورت کے خاندان میں سے مقرر کر دو۔ میں حاکم کی بجائے حَكَمًا کہنے سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ کہ وہ منصف مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ

دونوں تفصیلات کی طرف مراجعت کئے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں خواہ وہ فیصلہ فریقین کی مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور حَكَمٌ کا لفظ واحد جمع دونوں پر بولا

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةً﴾ کہ بعض اشعار میں برکت ہوتے ہیں جیسا کہ لبید نے کہا ہے ﴿(رمل)﴾

(۱۱۸) إِنَّ تَقْوَى رَبِّنَا خَيْرٌ نَقْلُ

کہ خدائے تعالیٰ کا تقویٰ ہی بہترین توشہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (۱۲-۱۹) اور ہم نے ان کو لڑکپن میں ہی دانائی عطا فرمائی تھی۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿(۹۳) أَلَصَّمْتُ حِكْمَةً وَقَلِيلٌ فَاعِلُهُ﴾ کہ خاموشی بھی حکمت ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔ یہاں (آیت اور حدیث میں) حکم کے معنی حکمت کے ہیں ﴿قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيَعْلَمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۲-۱۲۹) اور ان (لوگوں) کو کتاب اور دانائی سکھایا کرے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَأَذْكُرَنَّ مَا يَتْلُو فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۳۳-۳۳) اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی

کی باتوں پر مشتمل ہے جیسے فرمایا: ﴿الرَّه تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾ (۱۰-۱) یہ بڑی دانائی کی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نیز فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُرْدَجَرٌ حِكْمَةً بَالِغَةً﴾ (۵۳-۵۴) اور ان کو ایسے حالات (سابقین) پہنچ چکے ہیں جن میں عبرت ہے اور کامل دانائی (کی کتاب بھی)۔

اور بعض نے کہا ہے کہ قرآن پاک کے وصف میں حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿أَحْكَمْتَ آيَاتَهُ﴾ (۱۱-۱) جس کی آیتیں مستحکم ہیں۔ اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ قرآن پاک کی آیات محکم بھی ہیں اور ان میں پراز حکمت احکام بھی ہیں لہذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے قرآن محکم ہے۔

حکم کا لفظ حکمت سے عام ہے ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکم کے معنی کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ کہ وہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔

① انظر لحديث رجم ق د ه - عن ابي رت عن ابن مسعود (طب عن عمرو بن عوف وعن ابي بكره) (حل عن ابي هريرة) (خط عن عائشة عن حسان بن ثابت (ابن عساكر عن عمر) (ق عن ابن عباس) (عسكري عن عائشة) (كر عن عائشة) وفي كلها حكمة بدون اللام ولها طرقا فيها حكما وفي بعضها لحكامه انظر كترالعمال لعلی المتقی ۳: ۳۲۱ ثم ذكر ۳: ۱۶۶ عن احمر بن بكر الاسدي وفيه لحكمة كما رواه الاكثر ۱۲.

② قاله لبید بن ربیعة العامری وتمامه: وبأذن الله ربني وعجل - البيت في ديوانه ۳۹ وامالي المرتضى ۱- ۲۱ والعقد ۲: ۳۷۸ والمشكل للفتي ۲۸ وغريبه ۷۷ وجمهرة الاشعار ۱۷۰ او الكامل ۲: ۲۶۶ ونظام الغريب ۲۳۷ والبحر ۶: ۴۵۵ واللسان (نفل) وشواهد الكشاف ۲۲۹ والطبري (۹: ۱۷۱) والقرطبي ۷: ۳۶۱ ومحازالقران رقم ۲۷۲ وفي كترالعمال ۳: ۴۸۹ ان عمر بن الخطاب كان يامر برواية هذا القصيدة (وكيع).

③ اخرجہ ابو منصور الديلمي في مسند الفردوس من حديث ابن عمر بسند ضعيف والبيهقي في الشعب والقضاعي من حديث انس ان لقمان قال الخ كما في البيهقي وروضة العقلاء ۲۸ بسند صحيح عن انس راجع كترالعمال ۳: ۲۰۰-رقم ۷۵۲ او تخريج الاحياء للعراقي ۳: ۱۱۸ وفي الاحياء الصمت حكمة غلط، غلط فيه عثمان بن سعيد الراوي.

④ راجع الطبري ۱: ۴۷۶ وقول السدي هو المنقول عن قتادة راجع فتح القدير للشوكانى ۱۲.

ہیں ان کو یاد رکھو۔
 میں حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے یعنی جس پر کہ قرآن

تعالیٰ۔
 حدیث میں ہے ﴿ (۹۴) کہ جنت مُحَكِّمِينَ کے لئے ہے بعض نے کہا ہے کہ مُحَكِّمِينَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کہا جائے کہ یا تو مرتد ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے تو وہ قتل ہونا پسند کریں اور بعض نے کہا ہے کہ محکمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکمت کے ساتھ مختص ہیں۔

نے آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ.....﴾ میں تشبیہ کی ہے کہ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے حکمت بنا دیتا ہے تو اس میں ترغیب ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ میں حکمت سے ناسخ، منسوخ، محکم اور تشابہات کا علم مراد ہے۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ آیات و حکم کا علم مراد ہے سدی نے کہا کہ حکمت سے سنت نبوی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حقائق کا فہم مراد ہے کیونکہ بعض حقائق کا بیان اولو العزم پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے انبیاء ان کے تابع ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ (۵-۳۳) اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں۔ میں یَحْكُمُ کے معنی اس حکمت کے بیان کرنے کے ہیں جو انبیاء کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور یا یہ حکم ہی سے ماخوذ ہے یعنی فیصلہ کرتے رہے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاٰخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (۳-۷) جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور جو بعض تشابہ ہیں۔ میں محکمات سے وہ آیتیں مراد ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ پایا جاتا ہو۔ اور تشابہ کی چند قسمیں ہیں جنہیں ان

(ح ل ل)

أَلْحَلُّ: اصل میں حَلٌّ کے معنی گرہ کشائی کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:
 ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي﴾ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔
 میں یہی معنی مراد ہیں اور حَلَلْتُ کے معنی کسی جگہ پر اترنا اور فروکش ہونا بھی آتے ہیں اصل میں یہ حَلٌّ الْأَحْمَالِ عِنْدَ النَّزُولِ سے ہے، جس کے معنی کسی جگہ اترنے کے لئے سامان کی رسیوں کی گرہیں کھول دینا کے ہیں۔ پھر محض اترنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔
 لِهَذَا حَلَّ (ن) حَلُّوْا کے معنی کسی جگہ پر اترنا ہیں اور
 أَحَلَّهُ کے معنی اتارنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿أَوْ تَحُلُّ قَرْيَبًا مِّنْ دَارِهِمْ﴾ (۱۳-۳۱) یا ان کے مکانات کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔
 ﴿وَاحْلُوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ (۱۴-۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھرا تارا۔

① والمحكمين على صبغة المفعول وبكسر الكاف معناه المنصف من نفسه راجع للحديث الفائق ۱: ۱۴۱ واللسان والنهاية (حکم).

حلال کردی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں۔

میں ازواج مطہرات کی حلت تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کے عقد میں تھیں اور بنات العم وغیرہ کی حلت سے نکاح مراد ہے۔

بَلَغَ الْأَجَلُ مَحِلَّةً: ادا ہوگی قرض کا وقت قریب آپہنچا قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ﴾ (۲-۱۹۶) جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے۔

رَجُلٌ حَلَالٌ وَمَحِلٌّ: جو احرام کھول دے یا وہ آدمی جو حدود حرم سے باہر چلا جائے قرآن میں ہے: ﴿وَأِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ (۲-۵) اور جب احرام اتار دو تو پھر شکار کرو۔

﴿وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ﴾ (۲-۹۰) اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ (۲-۲۶) خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری قسموں کی گرہ کشائی کا کفارہ بیان کر دیا ہے۔ حدیث میں ہے ﴿۹۵﴾ لَا يَمُوتُ لِرَجُلٍ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوْلَادِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ إِلَّا

حَلَّ الدَّيْنُ: قرض کی ادائیگی کا وقت قریب آپہنچا۔ الْحِلَّةُ: نازل ہونے والی قوم (اسی سے کہا جاتا ہے) حَسَى حَلَالٌ جبکہ لوگ ایک دوسرے کے جوار میں قیم ہوں الْمَحِلَّةُ: (اترنے کی جگہ) اور حَلَّ الْعَقْدَةُ (گرہ کھولنا) سے بطور استعارہ حَلَّ (ض) الشَّيْءُ حِلًّا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے حلال ہونا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ (۵-۸۸) اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اسے کھاؤ۔

﴿هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ﴾ (۱۶-۱۱۶) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔

اور الْحَلُولُ سے أَحَلَّتِ الشَّاةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں سے دودھ اتر آنا کے ہیں۔ مگر أَحَلَّ اللَّهُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو حلال کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿أَحَلَّتْ لَكُمْ بِهِمَةَ الْأَنْعَامِ﴾ (۵-۱) تمہارے لئے چوپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِيَّاتِ اتَّبَيْتَ أَجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا آفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ﴾ (۳۳-۵۰) اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں

① الحديث باختلاف الفاظها في اللسان (حلال) والفاائق ۱: ۱۴۲ ولفظة لا يموت لمؤمن وفي ابن كثير لمسلم وفي رواية من مات له راجع للحديث المسند عبد الرزاق وابو داؤد والطيالسي واصله في الصحيحين من حديث ابى هريرة انظر ابن كثير ۳: ۱۳۳ وكنز العمال ۳: ۱۶۳-۱۶۴ وايضاً الاستثناء الاتحله القسم ورد للحارث في سبيل الله في مسند احمد والرواية في الترمذى والنسائى وابن ماجه وتحلة القسم من في القليل المفرد في القلة وقيل اشار الى قوله تعالى وان منكم الاواردها والذي ذهب اليه المؤلف هو اعتبار بالاصل يخاف المنقول في تفسيره ۱۲.

چادریں) الاَحْلِيلُ: پیشاب نکلنے کا سوراخ، کیونکہ پیشاب کے وقت اس کی گرہ کھل جاتی ہے۔

(ح ل ف)

الْحِلْفُ: عہد و پیمان جو لوگوں کے درمیان ہو۔
الْمَحَالْفَةُ: (مفاعلہ) معاہدہ بمعنی باہم عہد و پیمان کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر محالفت سے لزوم کے معنی لے کر کہا جاتا ہے فُلَانٌ حِلْفٌ كَرَمٌ وَحِلْفٌ كَرِيمٌ یعنی وہ کرم سے جدا نہیں ہوتا۔ حَلِيفٌ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو اس کی جمع اَحْلَافٌ (وَحُلَفَاءُ) آتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے (الطویل)

(۱۲۰) تَدَارَكْتُمَا الْاَحْلَافَ فَذُنُلَّ عَرْشُهَا
تم نے ان حلیفوں کا تدارک کرو یا جن کے پائے ثبات
متزلزل ہو چکے تھے۔

الْحِلْفُ اصل میں اس قسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے عہد و پیمان کیا جائے اسکے بعد عام قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تُطِيعُ كُلَّ حَلِيفٍ مَّهِينٍ﴾ (۱۰:۶۸) یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (تو کچھ) نہیں کہا۔

تَحِلَّةُ الْقَسَمِ کہ جس مسلمان کے تین بچے مرجائیں (اور وہ صبر کرے) تو اسے دوزخ کی آگ صرف تَحِلَّةُ الْقَسَمِ کی مقدار سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یعنی جتنی دیر میں کہ انشاء اللہ کہے۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۱۱۹) وَقَعُهُنَّ الْاَرْضَ تَحْلِيلُ

کہ ان کے قدم کا زمین پر پڑنا تَحِلَّةُ الْقَسَمِ کی مقدار ہے یعنی برائے نام ہے۔

الْحَلِيلُ: خاوند۔ مَوْنٌ حَلِيلَةٌ میاں بیوی کو حَلِيلٌ وَحَلِيلَةٌ یا تو اس لئے کہ جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی چادر کھولتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اسی لئے جو شخص کسی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہو وہ اس کا حَلِيلٌ کہلاتا ہے۔ اور یا یہ حَلَالٌ سے ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں۔ اور حَلِيلَةٌ کی جمع اَلْحَلَالُ ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَحَلَالٌ اٰبْنَاٰكُمْ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾
(۳-۲۳) اور تمہارے صلیبی بیٹوں کی عورتیں بھی۔
الْحُلَّةُ: (کپڑوں کا جوڑا) اِزَارٌ اور رداء (اوپر اور نیچے کی

۱ قطعاً من البيت لكعب بن زهير السلمى من قصيدة حمرة (۲۸۲-۲۸۷) فی ۸۵ بیتاً و صدره تخدی علی لسیرات وہی لاهتہ زواہل وفی رواية اللسان لاحقة بدل لاحقة باریع بدل ذواہل وفی رواية المحکم (حلل) نحاب بدل ذواہل والبيت فی النهاية (حلل) والعمدة ۲: ۸۸) وحمرة اشعار العرب ۳۱۰ وديوانه ۱۳ رمثله لعبد بن الطيب من قصيدة مفضلية رقم ۲۶ فی ۸۱ بیتاً یذکر ثورا و صدره یخفی التراب باظلاف ثمانية فی اربع والبيت فی امالی المرتضى والنوادر ۹ وديوان المعانی ۲: ۱۰۸ واللسان (حلل) لکن فی مسہن بدل وقعهن ۱۲۔

۲ قاله زهير يمدح زهير بن سنان والحارث بن عوف والاحلاف غطفان وقيس وتمامه: وذهيان قد زلت باقدا مها النعل راجع ديوانه ۱۰۹ وشواهد الكشاف ۱۰۰ والمعلقات العشر والمختارات ۶۲ ومختار الشعر الحاهلي (۱: ۱۶۲) والاتباع لابی الطيب ۳۴ واضداد ابی الانباری ۳۸۷ واضداد ابی الطيب (۱: ۱۳۷) واللسان (ثلل).

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَحْلِفُوا رُؤُوسَكُمْ﴾ (۲-۱۹۶) اور..... سر نہ منڈواؤ۔

﴿مُحَلِّقِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ﴾ (۲۷-۲۸)

اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتر واکر۔

رَأْسُ حَلِيقٍ مَوْنَدًا ہوا سر۔

لِحْيَةٍ حَلِيقَةٍ: موٹھی ہوئی داڑھی۔

اور کسی انسان کے حق میں بددعا کے وقت عَفْرَى

حَلْفِي کہا جاتا ہے یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچے جس پر

عورتیں اپنے سر کے بال موٹھا ڈالیں۔ بعض نے کہا ہے

اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے حلق کو قطع کر

ڈالے۔ اَلْمَحَالِقُ: وہ کبل جو کھر در ہونے کی وجہ سے

بدن کے بال کاٹ ڈالے۔

حَلَقَةٌ يَأْخُذُهَا جَمَاعَةٌ جَوَارِهُہُ كِشْفِ مِیْثِجِ ہوا۔

کیونکہ وہ دائرہ بیت میں انسان کے حلق کے مشابہ ہوتا

ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَلَقَةٌ کا لفظ صرف اس

جماعت کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے سر منڈوا

ڈالتے ہیں ۱۰

إِبِلٌ مُّحَلَّقَةٌ: شتران کہ بشکل حلقہ داغ برآ نہا کردہ باشند

اور حلقہ میں معنی دوران کا اعتبار ہے۔ جس طرح حَلَقَةٌ

الْقَوْمِ کہا جاتا ہے نیز کہا جاتا ہے حَلَقٌ اَطَّائِرُ جس

کے معنی پرند کا چکر لگا کر اڑنا کے ہیں ۱۱

﴿وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ﴾ (۹-۶۲) یہ

لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو

خوش کر دیں۔

شَيْءٌ مُّحْلِفٌ (مشکوک چیز) جس کے ثابت کرنے

کے لئے قسم کی ضرورت ہو۔

كُمَيْتٌ مُّحْلِفٌ: گھوڑا جس کے کیت اور اشتر ہونے

میں شک ہوا۔ ایک قسم کھائے کہ یہ کیت ہے اور دوسرا

حلف اٹھائے کہ یہ اشتر یعنی سرخ ہے اَلْمَحَالِقَةُ کے

اصل معنی تو ایک دوسرے کے سامنے قسم کھانا کے ہیں اس

سے یہ لفظ محض لزوم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اور

جو کسی سے الگ نہ ہوتا ہوا ہے اس کا حَلْفٌ يَأْخُذُهَا جَمَاعَةٌ

کہا جاتا ہے حدیث میں ہے ۱۲ (۹۶) لَا حَلْفَ فِي

الْإِسْلَامِ: اسلام میں زمانہ جاہلیت ایسے معاہدے نہیں

ہیں۔

فَلَانٌ حَلِيفُ اللِّسَانِ: فلاں چرب زبان ہے گویا اس

نے بولنے سے عہد کر رکھا ہے اور اس سے ایک لہجہ نہیں رکتا

حَلِيفُ الْفَصَاحَةِ: وہ فصیح ہے۔

(ح ل ق)

اَلْحَلْقُ: حلق (وہ جگہ جہاں سے جانور کو ذبح کیا

جاتا ہے) حَلَقَةٌ (ض) اس کے حلق کو قطع کر ڈالا۔

پھر یہ لفظ بال موٹھنے پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔

حَلَقَ شَعْرَهُ اس نے اپنے بال منڈوا ڈالے۔

۱ رواہ الحاکم فی المستدرک والمسلم وابدواؤ والنسائی عن جبیر بن مطعم (راجع الفتح للنہانی ۳: ۳۴۳) والحديث فی

النهاية (حلف) وغریب ابی عبید ۱۲۔

۲ وعلیٰ هذا فی جمع حلق (علی الاول مفرد وجمعه حلق واما الحلقه بسكون اللام فجمعه حلق وعند البعض حلق علی غیر

قیاس (النهاية)

۳ (۵۶-۸۳) میں مطلق معنی حلق آیا ہے وفی التنزیل الحلقوم (۵۶-۵۳) بمعنی الحلق قال بعضهم المیم فیہ اصلیه وعند البعض الواو

والمیم زائد تان (النهاية)۔

﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ﴾ (۲۳-۵۹)

اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔

میں حُلُم کے معنی سن بلوغت کے ہیں اور سن بلوغت کو حُلُم اس لئے کہتے ہیں کہ اس عمر میں عام طور پر عقل تیز آجاتی ہے کہا جاتا ہے۔ حَلَمَ (ن) فِی نَوْمِهِ خَوَابٌ دیکھنا۔ مصدر حَلَمٌ اور حُلُمٌ اور حُلُمٌ مثل رُبْعٌ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہی معنی تَحَلَّمَ وَاحْتَلَمَ کے ہیں۔

حَلَمْتُ بِهِ فِی نَوْمِي: میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوا أَضْعَافٌ أُخْلَامٌ﴾ (۱۲-۴۳) انہوں نے کہا

یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

الْحَلَمَةُ: بڑی چچڑی۔ کیونکہ وہ ایک جگہ پر جھرتے کی وجہ سے حلیم نظر آتی ہے اور سر پستان کو حَلَمَةُ النَّدْيِ کہنا محض ہیئت میں چچڑی کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

اس مجاز کی دلیل یہ ہے کہ سر پستان کو قرآن بھی کہہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ع (الطویل)

(۱۲۱) كَانَ قِرَادَى زَوْرِهِ طَبَعَتْهُمَا

بِطَيْنِ مِنَ الْحَوْلَانِ كُتَّابٌ أَعَجَبِيٌّ

(اس کے سینے پر پستانوں کے نشانات اس طرح خوشنما

نظر آتے ہیں کہ گویا کسی کاتب نے مٹی کی مہریں لگا دی

ہیں) حَلِمَ الْجِلْدُ چمڑے کو کیڑا لگ جانا۔ حَلَمْتُ

(ح ل م)

الْحُلُمُ کے معنی ہیں نفس و طبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ و غضب کے موقع پر بھڑک نہ اٹھے۔ اسکی جمع اَحْلَامٌ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ﴾ (۵۲-۳۲) کیا ان کی عقلیں ان کو..... سکھاتی ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَحْلَامٌ سے عقلیں مراد ہیں اصل میں حلیم کے معنی متانت کے ہیں مگر چونکہ متانت بھی عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے حلیم کا لفظ بول کر عقل مراد لیتے ہیں جیسا کہ مسبب بول کر سبب مراد لے لیا جاتا ہے۔ حَلَمٌ: بردبار ہونا۔ حَلَمَةُ الْعَقْلِ وَتَحَلَّمَ عَقْلٌ نے اسے بردبار بنا دیا۔ اَحْلَمَتِ الْمَرْأَةُ: عورت کا حلیم بچے جننا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ﴾ (۱۱-۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے عقل والے، نرم دل والے اور

رجوع کرنے والے تھے۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَبَشِّرْهُ بِأَنَّهَا بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ (۳۷-۱۰۱) تو ہم نے ان کو ایک نرم

دل لڑکے کی خوش خبری دی۔

کے معنی یہ ہیں کہ اس غلام میں، قوت برداشت..... تھی۔

اور آیت کریمہ:

① قاله عدی بن الرقاع فی قصیدة له یمدح فیہا عمر بن ہیرة وروی ایضاً للملحقہ الحرمی کما فی اللسان (قرن، عجم) والمعرب للحوالیقی ۱۰۵ والحماسة ۲: ۳۰۱-۳۰۲ والمرزوقی رقم ۷۸۱ من خمسة ابیات والاقتضاب ۹۷ والبیہ بغیر عزوفی المخصص ۲: ۱۴۸ والطبرسی ۱: ۹۴ والحولان (بفتح الحمیم جبل من نواحی دمشق وطنہ مشہور للختم وروی صاحب الاقتضاب ان الحولان اسم للطین الذی یطبع به وفی المطبوع الحولان (بالهملة) مصحف انشد الجوهری (قرن) لابن میادة یمدح بعض الخلفاء وفی روایة صدره بدل زوره وعدی بن الرقاع هو عدی بن زید بن مالک بن عدی بن الرقاع العاملی وكان شاعراً مقدماً عند بنی امیة خاصاً بالولید بن عبد الملک وعده ابن سلام فی الطبقة الثامنة من شعراء الاسلام راجع الاغانی ۸: ۷۲-۱۷۷) وابن سلام ۲۰۹-۲۱۳) والمؤتلف ۱۰۶ والمرزبانی ۲۵۳.

﴿الَّا حَمِيمًا وَعَسَاقًا﴾ (۲۵-۷۸) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ﴾ (۴-۱۰) اور جو کافر ہیں ان کے پینے کو نہایت گرم پانی۔

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ﴾ (۲۲-۱۹) اور ان کے سروں پر جلتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

﴿ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ﴾ (۲۲-۱۹) پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا۔

﴿هُذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَعَسَاقٌ﴾ (۵۷-۳۸) یہ گرم کھولتا ہوا پانی اور پیپ (ہے) اب اس کے مزے چکھیں۔

اور گرم پانی کے چشمہ کو حَمَمَةٌ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے ﴿۹۷﴾

الْعَالَمُ كَالْحَمَمَةِ يَأْتِيهَا الْبُعْدَاءُ وَيَزْهَدُ فِيهَا الْفُرَبَاءُ: کہ عالم کی مثال گرم پانی کے چشمہ کی سی ہے۔

جس (میں نہانے) کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور شفا یاب ہو کر لوٹتے ہیں۔ اور قرب و جوار کے لوگ اس سے بے رغبتی کرتے ہیں (اس لئے اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں)

اور تشبیہ کے طور پر پسینہ کو بھی حَمِيمٌ کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتَحَمَّ الْفَرَسُ کا محاورہ ہے جس کے معنی گھوڑے کے پسینہ پسینہ ہونے کے ہیں اور حَمَامٌ کو حَمَامٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پسینہ آور ہوتا ہے اور یا اس لئے

محرور رہتے ہیں)

اور تشبیہ کے طور پر پسینہ کو بھی حَمِيمٌ کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتَحَمَّ الْفَرَسُ کا محاورہ ہے جس کے معنی گھوڑے کے پسینہ پسینہ ہونے کے ہیں اور حَمَامٌ کو حَمَامٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پسینہ آور ہوتا ہے اور یا اس لئے

پانی پلایا جائے گا۔

الْبَعِيرُ: میں نے اونٹ سے چیچڑ نکالے۔ حَلَمْتُ فَلَانًا: کسی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ مدارات سے پیش آنا تاکہ وہ مطمئن رہے جیسا کہ اونٹ سے چیچڑ دور کرنے سے اسے سکون اور راحت محسوس ہوتی ہے اور انسان اس پر پوری طرح قدرت پالیتا ہے۔

(ح ل ی)

الْحُلِيِّ: (زیورت) یہ حَلْيُ کی جمع ہے جیسے نَدْيٌ کی جمع نُدْيٌ آجاتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ حُلِيَتْهُمْ عَجَلًا جَسَدًا لَّهُ خُورًا﴾ (۷-۱۳۸) اپنے زیور کا ایک بھڑا (بنالیا) وہ ایک جسم تھا جس میں سے تیل کی آواز نکلتی تھی۔

حِلْيٌ يَخْلِي آراستہ ہونا اور (حَلْيٌ آراستہ کرنا) قرآن پاک میں ہے: ﴿يُحَلِّوْنَ فِيهَا أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾ (۱۸-۱۳) ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

﴿حُلُوعًا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۷۶-۲۱) اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

اور حَلِيَّةٌ کے معنی زیور کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿أَوْ مَنْ يُنْسَوُا فِي الْحَلِيَّةِ﴾ (۲۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

اور حَلِيَّةٌ کے معنی زیور کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿أَوْ مَنْ يُنْسَوُا فِي الْحَلِيَّةِ﴾ (۲۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

زبور میں پرورش پائے۔

(ح م م)

الْحَمِيمُ کے معنی سخت گرم پانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا﴾ (۱۵-۳۷) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

① الحدیث فی النہایة (حم) والفتاویٰ ۱: ۱۵۰، وفيه ويتركها القرباء وغريبي ابى عبید ۲۰۱: ۳ والمعجم (حم) قال الحافظ فی تخریج الکشاف لم اجدہ ۴: ۶۰.

کی طرح ہوگی اور آیت کریمہ:
﴿وَوَظِلٌّ مِّنْ يَّحْمُومٍ﴾ (۵۶-۴۳) اور سیاہ دھوئیں
کے سائے میں۔

میں يَحْمُومٌ حمیم سے بفعول کے وزن پر ہے۔ بعض نے
کہا ہے کہ اس کے اصل معنی سخت سیاہ دھواں کے ہیں۔
اور اسے يَحْمُومٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں
شدت حرارت پائی جاتی ہے جیسا کہ بعد میں لا بَارِدٍ
وَلَا كَرِيمٍ سے اس کی تفسیر کی ہے۔ اور یا اس میں
حَمَمَةٌ یعنی کولے کی سی سیاہی کا تصور موجود ہے۔

چنانچہ سیاہ کو يَحْمُومٌ کہا جاتا ہے اور یہ حَمَمَةٌ (کولہ)
کے لفظ سے مشتق ہے۔ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ
ظُلَلٌ﴾ (۱۶-۳۹) ان کے اوپر تو آگ کے
ساتبان ہوں گے اور نیچے (ان) کے فرش ہوں گے۔

اور حَمَامٌ معنی موت بھی آجاتا ہے جیسا کہ کسی امر کے
مقدر ہونے پر حُمٌّ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور
بخار کو الْحُمَّى کہنا یا تو اس لئے ہے کہ اس میں حرارت
تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ
نے فرمایا ﴿۹۸﴾

الْحُمَّى مِنْ فَيْجِ جَهَنَّمَ۔ کہ بخار جہنم کی شدت سے
ہے اور یا بخار کو حُمَّى اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں پسینہ

کہ اس میں گرم پانی موجود رہتا ہے۔

إِسْتَحَمَّ فُلَانٌ۔ حمام میں داخل ہونا۔

پھر مجازاً قریبی رشتہ دار کو بھی حمیم کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ
انسان اپنے رشتہ داروں کی حمایت میں بھڑک اٹھتا ہے اور
کسی شخص کے اپنے خاص لوگوں کو حَمَامَةٌ کہا جاتا ہے۔
چنانچہ الْحَمَامَةُ وَالْعَامَّةُ: خاص و عام کا محاورہ ہے قرآن
میں ہے:

﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ﴾
(۲۶-۱۰۲، ۱۰۱) تو (آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا
ہے اور نہ گرم جوش دوست۔

نیز فرمایا:

﴿وَيَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا﴾ (۷۰-۱۰) اور کوئی
دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا۔

اور اس کی دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کے قریبی
مہربانوں کو حُزْرَانَتُهُ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے غم
میں شریک رہتے ہیں کہا جاتا ہے۔

إِحْتَمَّ فُلَانٌ لِفُلَانٍ: فلاں اس کے لئے غمگین ہوایا
اس کی حمایت کے لئے جوش میں آ گیا۔ اس میں باعتبار
معنی اِهْتَمَّ سے زیادہ زور پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں غم
زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جوش اور گرمی کے معنی بھی
پائے جاتے ہیں۔

أَحَمَّ الشَّخْمُ: چربی کو پگھلایا۔ یہاں تک کہ وہ گرم پانی

① متفق علیہ من حدیث بن عمر وعند البخاری عن عائشة موصولاً وفي الموطأ عن عمرو مرسلًا وعند الترمذی عن ثوبان وبمعناه
رواه الحاكم والنسائی عن ابن عباس وفي رواية عن انس زائد الموت (ابن السنن وابو عظیم فی الطب، هنا وفي الزهد وابن ابی
الدنیا فی المرض والكفارات عن الحسن مرسلًا وراجع لتخریجه كنز العمال ۳: رقم ۱۶۱۶-۱۶۱۷-۱۶۳۴ وج ۱۰ رقم ۱۷۰
والفتح للبهانی ۲: ۸۲ وایضاً الكنز ج ۱۰ رقم ۱۰۹-۱۶۵-۱۶۶.

کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہذا ہر شکر حمد ہے۔ مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ﴾ (۱۱-۷۳) وہ سزاوار تعریف اور بزرگوار ہے۔

میں حمید بمعنی محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی۔

حُمَادَاكَ أَنْ تَفْعَلَ كَذَا: یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَبَشِّرِ الرَّسُولَ بِمَا يَأْتِيهِ مِنَ بَعْثِي أَنْسُمَةَ أَحْمَدٍ﴾ (۶۱-۶۱) اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ﷺ ہوگا۔ ان کی بشارت سنا تا ہوں۔

میں لفظ احمد سے آنحضرت ﷺ کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تشبیہ ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کا نام احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ تفضیل) بولنے سے اس بات پر تشبیہ ہے کہ آپ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیشر و جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ﴾ (۲۸-۲۹) محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

میں لفظ محمد ﷺ گو من وجہ آنحضرت ﷺ کا نام ہے

اترتا ہے اور یا اس لئے کہ یہ موت کی علامات میں سے ایک علامت ہے جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں الْحُمِيُّ بَرِيدُ الْمَوْتِ (کہ بخار موت کا پیغام بر ہے) اور بعض اسے باب الموت یعنی موت کا دروازہ بھی کہتے ہیں اور اونٹوں کے بخار کو تمام کہا جاتا ہے یہ بھی حِمَامٌ (موت) سے مشتق ہے کیونکہ اونٹ کو بخار ہو جائے تو وہ شاذ و نادر ہی شفا یاب ہوتا ہے۔

حَمَمُ الْفَرْخِ: پرند کے بچے نے بال و پر نکال لئے کیونکہ اس سے اس کی جلد سیاہ ہو جاتی ہے۔

حَمَمٌ وَجْهَةٌ: اس کے چہرہ پر سبزہ نکل آیا۔ یہ دونوں محاورے حَمَمَةٌ سے ماخوذ ہیں۔

اور حَمَحَمَتِ الْفَرَسِ: جس کے معنی گھوڑے کے ہنہانے کے ہیں۔ یہ اس باب سے نہیں ہے۔

(ح م د)

الْحَمْدُ لِلَّهِ (تعالیٰ) کے معنی اللہ تعالیٰ کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثانیان کرنے کے ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے۔ کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے۔ جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدائشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح مال کے خرچ کرنے اور علم و سخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازی قد و قامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حمد صرف افعال اختیاریہ پر ہوتی ہے۔

نہ کہ اوصاف اضطراریہ پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان

میں عمومی رنگت کا لحاظ کیا گیا ہے) اور کبھی حَمْرَاءُ العجان (کنایہ از عجم) بھی کہا جاتا ہے۔^①

الْأَحْمَرَانُ: گوشت اور شراب ② أَلْمَوْتُ الْأَحْمَرُ: سخت موت، وہ موت جو قتل سے واقع ہو سَنَّةُ حَمْرَاءُ: قسط سالی۔ کیونکہ اس میں فضا کا رنگ سرخ نظر آتا ہے اسی بنا پر سخت گرمی کو حَمْرَةَ الْقَيْظِ کہا جاتا ہے۔ وَطَائِفَةُ حَمْرَاءُ: قدم کا تازہ نشان اس کے بالمقابل مٹے ہوئے نشان کو وَطَائِفَةُ دَهْمَاءُ بولتے ہیں۔

(ح م ل)

الْحَمْلُ: (ض) کے معنی بوجھ اٹھانے یا لاونے کے ہیں اس کا استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے اس لئے صیغہ فعل یکساں رہتا ہے۔ مگر بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسی طور پر اٹھائے جاتے ہیں جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ پر لادی جائے اس پر حمل (بکسر الحاء) کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھائے ہوئے ہوتی ہے اس پر حَمْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ۔ بادل میں پانی اور عورت کے حمل کے ساتھ تشبیہ دیکر درخت کے پھل کو بھی حَمْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَن تَدْعُ مُمْسِلَةً إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلُ مِنْهُ شَيْءٌ﴾ (۱۸-۳۵) اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ

لیکن اس میں آنجناب کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿إِنَّا نَبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ نَّاسِمُهُ يَحْيَىٰ﴾ (۱۹-۷)

میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنی حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

(ح م ر)

الْحِمَارُ: (گدھا) اس کی جمع حُمُرٌ وَحَمِيرٌ وَأَحْمِرَةٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْخَيْلِ وَالْبِغَالِ وَالْحَمِيرِ﴾ (۱۶-۸) اور گھوڑے فخر اور گدھے۔

کبھی حمار کے لفظ سے جاہل اور بے علم آدمی بھی مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ (۶۲-۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔

﴿كَانَهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَفْرِفَةٌ﴾ (۷۵-۵۰) گویا وہ گدھے ہیں جو بدک جاتے ہیں۔

حِمَارُ قُبَّانٍ: ایک قسم کا کبوتر (جسے فارسی میں خرک کہا جاتا ہے)۔ أَلْحِمَارَانُ: دو پتھر جن پر پتھر خشک کیا جاتا ہے۔ بیت میں حمار سے تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے اور گدھے کے ساتھ جلادت میں تشبیہ دے کر دوغلی نسل کے گھوڑے کو بھی الْمَحْمَرُ کہا جاتا ہے۔

الْحَمْرَةُ: سرخی الْأَحْمَرُ وَالْأَسْوَدُ: عرب و عجم (اس

① ونفی حدیث علی عارضہ رجل من الرالی فقال: اسکت یابین حمراء العجان ای بالین الامة والعجان مابین القبل والدمروھی کلمة تقولها العرب فی السب والذم (النهاية ۱: ۴۴۰).

② وايضا الذهب والزعفران ويقال للماء واللبن الابيضان وللتمر والماء الاسودان (النهاية).

اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر احکام توراہ کی بجا آوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں کوتاہی کی۔ کہا جاتا ہے۔ حَمَلْتُهُ وَحَمَلْتُ عَلَيْهِ كَذَا: میں نے اس کے ذمہ فلاں کام لگایا۔ تَحَمَّلَ وَاحْتَمَلَ وَحَمَلَ اس کے مطاوع آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا﴾ (۱۳-۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ (۶۹-۱۱) تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ.....﴾ (۲۳-۵۲) اگر منہ موڑو گے تو رسول پر (اس چیز کا ادا کرنا) ہے جو ان کے ذمے ہے اور تم پر (اس چیز کا ادا کرنا) ہے جو تمہارے ذمے ہے۔

﴿لَا تَحْمِلْ عَيْنًا أَضْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا﴾ (۲-۲۸۶) ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار! جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ أَلْوَاحٍ مِّن دُورٍ﴾ (۵۳-۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میٹھوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

﴿ذُرِّيَّةً مِّنْ حَمَلِنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ (۱۷-۱۳) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا بے شک

بنانے کو کسی کو بلائے تو وہ اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا۔ اور حَمَلْتُ کا صیغہ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے پر بولا جاتا ہے خواہ وہ بوجھ ظاہری ہو یا باطنی مثلاً کہا جاتا ہے حَمَلْتُ الثَّقَلَ حَمَلًا میں نے بوجھ اٹھایا۔ الرسالة پیغام اٹھایا۔ الْوِزْرُ: گناہ کا بوجھ اٹھایا۔ قرآن میں ہے:

﴿وَلِيَحْمِلَنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ﴾ (۳۹-۱۳) یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور (لوگوں کے) بوجھ بھی۔

﴿وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ (۲۹-۱۲) حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بوجھ اٹھانے والے نہیں۔

﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ مَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ (۹-۲۹) اور نہ ان (بے سرو سامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم کو سوار کروں۔

﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ﴾ (۲۲-۵) جن لوگوں (کے سر) پر توراہ لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بار تعیل) کو نہ

بولاجاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَمُولَةُ (بفتح) اسے کہتے ہیں جس پر بوجھ لا دیا گیا ہو۔ اور یہ قَتُوبَةٌ اور رَكُوبَةٌ کی طرح ہے اور جو بوجھ لدا ہوا ہے اسے حُمُولَةٌ (بالضم) کہا جاتا ہے اور حَمَلٌ بمعنی محمول آتا ہے اور یہ خاص کر بھیڑ کے چھوٹے بچے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اسے چلنے سے عاجز یا نوزائیدہ ہونے کی وجہ سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور حَمَلٌ کی جمع اَحْمَالٌ وَحِمْلَانِ آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر بادل کو حامل کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْحَمِلُ وَقِرًا﴾ (۲-۵۱) اور پانی کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اَلْحَمِيلُ: بہت پانی والا بادل۔ نیز جمیل اس کوڑا کرکٹ کو بھی کہا جاسکتا ہے جو سیلاب بہا کر لے آتا ہے اور اَضْبٰی مسافر اور ضامن پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ ضامن بھی مقروض کے ساتھ اس کی ضمانت کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے۔ نیز اَلْحَمِيلُ اس بچے کو کہتے ہیں جس کا نسب ثابت نہ ہو۔ چنانچہ میراث الحَمِيلِ کا مسئلہ ہے یعنی اس شخص کی میراث جس کا سبب متفق نہ ہو۔^①

حَمَالَةٌ اَلْحَطْبُ: کنایۃ چغل خور۔

فَلَانٌ يَحْمِلُ اَلْحَطْبَ الرَّطْبُ: یعنی فلاں چغلی کھاتا ہے۔

(ح م ی)

اَلْحَمْسِيُّ: وہ حرارت جو گرم جو ابر جیسے آگ، سورج وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی جو بدن میں

نوح (ہمارے) شکر گزار بندے تھے۔

﴿وَحَمَلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾ (۱۳-۶۹) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھائے جائیں گے۔

حَمَلَتِ الْمَرْأَةُ: عورت کا حاملہ ہونا اسی طرح حَمَلَتِ الشَّجَرَةُ: کا محاورہ استعمال ہوتا ہے حَمَلٌ کی جمع اَحْمَالٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاُولَاتِ الْاَحْمَالِ اجْلِهِنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (۴-۶۵) اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے۔

﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اَنْثٰى وَلَا تَضَعُ الْاٰبِلِغِمِ﴾ (۴-۳۱) اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔

﴿حَمَلَتْ حَمَلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ﴾ (۷-۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔

﴿حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ (۱۵-۳۶) اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی سال میں ہوتا ہے۔

اصل میں حَمَلٌ کے معنی بیٹھ پر بوجھ لا دانا کے ہیں پھر بطور استعارہ عورت کے حمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا اونٹنی کے حاملہ ہونے کے لئے وَسَقَتِ النَّاقَةُ

① وفی حدیث انہ کتب الی شریح الحمیل لایورث الابینة (النهائية) وفی الترمذی کان ابی حمیل فورثه مسروق.

② الاول قراءة ابن مسعود الحسن والثانی ابن عباس وعليه المصحف وفی مجاز ابی عبیدة: فی عین حمیة (۸۶) تقدیرها فعلة وہی مهموز ومجازها ذات حمأة ومن لم یهمز جعل مجازہ مجاز فعله من الحر الحامی وموضعها حمایة.

قوت حارہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي عَيْنِ حَامِيَةٍ﴾ (۱۸-۸۶) گرم چشمے میں۔

ایک قرأت میں حَمِيَّةٌ ہے ۵

﴿يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ﴾ (۹-۳۵)

جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے

گا۔

حَمَى النَّهَارُ: دن گرم ہو گیا۔ اُحْمِيَّتِ الْحَدِيدَةُ:

لوہا گرم کیا گیا۔

حُمِيًّا الْكُفَّاسِ: شراب کی تیزی، اور انسان کی قوت

غصیبہ جب جوش میں آ جائے اور حد سے تجاوز کر جائے تو

اسے بھی حَمِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے حَمِيَّتٌ

عَلَىٰ فُلَانٍ: میں فلاں پر غصے ہوا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ (۲۸-۲۶) اور ضد بھی جاہلیت

کی۔

پھر استعارہ کے طور پر حَمِيَّتِ الْمَكَانِ کا محاورہ

استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی جگہ کی حفاظت کرنا۔ ایک

روایت میں ہے ۵ (۹۹) لَا حِمَىٰ إِلَّا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ

کہ چراگاہ کا محفوظ کرنا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

کا حق ہے۔

حَمِيَّتٌ أَنْفِي مَحْمِيَّةٌ: میں نے اپنی عزت کی حفاظت

کی۔ حَمِيَّتِ الْمَرِيضِ حَمِيًّا: بیمار کو نقصان دہ

چیزوں سے روک دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا حَامٍ﴾ (۵-۱۰۳) اور نہ حَام۔

میں بعض کے نزدیک حَام سے وہ زاونٹ مراد ہے جس

کی پشت سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں (اس کے متعلق)

کہہ دیا جاتا تھا حَامِيٌّ ظَهْرُهُ فَلَا يَرْكُبُ اس کی پشت

محفوظ لہذا اس پر کوئی سوار نہ ہو۔

أَحْمَاءُ الْمَرْءِ: خاوند کی طرف سے عورت کے رشتہ

دار کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اضافت کے

وقت تینوں حالتوں میں حَمَاهَا وَحَمُوهَا وَحَمِيَّهَا

کہا جاتا ہے۔ بعض حَمًّا (مہوز) بھی بولتے ہیں

جیسا کہ کَمًّا ہے۔

الْحَمَاءُ وَالْحَمَّا سِیَاحٌ بَدْوِيٌّ: قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ حَمًّا مَسْنُونٍ﴾ (۱۵-۶۶) سڑے ہوئے

گارے سے۔ کہا جاتا ہے حَمَاتُ الْبَيْتِ: کچھڑ میں نے

کنوئیں کو صاف کیا۔ أَحْمَأْتُهَا: اسے کچھڑ سے بھر دیا۔

ایک قرأت میں ﴿عَيْنِ حَمِيَّةٍ﴾ (۱۸-۸۶) ہے یعنی

سیاہ بد بو دار کچھڑ والا چشمہ۔

(ح ن ن)

الْحَنِينُ: کسی چیز کی طرف شفقانہ بھنچنا کہا جاتا ہے۔

حَسْبُ الْمَرْءِ وَالنَّاقَةُ لِوَالِدِهَا عورت اور اونٹنی کا

اپنے بچے کا مشتاق ہونا اس اشتیاق کے ساتھ چونکہ کبھی

آواز بھی ہوتی ہے اس لئے حنین اس آواز کو کہتے ہیں

① الحديث في النهاية (حمى) وباختلاف الفاظه في معجم الاصبهاني وابن النجار عن ابن عباس (حم خ د) عن الصعب بن حنيفة راجع كنز العمال ۱۲.

② وفي النهاية: انه كان يصلى الى جذع في مسجده فلما عمل له المنبر صعد عليه فحن الجذع اليه كذافي النهاية وفي رواية كان يخطب بدل يصلى ثم حديث حنين الجزع معروف رواه جماعة من الصحابة وفي بعض الروايات فغار كخوار الثور حتى ارتجع المسعد فلامعنى لتاويل المؤلف وحمله على المجاز راجع للحديث الدارمي رقم ۲۶-۴۲.

﴿وَكَاؤُوا يَصْرُونَ عَلَى الْحَنْثِ الْعَظِيمِ﴾
(۴۶-۵۲) اور گناہ عظیم پڑھے ہوئے تھے۔

اسی لئے یَمِينِ عَمَوْص: (جھوٹی قسم) کو بھی حَنْثِ کہا جاتا ہے۔ اور حَنْثِ فِي يَمِينِهِ کے معنی قسم توڑنے کے ہیں اور حَنْثِ کے معنی سن بلوغت کے بھی آتے ہیں۔ کیونکہ اس عمر میں انسان جو گناہ کرے گاس پر اس کا مواخذہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے بَلَغَ فَلَانَ الْحَنْثِ: فلاں بالغ ہو گیا۔ اَلْمُتَحَنِّثُ وہ شخص جو اپنے آپ سے گناہ کو دور کرنے کے لئے عبادت کرے جیسے متحرج اور متاثم کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

(ح ن ج ر)

اَلْحَنْجَرَةُ: (نزرہ) نائے گلو یعنی بیرونی جانب سے طلحوم کا سرا اس کی جمع حناجر آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاطْمِينٍ﴾ (۱۸-۴۰) غم سے بھر کر گلو تک آرہے ہوں گے۔

﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ﴾ (۱۰-۳۳) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔

(ح ن ذ)

اَلْحَنِيدُ: (بھونا ہوا) قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنْ جَاءَ بِعَجَلٍ حَنِيدٍ﴾ (۱۱-۶۹) کہ ایک بھونا ہوا پھڑالے آئے۔

یعنی وہ پھڑا جو دو گرم پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا گیا تھا اور یہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اس سے لزوجت بہہ کر نکل جائے۔ یہ حَنْدَتُ الْفَرَسِ سے ماخوذ ہے

کہ جس میں اشتیاق اور شفقت پائی جائے یا اشتیاق کی صورت کا تصور کے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ (حدیث) حَنِينُ الْجِدْعِ اس معنی پر جموں ہے ﴿رِيحٌ حَنُونٌ: سرسراہٹ سے چلنے والی ہوا۔

قَوْسٌ حَنَّانَةٌ: آواز نکالنے والی کمان۔ محاورہ ہے (مثل) مَالَهُ حَانَةٌ وَلَا آتَةٌ۔ یعنی اس کے پاس نہ اونٹنی ہے اور نہ کوئی موٹی بھیڑ اس میں اونٹنی اور بھیڑ کی یہ صفت ان کے صوت کی بنا پر ہے۔ اور حنین چونکہ معنی شفقت پر مشتمل ہوتا ہے اور شفقت میں ہمیشہ جذبہ رحمت کارفرما ہوتا ہے اس لئے اس سے مراد رحمت لے لی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَحَنَّانًا مِّنْ لَّدُنَّا﴾ (۱۹-۱۳) اور اپنے پاس سے شفقت..... دی تھی۔

اسی سے اسمائے حسنیٰ اَلْحَنَّانُ وَالْمَنَّانُ ہے جس کے معنی بہت زیادہ رحم کھانے کے ہیں۔ حَنَّانِيكَ: تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہو۔ یہ لَبِيكَ وَسَعْدِيكَ کی طرح دشمنی لایا جاتا ہے۔

حُنَيْنٍ: (مکہ اور طائف کے درمیان) ایک مشہور مقام کا نام ہے (جہاں ۸ھ کو جنگ حنین ہوئی تھی) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبْتَكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ (۹-۲۵) اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا۔

(ح ن ث)

اَلْحِنْثُ: گناہ، نافرمانی قرآن پاک میں ہے:

ہر وہ شخص جو بیت اللہ کا حج کرتا اور ختنہ کرواتا عرب کے لوگ اسے حَنِيفٌ کہہ کر پکارتے تھے۔ یعنی وہ دین ابراہیم کا پابند ہے۔

أَلَا حَنْفٌ: جس کے پاؤں میں کجی ہو۔ کبھی تفاعل کے طور پر کسی کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف مائل ہونے کے معنی میں بطور استعارہ آتا ہے۔

(ح ن ک)

أَلْحَنْكُ: کے معنی انسان یا چوپائے کے تالو کے ہیں اور کوئے کی چونچ کو حک کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے لئے بمنزلہ انسان کے تالو کے ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

أَسْوَدٌ مِّثْلَ حَنْكِ الْغُرَابِ أَوْ حَلَكِ الْغُرَابِ (وہ کوئے کی چونچ یا اس کے پروں کی طرح سیاہ ہے) یہاں حنك کے معنی منقار اور حلك کے معنی پروں کی سیاہی کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿لَا حَسْبُكَ ذُرِّيَّتُهُ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۱۷-۶۲) تو میں تھوڑے شخصوں کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا۔

میں یہ حَنْكُ الدَّابَّةِ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے جس کے معنی اس کے منہ میں لگا دینے یاری باندھنے کے ہیں۔ پس یہ أَلْجَمَنَّ فَلَانًا وَأَلْزَيْسَنَّهُ کی طرح ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ أَحْتَنَكَ الْجِرَادُ الْأَرْضَ سے مشتق ہو جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو صفا چٹ کر دینے کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ میں انہیں اس طرح تباہ و برباد کروں گا جیسے ٹڈی زمین پر

جس کے معنی پسینہ لانے کے لئے گھوڑے کو ایک دو چکر دوڑا کر اس پر جھول ڈال دینے کے ہیں ایسے گھوڑے کو مَحْنُوذٌ اور حَنِيفٌ کہا جاتا ہے۔

حَنْدَتْنَا الشَّمْسُ: ہمیں سورج نے جھلس دیا۔ اور پسینہ سے چونکہ معمولی سا پانی نکلتا ہے۔ اس لئے جب کوئی شراب پلائے تو اس سے کہا جاتا ہے۔ أَحْنِدُ یعنی اس میں تھوڑا سا پانی ملا یعنی پسینہ کی مقدار میں یا اس رطوبت کی طرح جو حَنِيفٌ یعنی کباب کئے ہوئے گوشت سے نکلتی ہے۔

(ح ن ف)

أَلْحَنْفُ کے معنی گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل جَنْفٌ ہے جس کے معنی ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔ أَلْحَنِيفُ: (بروزن فعلیل) جو باطل کو چھوڑ کر استقامت پر آجائے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَنتَابَ لِلَّهِ حَنِيفًا﴾ (۱۶-۱۲۰) اور خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک کے ہور ہے تھے۔

﴿حَنِيفًا مُسْلِمًا﴾ (۳-۶۷) سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہور ہے تھے۔

حَنِيفٌ کی جمع حُنَفَاءُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاجْتَبَيْنَا قَوْلَ الزُّورِ حُنَفَاءَ لِلَّهِ﴾ (۲۲-۳۰، ۳۱) اور جھوٹی بات سے اجتناب کر و صرف ایک خدا کے ہو کر۔

تَحَنَّفُ فَلَانٌ: راہ استقامت کی تلاش کرنا۔

سے نبات صفا چٹ کر دیتی ہے۔
 حَنَّكَ الدَّهْرُ: زمانے نے اسے تجربہ کار بنا دیا۔
 جیسا کہ نَجْرَةٌ وَقَرْعٌ سِنَّةٌ وَأَفْتَرَةٌ وَغَيْرُهُ استعارات
 تجربہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ح و ت)

الْحَوْتُ بڑی مچھلی کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿نَسِيًا حَوْتُهُمَا﴾ (۱۸-۱۶) تو اپنی مچھلی بھول گئے۔
 ﴿فَالْتَقَمَهُ الْحَوْتُ﴾ (۳۷-۱۴۲) پھر مچھلی نے ان کو
 نگل لیا۔

اس کی جمع حَيْتَانُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿إِذْ تَأْتِيهِمْ حَيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَعًا﴾ (۷-۱۶۳)
 اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے
 سامنے پانی کے اوپر آتیں۔

اور مچھلی چونکہ رخ بدلتی رہتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے
 حَاوَتْنِي فُلَانٌ اس نے مجھے مچھلی کی طرح دھوکا دیا۔

(ح و ج)

الْحَاجَةُ: اس چیز کی ضرورت کو کہتے ہیں جس کی
 دل میں محبت ہو اس کی جمع حَاجَاتٌ وَحَوَائِجٌ آتی
 ہے اور حَاجٌ (ن) يَحْجُو وَاحْتِجَاجٌ کے معنی
 ضرورت مند ہونے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:
 ﴿إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسٍ يَعْقُوبَ قَضَاهَا﴾ (۱۲-۶۸)
 ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے
 پوری کی تھی۔

﴿حَاجَةً مِّمَّا أَوْتُوا.....﴾ (۵۹-۹) اور جو کچھ ان کو

(ح و ب)

الْحَوْبُ: (ن) جرم کا ارتکاب کرنا۔ حُوبٌ
 (اسم) گناہ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا﴾ (۳-۲) کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے ①

(۱۰۰) طَلَّاقٌ أُمُّ أَيُّوبَ حُوبٌ کہ ام ایوب کو
 طلاق دینا گناہ عظیم ہے۔ اور طلاق کو حوب کہنا اس بنا پر
 ہے کہ وہ ممنوع عنہ ہے اور یہ حَابٌ حُوبًا وَحُوبًا
 وَحِيَابَةٌ سے ہے جس کے معنی ارتکاب جرم کے ہیں۔
 اصل میں حَوْبٌ کا لفظ کلمہ زجر ہے جو آدمیوں کو ڈانٹنے
 کے لئے بولا جاتا ہے۔

فُلَانٌ يَتَحَوَّبُ مِنْ كَذَا: فلاں گناہ سے بچتا ہے جیسے
 يَتَأْتَمُّ عَرَبٌ لَوْگ کہتے ہیں (مثل) أَلْحَقَ اللَّهُ بِهِ
 الْحَوْبَةَ: اللہ اسے مسکت اور احتیاج میں مبتلا کرے
 اصل میں حَوْبَةٌ اس حاجت کو کہتے ہیں جو انسان کو
 ارتکاب جرم پر آمادہ کر لے کہا جاتا ہے کہ بَاتَ فُلَانٌ
 بِجَبِيَّةٍ سُوءٍ: فلاں نے بری حالت میں رات گزاری۔
 الْحَوْبَاءُ فُلَانٌ: بقول بعض نفس کے معنی میں آتا
 ہے۔ لیکن اصل میں حَوْبَاءُ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہ

① اخراجه ابو داؤد وفي المرسل و ابراهيم الحربي في الغريب من رواية ابن سيرين و رواه يحيى الهمداني في مسنده و الظيراني في الاوسط عن ابن سيرين عن ابن عباس و زاد: قال ابن سيرين الحوب الائم و روى الحاكم عن انس لكن فيه ان طلاق ام سليم لحوب (راجع للتفصيل ذيل الكشاف ۱: ۴۶۶ و تخريج الكشاف ۳۸ رقم ۳۱۶، وفي ذيل الامالي الزق و الحوبة المسكنة ۱۲).

پلٹنا بلحاظ ذات کے ہو یا بلحاظ فکر کے اور آیت کریمہ:
﴿إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ﴾ (۸۴-۱۳) اور خیال کرتا
تھا کہ (خدا کی طرف) پھر کر نہیں آئے گا۔
میں لَنْ يَحُورَ سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا مراد ہے جیسا
کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَ
رَبِّي لَتُبْعَثُنَّ﴾ (۶۴-۷) جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد
یہ ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دو
کہ ہاں ہاں!! میرے پروردگار کی قسم! تم ضرور اٹھائے
جاؤ گے۔

حَارَ الْمَاءُ فِي الْغَدِيرِ: پانی کا حوض میں گھومنا۔
حَارَ فِي أَمْرِهِ: کسی معاملہ میں متحیر ہونا۔
اسی سے مَحُورٌ ہے۔ یعنی وہ لکڑی جس پر چرخی گھومتی
ہے اور گھومنے کے معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔
سَيْرُ السَّوَانِي أَدَا لَا يَنْقَطِعُ کہ پانی کھینچنے والے
اونٹ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

مَحَارَةُ الْأَذْنِ: کان کا گڑھا۔ یہ مَحَارَةُ الْمَاءِ کے
ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں آواز سے
ہوا اس طرح چکر کاتی ہے۔ جیسے گڑھے میں پانی گھومتا
ہے۔ الْقَوْمُ فِي حَوَارٍ یعنی زیادتی کے بعد نقصان کی
طرف لوٹ رہے ہیں حدیث میں ہے ①

(۱۰۱) نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكُورِ: ہم
زیادتی کے بعد کسی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یا کسی کام کا

ملا اس سے کچھ خواہش۔

الْحَوْجَاءُ کے معنی حاجت ہی کے ہیں بعض نے کہا ہے
کہ حَاجٌ ایک قسم کے کانٹے کو کہتے ہیں۔

(ح و ذ)

الْحَوذُ: (ن) کے معنی ہیں ہانکنے والا، جو اونٹ
کے پیچھے اس کے رانوں کے عین بیچ میں چل کر وہاں سے
تختی کے ساتھ اسے ہانکے جائے۔ حَادًا إِلَّا بِلِ: تختی کے
ساتھ ہانکنا اور آیت:
﴿اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ﴾ (۵۸-۱۹) شیطان
نے ان کو قابو میں کر لیا ہے۔

میں استحوذ کے معنی ان پر مسلط ہو کر ہانکنے کے ہیں۔
یہ استحوذ العیبر علی الآتان کے محاورہ سے ماخوذ
ہے یعنی گدھے کا مادہ خرکی پشت پر چڑھ کر دونوں جانب
سے قابو پالینا (جیسا کہ جفتی کی صورت میں ہوتا ہے) اس
میں ایک قرأت استحوذ بھی ہے جو قیاس کے مطابق
ہے آیت میں شیطان کے بنی آدم پر غلبہ پانے کے لئے
استحوذ کا استعمال بطور استعارہ کے ہے جیسا کہ
إفْتَعَدَهُ الشَّيْطَانُ وَارْتَكَبَهُ کا محاورہ استعمال ہوتا
ہے۔ یعنی شیطان نے اسے اپنی سواری بنا لیا۔
الْحَوذِيُّ: مرد سبک فہم و نیک کار گزار، کسی چیز کا ماہر یہ
حَوذٌ بمعنی سوق (چلانا) سے مشتق ہے۔

(ح و ر)

الْحَوْرُ: (ن) کے اصل معنی پلٹنے کے ہیں خواہ وہ

① الحدیث فی اللسان (حور، کور، کون)، ومحالں ثعلب ۳۵۱ ومحازات القرآن للشریف الرضی ۲۸۳ والمحاراة النبویة واسباب
البلاغة والفساق ۲: ۳۱۱ وفيه بعد الكون وغریب ابی عبید: ۱۹۰: ۲۱۹ والترمذی فی الدعوات والنسائی فی الاستعاذة (حم) ۵: ۸۲-۸۳.
المثل فی حل المعامج

حَوْرَتُ الشَّيْءِ: کسی چیز کو گھمانا۔ سفید کرنا (کپڑے کا) اسی سے اَلْحَبْرُ الْحَوَّارُ ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں عیسیٰ ﷺ کے انصار واصحاب کو حَوَّارِيْنَ کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قنصاری یعنی دھوبی تھے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ صیاد یعنی شکاری تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حواری اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے جس پاکیزگی کی طرف کہ آیت:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (۳۳-۳۳) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قَصَّارٌ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی پن کا کام نہیں کرتے تھے۔ اور اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفت حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے اسی طرح ان کو صیاد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کی طرف لا کر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: ﴿(۱۰۲) الزبیر ابن عمتی وحواریٌّ کہ زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے نیز فرمایا: ﴿(۱۰۳) لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَّارِيٌّ وَحَوَّارِيٌّ

عزم کر لینے کے بعد اس میں تردد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے (مثل)
حَارَ بَعْدَ مَا كَارَ: زیادہ ہونے کے بعد کم ہو گیا۔
الْمَحَاوِرَةُ وَالْحَوَّارُ: ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹانا اسی سے تَحَاوُرٌ (تبادلہ گفتگو) ہے قرآن پاک میں ہے۔
﴿وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَ كَمَا﴾ (۵۸-۱) اور خدا تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

كَلِمَتُهُ فَمَا رَجَعَ إِلَى حَوَّارٍ أَوْ حَوِيرٍ أَوْ مَحَوْرَةٍ: میں نے اس سے بات کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَا يَعْشُ بِأَحْوَرٍ وہ عقل مندی سے زندگی بسر نہیں کر رہا ہے۔ اور آیات کریمہ:
﴿حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ (۵۵-۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔
﴿حُورٌ عِينٌ﴾ (۵۶-۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

میں حُورٌ أَحْوَرٌ اور حُورَاءُ کی جمع ہے اور حُورٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بقول بعض آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ظاہر ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے! إِحْوَرَّتْ عَيْنُهُ: یعنی اس کی آنکھ بہت سیاہی اور سفیدی والی ہے۔ اور یہ آنکھ کا انتہائی حسن سمجھا جاتا ہے۔ جو اس سے مقصود ہو سکتا ہے۔

① اخرجه النسائي والترمذی والبخاری من حديث جابر (وت لك) عن علي راجع الفتح مناقب زبیر بن العوام وتخريج الكشاف لابن حجر ۱۲.

② قاله نابغة واوله : ولاارى فاعلافي الناس يشبهه الشطرفى الاشباه النحويه (۷: ۲) والبيت فى مختار الشعر الجاهلى ۱: ۷۷ والعقد الثمين ۷ واللسان (حشى) وديوانه (۴۲) والخرزاة ۲: ۴۴) والمغنى لابن هشام (۱: ۱۳۰) والعبى (۱: ۳۸) والسوطى ۲۸-۲۷) واسرار ابن الانبارى ۲۰۸ وشرح العشر للتبريزى ۲۹۶ و اسمه ابوامامة زيادين معاويه المتوفى (نحو ۱۸ق) واختلف العلماء فى حاشى هل هو فعل او حرف جر واستدل المبرد بهذا البيت على ان حاشى قد تكون فعلاً انظر للتفصيل فى البغداديه ۲: ۴۴-۴۵).

الْحَوْشُ (ن) ایک کنارے سے کھانا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حشی اے مقلوب ہے اور اسی سے حاشیہ ہے جس کے معنی کنارے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے (بسیط)
(۱۲۲) وَمَا أَحَاشِي مِنْ الْأَقْوَامِ مِنْ أَحَدٍ
اور لوگوں سے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا (گویا شاعر نے کہا ہے کہ میں کسی کو ایک حشا میں نہیں رکھتا۔ کہ تمہاری فضیلت بیان کرتے وقت اسے مستثنیٰ کرنا پڑے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے (طویل)

(۱۲۳) وَلَا يَتَحَشَى الْفَحْلُ إِنْ أَعْرَضَتْ بِهِ
وَلَا يَمْنَعُ الْمَرْبَاعُ مِنْهُ فَصِيلَهَا
(ح و ط)

الْحَائِطُ: دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور احاطہ (افعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اجسام کے متعلق جیسے۔ أَحَطْتُ بِمَكَانٍ كَذَا يه
کبھی • بمعنی حفاظت کے آتا ہے جیسے فرمایا:
﴿أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ﴾ (۵۳-۴۲) سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور کبھی روکنے کے معنی میں آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿أَلَا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ﴾ (۶۶-۱۲) مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ۔ یعنی تمہیں روک لیا جائے۔ اور آیت کریمہ:
﴿أَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ (۸۱-۲) اور اس کے گناہ (ہر طرف سے) اس کو گھیر لیں۔

میں بہت بلیغ استعارہ ہے کیونکہ انسان جب کسی صغیرہ گناہ

الزیر کہ ہرنی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زیر بنیؓ ہے۔ اس روایت میں حضرت زیر بنیؓ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ عیسیٰؑ نے کہا تھا۔
﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾ (۱۶-۱۳) بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں۔ حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔

(ح و ش)

حَاشَا (کلمہ استثناء اور تزییہ ہے) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقُلْنَا حَاشَ لِلَّهِ﴾ (۱۳-۱۲) یعنی وہ شخص ہر نقص سے پاک اور دور ہے۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ یہ تزییہ اور استثناء کے لئے آتا ہے۔ ابوعلی الفسوی کا قول ہے کہ حاش اسم نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر حرف جرداغل نہیں ہوتا۔ اور نہ حرف ہے کیونکہ حرف میں جب تک تضعیف نہ ہو اس میں سے حذف نہیں ہوتا۔ حالانکہ حاش و حاشی دونوں طرح بولتے ہیں۔ پس بعض حاش کو مستقل کلمہ مان کر اسے حوش بمعنی و حشی سے مشتق مانتے ہیں۔ اور اسی سے حوشیء الکلام (وحشی کلام) ہے اور بعض نے کہا ہے حوش کے معنی مذکر جن کے ہیں اور اسی کی طرف وحشۃ الصيد منسوب ہے۔ اور آحشنتہ کے معنی میں کہ شکار کو ہر طرف سے گھیر کر پھندے کی طرف لایا۔

وَاسْتَوْحَشَوْهُ وَتَحَوَّشَوْهُ: انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

① قاله رجل من بني عكل والبيت في المعاني للقتبي ۳۹۲ و ۱۲۳۷ اللسان (حشی) عن الباهلی فی المعانی (۱۲۳)۔

﴿وَوَظَنُوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ﴾ (۱۰-۲۲) اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو لہروں میں) گھر گئے۔

میں احاطہ بالقدرۃ مراد ہے اسی طرح فرمایا:

﴿وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا﴾ (۲۸-۲۱) اور شہیتیں دیں جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (اور) وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں۔

﴿إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٌ﴾ (۱۱-۸۴) مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہے گا۔

الْأَحْيَاطُ: (افتعال) یعنی ایسے وسائل بروئے کار لانا جن کے ذریعہ کسی (مضمر) سے بجا ہوسکے۔

(ح و ل)

الْحَوْلُ: (ن) دراصل اس کے معنی کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں۔ معنی تغیر کے اعتبار سے حَالُ الشَّيْءِ يَحُولُ حَوْلًا وَلَا كَمَا حَوَّارُهُ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی شے کے متغیر ہونے کے ہیں۔ اور استحَالُ کے معنی تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنی انفصال کے اعتبار سے حَالُ بَيْنِي وَبَيْنَكَ كَذَا كَمَا حَوَّارُهُ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہوگئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾ (۸-۲۳) اور جان رکھو! کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

میں باری تعالیٰ کے مقلب القلوب ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے

کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے بار بار کرتا ہے تو یہ اسے کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس طرح وہ برابر گناہوں کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور وہ گناہ کو چھوڑ نہیں سکتا (تو گویا گناہ نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا)۔

(۲) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:

﴿قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (۶۵-۱۳) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ (۳-۱۲۰) یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

﴿إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ (۱۱-۹۲) میرا پروردگار تو تمہارے سب اعمال پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اور کسی چیز پر علم کے ذریعے احاطہ کر لینے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انسان اس چیز کے وجود، جنس، کیفیت، اس کی غرض

اور اس کو مالہ و ماعلیہ کو پوری طرح جان لے۔ اور اس طرح کا احاطہ اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ قرآن پاک نے مخلوق سے اس قسم کے احاطہ علمی کی نشانی کی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ﴾ (۱۰-۲۹) حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر

یہ قابو نہیں پاسکتے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا۔ اور خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا:

﴿وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا﴾ (۱۸-۶۸) اور جس بات کی تمہیں خبر ہی نہیں اس پر صبر کر

بھی کیونکر سکتے ہو۔

اس میں تشبیہ ہے کہ جب تک کسی چیز پر پوری طرح احاطہ نہ ہو اس وقت تک کامل صبر بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی چیز

کے بغیر ناممکن ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ (۲-۲۴۰) کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔

اسی سے حَالَتِ السَّنَةِ تحوّل کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں سال گزر گیا۔ حَالَتِ الدَّارِ گھر کی حالت متغیر ہوگئی۔

أَحَالَتْ وَأَحْوَلَتْ: اس پر ایک سال پورا ہو گیا۔ جیسا کہ أَعَامَتْ وَأَشْهَرَتْ کا محاورہ ہے۔

أَحَالَ فَلَانٌ بِمَكَانٍ كَذَا: وہ فلاں جگہ پورا ایک سال رہا۔

حَالَتِ النَّاقَةُ تحوّل جیسا کہ اونٹنی کا حاملہ نہ ہونا۔ گویا اسکی پہلی حالت متغیر ہوگئی۔

أَحَال: انسان وغیرہ کی وہ حالت جو نفس جسم اور مال کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے اور حَوْل كَالْفَرْسِ، بدنی، اور جسمانی تینوں قسم کی قوت پر بولا جاتا ہے اسی سے کہا جاتا ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ: اللہ کے سوا کچھ حیلہ اور قوت نہیں ہے۔

حَوْلُ الشَّيْءِ: کسی چیز کی وہ جانب جس کی طرف اسے پھیرنا ممکن ہو، حَوْل كَهَلَاتَا ہے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ﴾ (۳-۷) اور جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گردا گرد (حلقہ باندھے ہوئے) ہیں۔

الْحَيْلَةُ وَالْحَوِيلَةُ: اس تدبیر کو کہتے ہیں جس سے کسی

مطابق انسان کے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو اسے اس کے مقصد سے پھیر دیتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ﴾ (۲۴-۵۱۲)

(ان میں اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا) بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ بعض نے آیت ﴿يَحْوِلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مہلت دے رکھتا ہے۔ تاکہ وہ ارڈل عمر کی حد تک پہنچ جائے اور جاننے کے بعد کسی چیز کو بھی نہ جان سکے۔

حَوَّلْتُ الشَّيْءَ: کسی چیز کو متغیر کرنا اور پھیر دینا۔

اور یہ تغیر کبھی باعتبار ذات کے ہوتا ہے اور کبھی باعتبار حکم اور قول کے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ أَحَلْتُ عَلَى فُلَانٍ بِالذَّنْبِ: میں نے فلاں پر قرض کا حوالہ کر دیا۔ حَوَّلْتُ الْكِتَابَ: کتاب کو نقل کرنا۔ مثل مشہور ہے ﴿لَوْ كَانَ ذَا حِيلَةٍ لَتَحَوَّلَ﴾: اگر صاحب تدبیر ہوتا تو پھر جاتا اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ (۱۸-۱۰۸) اور وہاں سے

مکان بدلنا نہ چاہیں گے۔ میں حَوْلًا کے معنی تَحَوَّل یعنی پھرنے کے ہیں۔

الْحَوْلُ: سال کو کہتے ہیں اس لئے کہ سال بھر میں سورج اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ

كَامِلَيْنِ﴾ (۲-۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو

سال دودھ پلائیں۔

ہے۔ الْحَال: لغت میں اس صفت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی چیز موصوف ہوتی ہے اور اہل منطق کی اصطلاح میں سرلیح الزوال کیفیت کو حالت کہا جاتا ہے۔ جیسے حرارت برودت، بیوست اور رطوبت جو کسی چیز کو عارض ہوتی ہے۔

(ح و ی)

الْحَوَايَا (انتریاں) یہ حَوِيَّة کی جمع ہے جس کے معنی آنت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ﴾ (۶-۱۳۶)
انتریوں میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔

اور حَوِيَّة اس کبمل کو بھی کہتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کے ارد گرد لپٹا جاتا ہے۔ یہ اصل میں حَوِيْتُ (ض) حَيًّا وَحَوَايَةَ سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔

الْأَحْوَى: کلاسیاہ مائل بہ سبزی۔ یہ حَوَّة سے مشتق ہے جس کے معنی سبزی مائل سیاہی ہیں اور اس کا باب اَحْوَوَى يَحْوَوِي اِحْوَاءً آتا ہے جیسے اِرْعَوِي بعض نے کہا ہے کہ اس وزن پر یہ دو باب ہی آتے ہیں وَلَا تَالِثَ لِهَمَّا حَوِي حَوَّة سِياه سبزی مائل ہونا اسی سے اَحْوَى ہے جس کے معنی سخت سیاہ کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَى﴾ (۵-۸۷) پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا کر دیا۔

یہاں اَحْوَى سے مراد ہے وہ گھاس جو پرانی بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ۵

چیز تک پوشیدہ طور سے پہنچا جاسکے۔ عام طور پر اس کا استعمال بری تدبیر کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسی تدبیر کے متعلق بھی ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے وصف میں: ﴿وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ﴾ (۱۳-۱۳) آیا ہے یعنی باری تعالیٰ خفیہ سے اس کام کو سرانجام دیتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کو مکرو و کید کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے۔ نہ کہ بطور مذمت کے اللہ تعالیٰ تو ہر چیز سے پاک اور بالا ہے اور حیلہؑ بھی حَوْل سے مشتق ہے۔ واو کا ما قبل کسور ہونے کی وجہ سے اسے یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اسی سے رَجُلٌ حَوْل کا محاورہ ہے یعنی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔

الْمِحَالُ کے معنی ہیں دو متقاض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ کبھی قول میں ہوتا ہے جیسے کہا جائے ایک جسم دو جگہوں میں ایک ہی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اِسْتَحَالَ الشَّيْءُ: کسی چیز کا محال ہونا اور اس چیز کو مُسْتَحِيلٌ کہا جاتا ہے یعنی محال ہونے لگی۔ اَلْحَوْلَاءُ: یعنی سبزی چھلی جو اونٹنی کے پیٹ سے بچے کے ساتھ نکلتی ہے۔

مثل مشہور ہے ۱ وَلَا أَفْعَلُ كَذَا مَا أَرَزَمْتُ أُمَّ حَائِلٍ: جب تک کہ اونٹنی آواز نکالتی رہے، میں اس کام کو نہیں کروں گا اور ام حائل اس شتر بچہ مادینہ کو کہتے ہیں جو ابھی پیٹ سے باہر آیا ہو اور اس میں شبہ نہ رہا ہو کہ یہ مادہ ہے حالت اشتباہ کے دور ہونے کی وجہ سے اسے ام حائل کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں مذکر کو سقب کہا جاتا

۱ ای لا افعله ابدأ راجع اللسان (حول) والامالی امر ۲۱.

۲ لم اجرھا ویرحی ۱۲.

حَيْرَانٌ ﴿٦-٤١﴾ جیسے کسی کو جنات نے جنگل میں بھلا دیا ہو۔ (اور وہ) حیران ہو رہا ہو۔

الْحَائِرُ: جائے گرداب۔ شاعر نے کہا ہے ﴿١٢٥﴾ وَأَسْتَحَارَ شَبَابَهَا

اور اس کی جوانی بھر پور ہو گئی۔ اور استحار کے معنی پانی سے پیٹ کے اس قدر پر ہو جانے کے ہیں کہ اسے حیرت لاحق ہو جائے۔

الْحَيْرَةُ: ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پانی کے جمع ہونے کی وجہ سے اس مقام کا نام حیرہ پڑ گیا تھا۔

(ح ی ص)

حَاصٌ (ض) عَنِ الْحَقِّ کے معنی حق سے بھاگ کر شدت و کمروہ کی طرف جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ مِنْ مَّحِيصٍ﴾ ﴿٥٠-٣٦﴾ کہ کہیں بھاگنے کی جگہ ہے۔

﴿مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ﴾ ﴿١٣-٢١﴾ کوئی جگہ گریز اور رہائی ہمارے لئے نہیں ہے۔

یہ اصل میں حَيْصٌ وَبَيْصٌ سے ہے جس کے معنی شدت اور سختی کے ہیں۔ مگر الْحَوْصُ (اجوف وادی) ہو تو اس کے معنی چڑا سلنا ہوتے ہیں اور اسی سے حُصْتُ عَيْنِ الصَّفْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی صقرہ کی آنکھیں سی دینے کے ہیں۔

(١٢٤) طَالَ حَبْسٌ بِالذَّرِينِ الْأَسْوَدِ:

پرانی خشک اور سیاہ گھاس میں عرصہ سے مجبوس ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کی ترتیب اصل یہ ہے ﴿وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى - أَحْوَى فَجَعَلَهُ عَنَاءً﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بزر چارہ اگاتا ہے پھر اس کو کوڑا بنا دیتا ہے۔

(ح ی ث)

حَيْثُ: (یہ ظرف مکان مبنی پر ضم ہے) اور مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ﴾ ﴿٢-١٣٢﴾ اور تم جہاں ہو کرو۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ﴾ ﴿٢-١٣٩﴾ اور تم جہاں سے نکلو۔

(ح ی د)

الْحَيْدُ: (ض) کے معنی پہلو تہی کرنے اور دور بھاگنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ﴾ ﴿٥٠-١٩﴾ (اے

انسان) یہی (وہ حالت) ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

(ح ی ر)

حَارٌ (ض) حَيْرَةٌ فَهُوَ حَائِرٌ وَحَيْرَانٌ وَتَحِيرٌ وَاسْتَحَارَ کے معنی کسی کام سے بھٹکنے اور تردد ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيْطَانُ فِي الْأَرْضِ

① وعلى هذا التقدير يكون احوى حالاً كما في الكشاف ٤: ٧٣٨ وذكره ثعلب في مجالسه ٣٧٠ في امثلة القلب ١٢.

② قاله ابو ذؤيب الهذلي وتكملته ثلاثة اعمام فلما ترجمت - تقضى شباني والبيت في اللسان والصحاح والتاج (حرم) والمحکم (حبر) وفي روايته احوال بدل اعمام الينا بهون بدل تقضى بدل تقضى شباني وديوان الهذليين الستة (١: ٧١) والسيوطي

٩ في روايته علينا بهون وكذا في (س) وديوان الهذليين ١٢.

(ح ی ض)

گھیرنے اور اس پر نازل ہونے کے ہیں۔ اور یہ باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾ (۳۵۔

۴۳) اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

﴿وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِؤْنَ﴾ (۴۶۔

۲۶) اور جس چیز سے استہزاء کیا کرتے تھے اس نے ان کو آگھیرا۔

(ح ی ن)

الْحَيْنُ: اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعیین ہمیشہ مضاف الیہ ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَاتِ حَيْنَ مَنَاصِ﴾ (۳۸۔۳) اور وہ رہائی کا

وقت نہ تھا۔

اور بعض نے حین (رفع کے ساتھ) پڑھا ہے پس حین کا استعمال چند وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) مدت اور اجل کے معنی میں جیسے فرمایا:

﴿وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (۱۰۔۹۸) اور ایک مدت

تک (فوائد دینی سے) ان کو بہرہ مندرکھا۔

(۲) سال اور برس کے معنی میں جیسے:

﴿تَوَاتَىٰ أَكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا﴾ (۱۳۔۲۵)

اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت کھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو۔

الْحَيْضُ: وہ خون جو مخصوص دنوں میں صفت خاص کے ساتھ عورت کے رحم سے جاری ہوتا ہے اسے حیض کہا جاتا ہے اور حیض کے معنی حیض، وقت حیض اور مقام حیض کے ہیں۔ کیونکہ فعل سے اس قسم کے مصادر مَفْعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں جیسے مَعَاشٌ وَمَعَادٌ اور شاعر کے قول ع (الکامل)

(۱۲۶) لَا يَسْتَطِيعُ بِهَا الْفَرَادُ مَقِيلًا

(کہ چھڑی اس میں قبیلہ کی جگہ بھی نہیں پاتی)

میں مقبلا ظرف ہے یعنی قبیلہ کرنے کی جگہ گو بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے اور کہا جاتا ہے مَا فِى بُرْكَ مَكِيلٍ وَمَكَالٍ کہ تیرے غلہ میں ماپ نہیں ہے۔

(ح ی ف)

الْحَيْفُ: (ض) فیصلہ کرنے میں ایک جانب کو

جھک جانا انصاف نہ کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولَهُ

بَلْ أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۲۳۔۵) یا ان کو خوف

ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان کے حق میں ظلم کریں گے۔ (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

تَحَيَّفْتُ الشَّيْءَ میں نے اسے کناروں سے پکڑا۔

(ح ی ق)

الْحَيَوُوقُ وَالْحَيَقَانُ: (ض) کے معنی کسی چیز کو

① قاله الراعى النميرى عبید بن حصین بن جندل الراعى (ابو جندل هو من فحول الشعراء) و صدره : نبت مرافقهن فوق منزله والبيت من كلمة جمهورية طوبلة (۳۳۱-۳۳۷) و راجع للبيت اللسان (زلزل) و امالى المرتضى ۱: ۳۲۳) و البحر ۲: ۱۶۷) و الكتاب (۳۴۷: ۲) مع شرحه للشمرى المخصص ۹: ۱۲/۱۶/۵۵ و المحکم (حیض) و اللسان و فيه ما يستطیع و الحيوان (۵: ۴۳۷) و فى روايته نبت بدل نبت و فى بعض الروايات ثبت ۱۲.

(۵۷-۱۷) جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

﴿فَأَحْيَيْنَاهُ بِلُدَّةٍ مَّيْتًا﴾ (۵۰-۱۱) او اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا﴾ (۲۱-۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

(۲) دم حیا کے معنی قوت احساس کے آتے ہیں اور اسی قوت کی بنا پر حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿الْمَن نَّجْعَلِ الْأَرْضَ كَيْفَاتَا أَحْيَاءَ وَأَمْوَاتًا﴾ (۷۷-۲۶) اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتِ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (۳۱-۳۹) تو جس نے زمین کو زندہ کیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

میں زمین کو زندہ کرنے سے اسے قوت نامیہ عطا کرنا مراد ہے اور مُحْيِي الْمَوْتِ سے قوت احساس کے عطا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) قوت عاقلہ عالمہ کا عطا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَا﴾ (۶-۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور شاعر نے کہا ہے ❶

(۱۲۷) لَقَدْ أَسْمَعْتَ لَوْ نَادَيْتَ حَيًّا

(۳) ایک ساعت اور گھڑی کے معنی میں جیسے فرمایا:

﴿حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ﴾ (۳۰-۱۷) تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو.....

(۴) مطلق زمانہ اور وقت کے معنی میں جیسے فرمایا:

﴿هَلْ آتَىٰ عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (۷۶-۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے۔

﴿وَلَتَعْلَمَنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ﴾ (۳۸-۸۸) اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائے گا۔ اور کسی ایک معنی کی تعیین موقع محل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے: عَامَلْتَهُ مُحَايِنَةً: میں نے اس سے وقتاً فوقتاً معاملہ کیا۔

أَحْيَيْتُ بِالْمَكَانِ: میں وہاں ایک عرصہ ٹھہرا رہا۔

حَانَ حِينٌ كَذَا: فلاں چیز کا موسم قریب آ پہنچا۔

حَيَّيْتُ الشَّيْءَ: کسی چیز کے لئے وقت مقرر کرنا۔ اور أَلْحَيْنَ (بفتح الحاء) کے معنی موت اور ہلاکت کے ہیں۔

(ح ی)

الْحَيَاةُ: (زندگی، جینا یہ اصل میں حَيٌّ (س) یحییٰ کا مصدر ہے) کا استعمال مختلف وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) قوت نامیہ جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے نبات کو حَیٌّ یعنی زندہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾

❶ البيت فی النجاج غیر منسوب والطبرسی ۱: ۹۶، والطبری ۵: ۷۸ والبحر ۱: ۳۷۲-۴۸۶) وتزیه القرائن اوفیه لقد بدل وقد وايضاً لطائف المعارف لبونى ۳۲۷ وفى المطبوع وقد ناديت لو اسمعت حيامقلوب ثم رابت فى البلدان (رسم ابیہ) ان قائله ككبر برنى صدیقه خندفانی ۱۹ بیتاً ۱۲.

کہ علم و عقل کی زندگی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ﴾ (۸-۲۳) خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جب کہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جادواں) بخشتا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَدْ مَنَّا لِحَیَاتِنَا﴾ (۸۹-۲۳) کاش میں نے اپنی زندگی (کی جاودانی کے لئے) کچھ آگے بھیجا ہوتا۔ میں بھی اخروی دائمی زندگی مراد ہے۔

(۶) وہ حیات جس سے صرف ذات باری تعالیٰ متصف ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں حسیٰ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات اقدس ہوتی ہے جس کے متعلق موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

پھر دنیا اور آخرت کے لحاظ سے بھی زندگی دو قسم پر ہے یعنی حیات دنیا اور حیات آخرت چنانچہ فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰۤی ۝ وَاَثَرَ الْحَیٰةِ الدُّنْیَا﴾ (۷-۷۹) (۳۸، ۳۷) تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم

وَلٰكِنْ لَا حَیٰةَ لِمَنْ تَنَادٰی

اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سن لیتا۔ لیکن جس کو تم پکارتے رہے ہو اس میں زندگی نہیں ہے (یعنی عقل سے محروم ہے) (۴) غم کا دور ہونا مراد ہوتا ہے۔ اس معنی میں شاعر نے کہا ہے: (ضعیف)

(۱۲۸) لَیْسَ مِنْ مَّاتٍ فَاسْتَرَاحَ بِمَیْتٍ

اِنَّمَا الْمَیْتُ مَیْتٌ الْاَحْیَاءُ
جو شخص مر کر راحت کی نیند سو گیا وہ درحقیقت مردہ نہیں ہے۔ حقیقتاً مردے وہ ہیں جو زندہ ہونے کے باوجود مردے بنے ہوئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُوْلُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّہُمْ﴾ (۳-۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

میں شہدا کو اسی معنی میں اَحْیَاءٌ یعنی زندے کہا ہے۔ کیونکہ وہ لذت و راحت میں ہیں۔ جیسا کہ ارواح شہداء کے متعلق بہت سی احادیث مروی ہیں۔

(۵) حیات سے آخرت کی دائمی زندگی مراد ہوتی ہے۔ جو

① البیت مقطوعة لعدي بن الرعلاء العناني جاهلي وهو الذي يقال له كوني ابن الرعلاء (التاج - كوت - كوٹ) والنحويون يستشهدون به راجع معالم الابتداء للزبيدي ص) والبیت فی الاصمعیات ۵: وتهذيب الالفاظ ۴۴۸: والمعجم والمرزبانی ۸۶ والسمط ۶، ۳، ۸: والحزانة ۴: ۱۸۷) وابن السجری ۵۱ والنسبوی ۴۰۳۸: ۴۸۷: والاقنصاب ۸۹ ومجاز القرآن ۱۴۹ رقم ۱۷۹ والصناعین ۳۱۵ والبحر (۱: ۲۰۹) وایام العرب ۵۳ والرسالة القشيرية ۳۴ والمحكم (شعث) فی امثلة بیت التشعیث واضداد ابی الطیب ۱: ۳۱۸ ونسبه البحر فی الحماسة ۲۱۴ ویاقوت فی الارشاد ۱۲: ۹ والمعجم ۲۶۹ الی صالح بن عبدالقدوس قال الاستاذ المیمنی فی ذیل السمط وهو به البیط وبمذهبه اوفق والاسم ان الاستاذ حسن کامل الصوری نقل تخریج المیمنی بغیر عزوفی تعلیقاته علی دیوان البحر فی البیان (۱: ۱۳۲) ان الحسن البصری كان یتمثل بهذا البیت فی مجلسه ومواعظه راجع الحیوان ۶: ۵۰۷: وکنز العمال رقم ۲۵۵۱ (الدیلمی عن انس او ابن عباس واضداد ابی الطیب ۳۱۸ ولطائف المعارف للیونی ۳۲۷ وفي المیدانی ۲۸۹۱ مثل یضرب بمن یوعظ فلا یقبل ولا یفهم وفي المعجم للمرزبانی واللانی ان الشاعر قالها فی وقعة عین اباغ بین الفساسنة بالشام والمناذرة بالعراق واولها: کم ترکنا بالعمین عین اباغ من ملوک وسوقه القاء وبعد الشاهد انما المیت من یعیش ذلیلا - کاسفاباله قلیل الرجاء وبهذا یتضح المراد ۱۲.

سمجھا۔

﴿وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾

(۳۲-۵) اور جو اس کی زندگی کا موجب ہو تو گویا تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہو۔

یعنی انہیں ہلاکت سے نجات بخشی اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَ

﴿أُمِيتُ﴾ (۲-۲۵۸) میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور

مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مارتو میں بھی کر سکتا ہوں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں اس کافر کا مطلب یہ تھا کہ میں

ایک شخص کو معاف کر کے اسے زندگی بخشا ہوں۔

الْحَيَوَانَ: یہ زندگی کا مقام اور مقرر ہوتا ہے اور دو معنوں

میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ جس میں قوت احساس ہو۔

(۲) وہ جسے دائمی بقا حاصل ہو اور آیت کریمہ:

﴿وَإِنَّ السَّادِرَ الْأَخِيرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا

يَعْلَمُونَ﴾ (۲۹-۶۳) اور (ہمیشگی) زندگی (کا مقام)

آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔

میں اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے دار آخرت کو حیوان کہا

گیا ہے۔ اور لہٰی الْحَيَوَانَ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ حقیقی

اور سرمدی زندگی تو وہ ہے جس کے بعد فنا نہ آئے نہ کہ وہ

جو کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ حَيَوَانَ اور حَيَاة دونوں ہم

معنی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حَيَوَانَ وہ ہے جس میں

حیاء یعنی زندگی ہو اس کے مقابل مَوْتَان وہ ہے جس میں

زندگی نہ ہو۔ اور بارش کو حَيَا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مردہ ز

مین کو زندہ کر دیتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا﴾ (۲۱-۳۰)

﴿اِشْتَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ﴾ (۲-۸۶)

جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ﴾

(۱۳-۲۶) اور دنیا کی زندگی آخرت (کے بدلے) میں

(بہت) تھوڑا فائدہ ہے۔ یہاں متاع سے دنیاوی ساز

وسامان مراد ہے۔

﴿وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا﴾ (۱۰-۱)

(۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی سے مطمئن ہو

بیٹھے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ﴾

(۲-۹۶) بلکہ تم ان کو اور لوگوں سے زندگی پر کہیں حریص

دیکھو گے اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي

الْمَوْتَى.....﴾ (۲-۲۶۰) اور جب ابراہیم نے

(خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو

کیونکر زندہ کرے گا۔

میں حضرت ابراہیم عليه السلام نے اخروی زندگی کی کیفیت کا

مشاہدہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ جو دنیوی آفات

کے شوائب سے پاک ہوگی۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ﴾ (۲-۱۷۹) اور

اے اہل عقل! (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگی

ہے۔ میں قصاص میں حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ

قصاص کے خوف سے لوگ قتل پر اقدام کرنے سے رکے

رہیں گے۔ لہذا اس سے لوگوں کو زندگی حاصل ہوگی۔

فُلَانًا تَحِيَّةً: فلاں نے اسے حَيَّاكَ اللّٰهُ کہا۔ اصل میں تَحِيَّةٌ حیات سے مشتق ہے۔ پھر دعائے حیات کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ جملہ اقسام تحیہ حصول حیاة یا سبب حیاة سے خارج نہیں ہیں خواہ یہ دنیا میں حاصل ہو یا عقبیٰ میں۔ اسی سے التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ ہے ❶ اور آیت کریمہ:

﴿وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمُ﴾ (۲-۴۹) اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

کے معنی عورتوں کو زندہ چھوڑ دینے کے ہیں۔
الْحَيَاءُ کے معنی قباح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حَسِيَ فَهُوَ حَسِيٌّ
وَاسْتَحْيَا فَهُوَ مُسْتَحْيِيٌّ: اور بعض نے اسْتَحْيَا
فَهُوَ مُسْتَحِيٌّ (تحفیف یا) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔
قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ
يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲-۲۶)
خدا اس بات سے عار نہیں کرتا کہ پھر یا اس سے بڑھ کر
کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔
﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ (۳۳-۵۳)
لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

ایک روایت میں ہے:

(۱۰۳) إِنَّ اللّٰهَ يَسْتَحْيِي مِنْ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ
أَنْ يُعَذِّبَهُ كَمَا اللّٰهُ تَعَالَى بُوِضَّ هَمَّ مُسْلِمًا كَوَعْدَابِ دِينِهِ
سے شرماتا ہے۔

پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنی

میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:
﴿إِنَّا نَبْشِرُكَ بِغُلَامٍ نَّاسِمُهُ يَحْيَى﴾ (۷-۱۹) میں
انہیں سچی کہنے سے صرف یہ مقصود نہیں تھا۔ کہ وہ اس نام
سے مشہور ہوں گے۔ کیونکہ اس سے کوئی خاص فائدہ
حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا تھا کہ گناہوں
سے ان کا دل مردہ نہیں ہوگا جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے
اور آیت کریمہ:

﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ﴾ (۱۹-۳۰) وہی زندے کو مردے سے نکالتا
ہے اور (وہی) مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ نطفہ سے انسان پیدا کرتا ہے اور
انڈے سے مرغی۔ اسی طرح زمین سے نباتات نکالتا ہے
اور انسان سے نطفہ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا حُيِّنْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ
رُدُّوهَا﴾ (۳-۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو
(جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا
دیا کرو یا انہی لفظوں سے دعا دو۔ نیز ﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ
بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ
اللّٰهِ﴾ (۲۴-۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے
(گھر والوں کو) سلام کیا کرو۔ (یہ خدا کی طرف سے.....
تحفہ ہے۔

میں تَحِيَّةٌ کے معنی کسی کو حَيَّاكَ اللّٰهُ کہنے کے ہیں یعنی
اللہ تجھے زندہ رکھے۔ یہ اصل میں جملہ خبریہ ہے لیکن دعا
کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے حَيَّا فُلَانًا

❶ ويسمى التشهد في الصلوة والفاظه وددت في غير حديث والمعروف تشهد عبدالله بن مسعود اخرجہ الائمة السنة ومنها تشهد ابن عباس واختاره الشافعي وذهب مالك واصحابه الى تشهد عمر راجع الزرقاني على الموطا ۱: ۱۷۶-۱۷۸ (۱۷۸).

معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعالِ حسنہ کو سرا انجام دینے والا ہے۔



انتقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذاتِ باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔^①
(۱۰۴) إِنَّ اللَّهَ حَيٌّ كَمَا أَنَّ اللَّهَ حَيٌّ هُوَ تَوَّاسُّكَ

① ورد الحديث بالفاظ مختلفه وتامه كريم يستحي من عبده اذا رفع يديه ان يردهما ضميراً راجع ابو داؤد والترمذى وابن ماجه من حديث سلمان والحدیث أيضاً فی المستدرک للحاکم عن انس وابی یعلی عن جابر ابن عمر عن الطبرانی وراجع عون المعبود ۵۵۳:۱ والكافی لابن حجر رقم ۳۶ وکنز العمال رقم ۲۴۳ و۲۴۶ و۳۵۳ و۲۸۴ (عبدالرزاق عن انس) والحکیم الترمذی أيضاً عن انس ج ۲ وایضاً ۲۸۴-۳۸۶.

کتاب الخاء

کے متعلق:

﴿لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ﴾ (۷-۲۰۶) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿فَتَخَبَتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ﴾ (۲۲-۵۳) تو ان کے دل اللہ کے سامنے عاجزی کریں میں اخبات کے معنی دلوں کے نرم ہونے اور عاجزی کرنے کے ہیں۔ اور یہاں اس کے معنی قریا وہی ہیں جو کہ آیت:
﴿وَأَنَّ مِنْهَا لَمَّا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ (۲-۷۴) اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہبوط کے ہے۔

(خ ب ث)

الْمُخْبِتُ وَالْخَيْثُ: ہر وہ چیز جو ردی اور خیس ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (یعنی عقائد و خیالات) سے تعلق رکھتی ہو اصل میں خبیث ردی اور تا کارہ چیز کو کہتے ہیں جو بمنزلہ لوہے کی میل کے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے
(۱۰۹) سَبَّكْنَاهُ وَنَحْبِسُهُ لُجَيْنًا
فَأَبْدَى الْكَيْسِرُ عَنْ خَبَثِ الْحَدِيدِ
ہم نے اسے اس خیال سے ڈھالا کہ یہ چاندی ہے لیکن
بھٹی میں ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوہے کا میل ہے۔ اس
اعتبار سے یہ اعتقاد باطل کذب اور فعل قبیح سب کو شامل

(خ ب ء)

الْحَبَاءُ: (ف) کسی چیز کے پوشیدہ اور مخفی ذخیرہ کو خباء کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:
﴿الَّذِي يُخْرِجُ الْحَبَاءَ﴾ (۲۷-۲۵) جو چھپے ہوئے خزانے نکالتا ہے۔
اسی سے جَارِيَةٌ حُبَاءَةٌ (طَلْعَةٌ) کا محاورہ ہے یعنی وہ لڑکی جو کبھی پردہ میں چلی جاتی ہو اور کبھی باہر نکل آتی ہو۔
الْحَبَاءُ - وہ نشان جو (اونٹنی کے) کسی خفیہ مقام پر لگایا جاتا ہے۔

(خ ب ت)

الْخَبْتُ: نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں۔ اور
أَخْبَتَ الرَّجُلُ کے معنی نشیبی اور نرم زمین کا قصد کرنے یا وہاں اترنے کے ہیں (جیسے أَسْهَلَ وَأَنْجَدَ) اس کے بعد لفظ الْأَخْبَاتُ (افعال) اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔
﴿وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ﴾ (۱۱-۲۳) اور اپنے پروردگار کے آگے عاجزی کی۔
﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ﴾ (۲۲-۳۳) اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو۔
یعنی تواضع کرنے والوں کو جیسا کہ دوسری جگہ انہی لوگوں

① والمعروف في المثل حُبَاءَةٌ طَلْعَةٌ فُهِنَا سَفُوط.

کہدو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں۔
میں خبیث اور طیب سے کافر اور مومن اور اچھے اور
برے اعمال مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ﴾ (۳-۲۶)
اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے۔ میں
کفر، جھوٹ، چغلی ہر قسم کی فتنے باتیں داخل ہیں حدیث میں
ہے:

الْمُؤْمِنُ أَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهِ وَالْكَافِرُ أَخْبَثُ مِنْ
عَمَلِهِ کہ مومن اپنے عمل سے پاک اور کافر اپنے عمل
سے ناپاک ہے۔

اور خبیث و مُخْبِثُ نخب کے مرکتب کو بھی کہا جاتا
ہے۔

(خ ب ر)

الْخَبْرُ: جو باتیں بذریعہ خبر کے معلوم ہو سکیں ان
کے جاننے کا نام ”خبر“ ہے کہا جاتا ہے۔

خَيْرُ نَهْ خَيْرَةٌ وَأَخْبَرْتُ: جو خبر مجھے حاصل ہوئی
تھی اس کی میں نے اطلاع دی۔ بعض نے کہا ہے کہ
خُبْرَةٌ کا لفظ کسی معاملہ کی باطنی حقیقت کو جاننے پر
بولا جاتا ہے۔

الْخَبَارُ وَالْخُبْرَاءُ: نرم زمین۔ اور کبھی درختوں والی
زمین پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

الْمَخَابِرَةُ: بیانی پر کاشت کرنا۔ اسی سے کسان کو
”خَبیر“ کہا جاتا ہے۔

الْخَبِيرُ: چھوٹا تو شہ دان۔ تشبیہ کے طور پر زیادہ دودھ دینے
والی اونٹنی کو بھی خَبیر کہا جاتا ہے۔ اور آیت ہے:

﴿وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (۵۰-۳) اور جو کچھ تم

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثَ﴾ (۷-۱۵۷) اور
ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔

یعنی منظورات جو طبیعت کے ناموافق ہیں۔ اور آیت
کریمہ:

﴿وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرِيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ
الْخَبِيثَ﴾ (۲۱-۷۴) اور اس بہتی سے جہاں کے لوگ
گندے کام کرتے تھے بچا نکالا۔

میں عمل خبیث میں لذت اندوزی کے لئے مردوں کی
طرف مائل ہونے سے کٹایا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ
عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۳-۱۷۹)
جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے گا۔ میں
اعمال خبیث کو اعمال صالحہ سے اور بد باطن لوگوں کو نفوس
زکیہ سے تیز دینا مراد ہے۔ اور آیت:

﴿وَلَا تَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (۴-۲) اور ان
کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو اپنے ناقص اور برے مال
سے نہ بدلو۔

میں خبیث اور طیب سے حلال اور حرام مراد ہیں۔ اور
فرمایا:

﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ﴾
(۲۶-۲۳) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں
اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے۔

یعنی افعال قبیحہ اور آوارہ کام، بد باطن اور آوارہ لوگ ہی
کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ﴾ (۵-۱۰۰)

بدون استواری کے مارنے کے ہیں۔ جیسے اونٹ کا زمین پر اگلا پاؤں مارنا یا آدمی کا لٹھی کے ساتھ درخت سے پتے جھاڑنا۔ اور درخت سے جھاڑے ہوئے پتوں کو بھی خِطُّ کہا جاتا ہے جیسا کہ مضروب پر ضربت کا لفظ بول لیتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر بادشاہ کے ظلم پر بھی خِطُّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ظالم بادشاہ کو خُجُوٹ کہا جاتا ہے۔

اِخْتِطَّطِ الْمَعْرُوفِ کے معنی ہیں کسی سے زبردتی احسان کا مطالبہ کرنا یہ مجاورہ حَبَطُ الْوَرَقِ (درخت سے پتے جھاڑنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت: ﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (۲)۔ (۲۷۵) جیسے کسی کو جن نے لپیٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔

میں يَتَخَبَّطُ کے معنی خَبَطُ الشَّجَرِ سے بھی لئے جاسکتے ہیں۔ اور اغتباط سے بھی۔ جس کے معنی احسان کا مطالبہ کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے ①

(۱۰۵) اَللّٰهُمَّ اَعُوذُ بِكَ اَنْ يَّتَخَبَّطَنِي الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ: اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے لپٹ کر دیوانہ بنا دے۔

(خ ب ل)

اَلْخَبَالُ وَالْخَبَلُ وَالْخَبْلُ: اس فساد یا خرابی کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو لاحق ہو کر اس میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر دے۔ جیسے جنون یا وہ مرض جو عقل و فکر پر اثر انداز ہو۔ کہا جاتا ہے۔ خَبَلَهُ وَخَبَلَهُ فَهُوَ خَابِلٌ وَالْجَمْعُ خَبَلٌ رَجُلٌ مُّخَبَلٌ۔ دیوانہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّنْ

کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی حقیقت کو جانتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ تمہارے باطن امور سے واقف ہے۔ اور بعض نے خَبِيرٌ بمعنی مُّخْبِرٌ کہا ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿فَيَنْبِئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۶۲-۸) پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتا دے گا سے مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَنَبِّئُوا أَخْبَارَكُمْ﴾ (۴۷-۳۱) اور تمہارے حالات جانچ لیں۔

﴿قَدْ نَبَأْنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ﴾ (۹-۹۴) خدا نے ہم کو تمہارے سب حالات اللہ نے بتا دیئے ہیں۔ یعنی تمہارے احوال سے ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے۔

(خ ب ن)

اَلْخَبْنُ: روٹی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَحْمِلْ فَوْقَ رَأْسِيْ خُبْنًا﴾ (۱۲-۳۶) کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔ اَلْخَبْنَةُ: نان کو ماج۔ اَلْخَبْنُ: (مصدر) روٹی بنانا۔ اِخْتَبَنَ: (افتعال) روٹی بنانے کا حکم دینا۔ اَلْخَبَانَةُ: نانہالی کا پیشہ۔

استعارہ کے طور پر خُبْنُ کے معنی سخت ہکانے کے بھی آ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہانکنے والا بھی اسی طرح ہاتھ مارتا ہے جیسے روٹی بنانے والا کرتا ہے۔

(خ ب ط)

اَلْخَبَطُ: (ض) کے معنی کسی چیز کو اندھا دھند

بنا پر جو یا گہیوں کی بالی کے چھلکے کو بھی خِباء کہا جاتا ہے۔
قرآن میں ہے:
﴿كُلَّمَا حَبَّبْتَ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا﴾ (۱۷-۹۷) جب
اس کی آگ بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو عذاب دینے کے
لئے اور بھڑکا دیں گے۔

(خ ت ر)

الْخَتَرُ: اصل میں اس غداری کو کہتے ہیں جسے اس
قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان کمزور پڑ جائے اور اس
کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں قرآن پاک میں ہے:
﴿كُلُّ خَتَارٍ كَفُورٍ﴾ (۳۱-۳۲) جو عہد شکن اور
ناشکرے ہیں۔

(خ ت م)

الْخَتْمُ وَالطَّبْعُ: کے لفظ دو طرح سے استعمال
ہوتے ہیں کبھی تو خَتَمْتُ اور طَبَعْتُ کے مصدر ہوتے
ہیں اور اس کے معنی کسی چیز پر مہر کی طرح نشان لگانا کے
ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا
ہے۔

مجازاً کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کر
لینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے۔ جیسا کہ کتابوں یا

دُونُكُمْ لَا يَأْتُونَكُمْ خَبَالًا ﴿ (۳-۱۱۸) مومنو!
(کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا راز دان نہ بنانا۔ یہ
لوگ تمہاری خرابی (اور فتنہ انگیزی کرنے) میں کسی طرح
کی کوتاہی نہیں کرتے۔
﴿وَمَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا﴾ (۹-۳۷) تو تمہارے
حق میں شرارت کرتے۔

اور حدیث میں ہے ❶

(۱۰۶) مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ ثَلَاثًا كَانَ حَقًّا عَلَى
اللَّهِ أَنْ يَسْقِيَهُ مِنْ طِيَّةِ الْحَبَالِ: جو شخص تین مرتبہ
شراب پئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے لازماً دوزخیوں کی پیپ
پلائے گا۔

زہیر نے کہا ❷ (طویل)

(۱۳۰) هُنَالِكَ إِنْ يَسْتَحْبِلُوا الْمَالَ يَخْبِلُوا
یعنی ایسے موقعہ پر اگر ان سے مال مانگا جائے تو وہ مال
دے دیتے ہیں۔

(خ ب و)

حَبَّتِ (ن) النَّارُ: آگ کا شعلہ افسردہ ہو گیا اور
اس پر راکھ کا خِباء یعنی پردہ سا آ گیا۔ اصل میں خِباء
اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ اسی

❶ الحدیث باختلاف الفاظ فی النسائی عن ابن عمرو وحم ق ہ ن عن ابن عمرو (ہ عن ابی ہریرۃ) و(طب عر ابن عمرو) و الترمذی
عن ابن عمرو ورد (ہ عن ابن عمرو) راجع الفتح الکبیر ج ۳: ۲۰۱-۲۰۲)۔

❷ قالہ زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی وتمامہ وان یستلوا یعطوا وان یرسروا یغلوا والبیت فی اللسان (خیل، حول) وفی روایۃ
الطبری ۲۳-۲۴/۷۱۹۹ (۲۷۸) وان یستحلوا یخولوا بدل یستحلوا و یخولوا کذا فی روایۃ ابی عبید فی غریبہ والعسکری فی
الصناعتین وعدہ من جید المدیح قال فی الامالی (۲: ۱۵۴) ومانیالی مدح بہذین البیتین الایمدح بغیرہما والبیت فی مختار
الجاهلی بشرح المصطفیٰ السقا (۱: ۱۶۳) والمختارات ۶۲ و العمدۃ (۲: ۱۲۷) و نقد الشعر ۳۳ فی سبعة آیات والبحر
(۷: ۱۴۳) والعقد الثمین ۹۱ والمعانی الکبیر ۵۲۹ والسیوطی ۱۰۸ قال فی اللسان والاختیال اعطاء البعیر والناقۃ للکرب
واستخبل ای استعارمنہ والاصمعی وابو عبیدۃ فی ر: بہما عن ابی عمرو انکر الاستخبال وغیرہما اثبتہ والمعانی للقبتی (۵۴۰)۔

دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُطْعَمَنَّ مِنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے..... اس کا کہنا نہ ماننا۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ﴾ (۱۷-۳۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً﴾ (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں اغْفَالٌ كَيْنٌ اور قَسَاوَةٌ سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔

جہاں کہتے ہیں ۱۰ کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے ان کے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامت سے بے نیاز ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (۳۶-۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ

دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُطْعَمَنَّ مِنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے..... اس کا کہنا نہ ماننا۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ﴾ (۱۷-۳۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً﴾ (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں اغْفَالٌ كَيْنٌ اور قَسَاوَةٌ سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔

جہاں کہتے ہیں ۱۰ کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے ان کے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامت سے بے نیاز ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (۳۶-۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ

دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُطْعَمَنَّ مِنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے..... اس کا کہنا نہ ماننا۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ﴾ (۱۷-۳۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً﴾ (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

میں اغْفَالٌ كَيْنٌ اور قَسَاوَةٌ سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔

جہاں کہتے ہیں ۱۰ کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے ان کے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامت سے بے نیاز ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (۳۶-۶۵) آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ

۱۰ ہوابو علی محمد بن عبد الوہاب الحبائی المتوفی ۳۰۳ھ والحباء مثل رمان کورہ بخوزستان من نواحی الاہواز بین فارس وواسطہ والنضرة منها (التاج)۔

اللَّحْمُ: جسم کا لاغر ہو کر تھری دار ہو جانا خَدْوُتُهُ کسی کو دبلا کرنا۔ اس کا مطاوع تَخَدَّدَ آتا ہے۔

(خ د ع)

الْخَدَاعُ کے معنی جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس چیز سے پھیر دینا جس کے وہ درپے ہو اور آیت کریمہ:

﴿يُخَدِّعُونَ اللَّهَ﴾ (۲-۹) یہ (اپنے پندار میں) خدا کو حکم دیتے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ﴾ (۲۸-۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔

اور ان کے اس فعل کی شناخت اور آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خِدَاع سے تعبیر کیا ہے۔

اور اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں يُخَادِعُونَ رَسُولَ اللَّهِ ہے۔ پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے

کلام نہیں کر سکیں گے۔ اور آیت (۳۳-۴۰) میں آنحضرت ﷺ کو خَاتَمَ النَّبِيِّينَ فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کو مکمل کر دیا ہے۔ (اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَخِتَامُهُ مِسْكٌ﴾ (۸۳-۲۶) جس کی مہر مسک کی ہوگی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ خِتَامُ کے معنی مَا يُخْتَمُ بِہ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا آخری لطف اور برتن میں باقی ماندہ چھوٹ مسک کے طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی۔ مگر یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ شراب کو بذات خود لذیذ ہونا چاہیے اگر وہ بذات خود لذیذ نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

(خ د د)

الْخَدُّ وَالْأَخْدُوْدُ کے معنی ہیں زمین میں مستطیل اور گہرا گڑھا الْأَخْدُوْدُ کی جمع أَخَادِيدُ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قَتَلَ أَصْحَابُ الْأَخْدُوْدِ﴾ (۸۵-۴۰) کہ خندقوں کے (کھودنے) والے ہلاک کر دیئے گئے۔

اصل میں خَدُّ الْإِنْسَانِ کے معنی انسان کے رخسار کے ہیں ۱ اور استعارۃً زمین اور دوسری اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ لفظ وجہ (چہرہ) ہے تَخَدَّدَ

۱ وَلَا تُصَغِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۱۸:۳۱) ای لا تعرض عنهم استكباراً.

بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔ خَدَعَ الرِّيقُ: منہ سے تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔ اَلْأَخْدَعَانِ: گردن کی دو رنگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے خَدَعَتْهُ: میں نے اس کی اخدع رگ کو کاٹ دیا۔ حدیث میں ہے ⑤

(۱۰۷) بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ سِنُونُ خَدَّاعَةَ: کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بدلتے رہیں گے۔

(خ دن)

اَلْخَدْنُ: کے معنی مصاحب اور رفیق کے ہیں۔ مگر عام طور پر اس مصاحب پر بولا جاتا ہے جو جنسی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کے ساتھ رہتا ہو اسی سے خَدْنُ الْمَرْثَةِ وَخَدِينُهَا کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے آشنا کے ہیں۔ اَلْخَدْنُ کی جمع أَخْدَانٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَتَّخِذَاتِ أَخْدَانَ﴾ (۳-۲۵) اور شاعر کے قول ⑥

(۱۳۱) "خَدِينُ الْعُلَى"

وہ بلند یوں کا ساتھی ہے۔

میں بلند یوں کے لئے خَدِينٌ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ يَعَشُّقُ الْعُلَى: (وہ بلند یوں پر عاشق ہے) يُشَيِّبُ بِالْبَدْنِ (وہ سخاوت کے ساتھ تشبیہ کرتا

کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ بتانا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَ﴾ میں بیان ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (۳-۱۳۲) اور وہ انہی کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیسا کہ آیت وَمَكْرُؤًا وَمَكْرَ اللَّهُ میں ہے۔ خَدَعَ الضَّبُّ: گوہ کا اپنی بل میں داخل ہو جانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھوتیا رہتا ہے۔ جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس لیتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے اَلْعَقْرَبُ بَوَّابُ الضَّبِّ: کہ بچھوتیا گوہ کا دربان ہے۔

چونکہ اہل عرب کے ہاں ضَبُّ کی مکاری ضربُ اَلشَّ تھی اس لئے کہا گیا ہے ⑦ (مثل) هُوَ أَخْدَعُ مِنَ الضَّبِّ کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طَرِيقُ خَادِعٌ وَخَدِيعٌ: گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کو دھوکہ دیتا ہے۔ اَلْهَدْعُ: بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ گویا اس

① راجع للمثل المبدائی رقم ۱۳۷۳ والحيوان ۶: ۴۳، ۷/۴۵، ۱۰ واللسان (خدع) .

② الحديث باختلاف الفاظ في النهاية (خدع) وغريب ابى عبيد (وفي تاويله اختلاف وفي المحكم (خدع) ان قبل الساعة سنين خداعة واللائق مع السمط ۱۲۷ وفيه ان قبل الدجال سنين خداعة اى قاطعة الزكوة او قليل المطر كذافي الفائق ۲: ۱۰۷ وفيه ايضا بين يدى الساعة سنين خداعة اى يكثف فيها المطر ويقل النبات .

③ لم اجده ويرجى ۱۲ .

﴿كَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ﴾ (۲۲-۳۱) تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے۔ ﴿فَخَرَّ عَلَيْهِمْ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ (۱۶-۲۶) اور چھت ان پر ان کے اوپر سے گر پڑی۔ اَلْخَرِيرُ: پانی وغیرہ کی آواز کو کہتے ہیں جو اوپر سے گر رہا ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿خَرُّوا سُجَّدًا﴾ (۳۲-۱۵) تو سجدے میں گر پڑتے ہیں خَرُّوا کالفظ دومعنوں پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی (۱) گرنا اور (۲) ان سے تسبیح کی آواز کا آنا۔ اور اس کے بعد آیت وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ سے تشبیہ کی ہے کہ ان کا سجدہ ریز ہونا اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ تھا نہ کہ کسی اور امر کے ساتھ۔

(خ ر ب)

خَرَبَ الْمَكَانَ خَرَابًا کسی جگہ کا اجاز ہونا۔ یہ عَمَارَةٌ (آباد ہونا) کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَآ﴾ (۲-۳) اور انگی ویرانی میں سائی۔

اَخْرَبَهُ وَخَرَبَهُ: ویران کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵۹-۲) کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاز نے لگے۔

وہ اپنے ہاتھوں سے اس لئے ویران کرتے تھے تاکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے کام نہ آئیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بربادی ان کی جلاوطنی کی وجہ سے

ہے) يَنْسِبُ بِالْمَكَارِمِ: (اس کا نسب مکارم سے ملتا ہے) وغیرہ استعارات ہیں۔

(خ ذ ل)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا﴾ (۲۵-۲۹) اور شیطان انسان کو عین موقعہ پر دعا دینے والا ہے۔

اَلْخَذُولُ: (میخہ مبالغہ) بہت زیادہ خُذْلَان یعنی دعا دینے والا۔ اَلْخُذْلَانُ ایسے شخص کا عین موقعہ پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانا جس کے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا اسی بنا پر کہا جاتا ہے: خَذَلْتِ الْوَحْشِيَّةُ وَلَدَهَا: وحشی گائے نے اپنے بچہ کو چھوڑ دیا۔ تَخَذَلْتِ رَجُلًا فُلَانٌ اس کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں اسی سے آئی نے کہا ہے ﴿الرمل﴾

(۱۳۲) بَيْنَ مَغْلُوبٍ تَلِيْلِ خَدِّهِ وَخَذُولِ الرَّجُلِ مِنْ غَيْرِ كَسْحٍ (بعض مغلوب ہو کر رخسارے کے بل گر پڑے ہیں اور بعض کی ٹانگیں بدوں بے حسی کے جواب دے چکی ہیں۔ رَجُلٌ خَذَلَهُ بَسْ آدَى۔

(خ ذ ر)

خَرَّ (نض) خَرِيرًا کے معنی کسی چیز کے آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ﴾ (۳۳-۱۳) جب عصا گر پڑا تب جنوں کو معلوم ہوا۔

① قاله الاعشى في قصيدة طويلة في ديوانه (۳۸-۴۲) يمدح فيها اياس بن قبيصة الطائي وفي رواية اللسان والمحكم (كسح) خذل وصدره كحل وضاح كريم حده۔ وفي رواية ص و س صدره بين مغلوب بنيل حده كذا رواه ابن بري واما رواية المؤلف فلم ارها الا في بعض هوامش ديوانه ۱۶۳ و يروي: قليل والبیت فی اللسان (خذل) وديوانه ۴۱ و غريب ابى عبيد (۴: ۲۸۳) ۱۲۔

فرمایا: تو بہشت سے اتر جا۔ تجھے شایاں نہیں کہ یہاں غرور

تھی۔

کرے۔ پس نکل جا۔

﴿وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَةٍ مِنْ أَعْمَامِهَآ﴾ (۴۱۔

۴۷) اور نہ پھل گا بھوں سے نکلتے ہیں۔

﴿فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ﴾ (۳۰۔ ۱۱) تو کیا

نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔ ﴿يُرِيدُونَ أَن يُخْرَجُوا مِّنَ

النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا﴾ (۵۔ ۳۷)

(ہر چند) چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر اس سے

نہیں نکل سکیں گے۔ اور اخراج کا لفظ زیادہ تر اعیان

کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿أَنَّا كُنْمُ

مُخْرَجُونَ﴾ (۲۳۔ ۳۵) تو تم (زمین سے) نکالے

جاؤ گے۔ ﴿كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ

بِالْحَقِّ﴾ (۸۔ ۵) جس طرح تمہارے پروردگار نے تم

کو تدبیر کے ساتھ گھر سے نکالا۔

﴿وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا﴾ (۱۷۔ ۱۲) اور

قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے۔

﴿أَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ﴾ (۲۷۔ ۵۶)

کہ لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے نکال دو۔ اور کبھی

اخراج بمعنی نکوین الہی بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِّنْ بَطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ﴾ (۱۶۔ ۱۷۸)

”اور اللہ ہی نے تم کو ماؤں کے شکم سے پیدا کیا۔“ ﴿فَأَخْرَجْنَا

الْخَرِبَةَ: کان میں وسیع چھید گویا اس سے کان میں خرابی

پیدا ہوگئی اور اقطع و قطعاًء کی طرح آخرب

وخرباء کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور تشبیہ کے طور

پر مشکیزہ کے سوراخ کو بھی خربۃ المزادۃ کہا جاتا ہے

جیسا کہ مجازاً اذن المزادۃ کا محاورہ استعمال ہوتا

ہے۔ اور خرابۃ کے معنی خاص کراؤٹوں کے چور کے

ہیں۔ الخرب (زرخرب) شتر مرغ کی قسم کا ایک پرند،

اس کی جمع خربان ہے کسی شاعر نے کہا ہے: ﴿(رجز)

(۱۳۳) أَبْصَرَ خِرْبَانَ فِضَاءً فَانْكَدَرَ

کہ وہ فضا میں سرخابوں کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

(خ ر ج)

خَرَجَ: (ن) خُرُوجًا کے معنی کسی کے اپنی قرار

گاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ

قرار گاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت

نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ﴾ (۲۸۔ ۲۱) موسیٰ

وہاں سے ڈرتے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا

ہوتا ہے۔

﴿فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ﴾ (۷۔ ۱۳)

① قاله الاصمعي والجمع خراب والحوهرى .

② قاله المعاج فى مشطوره بمدح فيها عمر بن عبيد الله بن معمر التميمي وكان قد وجهه عبدالملك الى ابى فديك الحرورى حين خرج عليه وقبله : تفضى البازى اذالبازى كسر - وفى رواية أنس بدل ابصر والشطر فى الطبرى (٦٩:٩) (٦٥:٣٠) واللسان (كذا) وديوانه ، (طبعة ليك ١٩٠٣ء) رقم البيت ٧٦ والبيت من شواهد ابى عبيده فى مجازة تحت قوله واذالنعوم انكدرت (تكوبر: ٧٢) والشطر الاول فى ابن الشجرى (٣٨٩:١) والاتضاب ٤١٣ والامالى (١٧١:٢) والشطر فى المسط ٧٩ والبحر (٤٣٠:٨) وفيه فلاة بدل فضاء ١٢ .

معاورہ ہے۔ اَلْعَبْدُ يُؤَدِّي خَرْجَةَ غَلَامِ ابْنِي آدَمِي سے مقرر حصہ ادا کرتا ہے۔ وَالرَّعِيَّةُ تُؤَدِّي اِلَى الْاُمَيْرِ الْخَرَاجُ رِعِيَتِ حَاكِمِ كَوْلْكَانِ ادا کرتی ہے۔ اَلْخَرْجُ (ايضا) بادل کی ایک قسم ہے۔ اس کی جمع خُرُوجُ آتی ہے ایک روایت میں ہے ❶

(۱۰۷) اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ: یعنی مال بائع سے جو فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ بیع کی اس ضمانت کے عوض سمجھا جائے گا جو اس سے ساقط ہو چکی ہے۔

اَلْخَارِجِي: وہ شخص جو بذات خود اپنے ہمسروں کی صفات سے باہر نکل جائے اگر یہ خروج کسی اعلیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو بطور مدح بولا جاتا ہے اور اگر ادنیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو لفظ بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح کہ فُلَانٌ لَيْسَ بِاِنْسَانٍ: یعنی کسی سے انسانیت کی نفی کبھی بطور مدح ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❷

(۱۳۴) فَلَسْتُ لِاَنَسِي وَلَكِنْ كَمَلَاكِ

تَنْزَلٌ مِنْ جَوِّ السَّمَاءِ يَصُوبُ

تم انسان نہیں ہو بلکہ فرشتہ کی مثل ہو جو آسمان کی بلندی سے زمین پر اتر آئے۔

اور کبھی مذمت کے لئے۔ جیسے فرمایا:

بِهَ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتِ شَتِي ﴿۵۳-۳﴾ پھر اس نے انواع و اقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

﴿يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهُ﴾ (۲۱-۳۹) اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

التَّخْرِيجُ: (تفعلیل) یہ عام طور پر علوم و صناعات کی ایجاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور جو کچھ

حیوان کے اوجھ سے نکلتا ہے۔ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو خَرْجُ وَّخَرَاجُ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ﴾ (۲۳-۷۲) کیا تم ان سے (تبلیغ کے سلسلے میں) کچھ مال

مانگتے ہو تو تمہارے پروردگار کا مال بہت اچھا ہے۔ یہاں خراج کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اس

بات پر تشبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ نے اسے لازم و واجب کیا ہے۔ اور خَرْجُ خَرَاجُ سے عام ہے کیونکہ خَرْجُ

کا لفظ دَخْلُ (آمدنی) کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا﴾ (۱۸-۹۳) بھلا ہم آپ کے لئے خراج (کا انتظام) کر دیں۔

مگر خَرَاجُ کا لفظ عموماً زمین کے لگان پر بولا جاتا ہے

❶ الحدیث مروی مختصراً مطولاً راجع ابو داؤد و الترمذی ۲: ۲۶۰-۲۶۱ مع التحفة والنسائی وابن ماجہ راجع لتخريجه الرسالة رقم ۱۲۳۲ مع التحقيق احمد شاکر و کنز العمال ۴ رقم ۵۰۵ وابن حبان فی زوائده رقم ۱۱۲۵، ۱۱۲۶۔

❷ اختلافوا فی نسبة هذا البيت قال المعینی (۴: ۵۲۴) قاله رجل من عبد القیس یمدح النعمان وقيل هولابی وجزء یمدح عبد الله بن الزبير ونسبه الاعلم فی هامش الكتاب ۲: ۳۷۹) الى علقمة والبيت من شواهد الطبری (۱: ۱۴۸، ۱۹۸) وراجع للبيت ايضاً الصحاح والتاج (الک، ملک، صوب) و القرطبی (۹: ۱۸۳)، و امالی ابن الشعری ۲: ۲۰۲، ۲۹۲) والاشفاق (۱۷) والمجازلابی عیلمة (۱: ۳۳) ومختار الشعر الجاهلی و تهذيب الاصلاح (۱: ۱۲۶) والبحرہ ۴: ۳، ۳۰۴، ۱، ۱۳۷) وابن خالويه ۸۳ وابن الاباری فی السبع ۵۲۲ والبيت من كلمة مفضلية من زيادات المزروقي ۲: ۱۹۴ و صدره ولست يحبتي ولكن ملائماً ۱۲۔

اور اس قسم کی بات کہنے والے کو بھی جھوٹا کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ واقع کے مطابق ہی کیوں نہ بات کرے جیسا کہ منافقین کے بارے میں فرمایا:

﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ (۱۶۳-۱۷۱) اے محمد! ﷺ جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دل سے نہ اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔

(خ ر ط)

الْخُرْطُومُ: اس کے اصل معنی ہاتھی کی سونڈ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَنَسِمْهُ عَلَى الْخُرْطُومِ﴾ (۱۶-۱۷) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

میں انسان کی ناک پر خرطوم کا اطلاق کیا ہے تو یہ محض مذمت کے لئے ہے۔ یعنی اُسے نہ مٹنے والی عار لاحق ہوگی۔ یہ جِدَعَتِ أَنْفَهُ کی طرح کا محاورہ ہے۔

(خ ر ق)

الْخَرْقُ: (ض) کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے نگانے کے لئے پھاڑ ڈالنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَخْرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا﴾ (۱۵-۱۷) کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ مسافروں کو غرق کر دیں۔

خَرْقُ خَلْقٍ کی ضد ہے جس کے معنی اندازہ کے

﴿إِنَّ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ﴾ (۲۵-۲۴) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔

الْخَرْجُ: دور تک سیاہ و سپید (درہم) اسی سے کہا جاتا ہے۔ ظَلِيمٌ أَخْرَجُ وَنِعَامَةٌ خَرَجَاءُ: اہل شتر مرغ۔ اَرْضٌ مُخْتَرِجَةٌ: زمین کے جائے ازاں باگیاہ و جائے بے گیاہ باشند۔ اور الْخَوَارِجُ کو خوارج اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ امام کی اطاعت سے باغی ہو گئے تھے۔

(خ ر ص)

الْخَرِصُ: پھلوں کا اندازہ کرنا اور اندازہ کئے ہوئے پھلوں کو خَرِصَ کہا جاتا ہے یہ بمعنی مَنْخَرُوصٌ ہے۔ جیسے نَقْضٌ بِمَعْنَى مَنْقُوضٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ خَرِصٌ بمعنی کذب آجاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿إِنَّ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ (۳۳-۲۰) یہ تو صرف انگلیں دوڑارے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ يَخْرُصُونَ بمعنی يَكْذِبُونَ ہے یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ﴾ (۵۱-۱۰) انکل کرنے والے ہلاک ہوں۔

کے معنی بقول بعض یہ ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، اصل میں ہر وہ بات جو ظن و تخمین سے کہی جائے اسے خَرِصَ کہا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اندازہ غلط ہو یا صحیح۔ کیونکہ تخمینہ کرنے والا نہ تو علم یا غلبہ ظن سے بات کرتا ہے، اور نہ سماع کی بنا پر کہتا ہے۔ بلکہ اس کا اعتماد محض گمان پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تخمینہ کرنے والا پھلوں کا تخمینہ کرتا ہے

میں ہے۔^①
 (۱۰۸) مَا دَخَلَ الْخَرَقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ:
 جس چیز میں نادانی کا عمل دخل ہو تو وہ عیب ناک ہو جاتی
 ہے اور خَرَقٌ سے مَخْرَقَةٌ کا لفظ لیا گیا ہے^② جس کے
 معنی کسی کام میں حیلہ جوئی کے لئے بے دقتی کا اظہار
 کرنے کے ہیں۔

الْمَخْرَاقُ: کپڑے کا کوڑا جس سے بچے کھیلتے ہیں گویا
 اسے بھی کسی چیز کو واقع کے خلاف ظاہر کرنے کے لئے بنایا
 جاتا ہے۔

خَرَقَ الْغِزَالَ: ہرن کا نادانی کی وجہ سے دوڑ نہ سکتا۔

(خ ز ن)

الْخَزْنُ: کے معنی کسی چیز کو خزانے میں محفوظ
 کر دینے کے ہیں۔ پھر ہر چیز کی حفاظت کے معنی میں
 استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے بھید وغیرہ کی حفاظت کرنا اور
 آیت:

﴿وَأَنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ﴾ (۱۵-۲۱)
 اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں۔

﴿وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۲۳-۷)
 حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے ہیں۔ میں
 اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے
 جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یا اس معنی کی طرف
 اشارہ ہے۔ جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ^③

مطابق خوش سلوپی سے کسی چیز کو بنانا کے ہیں۔ اور
 خَرَقٌ کے معنی کسی چیز کو بے قاعدگی سے پھاڑ ڈالنے کے
 ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَخَرَقُوا لَهُ بَنِينَ
 وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶-۱۰) اور بے سمجھے (جھوٹ
 بہتان) اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا گھڑی ہیں۔

یعنی بے سوچے یہ بات کہتے ہیں۔ پھر معنی قطع کے اعتبار
 سے کہا جاتا ہے: خَرَقَ الثُّوبُ وَخَرَقَهُ: کپڑے کو
 پھاڑ ڈالنا خَرَقَ الْمَفَاوِزَ رِجْمَانَ طے کئے۔
 اخْتَرَقَ الرَّبِيعُ: ہوا کا چیز چلنا۔

الْخَرَقُ وَالْخَرِيقُ: خاص کر کشادہ بیابان کو کہا جاتا ہے
 اس لئے کہ وہ وسیع ریگستان کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا
 ہے۔

الْخَرَقُ: (خاص کر) کپڑے میں سوراخ اور کان میں
 کشادہ سوراخ۔ صَبِيٌّ أَخْرَقُ وَامْرَأَةٌ خَرَقَاءُ: جس
 کے کان کشادہ چھید ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ﴾ (۱۷-۳۷) کی تفسیر
 میں دو قول ہیں (۱) یہ کہ تو زمین کو طے نہیں کر سکے گا۔ (۲)

یا یہ کہ تو زمین کو اپنے پاؤں سے پھاڑ نہیں ڈالے گا۔ یہ
 دوسرا معنی خرق فی الاذن سے ماخوذ ہے اور بے سوچے
 سمجھے کام کرنے کے اعتبار سے احمق اور نادان شخص کو
 اخْرَقٌ وَخَرِيقٌ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث خرقاء ہے۔
 اور تند ہوا کو بھی خرقاء کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت

① الحدیث فی التاج والنہایة (خرق).

② قال الاضعی مولد (الحوہری) ۱۲۱.

③ راجع لحدیث فرغ اللہ باختلاف الفاظہ (والنہایة) وطس عن ابن مسعود والطبرانی عن ابی الدرداء وکنز العمال ۱: ۹۴ والفتح للنہانی ۲: ۲۶۶.

کے بدبودار ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہی
خَنَزَرَ (بہ تقدیم نون) کے ہیں۔

(خزئی)

خَزَيَّ (س) الرَّجُلُ رسوا ہونا۔ خواہ وہ رسوائی
انسان کو خود اس کی ذات سے لاحق ہو یا غیر کی طرف سے
پھر جو رسوائی اپنی جانب سے لاحق ہوتی ہے اسے حیائے
مفطرط کہا جاتا ہے اور اس کا مصدر خَزَيْتُ ہے۔ اس سے
صیغہ رصفت نَزَرَ خَزِيَانُ اور مؤنث خَزَيْتُ خَزَايَا۔

حدیث میں ہے ❶

(۱۱۰) اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَادِمِيْنَ:
اے خدا! ہمیں اس حالت میں زندہ نہ کرنا کہ ہم شرم اور
ندامت محسوس کرنے والے ہوں۔ اور جو رسوائی دوسروں
کی طرف سے لاحق ہوتی ہے وہ ذلت کی ایک قسم ہے۔
اور اس کا مصدر خَزَيْتُ ہے۔ اور رَجُلٌ خَزِيٌّ کے معنی
ذلیل آدمی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَهُمْ خَزْيٌ فِي الدُّنْيَا﴾ (۵-۳۳) دنیا میں ان کی
رسوائی ہے۔

﴿اِنَّ الْخَزْيَ الْيَوْمَ وَالسَّوْءَ عَلٰى الْكَافِرِيْنَ﴾
(۱۶-۲۷) کہ آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

﴿فَاذَقَهُمُ اللّٰهُ الْخَزْيَ الْحَيٰوَةِ الدُّنْيَا﴾ (۳۹-۲۶)
پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔

﴿لِنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخَزْيِ فِي الْحَيٰوَةِ الدُّنْيَا﴾
(۴۱-۱۶) کہ ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا

مزہ چکھائے۔

﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّزِلَ وَنَخْزِيْ﴾ (۲۰-۱۳۳) کہ

(۱۰۹) فَرَعَ رَبُّكُمْ مِنْ خَلْقِ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ
وَ الْاَجَلِ کہ خدا تعالیٰ مخلوق کی پیدائش کے رزق اور
اجل سے فارغ ہو چکا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاَسْقَيْنَاكُمُوْهُ وَمَا اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ﴾ (۱۵-۲۲)
اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا
خزانہ نہیں رکھتے۔

میں بعض نے خٰزِنِيْنَ کے معنی حٰفِظِيْنَ کئے ہیں۔
یعنی شکرگزاری سے تم اس کی حفاظت نہیں کر سکتے بعض
نے کہا کہ یہ آیت کریمہ:

﴿اَفَرَاَيْتُمُ الْمٰءَ الَّذِي تَشْرَبُوْنَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ
مِنَ الْمُنْزَنِ﴾ (۶۸، ۶۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جو
پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْخَزَانَةُ: یہ خازن کی
جمع ہے چنانچہ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:
﴿وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهُا﴾ (۳۹-۷۱) تو اس کے
داروغے اس سے کہیں گے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَايِنٌ
اللّٰهُ﴾ (۶-۵۰) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ
میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔ میں خَسْرًا اَسْنُ
اللّٰهُ سے وہ مقدمات الہیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے
لوگوں سے روک رکھی ہیں۔ کیونکہ لفظ خزن میں منع
کے معنی پائے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ
تعالیٰ کی وسیع جود اور قدرت مراد ہے۔ اور بعض نے اس
سے کلمہ کن مراد لیا ہے۔ خَزَانَ الدَّخْمِ کے اصل معنی تو
گوشت کی ذخیرہ اندوزی کے ہیں۔ لیکن کنایۃ گوشت

جاتا ہے۔ اور یہ صفات محمودہ سے ہے مگر دوسروں کی طرف سے بچنے سے ہون، ہوان اور ذل کہتے ہیں اور یہ مذموم سمجھی جاتی ہے۔

(ح س ۵)

خَسَاتُ الْكَلْبِ فَخَسًا: میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہو گیا۔ اور کسی کو دھتکارنے کے لئے عربی میں اِخْسَا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں کفار کے متعلق فرمایا:

﴿اِخْسَوْا فِيهَا وَلَا تَكْلُمُونَ﴾ (۲۳-۱۰۸) اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔
﴿فَقَلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ (۲-۶۵) تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ۔

اسی سے خَسَا الْبَصَرُ: کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں نظر در ماندہ ہو کر مفقوض ہو گئی۔

قرآن پاک میں ہے:
﴿خَاسِنًا وَهُوَ حَسِيرٌ﴾ (۶۷-۴) کہ وہ نظر در ماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

(ح س ۶)

الْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ: رَأْسُ الْمَالِ میں کمی آ جانا خسارہ کی نسبت کبھی انسان کی طرف ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے خَبِيرَ (س) فُسْلَانٌ فلاں نے نقصان اٹھایا۔ اور کبھی فعل کی طرف ہوتی ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے خَبِيرَتِ تِجَارَتِهِ اس کی تجارت خسارہ میں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَلْكَ إِذَا كَرَّةً خَاسِرَةً﴾ (۹-۱۲) یہ لوٹا تو (موجب) زیاں ہے۔

ہمارے ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے۔

اِخْزَى (افعال) یہ اِخْزَى اور اِخْزَايَةُ دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ لَا يَخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۶۶-۸) اس دن خدا پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کرے گا۔

کے دنوں معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اِخْزَى سے لینا نسب معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تَدْخِلُ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ﴾ (۳-۱۹۲) اے پروردگار! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا اسے رسوا کیا۔

میں اِخْزَيْتَهُ، اِخْزَايَةُ سے ہے مگر اِخْزَى سے بھی ہو سکتا ہے یہی معنی مندرجہ ذیل آیات میں مراد ہیں۔

﴿مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ﴾ (۳۹-۴۰) کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا۔

﴿وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۳-۱۹۴) اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔

﴿وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ﴾ (۵۹-۵) کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

﴿وَلَا تُخْزُونَ فِي ضَيْفِي﴾ (۱۱-۸۷) اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔ جس طرح

اِخْزَى دو قسم پر ہے یعنی رسوائی کبھی اپنی ذات کی طرف سے لاحق ہوتی ہے اور کبھی دوسروں کی طرف سے اسی

طرح ذل و هوان بھی دو قسم پر ہے جو ذلت انسان کو خود اس کی ذات کی جانب سے لاحق ہو اسے ہون و ذل کہا

میں ہو سکتا ہے کہ ماپ تول میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنے اور ظلم ترک کرنے کا حکم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہو جو قیامت کے دن میزان عمل میں کمی کا موجب ہوں جس کی وجہ سے آدمی ان لوگوں سے ہو جائے جن کے متعلق قرآن پاک نے: ﴿فَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ﴾ (۸-۱۰۱) کہا ہے۔ یہ دونوں معنی باہم لازم ملزوم ہیں۔ اور جہاں کہیں قرآن پاک میں ضمیر ان کا لفظ آیا ہے وہ اسی دوسرے معنی پر محمول ہے و نیوی کاروبار اور دیگر چیزوں میں نقصان اٹھانا مراد نہیں ہے۔

(خ س ف)

الْحُسُوفُ: کا لفظ چاند کے بے نور اور کُسُوفِ کا لفظ سورج کے بے نور ہونے پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خسوف قدرے بے نور ہونے کو کہا جاتا ہے۔ اور کُسُوفِ پوری طرح بے نور ہو جانے کو کہا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ سورج ہو یا چاند کہا جاتا ہے۔ خَسَفَهُ اللّٰهُ: اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا (متعدی) خَسَفَ هُوَ: (لازمی) زمین میں دھنس جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ﴾ (۲۸-۸۰) پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ ﴿لَوْ لَا أَنْ مَّنَ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا﴾ (۲۸-۸۲) اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔ حدیث میں ہے ①

(۱۱۱) إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَاتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ مال و جاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت و سلامتی، عقل و ایمان و ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالیٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ﴾ (۱۵-۳۹)

جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔ دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (۱۲۱-۲)

اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ..... أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (۲۷-۲)

جو خدا کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں..... یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

﴿فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (۳۰-۵)

مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَقِيمُوا الزَّوْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ (۹-۵۵)

اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔

① الحدیث فی الصحیحین و ابی داؤد والنسائی عن عائشة (صلوة الکسوف) والطیالسی عن انس و ابی البخاری والنسائی عن ابی بکرہ راجع الفتح النبہانی ج ۱ ص ۲۰۵-۲۰۶.

تیرے چہرے کے مقابلہ میں تو پتھر بھی ہشاش بشاش معلوم ہوتا ہے۔

الْمَخْشُوبُ: وہ چیز جس میں لکڑی ملائی گئی ہو۔ اور یہ رومی چیز سے کنایہ ہوتا ہے۔

(خ ش ع)

الْخُشُوعُ: (ن) کے معنی ضَرَاعَةٌ یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔ مگر زیادہ تر خُشُوع کا لفظ جوارح اور ضَرَاعَت کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے ①

(۱۱۲) إِذَا ضَرَعْتَ الْقَلْبُ خَشَعَتِ الْجَوَارِحُ جب دل میں فروتنی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا﴾ (۱۷-۱۰۹) اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔

﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ (۲۳-۲) جو نماز میں زیادہ عجز و نیاز کرتے ہیں۔

﴿وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ﴾ (۲۱-۹۰) اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔

﴿وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ﴾ (۲۰-۱۰۸) اور..... آوازیں پست ہو جائیں گی۔

﴿خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ﴾ (۲۸-۴۳) ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔

﴿أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾ (۷۹-۹) اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ زمین و آسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا:

لَا يَخْسِفَانِ لَمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے۔ اور عَيْنٌ خَاسِفَةٌ (اندر دھنسی ہوئی آنکھ) کا محاورہ خَسَفَ الْقَمَرُ سے منقول ہے بِئْسَ مَخْسُوفَةٌ: وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو اور چاند گہن لگنے سے چونکہ ماند پڑ جاتا ہے اس لئے بطور استعارہ خَسَفَ بِمَعْنَى ذَلَّتْ وَرَسَوَاتِي بھی آجاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

تَحَمَّلَ فُلَانٌ خَسْفًا: فلاں شخص ذلیل ہو گیا۔

(خ ش ب)

الْخَشَبُ: (موی لکڑی ج خُشْبُ) اور آیت

کریمہ:

﴿كَانَهُمْ خُشْبٌ مُسْتَدَّةٌ﴾ (۶۳-۴) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں۔

میں انہیں کما ہونے میں لکڑیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور خَشَبُ کے لفظ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا

ہے خَشَبْتُ السَّيْفَ: تلوار کو صیقل کرنا اور صیقل کے آلہ کو خشب کہا جاتا ہے۔ سَيْفٌ خَشِيبٌ: تلوار جو تازہ

صیقل کی گئی ہو۔ جَمَلٌ خَشِيبٌ: نیا اونٹ جو سدھایا نہ گیا ہو۔

تَخَشَّبَتِ الْإِبِلُ: لکڑی کھانا۔ سوکھی گھاس چرنا۔

جَبْهَةٌ خَشْبَاءُ: لکڑی کی طرح سخت اور کھر در پییشانی (کنایہ) بے حیا۔ جیسا کہ شاعر نے صحر یعنی چٹان کے

ساتھ تشبیہ دے کر کہا ہے (۱۳۵)

وَالصَّخْرُ هَشٌّ عِنْدَ وَجْهِكَ فِي الصَّلَابَةِ:

﴿يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشِيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشِيَةً﴾ (۷۷-۴) لوگوں سے یوں ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿الَّذِينَ يَلْعَنُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ﴾ (۳۳-۳۹) جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) بچپاتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

﴿وَكَيْفَ يَخْشَى الَّذِينَ﴾ (۹-۴)..... اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے۔

یعنی ان کو اپنے فقر کے خوف کا احساس ہونا چاہیے۔

﴿خَشِيَةً أَمَلًا﴾ (۲۱-۱۷) مفلسی کے خوف سے۔ یعنی اس اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو کہ یہ مفلس ہو کر ذلیل ہو جائے گی۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۳-۵۰) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

یعنی اس کے دل میں ایسا خوف ہو جو کہ معرفت الہی کا تقاضہ ہے۔

(خ ص ص)

التَّخْصِصُ وَالْإِخْتِصَاصُ وَالْحُصُوصِيَّةُ

والتَّخْصِصُ: کسی چیز کے بعض افراد کو دوسروں سے الگ کر کے ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا یہ الْعَمُومُ

والتَّعَمُّمُ والتَّعَمِيمُ کی ضد ہے۔

حُصَانُ الرَّجُلِ۔ جن پر خصوصی نوازش کرتا ہو۔

الْحَاصَّةُ: یہ عامتہ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ (۲۵-۸) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت

﴿إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا﴾ (۴-۵۶) جب زمین بھونچال سے لرزے لگے۔

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ (۱-۹۹) جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔

﴿يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا﴾ (۱۰۹-۵۲) جس دن آسمان لرزے لگے کپکپا کر۔ اور پہاڑ اڑنے لگیں (اون ہو کر)

(خ ش ی)

الْخَشِيَّةُ: اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے۔ یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (۳۵-۲۸) اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے

ہیں جو صاحب علم ہیں۔ میں خشیت الہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى وَهُوَ يَخْشَى﴾ (۸۰-۹، ۸) اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور (خدا سے)

ڈرتا ہے۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۳-۵۰) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

﴿فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا﴾ (۱۸-۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (بڑا ہو کر جو بد کردار ہوتا

کہیں) ان کو سرکش اور کفر میں پھنسا دے۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي﴾ (۱۵۰-۲) سوان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔

خَصَفٌ (وَخِصَافٌ) آتی ہے۔ اور خَصْفَةٌ (بِسُكُونِ صَادٍ) چڑے کے اس نکلنے کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس جیسا دوسرا نکلنا رکھ کر جوتا بنایا جائے خَصَفْتُ النُّعْلَ بِالْمُخَصَفِ: ستالی کے ساتھ جوتا سینا۔

ایک روایت میں ہے: ❶

(۱۱۳) كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْصِفُ نَعْلَهُ كَمَا رَسُلَ اللَّهِ ﷺ إِذَا جَازَا جُودًا خَصَفْتُ النُّعْلَةَ - زَبِيلُ بَنِي -

الْأَخْصَفُ وَالْخِصِيفُ: دو رنگ کا کھانا۔ اصل میں اس دودھ وغیرہ کو کہتے ہیں جو چڑے کے مشینے میں ڈالا جائے اور اس چڑے کا رنگ اسی کے ساتھ مل جائے۔ ❷

(خ ص م)

الْخَصْمُ: یہ خَصِيمَةٌ کا مصدر ہے جس کے معنی جھگڑنے کے ہیں کہا جاتا ہے: خَصَمْتُهُ وَخَاصَمْتُهُ مُخَاصَمَةً وَخِصَامًا: کسی سے جھگڑا کرنا قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِي أَنْخَصَمَ﴾ (۲۰۴-۲) اور وہ حالانکہ سخت جھگڑا ہو۔

﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ (۱۸-۲۳) اور جھگڑنے کے وقت بات نہ کر سکے۔

اور مُخَاصِمٌ کو خَصِيمٌ کہا جاتا ہے اور خصم کا لفظ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی مشنہ بھی آجاتا ہے۔ ❸

کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گناہ گار ہیں بلکہ سب پر واقع ہوگا۔

خَصَّهُ بِكَذَا وَاخْتَصَّهُ: کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ (۲-۱۰۵) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے۔ خِصَاصُ الْبَيْتِ: مکان میں شگاف کو کہتے ہیں۔ اسی سے خِصَاصَةٌ اس فقر اور احتیاج کو کہتے ہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔ اس قسم کے فقر کو خَلَّةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُؤْتِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خِصَاصَةٌ﴾ (۵۹-۹) اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔ لہذا آپ اسے خصاص سے ماخوذ قرار دے سکتے ہیں۔

الْخِصُّ: بانس یا کلدی کا جھوپڑا اور اسے خِصٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جھروکے نظر آتے ہیں۔

(خ ص ف)

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَطَفِقًا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ﴾ (۲۰-۱۲۲) یعنی آدم اور حوا اپنے اوپر خِصْفَةٌ یعنی درخت کے پتے چپکانے لگے اسی سے زَبِيلُ کو جو کھجوریں ڈالنے کے لئے کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا ہے اور گاڑھے کپڑے کو خِصْفَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع

❶ کلمة من حديث عائشة رواه الترمذی وفي كذا العمال (المفردات) ۷: رقم ۸۲۴ (حم - عن عائشة) وفي تخریج العراقي علی الاحیاء ۲: ۳۶۰ اخرجہ احمد من حدیث عائشة ورجاله رجال الصحیح ورواه ابو الشیخ ایضاً وابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۱۳۳ - ۲۱۳۵.

❷ قال الجوهری الخصیف اللبن الحلیب یصب علیہ الرائب فان جعل علیہ الثمر والسمن فهو العونبانی .

❸ قال الجوهری ومن العرب من یثنيه ویجمعه.

(خ ط ط)

الْحَطُّ: (مثل مَدُّ) جس میں طول ہو اہل ہندسہ کے نزدیک خطوط کئی قسم پر ہیں۔ یعنی مسطوح، مستدیر مقوس اور ممال وغیرہا اور ہر مستطیل علاقہ کو حَطُّ کہہ دیتے ہیں جیسے حَطُّ الْيَمِينِ: جو یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے جس کی طرف خطی نیزے منسوب ہیں اور زمین کا وہ حصہ جو انسان اپنے لئے مخصوص کرے اور کھودے اسے حَطُّ اور حِطَّةً کہا جاتا ہے۔

الْحَطِيظَةُ: وہ زمین جس کے ارد گرد بارش ہوئی اور وہ درمیان میں خط منحرف کی طرح بے بارش کے رہ گئی۔ اور الْحَطُّ کے معنی لکھنا، کتابت کرنا بھی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ﴾ (۲۹-۲۸) اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔

(خ ط ط)

الْحَطَأُ وَالْحَطَاةُ کے معنی صحیح جہت سے عدول

کرنے کے ہیں۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) کوئی ایسا کام بالا راہہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔ یہ خطا تام ہے جس پر مؤاخذہ ہوگا۔ اس معنی میں فعل حَطَىء يَخْطِئُ خَطْئًا وَخِطَاةً بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا﴾ (۱۷-۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مارا نا بڑا سخت جرم ہے۔

(۱۳۶) قَدْ أَعْسَفَ النَّازِحَ الْمَجْهُودَ مَعْسَفَةً

فِي ظِلِّ أَخْصَرَ يَدْعُوهَا مَهْ الْيَوْمُ

میں تاریک اور بھیا تک راتوں میں دور دراز راستوں میں سفر کرتا ہوں جو بے نشان ہوتے ہیں۔ اور سبزی اور شادابی کی وجہ سے عراق کے ایک حصہ کو سَوَادُ الْعِرَاقِ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿مُذْهَبًا مَّتَانًا﴾ (۵۵-۶۴) کے معنی سرسبز کے ہیں اور

خُضْرَةَ کی جگہ دُھمَّة کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی سیاہی کے ہیں۔ حدیث میں ہے ①

(۱۱۴) إِيَّاكُمْ وَخُضْرَاءَ الدِّمَنِ: تم کوڑی کی

سرسبزی سے بچو۔ اور خُضْرَاءَ الدِّمَنِ کی تفسیر بیان کرتے

ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: الْمَرْأَةُ الْحَسَنَةُ فِي

مَنْبَتِ السُّوءِ: یعنی خوبصورت عورت جو بد طبیعت ہو۔

الْمُخَاضِرَةُ: سبزیوں اور کچے پھلوں کی بیج کرنا۔

الْخَضِيرَةُ: کھجور کا درخت جس کی سبز اور شیم پختہ

کھجوریں جھڑ جائیں۔

(خ ض ع)

الْحُضُوعُ کے معنی خشوع یعنی جھکنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجُلٌ خُضِعْتُ لَهُ﴾ وہ شخص جو ہر ایک کے سامنے

عاجزی اور انکساری ظاہر کرتا پھرے۔

خَضَعْتُ اللَّحْمَ: میں نے گوشت کاٹا۔

ظَلِيمٌ أَخْضَعُ: شتر مرغ جس کی گردن میں پستی اور

جھکاؤ ہو۔

① رواہ الدارقطنی فی الافراد والرامهرمزی فی الامثال من حدیث الحدری قال الدارقطنی تفرده الواقدی وهو ضعیف (تخریج احياء للعراقی ۴۱:۲) والحديث مثل راجع الميدانی ۳۲:۱ والفاقی ۱۷۵:۱ وغریب ابی عبید الحصری ۱:۵۹.

فعل صادر ہو جائے۔ تو اس کے متعلق "أخطأ" کہا جاتا ہے اور اگر ارادہ کے مطابق وہ فعل صادر ہو تو اصاب کہتے ہیں۔ مگر کبھی أخطأ کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جس نے کسی غیر مستحسن فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کسی نازیبا کام کا ارادہ کیا ہو۔ لہذا أَصَابَ الْخَطَأَ وَالْخَطَأُ الصَّوَابُ وَأَصَابَ الصَّوَابَ وَالْخَطَأُ: ہر طرح کہنا درست ہوگا اور یہ لفظ مشترک ہے جو بہت سے معانی کا محتمل ہوتا ہے اس لئے جو شخص حقائق کا متلاشی ہو اسے اس کے متعلق خوب غور سے کام لینا چاہیے۔

الْخَطِيئَةُ: یہ قریب قریب سَيِّئَةٌ کے ہم معنی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَآحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ (۲-۸۱) اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔

لیکن زیادہ تر خَطِيئَةُ کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدور کا سبب بن جائے مثلاً کسی نے شکار کو نشانہ لگایا مگر نشانہ خطا ہو کر کسی انسان کو جا لگایا کسی مسکر چیز کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھا یہ سب دو قسم پر ہے ایک سبب منظور جیسے مسکر چیز پینا اس حالت میں جو فعل سرزد ہوگا وہ قابل گرفت ہوگا۔ دوم سبب مباح جیسے شکار کو نشانہ بنایا اس حالت میں اگر کوئی خطا سرزد ہوگی اس پر گرفت نہیں ہوگی اس قسم کی غلطی کے متعلق فرمایا:

﴿وَنَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَكِنْ

﴿وَأَنْ كُنَّا لَخَطِيئِينَ﴾ (۱۲-۱۹) اور بلاشبہ ہم خطا کرتے۔ (۲) ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔ کہا جاتا ہے۔

أَخْطَأَ يُخْطِئُ إِخْطَاءً فَهُوَ مُخْطِئٌ: اس میں اس کا ارادہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ❶

(۱۱۵) رُفِعَ عَنِ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنَّسِيَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھائے گئے ہیں۔ نیز فرمایا: ❷

(۱۱۶) مَنْ اجْتَهَدَ فَاخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ: جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ﴾ (۲-۹۲) اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو (ایک تو)..... غلام کو آزاد کر دے۔

(۳) غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہذا اس کا قصد مذموم ہوگا فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ❸

(۱۳۷) أَرَدْتُ مَسَاءً نَتَى فَأَجْرَتْ مَسْرَتِي وَقَدْ يَحْسُنُ الْإِنْسَانُ مِنْ حَيْثُ لَا يَدْرِي

(تو نے میری برائی کا ارادہ کیا لیکن مجھے خوشی حاصل ہوگی کبھی انسان نادانستہ طور پر بھی اچھا کام کر لیتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس شخص سے اتفاقاً ارادہ کے خلاف

❶ وفی روایة وضع وفی ابن عدی عن ابی بکر مرفوعاً رفع الله عن هذه هذا الامة ثلاثاً الخ قال الحافظ فی تخریجه ص ۱۳۲ رقم ۲۰۳ هذه من منكرات جعفر وفی روایة ابن ماجة والبيهقی وابن حبان عن ابن عباس ان الله تجاوز عن امتی (راجع المشكوة والآئی للسیوطی). ❷ لم احده. ❸ لم احده ويرجى ۱۲.

﴿وَلَا طَعَامَ إِلَّا مِنْ غِسْلِينَ ۝ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ﴾ (۶۹-۳۷) اور نہ پیپ کے سوا (اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گناہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔ مگر کبھی نفس گناہ پر بھی خاٹنہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ﴾ (۶۹-۹) اور وہ جو الٹی بستوں میں رہتے تھے سب گناہ کے کام کرتے تھے۔ یعنی وہ گناہ عظیم کا ارتکاب کرتے تھے جیسا کہ (بطور مبالغہ) شاعر شاعر کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ وہ قابل گرفت نہیں ہے ۱۰ مگر آیت کریمہ: ﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ﴾ (۲-۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔ میں وہی معنی مراد ہیں جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(خ ط ب)

الْخَطْبُ وَالْمَخَاطِبَةُ وَالْتَّخَاطُبُ: باہم گفتگو کرنا۔ ایک دوسرے کی طرف بات لوٹانا اسی سے خُطْبَةٌ اور خُطْبَةٌ کا لفظ ہے لیکن خُطْبَةٌ وعظ و نصیحت کے معنی میں آتا ہے اور خُطْبَةٌ کے معنی ہیں نکاح کا پیغام قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ﴾ (۲-۱۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو..... تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

اصل میں خُطْبَةٌ اسی حالت کو کہتے ہیں جو بات کرتے وقت ہوتی ہے جیسا کہ جِلْسَةٌ اور قَعْدَةٌ پھر خُطْبَةٌ سے تو خَطَابٌ اور خَطِيبٌ (دونوں لفظ استعمال

مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبَكُمْ﴾ (۳۳-۵) اور جو بات تم سے غلطی سے ہوگئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو (اس پر مواخذہ ہے) اور آیت کریمہ:

﴿وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا﴾ (۳-۲۲) اور جو کوئی قصور یا گناہ خود کرے۔

میں خَطِيئَتُهُ سے وہ فعل مراد ہے جو بلا قصد سرزد ہوا ہو اسی قسم کی خطا کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا۔ ﴿وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ﴾ (۲۶-۸۲) اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

خَطِيئَةُ کی جمع خَطِيئَاتٌ و خَطَايَا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ۖ إِنَّهَا خَطِيئَاتِهِمْ﴾ (۷۱-۲۵) اور ظالم لوگوں کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا (آخر) وہ اپنے گناہ کے سبب ہی۔

﴿إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا﴾ (۲۶-۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ بخش دے گا۔

﴿وَلَنَحْمِلَ خَطَايَاكُمْ وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ (۲۹-۳) ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ﴾ (۲-۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔

سے وہ مراد ہیں جو عمدائے کئے ہوں۔ اَلْحَاطِيءُ بِالْاِرَادَةِ گناہ کرنے والے کو کہتے ہیں جیسے فرمایا:

الْحَطَافُ: (۱) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔ (۲) آہن کج جس کے ذریعے کنوین سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے۔ (۳) وہ لوہا جس پر کنوین کی چرخی گھومتی ہے۔ ج خَطَاطِيفُ بازِ مُحَمَّدُفٌ: باز جو اپنے شکار پر تھپتا ہے۔
الْحَطِيفُ: تیز رفتاری۔ اَحْطَفُ الحَشَاوُ مَحْطَفَةٌ: مرد باریک شکم جس کے دہلا پن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انتڑیاں اچک لی گئی ہیں۔

(خ ط و)

خَطَوْتُ اَخْطُوْا کے معنی چلنے کے لئے قدم اٹھانے کے ہیں۔ خَطْوَةٌ ایک بار قدم اٹھانا۔ اَلْخُطْوَةُ: وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔
اَلْخُطْوَةُ: کی جمع خُطُوَاتٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ (۲-۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

یعنی شیطان کی اتباع نہ کرو۔ اور یہ آیت کریمہ:
﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ﴾ (۲۶-۳۸) اور خواہش کی پیروی نہ کرو۔
کی طرح ہے۔

(خ ف ف)

اَلْخَفِيفُ: (ہلکا) یہ ثقیل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اس کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔
(۱) کبھی وزن میں مقابلہ کے طور پر یعنی دو چیزوں کے باہم مقابلہ میں ایک کو خفیف اور دوسری کو ثقیل کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے دَرَهَمٌ خَفِيفٌ وَدَرَهَمٌ ثَقِيْلٌ: یعنی وہ درہم ہلکا ہے۔ اور یہ بھاری ہے۔

ہوتے ہیں مگر خُطْبَةٌ صرف خَاطِبٌ کا لفظ ہی بولا جاتا ہے۔ اور خُطْبٌ فعل دونوں معنی کے لیے آتا ہے۔

اَلْخُطْبُ: اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے مخاطب ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا خُطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ﴾ (۲۰-۹۵) پھر سامری سے کہنے لگے) کہ سامری تیرا کیا حال ہے۔
﴿فَمَا خُطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ﴾ (۵۱-۳۱) کہ فرشتو تمہارا مدعا کیا ہے۔

﴿فَصَلِّ الْخُطَابِ﴾ (۳۸-۲۰) دو ٹوک بات، فیصلہ کن بات جس سے نزاع ختم ہو جائے۔

(خ ط ف)

خَطَفَ يَخْطِفُ خَطْفًا وَاخْتَطَفَ اخْتِطَافًا کے معنی کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا کے ہیں۔

یہ باب (س ض) دونوں سے آتا ہے اور آیت کریمہ:
﴿إِلَّا مَنْ خَطَفَ الْخُطْفَةَ﴾ (۳۷-۱۰) ہاں جو کوئی (فرشتوں کی) بات کو (چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے۔

طا پر فتح اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد شیاطین ہیں جو چوری چھپے مالا اعلیٰ کی گفتگو کرتے تھے۔ نیز فرمایا:
﴿تَخْطِفُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوَىٰ بِهِ الرِّيحُ﴾ (۳۲-۳۱) پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر چھینک دے۔

﴿بِكَادِ الْبَرْقِ يَخْطِفُ ابْصَارَهُمْ﴾ (۲-۲۰) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں (کی بصارت کو) اچک لے جائے۔

﴿وَيَتَخَطَفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ (۲۹-۶۷) اور لوگ ان کے گرد و نواح سے اچک لئے جاتے ہیں۔ یعنی ان کے گرد و نواح میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے۔

مستعار ہے یعنی وہ کلام جو زبان پر ہلکی ہو اور آیت کریمہ: ﴿فَاسْتَحَفَّ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوهُ﴾ (۵۳-۳۳) غرض اس نے اپنی قوم کی عقل ماری اور انہوں نے اس کی بات مان لی۔ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنی قوم کو اکسایا کہ اس کے ساتھ تیزی سے چلیں اور یا یہ کہ انہیں اجسام و عزائم کے اعتبار سے ڈھیلا پایا اور بعض نے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ انہیں جاہل اور کم عقل سمجھا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ حَفَّتْ مَوَازِينُهُ﴾ (۹-۷) اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے۔

میں اعمال صالحہ کی کمی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا يَسْتَحْفَنُكَ﴾ (۶۰:۳۰) اور وہ تمہیں اوجھانہ بنا دیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ شہادت پیدا کر کے تمہیں تمہارے عقائد سے متزلزل اور برگشتہ نہ کر دیں۔

خَفُّوا عَن مَّوَازِينِهِمْ: وہ تیزی سے کوچ کر گئے۔

الْخُفُّ: موزہ۔ انسان کے موزہ سے تشبیہ دے کر خُفُّ النِّعَامَةِ وَالْبَعِيرِ (سپل شتر و م شتر مرغ) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(خ ف ت)

الْمُخَافَةُ وَالْخِيفَةُ پوشیدہ گفتگو کرتا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ﴾ (۱۰۳-۲۰) وہ آپس میں آہستہ آہستہ کہیں گے۔

﴿وَلَا تُخَافُ بَهَا﴾ (۱۱۰-۱۷) اور نہ آہستہ۔ کسی شاعر نے کہا ہے ۱

(۱۳۷) وَشَتَانَ بَيْنَ الْجَهْرِ وَالْمَنْطِقِ الْخَفَّتِ

کہ بلند اور پوشیدہ گفتگو میں بین فرق ہوتا ہے۔

(۲) اور کبھی تقابلی زمانی کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک گھوڑا جو نبی گھنڈہ میل کی مسافت طے کرتا ہو اور دوسرا پانچ میل فی گھنڈہ دوڑتا ہو تو پہلے کو خفیف (سبک رفتار) اور دوسرے کو ثقیل (ست رفتار) کہا جاتا ہے۔

(۳) جس چیز کو خوش آئند پایا جائے اسے خفیف اور جو طبیعت پر گراں ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے اس صورت میں خفیف کا لفظ بطور مدح اور ثقیل کا لفظ بطور مذمت استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات کریمہ:

﴿الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ﴾ (۶۶-۸) اب خدا نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔

﴿فَلَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ﴾ (۸۶-۲) سو نہ تو ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ اسی معنی پر محمول ہیں بلکہ ہمارے نزدیک آیت۔

﴿حَمَلْتُ حَمَلًا خَفِيفًا﴾ (۱۸۹-۷) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

(۴) جو شخص جلد پیش میں آجائے اسے خفیف اور جو پر وقار ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے خفیف صفت ذم ہوگی اور ثقیل صفت مدح۔

(۵) جو اجسام نیچے کی طرف جھکنے والے ہوں انہیں ثقیلہ اور جو اوپر کی جانب چڑھنے والے ہوں انہیں خفیفہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے زمین پانی وغیرہ کو اجسام ثقیلہ اور ہوا، آگ وغیرہ اجسام خفیفہ میں داخل ہوں گے۔

خَفَّ (ض) خَفًّا وَخَفَّةً وَتَخَفَّفَ: ہلکا ہونا۔ خَفَّفَهُ تَخْفِيفًا: ہلکا کرنا۔ اسْتَحَفَّفَهُ: ہلکا سمجھنا۔ خَفَّ الْمَتَاعُ سَامَانَ كَالهَلَاكَةِ هَوَانًا اسی سے کلام خَفِيفٌ عَلَيَّ اللِّسَانِ كَالْمَحَاوِرِ

۱ البيت في الصحاح واللسان (خفت) بغير عزو وصدرة: الخاطب جهراً اذ لهن تخافت ۱۲.

(خ ف ض)

الْخَفْضُ یہ رَفْع کی ضد ہے اور خَفْضُ کے معنی نرم رفتاری اور سکون و راحت بھی آتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَإِخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ﴾ (۲۴-۱۷) اور بجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ میں ماں باپ کے ساتھ نرم برتاؤ اور ان کا مطیع اور فرما بردار ہو کر رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ گویا یہ اَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ (کہ مجھ سے سرکشی نہ کرنا) کی ضد ہے اور قیامت کے متعلق فرمایا: ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (۳-۵۶) کسی کو پست کرے اور کسی کو بلند۔

کیونکہ وہ بعض کو پست اور بعض کو بلند کر دے گی پس خَافِضَةٌ میں آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ (۵-۹۵) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

(خ ف ی)

خَفِيَّةٌ (س) خَفِيَّةٌ الشَّيْءُ: پوشیدہ ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ (۷-۵۵) اپنے پروردگار سے عاجزی اور چپکے چپکے سے دعائیں مانگا کرو۔ الْخَفَاءُ: (مثل غطاء) کے معنی پردہ کے ہیں۔

خَفِيَّةٌ: میں نے اس سے پوشیدگی دور کر دی۔ یعنی ظاہر کر دیا۔ اَخْفَيْتُهُ پوشیدہ کرنا۔ چھپانا یہ ابتداء اور اعلان کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنْ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفَوْهَا

وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲-۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور وہ بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

﴿وَإِنَّا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ﴾ (۱-۶) جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔

﴿بَلْ يَدَّأَلُهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ﴾ (۶-۲۸) ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) ان پر ظاہر ہو گیا ہے۔

الْأَسْتِخْفَاءُ: چھپنا قرآن پاک میں ہے:

﴿أَلَا إِنَّهُمْ يَمْتَنُونَ صُدُورَهُمْ لَيَسْتَخْفُوا مِنْهُ﴾ (۱۱-۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ خدا سے پردہ کریں۔

الْخَوَافِي: پرند کے بازوں کے نیچے چھپے ہوئے پر۔ اس کا مفرد خَافِيَةٌ ہے اور یہ الْقَوَادِمُ کی ضد ہے۔

(خ ل ل)

الْخَلَلُ: دو چیزوں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو کہتے ہیں مثلاً بادل اور گھروں کے درمیان کا فاصلہ یا راکھ وغیرہ کا اندوئی حصہ اس کی جمع خِلَالٌ ہے۔ چنانچہ بادل کے متعلق فرمایا:

﴿فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ﴾ (۳۰-۲۸) تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے بارش برسنے لگتی ہے۔ اور گھروں کے متعلق فرمایا:

﴿فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ﴾ (۱۷-۵) اور وہ شہروں

پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ دو چیزوں کے درمیان رخنہ پڑ جاتا ہے۔

خَلَّ (ض) خَلًّا وَخِلَالًا لَلْحَمَّةِ گوشت کا دبلا اور کم ہو جانا۔ شاعر نے کہا ہے ①

(۱۴۰) إِنَّ جِسْمِي بَعْدَ خَالِي لَخَلَّ

کہ ماموں کے مرنے کے بعد میرا جسم گھل گیا ہے۔

الْخَلَّةُ ریگ زار کے اندر راستہ کو کہتے ہیں اور اسے خَلَّةٌ یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دشوار گزار ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ راستہ ریگ زار کے اندر سے گزرتا ہے۔ نیز ترش سرکہ کو بھی خَلَّةٌ کہتے ہیں۔ کیونکہ ترش اس میں سرایت کئے ہوتی ہے۔ الْخَلَّةُ تلوار کی نیام کا چمڑا جو اس کے اوپر منڈھا ہوا ہوتا ہے۔ نیام چونکہ اس کے اندر رہتی ہے اس لئے اس چمڑے کو خَلَّةٌ کہا جاتا ہے۔

الْخَلَّةُ (ایضاً) طبیعت کی خرابی یا عارضہ جو کسی چیز کی خواہش یا سخت احتیاج کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَلَّةٌ کے معنی حاجت اور خصلت بیان کئے جاتے ہیں۔

کے اندر پھیل گئے۔

شاعر نے کہا ہے ①

(۱۳۹) أَرَى خَلَلَ الرِّمَادِ وَمِیْضَ جَمْرِ

میں راکھ کے اندر آگ کے انگارے کی چمک دیکھتا ہوں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا أَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ﴾ (۹-۴۷) اور تم میں

دوڑے دوڑے پھرتے۔ یعنی چغل خوری اور فساد سے تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے۔

الْخِلَالُ: دانت وغیرہ صاف کرنے کا تیکا کہا جاتا ہے۔ خَلَّ سِنَّةً اس نے اپنا دانت صاف کیا۔ خَلَّ ثُوبَهُ کپڑے میں سوراخ کرنا۔ خَلَّ (ن) لِسَانَ الْفَصِيلِ اونٹ کے بچے کی زبان کو چھید کر تھوٹھی ڈالنا تاکہ اونٹنی کا دودھ نہ پی سکی۔

خَلَّ الرِّمِيَّةَ بِالسَّهْمِ نشانہ پر تیز مار کر سوراخ کر دیا۔ حدیث میں ہے: ②

(۱۱۷) خَلَّلُوا أَصَابِعَكُمْ (وضو میں انگلیوں کا خلال کیا کرو) الْخَلَّلُ فِي الْأَمْرِ کسی کام میں خرابی کا

① قاله بعض شعراء الامويين وتامه: اخاف ان يكون له ضرام - والبيت في اللسان (ضرم) ونسبه ابن بري لابي مریم وفي روايته خلل الرماد بدل خلال الرماد وفي تاريخ الطبري (۳۶: ۶) كتب نصر بن سيار الى مروان بن محمد وفي العقد (۴: ۴۷۷) ايلي هشام بن عبد الملك يخبره بخروج ابى مسلم الخراساني عليه والبيت ايضا في الاخبار الطوال لابي حنيفة الدينوري المتوفى ۲۸۲ھ في خمسة ابیات كذا في مجموعة المعاني ۱۱۲ وعزاه لابي مریم النحلي وفي محاضرات المؤلف (۳: ۱۷۷) معزولابي مهيم والبيت ايضا في الاغانى (۶: ۱۲) وفيه واحربان بدل احازران وفي ابن عساکر (۴: ۱۹۱) خلیق ان وفي الاغانى (۶: ۱۲۸) انه ارسل الايات اى الوليد بن يزيد وفي العقد (۱: ۱۱۱) ناربدل جمر كذا في الاصول سوى العيون ۱: ۱۲۸).

② راجع (حم) عن ابن عباس و(قط) عن عائشة و(قط) عن ابي هريرة (الفتح للنبهاني ج ۲ ص ۹۰).

③ وصدرة فاستقنھا ياسواد بن عمرو والبيت في قصيدة حماسية لتابط شرافى رثاء خاله بعد ان اخذ بناه و مطلعها ان بالشعب الذى دون سلع - لقتيلاً دمه ما يطل - وفي نسبه اختلاف كبير نسبة ابو تمام في الحماسة لتابط شراً (۲: ۳۱۳-۳۱۹) المزوفى - والتبريزى الى خلف الاحمر ۲: ۶۰ وطبقات الشعراء لابن سلام ۹۷ وبعضهم الى ابن اخت تابط شرانم اختلف فى ابن اخته فقيل الشنفرى كما فى الاغانى (۵: ۱۶۲) وامالى المرئضى (۲: ۱۸۵) وذيله (۱: ۲۸۰) واللسان (خلل) قال فى السمط ۹۲۰ قوله بعد خالى يريداً احتيالى وقيل اراد بعد قتل خالى وفي امالى القالى (۲: ۲۷۸) الخلل الرجل النحيف الجسم وعده العلماء من الاضداد ۱۲.

ہے اور خُلَّة (دوستی) سے نہیں ہے۔ جو لوگ اسے حبیب پر قیاس کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے سے محبت کرنا تو جائز ہے اس لئے کہ محبت اس کی ثنا میں داخل ہے۔ لیکن خُلَّة دوستی جائز نہیں ہے کیونکہ خُلَّة کے معنی دوستی کے دل میں سرایت کر جانے کے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ❶

(۱۴۱) قَدْ تَخَلَّلَتْ مَسَلِّكَ الرُّوحِ مِنِّي

وَبِهِ سُمِّيَ الْخَلِيلُ خَلِيلًا

تم میرے لئے بمنزلہ روح کے ہو اور اسی سبب سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر مشہور محاورہ ہے۔ تَمَازَجَ رُوحَانًا: ہماری روحیں باہم مخلوط ہیں۔

اور محبت کے معنی حبِ قلب میں دوستی رچ جانے کے ہیں۔ یہ حَبِيبَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی حب پر مارنے کے ہیں۔ لیکن حَبِ اللہ تعالیٰ کے متعلق محبت کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد احسان اور مہربانی کے ہوتے ہیں لہذا یہی معنی خُلَّة سے مراد ہوں گے۔ کیونکہ اگر ایک میں یہ تاویل صحیح ہے تو دوسرے میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر حُب سے حَبَّة الْقَلْبِ مراد لینا اور خُلَّة سے اللہ تعالیٰ کے حق میں تخلل کا معنی لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ ان باتوں سے بلند ہے۔ ❷ اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَبِيعُ فِيهِمْ وَلَا خُلَّةٌ﴾ (۲۵۳-۲) جس میں نہ

۱۴۱ ال کا سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔

الْخُلَّةُ: مودت، دوستی، محبت اور دوستی کو خُلَّة یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دل کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اور یا اس لئے کہ وہ دل کے اندر داخل ہو کر اس طرح اثر کرتی ہے جس طرح تیر نشانہ پر لگ کر اس میں نشان ڈال دیتا ہے۔ اور یا اس لئے کہ اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔

خَالَتُهُ مُخَالَةً وَخِلَاةً فَهُوَ خَلِيلٌ: اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ (۳-۲۵) اور خدا

نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل کہا ہے کہ وہ ہر حال میں باری تعالیٰ کے محتاج تھے اور یہ احتیاج ویسے ہی ہے۔ جس کی طرف آیت:

﴿إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتُ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ﴾ (۲۸-۲۳)

میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے ❶

(۱۱۸) أَلْسَلَهُمْ اغْنِي بِالْإِفْتِقَارِ إِلَيْكَ وَلَا تَقْرُبِي

بِالْإِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ: اے اللہ! مجھے اپنی احتیاج کے ساتھ

غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے کسی دوسرے کا

محتاج نہ بنا۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلِيلٌ خُلَّة سے ہے اور اللہ کے حق

میں خُلَّة کے لفظ کے وہی معنی ہیں جو لفظ محبت کے ہیں

ابو القاسم اللیثی کا کہنا ہے ❷ کہ یہ خُلَّة (احتیاج) سے

❶ کتاب میں حوالہ نہیں لکھا۔

❷ راجع لاجوالہ فی (ذریعہ)۔

❸ قالہ بشار بن برد الاعمى والبيت فى ادب الدنيا والدين للماوردى ۲۹۰ والبحر ۳: ۳۴۸ ومحاضرات المؤلف ۳: ۱۲.

❹ قال البغدادي فى لىاب التاويل (۵۰۲: ۱) وخلة الله للعبدهى تمكينه من طاعته وعصمته وتوفيقه وستر خلله ونصره والثناء عليه ۱۲.

طرح اس میں تغیر نہیں ہوتا۔

اصل میں مُخَلَّدُ اسے کہتے ہیں جو عرصہ دراز تک باقی رہے اس بنا پر جس شخص میں باوجود بڑی عمر کے بڑھاپا نہ آئے اسے مُخَلَّدُ کہا جاتا ہے۔ اور جس جانور کے (رباعی) دانت نکلنے تک ثنایا دانت قائم رہیں اس مُخَلَّدَةُ کہا جاتا ہے۔ اور بطور استعارہ ہمیشہ رہنے والی چیز کے متعلق خلود کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۱۱-۲۳) یہی صاحب جنت ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

﴿أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۲-۸۱) تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں۔ اور وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

﴿وَمَنْ يَفْتُلْ مُؤْمِنًا مَّتَعِدًا فَجَزَاءُ هَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا﴾ (۴-۹۳) اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔ تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا۔ اور آیت کریمہ:

﴿يُطَوَّفُ عَلَيْهِمْ وَلَدَانٌ مُخَلَّدُونَ﴾ (۵۶-۱۷) نوجوان خدمت گار جو ہمیشہ (ایک ہی حالت میں) رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ علیٰ حالہ قائم رہیں گے اور ان کی حالت تبدیل نہیں ہوگی اور بعض نے اس کے معنی مُقَرَّطُونَ بِالْمُخَلَّدَةِ کئے ہیں یعنی بالیاں

کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن نہ تو حسنت کی خرید و فروخت ہوگی اور نہ ہی مودت کے ذریعہ حاصل ہو سکیں گی تو گویا یہ آیت:

﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَبِغُ فِيهِمْ وَلَا خِلالًا﴾ (۱۴-۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خِلالِک باب مفاعلہ سے مصدر ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ خَلِيلِک کی جمع ہے۔ کیونکہ اس کی جمع أَخِلَّةٌ وَخِلَالٌ دونوں آتی ہیں اور یہ پہلی آیت کے ہم معنی ہے۔

(خ ل ذ)

الْخَلْوُدُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں عرصہ دراز تک تغیر و فساد پیدا نہ ہو اہل عرب اسے خَلْوُد کے ساتھ متصف کر دیتے ہیں۔ مثلاً چولہے کے ان تین پتھروں کو جن پر دیگ چڑھائی جاتی ہے۔ ”خَوَالِدٌ“ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیر تک ایک جگہ پڑے رہتے ہیں نہ اس لئے کہ ان کو دوام و بقا حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے۔

خَلَّدَ يَخَلِّدُ خَلْوُدًا عرصہ دراز تک رہنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَخَلَّدُونَ﴾ (۲۶-۱۲۹) شاید تم ہمیشہ رہو گے۔ اور خَلَّدَ انسان کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو تازنگی ایک حالت پر قائم رہتا ہے اور دوسرے اعضاء کی

آیت کریمہ:
﴿فَلَمَّا اسْتَيْسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا﴾ (۱۲-۸۰)
جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔

میں خَلَصُوا کے معنی دوسروں سے الگ ہونا کے ہیں اور آیت کریمہ:
﴿وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴾ (۲-۱۳۹) اور ہم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

﴿إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾ (۱۲-۲۳) بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔ میں مخلص بندہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ تو یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل تھے چنانچہ تثلیث کے متعلق فرمایا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾
وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے اور مسلمانوں کے متعلق فرمایا:
﴿مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ (۵-۹۸) کہ اخلاص کے ساتھ۔

﴿وَآخَلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ﴾ (۳-۱۳۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہو گئے۔

نیز موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:
﴿إِنَّهُ كَانَ مُخْلِصًا وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا﴾ (۱۹-۵۱)
بے شک وہ (ہمارے) برگزیدہ اور پیغمبر مرسل تھے۔ اور حقیقتاً اخلاص ماسوی اللہ سے بیزار ہونے کا نام ہے۔

پہنے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ خَلَدَةٌ ایک قسم کی بالی کو کہتے ہیں۔

الْإِخْلَادُ کے معنی کسی چیز کو باقی رکھنے یا اس پر بقا کا حکم لگانے کے ہیں اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَلِكَيْتُمْ أَخْلَدُ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (۷-۷۶) یعنی زمین کی طرف مائل ہو گیا یہ خیال کر کے کہ وہ اس پر ہمیشہ رہے گا۔

(خ ل ص)

الْخَالِصُ: (خالص) اور الْأَصْفَىٰ دونوں مترادف ہیں مگر الصافی کبھی ایسی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں جس میں پہلے آمیزش نہ ہو اور خالص اسے کہتے ہیں جس میں پہلے آمیزش ہو مگر اس سے صاف کر لیا گیا ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

خَلَصْتُهُ فَخَالِصٌ: میں نے اسے صاف کیا تو وہ صاف ہو گیا اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے ۵

(۱۳۲) خُلَاصُ الْخَمْرِ مِنْ نَسْجِ الْفِدَامِ
جیسے شراب صافی سے صاف ہو کر نکل آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا﴾ (۶-۱۳۹) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو بچہ ان چار پائیوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے۔

تجاورہ میں هَذَا خَالِصٌ وَخَالِصَةٌ (مذکر و مؤنث) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسے وَاهِبَةٌ وَرَأْوِيَّةٌ اور

۱ قاله المتنبی یصف حمی فالثی بمصر فی ذی الحجة سنة ثمان واربعین وثلاث مائة فی فصبه، ۴۱ بیتہ وصدردہ: وضافت خطہ فخلصت منها راجع دیوانہ ۳۶۶ ہندیہ بمصر ۱۹۲۳۔

(خ ل ط)

أَخْلَطَ فُلَانٌ فِي كَلَامِهِ (فلاں نے کلام کی)
أَخْلَطَ الْفَرَسُ فِي جَرِيهِ: گھوڑے کا دوڑنے میں
کو تا ہی کرنا۔

(خ ل ع)

الْخَلْعُ: اس کے معنی اتار دینے کے ہیں اور یہ
انسان کا اپنے کپڑے وغیرہ اور گھوڑے کا جھول اور پوزی
وغیرہ اتارنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ﴾ (۱۲-۲۰) تو اپنی جوتیاں اتار دو۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں لفظی معنی مراد ہیں اور انہیں جوتا
اتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ مردار گدھے کے
چمڑے سے بنا ہوا تھا بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ یہ دراصل
تمثیل ہے کہ یہاں اطمینان سے اقامت پذیر ہو جاؤ جیسا
کہ جب کسی کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ یہاں جم کر بیٹھ جاؤ تو اس
کے لئے اَنْزِعْ ثَوْبَكَ اَوْ خُفَّكَ وغیرہ محاورات استعمال
کئے جاتے ہیں۔ کبھی اس کا صلہ علی لاکر اس سے بخشش کے
معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ جیسے خَلَعَ فُلَانٌ عَلٰی
فُلَانٍ: فلاں نے اسے خلعت دی یا درہے کہ علی
(صلہ) کی وجہ سے عطا کے معنی مفہوم ہوتے ہیں ورنہ
اس کے بغیر یہ معنی صحیح نہیں ہوتے۔

(خ ل ف)

خَلْفٌ: (پیچھے) یہ قدم کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ (۲-۲۵۵)
جو کچھ ان کے رو برو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا
ہے اسے سب معلوم ہے۔

الْخَلَطُ: (ن) کے معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجزا
کو جمع کرنے اور ملا دینے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ
چیزیں سیال ہوں یا جامد یا ایک مائع ہو اور دوسری جامد اور یہ
مَزْجٌ سے اعم ہے۔ کہا جاتا ہے: اخْتَلَطَ الشَّيْءُ (کسی
چیز کا دوسری کے ساتھ مل جانا) قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْاَرْضِ﴾ (۱۰-۲۳) پھر اس
کے ساتھ بزمہ..... مل کر نکلا۔

خَلِيطٌ کے معنی دوست، بڑوسی یا کاروبار میں شریک کے
ہیں۔ اسی سے کتب فقہ میں خَلِيطَانٌ کا لفظ استعمال
ہوا ہے جس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا مال اکٹھا ہو۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلٰی
بَعْضٍ﴾ (۳۸-۲۳) اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر
زیادتی کرتے ہیں۔

اور خَلِيطٌ کا لفظ واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے چنانچہ
شاعر نے کہا ہے: (بسیط)

(۱۴۳) بَانَ الْخَلِيطُ وَلَمْ يَأُوْا لِمَنْ تَرَكَوْا
ساتھی جدا ہو گئے اور انہوں نے جن کو چھوڑا ان پر رحم نہ
کھایا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا
وَآخَرَ سَيِّئًا﴾ (۹-۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے
عملوں کو ملا دیا تھا۔

یعنی نیک اور بد دونوں قسم کے عمل کرتے رہے۔ محاورہ ہے۔

① قاله زهير في مطلع قصيدة في ۳۳ بيتاً وتامه: وزودك اشتياقاً اية سلكوا والبيت في النقااض ۱۶۹ وديوانه والعقد الثمين

جیسے فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ﴾

(۱۹-۵۹) پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو (چھوڑ دیا گواسے) کھو دیا۔

اور جو کسی کا جانشین اور قائم مقام ہو اسے خَلْفٌ (فتح اللام) کہا جاتا ہے۔ خِلْفَةٌ: ایک کا دوسرے کے بعد آنا قائم مقام ہونا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ (۲۵-۶۲)

اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

کہا جاتا ہے:

أَمْرُهُمْ خِلْفَةٌ: یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ شاعر

نے کہا ہے: ﴿طویل﴾

(۱۴۴) بِهَا الْعَيْنُ وَالْأَرَامُ يَمْشِينَ خِلْفَةً

اس میں گاوانِ دشتی اور ہرنیاں ایک دوسرے کے پیچھے چلتی ہیں۔

أَصَابَتْهُ خِلْفَةٌ: پیش لگ جانا۔

خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا: وہ اس کا جانشین ہو خواہ اس کی

موجودگی میں ہو یا بعد میں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ

يَخْلُقُونَ﴾ (۲۳-۶۰) اگر ہم چاہتے تو تم میں سے

﴿لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْن يَدَيْهِ وَمِن خَلْفِهِ﴾ (۱۳-۱۱)

اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں۔

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِيَدِنَا لِنَتَّكُونَ لِمَنْ خَلَفَكَ

آيَةً﴾ (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو (دریا سے نکالیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لئے عبرت ہو۔

اور خَلَفَ کے معنی پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ یہ تَقَدَّمَ اور سَلَفَ کی ضد ہے اور جو

مرتبہ میں گرا ہوا ہو اسے بھی خَلَفَ کہا جاتا ہے اسی بنا پر ردی چیز کو خَلْفٌ کہتے ہیں اور خَلَفَ کے معنی متاخر اور

جانشین کے بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾ (۷-۱۷۹) پھر ان

کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے۔

امثال عربیہ ہے: ﴿مَثَل﴾

سَكَتَ أَلْفًا وَنَطَقَ خَلْفًا: کہ وہ ہزار باتوں سے

خاموش رہا اور آخربات کی تو بے ہودہ اور ردی۔

خُلْفَةٌ: سرین جب اس سے گوزنکل جائے کم عقل جو

بے ہودہ بات کرے۔

تَخَلَّفَ فُلَانٌ عَنِ فُلَانٍ: کسی سے پیچھے رہ جانا کسی کا

جانشین ہونا۔ اس کا مصدر خِلْفَةٌ ہے جس کے معنی جانشینی کے ہیں مگر خَلَفَ خِلْفَةً (فتح الحاء) کے معنی کم عقل ہونے کے ہیں اور کم عقل آدمی کو خَلْفٌ کہا جاتا ہے۔ اور کبھی خَلْفٌ سے ناخلف بھی مراد ہوتا ہے۔

① المثل فی الميدانی رقم ۱۷۷۲ والاشتقاق ۱۳۷ وفی جمل المعاجم ۱۲.

② قالہ زہیر فی معلقته وتامہ۔ واطلاؤھا بنہض من کل محتم والبیوت فی دیوانہ ۵ وشرح القصائد العشر للبریزی ۱۰۱ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۵۱) وتفسیر الطبری ۲: ۶۳/۱۹: ۳۳) واللسان (خلف، طلی) والافتضاب ۱۶۱ ومحاضرات المؤلف (۴: ۶۶۳) والجمہرۃ ۱۰۵ وغریب القرآن ۳۱۴ والمعانی الکبیر ۶۹۶ والقرطبی ۳: ۶۵ ومحاز القرآن ۲: ۸۰ والعقد الثمین ۹۴ وایام العرب ۲۷۱. وشرح المعلقات لابن الانباری ۶۱، ۲۳۹ والسیوطی ۲۵۵.

بات میں اختلاف کرنا عموماً نزاع کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے استعارة اختلاف کا لفظ نزاع اور جدال کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ﴾ (۶۵-۳۳) لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

﴿وَإِخْتِلَافَ أَلْسِنَتِكُمْ وَالْوَاوَانِكُمْ﴾ (۲۲-۳۰) اور تمہاری زبانوں اور گلوں کا جدا جدا ہونا۔

﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ النَّبِيِّ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ﴾ (۳-۷۸) (یہ لوگ) کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں؟ (کیا) بڑی خبر کی نسبت؟ جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔

﴿إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (۵۱-۸۰) (اے اہل مکہ) تم ایک تناقض بات میں (پڑے ہوئے) ہو۔
﴿مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ﴾ (۱۲-۶۹) جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾ (۳-۱۰۵) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بین کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف) اختلاف کرنے لگے۔

﴿فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ﴾ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی۔

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا﴾ (۱۰-۱۹) اور (سب) لوگ (پہلے) ایک ہی امت (یعنی

فرشتے بنا دیتے جو تمہاری جگہ زمین میں رہتے۔

الْخِلَافَةَ کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔

خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب سے ہو۔ اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ﴾ (۶-۱۶۵) اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۹-۳۵) وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا۔

﴿وَيَسْتَخْلَفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۱۱-۵۷) اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لائے گا۔

الْخَلَائِفُ کا واحد خَلِيفَةٌ ہے اور خُلَفَاءُ کا خَلِيفٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُدُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۸-۲۶) اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ﴾ (۱۰-۷۳) اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

﴿إِذْ جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ (۷-۶۹) جب اس نے تم کو قوم نوح کے بعد سردار بنایا۔

الْإِخْتِلَافُ وَالْمُخَالَفَةُ کے معنی کسی حالت یا قول میں ایک دوسرے کے خلاف طریق کار اختیار کرنے کے

ہیں۔ اور خِلَافُ کا لفظ ان دونوں سے اعم ہے کیونکہ ضدین کا مختلف ہونا تو ضروری ہوتا ہے مگر مختلفین کا ضدین ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں کا باہم کسی

ایک ہی دین پر) تھے پھر جدا جدا ہو گئے۔

خُلْفٌ سے بھی۔ نیز فرمایا:

﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ﴾
(۱۰-۴۲) اور تم جس بات میں اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کی طرف (ہوگا)۔

﴿فَأَحْكُم بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾
(۳-۵۵) تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے..... ان کا فیصلہ کر دوں گا۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۱۰-۶) رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں (اختلاف سے ان کا یکے بعد دیگرے آنا مراد ہے)۔

الْخُلْفُ کے معنی وعدہ شکنی کے ہیں۔ محاورہ ہے:

وَعَدَيْنِي فَأَخْلَفْتَنِي: اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا قرآن پاک میں ہے:

﴿بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ﴾ (۹-۷۷) کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا۔
﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِعَادَ﴾ (۳-۹) بے شک اللہ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

﴿فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلَكِنَا﴾ (۲۰-۸۷، ۸۷) تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا (اس کے) خلاف کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلافی نہیں کی۔

أَخْلَفْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو وعدہ خلاف پایا۔
أَلَا خِلَافُ: ایک دوسرے کے بعد پانی پلانا۔

أَخْلَفَ الشَّجَرُ: پتہ جھڑ کے بعد درخت کا دوبارہ سرسبز ہونا۔

أَخْلَفَ اللَّهُ عَلَيْكَ: اللہ تعالیٰ تجھے ضائع شدہ چیز کا نعم

﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مَبُوءًا صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ فَمَا اخْتَلَفُوا حَتَّى جَاءَهُمُ الْعِلْمُ وَإِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾ (۱۰-۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی بڑی عمدہ جگہ دی اور کھانے کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں۔ لیکن وہ باوجود علم حاصل ہونے کے اختلاف کرتے رہے۔ بے شک جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا۔

اور قیامت کے دن کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَيَبْيَسِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ (۶-۹۲) اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔

﴿لَيَبْيَسِّنَنَّ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾ (۱۶-۲۹) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ان پر ظاہر کر دے اور آیت کریمہ:

﴿وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ﴾ (۶-۱۷۶) اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اخْتَلَفُوا بمعنی خَلَفُوا ہے۔ جیسے كَسَبَ وَآكْتَسَبَ اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف اس میں رد و بدل کر دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا اخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ﴾ (۸-۴۲) تو وقت معین (پر جمع ہونے) میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی۔

میں اخْتَلَفْتُمْ کا لفظ خلاف سے بھی ہو سکتا ہے اور

المبدل عطا فرمائے۔

والوں کے ساتھ بیٹھے ہو۔

خَلَفَ اللَّهُ: اللہ کی جانب سے تیرا خلیفہ ہو۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَا يَلْبُثُونَ خَلْفَكَ﴾ (۷۶-۷۷) تمہارے پیچھے یہ
بھی نہ رہتے۔

الْخَالَفَةُ: خیمے کا پچھلا ستون بطور کنایہ اس سے مراد
عورتیں لی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ مجاہدین سے پیچھے رہ جاتی
ہیں۔ اس کی جمع خَوَالِفُ ہے۔

مِنْ خَالَفٍ کے معنی بعد کے ہیں ایک قرأت میں
خَالَفَكَ ہے۔ یعنی میری مخالفت کر کے اور آیت کریمہ:
﴿أَوْ نَقُطِعَ أَيْدِيَهُمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ﴾
(۵-۳۳) یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک
ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔

قرآن پاک میں ہے:
﴿رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾ (۹-۸۷)
یہ اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ
جاتی ہیں (گھروں میں) بیٹھ رہیں۔

وَجَدْتُ الْحَىَّ خَلْفًا: یعنی مرد گئے ہوئے ہیں۔
صرف عورتیں موجود ہیں۔^۱

یعنی ایک سیدھی جانب سے اور دوسرا الٹی جانب سے
خَلَفْتُهُ میں نے اسے پیچھے چھوڑا۔ قرآن میں ہے:
﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ
اللَّهِ﴾ (۹-۵۱) جو لوگ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ
گئے۔ وہ پیغمبر خدا کی (مرضی) کے خلاف بیٹھ رہنے سے
خوش ہوئے۔ یعنی اللہ کے پیغمبر کے مخالفت ہو کر۔

الْخَلْفُ: (ایضاً)۔ کلہاڑی کی دھار۔ پہلو کی سب سے
چھوٹی پہلی جو پیٹ کے جانب سب سے آخری ہوتی ہے۔
الْخِلَافُ: بید کی قسم کا ایک درخت کیونکہ وہ امید کے
خلاف اگتا ہے یا اس کا باطن ظاہر کے خلاف ہوتا ہے۔

مُخْلِفٌ عَامٌ أَوْ عَامِيْنٌ: شتر کہ از بے ساگی یک یا
دو سال درگذشتہ باشد۔ الْخَلِيفِيُّ: خلافت حضرت عمر رضی اللہ
عنه کا قول ہے^۲

(۱۱۸) لَوْلَا الْخَلِيفِيُّ لَأَذَنْتُ: اگر بار خلافت نہ
ہوتا تو میں خود ہی اذان دیا کرتا۔ (اذان کی فضیلت کی
طرف اشارہ ہے)۔

﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِفُوا﴾ (۹-۱۱۸) اور
ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ بتوی کیا گیا تھا۔
﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ﴾ (۲۸-۱۶) جو..... پیچھے
رہ گئے تھے ان سے کہ دو۔

(خ ل ق)

الْخَلْقُ: اصل میں خلق کے معنی (کسی چیز کو بنانے
کے لئے) پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔ اور کبھی خلق

الْخَالِفُ: نقصان یا کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہنے والا
اور یہی معنی مَخْلِفٌ کے ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿فَأَقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ﴾ (۹-۸۳) پیچھے رہنے

۱ ومنه حديث المرة والمزادتين : والحى خلوف اى رجالنا غيب (النهاية خلف).

۲ وفى الفائق (۱: ۱۸۲) ولفظه لواطيق الاذان مع الخليفى لاذنت وهو مصدر معناه كثره جهده فى ضبط امور الخلافة وتصريف
اعتنتها كدافى النهاية (خلف) ولفظه لواطقت قال وهو مصدر مثل الرميما والدليلا وفى غريب ابى عبيد ۳: ۳۱۹ اسم على وزن هجيرا
ومعناه الخلافة وامثاله معدودة ۱۲.

(۱۶-۱۷) تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔

البتہ خلق بصورتِ استعمال کے ہوتا ہے بعض اوقات ذاتِ باری تعالیٰ دوسروں کو بھی اس کا اختیار دے دیتی ہے۔ جیسے **عَسَىٰ عَلِيمًا** کو مخاطب کر کے فرمائیں گے۔

﴿إِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾ (۵-۱۱۰) اور جب تم میرے حکم سے مٹی کا جانور بنا کر اور عام لوگوں کے لئے خلق کا لفظ صرف دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اندازہ کرنا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿الکامل﴾

(۱۴۵) وَلَا أَنْتَ تَفْرِي مَا خَلَقْتَ

وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِي

تم جو سوچتے ہو کر گزرتے ہو۔ اور بعض لوگ تجاویز کرتے رہتے ہیں مگر انہیں عملی جامد نہیں پہنا سکتے۔

(۲) جھوٹ بولنے کے معنی میں فرمایا:

﴿وَتَخْلُقُونَ أَفْكَاءَ﴾ (۲۹-۱۷) اور طوفان باندھتے

ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کریمہ:

﴿فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (۲۳-۱۳) تو

خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ بڑا بابرکت ہے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سوا

دوسرے بھی متصف ہو سکتے ہیں۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ

ہے کہ یہاں أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ بمعنی أَحْسَنُ الْمُقَدِّرِينَ

بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ (۱۶-۳)

اسی نے آسمانوں اور زمین کو مٹی برحمت پیدا کیا۔ میں خلق

بمعنی ابداع ہی ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اسی کو ﴿بَدِيعُ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۲-۱۱۷) سے تعبیر کیا ہے۔

نیز ایک چیز کو دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾ (۴-۱) تم کو ایک

شخص سے پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْقَةٍ﴾ (۱۶-۳) اسی نے

انسان کو نطفے سے بنایا۔

﴿خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ﴾ (۲۳-۱۲) ہم نے

انسان کو خلاصے سے پیدا کیا۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ﴾ (۷-۱۱) اور تم کو ہم نے (ابتدا

میں مٹی سے) پیدا کیا۔

﴿خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ﴾ (۵۵-۱۵) اور

جنات..... کو شعلے سے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ خلق بمعنی ابداع ذاتِ باری تعالیٰ کے

ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ ذاتِ باری تعالیٰ اور دوسروں

کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾

① البیت لزہیر بن ابی سلمة من قصيدة بمدح ہرماتی ۲۱ بیتاً راجع دیوانہ ۲۴ والعقد الثمین ۸۲ والمعانی للقبی ۳۲۱، ۳۲۹ والاضداد لابن السکیت ۲۰۵ والاصعی ۵۵ وابن الأتباری (۱۵۹) وابی الطیب (۵۶۱) وشرح شواہد الشافیہ (۲۳۹) والکتاب ۲۸۹:۲ ومقاییس اللغه (۲: ۲۱۴) والحيوان (۳: ۲۸۳) واللسان (خلق، دی) والطبری (۱۸-۱۹) والبحر المحیط (۱: ۶۶۵/۲/۶۶۵: ۳۹۸) والمشکل للقبی ۳۸۸ والصناعتین (۳۸۶، ۴۴۷) وفيه وادراك بدل ولان وفی مختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۹۰) فلا بدل ولا والبيت ایضاً فی ثلاثین لابن خالویه ۴۵.

مراد لی ہے۔ اور بعض نے تغیرِ خلقت یعنی شکل و صورت کا بدلنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ﴾ (۲۶-۱۶۶) اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لئے (پیمیاں) پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو۔

میں ”مَا خَلَقَ“ سے کنا یہ عورتوں کی شرمگاہیں مراد ہیں۔ اور وہ ہر مقام جہاں خلق کا لفظ کلام کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اس سے جھوٹ ہی مراد ہیں۔ اس بنا پر اکثر لوگ قرآن پاک کے متعلق خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتے تھے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿إِنَّ هَذَا إِلَّا خَلَقُ الْأَوَّلِينَ﴾ (۲۶-۱۳۷) یہ تو اگلوں کے ہی طریق ہیں اور ایک قرأت میں ﴿إِنَّ هَذَا إِلَّا خَلَقُ الْأَوَّلِينَ﴾ (۲۶-۱۳۷) بھی ہے یعنی یہ تو پہلے لوگوں کی ایجاد و اختراع ہے۔

﴿مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَذَا إِلَّا اخْتِلَافٌ﴾ (۳۸-۷) یہ بچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں۔ یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔

خَلَقُ کا لفظ مخلوق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خَلَقُ اور خُلِقُ اصل میں دونوں ایک ہی ہیں۔ جیسے شَرِبُ و شُرِبَ و صَرَمَ و صُرِمَ مگر ان میں اتنا فرق ہے کہ خَلَقُ بمعنی خلقت یعنی اس شکل و صورت پر بولا جاتا ہے۔ جس کا تعلق ادراکِ بصر سے ہوتا ہے اور خُلِقُ کا لفظ قومی باطن اور عادات و خصائل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جن کا تعلق بصیرت سے ہے ﴿قرآن

ہے یعنی اللہ تعالیٰ سب بہتر اندازہ کرنے والا ہے (اور خلق بمعنی تقدیر دوسروں کی صفت بھی آجاتا ہے) اور دوسرا جواب یہ ہے۔ کہ یہاں اللہ تعالیٰ پر أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کا اطلاق کفار کے اعتقاد کے اعتبار سے ہے۔ ان کا دُعا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی پیدا کرتے ہیں تو پھر بھی ذات باری تعالیٰ ان کے اعتقاد کے بموجب، ان سب سے بہتر پیدا کرنے والی ٹھہری جیسے فرمایا:

﴿خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۳-۱۶) کیا انہوں نے خدا کی سی مخلوقات پیدا کی ہے جس کے سب ان پر مخلوقات مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا مَرْتَبَهُمْ فَلَيعْبِيرَنَّ خَلْقَ اللَّهِ﴾ (۳-۱۱۹) اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا۔ کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَلَقُ اللہ کی تغیر سے مراد خصاء (یعنی خصی ہونا) اور نطف اللسحیہ (داڑھی کے بال اکھاڑ ڈالنے) وغیرہ کے ذریعہ (فطرتی صلاحیتوں اور) صورتوں کو تبدیل کرنا مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ احکام الہی میں تحریف و تبدیل کرنا مراد ہے ﴿اس صورت میں خلق اللہ سے مراد دین الہی ہوگا) اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَبْدِيلَ لِمَا خَلَقَ اللَّهُ﴾ (۳۰-۲۰) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ ”خلق اللہ“ سے قضا و قدر الہی

① ولکلال القولین محمول وکل منہی عن السلف راجع ابن کثیر ۱: ۵۵۶ و معالم التنزیل للبغوی ۱: ۴۹۹۔

② والعلماء دون الاخلاق علی حدة و صنفوا فیہا الکتب ومنها تہذیب الاخلاق لیحیی بن عدی و کتب الامام الغزالی انفع للتربیة فی هذا الباب۔

پاک میں ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾
 ﴿وَأَنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ﴾ (۲۸-۴) اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں۔

﴿وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثَلَاتُ﴾ (۱۳-۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے ہیں۔
 ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ (۲-۱۳۳) یہ جماعت گذر چکی۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ (۳-۱۳۷) تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں۔
 ﴿الَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (۳۵-۲۳) مگر اس میں ہدایت کرنے والا گذر چکا ہے۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (۲-۲۱۳)..... تم کو پہلے لوگوں کی سی۔
 ﴿وَأَذَّخَلُوا عَصُورًا عَلَيْنِكُمْ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۳-۱۱۹) اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ﴾ (۱۲-۹) پھر ابا کی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے رہ جائے گی۔

﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شِبَابِئِهِمْ﴾ (۲-۱۳) اور جب خَلَا الْإِنْسَانُ: تنہا ہونا۔ خَلَا فَلَانٌ بِفُلَانٍ كَسَىٰ کے ساتھ تنہا ہونا۔

خَلَا إِلَيْهِ: کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شِبَابِئِهِمْ﴾ (۲-۱۳) اور جب

﴿وَأَنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ﴾ (۲۸-۴) اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں۔
 الْخَلَاقُ: وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:
 ﴿وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (۲-۲۰۰) ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔

فُلَانٌ خَلِيقٌ بِكَذَا: فلاں اس کا اہل ہے گویا وہ خوبی اس میں پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ فُلَانٌ مَجْبُورٌ عَلَىٰ كَذَا وَمَدْعُوٌّ إِلَيْهِ مِنْ جِهَةِ الْخَلْقِ کا محاورہ ہے۔
 خَلَقَ الثَّوْبَ وَأَخْلَقَ: کپڑے کا پرانا ہو جانا اور پرانے کپڑے کو خَلَقَ وَمُخْلَقٌ وَأَخْلَاقٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ حَبْلٌ أَرْمَامٌ وَأَرْمَاتٌ کا محاورہ ہے اور کپڑے کے پرانا ہونے سے ملائم اور چمکانا ہونے کا معنی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

جَبَلٌ أَخْلَقَ وَصَخْرَةٌ خَلَقَاءُ: چمکانا پہاڑ یا چمکانا پتھر۔
 خَلَقْتُ الثَّوْبَ: میں نے کپڑے کو پرانا کیا۔ اَخْلَوْتُ السَّحَابَ أَنْ تُمْطِرَ: امید ہے کہ بارش ہوگی۔

یہ یا تو خَلَقْتُ الثَّوْبَ سے ماخوذ ہے اور یا ہو خَلِيقٌ بِكَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔
 الْخَلُوقُ: ایک قسم کا خوشبو۔

(خ ل و)

الْخَلَاءُ: خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور الْخُلُوعُ کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں مَضَىٰ (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لئے اہل لغت خَلَا الزَّمَانُ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

خَمَدَتِ الْحَمِيَّ كاحوارہ ہے جس کے معنی بخار کا
جوش کم ہو جانے کے ہیں۔ اور کبھی بطور کنایہ یہ خَمُودٌ
بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿جَعَلْنَا هُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ﴾ (۲۱-۱۵) ہم
نے ان کو (کھیتی کی طرح) کاٹ کر (آگ کی طرح) بجھا
کر ڈھیر کر دیا۔

﴿فَإِذَا هُمْ خَامِدُونَ﴾ (۳۶-۳۹) سو وہ (اسی سے)
ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

(خ م ن)

الْحَمْرُ: (ن) اصل میں خَمْرٌ کے معنی کسی چیز
کو چھپانے کے ہیں۔ اسی طرح خَمَارٌ اصل میں ہراس
چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھپائی جائے مگر عرف
میں خِمَارٌ کا لفظ صرف عورت کی اورہنی پر بولا جاتا ہے
جس کے ساتھ وہ اپنے سر کو چھپاتی ہے اس کی جمع خُمُرٌ
آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلْيَضْرِبَنَّ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ﴾ (۲۳-
۳۱) اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔

کہا جاتا ہے:

اخْتَمَرَتِ الْمَرْأَةُ وَتَخَمَرَتِ: عورت نے سر
پر اوڑھنی ڈال لی۔

خَمَرَتِ الْإِنَاءَ میں نے برتن ڈھانپ دیا۔ ایک روایت
میں ہے ۵

وہ اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

خَلَيْتُ فُلَانًا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ
دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال
ہونے لگا ہے۔ فرمایا:

﴿فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾ (۹-۵) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔
نَاقَةُ خَلِيَّةٍ: اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔
إِمْرَأَةٌ خَلِيَّةٌ: مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد
چھوڑ دی گئی ہو۔ اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی
ہو اسے بھی خَلِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔

الْخَلِي: جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مُطَلَّقَةٌ کا لفظ سکون
و اطمینان کے معنی میں آجاتا ہے۔
چنانچہ شاعر نے ۵ (طویل)

(۱۴۶) مُطَلَّقَةٌ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجِعُ
میں (کبھی اسے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ درد و کراہتی
ہے) میں مُطَلَّقَةٌ کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔
الْخَلَاءُ: خشک گھاس کہا جاتا ہے: خَلَيْتُ الْخَلَاءَ
میں نے خشک گھاس کاٹی۔

خَلَيْتُ الدَّابَّةَ: جانور کو خشک گھاس ڈالی۔ سَيْفٌ
يَخْتَلِي: تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

(خ م د)

خَمَدَتِ النَّارُ: آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا
(جب کہ اس کا انگارہ نہ بجھا ہو) اور اسی سے بطور استعارہ

۱ قاله النابغة الذبياني و صدره: تناذرها الرافون من سوء سمها - وفي المطبوع مطلقه محرف والبيت في اللسان (طلق، نذر)
والكامل (۸۵۶) و مختار الشعر الجاهلي (۱: ۸۲) والبحر (۵: ۴۲۲) والعمدة (۱: ۲۳۸) والمخصص (۹: ۶۵) وديوانه ۵۲
والحيوان (۴: ۲۴۸) والعقد النمين ۱۹.

۲ وتمامه واد كوا اسقبتكم و احيفوا ابو ابكم واطفئوا مصايحككم و اكنفتوا ابناكم كم الخ الحديث في الفائق ۱: ۱۸۴.

بیماری کے معنی کے لئے مخصوص ہے۔

خَمْرَةُ الطَّيِّبِ خوشبو خاگیرہ وَّ خَمْرَةٌ: کسی سے گل مل جانا اس سے الگ نہ ہونا۔ اسی سے بطور استعارہ شاعر نے کہا ہے ﴿(طویل) (۱۴۷) "خَامِرِي أُمَّ عَامِرِي" کہ اے ام عامر چھپ جا۔

(خ م س)

الْخَمْسُ: (پانچ) اصل میں یہ لفظ اسم عدد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَقُولُونَ خَمْسَةَ سَادِسْتُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸)

(۳۷) اور کچھ لوگ کہتے ہیں اصحاب کہف پانچ تھے اور ان کا چھٹا ان کا کتا تھا۔ وَقَالَ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾

(۱۳-۲۹) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہے۔

الْخَمِيسُ: (جامہ پانچ گزی) روز شنبہ۔

رُمَحٌ مَّخْمُوسٌ: نیزہ پانچ گزی۔ الْخَمْسُ: پیاسے

اونٹ جو چوتھے روز پانی پر وارد ہوں۔

خَمَسْتُ الْقَوْمَ: (ن) پانچواں حصہ لینا۔

خَمَسْتُهُمْ (ض) پانچواں ہونا۔

(۱۲۱) خَمْرٌ وَابْتَيْتَكُمْ: کھانے کے برتن ڈھانپ کر رکھا کرو۔

أَخْمَرْتُ الْعَجِينَ: گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر ملانا اور خَمْرَةٌ کو خمیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مضمُورَةٌ ہوتا ہے دَخَلَ فِي خَمَارِ النَّاسِ: لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو کر چھپ گیا۔

الْخَمْرُ: شراب نشہ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے بعض لوگوں کے نزدیک ہر نشہ آور چیز پر خَمْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک صرف اسی چیز کو خمر کہا جاتا ہے جو انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے۔^۱

(۱۲۲) الْخَمْرُ مِنْ هَاتَيْنِ، النَّخْلَةِ وَالْعَبْتَةِ: (کہ) خمر (شراب حرام) صرف وہی ہے جو ان دو درختوں یعنی انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ "خمر" صرف غیر مطبوخ ہے یعنی اسی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو۔ پھر اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں کہ کس حد تک پکانے کے بعد اس پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا۔

الْخُمَارُ: بیماری جو شراب نوشی سے لگ جاتی ہے۔ یہ بھی زُكَامٌ اور سُعَالٌ کی طرح فُعَالٌ کے وزن پر ہے جو کہ

① رواہ الدارمی ۲: ۳۸۰ من حدیث ابی ہریرۃ والحديث فی مسلم والاربعۃ واحمد فی مستندہ .

② قطعة من البيت وتكملته: فلأتدفنونی ان دفنی محرم۔ علیکم ولكن قال المرتضیٰ (۲: ۷۳) البيت لتابط شرابیوی للشنہری (صاحب لامية العرب التي شرحها الزمخشري باعجب العجاب) وللستاذ الميمني حقق هذه في الطرائف (۱: ۳۶۱) راجع للبيت وقصته الاغانی (۲۱: ۱۳۶) وطبقات الشعراء لابن سلام (۱: ۷۴) والحيوان (۶: ۵۰) والمعانی الكبير ۲۱۳ وامالی ابن البختري (۱: ۳۶) والحامسة بالبتريزي (۲: ۲۴) وذيل الامالی ۳۶ والصناعتين ۸۸۳ والصاحی ۲۲۴ والبحر (۳: ۳۷۷) ومجمع البيان ۱: ۷۴ والمحاضرات للمؤلف ۳: ۳۹۸ وابن ابی الحديد ۱: ۵۷ واللسان (عمر) وفي رواية ابشری بدل خامری۔ قال صاحب العقد (۱: ۷۱۸-۷۱۹/۴: ۲۱۹) ان رواية خامری بعيد عن المعنی راجع الازمنه والامکنه ومعنی البيت لاتدفنونی بل دعونی لتی یقال لها اذا صيدت خامری ام عامر ای للضبع قال التحليل ونقل عنه سيويہ فی "الكتاب" والخفاجی فی شرح الدرۃ (۱۴-۱۵) وصدر الافاضل فعلى هذا ليس فی البيت التفات كماذهب اليه البعض والقطعة ايضا فی بيت الاخطل اللسان (وشظ) والمرزوفی والقطعة مثل راجع الجرحانی ۹۰ والمسکری والميدانی ۱۲.

جو شکل و صورت کے لحاظ سے گو انسان نظر آتے ہیں لیکن اخلاق و عادات کے اعتبار سے بندر اور سور بنے ہوئے ہیں۔

(خ ن س)

الْحَنْسُ: (ن) کے معنی پیچھے ہٹنے اور سکر جانے کے ہیں اسی سے شیطان کو حنساس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر الہی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور وسوسہ انداز نہیں ہو پاتا۔ قرآن میں ہے:

﴿مَنْ شَرَّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۳-۱۲) شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِالْخَنَّاسِ﴾ (۸۱-۱۵) ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

میں خنسس سے وہ ستارے مراد ہیں جو دن کو الٹی رفتار چلتے ہیں یہ خنسس کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے زل، مشتری اور مریخ مراد ہیں۔ کیونکہ یہ الٹی چال چلتے رہتے ہیں۔

اُخْنَسْتُ عَنْهُ حَقَّةً: میں نے اس کے حق کو موخر کر دیا، روک لیا۔

(خ ن ق)

الْمُنْحَنَقَةُ: (ق-۵) جو جانور گلاٹ کر مر جائے۔

الْمُنْحَنَقَةُ: کے معنی قلاہہ کے ہیں۔

(خ م ص)

الْمَخْمَصَةُ: ایسی بھوک جس سے پیٹ پچک

جائے۔ قرآن میں ہے:

﴿فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ﴾ (۵-۳) ہاں جو شخص

بھوک میں ناچار ہو جائے۔ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ خَامِصٌ: پچکے ہوئے۔ پیٹ والا اَخْمَصُ الْقَدَمِ پاؤں کے تلوے کا گڑھا۔

(خ م ط)

الْخَمْطُ - درخت بے خار۔ بعض نے کہا ہے کہ

خَمْطُ پیلو کے درخت کو کہتے ہیں۔

الْخَمْطَةُ: ترش شراب۔ تَخَمَّطُ: غضب ناک ہونا۔ کہا

جاتا ہے۔ تَخَمَّطَ الْفَحْلُ سائڈ کا سستی سے بررانا۔

(خ ن ز)

الْخَنْزِيرُ کے معنی سور کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْفِرْدَاةَ وَالْخَنَازِيرَ﴾ (۵-۲۰)

اور (جن کو) ان میں سے بندر اور سور بنادیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خاص کر سور ہی مراد ہے اور بعض

کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے افعال و

عادات بندر اور سور جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ بلحاظ صورت

کے بندر اور سور بن گئے تھے۔^۱ مگر زیر بحث آیت میں

دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم

کی صورتیں مسخ ہو گئی تھیں اور وہ بندر اور سور بن گئے

تھے۔^۲ اسی طرح انسانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں

① ذهب الجمهور الى ان المسخ كان عقوبة وحققتا وقال مجاهد بالقول الثاني واول المسخ على تغيير الاخلاق والله اعلم راجع التفاسير.

② کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

(خ و ر)

فَاعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ﴿٢٨-٢٧﴾ اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ بکواس کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ اور باتوں میں مشغول ہو جائیں۔

أَخْضَتْ دَابَّتِي فِي الْمَاءِ: میں نے اپنی سواری کو پانی میں ڈال دیا۔

تَخَاوَضُوا فِي الْحَدِيثِ: باہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔

(خ و ف)

الْخَوْفُ: (س) کے معنی ہیں قرآن و شواہد سے کسی آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ رجاء اور طمع کا لفظ قرآن و شواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے خوف کی ضد اسن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ﴾ (٥٤-٥٤)

اور اس کی رحمت کے امید وار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ

خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (٣٢-١٦) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔ (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔

﴿وَأَنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا﴾ (٣-٣) اور اگر تم کو اس

بات کا خوف ہو کہ..... انصاف نہ کر سکو گے۔ اور آیت کریمہ:

الْخُورُ: دراصل یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے پھر استعارۃً اونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَجَلًا جَسَدًا لَّهُ خُورًا﴾ (٢٠-٨٨) ایک بچھڑا (جس کا) قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

أَرْضُ خُورًا: دو بلندیوں کے درمیان پست زمین۔ رُمَحُ خُورًا: کمزور نیزہ۔

الْخُورَانُ: بہائم کی آواز۔ جانوروں کے گوبر کرنے کا راستہ۔

(خ و ض)

الْخَوْضُ: (ن) کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنے پر ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَمَّا سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ﴾ (٩-٦٥) اور اگر تم ان سے (اس بارے

میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور ول لگی کرتے تھے۔

﴿وَخَضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا﴾ (٩-٦٩) اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم بھی باطل میں ڈوبے رہے۔

﴿ثُمَّ ذَرَهُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ﴾ (٦-٩١) پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا

ڈرتے رہو۔

یعنی شیطان کا حکم مت بجاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو کر رہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَىٰ خِيفَتُ الْمَوَالِي مِنْ وَرَائِي﴾ (۱۹-۵) اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔ میں خوف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے مال کی فکر تھی کہ موالی اس کے وارث بن جائیں گے۔ جیسا کہ بعض جہلاء نے سمجھا ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ اس سے کہیں بلند ہوتا ہے کہ وہ دینی مال و اسباب کی فکر کریں بلکہ موالی سے انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان کے مرنے کے بعد شریعت کی رعایت اور نظام دین کی حفاظت نہیں کریں گے۔

الْخَيْفَةُ: کے معنی خوف کی حالت کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةَ مُوسَىٰ قُلْنَا لَا تَخَفْ﴾ (۲۰-۶۷) (اس وقت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔

اور کبھی خِيفَةُ بمعنی خوف بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ﴾ (۱۳-۱۳) اور فرشتے سب اس کے خوف سے۔

﴿تَخَافُوهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ﴾ (۳۰-۲۸) (اور کیا) تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو۔

یہاں خوف کی بجائے خيفة کا لفظ لانے سے اس بات کی

﴿وَأَنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ (۳-۳۵) اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں آن بن ہے۔ میں بعض نے خِفْتُمْ کے معنی عَرَفْتُمْ کئے ہیں یعنی اگر تمہیں معلوم ہو مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ الْخَوْفُ مِنَ اللَّهِ: (اللہ تعالیٰ سے ڈرنے) کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الہی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔

التَّخْوِيفُ: (تفہیل) ڈرنا اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو برے کاموں سے بچنے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ﴾ (۱۶-۳۹) بھی اسی معنی پر محمول ہے اور باری تعالیٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تحویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّمَّا ذٰلِكُمْ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآئِهٖ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْا اِنۡ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (۳-۱۷۵) یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے لہذا اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے

① ذهب الفراء الى ان معناه التنفص والزجاج الى معنى الاخافة راجع التاج واللسان (خوف).

اور نفاق دین کے متعلق بولا جاتا ہے۔ پھر ان میں تداخل ہو جاتا ہے۔ پس خیانت کے معنی خفیہ طور پر عہد شکنی کر کے حق کی مخالفت کے آتے ہیں اس کی ضمانت ہے۔ اور محاورہ میں خُنْتُ فُلَانًا وَأَمَانَةً فُلَانٍ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ﴾ (۸-۲۷) نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأةَ نُوحٍ وَ امْرَأةَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا﴾ (۶۲-۱۰) خدا نے کافروں کے لئے نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِنْهُمْ﴾ (۵-۱۳) اور ہمیشہ تم ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

کے معنی بعض نے علی جماعۃ خائنة منهم کئے ہیں یعنی خائنة کو جماعۃ کی صفت مانا ہے اور بعض نے اس کے معنی علی رجل خائن کئے ہیں یعنی اسے رجل کی صفت مانا ہے اور کہا ہے کہ رجل خائن وخائنة دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ راویۃ (روایت کرنے والا) اور دأھیۃ کے الفاظ ہیں۔

طرف اشارہ ہے کہ ان کی حالت لازمہ بن چکی تھی جو ان پر ہر آن طاری رہتی تھی۔

التَّخَوُّفُ: (تفعل) کسی انسان کا اظہار خوف کرنا۔ تَخَوُّوْنَاهُمْ: ہم نے انہیں اتنا کم کیا جس قدر کہ خوف اس کا مقضی تھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوْ يَأْخُذُهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ﴾ (۱۶-۳۷) یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہو گیا ہو اس وقت پکڑے۔

(خ و ل)

التَّخَوُّلُ: (تفعیل) کے اصل معنی خَوَّلَ یعنی حشم و خدام عطا کرنے کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ایسی چیزیں عطا کرنے کے ہیں جو انسان کو خَوَّلَ کا کام دے اور بقول بعض ایسی چیزیں عطا کرنا جن کی نگہداشت کی ضرورت پڑے۔ اور یہ فُلَانٌ خَالٌ مَالٍ أَوْ خَائِلٌ مَالٍ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی فلاں مال کی خوب نگہداشت کرنے والا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ﴾ (۶-۹۳) اور جو مال و متاع ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

اور "الْخَالُ" اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو وحشی جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ نیز خَالٌ کے معنی تل یعنی بدن پر سیاہ نشان کے بھی آتے ہیں۔

(خ و ن)

الْخِيَانَةُ: خیانت اور نفاق دونوں ہم معنی ہیں مگر خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ کرنے پر بولا جاتا ہے

① رابضاً الحال والحالة احوالاً وام واختها وفي التنزيل خالك ۲۳-۵۰ اویوت احوالکم اویوت خالاتکم ۲۴-۶۱ خالاتک ۲۳۔

ہونے کے ہیں۔

خَوْتُ خَوَاءِ الدَّارِ: گھر ویران ہو کر گر پڑا اور جب ستارے کے گرنے سے بارش نہ ہو تو تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ خَوِيَ النَّجْمُ وَأَخْوَىٰ یہاں خَوِيَ کی نسبت اخسویٰ کے لفظ میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے جیسا کہ سقیٰ اور اسقیٰ ہیں۔

التَّخْوِيَةُ: دو چیزوں کے درمیان جگہ خالی چھوڑنا۔

(خ ی ب)

الْخَيْبَةُ (ض) کے معنی ناکام ہونے اور مقصد فوت ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيذًا﴾ (۱۳-۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد ہو گیا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ﴾ (۲۰-۶۱) اور جس نے افترا کیا وہ نامراد رہا۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّهًا﴾ (۹۱-۱۰) اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

(خ ی ر)

الْخَيْرُ: وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو۔ مثلاً عقل عدل و فضل اور تمام مفید چیزیں یہ الشَّرُّ کی ضد ہے۔ اور خیر ردو قسم پر ہے۔

(۱) خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بعض نے کہا کہ خَائِنَةٌ یہاں مصدر کی جگہ پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ قَسَمَ قَسَائِمًا کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ﴾ (۳۰-۱۹) وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَأَن يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ﴾ (۸-۷۱) اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں تو یہ پہلے ہی اللہ سے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو (تمہارے) قبضے میں دے دیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَعَلِمَ اللَّهُ أَنكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ﴾ (۲-۱۸۷) خدا جانتا ہے کہ تم اپنے حق میں خیانت کرنا چاہتے تھے۔

میں اِخْتِيَان کے معنی خیانت کے لئے حیلہ کرنے کے ہیں۔ اس بنا پر تَخْوُونٌ اِنْفُسِكُمْ نہیں کہا کیونکہ ان سے خیانت کا صدور نہیں ہوا تھا جس کے معنی قصد خیانت کے لئے جذبات کے حرکت میں آنے کے ہیں اسی معنی کی طرف اِنَّ النَّفْسَ لَا مَارَةَ بِالسُّوْءِ، میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(خ و ی)

الْخَوَاءُ: کے معنی خالی ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے:

خَوِيَ (ض) خَوِيَ - بَطْنُهُ مِنَ الطَّعَامِ: یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی ہو گیا۔ اور تشبیہ کے طور پر خَوِيَ الْجَوْزُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خالی

۱ وفی التنزیل وہی خواویۃ علی عروشہا وایضاً ۲: ۲۵۹ (۶۹-۷)۔

۲ وایضاً ۳: ۱۲۶)۔

۳ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

جاتا ہے "چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَأَنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾ (۸-۱۰۰) وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔ میں بھی خیر کے معنی مال کثیر کے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: **إِنْ تَرَكَ خَيْرًا** میں مال کو خیر کہنے میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وصیت صرف اس مال میں بہتر ہے جو محمود طریق سے جمع کیا گیا ہو۔ اس معنی میں فرمایا:

﴿قُلْ مَا أَنفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ﴾ (۲-۱۱۵) کہدو (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو (وہ درجہ بدرجہ اولیٰ استحقاق میں) ماں باپ کو۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللَّهُ﴾ (۲-۱۹۷) اور جو نیک کام کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَكَاتَبُوا لَهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا﴾ (۲۳-۳۳) اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو۔

میں بعض نے **خَيْرًا** سے مال مراد لیا ہے یعنی اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے پاس مال ہے اور بعض نے خیر بمعنی ثواب لیا ہے کہ اگر تمہیں یقین ہو کہ ان کی آزادی تمہارے اور ان کے حق میں فائدہ مند یعنی باعث ثواب ہوگی۔ خیر و شر کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

کبھی بطور اسم کے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:

(۱۱۹) لَا خَيْرَ بِخَيْرٍ بَعْدَهُ النَّارُ وَلَا شَرٌّ بِشَرِّ بَعْدَهُ الْجَنَّةُ کہ وہ خیر کچھ بھی خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہو جائے۔

(۲) دوسری قسم خیر و شر مفید کی ہے یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمر کے حق میں شر بن جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن پاک نے اسے خیر و شر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا﴾ (۲-۱۸) اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِنْ مَّالٍ وَبَيْنَيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ﴾ (۲۳-۵۶، ۵۵) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیڑوں سے مدد دیتے ہیں (تو اس سے) ان کی بھلائی میں جلدی کرتے ہیں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مال پر خیر کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مال کثیر ہو اور حلال طریق سے جمع کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے ① (۱۲۱) کہ حضرت علیؓ اپنے ایک غلام کے پاس گئے تو اس نے دریافت کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں کچھ وصیت نہ کر جاؤں؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا: "نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کے لئے **إِنْ تَرَكَ خَيْرًا**" فرمایا ہے۔ اور خیر مال کثیر کو کہا

① الحدیث ذکرہ فی الکشاف قال الحافظ فی تحریحہ رواہ عبدالرزاق عن معمر عن هشام عن ابیہ وایضاً ابن ابی شیبہ عن ابی خالد الاحمر عنہ ومثله عن عائشة ان رجلاً اراد ان یوصی فساءلہ کم مالک (عبدالرزاق عن عبداللہ بن عبید بن عمیر وابن ابی شیبہ عن ابن ابی ملیکۃ عن عائشۃ) انظر تحریح الحافظ (۱۴ رقم ۱۰۶۹۱۰۴)۔

اور آیت کریمہ:

﴿فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ﴾ (۵۵-۷۰) ان میں سے نیک سیرت (اور) خوبصورت۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خیرات اصل میں خیرات ہے تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ خَيْرٌ وَأَمْرَأَةٌ خَيْرَةٌ، وَهَذَا خَيْرٌ الرَّجَالِ وَهَذِهِ خَيْرَةُ النِّسَاءِ: اور خیرات سے مراد یہ ہے کہ ان میں نیک سیرت عورتیں ہوں گی۔ الْخَيْرُ بہتر جو خیر کے ساتھ مختص ہو۔ نَاقَةُ خَيْارٍ وَجَمَلٌ خَيْارٌ (مذکورہ مؤنث) بہتر اونٹنی یا اونٹ۔

أَلَا سِتِّخَارَةٌ: کے معنی طلب خیر کے ہیں اس کا مطاوع خَارَ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔

اسْتِخَارَ اللَّهُ الْعَبْدُ فَخَارَ لَهُ: بندے نے اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کی تو اللہ تعالیٰ نے جو بہتر تھا وہ بتا دیا۔ خَايِرْتُ فُلَانًا كَذَا فَخَيْرْتُهُ: میں نے فلاں سے (علم میں) مسابقت کی تو میں غالب رہا۔

الْخَيْرَةُ: سے مراد وہ حالت ہے جو طلب خیر یا مختار کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ قَعْدَةٌ وَجَلْسَةٌ كَالْفَرْقَاعِدِ اور جَالِسٌ کی ہیئت اور حالت پر بولا جاتا ہے۔

الْاِخْتِيَارُ: (اتصال) بہتر چیز کو طلب کر کے اسے کر گزرنا۔

اور کبھی اختیار کا لفظ کسی چیز کو بہتر سمجھنے پر بھی بولا جاتا ہے گو نفس الامر میں وہ چیز بہتر نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَىٰ الْعَالَمِينَ﴾ (۴۳-۴۲) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل علم سے دانستہ

﴿وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ (۳)۔

اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔

میں بھی خیر بطور اسم کے استعمال ہوا ہے اور کبھی یہ دونوں بطور وصف کے آتے ہیں اور أَفْعَلٌ مِنْ کی تقدیر میں ہوتے ہیں جیسے هَذَا خَيْرٌ مِنْ ذَلِكَ وَأَفْضَلُ: یعنی یہ اس سے بہتر اور افضل ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا﴾ (۲-۱۰۶) تو اس سے بہتر بھیج دیتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲-۱۸۴) تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

میں خیر اسم بھی ہو سکتا ہے اور معنی أَفْعَلٌ مِنْ بھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّوْبَىٰ﴾ (۲-۱۹۷) اور زادراہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر

(فائدہ) زادراہ کا پرہیز گاری ہے۔

میں خیر معنی أَفْعَلٌ مِنْ کے ہے۔

پھر کبھی تو خیر لفظ شر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور کبھی ضُرُّ کے مقابلہ میں جیسے فرمایا:

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

(۶-۱۷) اور اگر خدا تم کو کوئی سختی پہنچائے تو اسی کے سوا اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر نعمت (وراحت)

عطا کرے (تو کوئی اس کو روکنے والا) نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

رات کی تاریکی مراد ہے۔ اور شاعر کے قول (طویل)

(۱۴۸) تَدَلَّىٰ عَلَيْهَا بَيْنَ سَبِّ وَ خَيْطَةٍ:

دو رسی اور میخ کے مابین اس پر انک گیا۔

میں خَيْطَةُ کا لفظ بطور استعارہ رسی یا میخ کے معنی میں

استعمال ہوا ہے۔ ایک روایت میں ہے ۱۰

(۱۲۲) کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم رضی اللہ

نے سیاہ اور سفید دو عقاب (ڈورے) رکھ لئے ان کی

طرف دیکھتے جاتے اور کھانا کھاتے جاتے یہاں تک کہ وہ

دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگے پھر انہوں نے

آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:

إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقَفَا وَأَمَّا ذَاكَ بِيَاضِ النَّهَارِ

وَسَوَادِ اللَّيْلِ كَمَا تَوْرَىٰ بِهِيَ عَرِيضُ الْقَفَا (احق)

ہو۔ اس سے مراد تو رات کی سیاہی اور فجر کی سفیدی ہے۔

خَيْطَةُ الثُّوبِ فِي رَأْسِهِ: اس کے سر میں دھاگے کی

طرح بڑھا پاٹا ہر ہو گیا۔ اَلْخَيْطُ: (ایضا) شتر مرغ اس

کی جمع اَلْخَيْطَانُ ہے۔ نَعَامَةُ خَيْطَاءُ: دھاگے کے

طرح لمبی گردن والا شتر مرغ۔

(خ ی ل)

اَلْخَيْالُ: اس کے اصل معنی صورت مجردہ کے ہیں

جیسے وہ صورت جو خواب یا آئینے میں نظر آتی ہے یا کسی کی

عدم موجودگی میں دل کے اندر اس کا تصور آتا ہے۔ پھر

(مجازاً) ہر اس امر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تصور کیا

منتخب کیا تھا۔

میں ان کے بلحاظ خلقت کے بہتر ہونے کی طرف بھی

اشارہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں دوسروں پر

فوقیت بخشنا مراد ہو۔ متکلمین کی اصطلاح میں مختار کا لفظ ہر

اس فعل کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے کرنے میں انسان

پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو۔ لِهَذَا هُوَ مُخْتَارٌ فِي كَذَا كَمَا

مخاروہ ہے فَلَا نَ لَهُ إِخْتِيَارٌ کے ہم معنی نہیں ہے۔

کیونکہ اِخْتِيَارٌ کے معنی اس کام کے کرنے کے ہوتے

ہیں جسے انسان بہتر خیال کرتا ہو۔ مگر مُخْتَارٌ کا لفظ فاعل

اور مفعول دونوں پر بولا جاتا ہے۔

(خ ی ط)

اَلْخَيْطُ: دھاگا۔ وَالْجَمْعُ اَلْخَيْطُوطُ۔

خَاطٌ (ض) خِيَاطَةٌ وَخَيْطَةُ الثُّوبِ کے معنی کپڑا

سینے کے ہیں اور کپڑا سینے کی سوئی کو اَلْخِيَاطُ کہا جاتا

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ ”یہاں

تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نکل جائے۔“

اور آیت کریمہ:

﴿حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (۲-۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید

دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

میں خَيْطُ أَبْيَضُ اور اَسْوَدُ سے صبح کی سفیدی اور

① قاله ابو ذؤيب يصف مشار العسل وتماهه..... بحرداء مثل الوكف يكوغرابها وفي التهذيب والقالى (۲: ۲۵۸) شطره

الثانى شديد الوصاة نابل وابن نابل والبيت من شواهد الكشاف ۱۴۳ لكن فيه تمامه تدلى ولو المائح المتشمر والله اعلم والبيت فى تهذيب الاصلاح واللسان (سب، خيط .)

② حديث عدى بن حاتم متفق عليه وفى ابى داؤد من حديث الشعبي عنه والصحيح انه صلى الله عليه وسلم قاله مزاحاً ولم يعبره بالحمق وان كانت اللفظة تاتى بمعنى الحمق ايضاً ۱۲.

مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ﴾ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے اور کبھی ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔

جیسا کہ ایک روایت میں ہے ❶

(۱۲۲) يَا خَيْلَ اللَّهِ ارْكَبِي:

اے اللہ! کے سوار! گھوڑے پر سوار ہو جا، تو یہاں خیل بمعنی فارس کے ہے اور ایک حدیث میں ہے۔ ❷

(۱۲۳) عَفَوْتُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ:

شکرا (ایک پرندہ) کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر لحظہ خیال ہوتا ہے۔ کہ دوسرے رنگ کا ہے۔

اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے ❸ (مجرد الکامل)

(۱۴۹) كَأَبِي بَرِاقِشٍ كُلُّ لَوْنٍ لَوْنُهُ يَتَّخِذُ

ابو برقاش کی طرح جو ہر آن نیا رنگ بدلتا ہے۔



جائے اور ہر اس پتے دبلے شخص کو خیال کہا جاتا ہے جو بمنزلہ خیال اور تصور کے ہو۔

التَّخْيِيلُ: (تفہیل) کے معنی کسی کے نفس میں کسی چیز کا خیال یعنی تصور قائم کرنے کے ہیں اور التَّخْيِيلُ معنی از خود اس قسم کا تصور قائم کر لینے کے ہیں۔ اور خَيْلٌ بمعنی ظَنَنْتُ آتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مضمون چیز بھی بمنزلہ خیال کے ہوتی ہے۔

خَيْلَتِ السَّمَاءُ: آسمان میں بارش کا سماں نظر آنے لگا۔

فُلَانٌ مُخْيِلٌ بَكْدًا: فلاں اس کا سزاوار ہے اصل میں اس کے معنی یہ ہیں کہ فلاں اس خیال کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اَلْخَيْلَاءُ تکبر جو کسی ایسی فضیلت کے تخیل پر مبنی ہو جو انسان اپنے اندر خیال کرتا ہو۔ اسی سے لفظ خیل لیا گیا ہے کیونکہ جو شخص گھوڑے پر سوار ہو وہ اپنے اندر نخوت و غرور پاتا ہے۔ دراصل خیل کا لفظ گھوڑے اور سوار دونوں کے

❶ رواہ الشيخ فى الناسخ والنسخ وعزاه المهبلى فى الروض لمسلم والحديث باختلاف الفاظه فى ابى داؤد والمستدرک للحاکم وفى الردة للعواقدى قاله خاند بن الوليد لاصحابه يوم اليمامة راجع الکافى رقم ۲۹۴ والحيوان ۱: ۳۳۵ من كلمات النبى صلى الله عليه وسلم لم يتقدمه فيها احد وفى اضداد ابى الطيب يقولون ياخييل الله اركبى على القلب وعده من المجاز.

❷ رواه ابو داؤد والترمذى من حديث على مرفوعاً قال الدارقطنى الصواب وقفه على على وفى المسئلة اختلاف راجع لاختلاف الفاظه النيل ۴: ۱۴۶-۱۴۷ وكنز العمال ۶ رقم ۱۲۵۸.

❸ قاله الاسدى فى ذم قوم مشهورين بالمقالح وفى المطبوع مسامدات "كادت" بدل كابي مصحف راجع اللسان (برقش) والافتضاب ۳۵۳ والعيون ۲: ۲۹۶ والحيوان (۲: ۴۷) وانظر للبيت والروايات ومماثل فيه ديوان المعانى (۱: ۲۸۲) وخزانة الادب ۳: ۶۶۰ والصناعتين ۱۰۳ وذيل الامالى ۸۳ والمحاضرات للمؤلف (۱: ۱۵).

کِتَابُ الدَّالِّ

(د ب)

﴿وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِنْ مَّاءٍ﴾ (۲۴-۲۵) اور

خدا ہی نے ہر چلتے پھرتے جانور کو پانی سے پیدا کیا۔

﴿وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ﴾ (۲-۱۶۴) اور زمین پر

ہر قسم کے جانور پھیلائے ہیں۔

﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾

(۱۱-۶) اور زمین پر چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق

اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔

﴿وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ

بِجَنَاحَيْهِ.....﴾ (۲-۳۸) اور زمین پر چلنے پھرنے والا

(حیوان) یا دوپروں سے اڑنے والا پرند نہیں ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ

عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾ (۳۵-۳۵) اور اگر خدا

لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین

پر کسی ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

کی تفسیر میں ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہاں دَابَّةٌ سے خاص

کر انسان مراد ہیں ۱ مگر اولیٰ یہ ہے کہ اسے عموم پر رکھا

جائے اور اس سے ہر ذی حیات چیز مراد لی جائے۔ اور

آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً

الدَّابُّ کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں کہا جاتا ہے۔

دَابٌّ فِي السَّيْرِ دَابًّا: وہ مسلسل چلا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ﴾ (۱۳-۳۳)

اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں

(دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں۔

نیز دَابٌّ کا لفظ عادتاً سترہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿كَذَابٍ آلِ فِرْعَوْنَ﴾ (۳-۱) ان کا حال بھی

فرعونوں جیسا ہے۔

یعنی ان کی عادات جس پر وہ ہمیشہ چلتے رہے ہیں۔

(د ب ب)

الدَّبُّ وَالِدَيْبُ: (ض) کے معنی آہستہ آہستہ

چلنے اور ریگننے کے ہیں۔ یہ لفظ حیوانات اور زیادہ تر

حشرات الارض کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور

شراب اور کہنگی وغیرہ کے (جسم اور کپڑے وغیرہ میں)

سرایت کر جانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جن کی حرکات

کا علم حاسہ بھر سے ادراک نہ ہو سکتا ہو۔ یہ لفظ گو عرف

میں خاص کر گھوڑے پر بولا جاتا ہے مگر (لغت) ہر حیوان

یعنی ذی حیات چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن

پاک میں ہے:

۱ ونصہ ومجاز دابة ما هنا انسان راجع مجازہ (۲: ۱۵۶) وقارن الطبری ۱۲.

جنگ کے روزان سے پیٹھ پھیرے گا۔

﴿يَضْرِبُونَ وُجُوهُهُمْ وَأَذْبَارَهُمْ﴾ (۸-۵۰) ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر (کوڑے و ہتھوڑے وغیرہ) مارتے ہیں۔

﴿فَلَا تُولُوهُمْ الْأَذْبَارَ﴾ (۸-۱۵) تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔

یعنی ہزیمت خوردہ ہو کر مت بھاگو اور آیت کریمہ:

﴿وَأَذْبَارَ السُّجُودِ﴾ (۵۰-۴۰) اور نماز کے بعد (بھی) میں ادبار کے معنی نمازوں کے آخری حصے (یا نمازوں کے بعد) کے ہیں۔ اور ﴿أَذْبَارَ النُّجُومِ﴾ (۵۲-۳۹)

میں یہ مصدر بمعنی ظرف ہوگا یعنی ستاروں کے ڈوبنے کا وقت جیسا کہ مَقْدَمُ الْحَاجِّ اور خُفُوقُ النَّجْمِ میں ہے۔ اور اذْبَارٌ (فتح الهمزة) ہونے کی صورت میں جمع

ہوگی۔ اور الدبر سے مشتقات (جیسے دَبْرٌ وَادْبَرٌ وَدَابِرٌ) کبھی باعتبار فاعل (یعنی فعل لازم) کے استعمال ہوتے

ہیں۔ جیسے: دَبْرَ فُلَانٍ (فلاں نے پیٹھ پھیری) اَمْسِ الدَّابِرُ (کُلْ گدشتہ) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاللَّيْلُ إِذْ دَبَّرَ﴾ (۳۳-۷۳) اور رات کی جب پیٹھ پھیرنے لگے۔

اور کبھی باعتبار مفعول (یعنی فعل متعدی) کے جیسے دَبَّرَ السَّهْمُ الْهَدَفَ: (تیر نشانہ سے پرے گر پڑا)۔

دَبَّرَ فُلَانٌ الْقَوْمَ: (یعنی وہ قوم سے پیچھے رہ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَقَطَّعَ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ (۶-۳۵)

وَمِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ﴾ (۲۷-۸۲) اور جب ان کے بارے میں (عذاب کا) وعدہ پورا ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین میں سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک غیر معروف قسم کا جانور ہوگا جو قیامت کے قریب خروج کرے گا۔ اور بعض نے اس سے وہ شریہ لوگ مراد لئے ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہوں گے۔ اس صورت میں لفظ دَابَّةٌ جمع ہوگا (جیسا کہ خَائِنٌ کی جمع خَائِنَةٌ آجاتی ہے) اور ہر چلنے پھرنے والی چیز کو شامل ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۸-۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانوروں میں سب سے بدتر۔

میں دَوَابٌّ کا لفظ جملہ حیوانات کو شامل ہے۔ محاورہ ہے: نَاقَةٌ دَبُّوبٌ: ضعف اور سستی کی وجہ سے آہستہ چلنے والی اونٹنی۔

مَا بِالْدَّارِ دُبِيٌّ: گھر میں کوئی نہیں۔

أَرْضٌ مَدْبُوبَةٌ: وہ زمین جس میں چھوٹے چھوٹے ریگنے والے جانور کثرت سے ہوں۔

(د ب ر)

دُبْرٌ: پشت، مقعد یہ قبل کی ضد ہے اور یہ دونوں لفظ بطور کنایہ جانے مخصوص کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور اس میں دُبْرٌ اور دُبْرٌ دو لغات ہیں اس کی جمع اذْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُولِهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبْرَهُ﴾ (۸-۱۶) اور جو شخص

① وَدُبِيٌّ قَالَ الْحَبِيرِيُّ وَلَا يَتَكَلَّمُ بِهَا إِلَّا فِي الْحَدِّ إِذَا نَفَى .

دشمنی کرنے کے ہیں۔

التَّدْبِيرُ: (تفعلیل) کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْمُدْبِرَاتِ أَمْرًا﴾ (۵-۷۹) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔

یعنی وہ فرشتے جو امور دینیوں کے انتظام کے لئے مقرر ہیں۔ التَّدْبِيرُ: (یضاً) آزاد کردن بندہ پس از مرگ۔

الدَّبَارُ: (فتح الدال) ہلاکت جو قوم کی جڑ کو کاٹ ڈالے۔ نیز ایام جاہلیت میں بدھ کے دن کو دوبار کہا جاتا تھا۔ کیونکہ عرب لوگ اس سے بدشگونی لیتے تھے۔

الدَّبِيرُ: ریسماں کہ برکشند بوقت رشتن سپس اودیہ (وَضِدَّ آس قَبِيلِ اسْت)

رَجُلٌ مُقَابِلٌ وَ مَدَابِرٌ: نجیب الطرفین۔
شَاةٌ مُقَابِلَةٌ مَدَابِرَةٌ: کبری جس کا اگلی اور پچھلی جانب سے کان کٹا ہوا ہو۔

دَابِرَةُ الطَّائِرِ: پرند کے پاؤں کا رخا پرندگی پانچویں اگلی جو دوسری انگلیوں کے اوپر نکلتی ہے۔

دَابِرَةُ الْحَافِرِ: ناخن کہ بر بازوئے ستور بر آید۔
الدَّبْوْرُ: پچھوئی ہوا۔ الدَّبْرَةُ: قابل کاشت زمین کا ٹکڑا

اس کی جمع دَبَارٌ ہے شاعر نے کہا ہے کہ ﴿طویل﴾
(۱۵۰) جَرَبَةٌ تَعْلُو الدَّبَارَ عُرُوبُهُا

غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔

﴿إِنَّ دَابِرَهُ هُوَ لَاءِ مَقْطُوعٌ مُصْبِحِينَ﴾ (۱۵)۔
(۶۶) کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جائے گی۔

اور دَابِرُ کے معنی متاخر یا تابع کے آتے ہیں خواہ وہ تاخر باعتبار مکان یا زمان کے ہو اور خواہ باعتبار مرتبہ کے۔

أَدْبَرُ: اعراض کرنا۔ پشت پھیرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ﴾ (۴۳-۲۳) اور پھر پشت پھیر کر چلا اور (قبول حق سے) غرور کیا۔

﴿تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى﴾ (۷۰-۱۷) ان لوگوں کو بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا۔ حدیث میں ہے:

(۱۲۵) لَا تَقَاطِعُوا وَلَا تَدَابِرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا: کہ نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور نہ آپس میں روٹھو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔

بعض نے لَا تَدَابِرُوا کے معنی یہ کئے ہیں کہ پس پشت ایک دوسرے کی برائی بیان نہ کرو۔

أَلَا سَتَدْبَارُ: (استفعال) پشت پھیرنا۔ کسی چیز کے پیچھے ہونے کو طلب کرنا۔

تَدَابِرَ الْقَوْمِ: باہم اختلاف کر کے قطع تعلق کرنا۔

الدَّبَارُ: یہ دَابِرَةٌ کا مصدر ہے جس کے معنی پس پشت

① متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ ورواہ البخاری عن انس بمعناه والطبرانی عن ابی ایوب راجع کنز العمال ۹: ۲۲۹ و ۹۳۸ و تخریج الاحیاء ۲: ۱۷۸، ۱۸۰۔

② قاله بشر بن ابی حازم و تکملته: تحدر ماء البئر عن جرشینته علی و فی المطبوع جریہ (بالیاء) مصحف و الصواب بالموحدة و النشاء و معناه المزرعة و الدبار جمع دبرۃ اودبارۃ و هی القطعة من المزرعة و المجرشۃ نافۃ منسوبة الی جرش و هی ارض باليمن و اهلها یتساقون علی الابل فالشاعر شبه تحدر دموعه بتحدر ماء علی جریہ من غروب یتسقی علیها کذا قال الجوهری جرش، دبر) و البیت ایضاً فی اللسان (جرش، دبر، جرش) و المفضلیات ۲: ۳۰ و فیہ القرب مکان البئر راجع ایضاً البلدان (رسم جرش) و فیہ ان جرش فتحت فی حیاة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سنة عشر من الهجرة صلحاً علی الفیء و جرش بالضم و الفتح ۱۲۔

ہوں اُسے دائر کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ دِثْرٌ مَالٍ: وہ مال کی اچھی طرح خبر گیری کرنے والا ہے۔

(د ح ر)

الدَّحْرُ وَالذَّحُورُ: (ن) کے معنی دھکار دینے اور دور کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَخْرَجَ مِنْهَا مَذءً وَمَا مَدْحُورًا﴾ (۷-۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل دھکارا ہوا۔

﴿فَتَلَقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا﴾ (۷-۳۵) ملامت زدہ اور درگاہِ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔

﴿وَيُفْقَدُونَ مِنَ كُلِّ جَانِبٍ دُحُورًا﴾ (۳۷-۹) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں (یعنی وہاں سے) نکال دیئے گئے۔

(د ح ض)

دَاحِضَةٌ: (اسم فاعل) باطل اور زائل ہونے والی (دلیل) قرآن پاک میں ہے:

﴿حُجَّتْهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۳۲-۱۶) ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی دلیل بالکل بودی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اَدْحَضْتُ فُلَانًا فِي حُجَّتِهِ فَدَحَصَّ وَأَدْحَضْتُ حُجَّتَهُ فَدَحَضْتُ (میں نے اس کی دلیل کو باطل کیا تو وہ باطل ہو گئی) ❶

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ

جیسے کہ یمنی اونٹنی کے پانی سے بھرے ہوئے ڈول زمین پر گرتے ہیں۔

الدَّبْرُ: شہد کی مکھیوں، بھڑوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا غول جن کا ڈنگ ان کی مقعد پر ہوتا ہے۔ اس کا واحد دَبْرَةٌ ہے۔

الدَّبْرُ: مال کثیر جو میت چھوڑ مرے۔ اس کا شنیہ اور جمع نہیں آتا۔ ❶

دَبْرَ البَعِيرِ: زخمی پیڑھ والا ہونا۔ ایسے اونٹ کو ادْبْرٌ و دَبْرٌ کہتے ہیں۔ الدَّبْرَةُ: (فتح الباء و سکون ہا) شکست درکار زار۔ ❶

(د ث ر)

الْمُدَّتْرُ: (از تفعّل) اصل میں مُتَدَتِّرٌ تھا۔ تاء کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا۔ اس کے معنی کپڑا اوڑھنے والے کے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دَثَرْتُهُ فَتَدَّتْرُ: (میں نے اسے کپڑے میں لپیٹا چنانچہ وہ لپٹ گیا) قرآن پاک میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّتِّرُ﴾ (۷۳-۱) اے (محمد ﷺ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔ الدَّتَارُ: وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ

جائے جیسے چادر کبیل وغیرہ۔

تَدَّتْرَ الفَحْلُ النَّاقَةَ: سانڈھ اونٹنی پر چڑھ گیا۔

تَدَّتْرَ الرَّجُلُ الفَرَسَ: آدمی گھوڑے پر کوو کر سوار ہو گیا۔ رَجُلٌ دَثُورٌ: گم نام آدمی۔

سَيْفٌ دَاثِرٌ: زنگ آلود تلوار، جسے پالش کئے بہت عرصہ گزر گیا ہو۔ اسی سے جس منزل کے نشانات مٹ گئے

❶ كذا في الصحاح.

❷ ومنه المثل شر الرأى الدبرى اى الذى يسنع احيراً عند فوت الحاجة.

❸ وفي التنزيل: فساهم فكان من المدحضين ۳۷-۱۴۱.

دینے کی جگہ کے ہیں۔ یہ دَحَوْتُ سے اُفْعُولُ کے وزن پر ہے۔ دَحِيَّةٌ ایک مرد کا نام تھا (جو دحیہ کلبی کے نام سے مشہور تھا)۔

(د خ و)

الدَّخْرُ وَاللُّدْخُورُ: (ف۔س) کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ اَدَّخَرْتُهُ فَدَخِرَ: میں نے اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَهُمْ دَاخِرُونَ﴾ (۱۶-۴۸) اور وہ ذلیل ہو کر۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ (۲۰-۶۰) جو لوگ میری عبادت سے ازراہ تکبر کنیا تے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔

اور يَدْخِرُ اصل میں يَدْخِرُ تھا۔ پہلے تاہ کو دال سے تبدیل کیا پھر زال کو دال بنا کر دال کو دال میں ادغام کر کے يَدْخِرُ بنا لیا اور یہ اس باب (دخ ر) سے نہیں ہے۔

(د خ ل)

الدَّخُولُ: (ن) یہ خروج کی ضد ہے۔ اور مکان و زمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔ دَخَلَ مَكَانًا كَذَا (فلاں جگہ میں داخل ہوا)۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿أَدْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (۲-۵۸) کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔

الْحَقُّ ﴿(۱۸-۵۶) اور جو کافر ہیں، وہ باطل (سے استدلال کر کے) جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو اس کے مقام سے پھسلا دیں۔

اصل میں دَحَضُ الرِّجْلِ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں۔ اس بنا پر مناظرہ کے بارے میں کسی نے کہا ہے ﴿ع (اکمال)﴾ (۱۵۱) نَظَرًا يُزِيلُ مَوَاقِعَ الْأَقْدَامِ: ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔ اور بطور استعارہ دَحَضَتِ الشَّمْسُ: کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں۔

(د ح و)

الدَّخْوُ: کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا (۷۹-۳۰) اور اس کے بعد زمین کو اس کے مقرر سے دور کیا۔

یعنی اسے اس کی قرار گاہ سے زائل کر دیا جیسا کہ آیت کریمہ: يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ (۷۳-۱۴) میں ہے۔ یہ دَحَا الْمَطَرُ الْحَصَى عَنْ وَجْهِ الْأَرْضِ: (کہ بارش زمین سے نکل کر بہا کر لے گئی) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے۔

مَرَّ الْفَرَسُ يَدْخُو دَحْوًا، گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا خاک اڑاتا چلا گیا۔ اور اسی سے اُدْحَى السَّعَامُ ہے جس کے معنی ریت میں شتر مرغ کے انڈے

① والبيت من شواهد الكشاف ۱۲۳ واوله: بتقارون اذا التقوا في مجلس - والبيت في محاضرات المؤلف (۱: ۷۳) والصناعيين ۲۸۱، ۳۵۷ وفيه مواضع بدل مواقع واللسان (نظر، فرض، زال) وفي روايته في موطن بدل في مجلس والشرطي في المقاييس (۳: ۲۱) والبيت في المشكل للفتي ۱۳۰ ومحازات القرآن للرضي ۳۴۳ والشوكاني ۲۶۹ والقرطبي ۲۵۶ والفخر (۳۰: ۱۰۰) والبيهر ۳۱۷ والطبري (۲۹: ۳۰) والغريب للفتي ۴۸۲ والبيان للمحافظ (۱: ۱۱) وفي روايته في موقف بدل في مجلس ۱۲.

ارادہ سے داخل ہوں گے۔

اور ان کی حالت اہل دوزخ کی سی نہیں ہوگی جن کے بارے میں قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿الَّذِينَ يُحْشَرُونَ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ﴾ (۲۵-۳۴) جو لوگ اپنے چہروں کے بل دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

﴿إِذَا لَا غَلَاظَ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ﴾ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے۔

اور مُدْخَلًا پڑھا جائے تو یہ لِيُدْخِلَنَّهُمْ مُدْخَلًا يَرَوْنَهُ کی طرح ہوگا۔

إِدْخَلَ: کسی جگہ میں بہ صد مشقت داخل ہونا، گھس جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

لَيُوجِدُونَ مَلْجَأًا أَوْ مَعَارَاتٍ أَوْ مُدْخَلًا (۹-۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا (زمین کے اندر گھسنے کی جگہ مل جائے۔

الْمُدْخَلُ: یہ دَعَلَ کی طرح اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعویٰ کرنے سے کٹنا یہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے۔

دُخِلَ فُلَانٌ ﴿فِي عَقْلِهِ أَوْ جَسَدِهِ﴾ فَهُوَ مُدْخُولٌ وَدَخِلَ (س) دَخَلًا (کنایہ) یعنی اس کے عقل و جسم یا اصل میں خرابی پائی جاتی ہے۔ اسی سے اندر سے کھوکھلے درخت کو شَجَرَةً مُدْخُولَةً کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ

أُدْخِلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

(۱۶-۳۲) جو تم عمل کیا کرتے تھے ان کے بدلے بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

﴿أُدْخِلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾

(۱۶-۲۹) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

الْأَنْهَارُ﴾ (۵۸-۲۲) اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں داخل کرے گا۔

﴿وَيُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ﴾

(۷۶-۳۱) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَقُلْ رَبِّ ادْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾

(۱۷-۸) اور کہو کہ اے پروردگار! مجھے (مدینے میں) اچھی طرح داخل کیجیے۔

میں مُدْخَلٌ (فتح الیم) دَخَلَ يَدْخُلُ سے

ہوگا اور مُدْخَلٌ (بضم میم) ہو تو اَدْخَلَ يَدْخُلُ سے جیسے فرمایا:

﴿لِيُدْخِلَنَّهُمْ مُدْخَلًا يَرَوْنَهُ﴾

(۲۲-۵۹) وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾ (۴-۳۱)

میں ہر دو قراءت منقول ہیں یعنی (میم کا ضمہ اور

فتح) ابوعلی القسوی لکھتے ہیں ۱ کہ مُدْخَلًا (فتح الیم)

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جنت میں قصد اور

۱ الفارسی صاحب الايضاح والتكملة (المتولد ۲۸۸ھ المتوفى ۳۷۷ھ راجع لاحواله (من بحث أمين).

(۱۶-۹۲) تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ بنانے لگو۔

دَخَنَتِ النَّارُ تَدَخُنُ: آگ کا کثرت سے دھواں دینا۔ اسی سے دُخْنَةٌ ہے لیکن عرف میں اس خوشبو کو دُخْنَةٌ کہا جاتا ہے جس سے دھوئی دی جاتی ہے۔ دَخَنَ الطَّبِيخُ پکی ہوئی چیز کا دھوئیں سے خراب ہو جانا۔ اور دُخَانٌ سے لون (رنگ) کے معنی لے کر کہا جاتا ہے۔ شَاةٌ دَخْنَاءٌ وَذَابَتْ دَخْنَةً دھوئیں جیسی سیاہ بکری۔ لَيْلَةٌ دَخْنَانَةٌ: تاریک رات۔

اور اس سے ایذا رسائی کے معنی لے کر هُوَ دَخِنُ الْخَلْقِ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی وہ بدخلق ہے۔ ایک روایت میں ہے۔^۱
(۱۲۵) هُدْنَةٌ عَلِيٌّ دَخِنٌ یعنی صلح ہو جائے گی لیکن دلوں میں کینہ ہوگا۔

(د ر)

الْمَذْرَأُ: (صیغہ مبالغہ) بہت برسنے والا۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِذْرَارًا﴾ (۶-۶) اور ان پر آسمان سے لگا تارینہ برسایا۔
﴿يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِذْرَارًا﴾ (۱-۱۱) وہ تم پر آسمان سے لگا تارینہ برسائے گا۔

اص میں مِذْرَارٌ، دَرٌّ اور دَرَّةٌ سے ہے جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ پھر بطور استعارہ بارش کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ اونٹ کے دیگر اسماء و اوصاف بطور

الذَّخَالُ: (الابل) وہ اونٹ جو ایک مرتبہ پانی پی چکا ہو اور اسے دوبارہ پیا سے اونٹوں کے درمیان حوض پر داخل کیا جائے تا کہ مزید پانی پی لے۔ الذَّخَلُ: ایک چھوٹا سا دھند لے رنگ کا پرند اور اسے دُخَلٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گنجان درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔

الدَّوْحَلَةُ: کھجور کے پتوں کا زنبیل۔
دَخَلَ بِأَمْرَةٍ تَمَّ (کنایہ) اس نے اپنی عورت سے مباشرت کی۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿مِنْ نِّسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ (۴-۲۳)
جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو..... ہاں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو (ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں) تم پر کچھ گناہ نہیں۔

(د خ ن)

الدَّخَانُ: یہ اَلْعَثَانُ کے ہم معنی ہے یعنی اس دھوئیں کو کہتے ہیں جو آگ کے شعلہ کے ساتھ نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ (۳۱-۱۱)
پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دھوئیں کی مثل تھا یعنی اس میں تماسک نہیں

۱ من حدیث حذیفة بن الیمان وبعده وجماعة علی اقداء مثل لکدورنیا تمہم وفقد تصافیہم الفائق ۲: ۳۲۲ و ابو داؤد (۲۱: ۵۸۳)۔

استعارہ ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

لِئِنَّ دَرَّةً اس کی خوبی اللہ کے لئے ہے (تعجب)
دَرَّةً لَكَ: تمہاری خیر زیادہ ہو۔

پھر بطور استعارہ بازار کے پر رونق ہونے پر لِّلْسُوقِ دِرَّةً (بازار پر رونق ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

مثل مشہور ہے (مثل) سَبَقَتْ دِرَّةً غِرَارَةً: اس کی تلوار پر خون سبقت کر جاتا ہے۔ جیسا کہ ضرب المثل کے طور پر (مثل) سَبَقَ سَيْلُهُ مَطْرَةً (اس کی بارش سے قبل ہی سیلاب آ جاتا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ اسْتَدْرَبْتُ الْمَعْزَى: یعنی بکری نے ز سے جفتی کی خواہش کی کیونکہ بکری حاملہ ہوگی تو بچہ جنے گی اور بچہ جنے گی تو دودھ دے گی لہذا اسْتَدْرَبْتُ بول کر ز کی خواہش سے کنایہ کیا جاتا ہے۔

(د ر ی)

الْدَّرَاءُ: (ف) کے معنی (نیزہ وغیرہ کے) ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

قَوْمٌ دَرَّةً: میں نے اس کی کچی کو درست کر دیا۔ دَرَّتْ عَنْهُ: میں نے اس سے دفع کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَذُرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾ (۲۲-۱۳) اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

﴿وَيَذُرُوا عَنْهَا الْعَذَابَ﴾ (۱۸-۱۳) اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔

حدیث میں ہے۔ (۱۲۶) اِذْرَوْا الْحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ

شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو اس میں متنبہ کیا گیا ہے حدود کو دفع کرنے کے لئے حیلہ کرنا چاہیے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاذْرَوْا وَاعْنِ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ﴾ (۳-۱۶۸) تو اپنے اوپر سے موت کو نال دینا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاذْرَأْتُمْ فِيهَا﴾ (۲-۷۲) (تو اس میں تم باہم جھگڑنے لگے۔ میں اِذْرَأْتُمْ اصل میں تَذَارَأْتُمْ ہے

تخفیف کے لئے تاء کو دال سے بدل کر ادغام کر دیا گیا ہے اور شروع میں ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے لہذا یہ اِفَاعَلْتُمْ کے وزن پر ہے۔ بعض ادباء نے کہا ہے کہ اِذْرَأْتُمْ بروزن اِفْتَعَلْتُمْ ہے مگر یہ چند وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔ اول یہ کہ اِذْرَأْتُمْ کے آٹھ حروف ہیں اور اِفْتَعَلْتُمْ کے صرف سات حروف ہیں۔ دوم یہ کہ اس میں ہمزہ وصلی کے بعد حرف تاء ہے جسے دال سے تبدیل کیا گیا ہے اور اِفْتَعَلْتُمْ (میں ایسے نہیں ہے) سوم یہ کہ اگر اِفْتَعَلْتُمْ کے وزن پر ہوتا ہے تو دوسرے حرف کے بعد دال کو تاء سے تبدیل کرنا چاہئے تھا۔ چہاں یہ کہ جس فعل کا عین کلمہ حرف صحیح ہو اس میں تاء افعال کا مابعد ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ مگر یہاں اسے ساکن بنا لیا گیا ہے۔ پنجم یہ کہ یہاں تاء اور دال کے درمیان حرف زائد لایا گیا ہے۔ حالانکہ باب افعال میں یہ نہیں ہوتا۔ ششم یہ کہ اسے باب افعال سے ماننے کی صورت میں الف کو عین کلمہ ماننا پڑے گا۔ حالانکہ وہ موضع عین میں نہیں ہے۔

① روی عن علی مرفوعاً لکنہ منکرو عن ابن مسعود موقوفاً وفي مسند ابی حنیفۃ الحارثی عن ابن عباس مرفوعاً وکذا عن عقبۃ بن عامر ومعاذ وعمرو غیر واحد من الصحابۃ لکن جملة الآثار لاتخلو عن ضعف اونکارۃ واضح مافیہ قول ابن مسعود راجع النیل (۷): ۱۱۰-۱۱۱) وبمعناه فی ابن ماجہ وعن عائشۃ فی الترمذی موقوفاً.

② قارن الطبری (۱: ۳۵۷-۳۵۶).

دَرَجَ الشَّيْخُ وَالصَّبِيُّ دَرَجَانًا: بوڑھے اور بچے کا اس طرح آہستہ آہستہ چلنا جیسا کہ سیڑھی پر چڑھنے والا چلتا ہے۔

الدَّرَجُ: کتاب یا کپڑے کی تہ اور لپیٹے ہوئے مراسلہ یا کپڑے کو بھی دَرَج کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ دَرَج بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیسا کہ طَوْنَةُ الْمَنِيَّةِ میں طَيِّءٌ کا لفظ موت کے لئے مستعار ہے۔ اور محاورہ ہے۔ مَنْ دَبَّ وَدَرَجَ: جو زندہ اور چل پھر رہا ہے اور جو مر چکا ہے اور اس نے اپنے دفتر زندگی کو لپیٹ لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۷-۱۸۲) ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم نہ ہوگا۔ کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں ہم انہیں کتاب کی طرح لپیٹ لیں گے۔

یہ ان کی بے خبری اور غفلت سے کنایہ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تُطْعَمَنْ مِّنْ أَعْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۸-۲۸)

اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے..... اس کا کہنا نہ ماننا۔

بعض نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے معنی یہ کئے ہیں کہ ہم انہیں بتدریج پکڑیں گے بایں طور کہ انہیں آہستہ آہستہ کسی چیز (جہنم) کے قریب لار ہے ہیں جیسا کہ سیڑھیوں اور منزلوں پر چڑھایا ان سے نیچے اتر جاتا ہے۔

دَرَجُ: چھوٹا سا تھیلا جس میں عورتیں خوشبو اور سنگار کا دیگر سامان رکھتی ہیں۔ الدَّرَجَةُ: وہ لہجہ جسے لپیٹ کر ناقہ کی گس میں رکھ دیا جاتا ہے۔

الدَّرَاجُ: تیز۔ کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔

ہفتم یہ کہ دو حروف افْتَعَلَ کی تاء سے قبل ہیں اور اس کے بعد بھی دو ہی ہیں۔ مگر ادْرَأْتُمْ میں تاء کے بعد تین حروف ہیں۔

(درج)

الدَّرَجَةُ: کا لفظ منزلتہ کے ہم معنی ہے مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مَنْزِلَةٌ (اترنے کی جگہ) کو درجہ اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار کیا جائے ورنہ بسط جگہ پر امتداد کے اعتبار سے اسے درجہ نہیں کہتے جیسا کہ چھت اور سیڑھی کے درجات ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا اطلاق منزلہ رفیعہ یعنی بلند مرتبہ پر بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَلِلرَّجَالِ عَلَىٰ عَنُوبِهِمْ دَرَجَةٌ﴾ (۲-۲۲۸) البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ میں تشبیہ کی ہے کہ عقل و سیاست وغیرہ کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے جس کی طرف آیت:

﴿الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (۴-۳۴)

مرد عورتوں کے قوام اور منتظم ہیں۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور اہل جنت کے متعلق فرمایا: ﴿لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۸-۴) اور ان کے لئے پروردگار کے ہاں (بڑے بڑے) درجے..... ہیں۔

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۳-۲۳) یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصحاب درجات ہوں گے اور تشبیہ کے طور پر ستاروں کے منازل کو دَرَجَاتُ النُّجُوم کہا جاتا ہے۔

مَدْرَجَةٌ: راستے کا وسط اور وسیع حصہ۔

فُلَانٌ يَتَدَرَّجُ فِي كَذَا: فلاں اس پر درجہ بدرجہ چڑھ رہا ہے۔

(درک)

الدَّرَكُ اور دَرَجُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن الدَّرَجُ کا لفظ اوپر چڑھنے کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اور الدَّرَكُ کا لفظ نیچے اترنے کے لحاظ سے اس لئے دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ اور دَرَكَاتُ النَّارِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ پستی کے اعتبار سے دوزخ کو هَاوِيَةٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (۳-۱۳۵) کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے۔

اور سمندر کی گہرائی کی تہہ اور اس رسی کو جس کے ساتھ پانی تک پہنچنے کے لئے دوسری رسی ملائی جاتی ہے بھی دَرَكُ کہا جاتا ہے اور دَرَكُ بمعنی تادان بھی آتا ہے مثلاً خرید و فروخت میں بیعنا کو دَرَكُ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿لَا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَى﴾ (۲۰-۷) پھر تم کو نہ تو (فرعون کے) آپکڑنے کا خوف ہوگا اور نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔

أَدْرَكَ: کسی چیز کی غایت کو پہنچنا، یا پالینا جیسے کہ أَدْرَكَ الصَّبِيَّ: لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچ گیا یعنی بالغ ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ (۱۰-۹۰) یہاں تک کہ اس کو غرق (کے عذاب) نے آپکڑا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ (۶-۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ کو بعض نے ادراک بصری کی نفی پر حمل کیا ہے اور بعض نے ادراک کی نفی بلحاظ بصیرت مراد لی ہے اور کہا ہے کہ اس آیت سے

(درس)

دَرَسَ الدَّارُ: گھر کے نشان باقی رہ گئے اور نشان کا باقی رہنا چونکہ شے کے فی ذاتہ مٹنے کو چاہتا ہے اس لئے دُرُوسِ کے معنی اِنْجَاء یعنی مٹ جانا کر لئے جاتے ہیں اسی طرح دَرَسْتُ الْكِتَابَ وَالْعِلْمَ کے اصل معنی کتاب یا علم کو حفظ کر کے اس کا اثر لے لینے کے ہیں اور اثر کا حاصل ہونا مسلسل قرأت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے دَرَسْتُ الْكِتَابَ کے معنی مسلسل پڑھنا کے آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَدَرَسُوا مَا فِيهِ﴾ (۷-۶۹) اور جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا ہے۔

﴿بِمَا كُنتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ﴾ (۳-۷۹) کیونکہ تم کتاب (خدا کی) تعلیم دیتے اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔

﴿وَمَا أَتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا﴾ (۳۳-۳۴) اور ہم نے نہ تو ان کو کتابیں دیں جن کو یہ پڑھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلْيَقُولُوا دَرَسْتُ﴾ (۶-۱۰۵) میں ایک قرأت دَارَسْتُ بھی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کافر یہ نہ کہیں

کہ تم نے کتاب کو دوسروں سے پڑھ لیا۔ بعض نے کہا ہے کہ: ﴿وَدَرَسُوا مَا فِيهِ﴾ (۳-۷۹) کے معنی یہ

ہیں کہ انہوں نے اس پر عمل ترک کر دیا اور یہ دَرَسَ الْقَوْمِ الْمَكَانَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی انہوں نے مکان کے نشانات مٹا دیئے۔ دَرَسَتِ الْمَرْأَةُ (کنایہ) عورت کا حائضہ ہونا۔ دَرَسَ الْبَعِيرُ: اونٹ کے جسم پر خارش کے اثرات ظاہر ہونا۔

عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ ہے۔ حسن نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ امورِ آخرت سے سراسر غافل ہیں، مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ آخرت کو پالینے سے انکا علم منتہی ہو چکا ہے۔ اس بنا پر وہ اس سے جاہل اور بے خبر ہیں۔ بعض نے کہا ہے: اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں آخرت میں ان چیزوں کی حقیقت معلوم ہو جائے گی کیونکہ دنیا میں جو چیزیں محض ظنون نظر آتی ہیں آخرت میں ان کے متعلق یقین حاصل ہو جائے گا۔

(درہم)

الدَّرْهَمُ: چاندی کے ایک سکہ کا نام ہے اس کی جمع دَرَاهِمٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمٍ مَعْدُودَةٍ﴾ (۱۲-۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔

(دری)

الدَّرِيَّةُ: اس معرفت کو کہتے ہیں جو کسی قسم کے حیلہ یا تدبیر سے حاصل کی جائے اور یہ دَرِيَّةٌ وَدَرِيْتُ بِهٖ دَرِيَّةٌ: دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (یعنی اس کا تعدیہ باء کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اور باء کے بغیر بھی) جیسا کہ قَطِنْتُ وَشَعَرْتُ ہے اور اَدْرَيْتُ بمعنی دَرَيْتُ آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الوافر﴾ (۱۵۲)

وَمَاذَا يَدْرِي الشُّعْرَاءُ مِنِّي
وَقَدْ جَاوَزْتُ رَأْسَ الْأَرْبَعِينَ

اور شعراء مجھے کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں جب کہ میں

اس معنی پر تنبیہ کی ہے کہ جو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول "يَا مَنْ غَايَةُ مَعْرِفَتِهِ الْقُصُورُ عَنْ مَعْرِفَتِهِ:" اے وہ ذات جس کی غایت معرفت بھی اس کی معرفت سے کوتاہی کا نام ہے۔) میں پایا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی غایت یہ ہے کہ انسان کو تمام اشیاء کا کما حقہ علم حاصل ہونے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ ذات باری تعالیٰ نہ کسی کی جنس ہے اور نہ کسی چیز کی مثل ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کی موجد ہے۔

التَّدَارُكُ: (پالینا) نہ زیادہ تر نعمت اور فریادری کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْلَا أَنْ تَدَارَكُنَا نِعْمَةٌ مِّنْ رَبِّهِ﴾ (۶۸-۳۹) اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی اور آیت کریمہ:

﴿حَتَّىٰ إِذَا دَارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا﴾ (۷-۳۸) یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہو جائیں گے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جب سب کے سب اس میں ایک دوسرے کو آملیں گے۔ پس اِدَارَكُوا اصل میں تَدَارَكُوا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿بَلْ اِدَارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ (۲۷-۶۶) بلکہ آخرت (کے بارے میں) ان کا علم منتہی ہو چکا ہے۔ میں اِدَارَكَ اصل میں تَدَارَكَ ہے تاہم کو دال میں ادغام کرنے کے بعد ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے جس طرح کہ آیات:

﴿إِنَّا قَلْنُمُ إِلَى الْأَرْضِ﴾ (۹-۳۸) اور ﴿أَطِيرْنَا بِكَ﴾ (۲۷-۳۷) میں ہے ایک قرأت میں بَلْ اِدْرَكَ

① قاله سبحانه بن نيل الرياحي وفي اللسان والمحکم (طبع) حر بدل رأس والبيت في البحرى ۲۵ والكامل ۴۵۰ وفي ترجمته في الاصابة ۱۱۰: ۱۱۰ والسمط (۵۵۸) والسبيوطى ۱۵۷ والبعنى (۱۹۱: ۱) والنخزانية (۱۲۶: ۱) والاصمعيات ۷۳ واصلاح يعقوب ۵۶ او نقد الشعر ۷۰ وفيه تنبغى بدل بدرى ومحالس ثعلب ۱۷۶ والاشباه (۱۵۲: ۴) والبيت كانه مقيدة الغافية وفيه اقراء وبعده: اخو عسمين محتجم اشدى ونجذنى مداورة السنين ۱۱۲.

ہے کیونکہ اگر دَرَاتٌ سے ہوتا تو ولا اذْرَأْتُكُمْ وہ کہا جاتا ❶ اور جہاں کہیں قرآن پاک میں وَمَا يُذْرِيكَ آیا ہے اس کے بعد اس کا بیان مذکور نہیں ہے ❷

(جیسے فرمایا): ﴿وَمَا يُذْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكِيٰ﴾ (۸۰-۳) اور تم کو کیا خبر کہ شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔ ﴿وَمَا يُذْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ﴾ (۴۲-۱۷) اور تم کو کیا معلوم کہ شاید قیامت قریب ہی آ چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ در آیۃ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔ اور شاعر کا قول ہے ❸

(۱۵۳) لَا هَمَّ لَا اذْرِيْ وَاَنْتَ الدَّارِيْ

اے اللہ! میں نہیں جانتا اور تو خوب جانتا ہے۔

میں جو اَنْتَ الدَّارِيْ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے تو یہ سمجھ اور اجڈ بد کا قول ہے (لہذا حجت نہیں ہو سکتا) اَلدَّرِيَّةُ: (۱) ایک قسم کا حلقہ جس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔

(۲) وہ اونٹنی جسے شکار کو مانوس کر نیکے لئے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور شکاری اس کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ شکار کر سکے۔

اَلْمَذْرِيْ (۱) بکری کا سینگ کیونکہ وہ اس کے ذریعہ مدافعت کرتی ہے۔ اسی سے استعارۃً کنگھی یا باریک سینگ کو مَدْرِيْ کہا جاتا ہے۔ ❹ جس سے عورتیں اپنے بال درست کرتی ہیں۔

چالیس سے تجاوز کر چکا ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا تَذْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهٗ يُحَدِّثْ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ (۶۵-۱۰) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کر دے۔

﴿وَاِنْ اَذْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ﴾ (۲۱-۱۱) اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لئے آزمائش ہو۔ ﴿مَا كُنْتُ تَذْرِيْ مَا الْكِتٰبُ﴾ (۴۲-۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں وَمَا اَذْرٰكُ آیا ہے وہاں بعد میں اس کا بیان بھی لایا گیا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَا اَذْرٰكُ مَا هِيَ نَارٌ حٰمِيَةٌ﴾ (۱۰۱-۱۱) اور تم کیا سمجھے کہ (ہاویہ) کیا ہے؟ (وہ) دھکتی ہوئی آگ ہے۔

﴿وَمَا اَذْرٰكُ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾ (۹۷-۲) اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر۔ ﴿وَمَا اَذْرٰكُ مَا الْحٰقَّةُ﴾ (۶۹-۳) اور تم کو کیا معلوم

ہے کہ سچ بچ ہونے والی کیا چیز ہے؟

﴿ثُمَّ مَا اَذْرٰكُ مَا يَوْمَ الدِّيْنِ﴾ (۸۳-۱۷) اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿قُلْ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا اَذْرٰكُمْ بِهٖ﴾ (۱۰-۱۶) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا تو (نہ تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ میں اَذْرٰكُمْ دَرِيْتُ سے

❶ وفى الصحاح: وقرى (ولاد اذركم به) والوجه فيه ترك الهمزة (ه) وفى اعراب ثلاثين همزة الحسن البصرى فى بعض الايات وكذبه النحويون وكذا الاختلاف فى الدرية - قال ابوزيد هو مهموز لكن الجمهور على ترك الهمزة.

❷ منقول عن الفراء راجع اعراب ثلاثين لابين خالويه ۴۰.

❸ البيت فى الصحاح واللسان (ورى، لهم) وتمامه كل مرئى منك على مقدار ۱۲.

❹ وفى الحديث ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان فى يده مدرى يحك به رأسه (الفائق ۱: ۱۹۶).

(د س ی)

دَسَى: (تفعل) کے معنی کسی چیز کو مٹی میں چھپا دینے اور گم کر دینے کے ہیں۔ یہ اصل میں دَسَسَ تھا تخفیف کے لئے ایک سین کا یاء سے تبدیل کر دیا گیا جیسا کہ تَطَنَّنْتُ سے تَطَنَّنْتُ بنا لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدْ حَابَ مَنْ دَسَّهَا﴾ (۹۱-۱۰) اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد اور ناکام رہا۔

(د ع ع)

الدَّعُّ: کے معنی سختی کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں۔ اصل میں یہ کلمہ زجر ہے جس طرح پھسلنے والے کو (بطور دعا، لعا کہا جاتا ہے اسی طرح دَعَّ دَعَّ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعَا﴾ (۵۲-۱۳) جس دن وہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے۔

﴿فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ﴾ (۱۰۷-۲) یہ وہی (بد بخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

(۱۵۴) دَعَّ الْوَصِيَّ عَلَىٰ قَفَاءِ يَتِيمِهِ

جیسا کہ وصی یتیم کو گڈی پر گھونسا مارتا اور اسے دھکے دیتا ہے۔

(د ع و)

الدَّعَاءُ: (ن) کے معنی ندا کے ہیں مگر نداء کا لفظ کبھی صرف یَا، آيَا وغیر ہا حروفِ ندا پر بولا جاتا ہے۔

(د س ر)

الدُّسْرُ: بیخیں اس کا واحد دَسَارٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَمَلْنَا عَلَىٰ ذَاتِ الْأَوَّاحِ وَدُسْرُ﴾ (۵۳-۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میٹھوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

اصل میں دَسْرٌ کے معنی کسی چیز کو زور سے مار کر ہٹا دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: دَسَّرَهُ بِالرُّمْحِ: اسے نیزہ مار کر پیچھے ہٹا دیا اور رَجُلٌ مِطْعَنٌ کی طرح مِدَسْرٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی بہت بڑے نیزہ باز کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے: ❶

(۱۲۷) لَيْسَ فِي الْعَنْبَرِ زَكْوَةٌ أَنَّمَا هُوَ شَيْءٌ دَسْرَةٌ الْبَحْرِ: کہ عنبر میں زکوٰۃ نہیں ہے وہ ایک چیز ہے جسے سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔

(د س س)

الدَّسُّ: (ن) کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی داخل کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے کہ دَسَسْتُهُ فَدَسَّ: میں نے اسے ٹھونسا تو وہ ٹھنسن گیا۔

دُسَّ الْبَعِيرُ بِالْهِنَاءِ: اونٹ پر زبردستی قطر ان ملی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ قطر ان کے متعلق دَسٌّ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا قرآن پاک میں ہے:

﴿أَمْ يَدْسُهُ فِي التُّرَابِ﴾ (۱۶-۵۹) یا زمین میں گاڑ دی۔

❶ الحدیث موقوف علی ابن عباس راجع الفائق ۱: ۱۹۷ وبحث عنه صاحب الامالی وعنه ايضا ليس العنبر برکاز راجع البخاری

مع الفتح ۸: ۱۰۵.

❷ وفي الحدیث العرق وساس من رواية ابن عمر (الفائق ۱: ۲۲).

السَّاعَةَ غَيْرَ اللَّهِ تَدْعُونَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ بَلْ
إِيَّاهُ تَدْعُونَ ﴿٦-٣١﴾ کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو
اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آ موجود ہو تو کیا تم
(ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟ اگر
سچے ہو (تو بتاؤ) (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی
کو پکارتے ہو۔

میں تشبیہ کی ہے کہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ
تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا اور عاجزی کرتے ہو۔

﴿وَادْعُوا رَبَّكُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (٥٦-٤) اور
خدا سے خوف کرتے ہوئے اور امید رکھ کر دعائیں مانگتے
رہنا۔

﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ﴾ (٣-٢٣) اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار
ہوں ان کو بھی بلاؤ اگر تم سچے ہو۔

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ﴾
(٣٩-٨) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے
پروردگار کو پکارتا (اور) اس کی طرف دل سے رجوع کرتا
ہے۔

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ﴾ (١٠-١)
(١٢) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا ہوا ہمیں پکارتا
ہے۔

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا
يَضُرُّكَ﴾ (١٠-١٠٦) اور خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارتا

اگرچہ ان کے بعد منادئیٰ مذکور نہ ہو لیکن دعاء کا لفظ صرف
اس وقت بولا جاتا ہے جب حروفِ ہدا کے ساتھ اسم
(منادئیٰ) بھی مذکور ہو ﴿جیسے: يَا فُلَانُ﴾۔ کبھی یہ دونوں
یعنی دعا اور ہدا ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءَ وَ
نِدَاءَ﴾ (٢-١٤١) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی
ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سُن
سکے۔

اور کبھی دُعَاء بمعنی تسمیہ (نام رکھنا) آجاتا ہے جیسے
دَعَوْتُ ابْنِي زَيْدًا میں نے اپنے بیٹے کا نام زید رکھا۔

اور آنحضرت کی تعلیم پر رغبت دلاتے ہوئے فرمایا: ﴿
لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ
بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ (٢٣-٦٣) مومنو! پیغمبر کے بلانے
کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو
بلاتے ہو۔

کیونکہ بعض لوگ آنحضرت ﷺ سے مخاطبت کے وقت
آپ کو ”یا محمد“ کہہ کر پکارتے تھے۔ اور دَعَوْتُهُ
کے معنی سوال یا مدد طلب کرنا بھی آتے ہیں۔ ﴿قرآن
پاک میں ہے:

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّنَا﴾ انہوں نے کہا (اب کے)
اپنے پروردگار سے پھر درخواست کیجئے۔ اور آیت کریمہ:
﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ آتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمْ

① لم احده ويرجى. قارن الفتح للحافظ ١٣-٣٣٨.

② كذا ذكر الحافظ في الفتح ١٣-٣٣٨.

③ و حملة القول ان لفظ الدعاء جاء في القرآن لستة معان العبادة ولم يذكره المؤلف والاية ادعوني استجب لكم بمعنى العبادة بدل
ابعدھا والاستغاثة والسؤال والقول والنداء والثناء راجع شرح الاسماء الحسنی لابی القاسم (القشیری).

کی طرف بلاتے ہو۔ تم مجھے اس لئے بلاتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرو اور..... اس کا شریک مقرر کروں۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا جَرَمَ أَنَّ مَا تَدْعُونَ نَبِيَّ إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ﴾
(۴۰-۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا اور آخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں ہے۔

میں دَعْوَةٌ کے معنی رفعت اور عظمت کے ہیں ۱۰ دَعْوَةٌ کے معنی خاص کرنسبت کا دعویٰ کرنے کے آتے ہیں۔ اصل میں یہ قَعْدَةٌ وَجِلْسَةٌ کی طرح فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو حالت کے لئے آتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔

دَعَا دَاعِيَ اللَّبَنِ (مثل) یعنی دودھ اتارنے کے لئے تھوڑا سا دودھ تھنوں میں چھوڑ دے۔ ۱۱

الادِّعَاءُ کے معنی کسی چیز کے متعلق دعویٰ کرنے کے ہیں (کہ یہ میری ہے) اور جنگ میں ادِّعَاءُ کے معنی اپنے کو کسی طرف منسوب کرنا ہوتے ہیں۔ ۱۲ (کہ میں فلاں قوم سے ہوں یا فلاں کا بیٹا ہوں وغیرہ) اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ نَزُّ لًا﴾ (۴۱-۴۳) اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے (موجود ہوگی) (یہ) مہمانی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم جنت میں جو چیز طلب کرو گے حاضر کر دی جائے گی۔

جو نہ تمہارا بھلا کر سکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے۔
اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا﴾ (۲۵-۱۴) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو۔

دعائے ثبور سے يَالَهْفَاهُ يَا حَسْرَتَاهُ وغیرہ کلمات تاسف کہنا اور واو پلا کرنا مراد ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ آج تم پر ایک مصیبت نہیں ہے بلکہ بہت سے غموم و مصائب کا سامنا ہوگا۔ ۱۳

الدُّعَاءُ (إِلَى الشَّيْءِ) کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے پر رغبت دلانے اور اُکسانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ﴾
(۱۲-۳۳) کہ پروردگارا جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰-۲۵) اور اللہ تعالیٰ تو سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

﴿وَيَقَوْمٌ مَّا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۚ تَدْعُونَنِي لَأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأَشْرِكُ بِهِ﴾ (۴۰-۴۲) اور اے قوم میرا حال ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے (دوزخ کی) آگ

۱ وايضاً دعا بمعنی جعل كما في قوله تعالى: ان دعوا للرحمن والبدأ (۱۹-۹۱)۔

۲ كذا نقل عن المؤلف الحافظ في الفتح ۱۳-۳۳۸۔

۳ امر صلى الله عليه وسلم ضرار بن ازور ان يحلب ناقت فقال له (الفائق ۱: ۱۹۸) والنهاية (دعا) وغريب ابى عبيد۔

۴ كما قال صلى الله عليه وسلم يوم الاحد: انا ابن عبدالمطلب ومن الدعوة الدعوى وجمعه ادعاء ۲۳-۴)۔

اللہ تو مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔
﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾
(۲-۲۵۱) اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور
حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰-۷)
(۳،۲) کوئی اس کو نال نہ سکے گا۔ (اور وہ) خدائے صاحب
درجات کی طرف سے (نازل ہوگا)۔

میں دافع کے معنی حامی اور محافظ کے ہیں۔

الْمُدْفَعُ: ہر جگہ سے دھککا ہوا۔ ذلیل اور رسوا۔
الْدَّفَعَةُ: بارش کی بوچھاڑ۔ الدَّفَاعُ سیلاب کا زور۔

(د ف ق)

الْدَّفَقُ: (مصدر) کے معنی سرعت کے ساتھ
بننے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
﴿وَمِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ﴾ (۸۶-۶) (اچھل کر تیزی سے
گرنے والے پانی سے۔

اسی سے بطور استعارہ جَاءُوا دُفْقَةً (وہ یکبارگی آگئے)
کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور تیز رفتار اونٹ کو بَعِيرٌ
أَذْفَقٌ کہتے ہیں۔

مَشَى الدَّفْقَى: اس طرح تیز رفتاری سے چلا جیسے زور
سے بننے والا پانی اچھل کر گرتا ہے اور بہتا ہوا چلا جاتا
ہے۔

مَشَوْ دُفْقًا: وہ تیز چلے۔

(د ک ک)

الْدُّكُّ: (اسم) کے معنی نرم اور ہموار زمین کے

اور دَعْوَى کبھی بمعنی اِدْعَاء بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿فَمَا كَانَ دَعْوُهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بِأَسْنَا﴾ (۷-۵)
تو جس وقت ان پر عذاب آتا تھا ان کے منہ سے یہی نکلتا
تھا۔

اور کبھی بمعنی دعا کے ۱ جیسے فرمایا:

﴿وَأٰخِرُ دَعْوُهُمْ اَنْ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ﴾ (۱۰-۱۰) اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ
خدائے رب العالمین کی حمد اور اس کا شکر ہے۔

(د ف ۱)

الْدَّفءُ: گرمی، حرارت یہ بَزْد (سردی) کی ضد
ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ﴾ (۱۶-۵) ان میں
تمہارے لئے جز اول اور بہت سے فائدے ہیں۔

میں دِفْء سے جاڑے کا سامان مراد ہے۔

رَجُلٌ دِفَانٌ: (مؤنث دِفْءِ) گرمی حاصل کرنے والا۔
بَيْتٌ دِفِيٌّ: گرم مکان۔

(د ف ع)

الْدَّفْعُ: (دفع کرنا، ہٹا دینا) جب اس کا تعدیہ
بذریعہ الیٰ ہو تو اس کے معنی دے دینے اور حوالے کر دینا
ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ﴾ (۳-۶) تو ان کا مال
ان کے حوالے کر دو۔

اور جب بذریعہ عَن متعدی ہو تو اس کے معنی مدافعت اور
حمایت کرنا ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَدْفَعُ عَنِ الدِّينِ أَمْوَالًا﴾ (۲۲-۳۸)

۱ والدعوى ههنا بمعنى القول راجع الفتح للحافظ ۱۳: ۳۳۸.

﴿مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ﴾
 (۱۴-۳۳) تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہو۔ مگر گھن
 کے کیڑے سے۔ اصل میں دلالۃ کا لفظ کنایہ و امارۃ کی
 طرح مصدر ہے۔ اور اسی سے دال صیغہ صفت فاعل ہے
 یعنی وہ جس سے دلالت حاصل ہو اور دلیل صیغہ مبالغہ
 ہے، جیسے عَالِمٌ وَعَلِيمٌ وَقَدِيرٌ ہے کبھی دَالٌ
 وَدَلِيلٌ بمعنی دلالۃ (مصدر آجاتے ہیں) اور یہ تسمیہ
 الشیء بمصدرہ کے قیل سے ہے۔

(دلک)

ذُلُوكُ: (الشَّمْسِ) کے معنی ہیں آفتاب کا
 (زوال) نائل بہ غروب ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوكِ الشَّمْسِ﴾ (۷۸-۷۷)
 (اے محمد ﷺ!) سورج کے ڈھلنے سے نماز
 پڑھا کرو۔

یہ اصل میں ذَلَكْتُ الشَّمْسِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے
 جس کے معنی ہیں کوئی چیز دیکھنے کے لئے آنکھوں کے
 اوپر ہتھیلی رکھ کر دھوپ کو دُفَع کرنا۔ اور اسی سے ذَلَكْتُ
 الشَّيْءِ فِي الرَّاحَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی چیز
 کو ہتھیلی میں لے کر ملنے کے ہیں۔ ذَلَكْتُ الرَّجُلَ:
 لیت لعل کرنا۔

الذُّلُوكُ: ایک قسم کی خوشبو جسے بدن پر ملا جاتا ہے۔
 الدَّلِيلُكُ: ایک قسم کا کھانا جو مسک اور کھجور سے تیار ہوتا
 ہے۔

ہیں۔ اور دَكَّهٗ (ن) دَكَّا کے معنی کوٹ کر ہموار کرنے
 کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً﴾
 (۱۴-۶۹) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھائے جائیں گے۔
 پھر ایک بارگی توڑ کر برابر کر دیئے جائیں گے۔
 ﴿وَدُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ (۲۱-۸۹)
 یعنی زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کر دی جائے گی۔
 ﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجِبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا﴾ (۷-۷)
 (۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر نمودار ہوا تو (تھیلی انوار
 ربانی نے) اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

اور اسی سے دُكَانٌ ہے جس کے معنی ہموار چوترہ کے
 ہیں۔

الذُّكْدَاكُ: نرم ریت۔ اَرْضٌ دَكَّاءُ: ہموار زمین ج دُكْتُ۔
 اور ہموار زمین کے ساتھ تشبیہ دے کر نَاقَةٌ دَكَّاءُ اس اونٹنی
 کو کہہ دیتے ہیں جس کو کوہان نہ ہو۔^۱

(دل ل)

الدَّلَالَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کی معرفت حاصل
 ہو، جیسے الفاظ کا معانی پر دلالت کرنا اور اشارات و رموز اور
 کتابت کا اپنے مفہوم پر دلالت کرنا اور حساب میں عقود کا
 عدد مخصوص پر دلالت کرنا وغیرہ اور پھر دلالت عام ہے کہ
 جاعل یعنی وضع کی وضع سے ہوا یا بغیر وضع اور قصد کے ہو
 مثلاً ایک شخص کسی انسان میں حرکت دیکھ کر جھٹ جان لیتا
 ہے کہ وہ زندہ ہے قرآن پاک میں ہے:

۱ وفی المطبوع الجبال مکان الارض خطاً مطبعی ۱۲۔

۲ قارن المحاز لابی عبیدہ (۱: ۴۱۵)۔

۳ وفی التنزیل ثم جعلنا الشمس علی دلیلاً (۲۵: ۴۵)۔

(دل و)

اموال کے ذریعہ (رشوت دے کر) حکام تک رسائی حاصل کرو۔

اِسْتَدْلَى (تفعل) قریب ہونا۔ اور اترانا قرآن میں ہے:

﴿ثُمَّ دَنَىٰ فَدَلَّىٰ﴾ (۵۳-۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔

(دم دم)

الدَّمَامَةُ: (فعللة) ہلاک کرنا۔ اور آیت:

﴿فَدَمَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ﴾ (۹۱-۱۳) کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انہیں ہلاک کر ڈالا اور پریشان کر بے چین کر دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ دَمَدَمَةٌ (اسم صوت ہے اور) بلی کی آواز کی حکایت کو کہتے ہیں۔ اسی سے دَمَدَمٌ فُلَانٌ فِی كَلَامِهِ کا محاورہ ہے یعنی اس نے پریشان کن سی گفتگو کی۔ دَمَمْتُ الثَّوْبَ کپڑے کو رنگ سے طلا کرنا۔

الدِّمَامُ: ہر چیز جس سے طلا کی جائے۔

بَعِيرٌ مَدْمُومٌ بِالشَّحْمِ۔ بہت موٹا اور چربی والا اونٹ گویا چربی اس پر طلائی کی گئی ہے۔

الدِّمَاءُ وَالدِّمَمَةُ: جنگلی چوہے کا بیل۔

الدِّمَاءُ (تخفیف ميم) وَالذِّيمُومَةُ صحراء، ریگستان۔

دَلَوْتُ الدَّلْوُ: کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں اور اَدْلَيْتَهَا کے معنی ڈول بھر کر نکالنے کے۔ ابومنصور نے لکھا ہے کہ اَدْلَى کے معنی ڈول کنویں میں ڈالنے کے آجاتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ①

﴿فَادْلَىٰ دَلْوَةً﴾ (۱۲-۱۹) اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔ اسی سے بطور استعارہ اَدْلَى کے معنی کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی آجاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے: ②

(۱۵۵) وَلَيْسَ الرِّزْقُ عَنْ طَلَبِ حَيْثِثِ

وَلَكِنْ اَلْقِ دَلْوَكَ فِى الدِّلَاءِ

رزق جدوجہد سے حاصل نہیں ہوتا ہاں تمہیں اس کے لئے وسائل تلاش کرنا چاہیے۔ اس بنا پر وسیلہ کو مائِج کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا: ③

(۱۵۶) وَلِى مَائِجٌ لَّمْ يُورِدِ النَّاسُ قَبْلَهُ

مُعَلًى وَأَشْطَانُ الطَّوْىِ كَثِيرٌ

میرے پاس اظہار مطلب کے لئے ایسا بلند قدر وسیلہ ہے جو اچھوتے مضامین بیان کرتا ہے۔ اور گفتگو کے اسباب بہت ہیں اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَدَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ﴾ (۲-۱۸۸) اور تہ ان

① راجع تاج المصادر لابی جعفر البیهقی .

② البیت فی محاضرات المؤلف ۲: ۴۹۲: ۲ وفی رواية: وما طلب المعيشة بالتمنى ومجموعة المعانى ۱۷۳ والميدانى رقم ۳۳۲۰ مع آخر ولم ارفى المراجع من نسبة .

③ قال العجب السلولى وعنى بالمائج لسانه وفى اللسان (ميج) الماء بدل الناس ويعلى بدل معلى والدلاء بدل الطوى والبيت فى المحكم (ميج) ومحالس ثعلب ۵۲۴-۵۲۳ فى تسعة والازمنة والامكنة (۲: ۱۵۹) وهى قصيدة فى ۱۱ بيتاً انشدھا الشاعر بين يدى عبدالملك بن مروان والعجبر هو عمير بن عبدالله بن عبيدة شاعر مقل وكان حبيبا راجع الاغانى (۱۱: ۱۴۶-۱۵۳) والخزانة (۲: ۳۹۹) وابن سلام (۱۹۹-۲۰۰) .

ہیں (اس سے نیست و نابود کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ﴾
(۲۱-۱۸) (نہیں) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا مغز توڑ دیتا ہے۔

حُجَّةٌ دَائِمَةٌ: حجت قاطعہ، ہر پھوڑ دہل۔ نیز دَائِمَةٌ ایک قسم کے شگوفہ کو کہتے ہیں جو کھجور کے تناسے پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر اسے کاٹنا نہ جائے تو کھجور کے درخت کو خشک اور خراب کر دیتا ہے۔ نیز دَائِمَةٌ اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جو پالان کی لکڑی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے۔ یہ تمام الفاظ دَمَغٌ سے بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔ جس کے معنی دماغ کو توڑنا کے ہیں۔

(د م ی)

الدَّمُّ: خون۔ یہ اصل میں دَمِيٌّ تھا (یاد کو برائے تخفیف حذف کر دیا ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿حُضِرْمَتٌ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُّ﴾ (۵-۳) تم پر مردار جانور اور (بہتا) ہوا ہوا..... یہ سب حرام ہے۔ دَمٌ کی جمع دَمَاءٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ﴾ (۲-۱۴۰) کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔ دَمِيَّتٌ (س) الْجَرَاحَةُ: زخم سے خون بہنا۔ فَرَسٌ مَدْمِيٌّ: خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔ الدَّمِيَّةُ: گڑیا (جو خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو) سَجَّةٌ دَائِمَةٌ: سرکارِ زخم جس سے خون بہہ رہا ہو۔

(د ن ر)

الدَّيْتَارُ: (اشرفی) اصل میں دَيْتَارٌ تھا۔ ایک نون

(د م ر)

التَّدْمِيرُ: (تفعیل) کے معنی ہیں کسی چیز پر ہلاکت لا ڈالنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَدَمَّرْنَا هُمْ تَدْمِيرًا﴾ (۱۷-۱۶) اور ہم نے انہیں ہلاک کر ڈالا۔

﴿ثُمَّ دَمَّرْنَا الْأَخْرِينَ﴾ (۲۶-۱۷۲) پھر ہم نے اوروں کو ہلاک کر دیا۔
﴿وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ﴾ (۷-۱۳۷) اور فرعون اور قوم فرعون پر جو (محل) بناتے اور انگور کے باغ) جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۲۷-۱۰) خدا نے ان پر تباہی ڈال دی۔

میں دَمَرٌ کا مفعول محذوف ہے۔
محاورہ ہے: مَا بِالْأَدَارِ تَدْمِيرِيٌّ: یعنی گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔

(د م ع)

دَمَعَتِ (ف) الْعَيْنُ دَمْعًا وَ دَمْعَانًا: آنسو جاری ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا﴾ (۹-۹۲) تو وہ لوٹ گئے۔ اور اس غم سے..... ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ الدمع اسم بھی آتا ہے جس کے معنی ہیں آنسو اور (باب مذکور کا) مصدر بھی۔

(د م غ)

الدَّمْعُ: (ف) کے اصل معنی دماغ پھوڑ دینے کے

چیزیں کیوں چاہتے ہو۔

اور کبھی بمعنی اول (نشأۃ اولی) استعمال ہوتا ہے۔
اور الآخر۔ (نشأۃ ثانیہ) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جیسے
فرمایا:

﴿خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۲۲-۱۱) اس نے دنیا
میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَأَتَيْنَهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَآتَيْنَاهُ فِي الْآخِرَةِ
لَمَنْ الصَّالِحِينَ﴾ (۱۶-۱۲۲) اور ہم نے ان کو دنیا
میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں
ہوں گے۔

اور کبھی آدنی بمعنی اقرب آتا ہے اور اقصیٰ کے
بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى﴾
(۸-۴۲) (جس وقت تم (مدینے کے) قریب کے ناکے
پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

الدُّنْيَا کی جمع الدُّنْيَى آتی ہے جیسے الْكُبْرَى کی جمع
الْكُبْرَى وَالصُّغْرَى کی جمع الصُّغْرَى۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَذَلِكَ آدْنَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَا﴾
(۵-۱۰۸) اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح
صحیح شہادت ادا کریں۔

میں آدنی بمعنی أَقْرَبُ ہے یعنی یہ أَقْرَبُ ہے کہ شہادت
ادا کرنے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں۔

اور آیت کریمہ:

کو یا سے تبدیل کیا گیا ہے (والجمع ودانیر) بعض نے کہا
ہے کہ یہ فارسی لفظ دین آر سے معرب ہے یعنی وہ جسے
شریعت لے آئی ہو۔ قرآن میں ہے۔

مَنْ إِنْ تَأَمَّنْهُ بِدِينَارٍ (۳-۷۵) کہ اگر اس
کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو۔

(د ن و)

الدُّنُو (ن) کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ
قریب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی، اور قرب بلحاظ مرتبہ سب
کو شامل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّخْلِ مَنْ طَلَعَهَا قِنَوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ (۶-
۹۹) اور کھجور کے گائے میں سے قریب جھکے ہوئے خوشے
کو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ دَنَىٰ فَتَدَلَّىٰ﴾ (۵۳-۸) پھر قریب ہوئے اور
آگے بڑھے۔

میں قرب حکمی مراد ہے اور لفظ ادنیٰ کبھی بمعنی اصْغَرَ
(آتا ہے) اس صورت میں اَكْبَرَ کے بالمقابل استعمال
ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَا آدْنَىٰ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرَ﴾ (۵۸-۷) اور
نہ اس کے کم نہ زیادہ۔

اور کبھی آدنیٰ بمعنی آرَدَلٌ استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ
خیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ آدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾
(۲-۶۱) بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص

① المعرب للحوالبقي وراجع الاتفاق (۱: ۱۳۹)۔

② والصواب في التمثيل ونديقنهم من العذاب الادنى دون العذاب الاكبر (۳۲-۲۱)۔

یعنی ابتداء آفرینش سے لے کر اس کے اختتام تک کا عرصہ۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿هَلْ آتَىٰ عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾
(۷۶-۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے۔

میں اَلدَّهْرُ سے یہی معنی مراد ہیں پھر (مجازاً) اس سے ہر طویل مدت مراد لی جاتی ہے۔ برخلاف لفظ ”زمان“ کے کہ یہ مدت قلیلہ اور کثیرہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور دَهْرٌ فَلَانٌ کے معنی اس کی مدت حیات کے ہیں اور جو عادت زندگی بھر باقی رہے اس پر بھی استعارۃً دَهْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: مَا دَهْرِي بِكَذَا: میں اس کا عادی نہیں ہوں۔ اور ظلیل نے حکایت کی ہے: دَهْرٌ فَلَانًا نَائِبَةٌ دَهْرًا: (یعنی فلاں پر مصیبت نازل ہوگئی) تو یہاں دَهْرٌ کا لفظ مصدر ہے اور بعض نے دَهْرٌ دَاهِرٌ وَدَاهِيْرٌ: زمانہ بے انتہا وقت ایک حدیث میں ہے۔^۱

(۱۲۹) لَا تَسْبُوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ (کہ زمانہ کو برامت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے) بعض نے اللہ تعالیٰ کے دَهْرٌ ہونے کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ جو خیر و شر اور خوشی اور ناخوشی زمانہ کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کا فاعل حقیقی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لہذا جب تم زمانہ کو برا بھلا کہو گے جو تمہارے اعتقاد کے مطابق فاعل ہے۔ تو

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ تَقْرَءَ عَيْنُهُنَّ﴾ (۳۳-۱۵) یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَلَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِى الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۲-۲۱۹، ۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو)۔

دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے۔

اَدْنَيْتُ بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ وَأَدْنَيْتُ أَحَدَهُمَا مِنَ الْآخَرِ: یعنی دو چیزوں کو باہم قریب کرنا۔ یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يُذْنِبْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ (۳۳-۵۹) کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔

اَدْنَيْتِ الْفَرَسُ: گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آ پینچا۔

الدُّنْيَى: خاص کر حقیر اور رذیل آدمی کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ سَيِّءٌ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔

هُوَ دُنْيَىٌ یعنی نہایت رذیل ہے۔ اور جو مردی ہے^۲

(۱۲۸) إِذَا أَكَلْتُمْ فِدْنُوا تُوِيَهُ دُونََ سَہِ لِيَعْنِي جب کھانا کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

(دہر)

الدَّهْرُ: (زمانہ) اصل میں مدت عالم کو کہتے ہیں

۱ وفي النهاية (دنا) سَمُوَ اللّٰهُ وَدُنُوْا وَسَمُوْا قَال وَهُوَ فَعَّلُوا مِنْ دَنَا يَدْنُوْا وَمَعْنَاهُ كَلَوَامًا يَلِيْكُم وَمَا يَنْبِيْكُم .

۲ اخبرجه البخارى واللسان (دهر) والفاظ (۳۱۵: ۱) وانظر لتاويل الحديث امالي المرتضى (۱: ۴۵-۴۶) وابن كثير (۴: ۱۵۱) والطبري (۲۵: ۱۵۲) بسياق غريب جدا الحديث باختلاف الفاظه في (م، حم م ق) (وابن عساكر في معجمه وابن النجار كلهم عن ابي هريرة) راجع كنز العمال (۳: ۳۴۵: ۱۲).

نہایت گہرا سبز رنگ مراد ہوتا ہے جیسا کہ ہلکے سیاہ رنگ کو خَضْرَءٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں قسم کی رنگت قریباً ملتی جلتی ہی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مُدْهَامَاتَان﴾ (۲۳-۵۵) دونوں خوب گہرے سبز۔ یہ ادھام ادھیما مآ سے مُفْعَلٌ کے وزن پر ہے۔ کسی شاعر نے رات کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔ ﴿الْبَسِيط﴾ (۱۳۶) فِی ظِلِّ اَخْضَرَ يَدْعُوَهَا مَهْ الْيَوْمُ

یعنی تاریک رات جس میں کہ بوم اپنے ہام کو بلارہا ہوتا ہے۔

(د ه ن)

الدَّهْنُ: تیل، چکنائٹ، ج اذہان قرآن پاک میں ہے:

﴿تَنْبَتُ بِالدَّهْنِ﴾ (۲۳-۲۰) جو روغن..... لئے ہوئے اگتا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدَّهَانِ﴾ (۵۵-۳۷) پھر..... تیل کی تلچٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ دہان کے معنی تلچٹ کے ہیں۔

الدَّهْنُ: ہر وہ برتن جس میں تیل ڈالا جاتا ہے۔

یہ اسم آلہ کے مجملہ ان اوزان کے ہے جو (بطور شاذ) مُفْعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں اور بطور تشبیہ (پہاڑ میں) اس مقام (چھوٹے سے گڑھے) کو بھی مُدْهَنْ کہا جاتا ہے۔ جہاں تھوڑا سا پانی ٹھہر جاتا ہو اور دُھَنْ سے بطور استعارہ کم دودھ والی اونٹنی کو دَھِیْنٌ کہا جاتا ہے اور یہ فعل بمعنی فاعل کے وزن پر ہے یعنی وہ بقدر دہن کے

گویا اللہ تبارک و تعالیٰ کو گالیاں دے رہے ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں دَھْرٌ ثانی دَھْرٌ اول کا غیر ہے اور یہ مصدر بمعنی فاعل ہے یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ اور معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کا تصرف و تدبیر اور جو کچھ رونما ہوتا ہے اس کا فیضان اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے مگر معنی اول اظہر و انسب ہے۔ اور قرآن پاک نے مشرکین عرب کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيٰ وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ (۲۴-۲۵) کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (بہیں) مرتے اور جیتے ہیں اور یہ صرف زمانہ ہی ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں دَھْرٌ سے مراد زمانہ ہی ہے۔

(د ه ق)

الدَّهْقُ (ف) کے معنی لبالب بھرنے اور چھلکنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَاَسًا دِهَاقًا﴾ (۳۳-۷۸) اور لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ۔

مجاورہ ہے:

أَذْهَقْتُ الْكَأْسَ فَدَهَقَ (میں ہے پیالہ بھرا تو وہ بھر گیا) دَهَقَ لِيْ مِنْ الْمَالِ دَهَقَةً (اس نے مجھے بہت مال دیا) جیسا کہ قَبْضٌ لِيْ قَبْضَةٌ کا مجاورہ ہے۔

(د ه م)

الدُّهْمَةُ: کے اصل معنی تورات کی سیاہی کے ہیں اور یہ لفظ گھوڑے کی سیاہی پر بولا جاتا ہے کبھی اس سے

① قاله ذوالرمة والبيت في النسان (عسف، موم) وقد مرتخریحه فی (خضری).

کہ حزم و احتیاط اور قوت چالپوسی اور جزع فزع سے بہتر ہیں۔

دَاهَنْتُ فُلَانًا مَدَاهَنْتَهُ: میں نے فلاں کے سامنے چالپوسی کی۔ قرآن میں ہے:

﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيْدِهِنُونَ﴾ (۶۸-۹) کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم مداهنت سے کام لویہ بھی نرم ہو جائیں۔

(دود)

دَاوُد (داؤد علیہ السلام) یہ عجمی نام ہے (اور عجم و عجمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے)۔

(دور)

الدَّارُ: منزل، مکان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ چار دیواری سے گھرا ہوتا ہے۔ بعض نے دَارَةَ بھی کہا ہے۔ اس کی جمع دِيَارٌ ہے۔ پھر دار کا لفظ شہر، علاقہ بلکہ سارے جہاں پر بولا جاتا ہے اور الدَّارُ الدُّنْيَا اور الدَّارُ الْآخِرَةُ سے نشأۃ اولیٰ اور نشأۃ ثانیہ میں دو قرار گاہوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے دَارَ الدُّنْيَا وَ دَارَ الْآخِرَةِ (باضیافت) بھی کہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۶-۱۲۷) ان کے لئے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی

دودھ دیتی ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ فَعِيلٌ بمعنی مفعول ہے۔ گویا اسے دودھ کا دھن لگایا گیا ہے۔ یہ بھی دودھ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے یہ دوسرا قول اقرب الی الصّحّة معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں "ہ" تائید نہیں آتی۔ (جو فعیل بمعنی مفعول ہونے کی دلیل ہے)

دَهْنَ الْمَطَرِ الْأَرْضِ: بارش نے زمین کو ہلکا سا نرم کر دیا جیسا کہ سر پر تیل ملا جاتا ہے۔

دَهْنَهُ بِالْعَصَا (کنایت) لاشی سے اس کی تواضع کی۔ یہ بطور تمکیم کے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَسْحَتَهُ بِالسَّيْفِ وَ حَيَّتَهُ بِالرَّمْحِ: کا محاورہ ہے۔ لیکن یہ تصحیح، نرمی برتنے اور حقیقت کا دامن ترک کر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ تَقْرِيدٌ کا لفظ جس کے اصل معنی اونٹ سے چچر دور کرنا کے ہیں پھر تصحیح اور نرمی برتنا کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَفِيهِذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ﴾ (۵۶-۸۱) کیا تم اسی کتاب سے انکار کرتے ہو؟

شاعر نے کہا ہے (السریح)

(۱۵۷) الْحَزْمُ وَالْقُوَّةُ خَيْرٌ مِنَ

الدَّهَانِ وَالْقِلَّةِ وَالْهَاعِ

① قاله ابو قيس بن الاسلت الانصارى وفي رواية الاكثر: الكيس والقوة خير من ال: اشفاق والفهية والهاع - والبيت من كلمة مفضلية ۲۳۵ فی ۲۴ بیتاً وفي روايته الفكة بدل القلة وفي رواية احمد بن عبيد الفهية كمافي اللسان (فك) ومعناه الضعف والهاع سوء الحرص مع الضعف والبيت في الحيوان (۳: ۴۶) والبيان (۱: ۲۰۴) والامالي (۲: ۲۱۲) والسبط (۲۳۷) والبحر (۸: ۲۰۸) وابدال ابني الطيب (۲: ۳۷۵) وفي العمدة (۲: ۱۸) انشاء الامثلة معاصيب في المقابلة و ابو القيس اخلف في اسمه ذكره الحافظ في الاصابة والراجح صيفي بن الاسلت وكان الدوس اسندامرها اليه في الحروب الاخيرة بين الدوس والحزرج فكفني وساد حتى شعب وتغير وليث اشهرأ لايقرب من امرئيه ثم انه جاء ليلة فندق على امرئيه ففتحت له فاهوئى اليها بيده فدفعته وانكرته فقال انا ابو قيس فقالت والله عرفتك حتى تكلمت فقال في ذلك القصيدة مطلعها قالت ولم تقصد لقليل الخناء مهلاً فقد بلغت اسماعى - وفيها الشاهد واختلف في اسلامه راجع الاصابة (۱۵۸: ۵-۲۵۷: ۴/۲۵۷) والاعاني (۱۵: ۱۵۴) واسدالغابة (۱: ۱۸۴) والخزاة (۳: ۳۷۵-۳۷۸).

کا گھر ہے۔

ہے اسی مناسبت سے زمانہ کو..... الدَوَّارِیٰ کہتے ہیں کیونکہ اس کی گردشیں بھی انسان پر گھومتی رہتی ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے ۵ (الرجز)

(۱۵۸) وَالذَّهْرُ بِالْإِنْسَانِ دَوَّارِیٌّ

کہ زمانہ انسان کو گھما رہا ہے۔

اور الدورة والدائرة کا لفظ مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو محبوب چیز گھوم کر آئے اسے دَوْلَة کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿نَخْشَىٰ أَنْ تُصَيِّنَا دَائِرَةً﴾ (۵۲-۵) ہمیں خوف

ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے دَائِرَة کی جمع دَوَّارِیُّ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَتَرَبَّصُّ بِكُمْ الدَّوَّارِیُّ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ﴾

(۹۸-۹) کہ وہ تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں

انہی پر بری مصیبت واقع ہو یعنی تباہی اور بربادی انہیں

ہر طرف سے اس طرح گھیر لے جیسا کہ کوئی شخص دائرہ کے

اندر ہوتا ہے۔ اور ان کے لئے اس بربادی سے نکلنے کی

صورت باقی نہ رہے۔

الدَّوَّارُ: ایک بت کا نام ہے جس کے گرد اگر دلوگ

طواف کیا کرتے تھے۔

الدَّارِیُّ: یہ الدار کی طرف منسوب ۵ ہے مگر عطار (عطر

یہاں دار السلام سے جنت مراد ہے اور ﴿دَارُ الْبَوَارِ﴾ (۱۳-۲۸) ہلاکت کا گڑھا سے جہنم۔ نیز فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ﴾ (۲-۹۳)

کہہ دو کہ اگر آخرت کا گھر..... تمہارے لئے ہی مخصوص ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ (۲-۲۳۳)

بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو..... اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔

﴿وَقَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا﴾ (۲۲-۲۳۶) جب کہ

ہم وطن..... سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔

﴿سَأَرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ﴾ (۷-۲۵) میں

عنقریب تم کو نافرمان لوگوں کا گھر دکھاؤں گا۔

کہا جاتا ہے مَا بِهَا دِيَارٌ یعنی یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ

دَارٌ سے فِعْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ کیونکہ اِغْرَفْعَالٌ کے

وزن پر ہوتا تو دِيَارٌ کی بجائے دَوَّارٌ کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ (قول سے) قَوَالٌ اور (جور سے) جَوَارٌ ہے۔

الدَّائِرَة: خط محیط (سرکل) کو کہتے ہیں یہ دَارٌ يَدْوُرُ

دَوَّرَانَا سے ہے جس کے معنی چکر لگانا کے ہیں پھر

مصیبت گردش زمانہ کو بھی دائرَة (یادارَة) کہہ دیا جاتا

۱ بیت من مشطورة الرجز للعجاج فی وصف الدهر وبعده: افنى القرون وهو فقسرى وقبله: أطرباً وانت قنسى والرجز فى اللسان (قمر دور) والصحاح (دور) وتفسير الطبرى (۱۹: ۱۴) وارجيز العرب للسيد توفيق البكرى ۱۷۴ ومجموع اشعار العرب (۶۶: ۲) والعزارة (۱۱: ۵۱) وابن هشام (۱: ۱۲) رقم ۱۲ وثلاثين ۱۹ والسيوطى ۱۸ والعزروقى ۴: ۸۱۸ والمحكم (قمر) ۱۲.

۲ ذكر علماء اللغة والغريب قولين فى هذه النسبة الاول نسبة الى الدار وهى عَلمٌ لموضع بين البصرة والبحرين كمافى الياقوت (رسم: الدار) وذكره ابن دريد فى الملاحم وقال: الدار موضع بالبحرين معروف واليه ينسب الدارى العطار والثانى انه نسبة الى فرضة البحرين يقال لها دارين: قال الياقوت: والنسبة اليها دارى واليه ذهب ابن الاثير فى النهاية (دار) والجوهري فى الصحاح (دار) وفى البلدان هى بلدة فتحت فى ايام ابي بكر رضى الله عنه سنة ۱۲ وكان على الغزاة العلاء بن الحضرمى وفيه يقول الفرزدق كان تريكة من ماء مزون. ودارى الذكى من المدام راجع البلدان (رسم: دارين) ۱۲.

﴿كَيْسَلًا يَكُونُ دَوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں یہ پھرتا رہے۔

تَدَاوَلَ الْقَوْمُ كَذَا: کسی چیز کو دولت کی طرح باری باری لینا۔

دَاوَلَ اللَّهُ كَذَا بَيْنَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان اسے گھمایا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (۳-۱۳۰) اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں ادا کرتے بدلتے رہتے ہیں۔

الدَّوْلُوتُ: بڑی مصیبت۔ ج الدَّائِلُ والدُّوْلَاءُ۔

(دوم)

الدَّوَامُ: اصل میں دوام کے معنی سکون کے ہیں کہا جاتا ہے۔ دَامَ الْمَاءُ (پانی ٹھہر گیا) اور (حدیث میں) ﴿الْمَاءُ الدَّائِمُ﴾ یعنی کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

أَدَمْتُ الْقِدْرَ وَدَوَّمْتُهَا: تھوڑا سا پانی ڈال کر ہانڈی کو ٹھنڈا کر دیا۔ اسی سے دَامَ الشَّيْءُ کا محاورہ ہے یعنی وہ چیز جو عرصہ دراز تک رہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دَمْتُ فِيهِمْ﴾ (۵-۱۱۷)

فروش کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے ﴿جیسا کہ اَلْهَالِكِيُّ كَالْفَقِيْنِ﴾ یعنی لوہار پر خاص کر بولا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ ﴿

(۱۲۹) مَثَلُ الْجَلِيْسِ الصَّالِحِ كَمَثَلِ الدَّارِيِّ كَمَا نِيكَ صِحْبِي كِي مَثَلِ عَطَارِكِي سِي هِيَ۔

اور جو شخص گھر کے اندر ہی جم کر بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے اسے بھی دَارِيٌّ کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُهَا وَنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ (۲-۲۸۲) ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔

یعنی نقد اور ہاتھوں ہاتھ لین دین ہو اور اس میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔

(دول)

الدَّوْلَةُ وَالِدَوْلَةُ: دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی گردش کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ کا لفظ مال و زر کے گھومنے پر بولا جاتا ہے اور دَوْلَةٌ لُرَائِي اور عزت و جاہ کے ادا کرنے بدلنے پر۔ بعض نے ان دونوں میں یہ فرق کیا ہے کہ دَوْلَةُ اسم ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ لین دین کیا جائے اور دَوْلَةُ (بضم الدال) مصدر ہے یعنی لین دین کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

① وتمة الحديث ذكره المؤلف في الاخوابيات من محاضراته (۶: ۳) والزمر مشرى في الفائق (۱: ۲۰۶) والنهية (دار راجع للحديث (دك عن انس) ودع والرامهرمزي، د، حب، في روضة العقلاء عن شبل عن انس وابن حبان والرامهرمزي ايضا عن ابى موسى ولفظ الاكثر مثل العطار لان اصحاب الغريب ذكر والفظ الدارى بدل العطار راجع للمراجع كتر العمال ۵، ۵، ۹، والفتح للنبيهاني ۳: ۱۲۸ و مجمع البحار (۱: ۴۵۲) ۱۲.

② ولفظة الحديث ولايولن احدكم في الماء الدائم راجع تخريجه في كتر العمال ۹: ۱۷۷۲-۱۷۸۶ وفي كتب الغريب النهاية (دوم) والفائق (۱: ۲۰۵).

تعلق نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ﴾ (۴-۴۰) اور اس کے سوا
اور گناہ..... معاف کر دے۔

میں مَادُونَ سے وہ گناہ مراد ہیں جو شرک سے کم درجہ
کے ہیں یا وہ جو شرک کے علاوہ ہیں۔ اور یہ دونوں معنی ایک
دوسرے کے لازم ملزوم ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَهَيْنِ
مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۵-۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا
کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو۔ میں
مِنْ دُونِ اللَّهِ کے معنی غَيْرِ اللَّهِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ
کو چھوڑ کر ہم دونوں کو معبود بنا لو۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں
کہ دو معبود جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جائے۔ اور
آیت کریمہ:

﴿لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ﴾ (۶-۱۵)
اس کے سوا نہ تو ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش
کرنے والا۔ اور نیز آیت:

﴿وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾
(۲-۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار
نہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ حکم الہی کے بغیر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو
ان کی مدد کر سکے اور یہی معنی آیت کریمہ: ﴿قُلْ أَدْعُوا
مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا﴾ (۶-۷۰)
(۷۰-۷۰) کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا
کر سکے نہ بُرا۔

اور جب تک میں ان میں رہا ان (کے حالات) کی خبر رکھتا
رہا۔

﴿إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا﴾ (۳-۷۵) جب تک
اس کے سر پر ہرقت کھڑے نہ رہو۔
﴿لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا﴾ (۵-۳۴)
جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔

اور یہ باب دِمْتَ تَدَامُ سے آتا ہے اور بعض نے دِمْتَ
تَدَوْمُ کہا ہے جیسے مَتَّ مَمَاتٌ دَوْمَتِ الشَّمْسُ
فِي كَيْدِ السَّمَاءِ: وسط آسمان میں سورج ٹھہر گیا۔ شاعر
نے کہا ہے: ❶

(۱۵۹) وَالشَّمْسُ حَيْرِي لَهَا فِي الْجَوْ تَدْوِيمُ:
سورج حیران پریشان ہو کر فضا میں ٹھہرا ہوا ہے۔
دَوْمَ الطَّيْرِ فِي الْهَوَاءِ پرنڈ فضا میں منڈ لایا۔
إِسْتَدَمَّتْ الْأَمْرَ: میں نے اس پر دیر تک غور و فکر کیا۔
أَلْظَلُّ الدُّوْمُ: (دائِمٌ) ہمیشہ رہنے والا سایہ۔
الْدَيْمَةُ: بارش جو لگا تار کئی روز تک برتی رہے۔

(دُون)

الدُّوْنُ: جو کسی چیز سے قاصر اور کوتاہ ہو وہ ”دُون“
کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے اور
الدُّوْنُ بمعنی دُنَىٰ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ﴾ (۳-۱۱۸) کے
معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کو رازدار مت بناؤ جو دیانت میں
تمہارے ہم مرتبہ (یعنی مسلمان) نہیں ہیں۔ بعض نے کہا
ہے کہ جو قرابت میں تم سے نیچے ہیں۔ یعنی تمہارا ان سے

❶ قاله ذوالرمة في ميميته يصف جناباً الذي يصبح في حر الشمس واوله: معروفياً مرض المرضاض بر كضه - والبيت في اللسان (دوم)
والاقتضاب ۱۵۹ والبحر (۲: ۴۹۸) والمحاضرات للمؤلف ۵۴۹ والمعاني الكبير ۶۱۱ ديوانه ۵۷۸ ابو الطيب في اضداده (۲۶۷).

طرح ہے لیکن شریعت کی طاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ (۳-۱۹) دین تو

اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ

مُحْسِنٌ﴾ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا

ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی

ہے۔

﴿وَإِخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ﴾ (۴-۱۲۶) اور خالص خدا

کے فرمانبردار ہو گئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ (۵-۷۷)

اے اہل کتاب! اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ

کرو۔

میں آنحضرت کے دین یعنی اسلام کی اتباع پر ترغیب پائی

جاتی ہے جو تمام ادیان سے معتدل دین ہے اور افراط و تفریط

سے پاک ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ (۲-۱۲۳) اور

اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (۲-۲۵۶) دین (اسلام)

میں زبردستی نہیں ہے۔

میں بعض نے دین کے معنی طاعت کیے ہیں۔

کیونکہ طاعت حقیقت میں وہی ہے جو مبنی بر اخلاص ہو اور

میں مراد ہیں کہ دُون میں ایک لفت دُون (بفتح الدال) بھی ہے کہا جاتا ہے کہ دُونَكَ كَذَا: یعنی یہ پکڑ لو۔ یعنی نے کہا ہے کہ دَانَ يَدُونَ دُونًا کے معنی کمزور ہونے کے ہیں۔^۱

(دین)

دِنْتُ الرَّجُلَ کے معنی قرض لینے اور اَدْنْتُهُ کے

معنی ہیں کہ میں نے اُسے دائن بنا دیا یعنی قرض دیا۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ دِنْتُهُ کے معنی اَفْرَضْتُهُ یعنی قرض

دینا کے ہیں۔ اور مقروض کو مَدِينٌ وَمَذْيُونٌ کہا جاتا

ہے دِنْتُهُ کے معنی قرض لینا بھی آتے ہیں۔ شاعر نے

کہا ہے۔^۲

(۱۶۰) نَدِينُ وَيَقْضِي اللَّهُ عَنَّا وَقَدْ نَرَى

مَصَارِعَ قَوْمٍ لَّا يَدِينُونَ ضِيْعًا

ہم قرض لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس قرض کو ادا کر دیتا

ہے اور جو لوگ قرض نہیں لیتے ان کی قبریں ضائع ہونے

والی دیکھتے ہیں اور اَدْنْتُ دِنْتُ کی طرح ہے یعنی اس

کے معنی قرض لینا کے ہیں اور اَدْنْتُ کے معنی قرض دینا

بھی ہیں۔

الْتَدَائِنُ وَالْمُدَائِنَةُ: قرض کا معاملہ کرنا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ بَعْدَ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ (۴-۱۲)

(یہ حصے بھی) بعد ادا کے وصیت و قرض۔

الْدَّيْنُ کے معنی طاعت اور جزا کے آتے ہیں اور بطور

استعارہ دین بمعنی شریعت بھی آتا ہے۔ اور دینِ ملت کی

^۱ قال في الصحاح ولا يشتق منه فعل وبعضهم يقول منه: دان يدون دوناً راجع أيضاً اللسان (دون).

^۲ وفي اللسان ضيغ بالخفض على الصفة للقوم والبيت للعجير السلولي (قبلة) : فعد صاحب اللحام سيفاتيعة - وزدد رهماً فوق المغالين واخنع - والبيت في الصحاح (دين) وفي روايته أيضاً ضيغاً وقال ابن بري: صوابه ضيغ بالخفض على الصفة (لقوم).

حق کو قبول کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (۳-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیو کار بھی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَوْ لَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ﴾ (۵۶-۸۶) میں غیر مَدِينِينَ کے معنی غیر مَعْجِزِينَ کے ہیں۔ یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا نہیں دی جائے گی۔

الْمَدِينُ وَالْمَدِينَةُ: (ایضاً) کے معنی غلام اور لونڈی کے بھی آتے ہیں۔ ابو زید نے کہا ہے ۱ کہ دُيَسِّنَ فُلَانٌ يَدَانِ سَے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی ناپسند کام پر مجبور کیے جانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دُنْتَهُ سَے ماخوذ ہے جس کے معنی طاعت کی جزا دینے کے ہیں بعض نے لفظ مَدِينَةَ (شہر) بھی اسی معنی سے لیا ہے۔



اخلاص کی صورت میں اکراہ و جبر کیسے ہو سکتا ہے بعض نے کہا ہے کہ عدم جبر کا حکم ان اہل کتاب کے ساتھ مختص ہے جو چیز یہ ادا کریں۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ﴾ (۳-۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟

میں دین اللہ سے دین اسلام مراد ہے۔ کیونکہ (قرآن پاک نے) دوسری آیت میں تصریح فرمادی ہے۔

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ (۳-۸۵) اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہ معنی مراد ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ﴾ (۹-۳۳) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔

﴿وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ﴾ (۹-۲۹) اور نہ دین

۱ ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری وحده من الصحابة باشدید العناية لجمع اللغات واللمحات توفي ۲۱۴ھ وقد قارب المائة كان من تلامذة عمرو بن العلاء و زليزیدی كان رفيقه فی الدرر راجع لاحواله (بشد) ۱۲.

کتاب الذال

(ذ ب ب)

الذَّبَابُ: کے معنی مکھی کے ہیں اور یہ لفظ شہد کی مکھی اور بھڑ وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ (طویل)

(۱۶۱) فَهَذَا أَوْ أَنَّ الْعِرْضِ حَىٰ ذُبَابُهُ

زَنَابِيرُهُ وَالْأَزْرَقُ الْمُتَمَلِّسُ

یہ وادی کے پر رونق ہونے کا موسم ہے اس کے زنا بیر اور سبز کھیاں خوب بھن بھناری ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَأَن يَسْتَنْبِهُمُ الذُّبَابُ شَيْتَانًا﴾ (۷۳-۷۴) اور اگر

ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے میں ذباب کے معنی مکھی کے ہیں۔

ذُبَابُ الْعَيْنِ: آنکھ کی پتلی۔ اسے ذُبَابُ يَتَوَهَّيْتُتِ مِیْنِ

تشبیہ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ آنکھ کی

پتلی سے بھی مکھی کی طرح شعاعیں نکلتی ہیں۔ اور ایذا رسانی

میں مکھی کے ساتھ تشبیہ دے کر تلوار کی دھار کو ذُبَابُ

السَّيْفِ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح موذی شخص کو بھی

ذُبَابٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

(ذ ب ب)

الذِّئْبُ: کے معنی بھیڑیا کے ہیں اصل میں یہ ذئب یعنی مہوز ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ﴾

(۷-۱۲) تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ أَرْضٌ مَّدَّةٌ بَتَّةٌ: بہت بھیڑیوں والی سرزمین۔

ذَيْبٌ فُلَانٌ: درگوسپنداں وے گرگ افتاد۔

تَذَاءُ بَيْتِ الرِّيحِ: ہوا ہر طرف سے چلی۔ یہ بھیڑیے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

تَذَاءُ بَيْتِ الرِّيحِ: ہوا ہر طرف سے چلی یہ بھیڑیے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

تَذَاءُ بَيْتِ اللَّيْنَانَةِ: اونٹنی کوچے پر مہربان کرنے کیلئے بھیڑیے کا روپ دھار لینا اور بیت کذائی میں مشابہت کے پیش نظر

پالان کے پہلوؤں کے درمیان کی کشادگی کو ذئبہ کہا جاتا ہے۔

(ذ م م)

ذَامَةٌ يَذَّامُهُ ذَامًا اور ذَامَةٌ (ن) ذَمًا اور ذَامَةٌ کے ایک

ہی معنی ہیں کسی کو حقیر اور مذموم گردانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَخْرِجْ مِنْهَا مَذْمُومًا وَمَا مَذْحُورًا﴾ (۷-۱۸) نکل

جا یہاں سے ذلیل راندہ ہوا۔

۱ قال المتملس ولقب به بهذا البيت في الحماسة (۱۰۲: ۲) والخزانة (۲۷۰: ۳) والاعاني (۲۰: ۲۱) والسمط ۲۵۰ والاقتضاب ودويانه رقم ۵ والسيوطي ۱۰۴، ۱۷ والمختارات ۳۳ والمحکم (عرض) والحيوان (۳: ۳۹۱) والمعاني الكبير للقتبي وفي روايته وذلك بدل فهذا والمرزوقي ۶۶۲ وفي روايته حن ذبابه بدل حى ذبابه والمتلمس شاعر جاهلى اسمه جرير بن عبد المسيح الضبعي راجع لترجمته السيوطي ۱۰۲-۱۰۴ والاعاني (۲۱: ۱۲۷، ۱۳۵) والخزانة (۱: ۴۷۶) والشعراء (۱۳۱-۱۳۶).

(۱۶۳) يُذَبِّبُ وَرَدًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ

کہ ورد اس کے پیچھے سخت دوڑ رہا تھا۔

(ذ ب ح)

الذَّبْحُ: (ف) اصل میں اس کے معنی حیوانات

کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذَبْحُ بمعنی مَذْبُوح آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدَّيْنَا لَهُ يَذْبِحُ عَظِيمًا﴾ (۲۷-۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کا ان کو فدیہ دیا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبِحُوا بِقَرَّةٍ﴾ (۲-۶۷) کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔

ذَبَحْتُ الْفَارَةَ: میں نے نافہ مشک کو چیرا۔ یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ذَبَحَ الدِّنَّ کا محاورہ ہے جس کے معنی مکے میں شگاف کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَذْبِحُونَ أَبْنَاءَ كُفْرِهِمْ﴾ (۲-۳۹) تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے۔

میں صیغہ تفعیل برائے تکثیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ کیے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔

سَعَدُ الذَّبَائِحِ: (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے۔ اور سیلاب کے گڑھوں کو مَذَابِحُ کہا جاتا ہے۔

(ذ خ ر)

الْإِدْخَارُ: (اعتقار) اصل میں اذْتِخَارُ تھا۔

کہا جاتا ہے:

ذَبَّ عَنْ فُلَانٍ: کسی سے کبھی کو دور ہٹانا۔

الْمَذَبَّةُ: مورچھل، مچھیاں اڑانے کا آلہ۔

استعارہ کے طور پر ذَبُّ کا لفظ ہر چیز کے دفع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

ذَبَّتْ عَنْ فُلَانٍ: میں نے فلاں سے کبھیوں کو دور ہٹایا۔ ذَبَّ الْبَعِيرُ: اونٹ کی ناک میں کبھی داخل ہو گئی۔

یہ بھی بیماری کے دوسرے صیغوں کی طرح (جیسے ذُكِمَ وغیرہ) فعل مجہول استعمال ہوتا ہے۔

بَعِيرٌ مَذْبُوبٌ وَذَبَّ جِسْمُهُ: اونٹ دبلا ہو کر کبھی یا تلوار کی دھار کی طرح ہو گیا۔

الذَّبْدَةُ: اصل میں معلق چیز کے لٹنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ ہر قسم کی حرکت اور اضطراب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مُذَبِّبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ﴾ (۳-۱۳۳) بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں۔

یعنی وہ ہمیشہ مضطرب سے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی کفار کی طرف۔ شاعر نے کہا ہے۔^①

(۱۶۲) تَرَىٰ كُلَّ مَلِكٍ دُونَهَا يَتَذَبَّبُ

کہ اس کی سلطنت کے ورے ہر ایک سلطنت مضطرب نظر آتی ہے۔

ذَبَبْنَا إِسْلَانًا: ہم نے اونٹوں کو سخت ہٹکایا۔ شاعر نے کہا ہے۔^② (مقارِب)

① قاله النابغة في قصيدة يمدح فيها النعمان بن المنذر واوله: ألم تر ان الله اعطاك سورة وسياهي في (سور).

② وتسامه: وادركه وقع مردی خشب والبيت لغنتره بن مشداد والعيسى ابو العنفس راجع المرزوقی ۱۴۴ وفی رواية المختار الجاهلی ۱: ۳۱۰ والعقد الثمین ۳۵ تذائب بدل یذیب ومرد بدل مردی والبيت فی اللسان (خشب) والمعانی ۱۸۲۰.

ذَرَعَتُهُ: (۱) بازو پر مارنا۔ اور ذَرَعْتُ کے معنی (۲) بازو پھیلانا بھی آتے ہیں اور اسی سے ذَرَعَ البَعِيرُ فِي سَبِيلِهِ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کے بازو پھیلا کر چلنے کے ہیں۔ (تیز چلنا) فَرَسٌ ذَرِيعٌ وَذَرُوعٌ - کشادہ قدم گھوڑا (تیز رو) مُذْرَعٌ (سفید بازو والا گھوڑا یا بیل) اور زَقٌّ ذِرَاعٌ کے معنی بعض کے نزدیک بڑی مشک کے ہیں اور بعض کے نزدیک چھوٹی مشک کو کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں بازوؤں والی مشک کو کہتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں بغیر بازو مشک کے یعنی جس کے بازو کاٹ دیئے گئے ہوں۔

محاورہ ہے کہ ذَرَعَةُ الْقَيْءِ اُس پر قے غالب آگئی ذَرَعَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا کشادہ قدم چلنا۔

تَذَرَعَتِ الْمَرْأَةُ الْخُوصَ: عورت کا ٹوکری وغیرہ بنانے کے لئے کھجور کی شاخوں کو کاٹنا۔ اسی سے تشبیہ کے طور پر تَذَرَعُ فِي كَلَامِهِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کلام میں تیزی کرنے کے ہیں جیسا کہ سَفَسَفَ فِي كَلَامِهِ (لغوگوئی کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جو اصل میں سَفِيفُ الْخُوصِ کھجور کے پتوں کی ٹوکری) سے ماخوذ ہے۔

ذَرَعٌ

ذُرُوعَةُ السَّنَامِ وَذُرُوعُ: کوہان کا بلند حصہ۔ اسی سے محاورہ ہے اَنَّا فِي ذُرَاكَ میں تیری جناب میں

تَذَرُوهُ الرِّيَّاحُ بھی ہے۔
الذَّرَعَةُ: بڑھاپے یا نمک کی سفیدی۔
کہا جاتا ہے کہ مِلْحٌ ذِرَائِيٌّ نہایت سفید نمک اور جس کے بال سفید ہو جائیں اسے رَجُلٌ اَذْرَاءٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی مؤنث ذِرَاءَةٌ ہے۔
ذِرَى شَعْرُهُ (وَذَرَاءٌ كَفَرِحٍ وَمَنْعٍ) اس کے بال سفید ہو گئے۔

ذِرَاعٌ

الذِّرَاعُ: ہاتھ (کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے آخر تک) کبھی ذِرَاعٌ کا لفظ بول کر مَذْرُوعٌ یعنی وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جس کی پیمائش کی گئی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ﴾ (۶۹-۳۲) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو۔ اور ذِرَاعٌ مِّنَ الثَّوْبِ وَذِرَاعٌ مِّنَ الْاَرْضِ وغیرہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور حیوان کے بازو کے ساتھ تشبیہ دے کر ایک ستارے کو بھی ذِرَاعُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔
ذِرَاعُ الْعَامِلِ: نیزے کا اگلا حصہ محاورہ ہے۔

هَذَا عَلِيٌّ حَبْلٌ ذِرَاعِيٌّ: یہ تیرے اختیار میں ہے جیسا کہ هُوَ فِي كَيْفِكَ کا محاورہ ہے
ضَاقَ بِكَذَا ذِرَاعِيٌّ: یعنی میں اس سے عاجز ہوں۔
جیسا کہ ضَاقَتْ بِهِ يَدِي محاورہ ہے۔

① قرأة شاذة وفي حرف ابن مسعود تذريره الرياح وايضا تذريره فهذه ثلاث ذكرها اصحاب التفسير (راجع الطبري والشوكاني) .

② وفي المعاجم بفتح الراء وسكونها.

③ وفي التنزيل: وضاق بهم ذراعاً (۱۱-۷۷) .

باعزت ہوں ❶ (میں تیری پناہ میں ہوں) **الْمَذْرَأُ** وَأَنْ: سرین کے دونوں کنارے (وَلَا وَاحِدَ لَهُ) ❷
ذَرْنَهُ الرِّيحُ تَذْرُوهُ وَتَذْرِيهِ: ہوا کا کسی چیز کو کھیر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَالذَّارِيَاتِ ذُرْوًا﴾ (۱۸-۲۵) کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔
الذَّرِيَّةُ کے اصل معنی چھوٹی اولاد کے ہیں مگر عرف میں مطلق اولاد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
 اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ❸ قرآن پاک میں ہے:
﴿ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ (۳-۳۳) ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے۔

(۲-۲۳) میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا انہوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد سے بھی۔
ذُرِّيَّةٌ کے اصل میں تین اقوال ہیں۔
 (۱) بعض نے کہا ہے کہ یہ **ذَرَّ** اللّٰهُ الْخَلْقَ سے ہے یعنی اصل میں مہموذ اللام ہے مگر کثرت استعمال کے سبب **ذَوِيَّةٌ** و **بَرِيَّةٌ** کی طرح ہمزہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔
 (۲) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں **ذُرْوِيَّةٌ** بروزن **فُعْلِيَّةٌ** تھا اور **ذُرٌّ** سے مشتق ہے۔ جیسے **قُرِيَّةٌ** قر سے۔
 (۳) ابوالقاسم البخّی کہتے ہیں: ❹ کہ آیت کریمہ:
﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ﴾ (۷-۱۵۹) اور ہم نے.....
 جنم کے لئے پیدا کیے۔
 میں **ذَرَأْنَا** **ذَرِيَّتِ** **الْحِنطَةَ** سے مشتق ہے جس کے معنی گندم کو اُساؤں کرنے کے ہیں گویا وہ اسے بھی مہموذ نہیں سمجھتے۔ ❺

(ذ ع ن)

الْإِذْعَانُ: (افعال) کے معنی کسی کا مطیع اور منقاد ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ﴾ (۲۳-۴۹) تو ان کی طرف مطیع ہو کر چلے آتے۔
نَاقَةٌ مُذْعَانٌ: سوار کی مطیع اور فرمانبردار اونٹنی۔

﴿ذُرِّيَّةٌ مِّنْ حَمَلِنَا مَعَ نُوحٍ﴾ (۱۷-۳۰) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح (عَلَيْهِ السَّلَامُ) کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔

﴿وَأَيَّةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِّ الْمَشْحُونِ﴾ (۳۶-۴۱) اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔
﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾

❶ والمعروف بفتح الذال ای فی ظلك و كفتك .

❷ راجع الامالی ج (۱ ص ۱۹۹) .

❸ وفي اشتقاقه اختلاف ذكره اصحاب المعاجم في (ذر) وفي (ذرة) ونحو (ذرة) .

❹ ابو القاسم البلخي عبدالله بن احمد الحنفي المعروف بالكعبي احد شيوخ المعتزلة وراس طائفة فيهم يقال لهم الكعبية وفي النحل للشعرستاني (۱: ۳۷) وكان تلميذاً لابي الحسين الخياط المعتزلي ومنه في كشف الظنون (۱: ۲۳۴) وابن النديم ۱۵۷ انه الف تفسيراً كبيراً في اثني عشر جلداً توفي رحمه الله في سنة ۳۱۹، ۳۱۷ راجع لترجمه لسان الميزان ۳: ۲۵۵ وابن

خلكان ۱: ۲۵۲

❺ لان المهموز معناه يخالف الاعتزال فتحهم وتلوى راجع الكشاف ۱۲ .

ذِقْن

ذَقْنٌ: بٹھوڑی۔ اس کی جمع اَذْقَانٌ ہے۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿وَيَخِرُّونَ لَئِلًا ذَقَانٌ يَبْكُونَ﴾ (۱۸-۱۰۹) اور

ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں۔

ذَقْنَتُهُ میں نے اس کی ٹھوڑی پر مارا۔

نَاقَةٌ ذُقُونٌ: وہ اونٹنی جو ٹھوڑی کے سہارے پر چلتی

ہو۔ ۱ پھر تشبیہ کے طور پر ذول کو جو ایک جانب مائل

ہو اسے بھی دَلُو ذُقُو قُ کہہ دیتے ہیں۔ ۲

ذِكْر

الذِّكْرُ: یہ کبھی تو اس بیتِ نفسانیہ پر بولا جاتا ہے

جس کے ذریعہ سے انسان اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ

قریباً حفظ کے ہم معنی ہے مگر حفظ کا لفظ احراز کے لحاظ سے

بولا جاتا ہے اور ذِکْرٌ کا لفظ استحضار کے لحاظ سے۔ اور کبھی

”ذِکْرٌ“ کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ

”ذِکْرٌ“ دو قسم پر ہے۔ ذکر قلبی اور ذکر لسانی۔ پھر ان میں

سے ہر ایک دو قسم پر ہے نسیان کے بعد کسی چیز کو یاد کرنا یا

بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ہر قول کو ذکر کہا جاتا

ہے۔ چنانچہ ذکر لسانی کے بارے میں فرمایا:

﴿لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ﴾ (۲۱-۱۰)

ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں

تمہارا تذکرہ ہے۔

﴿وَهَذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنْزَلْنَاهُ﴾ (۲۱-۵۰) اور یہ

مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔

﴿وَهَذَا ذِكْرٌ مِّنْ مَّعِي وَذِكْرٌ مِّنْ قَبْلِي﴾ (۲۱-)

(۲۳) یہ میری اور میرے ساتھ والوں کی کتاب ہے اور مجھ

سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿إِنزِيلٌ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا﴾ (۳۸-۸) کیا ہم

سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔

میں ذکر سے مراد قرآن پاک ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ص ۵ وَالْقُرْآنُ ذِي الذِّكْرِ﴾ (۳۸-۱) ص۔ قسم ہے

اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ (۲۳-۲۳) اور یہ

(قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت

ہے۔

میں ذکر بمعنی شرف ہے یعنی یہ قرآن تیرے اور تیری قوم

کے لئے باعث شرف ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَسَلِّطُوا أَهْلَ الذِّكْرِ﴾ (۱۶-۲۳) تو اہل کتاب

سے پوچھ لو۔

میں اہل ذکر سے اہل کتاب مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا سَوِيًّا﴾ (۶۵-۱۱۱)

خدا نے تمہارے پاس نصیحت (کی کتاب) اور اپنے پیغمبر

(بھی بھیجے) ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں الذِّكْرُ آنحضرت ﷺ کا

وصف ہے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وصف میں کَلِمَةٌ کا لفظ

وارد ہوا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کو الذِّكْرُ اس لحاظ

۱ وفی الصحاح ترخی ذقہا فی السیر وفی الاساس تمدخطاها وتحرك رأسها قوة ونشاط فی السیر ۱۲۔

۲ وفی الصحاح والمحیط اذا حرزتها فحالت شفتها مائلة (التاج) ۱۲۔

يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا ﴿٤٦﴾ (۱-۲۶) انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔ میں شَيْئًا مَّذْكُورًا کے تھی یہ ہیں کہ بذات خود اس کا وجود نہ تھا اگرچہ علم الہی میں اس وقت بھی موجود تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۹)۔
 (۶۷) کیا (ایسا) انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا۔

کے معنی یہ ہیں کہ حشر و نشر کے منکر کو اپنی پہلی پیدائش یاد نہیں ہے جس سے وہ دوبارہ جی اٹھنے پر استدلال کر سکتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (۳۶)۔
 (۷۹)

﴿وَهُوَ الَّذِي بَدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾ (۳۰-۲۷)
 اور آیت کریمہ:

﴿وَذَكِّرْهُ لِلَّهِ أَكْبَرُ﴾ (۲۹-۳۸) اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے۔

کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد کرنا بندے کے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے بڑھ کر ہے۔ گویا اس میں کثرت سے ذکر الہی کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

الذِّكْرَى: کثرت سے ذکر الہی کرنا اس میں "الذِّكْر" سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرَى لَأُولَى الْأَلْبَابِ﴾ (۳۸)۔
 (۴۳) (یہ) ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے

سے کہا گیا ہے۔ کہ کتب سابقہ میں آپ ﷺ کے متعلق خوش خبری پائی جاتی تھی۔ اس قول کی بنا پر رَسُولًا ذِكْرًا سے بدل واقع ہوگا۔ بعض کے نزدیک رَسُولًا پر نصب ذِکْرٌ کی وجہ سے ہے گویا آیت یوں ہے: ﴿قَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا ذِكْرًا رَسُولًا يَتْلُو﴾ ﴿جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿أَوْ اطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا﴾ (۹۰-۱۳) میں یَتِيمًا اطْعَامٌ کی وجہ سے منسوب ہے اور نسیان کے بعد ذکر کے متعلق فرمایا:

﴿فَأَنبَى نَسِيئَتِ الْحَوْتِ وَمَا أَنْسَيْنِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ﴾ (۱۸-۶۳) تو میں بھول گیا اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

اور ذکر قلبی اور لسانی دونوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَاذْكُرُوا لِلَّهِ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (۲-۲۰۰) تو (منی میں) خدا کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

﴿فَاذْكُرُوا لِلَّهِ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَذِكْرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ﴾ (۲-۱۹۸) تو مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں خدا کا ذکر کرو اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو سیکھایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ (۲۱-۱۰۵) اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

میں الذِّكْر سے کتب سابقہ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِنَ الدَّهْرِ لَمْ

۱ علی سبیل المبالغة او علی حذف مضاف من الاول تقدیره: انزل ذاذ کر رسولاً (فتح القدير ۵: ۲۴۶-۲۴۷)۔

۲ قاله ابو علی الفارسی لان المصدر المنون يعمل (السابق) فالمراد بالذکر القران راجع الطبری ۱۲۔

لے نصیحت ہے۔

کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس کے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الہی میں غور و فکر کرتے رہو حتیٰ کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔

﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵۱-۵۵) اور نصیحت کرتے رہو کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔

اسی طرح بہت سی آیات میں ذکر کی کالفاظ آیا ہے۔ التذکرۃ: جس کے ذریعہ کسی چیز کو یاد دلایا جائے۔ اور یہ دلالت اور امارت سے اعم ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ﴾ (۴۳-۴۹) ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں۔

الذکر: یہ انٹی (مادہ) کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَيْسَ الذِّكْرُ كَالْأُنْثَى﴾ (۳-۳۶) اور (نذر کے لئے) لڑکا (موزوں تھا کہ وہ) لڑکی کی طرح (ناتواں) نہیں ہوتا۔

﴿كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ﴾ (۸۰-۱۱) دیکھو یہ قرآن نصیحت ہے۔ مراد قرآن پاک ہے۔

﴿آءِ الذِّكْرَيْنِ حَرَّمَ آمَ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (۶-۱۳۳) کہ (اللہ تعالیٰ نے) دونوں کے نر کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادیوں کو۔

ذکر تہ کذا: کسی کو کچھ یاد دلانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَذَكَّرْهُمْ بِأَيْمِ اللَّهِ﴾ (۱۴-۵) اور ان کو اللہ تعالیٰ کے دن یاد دلاؤ۔

ذکر کی جمع ذکور و ذکران آتی ہے چنانچہ فرمایا: ﴿ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا﴾ (۲۲-۵۰) بیٹے اور بیٹیاں۔ اور ذکر کا لفظ بطور کنایہ عضو تناسل پر بھی بولا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَتَذَكَّرْ إِحْدَهُمَا الْأُخْرَى﴾ (۲-۲۸۲) تو دوسری سے یاد دلا دے گی۔

اور جو عورت زینہ بچہ دے اسے مُذْكَرُ کہا جاتا ہے۔ مگر اَلْمُذْكَارُ وہ ہے جس کی عادت زینہ اولاد کو جنم دینا ہو۔ نَاقَةُ مُذْكَرَةٌ: وہ اونٹنی جو عظمت جثہ میں اونٹ کے مشابہ ہو۔

اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔ اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذکر بنادے گی بعض علماء نے آیت کریمہ:

سَيَفِّفُ ذُو ذُكْرٍ وَمُذْكَرٍ: آبدار اور تیز تلوا صارم ذُكُورُ الْبَقْلِ: وہ ترکاریاں جو لمبی اور سخت ہوں۔

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكَرْكُمْ﴾ (۲-۱۵۲) سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

(ذکو) ذَكَتِ (ن) النَّارُ کے معنی آگ جلنے اور روشن ہونے کے ہیں اور ذَكَيْتُهَا (تفعلیل) کے معنی جلانے اور روشن کرنے کے ہیں۔ ذُكَاةٌ: سورج اور فجر کو سورج کا بیٹا تصور کر کے اسے اِسْنُ ذُكَاةٍ: کہا جاتا ہے اور اس کا

اور ﴿أَذْكُرُوا نِعْمَتِي﴾ (۳-۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو۔ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اَذْكُرُونِي کے مخاطب آنحضرت ﷺ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد

غالب رہتے ہیں۔^①

ذَلَّ

الذَّلُّ: (ن) یہ ذَلَّ يَذُلُّ کا مصدر ہے اور ذُلٌّ (بضم ذال) زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں مگر جب طبیعت کی تیزی اور سختی از خود مغلوب ہو جائے تو اسے ذُلٌّ (بکسرہ ذال) کہا جاتا ہے۔ لہذا آیت کریمہ:

﴿وَإِخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (۱۷-۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے مقہور و مجبور بن کر رہو۔ اور ایک قرأت میں جَنَاحَ الذُّلِّ (بکسرہ ذال) ہے۔^② یعنی ان کے سامنے نرم خوار طاعت کیش بن کر رہا کرو۔ بغیر تاء کے ذُلٌّ اور تاء کے ساتھ ذَلَّةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قُلُّ اور قِلَّةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَوَسَّرَهُمْ ذِلَّةً﴾ (۱۰-۲۷) اور ان کے مونہوں پر ذلت چھاجائے گی۔
﴿وَوَضَعْنَا لَهُمْ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ﴾ (۲-۶۱) اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے توانائی) ان سے چھنا دی گئی۔

﴿سَيَسْأَلُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ﴾ (۷-۱۵۲) ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور ذلت (نصیب ہوگی)

ذَلَّتِ الدَّابَّةُ ذُلًّا منہ زوری کے بعد سواری کا مطیع ہو جانا اور اس قسم کی مطیع اور منقاد سواری کو ذُلُّوْلٌ (صفت)

حاجب اور دربان تصور کر کے اسے حَاجِبُ الشَّمْسِ کہہ دیتے ہیں۔

اور بطور کنایہ ذُكَاةٌ کے معنی ذہانت اور ذوق نہی کے بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ فُلَانٌ هُوَ شَعْلَةٌ نَارٍ۔ کا محاورہ ہے کہ فلاں آتش کا پر کالا ہے۔ ذَكَيْتُ الشَّاةَ: بھیڑ ذبح کرنا۔

اصل میں تَذْكِيَةٌ (تفعیل) کے معنی حرارت غریزی خارج کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں مخصوص طریقہ سے حیاہ زائل کرنے کو تذکیۃ کہتے ہیں۔^③

اس اشتقاق کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ میت کو حَاسِمًا اور حَاسِمًا کہا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بھی ہوئی آگ کو مَيْتَةٌ کہا جاتا ہے۔

ذِكَى الرَّجُلُ: جب کوئی شخص سن رسیدہ ہو کر کثرت تجارب کی بنا پر ذکاوت اور فہم سے بہرہ مند ہو جائے تو اس کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اس اشتقاق کے اعتبار سے صرف اسی عمر رسیدہ کو مذکیٰ کہا جائے گا جو کار آزمودہ و ریاضت چشیدہ ہو اور پھر تجارب اور ریاضت عام طور پر چونکہ عمر رسیدہ آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں ذکاوت کا لفظ استعمال ہوا تو اس مناسبت سے عمدہ اور عمر رسیدہ گھوڑوں کے متعلق بھی ذُكَاةٌ کا لفظ بولا جانے لگا چنانچہ محاورہ ہے: جَرِيٌّ الْمُدْكِيَاتِ غَلَابٌ: کہ بوڑھے گھوڑے دوڑ میں

① ای فی التنزیل الاما ذکیتم ای الا ان تذبحوا.

② المثل لقیس بن زہیر العیمی و یضرب عن یوصف بالثبریز علی اقرانه فی حلبة الفضل راجع للمثل اللسان (ذکی) و المیدانی رقم (۸۲۱) و جمهرة الامثال ۷۸ و المشکل للقیسی ۶۵ و وسط اللالی ۵۸۳ قال المیمی فی طرته و یروی غلاء و المثل فی الکامل ۲۱۹ و المستقصی و الثمار ۲۸۵ و العسکری ۱۰۷۷: ۳۰۳ و النری ۲: ۲۳.

③ وہی قرأۃ ابن عباس و عروہ بن جبیر و غیرہما و بالضم قرأۃ الجمهور (ابو حیان ۶: ۲۸ و ابن الانباری ۴۷۳).

اس سے صیغہ صفت مفعول مَذْمُومٌ وَ ذَمِيمٌ آتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَذْمُومًا مَذْحُورًا﴾ (۱۷-۱۸) نفرین سنگر اور

(درگاہِ خدا سے) راندہ ہو کر۔

اور بعض ذَمَمْتَهُ صیغہ واحد متکلم میں دوسری میم کو تاء سے

بدل کر ذَمَمْتَهُ بھی کہہ دیتے ہیں۔

الذِّمَامُ: وہ عہد وغیرہ جس کا ضائع کرنا باعثِ مذمت

ہو۔ یہی معنی ذِمَّةٌ وَمَذْمَةٌ کے ہیں۔ کہا گیا ہے لِسَى

مُذْمَةٌ فَلَا تَهْتَكُهَا کہ میرے عہد یا حرمت کا پاس

کیجئے توڑیئے نہیں۔

أَذْهَبَ مَذْمَتَهُمْ بِشَىءٍ یعنی ان کے حق احترام کا بدلہ

اتاریئے۔

أَذَمَّ بِكَذَا: اس کی حرکت کو ضائع کر دیا۔ تہاوان سے کام

لیا۔ رَجُلٌ مِذْمٌ: بے حس و حرکت • بِئْرٌ ذَمَّةٌ: کم پانی

والا کنواں • چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سامادہ جو

ناک پر ظاہر ہو جاتا ہے اسے الذِّمِيمُ کہا جاتا ہے۔ شاعر

نے کہا ہے: •

(۱۶۵) وَتَرَى الذِّمِيمَ عَلَى مَرَايِنِهِمْ

يَوْمَ الْهَيْجِ كَمَا زِنَ النَّمْلِ

لِزَانِي كَ وَنِ ان كِ نَاكِ پَرِ چِيُونِي كَ انڈوں كِ طَرَحِ

سَفِيْدِي پَحْشِيَا نِظْرَا تِي هِيْنَ۔

فاعلی) کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا ذُلُّوا لْتَبِيْرِ الْأَرْضِ﴾ (۲-۷۱) کہ وہ تیل کام

میں لگا ہوا نہ ہو۔ نہ تو زمین جوتا ہو۔

پھر اگر انسان کی ذلت خود اس کے اپنے اختیار و ارادہ سے

ہو تو وہ محمود سمجھی جاتی ہے جیسا کہ قرآن پاک نے مؤمنین

کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أَذَلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵-۵۴) جو مومنوں کے

حق میں نرمی کریں۔

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (۳-۱۲۳)

اور خدا نے جنگ بدر میں بھی تمہاری مدد کی تھی اور اس وقت

بھی تو تم بے سرو سامان تھے۔

﴿فَأَسْأَلُكُمْ سُبُلَ رَبِّكَ ذُلًّا﴾ (۱۶-۶۹) یعنی

بغیر کسی قسم کی سرکشی کے نہایت مطیع اور منقاد ہو کر اپنے

پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذَلُّلًا﴾ (۶-۱۳۷) کے معنی

یہ ہیں کہ وہ گچھے اس طرح جھکے ہوئے ہوں گے۔ کہ ان کو

نہایت آسانی سے توڑ سکیں گے۔

مجاورہ ہے: مثل۔

الْأُمُورُ تَجْرِي عَلَيَّ أذْ لَا لِيَهَا: کہ تمام امور اپنے

راستوں پر اور حسبِ مواقع جاری ہیں۔

(ذ م م)

ذَمَّةٌ (ن) ذَمًّا کے معنی مذمت کرنے کے ہیں۔

① ايضاً مُذِمٌّ وَمُذَمٌّ (الصحاح) .

② وجمعها ذمام .

③ قاله الحاورۃ الذيباني وفي رواية اللسان : كمازن الحنظل وفي الحمرة لابن دريد غب العجاج اوغب الهياح (۱۹) بدل يوم

الهياح وفي رواية الابدال لابي الطيب (۱: ۱۹۶) وترى الذئبق قال في الصحاح الذميم المخاط والبول الذي يذم ويذم من قضيب

النيس الذميم ايضاً شيء يخرج من سام المارن كبيض النمل وذهب ابن دريد الى ان الذميم ههنا هو الندى - راجع للبيت اللسان

والنجاج (حنظل، ذم، مزون) والصحاح (ذم) والمخصص (۲: ۵۶/۵۷: ۸۴) والاساس (رسن) ومبادئ اللغة لالاسكا في ۷۶.

(ذنب)

ذَنْبُ الدَّابَّةِ وَغَيْرِهَا: چوپایہ وغیرہ کی دم کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق کم مرتبہ اور رذیل آدمی پر ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

هُمْ أَذْنَابُ الْقَوْمِ: یعنی وہ رذیل ہیں اور اسی سے بطور استعارہ ٹیلوں میں پانی کے راستوں کو مَذَانِبُ التَّلَاحِ کہا جاتا ہے۔

الْمَذْنَبُ: (ایضاً) وہ کھجور جو پھل جانب سے پکنا شروع ہو۔
الذَّنْبُ: لمبی دم والا گھوڑا۔ دم دار ڈول سَجَلُّ کی طرح بطور استعارہ ذَنْبُوبُ کے معنی بھی نصیبہ اور حصہ آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ﴾ (۵۲-۵۹) کہ ان ظالموں کے لیے بھی (عذاب کی) نوبت مقرر ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کی نوبت مقرر تھی۔

الذَّنْبُ: (ض) کے اصل معنی کسی چیز کی دم کو پکڑنا کے ہیں کہا جاتا ہے کہ ذَنْبَتُهُ: میں نے اس کی دم پر مارا۔ دم کے اعتبار سے ہر اس فعل کو جس کا انجام برا ہو اسے ذَنْبُ کہہ دیتے ہیں اسی بنا پر انجام کے اعتبار سے گناہ کو تَبَعَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ ذَنْبُ کی جمع ذُنُوبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ﴾ (۳-۱۱) تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (عذاب میں) پکڑ لیا تھا۔

﴿فَكَلَّا أَخَذْنَا بِذُنُوبِهِمْ﴾ (۲۹-۴۰) تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا۔

﴿وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (۳-۱۳۵) اور اللہ تعالیٰ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ وَغَيْرُ

ذَلِكَ مِنَ الْآيَاتِ

(ذهب)

الذَّهَبُ: سونا۔ اسے ذَهَبَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔
رَجُلٌ ذَهَبٌ: جو کان کے اندر زیادہ سونا دیکھ کر ششدرہ جائے۔

شَيْءٌ مُذَهَّبٌ (او مُذَهَّبٌ) زرا نودودہ طلائی ہوئی چیز۔

كُمَيْتٌ مُذَهَّبٌ (أو مُذَهَّبٌ) کیمیت گھوڑا جس کی سرنی پر زرردی غالب ہو۔ گویا وہ سنہری رنگ کا ہے۔
الذَّهَابُ (وَالذُّهُوبُ) کے معنی چلا جانے کے ہیں۔
ذَهَبَ (ف) بِالنَّشِءِ وَأَذَهَبَهُ: لے جانا۔ یہ اعیان و معانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي﴾ (۳۷-۹۹) کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔

﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ﴾ (۱۱-۷۴) جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَاتٍ﴾ (۳۵-۸) تو ان لوگوں پر افسوس کر کے تمہارا دم نہ نکل جائے۔

میں ذَهَابُ نَفْسِ مَوْت سے کنایہ ہے اور فرمایا: ﴿إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (۱۴-۱۹) اگر وہ چاہتے تو تمہیں نابود کر دے اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق پیدا کر دے۔

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ﴾ (۳۴-۳۵) وہ کہیں گے خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔

بچوں کو بھول جائیں گی۔

(ذو)

ذُو: (والا، صاحب) یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) یہ کہ اسماء اجناس و انواع کے ساتھ توصیف کے لیے اُسے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسم ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اسم ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع بھی آتا ہے۔ اور مؤنث کے لیے ذات کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ ذواتا اور جمع ذوات آتی ہے۔ اور یہ تمام الفاظ مضاف ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (۲)۔

(۲۵) لیکن اللہ تعالیٰ اہل علم پر بڑا مہربان ہے۔

﴿ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى﴾ (۶۳-۶۴) (یعنی جبریل علیہ السلام) طاقتور نے۔ پھر وہ پورے نظر آئے۔

﴿وَذِي الْقُرْبَى﴾ (۲-۸۳) اور رشتہ داروں۔

﴿وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ﴾ (۱۱-۳) اور ہر صاحب فضل کو اس کی بزرگی (کی داد) دے گا۔

﴿ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى﴾ (۲-۱۷۷) رشتہ داروں اور یتیموں۔

﴿إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ (۱۱-۵) وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے۔

﴿وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (۱۸-۱۸) اور ہم ان کو دائیں اور بائیں کرٹ بدلاتے ہیں۔

﴿وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ﴾ (۸-۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان و شوکت

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ﴾ (۳۳)۔ (۳۳) اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے۔

اور آیت: ﴿فَلَا تَعَصَلُوا لِنْتَدَهُبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْنَاهُمْ﴾ (۴-۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کو اپنے گھروں میں اس لیے نہ روک رکھو کہ اس طرح مہر وغیرہ کی کچھ تم ان سے واپس لو۔ اور فرمایا:

﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (۸-۳۶) اور آپس میں جھگڑانہ کرنا (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

﴿ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ﴾ (۲-۱۷) تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی۔

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ﴾ (۲-۲۰) اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی)..... کو زائل کر دیتا۔

﴿لَيَقُولُنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي﴾ (۱۱-۱۰) تو (خوش ہو کر) کہتا ہے کہ (آبا) سب سختیاں مجھ سے دور ہو گئیں۔

(ذهل)

الذُّهُولُ (ف): ایسی مشغولیت جو غم و نسیان کی موجب ہو۔ کہا جاتا ہے۔ وَهَلَ عَنْ كَذَا: وہ اس سے غافل ہو گیا۔ اذْهَلَهُ كَذَا: فلاں چیز نے غافل کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ﴾ (۲۲-۲) (اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اس دن یہ حال ہوگا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے

﴿هُدَا مَا تُوَعَدُونَ﴾ (۵۳-۳۸) یہ چیزیں ہیں جن کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

﴿هُدَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ﴾ (۱۳-۵۱) یہ وہی ہے جس کے لیے تم جلدی چھایا کرتے تھے۔

﴿إِنْ هُدَيْنَ لَسَجْرِينَ﴾ (۲۰-۶۳) کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

﴿هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ﴾ (۵۲-۱۳) یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

﴿هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ (۵-۳۳) یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

”ہذا“ کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لیے ذاک اور ذک استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿آلَمْ ذَلِكِ الْكِتَابُ﴾ (۲-۲۱) آلَمْ یہ کتاب۔

﴿ذَلِكِ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ﴾ (۱۸-۱۷) یہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔

﴿ذَلِكِ أَنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكِ الْقُرَى﴾ (۶-۱۳۱) یہ اس لیے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو..... ہلاک کر دے۔

(مَا ذَا)

اور ”مَا ذَا“ بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ اول یہ ”مَا“ ذَا کے ساتھ مل کر بمنزلہ ایک اسم کے ہو۔ دوم یہ کہ ذَا بمنزلہ الَّذِي کے ہو (مَا بمعنی ای شئیء کے ہو)

(یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے۔

﴿ذَوَاتَا أَفْنَانٍ﴾ (۵۵-۲۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں)۔ علمائے معانی (منطق، فلسفہ) ذات کے لفظ کو بطور استعارہ عین شی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ جو ہر اور مرض بدون اضافت کے استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی اسم ضمیر کی طرف مضاف ہو کر اور کبھی معرف باللام ہو کر۔ اور یہ لفظ بمنزلہ نفس اور خاصہ کے بولا جاتا ہے۔ اور نَفْسُہُ وَخَاصَّتُہُ کی طرح ذَاتُہُ بھی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ عربی زبان کے محاورات سے نہیں ہے۔

(۲) بنی طبری ذُو بمعنی الَّذِي استعمال کرتے ہیں اور یہ رقی، نصی، جری، جمع اور تانیث کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿الوافر﴾ (۱۶۶) وَيَبْرِي ذُو حَفْرَتٍ وَذُو طَوَيْتٍ یعنی کنواں جسے میں نے کھودا اور صاف کیا ہے۔

(ذَا)

ہاں ”ہذنا“ میں ”ذا“ کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ هَذَا وَهَذِي وَهَاتَا۔ ان میں سے صرف هَاتَا کا تثنیہ هَاتَانِ آتا ہے۔ هَذِهِ اور هَذِي کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَرَأَيْتَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ﴾ (۱۷-۱۲) کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

قاله سنان بن فحل الطائي حين اختصم الى عبدالرحمن بن الضحاك والى المدينة (۱۰۳-۱۰۴) أيام يزيد بن عبدالملك والبيت من خمسة اوردها ابوتامم في الحماسة رقم ۱۹۲ المرزوقى وقد عيب به على المؤلف ابراهه في باب الحماسة (راجع شرح الحماسة امين الدين الطبرى) وفى اللسان (زود) غير منسوب وامالى الشحره (۳۰۶: ۲) والخزانة (۵۱۱: ۲) ۱۲.

پہلی قسم کی مثال جیسے:

کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمْ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ﴾ (۲۸)۔
(۲۳) اور دیکھا ان کے ایک طرف دو عورتیں (اپنے مال
کو) رو کے کھڑی ہیں۔ یعنی اپنے ذُوذُور کو رو کے کھڑی
ہیں۔ اور ذُوذُور اوتوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔

(ذوق)

الذُّوقُ: (ن) کے معنی چکھنے کے ہیں۔ اصل میں
ذُوقُ کے معنی تھوڑی چیز کھانے کے ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کو
زیادہ مقدار میں کھانے پر اَكْلُ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن
پاک نے عذاب کے متعلق ذوق کا لفظ اختیار کیا ہے اس
لیے کہ عرف میں اگرچہ یہ قلیل چیز کھانے کے لیے استعمال
ہوتا ہے مگر لغوی معنی کے اعتبار سے اس میں معنی کثرت کی
ملاحیت موجود ہے۔ لہذا معنی عموم کے پیش نظر عذاب
کے لیے یہ لفظ اختیار کیا ہے۔ تاکہ قلیل و کثیر ہر قسم کے
عذاب کو شامل ہو جائے قرآن پاک میں بالعموم یہ لفظ
عذاب کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾ (۴-۵۹) تاکہ (ہمیشہ) عذاب
کا مزہ چکھتے رہیں۔

﴿وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ﴾ (۳۲-۲۰) اور
ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے مزے چکھو۔

﴿فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ (۶-۳۰)
اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب (کے)

کہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے
(ہو) اس صورت میں چونکہ ”ذ“ کے ساتھ مل کر ایک اسم
بنتا ہے۔ اس لیے ”مَآ“ کے الف کو حذف نہیں کیا گیا۔
اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ﴿(الوافر)

(۱۶۷) دَعِيَ مَاذَا عَلِمْتِ سَأْتَقِيهِ

یعنی جو چیز تجھے معلوم ہے اسے چھوڑ دے میں اس سے
بچنے کی کوشش کروں گا۔ اور آیت کریمہ: ﴿يَسْأَلُونَكَ
مَاذَا يَنْفِقُونَ﴾ (۲-۲۱۹) اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں
(کہ خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں۔

میں جو لوگ قُلِّ الْعَفْوِ میں الْعَفْوُ کو نصب پڑھتے ہیں۔
وہ ”مَاذَا“ کو بمنزلہ ایک اسم کے مانتے ہیں یعنی کونسی چیز
صرف کریں مگر جن کے نزدیک ”العفو“ مرفوع ہے ان
کے نزدیک ”ذ“ بمعنی الَّذِي ہے اور مَا اسْتَفْهَمِيہ ہے اُنّی
مَا الَّذِي يُنْفِقُونَ یعنی وہ کونسی چیز ہے جسے خرچ
کریں۔ اس بنا پر آیت کریمہ:

﴿مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ (۱۶)۔

(۲۴) کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ
(وہ تو) پہلے لوگوں کی دکاتیں ہیں۔

میں آسَاطِيرُ پر نفع اور نصب دونوں جائز ہیں۔ ﴿

(ذود)

ذُذُوهُ: (ن) عَنْ كَذَا کے معنی کسی چیز سے نفع

① قاله المثقّب العبدی عائذ بن محصن وتامه: لكن بالمعنی نینی۔ والبیة فی العزارة (۲: ۵۵۴) وابن هشام (۱: ۳۳۳) والعینی (۱: ۴۸۸) والسیوطی ۶۹ قال السیوطی اورده المؤلف فی ماذا علی انها موصول او جنس بمعنی ای شیء وعلمت ضبطه النحاس بکسر التاء والاحفش عن ابی اسحاق بضمها واللسان (ذو) ونسبه الی ابی حبة النمری والبحر ۱: ۱۱۹ والکتاب ۱: ۴۰۵ والشتمری بغیر عزو ۱۲۔

② فارن المشکل للقتبی (۱۲۴-۱۲۵) ۱۲۔

تو اللہ نے ان کے اعمال کے سبب انکو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھایا۔

میں لباس کے ساتھ ذوق کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس سے اختصار و ابتلاء مراد ہے یعنی بھوک اور خوف سے اس طرح دو چار کیا کہ وہ انکا تجربہ کرنے لگے بعض نے کہا ہے کہ یہاں دراصل دو جملے ہیں اور تقدیر کلام یہ ہے اذآقہا طعم الجوع والخوف والبسها لباسهما: یعنی انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا اور ان دونوں کو لباس اور ہادیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذَا آذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ (۲۸-۳۲) اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں۔

میں رَحْمَةً کے ساتھ اذآق کا لفظ استعمال ہوا ہے اور رحمة کے بالمقابل سَيِّئَةً (یعنی سختی اور مصیبت) کے لیے أَصَابَ کا لفظ آتا ہے تو لفظ اذآق لاکر تشبیہ کی ہے کہ انسان ادنیٰ سی نعمت پا کر اتر اجاتا ہے اور گھمنڈ کرنے لگ جاتا ہے اس سے آیت کریمہ:

﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ﴾ (۹۶-۹۷) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔ کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔



مزے) چکھو۔

﴿ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ﴾ (۳۴-۳۹) (اب) مزہ چکھو تو بڑی عزت والا (اور) سردار ہے۔

﴿إِنَّكُمْ لَذَاقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ﴾ (۳۷-۳۸) بے شک تم تکلیف دینے والے عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو۔

﴿وَلَنذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَلِيمِ الْآخِزِ﴾ (۳۲-۳۱) اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔ اور بعض مقامات پر رحمت کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے فرمایا: ﴿وَلَسِنَ آذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً﴾ (۱۱-۹) اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں۔

﴿وَلَسِنَ آذَقْنَا نِعْمَاءَ بَعْدَ ضَرْأٍ مِّنْهُ﴾ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

اور کبھی بطور استعارہ ابتلاء اور اختیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے اذقنہ کذا فذاق: میں نے اسے مزہ چکھایا چنانچہ اس نے چکھ لیا۔ فُلَانٌ ذَاقَ كَذَا وَأَنَا أَكَلْتُهُ (مثل) فلاں نے تو اسے چکھا ہے اور میں کھا چکا ہوں یعنی میں نے اس سے زیادہ باخبر ہوں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَإِذَا ذَاقَهَا اللَّهُ لِيَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ﴾ (۱۲-۱۱۳)

كِتَابُ الرَّاءِ

(ر ب ب)

أَرَبَابًا ﴿ (۳۰-۸۰) اور وہ تم سے (کبھی بھی) یہ نہیں کہے گا کہ فرشتوں اور انبیاء کرام کو خدا مانو (یعنی انہیں معبود بناؤ) اور مسبب الاسباب اور مصالح عباد کو کفیل سمجھو۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۱-۱) ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

﴿اللَّهُ رَبُّكُمْ رَبُّ آبَائِكُمْ الْأَوَّلِينَ﴾ (۳۷-۱۲۶) یعنی اللہ کو جو تمہارا (بھی) پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا بھی۔

رَبُّ الدَّارِ: گھر کا مالک رَبُّ الْفَرَسِ: گھوڑے کا مالک اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:

﴿أَذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَإِنَّ سَاءَ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ﴾ (۱۲-۴۲) اپنے آقا سے میرا بھی تذکرہ کرنا۔ سوشیطان نے اس کو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا۔

﴿ارْجِعْ إِلَيَّ رَبِّكَ﴾ (۱۲-۵۰) اپنے سرکار کے پاس

الرَّبُّ: (ن) کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کسی

چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں اور رَبَّهٗ ، وَرَبَّاهُ وَرَبِّهٖ تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔ ﴿لَا نَ رَبَّ نَسِي رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ يَرَبِّي رَجُلٌ مِّنْ هَوَازِنَ﴾: کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔

رَبٌّ کا لفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃً بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اضافت اور لام تعریف سے خالی) ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کفیل ہے، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے:

﴿بَلَدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ عَفُورٌ﴾ (۳۴-۱۵) عمدہ شہر اور (آخرت میں) گناہ بخشے والا پروردگار نیز فرمایا:

﴿وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ

① قاله صفوان بن امية كصافي الكشاف (۱: ۸) والمغازي لان اسحاق ومن طريقة اخرجه ابن حبان في صحيحه والبيهقي في الدلائل وذكر الدارقطني في الغرائب عن الزهري مرسلًا كذا ذكره والصابون ان صفوان قاله لكلداء بن حنبل اخيه من امه وحديثه انه لما نهزم الناس عن الرسول الله صلى الله عليه وسلم يوم حنين وتكلم الناس فقال سفيان بن حرب لانتهي هزيمتهم دون البحر وصرح كلداء بن حنبل الا بطل السحر واليوم فقال له صفوان اسكت فض الله فاك انظر للكلمة سيرة ابن هشام ۴: ۸۶ واللسان (ريب) والفاق (۲: ۱۴۵) واضداد ابن السكيت ۲۰۴ واضداد ابن الطيب ۳۱۴ وفي اللسان (ريب) وكذا قال ابن عباس في حوار لابن الزبير لان يربني ابو عمى احب الي من ان يربني غير هم يعني ان بنى امية خير منك ۱۲.

اس میں الف نون زنداتان ہیں جیسا کہ جِسْمٌ وَلِحْيٌ کی نسبت میں جِسْمَانِيٌّ وَلِحْيَانِيٌّ کہا جاتا ہے ❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: (۱۶۸) اَنَا رَبَّانِيٌّ هَذِهِ الْأُمَّةُ: میں اس امت کا عالم ربانی ہوں اس کی جمع رَبَّانِيُّونَ ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ﴾ (۵-۶۳) انہیں ان کے رَبِّيٌّ (یعنی مشائخ) کیوں منع نہیں کرتے۔ ﴿كُونُوا رَبَّانِيِّينَ﴾ (۳-۷۸) (بلکہ دوسروں سے کہے گا) کہ تم خدا پرست ہو کر رہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ رَبَّانِيٌّ اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قول انب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے۔ ❷ اور آیت کریمہ: ﴿رَبِّيُّونَ كَثِيرٌ﴾ (۳-۳۵) بہت سے اللہ والوں نے۔ میں رَبِّيٌّ بمعنی رَبَّانِيٌّ ہے۔ ❸

الرَّبِّيَّةُ وَالرَّبَّانِيَّةُ: یہ دونوں مصدر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے رَبِّيَّةٌ اور دوسروں کے لیے رَبَّانِيَّةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

الرَّبِّ (صیغہ صفت) جمع ارباب قرآن پاک میں ہے: ﴿أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (۱۲-۳۹) بھلا دیکھو تو سہمی کہ جدا جدا معبود اچھے یا

لوٹ جاؤ۔ اور آیت: ﴿مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ (۱۲-۲۳) (یوسف نے کہا) معاذ اللہ وہ (تمہارا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رَبِّيٌّ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مراد لیا ہے لیکن پہلا قول انب معلوم ہوتا ہے۔ ❹

رَبَّانِيٌّ بقول بعض یہ رَبَّانٌ (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔ لیکن عام طور پر فَعْلَانٌ (صفت) فَعِلٌ سے آتا ہے۔ جیسے عَطْشَانٌ سَكْرَانٌ اور فَعِلٌ (فتح عین سے بہت کم آتا ہے) جیسے نَعْسَانٌ (مِنْ نَعَسٍ)

بعض نے کہا کہ یہ رَبٌّ (مصدر) کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِيٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَبٌّ مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور رَبَّانِيٌّ وہ ہے جو علم سے اپنی پرورش کرے درحقیقت یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی تربیت کرے گا وہ علم کو بھی فروغ بخشنے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ بمعنی اللہ کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِيٌّ بمعنی الٰہی ہے (یعنی اللہ والا) اور

❶ و لهذا هو قول الزجاج راجع فتح القدير للشوكاني ۱۷: ۳ و الفيوضات الالهيہ (۲: ۴۴۵)۔

❷ والزائدتان للمبالغة في النسبة كما في رباني وشعراني راجع الكتاب لسبويه واضداد ابی الطيب (۳۰۵)۔

❸ قال ابو عبيدة في محازة (۱: ۹۷) لم يعرفوا ربانيين وفي العرب للحواليقي (۱۶۱) قال ابو عبيد احسن الكلمة ليس بعبية انما هي عبرانية اوسريانية وذلك لان ابا عبيدة زعم ان العرب لا تعرف الربانيين - زاد ابو عبيد وانما عرفها الفقهاء واهل العلم راجع ايضا للسان (ربی) وانظر في القرطبي (۴: ۱۲۲) وغريب ابی عبيد۔

❹ في محاز ابی عبيدة: الرببيون الجماعة الكثيرة والواحد منها ربی ايضا قارن الفتح (۸: ۱۵۵)۔

خداے یگانہ اور زبردست۔

ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پاری ہو۔ اسے رَيْبُ يَارَيْبِيَّةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع رَيْبَائِبُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَبَائِبُكُمُ اللَّائِي فِي حُجُورِكُمْ﴾ (۴-۲۳) اور تمہاری بیویوں کی (پچھلی) اولاد جو تمہاری گودوں میں (پرورش پاتی) ہے۔

رَيْبُتُ الْأَدِيمِ بِالسَّمْنِ: میں نے چڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔

رَيْبُتُ الدَّوَاءِ بِالعَسَلِ: میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی۔ سِقَاءُ مَرْبُوبٌ: پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔ شاعر نے کہا ہے ﴿(طویل)

(۱۷۰) فَكُونِي لَهُ كَالسَّمْنِ رَبَّتْ لَهُ الْأَدِمُ
تم اس کے لیے ایسی ہو جاؤ جیسے رَبُّ لگا ہوا چڑا گھی کے لیے ہوتا ہے۔

الرَّيَابُ: بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے مَطَرٌ كَوْدَرٌ (دودھ) اور بادل کو تشبیہاً القُوحُ (یعنی دوڑھیل اونٹنی) کہا جاتا ہے محاورہ ہے۔

اصل تو یہ تھا کہ رَبُّ کی جمع نہ آتی۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدہ کفار کے مطابق بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے اور اَرْبَابٌ کے علاوہ اس کی جمع اَرْبَابَةٌ وَرُبُوبٌ بھی آتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ﴿(بسیط)

(۱۶۸) كَانَتْ اَرْبَابُهُمْ بَهْزٌ وَعَرَّهْمُ

عَقْدُ الْجَوَارِ وَكَانُوا مَعَشَرًا عُدْرًا

ان کے ہم عہد بنی بہز تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کر دیا اور درحقیقت وہ عذار لوگ ہیں۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے ﴿(طویل)

(۱۶۹) وَكُنْتُ امْرَأًا أَفْضَتْ إِلَيْكَ رَبَائِبِي

وَقَبْلَكَ رَبَّنِي فَضَعْتُ رُبُوبٌ

تم وہ آدمی ہو جس تک میری سرپرستی پہنچی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سرپرست بن چکے ہیں۔ مگر میں ضائع ہو گیا ہوں۔ رِبَابَةٌ: عہد و پیمان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رَابَّةٌ: وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہی ہو۔ اس کا مذکر رَابٌ ہے۔ لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے

① قاله ابو ذھیب الھزلی وبھزی بطن من سلیم والبیئ فی اللسان (رب) والمعانی الکبیر (۴۴۰)۔

② قاله علقمة بن عبیدہ فی قصیدة مفضلیة (۲: ۱۹۴) وفی روایة امانتی بدل ربائی وربتی) بناء التانیث والبیئ فی منتهی الطلب (۲۹: ۱) والطبری (۱: ۶۲ / ۳۱ / ۳۲۷) واللسان (رب) ومنخار الشعر الجاهلی (۱: ۳۲۱) والعقد الثمین (۱۰۷) وایام العرب ۵۷ وفی الھامش قال بعض مصحح اللسان قال الصاغانی والروایة "انت امرأة" والمخاطب حارث بن نضلة ۱۲۔

③ قال عمرو بن شاس الاسدی یخاطب امرئہ ام احسان ابنة الحارث وكانت تکره ابنه عراد فطلقها ثم ندم ولام نفسه وصدده فان كنت منی او تریدین صحبتی - وقوله رب ت له الادم ای جعل فیها الرب لئلا تفسد والادم واحدها ادم یرید الاسقیة التي یجعل فیها الرب لتصلح للسمن وفی روایة اسد الغابة به بدل له والبیئ فی الحماسة مع المرزوقی ۲۸۰ والشعراء ۳۸۹ والکامل ۱۵۴ والطبقات للحمی ۷۶ وانظر والابیات ایضاً فی الاغانی (۱۰: ۶۰) والامالی (۲: ۱۸۴-۱۸۵) وفی روایة رب له الادم والتبریذی (والسمط ۸۰۳)۔

ہو جیسا کہ نقص سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نقص کہا جاتا ہے۔ اور بُحّ قرعہ اندازی یا قمار بازی کے تیر کو کہتے ہیں۔ تو شعر کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمان داری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ ﴿طویل﴾

(۱۷۲) فَاوَسَّعَنِي حَمْدًا وَاوَسَّعْتُهُ قِرَىٰ

وَأَرْحَضَ بِحَمْدِ كَانِ كَأَسْبَةِ الْأَكْلِ

اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہو جائے۔

(ر ب ص)

التَّرْبِصُ کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ خواہ وہ

انتظار سامان تجارت کی گرانی یا ارزانی کا ہو یا کسی امر کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا ہو۔ تَرَبَّصْتُ لِكَيْدًا وَبِئِي رُبُصَةً لِكَيْدًا وَتَرَبَّصُّ: کسی چیز کا انتظار کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ﴾ (۲-۲۴۸) مطلقہ عورتوں

کو چاہیے کہ انتظار کریں۔

﴿قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِينَ﴾ (۵۲-)

(۳۱) ان سے کہو کہ (بہت اچھا) تم (بھی) انتظار کرو اور

میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسَيْنِيْنَ

وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ﴾ (۵۲-۹) اے پیغمبر! ان

أَرَبَّتِ السَّحَابَةُ: بدلی متواتر برستی رہی اور اس کے اصل معنی ہیں بدلی صاحب تربیت ہو گئی۔ اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنی لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے أَرَبْتُ فُلَانًا بِمَكَانٍ كَذَا: اس نے فلاں جگہ پر اقامت اختیار کی۔ رَبُّ تَقْلِيلٍ کے لیے آتا ہے اور کبھی کثیر کے معنی بھی دیتا ہے۔ ﴿

ہے۔ ﴿

جیسے فرمایا:

﴿رُبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوِ كَانُوا مُسْلِمِينَ﴾

(۲-۱۵) کافر بہتیرے ہی ارمان کریں گے (کہ) اے

کاش (ہم بھی) مسلمان ہوئے ہوتے۔

(ر ب ج)

الرَّبِيعُ: وہ فائدہ جو خرید و فروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرۃ اعمال کو بھی ربيع کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف ہوتی ہے۔ اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا رَبَّحَتْ تِجَارَتُهُمْ﴾ (۲-۱۶) سونہ تو ان کی

تجارت سود مند ہوئی۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

(۱۷۱) قَرَوْا أَضْيَابَهُمْ رُبِحًا بَيْحَ

بعض نے کہا ہے کہ ربيع ایک پرندے کا نام ہے اور بعض

نے کہا ہے کہ ربيع بمعنی چربی ہے لیکن ہمارے خیال میں

ربیع سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو ربيع سے حاصل ہوئی

① قاله حفان بن نديه وتمامة بعيش بفضلهن الحى سمر - والبيت فى اللسان والمحكم والتاج (ربح بوح) وقبله: اذا الحسناء لم ترخص يديها ولم يقصر لها بصر بستر.

② البيت فى الفاضل للمبرد (۲۸) والحماسة (۴: ۶۳) والمرزوقى (۱۰۶۹) فى ثلاثة بغير عزو ۱۲.

جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: **«وَمِنَ الرِّبَاطِ**
إِنْتَظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ:» کہ ایک نماز کے بعد
دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی 'رباط' ہے۔ **فُلَانٌ رَّابِطٌ**
الْجَاشِ فُلَانٌ مَضْبُوطٌ دَلٌ ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ لَا أَن رَّبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِنَا﴾ (۲۸-۱۰) اگر ہم اس
کے دل کو مضبوط نہ کیے رہتے (تو عجب نہ تھا کہ وہ ہمارا
معاملہ ظاہر کر دیتیں)۔
﴿وَلَيْسَ رِبْطٌ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ﴾ (۸-۱۱) تاکہ تمہارے
دلوں کی ڈھارس بندھائے۔

اور اسی معنی کی طرف دوسرے مقام پر اشارہ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ
وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸-۲۲) وہ خدا ہی تو تھا جس
نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل ڈالا اور اپنے فیضان نبی
سے ان کی تائید کی۔

کیونکہ ان کے دل ایسے نہیں تھے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَأَفْتَدَتْهُمْ هَوَاءٌ﴾ (۱۳-۲۳) اور ان کے دل (ہیں
کہ) ہوا ہوئے چلے جا رہے ہیں۔
اور اسی سے **فُلَانٌ رَّابِطٌ الْجَاشِ** کا محاورہ ماخوذ ہے
جس کے معنی مضبوط دل فنیض کے ہیں۔

(ر ب ع)

أَرْبَعٌ وَأَرْبَعُونَ وَرُبْعٌ وَرِبَاعٌ: ان سب کی
ایک ہی اصل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸-۲۲) (اصحاب

لوگوں سے) کہو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے
(خواہ نحوہ) ایک نہ ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے
حق میں انتظار کرتے ہیں۔

(ر ب ط)

رَبَطَ الْفَرَسِ کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ پر
حفاظت کے لیے باندھ دینے کے ہیں اور اسی سے **رِبَاطٌ**
الْجَيْشِ ہے یعنی فوج کا کسی جگہ پر متعین کرنا اور وہ مقام
جہاں حفاظتی دسے متعین رہتے ہوں اسے **رِبَاطٌ** کہا جاتا
ہے۔ اور **رَبَطْتُ وَرَبَّطْتُ** کا مصدر بھی **رِبَاطٌ** آتا
ہے۔ اور **مُرَابَطَةٌ** کے معنی حفاظت کے ہیں۔ چنانچہ
قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ
وَعَدُوَّكُمْ﴾ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے سرحدوں پر
باندھے رکھنے سے جس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن
کو مرعوب کرو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا﴾
(۳-۱۹۹) (ان تکلیفوں کو جو راہ خدا میں تم کو پیش آئیں)
برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور دشمن
کے مقابلے کے لیے تیار رہو۔
پس معلوم ہوا کہ **مُرَابَطَةٌ** کی دو قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ اسلامی سرحدوں پر دفاع کے لیے پہرہ دینا اور
دوسرے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنا اور اس میں
کو تابی نہ کرنا۔ جیسے مجاہدہ نفس کی صورت میں ہوتا ہے اور
اس مجاہدہ نفس کا ثواب بھی جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے

① اخبرجہ ابن حبان فی زوائدہ من حدیث حابر انظر رقم ۱۶۱ وفی روايته افضل الرباط انتظار الصلوة بعد الصلوة (عب وابن جریر
عن ابی ہریرة) راجع کنز العمال ۱۲۔

ہے۔ خواہ وہ اقامت موسم بہار میں ہو یا کسی اور موسم میں ہو۔ حتیٰ کہ ہر منزل کو ربیع کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اصل معنی موسم ربیع کی اقامت گاہ کے ہیں۔

الرَّبِيعُ وَالرَّبِيعِيُّ: جانور کا وہ بچہ جو موسم ربیع میں پیدا ہو اور موسم بہار جانوروں کی ولادت کے لیے چونکہ سال میں پہلا اور بہتر موسم ہے اس لیے استعارہ کے طور پر وہ بچہ جو کسی کے ہاں عالم شباب میں پیدا ہوا ہو ربیع ہی کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے:

أَفْلَحَ مَنْ كَانَ لَهُ رَبِيعِيٌّ: سعادت مند ہے وہ شخص جس کے ہاں عالم شباب میں اولاد ہو جائے۔

الْمَرْبِيعُ: موسم بہار میں بچہ دینے والی اونٹنی۔
عَيْتٌ مَرْبِيعٌ: موسم بہار کی بارش۔

رَبَعَ الْحَجْرَ وَالْحِمْلَ پتھریا بوجھ کو چاروں طرف سے پکڑ کر اٹھانا۔

الْمَرْبِيعُ: لکڑی جس کے ذریعہ چوپایہ پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ اَرْبَعَ عَلَيَّ ظَلْعِيكُ: یعنی طاقت سے زیادہ کام نہ کرو یا تو ربیع بمعنی اقامت سے ہے اور یاربِعَ الْحَجَرِ سے الْمَرْبِيعُ: اموال غنیمت کا چوتھا حصہ جو رئیس قبیلہ وصول کیا کرتا تھا یہ رُبَعَةُ الْقَوْمِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رُبْع وصول کرنے کے ہیں اور اسی سے استعارہ کے طور پر رِبَاعَةٌ بمعنی سیادت آتا ہے۔ مشہور مثل ہے:

کہف) تین تھے اور چوتھا (ان کے ساتھ) ان کا کتا تھا۔
﴿أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتَبَوَّنُ فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۶-۵) چالیس برس تک (وہ سرزمین ان کے نصیب نہ ہوگی اور) اس بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔

﴿أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ (۱۳۲-۷) (یوں) چالیس رات (کا وعدہ پورا ہو گیا)

﴿وَلَهُنَّ الرَّبِيعُ مِمَّا تَرَكَتُمْ﴾ (۱۲-۳) اور تم کچھ (ترک) چھوڑ مرو تو بیبیوں کا حصہ چوتھائی ہے۔

﴿مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾ (۳-۳) دو دو اور تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کر لو۔

رَبَعْتُ الْقَوْمَ: (۱) میں نے قوم سے چوتھائی حصہ وصول کیا۔ (۲) میں نے انہیں چار بنا دیا۔

رَبَعْتُ الْحَبْلَ: رسی کو چار ریشوں سے بٹنا۔
رَبِعُ (۱) چار دن کے پیاسے اونٹ۔ (۲) چوتھیا بخار

أَرْبَعُ إِبِلَةٍ: اونٹوں کو چوتھے روز پانی پلانا۔

رَجُلٌ مَرْبُوعٌ وَمَرْبِيعٌ: جسے چوتھیا بخار ہو۔

الرَّبِيعَاءُ چہار شنبہ۔ کیونکہ عربی میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہے۔ جسے یوم الاحد کہا جاتا ہے۔

رَبِيعٌ: موسم بہار (کیونکہ یہ سال کا چوتھا موسم ہے) اسی سے محاورہ ہے:

رَبَعَ فُسْلَانٌ وَارْتَبَعَ: اس نے فلاں جگہ پر موسم بہار گذارا مجازاً کسی جگہ پر اقامت کے معنی میں استعمال ہوتا

① و قبلہ: ان بنی صبیہ صفیون والشطرق قد اصبح مثلاً يضرب فی التدم علی مافات وقد تمثل بهما سليمان بن عبد الملك وهو يهود بنفسه الفائق (۲: ۲۵) و الاحبار الطوال (۳۳۰) والثل في الميداني (۱: ۱۴۰) والرحز ايضاً في الاصلاح (۲۶۲: ۴۷۰) والحيوان (۱: ۱۰۹) والاشفاق (۴۳: ۱۰۲) والعقد (۳: ۱۰۳) والمقاييس (۳: ۳۲۶) والالفاظ (۶: ۳۹۶) والفائق (۲: ۴۷) والمخصص (۱: ۳۰) والمحکم والتاج (ربيع) وجمهرة الامثال (۱: ۴۰) واللسان (ربيع صيف) والشطرق الثاني في شرح الحماسة للمرزوقي (۱۳۹۵) والاول في المعاني للفتني ۳۱۱ واختلف في اول قائله فقي نوادر لبي زيد ۸۷ هو اكرم بن صيفي وفي الميداني سعد بن مالك بن ضبة وقيل بن معاوية بن قشير وفي محاضرات المؤلف (۳: ۲۰۱) قاله دهقان لملك من ملوك العمم وفيه الخبر وفي اللسان واكرم بن صيفي ۱۲.

انہیں بڑا سخت پکڑا۔

أَرَبِيٌّ عَلَيْهِ: کسی پر بلند ہونا یا کسی کی نگرانی کرنا۔

رَبِيتُ الْوَلَدِ فَرَبًا: میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ

بڑھ گیا بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں رَبَبْتُ ہے۔

تخفيف کے لیے ایک باء کو یاء سے بدل دیا۔ جیسا کہ

تَطَنَيْتُ کہ اصل میں تَطَنَنْتُ ہے تخفیفاً ایک نون کو یاء

سے تبدیل کر دیا ہے۔

الرَّبَا: (سود) رأس المال یعنی اصل سرمایہ پر جو بڑھتی لی

جائے وہ رِبُو کہلاتی ہے۔ لیکن شریعت میں خاص قسم کی

بڑھتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ زیادہ ہونے کے

اعتبار سے فرمایا:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رَبَا يَرَبُوفِي أَمْوَالِ النَّاسِ

فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۳۰-۳۹) اور تم جو چیز

(عطیہ) زیادہ لینے کے لیے دو تاکہ لوگوں کے اموال

میں بڑھتی ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھے گی۔

اور آیت:

﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۲-۲۷)

اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔

میں محق کا لفظ لا کر اس بات پر تشبیہ کی ہے کہ ”ربا“ یعنی

سود میں برکت نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں زکوٰۃ کے

متعلق فرمایا:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ

فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ﴾ (۳۰-۳۹) اور جو تم

(محض) خدا کی رضا جوئی کے ارادے سے زکوٰۃ دیتے ہو تو

جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دیئے ہوئے کو خدا کے

ہاں بڑھا رہے ہیں۔

لَا يُقِيمُ رِبَاعَةَ الْقَوْمِ إِلَّا فُلَانٌ کہ قوم کی سیاست

کی باگ ڈور فلاں شخص ہی سنبھال سکتا ہے۔

رَبِيعَةٌ: (ایضاً) اصل میں ڈبیہ کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس

کے چار طبقے یا چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔

الرَّبَاعِيَّتَانِ: دو دانتوں کا نام۔ بعض نے کہا ہے کہ ان

دونوں کے درمیان چونکہ چار دانتوں کا فاصلہ ہوتا ہے اس

لیے انہیں رباعیان کہا جاتا ہے۔

الرَّبُوعُ: جنگلی چوہا۔ کیونکہ یہ چوکھائل بناتا ہے۔

أَرْضٌ مَّرْبُوعَةٌ: بہت چوہوں والی زمین جیسا کہ زیادہ

سوسا والی زمین کو مُصَبَّةٌ کہا جاتا ہے۔

(ر ب و)

رَبْوَةٌ: (مثلثة الراء) وَرَبَاوَةٌ (فتح الراء وکسرھا)

بلند جگہ یا ٹیلے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ (۲۳-۵) ایک

اونچی جگہ جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب (بھی تھی)۔

الوَالْحَسَنُ نے کہا ہے کہ رِبْوَةٌ کا لفظ زیادہ جید ہے۔ کیونکہ

اس کی جمع رُبِيٌّ آتی ہے۔ اور رِبَا فُلَانٌ فلاں اونچی

جگہ پر چلا گیا۔ اور رِبْوَةٌ کو رَابِيَةٌ بھی کہا جاتا ہے گویا وہ

خود بلندی پر ہے اور اسی سے رِبَا ہے جس کے معنی بڑھنے

اور بلند ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَّتْ﴾ (۲۲-۵)

پھر جب ہم اس پر پانی برسات دیتے ہیں تو وہ لہلہانے اور

ابھرنے لگتی ہے۔

﴿فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا﴾ (۱۳-۱۷) پھر

نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿فَأَخَذَهُمُ أَخْذَةً رَّابِيَةً﴾ (۲۹-۱۰) تو خدا نے بھی

طور پر ہو یا صناعی طریقہ سے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَانَتْ رَتْقًا فَفَتَقْنَا هَمًّا﴾ (۲۱-۳۰) کہ آسمان
 وزمین (دونوں ایک ہیوں تھے تو ہم نے (اس کو توڑ کر)
 زمین و آسمان کو الگ الگ کیا۔
 رَتْقاء: وہ عورت جس کی شرمگاہ کے دونوں کنارے باہم
 چسپیدہ ہوں اور اس سے ہم بستری نہ ہو سکے۔
 مشہور محاورہ ہے:

فَلَا تَرَاقِبَ فَسَاتِقٌ فَنِي كَذَا (مثل) فلاں اس
 معاملہ میں کرتا دھرتا ہے۔

(رت ل)

الرَّتْلُ: کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ تنظیم اور
 مرتب ہونا۔ رَجُلٌ رَتْلٌ الْأَسْنَانِ آدمی جس کے
 دانت آبدار اور حسن ترتیب کے ساتھ ہوں اور تَسْرِيْلُ
 کے معنی سہولت اور حُسن تناسب کے ساتھ کسی کلمہ کو
 ادا کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَتَّلْ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا﴾ (۳-۷۳) اور تم قرآن
 پاک کو خوب حسن ترتیب کے ساتھ پڑھا کرو۔
 ﴿وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا﴾ (۲۵-۳۲) اور ہم نے اسے
 نہایت عمدہ ترتیب اور تناسب کے ساتھ اتارا۔

(رت ج)

الرَّجُّ (م ن) اس کے معنی کسی چیز کو ہلانے اور
 جنبش دینے کے ہیں اور اَرْتَجَجُ (انتعال) اس کا

الْأَرْبِيَّتَانِ: سرینوں کے چڈھے۔
 الرَّبْوُ: سانس پھولنا۔ سانس پھول کر چونکہ اوپر کو چڑھتا
 ہے اس لیے اس کو رَبْوٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سانس
 پھولے ہوئے آدمی کے متعلق هُوَ يَتَنَفَّسُ الصَّعْدَاءُ
 کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور الرَّبِيَّةُ: جس کے معنی
 جاسوس ہیں (ربء) سے ہے اور اس مادہ (رب و) سے
 اس کو کوئی تعلق نہیں۔

(رت ع)

رَتَعَ (ف) رَتَعًا وَرَتُوْعًا۔ وَرَتَعَةٌ کے اصل
 معنی جانوروں کے چرنے کے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور
 پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
 چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَرْتَعُ وَيَلْعَبُ﴾ (۱۲-۱۲) کہ (جنگل کی پھل
 پھلاری) کھائے پیئے اور کھیلے (کودے)
 اور تشبیہ کے طور پر (بدگویی کے معنی میں بھی آتا ہے
 (جیسا کہ) شاعر نے کہا ہے۔^①

(۱۷۴) وَإِذَا يَخْلُوْهُ لَحْمِي رَتَعَ
 جب تنہائی میں اس کے پاس ہوتا تو میرا گوشت کھانے
 لگ جاتا ہے یعنی غیبت کرتا ہے۔
 مویشی کے لیے راتع کی جمع رَتَاعٌ آتی ہے اور
 انسان کے لیے رَاتِعُوْنَ۔

(رت ق)

الرَّتْقُ: اس کے اصل معنی جوڑنا اور ملانا کے ہیں خواہ خلقی

① مفید القافیہ قالہ سوید بن کاہل الیشکری فی کلمة مفضلية ۱۸۸ بیتاً بعضہا فی الامالی (۱: ۱۰۱، ۲: ۳۱۹) وصدرة: ویحینی
 اذا لاقیته والبيت فی اللسان (رتع) والشعراء ۲۵۱ والحزانة (۲: ۵۴۷) وشواهد الکشاف ۷۲ وفی رواية اذا یخلو بدل خلوا وحبیب
 لی بدل ویحین ۱۲۔

عذاب دردناک کی سزا ہے۔ میں لفظ رَجَز زلزلہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے اور فرمایا:

﴿إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۳۹-۳۳) ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔

﴿وَالرَّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (۴-۵) اور نجاست سے الگ رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رَجَز سے بت مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مآل کے لحاظ سے عذاب کہا جاسکتا ہے۔ جیسے ندی بمعنی شہم آجاتا ہے اور آیت:

﴿وَيُنزِلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُم رِجْزَ الشَّيْطَانِ﴾ (۸-۱۱) اور آسمان سے تم پر پانی برسارہا تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔

میں رَجَز الشَّيْطَان سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی، فساد انگیزی وغیرہ گناہ مراد ہیں جس کی شیطان ترغیب دیتا ہے۔

رِجَازَةٌ وہ کبیل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ..... کا توازن قائم رکھنے کے لیے ایک طرف باندھ دیتے ہیں۔ اس میں بھی حرکت واضطراب کے معنی ملحوظ ہیں۔

(ر ج س)

الرَّجْسُ: پلید، ناپاک، جمع اَرَجَاسُ کہا جاتا ہے رَجُلٌ رَجْسٌ: ناپاک آدمی۔ وَرِجَالٌ

مطالع ہے جس کے معنی ہلنے اور مضطرب ہونے کے ہیں۔ جیسے رَجَبُهُ فَاَرْتَجَّ: اسے ہلایا چنانچہ وہ ہلنے لگا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا﴾ (۵۶-۴) اور قیامت اس وقت واقع ہوگی۔ جب کہ زمین بڑے زور سے ہلنے لگے گی۔

اسی کو دوسرے مقام پر: ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ﴾ (۹۹-۱) (جب زمین بڑے زور سے ہلا دی جائے گی۔ سے تعبیر کیا ہے۔

الرَّجْرَجَةُ: اضطراب۔ كَتَبْتُهُ رَجْرَجَةً: لشکر جرار۔ جَارِيَةٌ رَجْرَجَةٌ: تھر تھر کر ہلنے والی چھو کری۔ اَرْتَجَّ كَلَامُهُ: کلام کرتے وقت آواز میں گونج اور لہر پیدا ہونا۔ رَجْرَجَةٌ: تھوڑا سا پانی جو ہلانے سے گدلا ہو جائے۔

(ر ج ن)

الرَّجْزُ: اس کے اصل معنی اضطراب کے ہیں۔ اور اسی سے رَجَزُ البَعِيرُ ہے جس کے معنی ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں کی کپکپائی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو اَرَجَزُ اور ناقہ کو رَجَزَاءُ کہا جاتا ہے اور شعر کے ایک بحر کا نام بھی رَجَزُ ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں کہا جائے اسے اَرَجُوزَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع اَرَجِيزُ آتی ہے اور رَجَزَ فَلَانٌ وَارْتَجَزَ کے معنی بحر جز پر شعر بنانے یا اُزْهُوہ پڑھنے کے ہیں اور رَجَزُ گوشاعر کو اَرَجِيزُ،

رَجَازٌ اور رَجَازَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿عَذَابٌ مِّن رَّجِزِ آئِنٍ﴾ (۳۳-۵) (ان کے لیے)

بعض نے رَجَسٌ سے نمن (بدبودار) اور بعض نے عذاب مراد لیا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ (۹-۲۸) مشرک تو (نرے) گندے ہیں۔

میں مشرکین کو اور آیت کریمہ:

﴿أَوْلَحَمٍ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رَجَسٌ﴾ (۲-۲۵) (یا سو رکا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں۔ میں خنزیر کے گوشت کو رجم کہا گیا ہے یعنی شرعاً ناپاک ہونا مراد ہے۔ رَجَسٌ وَرَجَزٌ: سخت آواز چیخ۔ بَعِيسٌ رَجَّاسٌ: مست اونٹ عَمَامٌ، رَجَّاسٌ وَرَجَّاسٌ: بہت گرجنے والا بادل۔

(ر ج ع)

الرُّجُوعُ: اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے مبدأ حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں۔ خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جزو کے اور یا باعتبار (فعل کے ہو) الفرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رَجَعُ کے معنی لوٹانے کے اور رَجَعَةٌ کا لفظ طلاق کے بعد رجوع کرنے یا موت کے بعد دنیا کی طرف لوٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے: ﴿فَلَا تُؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ﴾: فلا رجعت پر ایمان رکھتا ہے اور رجوع کا لفظ خاص کر پرند کے اپنی جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس اس طرف لوٹ آنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ رجوع کے معنی میں فرمایا:

﴿لَيْسَ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ﴾ (۲۳-۸) اور یہ منافق

أَرَجَّاسٌ: قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ (۵-۹۰) (توبہ) ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔

جاننا چاہئے کہ رَجَسٌ چار قسم پر ہے۔ (۱) صرف طبیعت کے لحاظ سے (۲) صرف عقل کی جہت سے۔ (۳) صرف شریعت کے روئے۔ (۴) ہر سہ کی روئے جیسے میتہ (مردار) سے انسان کی طبعی نفرت بھی ہے اور عقل و شریعت کی روئے بھی ناپاک ہے۔ رجم شرعی، جیسے جوا اور شراب ہے کہ شریعت نے انہیں رجم قرار دیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ چیزیں عقل کی روئے بھی رجم ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنَّمَهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲-۲۱۹) (مگر) فائدہ سے ان کا گناہ (اور نقصان) بڑھ کر۔ میں اسی معنی پر تنبیہ کی ہے کیونکہ جس چیز کا نقصان اس کے نفع پر غالب ہو ضروری ہے کہ عقل سلیم اس سے مجتنب رہنے کا حکم دے اسی طرح کفار کو رجم قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ شرک کرتے ہیں اور شرک عند العقل قبیح ترین چیز ہے جیسے فرمایا:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ رَجَسٌ فَرَأَدْتَهُمْ رَجْسًا إِلَىٰ رَجْسِهِمْ﴾ (۹-۱۲۵) اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) خباثت پر ایک اور خباثت بڑھا دی۔

﴿وَيَجْعَلُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (۱۰-۱۰) اور خدا (شرک و کفر کی) نجاست انہیں لوگوں میں ڈالتا ہے جو (دلائل و حقائق) میں عقل کو کام میں نہیں لاتے۔

① قال في اللسان ومن حملتهم طائفة من الرافضة يقولون ان علي بن ابي طالب مستتر في السحاب فلا يخرج مع من خرج من ولده حتى ينادى مناد من السماء: اخرج مع فلان ۱۲.

کہتے ہیں کہ اگر مدینے لوٹ کر گئے۔

﴿فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ آبِيهِمْ﴾ (۱۲-۶۳) تو جب (یہ

لوگ) اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے۔

﴿وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ﴾ (۷-۱۵۰) اور

جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

﴿وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ اَرْجِعُوا فَارْجِعُوا﴾ (۲۳-۲۸)

اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ آؤ تو (بے تامل) لوٹ

آؤ۔ رَجَعْتُ عَنْ كَذَا: میں نے فلاں بات سے

رجوع کر لیا رَجَعْتُ الْجَوَابَ: (متعدی) جواب دینا

جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَائِفَةٍ﴾ (۹-۸۳) اگر خدا

تم کو (جہاد پر سے ان منافقوں کے) کسی گروہ کی طرف

(صحیح و سلامت) لوٹا کر لے جائے۔

﴿إِلَىٰ اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ (۱۱۰-۴) تم (سب) کو اللہ

کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

﴿إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ﴾ (۹۲-۸) بے شک (ان

سب کو) تمہارے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ﴾ (۱۰-۴) اسی کی طرف تمہیں لوٹ

کر جانا ہے۔

مَرْجِعٌ رُجُوعٌ سے بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ آیت: ﴿ثُمَّ

إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (۲-۲۸) پھر اس کی طرف لوٹ کر

جائیں گے۔

میں ہے اور رَجَعٌ (متعدی) سے بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ

اس آیت میں ایک قرأت: ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾

(۲-۲۸) پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

بھی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَىٰ اللَّهِ﴾ (۲-۲۸۱)

اور دیکھو اس دن (کی پرش) سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے

حضور میں لوٹائے جاؤ گے۔

میں ایک قرأت تَرْجِعُونَ (بصیغہ معروف) بھی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (۲۳-۲۸) کہ (اب بھی) یہ

لوگ باز آ جائیں۔

میں رَجُوعٌ عَنِ الذَّنْبِ: یعنی گناہ سے باز آ جانا مراد

ہے اسی طرح آیت:

﴿وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾

(۲۱-۹۵) کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے لیے ممکن نہیں

ہے کہ توبہ کر کے شرک و کفر یا گناہوں سے باز آ جائیں

کیونکہ مرنے کے بعد توبہ نہیں ہے اسی بنا پر منافقین کو

استہزاء کے طور پر کہا جائے گا۔

﴿أَرْجِعُوا وِرْآئِكُمْ فَاتِمْسُوا نُورًا﴾ (۵۷-۱۳)

(الایۃ) تو (ان سے کہا جائے گا) کہ (نہیں) اپنے پیچھے

(یعنی دنیا) کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) کوئی اور روشنی

تلاش کرو۔

(یعنی توبہ کر کے ایمان لاؤ جو اس روشنی کا سبب ہے۔ اور آیت:

﴿بِسْمِ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ﴾ (۲۷-۳۵) کہ اچھی کیا

لے کر آتے ہیں۔

میں يَرْجِعُ رُجُوعٌ سے بھی ہو سکتا ہے اور رَجَعِ الْجَوَابِ

سے بھی جیسا کہ فرمایا:

﴿يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ نِ الْقَوْلِ﴾ (۳۲-۳۱)

اور ایک کی بات ایک رد کر رہا ہوگا۔

اور آیت کریمہ:
 ﴿ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَأَنْظَرْنَا مَاذَا يَرْجِعُونَ﴾ (۲۷-۲۸)
 پھر ان سے (الگ) ہٹ جا۔ اور دیکھتا رہ کہ لوگ کیا
 جواب دیتے ہیں۔

میں یَسْرَجِعُونَ رَجَعَ الْجَوَابَ سے ہے نہ کہ رجوع
 سے اور آیت کریمہ:
 ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ﴾ (۸۶-۱۱) اور پانی برسانے
 والے آسمان کی قسم۔

میں رَجَعَ کے معنی بارش کے ہیں اور بارش کو رَجْعُ اس
 لیے کہا گیا ہے کہ اولاً سمندروں سے بخارات بن کر پانی
 اوپر چلا جاتا ہے اور پھر ہوا بارش کی صورت میں انہیں
 زمین پر واپس لے آتی ہے اور تالاب کو بھی رَجْعُ کہا جاتا
 ہے یا تو اس لیے کہ اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اور یا
 اس لیے کہ اس کی لہروں میں تلاطم ہوتا رہتا ہے محاورہ ہے:
 لَيْسَ لِكَلَامِهِ مَرْجُوعٌ اس کی بات کا جواب نہیں۔
 دَابَّةٌ لَهَا مَرْجُوعٌ وہ جانور جسے استعمال کے بعد بیچنا
 ممکن ہو۔

نِسَاقَةٌ رَاجِعَةٌ: اونٹنی جو چمکتی سے حاملہ نہ ہو گویا وہ نر کے
 نطفہ کو واپس لوٹا دیتی ہے۔
 أَرْجَعُ يَدَهُ إِلَى سَيْفِهِ: اس نے تلوار سونٹنے کے لیے
 ہاتھ کو واپس لوٹا یا۔
 الْإِرْتِجَاعُ: (الاعتقال) واپس لے لینا۔ إِرْتِجَاعُ
 إِسْلَامٍ - زلزلہ زلزلہ کران کے عوض مادہ شتر خریدنا اس میں
 اگرچہ بعینہ چیز کو لوٹانے کے معنی نہیں پائے جاتے لیکن
 پہلی تقدیر واپس لوٹانے کے معنی ملحوظ ہیں۔
 إِسْتَرْجَعُ فَلَانٌ - إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہا۔

الرَّجِيعُ: (۱) غنمایا قرأت کے وقت آواز کو حلق میں لوٹانا۔
 (۲) کوئی بات دوبارہ کہنا، اسی سے ترجیع فی الاذان ہے
 جس کے معنی اذان میں شہادتین کو ایک مرتبہ پست آواز سے
 کہنے کے بعد دوبارہ بلند آواز سے کہنے کے ہیں۔
 الرَّجِيعُ: (۱) انسان یا چوپایہ کا فضلہ، اسے اگر رجوع
 سے مانا جائے تو فاعیل بمعنی فاعل ہوگا اور اگر رَجَعُ
 (متعدی) سے مانا جائے تو فاعیل بمعنی مفعول ہوگا۔
 جَبَّةٌ رَجِيعٌ: وہ جبہ جسے ادھیڑ کر دوبارہ سلا گیا ہو۔
 (۲) نیز رجیع اس سواری کو کہتے ہیں کہ جو ایک سفر سے واپس
 آنے کے بعد متصل ہی دوسرے سفر پر چلی جائے اس کی
 مؤنث رَجِيعَةٌ ہے اور کنایہ کے طور پر کثرتِ اسفار کی وجہ
 سے لاغر اور دلی سواری کو بھی دَابَّةٌ رَجِيعٌ وَرَجْعُ سَفَرٍ
 کہہ دیتے ہیں۔
 (۳) نیز مکرر کلام کو بھی رَجِيعٌ کہا جاتا ہے۔ (۴) وہ کلام
 جو بوجہ کراہت متکلم کی طرف لوٹا دی جائے اسے بھی
 رَجِيعٌ ہی کہا جاتا ہے۔

(ر ج ف)

الرَّجْفُ: (ن) اضطراب شدید کو کہتے ہیں اور
 (رَجَفَتِ الْأَرْضُ أَوِ الْبَحْرُ) کے معنی زمین یا سمندر
 میں زلزلہ آنا کے ہیں۔ بَحْرٌ رَجَافٌ: متلاطم سمندر قرآن
 پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرُجِفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾ (۷۳-۱۴)
 جب کہ زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے۔
 ﴿يَوْمَ تَرُجِفُ الرَّاجِفَةُ﴾ (۷۹-۶) جب کہ زمین
 لرز جائے گی۔

﴿فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ (۷۸-۷) پس ان کو زلزلے

نے پایا۔

(صرف اتنی بات پر) ایک شخص کے قتل کے درپے ہو کہ وہ اللہ ہی کو اپنا پروردگار بناتا ہے۔ محاورہ ہے: هُوَ اَرْجُلُ الرَّجُلَيْنِ: کہ وہ دونوں میں زیادہ جو ان مرد ہے۔

السَّجُلُ: پاؤں۔ اس کی جمع اَرْجُلٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَمْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ إِلَى الْكَعْبِينَ﴾ (۶-۵) اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھولیا کرو۔

رَاجِلٌ وَرَجُلٌ: پایادہ چلنے والا۔ یہ بھی السَّجُلُ بمعنی پاؤں سے مشتق ہے اور راجل کی جمع رَجَالَةٌ اور رَجُلٌ آتی ہے جیسے رَكْبٌ جو کہ رَاكِبٌ کی جمع ہے اور رَاجِلٌ کی جمع رَجَالٌ بھی آجاتی ہے جیسے رَاكِبٌ وَرِكَابٌ۔

اور رَجُلٌ رَاجِلٌ سے کہتے ہیں جو چلنے پر قدرت رکھتا ہو اس کی جمع رَجَالٌ آجاتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَرَجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ (۲-۲۳۹) تو پاؤں پیدل یا سواری طرح رَجِیلٌ وَذُو رَجَلَةٍ کے معنی بھی بہت زیادہ یا پایادہ چلنے والے شخص کے ہیں۔

حَرَّةٌ رَجْلَاءُ: جس میں صعوبت سے چلا جاسکے۔

الأَرْجُلُ: سفید پاؤں والا گھوڑا۔ بڑے پاؤں والا۔ رَجَلْتُ الشَّاةَ: میں نے بکری کو پاؤں سے باندھ کر لٹکا

دیا۔ اور بطور استعارہ رَجُلٌ کے معنی (۱) ٹڈی دل اور پانی بہنے کا راستہ بھی آجاتے ہیں اس کا واحد رَجْلَةٌ ہے اور سَيْلُ الْمَاءِ كورَجُلٍ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے

الأَرْجَافُ: (افعال) کوئی جھوٹی انواہ پھیلا کر یا کسی کام کے ذریعہ اضطراب پھیلانا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ﴾ (۳۳-۶۰) اور جو لوگ مدینے میں جھوٹی انواہیں پھیلاتے ہیں۔

مثل مشہور ہے۔ ۵ الأَرَاخِيفُ مَلَاقِيحُ الْفَتَنِ: کہ جھوٹی انواہیں فتنوں کی جڑ ہیں۔

(ر ج ل)

الرَّجُلُ: کے معنی مرد کے ہیں اس بنا پر قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا﴾ (۶-۹) اگر ہم (رسول کا مددگار) کوئی فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی ہی بناتے۔

رَجْلَةٌ: عورت جو مردی وضع اختیار کر لے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۵

(۱۷۵) "لَمْ يَبَالُوا حُرْمَةَ الرَّجْلَةِ"

اس مرد نما عورت کی حرمت کی پرواہ نہ کی۔

اور رَجُلٌ کے معنی مرد کا مل بھی آتے ہیں جس میں مردانگی کے جوہر نمایاں ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى﴾ (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا۔

رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِّنَ آلِ فِرْعَوْنَ: فرعون کے لوگوں میں سے ایک مرد مومن یعنی جو قوی اور بہادر تھا (یہ ماجرا سن کر بولا) ﴿أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ﴾ کیا تم

① راجع للمثل المعاصم وفي الميداني ۱۲.

② لم احده قائله واوله: حرقوا حجب فتاتهم۔ والبيت في اللسان (رجل) والكامل ۲۴۱ وتفسير الطبري (۸: ۱۴۶) والبحر (۲: ۱۷۶) وفي المطبوع لم ينالوا مصحف. كل جار ظل مغتبطاً. غير حيران بنى حبله. والبيت ايضا في امالي ابن الشجري (۲: ۲۸۷) واعراب ثلاثين لابن خالويه (۴۴) وفي روايته صولة بدل حرمة والاعجاز للباقلاني.

ذنا ب کہہ دیتے ہیں۔

رَجُلَةٌ: بقلة الحمقاء: کیونکہ وہ بھی عموماً راستہ میں آگتا ہے۔

اور کسی شخص کے عہد حکومت کو بھی رَجُل کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: كَمَا ذَٰلِكَ عَلَىٰ رَجُلٍ فُلَانٍ (کہ فلاں کے عہد حکومت میں تھا) جیسا کہ علیٰ رَأْسِ فُلَانٍ کا محاورہ ہے۔

إِرْتَجَلَ الْكَلَامَ فِي الْبَدِيهَةِ کہنا۔ اِرْتَجَلَ الْفَرَسُ فِي عَدْوِهِ: گھوڑے کا درمیانی دوڑ دوڑنا۔

تَرَجَّلَ الرَّجُلُ: سواری سے اتر کر پیدل چلنا۔

تَرَجَّلَ فِي الْبَيْتِ: بغیر ری کے کوئیں میں اترنا۔

تَرَجَّلَ النَّهَارُ: سائے کا دیواروں سے نیچے اترنا گویا وہ پیدل چل رہا ہے۔

رَجَلَ شَعْرَهُ کے معنی بالوں کو کنگھی کرنا کے ہیں کیونکہ کنگھی کرنے سے بال نیچے پاؤں کی طرف اتر آتے ہیں۔

الْمِرْجَلُ: نصب کی ہوئی دیگ۔ اَرَجَلْتُ الْفَصِيلَ اُونٹنی کے بچہ کو اس کی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا۔

(ر ج م)

الرَّجَامُ: پتھر۔ اسی سے الرجم ہے جس کے معنی سنگسار کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ رَجَمَهُ: اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا ہوا ہے مَرَجُومٌ کہتے

ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ﴾ (۲۶-۱۱۶) کہ تم ضرور سنگسار کروئے جاؤ گے۔

﴿أَنَّهُمْ إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ﴾ (۱۸-۲۰) کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

پھر استعارہ کے طور پر رَجَمٌ کا لفظ جھوٹے گمان، توہم، سب و شتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجَمًا بِالْغَيْبِ﴾ (۱۸-۲۲) یہ سب غیب کی باتوں میں اٹکل کے نکلے چلاتے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔ (طویل)

(۱۷۶) "وَمَا هُوَ عَنْهَا بِالْحَدِيثِ الْمَرْجَمِ"

اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔ اور شیطان کو رجم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور اعلیٰ

کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ (۱۶-۹۸)

تو شیطان مردود کے وسوسے سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔

﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ﴾ (۳۸-۷۷) تو بہشت

سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔

اور شُهْبٌ (ستاروں) کو رَجُومٌ کہا گیا ہے قرآن

پاک میں ہے:

① قاله زهير في معلقته من السبعة واوله: وما الحرب الا ما علمتم وذقمم۔ والبيت في محازبي عبدة ۳۹۸ رقم ۴۶۴ وعنه في الفتح ۳۹۳: ۶) والعقد الثمين ۹۵ وایام العرب ۲۷۴ والامناس رجم والمحاضرات للنووف (۱۷۶: ۳) والحمهرة ۱۰۷ وديوانه ۱۷ وشرح العشر للتهريزي (۱۱۲) والبحر (۱۱۴: ۶) والقرطبي (۳۸۳: ۱۰) والخزانة (۴۳۰: ۳) ومختار الشعر الحاهلي (۱: ۱۰۴) وشرح السبع لابن الانباري (۰۲۶۷)

میں بعض مفسرین نے اس کے معنی لا تَخَافُونَ کیے ہیں یعنی کیوں نہیں ڈرتے جیسے کہ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿طویل﴾ (۱۷۷) إِذَا لَسَعَتْهُ النَّحْلُ لَمْ يَرْجُ لَسَعَهَا وَحَالَفَهَا فَنِي بَيْتِ نُوْبٍ عَوَاسِلُ
جب اسے مکھی ڈنگ مارتی ہے تو وہ اس کے ڈسنے سے نہیں ڈرتا۔ اور اس نے شہد کی مکھیوں سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف درجاء باہم متلازم ہیں (جب کسی محبوب چیز کے حصول کی توقع ہوگی) ساتھ ہی اس کے تضییع کا اندیشہ بھی دامن گیر رہے گا۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس صورت میں اندیشہ کے ساتھ ہمیشہ امید پائی جاتی ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرْتَجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ﴾ (۱۰۴-۳) اور تم کو خدا سے وہ وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔
﴿وَأَخْرُونَ مَرْجُونَ لِأَمْرِ اللَّهِ﴾ (۱۰۶-۹) اور کچھ اور لوگ ہیں کہ حکم خدا کے انتظار میں ان کا معاملہ ملتوی ہے۔

أَرْجَبَتِ السَّاقَةُ: اونٹنی کی ولادت کا وقت قریب آ گیا۔ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اونٹنی نے اپنے مالک کو قرب ولادت کی امید دلائی۔

﴿رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ﴾ (۶۷-۵) ان کو شیاطین کے لیے ایک طرح کا زور بنایا ہے۔

رَجْمَةٌ وَرُجْمَةٌ: قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس سے قبر مراد لیتے ہیں۔ اس کی جمع رِجَامٌ وَرُجْمٌ آتی ہے۔ اور رَجَمْتُ الْقَبْرَ کے معنی قبر پر پتھر نصب کرنا کے ہیں۔ حدیث میں ہے: ﴿

(۱۵۰) لَا تَرُجَمُوا قَبْرِي - کہ میری قبر پر پتھر نہ لگانا۔
الْمَرَّاجِمَةُ: باہم ایک دوسرے کو مغلظات سنانا۔ مَقَادِقَةُ کی طرح یہ لفظ بھی اس معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور رَجْمٌ سے تَرَجْمَانٌ بروزن تَفْعُلَانٌ آجاتا ہے۔

(ر ج و)

رَجَا البَيْتُ: کنویں کا کنارہ۔ رَجَا السَّمَاءُ: آسمان کا کنارہ۔ اس کی جمع آرَجَاءٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْمَلِكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا﴾ (۶۹-۱۷) اس کے کنارے پرفرشتے ہوں گے۔

اور رَجَاءٌ ایسے ظن کو کہتے ہیں جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَالِكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا﴾ (۷۱-۱۷) تو تمہیں کیا بلا مار گئی کہ تم نے خدا کا وقار دل سے اٹھا دیا۔

۱ وصیة اوصی بہا عبد اللہ بن مغفل وقت الموت ای لاتعملوا علیہا الرحم ومعناه النهی عن التسنیم والرفع انظر الفائق ۱: ۲۳۳ والنہایة (۲: ۲۰۵) قال الجوهری المحدثون یرونه بتخفیف الحیم والصحیح تشدیدھا ۱۲۔
۲ قالہ ابو ذہب الہذلی فی وصف مشنار والبیٹ من شواہد الکشاف ۱۴۴ والطبری (۱: ۳۱۳) والطبری و دیوان الہذلیین (۱: ۱۴۳) والاساس (۲: ۴۷۹) واللسان (نوب) ومجاز القران رقم ۳۰۹ والخزانة (۲: ۴۹۲) ورسالة المبرد (ماتفق لفظہ واختلف معناه) والاضداد لابن الانباری ۹ وابن السکیت ۷۹ والمقاییس (نوب) وابن ولاد ۴۳ والمعانی الکبیر ۶۲۷ والجمهرة (اشعار) ۶۲ والقرطبی (۸: ۳۱۱) والدرة للحریری ۱۰۷ وتهذیب اصلاح المنطق (۱/۱۴۲: ۲۰۴) ومعانی القران المنسوب الی الفراء (۱: ۲۸۶) وفیہ عوامیل بدل عوامیل والمشکل للفتی ۱۴۷ وغریہ ۲۷۱ وفی رواہ ابی الطیب (ابدال ۲: ۳۸۴) ورسالة الغفران (۲: ۴۳۲) والمخصص (۸: ۱۷/۱۲۸) والصحاح (نوب) واللسان والتاج (خلف) رجاء، دبر) واضداد ابی الطیب ۲۹۹ خالفها (بالحاء المعجمة) وروایة الاضداد اول الثلاثة خالفها (بالحاء المهملة) ۱۲۔

ملاوٹ نہ ہو) قرآن پاک میں ہے:
﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَّخْتُومٍ﴾ (۸۳-۲۵) ان کو
شرابِ خالص سر بند پلائی جائے گی۔

(ر ح ل)

الرَّحْلُ: ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لیے باندھا
جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے پھر یہ لفظ مجازاً خود اونٹ پر
بولا جانے لگا ہے اور کبھی رَحْلٌ کا لفظ اس چیز پر بھی
بولا جاتا ہے جس پر گھر میں بیٹھا جاتا ہے۔ اس کی جمع
رِحَالٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ﴾
(۱۲-۶۲) تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ ان کا سرمایہ
ان کے کپاووں میں رکھ دو۔

الرَّحْلَةُ: (مصدر) اس کے اصل معنی سفر یا کوچ کرنے
کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۱۰۶-۲) جاڑے اور
گرمی کے سفروں کو (اکٹھار کھنے والے)

أَزْحَلْتُ الْبَعِيرَ: میں نے اونٹ پر پالان کسا۔
أَزْحَلَ الْبَعِيرُ: نے اونٹ کا اس قدر موٹا ہو جانا گویا
موٹاپے کی وجہ سے اس کی پیٹھ پر پالان رکھا ہوا ہے۔
رَحْلَتُهُ: میں نے اسے اس جگہ سے دور ہٹایا۔
الرَّاحِلَةُ: اونٹ جو سواری کے قابل ہو جائے۔
رَاحِلَةٌ: سفر کرنے میں اس کی مدد کی۔ مَرَحَلٌ: وہ کپڑا
جس پر کپاوے کی تصویریں بنی ہوئی ہوں۔

(ر ح م)

الرَّحِمُ: عورت کا رحم۔ اور رَحِيمٌ اس عورت کو

الْأَرْجُونَ: ایک قسم کا سرخ رنگ جو رجاء کی طرح
فرحت بخش ہوتا ہے۔

(ر ح ب)

الرَّحْبُ: (اسم) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔

اسی سے رَحْبَةُ الْمَسْجِدِ ہے جس کے معنی مسجد کے
کھلے صحن کے ہیں اور رَحْبَتِ الدَّارِ کے معنی گھر کے
وسیع ہونے کے۔ پھر یہ رَحْبٌ کا لفظ استعارہً پیٹ یا
سینہ کی وسعت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے رَحْبُ
الْبَطْنِ: (بسیار خور) رَحْبُ الصَّدْرِ (فراخ سینہ)
عالی ظرف کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے برعکس ضيق الصدر
کا لفظ مجازاً تنگ سینہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَافَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحَبَتْ﴾ (۹-۲۵)
اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی۔

اور بطور استعارہ جس کے نوکر چاکر بہت زیادہ ہوں اسے
رَحِيبُ الْفَنَاءِ کہا جاتا ہے۔

مَرَحَبًا وَاهْلًا: تو نے کشادہ جگہ پائی اور اپنے اہل میں
آیا (یہ لفظ خوش آمدید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے)
قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا مَرَحَبًا بِهِمْ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارَ- قَالُوا بَلْ
أَنْتُمْ لَا مَرَحَبًا بِكُمْ﴾ (۲۸-۶۰، ۵۹) ان پر خدا کی
مار بے شک یہ بھی دوزخ ہی میں آ رہے ہیں۔ (یہ سن کر وہ
کہیں گے) بلکہ تم پر خدا کی مار۔

(ر ح ق)

رَحِيقٌ: (خالص عمدہ شراب جس میں کسی قسم کی

فرمایا: ”میں رحمان ہوں اور تو رحم ہے میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کروں گا“ ❶

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبع مخلوق میں ودیعت کر دی ہے اور احسان کو اپنے لیے خاص کر لیا ہے تو جس طرح لفظ رحم، رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے۔

الرَّحْمَنُ، الرَّحِيمُ: یہ دونوں فَعْلَانٌ وَفَعِيلٌ کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں ❷ جیسے نَدْمَانٌ وَنَدِيمٌ پھر رَحْمَنٌ کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سمایا ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر بھی جائز ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (۲-۱۷۳) بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ

کہتے ہیں جسے خرابی رحم کی بیماری ہو اور استعارہ کے طور پر رحم کا لفظ قرابت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام اقرباء ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں رَحْمٌ وَرُحْمٌ دو لغت ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاقْرَبْ رُحْمًا﴾ (۱۸-۸۱) اور قرابت میں (اس سے) بہتر (ہو)

الرَّحْمَةُ: وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ جیسے: رَحِمَ اللَّهُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے جب اس کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا جیسا کہ مروی ہے:

(۱۵۱) إِنَّ الرَّحْمَةَ مِنَ اللَّهِ أَنْعَامٌ وَأَفْضَالٌ وَمِنْ الْأَدْمِيسِ رِقَّةٌ وَتَعْطَفُ: کہ اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام وفضل سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقت اور شفقت کے معنی میں آتی ہے۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے۔ ❶

(۱۵۲) ((أَنَّهُ لَمَّا خَلَقَ اللَّهُ الرَّحِمَ قَالَ لَهُ أَنَا الرَّحْمَنُ وَأَنْتَ الرَّحِيمُ شَقَقْتُ اسْمَكَ مِنْ أَسْمِي فَمَنْ وَصَلَكَ وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَكَ قَطَعْتُهُ)) کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس نے

❶ اخرجه ابوداؤد.

❷ کتاب میں حوالہ نہیں ہے۔

❸ راجع غریب القرآن للقتبی ۶ و مجاز القرآن لابی عبیدہ ۲۱ والطبری (۱: ۵۸، ۵۹) و علی ابی عبیدہ ردا غیفا لقولہ: ان الرحمن مجازہ ذو الرحمة و الرحیم مجازہ الرحیم.

أَصَابَ ﴿۳۸-۳۶﴾ تو ہم نے ہوا کو ان کا تابع کر دیا کہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق اسی طرف وہ نرمی سے چلتی۔

اور اسی سے اَرْخِيتُ السِّتْرِ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنی پردہ لگانے کے ہیں پھر اَرْخَاءُ السِّتْرِ سے بطور استعارہ اَرْخَاءُ سَرْحَان بولا جاتا ہے جس کے معنی بھیڑیے کی تیزی کے ہیں۔ اور ذُوَيْب نے کہا ہے:

(الکامل)

﴿۱۷۸﴾ "فَهِيَ رِخْوٌ تَمْنَعُ"

اور وہ ہوا کی طرح تیز اور نرم رفتار ہے۔

فَرِسٌ مِرْحَاءٌ: تیز گھوڑی۔ خیل مران تیز رو گھوڑے۔
اَرْخِيْتُهُ: میں نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی کہ تیز رفتاری سے چلے۔

(ر د د)

الرَّدُّ: (ن) اس کے معنی کسی چیز کو لوٹا دینے کے ہیں خواہ ذات شے کو لوٹایا جائے یا اس کی حالتوں میں سے کسی حالت کو۔ محاورہ ہے۔ رَدَّدْتُهُ فَارْتَدُّ: میں نے اسے لوٹا یا پس وہ لوٹ آیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يُرَدُّ بِأَسْمَاءٍ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۶-۱۳۸)

(مگر تاکبے) لوگوں سے اس کا عذاب تو ہمیشہ کے لیے ملنے والا ہی نہیں۔

اور ذات شے کو واپس لوٹانے کے متعلق فرمایا:

مَا سَعَيْتُمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۹-۱۲۸﴾ لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہڈ کا ہے اور مسلمانوں پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہیں۔

بعض نے رَحْمَن اور رَحِيم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رَحْمَن کا لفظ ذُنبوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رَحِيم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ﴾ (۷-۱۵۶) اور ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل

دنا اہل) سب چیزوں کو شامل ہے پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الہی عام ہے اور مومن و کافر دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مومنین کے ساتھ مختص ہوگی (اور کفار اس سے کلیتہً محروم ہوں گے)۔

(ر خ و)

الرَّخَاءُ: لیت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور یہ شئیء رِخْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نرم چیز کے ہیں اور باب رَخِيَ يَرِخِي بَرُوزَن عَلِمَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ

● قطعة من عجز البيت لاسي ذؤيب وتكلمته: قعدوا به خوفاً يفصم جريها - خلق الرحانة والبيت من كلمة مفضلية حمهرية طويلة في ٦٥ بيتاً (٢٢١-٢٢٩) والبيت في السمط (٤٤٨-٧٤١) والسيوطي ٩٢ والحمهرة ٢٤٦ والاقتضاب ٤١٣ والمحكم (رحل) ودويان الهذليين (١٦:١) واللسان (خو).

﴿مُنْقَلَبًا﴾ (۱۸-۳۶) (توجہ) میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹا جاؤں گا تو جہاں لوٹ کر جاؤں گا۔ (بہر حال اس دنیا سے (تو اس جگہ کو) بہتر ہی پاؤں گا۔

﴿ثُمَّ تَرُدُّونَ إِلَىٰ عَالَمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۹-۹۳) پھر آخر کار تم اس (قادر مطلق) کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب دونوں کو جانتا ہے۔

﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقُّ﴾ (۶-۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس بلائے جائیں گے۔

تو یہاں رَدُّ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسے کہ آیت تَمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ میں رَجَعٌ کا لفظ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلرُّدُّ اِلَى اللّٰهِ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنی وہ ہے جس کا ذکر آیت کریمہ: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ﴾ (۲۰-۵۵) میں ہے (یعنی فوت کر کے) زمین کی طرف لوٹا دینا اور دوسرے معنی وہ ہیں جس کی طرف کہ:

﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى﴾ (۲۰-۵۵) میں ارشاد فرمایا ہے یعنی فوت کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا لیکن یہ دو معنی دو حالتوں کے اعتبار سے ہیں اور رَدُّ کا لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے دونوں معنی کو شامل ہے اور آیت: ﴿فَرُدُّوْا اَيْدِيْهِمْ فِىْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۳-۹) کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں ایک یہ کہ غصہ سے پشت دست کاٹنے لگے۔ دوم یہ کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی طرف اشارہ ہے تیسرے یہ کہ اَفْوَاهِهِمْ میں ہم کی ضمیر کا مرجع انبیاء کو قرار دیا جائے یعنی انہوں نے انبیاء کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور انہیں خاموش کر دیا

﴿لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ﴾ (۶-۲۸) اور اگر (دنیا میں) واپس بھیج دیئے گئے تو جس چیز سے ان کو منع کیا گیا ہے اس کو دوبارہ کریں۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكُرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۷-۶) پھر ہم نے (تم کو) دشمنوں پر (غلبہ دے کر دوبارہ) تمہارے دن پھر دیئے۔

﴿رُدُّوْهَا عَلٰى﴾ (۳۸-۳۳) (تو) ان گھوڑوں کو میرے پاس لوٹا لاؤ۔

﴿فَرَدَدْنَاهُ اِلٰى اٰمِهِ﴾ (۲۸-۱۳) غرض ہم نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔

﴿يَا لَيْتَنَّا نُرَدُّ وَلَا نُكٰذِبُ﴾ (۶-۲۷) اے کاش ہم پر دنیا میں واپس بھیج دیئے جائیں اور پروردگار کی آیتوں (کو) نہ جھٹلاتے۔

اور کسی کو اس کی پہلی حالت کی طرف رد کرنے کے متعلق ہے۔ فرمایا:

﴿يُرُدُّوْكُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ﴾ (۳-۱۴) تم کو الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا کر لے جائیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ﴾ (۱۰-۱۰)

(۱۰-۱۰) اگر (اللہ تعالیٰ) تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے فضل کا روکنے والا نہیں۔ میں رَادُّ کے معنی روکنے والا اور دفع کرنے والا کے ہیں۔ اور یہ معنی آیت:

﴿عَذَابٌ غَيْرٌ مَّرْدُوْدٌ﴾ (۱۱-۷۶) (اور ان لوگوں پر

ایسا) عذاب آنے والا ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ میں مراد ہے اور اسی سے اَلرُّدُّ اِلَى اللّٰهِ ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَئِنْ رُدِدْتَ اِلَى رَبِّىْ لَاجِدَنَّ خَيْرًا مِنْهَا

معنی آیت:

﴿وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ قِمَّتَ وَهُوَ كَافِرٌ﴾
 (۲-۲۱) میں مراد ہیں: ﴿وَنُرْدُ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا﴾
 (۲-۷۱) تو (کیا اس کے بعد) بھی اٹے پیروں (کفر کی
 طرف) لوٹ جائیں گے۔

اور غیر کفر کی طرف لوٹنے کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ﴾ (۲۱-۵) اور اپنی
 پشتوں پر مت پھرو یعنی کسی کام کی تحقیق کر لینے اور اس کی
 اچھائی کو جان لینے کے بعد اسے مت چھوڑو۔
 ﴿فَارْتَدَّ عَلَىٰ آثَارِهِمْ قَصَصًا﴾ (۱۸-۱۴) پھر
 دونوں اپنے (پیروں کے) نشانوں کے کھون لگاتے اٹے
 پاؤں پھرے۔

﴿فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ
 بَصِيرًا﴾ (۱۲-۹۶) پھر جب یوسف علیہ السلام کے زندہ
 وسلامت ہونے کی خوشخبری دینے والا (یعقوب علیہ السلام کے
 پاس) آپہنچا تو اس نے (آنے کے ساتھ ہی یوسف کا
 کرتہ) یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ فوراً پینا ہو
 گئے۔ یعنی ان کی بینائی ان کی طرف لوٹ آئی اور رَدَدْتُ
 الْحُكْمَ إِلَىٰ فُلَانٍ کے معنی کسی کے فیصلہ سپرد کر دینے
 کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ﴾
 (۳-۵۹) پھر اگر کسی امر میں تم (اور حاکم وقت) آپس
 میں جھگڑ پڑو تو اس امر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ
 کے طرف رجوع کرو۔

اور ردُّ کا لفظ لا کر اس بات پر تشبیہ کی ہو کہ انہوں نے بار
 بار ایسا کیا۔ ①

اور آیت: ﴿لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِمْ
 كُفَّارًا﴾ (۲-۱۰۹) کہ ایمان لاپھنے کے بعد تم کو کافر بنا
 دیں۔

میں ردُّ کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ حالت کفر کی
 طرف لوٹانا چاہتے ہیں جسے تم چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہو۔
 جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَطِبَعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ
 أَوْتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوْا بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ﴾
 (۳-۹۹) لوگو! تم اہل کتاب کے کسی فرقے کا بھی کہامانو
 گے تو وہ تمہارے ایمان لائے پیچھے تم کو پھر کافر بنا دیں
 گے۔

الْاِرْتِدَادُ وَالرَّيْدَةُ: اس راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس
 سے کوئی آیا ہو۔ لیکن رَيْدَةً کا لفظ کفر کی طرف لوٹنے کے
 ساتھ مختص ہو چکا ہے اور ارتداد عام ہے جو حالت کفر اور
 غیر دونوں کی طرف لوٹنے پر بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن
 پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
 لَهُمُ الْهُدَىٰ﴾ (۴۷-۲۵) بے شک جو لوگ اپنی پشتوں
 پر لوٹ گئے (اس کے) بعد کہ ان کے سامنے ہدایت واضح
 ہو گئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ﴾ (۵-
 ۵۳) میں اسلام سے کفر کی طرف لوٹنا مراد ہے اور یہی

① والبسط ماریت البحث فی الآیة فی امالی المرتضیٰ راجع (۳۶۵-۳۶۷)۔

(ردف)

الرَدْفُ: تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو اور رَدْفُ الْمَرْءَةِ کے معنی عورت کی سرین کے ہیں۔

الْتَرَادُفُ: یکے بعد دیگرے آنا۔ ایک دوسرے کی پیروی کرنا۔

الرَّادِفُ: متاخر، یعنی پچھلا۔

الْمُرْدِفُ: اگلا جس نے اپنے پیچھے کسی کو سوار کیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْفِ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾ (۸-۹) سواس نے تمہاری سنی (اور فرمایا) کہ ہم لگاتار ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کریں گے۔

ابو عبیدہ کے نزدیک رَدْفَ وَاَرْدَفَ: یعنی مجرد اور مزید فیہ ایک ہی معنی میں آتے ہیں * اس لیے انہوں نے مُرْدِفِينَ کا معنی ”بعد میں آنے والے“ کیا ہے۔ اور یہ شاہد پیش کیا ہے۔ *

(۱۷۹) ”إِذَا الْجَوَازُ أَرْدَفَتِ الثَّرِيًّا“

جب ثریا کے پیچھے جو زاء ستارہ نکل آیا۔

عام محاورہ ہے: رَادَّةٌ فِى كَلَامِهِ: کسی سے بحث کرنا حدیث میں ہے۔ *

(۱۵۳) اَلْبَيْعَانِ يَتَرَادَانِ: یعنی بائع اور مشتری بیچ لو رو کر دیاں۔

رَدَّةُ الْاِبِلِ: اونٹوں کا دوبارہ پانی پینے کو جانا۔ اَرَدَّتِ النَّاقَةُ: (۱) اونٹنی کا ولادت سے قبل پستان نکالنا۔ (۲) نمناک زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے اونٹنی کے پستان اور مخصوص جگہ پر روم ہو جانا۔

اِسْتَرَدَّ الْمَتَاعَ: سامان واپس لے لینا۔

(ردی)

الرِدْيُ: جو دوسرے کا مددگار بن کر اس کے تابع ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَرْسَلْنَا مَعِيَ رِدْيًا يَصْدَقُنِي﴾ (۲۸-۳۳) ان کو مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دو کہ میری تصدیق کریں۔

اور اَرْدَيْتُهُ کے معنی کسی کی مدد کرنا کے ہیں اور رِدْيٌ (ردی) بھی اصل میں رِدْيٌ کے ہم معنی ہے مگر عرف میں

متاخر مذموم پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: رِدْيٌ الشَّيْءِ رِدَاةٌ فَهُوَ رِدْيٌ: کسی شے کا ردی ہونا۔

1 رواه النسائي عن سمرة وابوداؤد وابن ماجه عن ابى بردة والمستدرک عن ابن عمرو والبخارى عن ابن عمرو ومتفق عليه عن حکيم ابن حزام (راجع الفتح للنبيهانى (۲: ۲۰)).

2 وكذا قال ابن الاعرابى راجع شرح الدرر ۲۰۱ ومحازابى عبیده (۱: ۲۴۱) والحمه لابی على الفارسى (۱: ۱۹۳) والقرطبى (۷: ۳۷۱) ونقل عن ابى عبیده الحافظ فى الفتح (۸: ۲۳).

3 راجع اللسان (ردف، قرط) قاله خزيمه بن نهدي كان يعشق فاطمة بنت يشكرو فيها يقول وتماهه: ظننت بال فاطمة الظنوننا. وبعده يقول: حالت دون ذلك من هموم - هموم تورث الداء الدفينا والبيت فى الطبرى (۹: ۱۹۱) وشرح الدرر ۲۰۱ والبحر (۷: ۲۱۶) غير منسوب وفى السمط (۱: ۹۹) انه لخزيمه (مثل كريمة) بن نهدي قال الاستاذ الميمنى هذا هو الصحيح وهو مصحف فى جل الكعب بخزيمه او جذيمه الا فى المعجم البكرى ۱۴ والمشتبه فانه ضبطه بالصواب والبيت فى التاج (ردف) وشرح المعلقات لابن الانبارى ۷۸ والتبريزى ۳۷ وخزيمه هذا مترجم له فى المعجم البكرى ۱۴ ورجع أيضاً الميدانى (۲۸۸، ۳۷۴، ۳۹۰) وكتاب البسوس ۷ وانظر لمعناه الانواء للقتبى والخبر بطوله فى الاغانى (۱۱: ۱۵۴).

مگر ابو عبیدہ کے علاوہ دوسرے علماء نے مُرْدَفِينَ کے معنی یہ کیے ہیں ”دوسرے فرشتوں کو پیچھے لانے والے“ تو اس لحاظ سے گویا دو ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی گئی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ مُرْدَفِينَ سے مراد وہ فرشتے ہیں۔ جو اسلامی لشکر کے آگے آگے چلتے تھے تاکہ کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیں۔

اور ایک قرأت میں مُرْدَفِينَ فتح دال کے ساتھ ہے یعنی ہر ایک مسلمان فوجی کے پیچھے اس کی مدد کے لیے ایک فرشتہ متعین تھا۔

آ موجود ہوں گے۔
 أَرْدَفْتُهُ: میں نے اسے اپنے پیچھے سوار کیا۔
 أَلْرَدَافُ: سواری پر ردیف کے بیٹھنے کی جگہ۔
 دَابَّةٌ لَا تُرَادِفُ أَوْ لَا تُرَدِّفُ: سواری جو ردیف کو سوار نہ ہونے دے۔
 جَاءَ وَاحِدٌ فَأَرَدَفَهُ الْآخَرُ۔ ایک کے بعد دوسرا آیا۔
 أَرْدَافُ الْمُلُوكِ۔ بادشاہوں کے جانشین، نائب۔

(ر د م)

الرَّذْمُ: پتھروں سے کسی شگاف کو بند کرنا۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا﴾ (۱۸-۹۵) میں تم

(لوگوں) میں اور ان (لوگوں) میں ایک روک بنا دوں۔

رَدْمٌ بِمَعْنَى مَرْدُومٍ يَأْمُرُ رَدْمٌ بِمَعْنَى شَاعِرٍ نَبِيٍّ

ہے (الکامل)

(۱۸۰) هَلْ عَادَرَ الشُّعْرَاءُ مِنْ مُتَرَدِّمٍ

کیا شعراء قدیم نے کوئی قابل اصلاح مقام چھوڑا ہے

(جس پر طبع آزمائی کی جائے)

أَرَدَمَتْ عَلَيْهِ الْحُمَى: کسی کو دائمی بخار رہنا۔

سَحَابٌ مُرْدَمٌ سَاكِنٌ أَوْ رَائِدٌ جَلَّ بِرُطْبِهِ نَالِ الْبَادِلِ۔

(ر د ی)

الرَّذَى: (س) کے معنی ہلاکت کے ہیں اور

التَّرْدَى: (تفعل) کے معنی ہیں اپنے آپ کو ہلاکت

ایک اور قرأت میں مُرْدَفِينَ بتشدید دال ہے جو دراصل مُرْتَدِينَ باب افتعال سے ہے۔ صرفی قاعدہ کے مطابق تاء کو دال میں ادغام کر کے اس کی حرکت دال کو دے دی گئی ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے:

﴿الَّذِينَ يَكْفِيكُمْ أَنْ يُمَدِّدْكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آفٍ مِنَ

الْمَلَائِكَةِ مُتَرَلِّينَ ۝ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم

مِّنْ قَوَارِهِمْ هَذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آفٍ مِنَ

الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ﴾ (۳-۲۳، ۲۴) کیا تم کو اتنا کافی

نہیں کہ تمہارا رب (آسمان سے) تین ہزار فرشتے بھیج کر

تمہاری مدد فرمائے (ضرور کافی ہے) بلکہ اگر تم ثابت قدم

رہو (اور خدا اور رسول کی نافرمانی سے) بچو اور دشمن

(ابھی) اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمہارا رب پانچ ہزار

فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو بڑی سچ دھج سے

۱ قرآء اهل المدينة ويعقوب مردفين بفتح الدال والباقون بالكسر وقرء في الشواذ مردفين (راجع: الطبري ۱۱۱: ۹).

۲ قاله عنتره العبسي وتماه: ام هل عرفت الدار بعد هم والبيت من معلقته تسمى المذبية راجع السيوبي ۱۶۴ والامالي (۲): ۱۴۲) قال العباسي في السمط ۷۶۹ البيت لا يوجد في شرحي التبريزي والروزي ويوجد في ديوان الستة ۴۴ (العقد الثمين) رقم

۲۱ مطلع قصيدة وانظر ايضا ابن الانباري ۲۹۴ والتبريزي ۱۷۲ رواه ابو عمرو عن ابى حزام العنكي فقط والبيت من شواهد الطبري

(۱۶: ۲۳) والشعراء الجاهلي (۱: ۳۷۹) واللسان (روم) ويروي من مترجم وفي رواية ابى عبدة مترجم راجع ابدال ابى الطيب

(۲: ۵۸) والحجره ۱۶۱ والشطرنجى المثل السائر (۱: ۳۴۷).

(رزق)

الرِّزْقُ: وہ عطیہ جو جاری ہوخواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنی نصیبہ بھی آجاتا ہے۔ اور کبھی اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بنتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔

أَعْطَى السُّلْطَانُ رِزْقَ الْجُنُودِ: بادشاہ نے فوج کو راش دیا۔

رُزِقْتُ عِلْمًا: مجھے علم عطا ہوا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۶۳-۱۰) یعنی جو کچھ مال وجاہ اور علم ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے صرف کرو اسی طرح آیت:

﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ (۲-۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہِ خدا میں) صرف کرتے ہیں۔ میں بھی رزق عام ہے جو ان تینوں کو شامل ہے۔

﴿كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ (۲۰-۸۱) اور ہم نے جو تم کو عمدہ اور پاکیزہ (روزیاں) دی ہیں (شوق سے) کھاؤ۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْكُمْ تُكذِّبُونَ﴾ (۵۶-۸۲) میں رزق کے معنی حصہ اور نصیبہ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نعمت الہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنا لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ﴾ (۵۱-۲۲) اور تمہارا رزق آسمان میں ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد بارش ہے جو ہر

کے سامنے پیش کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا يَغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى﴾ (۹۲-۱۱) اور جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

﴿وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرَدَّى﴾ (۲۰-۱۶) اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے پڑا (اگر ایسا کرو گے) تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔

-(الْإِرْدَاءُ: افعال) ہلاک کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿تَاللَّهِ إِنْ كِدْتُمْ لِتَرُدُّونَ﴾ (۳۷-۵۶) خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کرنے کو تھا۔

الْمُرْدَاةُ: پتھر جس سے دوسرے پتھر توڑے جاتے ہیں۔

(رذل)

الرِّذْلُ وَالرِّذَالُ: وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔

قرآن میں ہے:

﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِدُّ إِلَى أَرْضِ الْعُمُرِ﴾ (۱۶-۷۰) اور تم میں سے ایسے بھی ہیں جو بدترین حالت کی طرف لوٹتے جاتے ہیں۔

﴿إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادْنَا بِأَدَى الرَّأْيِ﴾ (۱۱-۲۷) مگر جو ہم میں سے رذالے ہیں (اور پیرو ہو گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے۔

﴿أَنْتُمْ مِنْ لَدُنِّي وَأَتَّبِعْكَ الْآرْذَلُونَ﴾ (۲۶-۱۱۱) کیا ہم تمہاری بات تسلیم کر لیں۔ حالانکہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے متبع ہیں۔

یہ ارذل کی جمع ہے جس کے معنی حقیر اور ذلیل شخص کے ہیں۔

وہاں ان کا کھانا صبح و شام (جس وقت وہ چاہیں گے ان کو ملا کرے گا) میں انعاماتِ اخروی ہی مراد ہیں۔ اور آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ (۵۸-۵۱) اللہ تعالیٰ خود بڑا روزی دینے والا، قوت والا اور زبردست ہے۔

میں رزق کا لفظ عموم پر محمول ہوگا اور ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ لیکن رَازِقُ کا لفظ خالقِ رزق اور ان کے دینے والے اور مسببِ تیبوں پر بولا جاتا ہے اس لیے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے اور اس انسان پر بھی جو دوسروں تک رزق پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ لہذا آیت: ﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ﴾ (۱۵-۲۰)..... اور ہم (ہی) نے زمین میں تمہارے لیے سامانِ معیشت پیدا کیا اور ان کے لیے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ یعنی جن کی روزی کا نہ تم سبب بنتے ہو اور نہ ہی تمہیں ان کی روزی میں کسی قسم کا دخل ہے اسی طرح آیت:

﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ (۱۶-۷۳) اور خدا کے سوا ان (معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں و زمین میں ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی (ایسے اختیار پر) دسترس پاسکتے ہیں۔ میں لا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا سے مراد یہ ہے کہ انہیں رزق دینے میں کسی قسم کا بھی دخل نہیں ہے (اور تمام اسبابِ رزق خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں)۔ عام محاورہ ہے: إِزْتَرَقَ الْجُنْدُ: یعنی لشکر نے اپنا مقررہ راشن حاصل کیا اور وہ راشن جو ایک دفعہ دیا جائے

ذی حیات کے لیے باعثِ حیات ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾ اور ہم نے آسمان سے بارش کی اور بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد نصیبہ ہے اور آیت میں تشبیہ پائی جاتی ہے کہ حظوظ یعنی نصیبے مقادیر کے ساتھ ہیں اور آیت:

﴿فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ﴾ (۱۸-۱۹) تو اس میں سے (بقدر ضرورت) کھانا تمہارے پاس لے آئے۔

میں رزق سے مراد طعام ہی ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ﴾ (۵۰-۱۱) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کے کیلیں خوب گتھی ہوئی ہیں بندوں کو روزی دینے کے لیے۔

میں رزق سے مراد غذائی اشیاء مراد ہیں اور بعض کے نزدیک کھانے پینے اور ہر قسم کے استعمال کی چیزیں مراد ہیں۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں قدرتِ الہی کے ساتھ بارش کے ذریعہ ہی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور آیت:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْواتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾ (۳-۱۶۸) اور (اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کو مرا ہوا خیال نہ کرنا (یہ مرے نہیں) بلکہ زندہ ہیں ان کو ان کے پروردگار کے ہاں روزی ملتی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر اخروی نعمتوں کا برابرِ فیضان ہو رہا ہے۔

اسی طرح آیت: ﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴾ (۱۹-۶۲) اور

اے رَزَقَةً کہا جاتا ہے۔

الرَّاسِخُ فِي الْعِلْمِ: وہ محقق جسے کوئی اشکال اور شبہ پیش نہ آئے گویا یہ راسخ فی العلم لوگ وہی ہیں۔ جو آیت: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ لَمْ يَرْتَابُوا﴾ (۱۵-۳۹) پس سچے مسلمان تو وہ ہیں (جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک و شبہ نہیں کیا میں مذکور صفات کے ساتھ متصف ہیں۔ اور اسی طرح سورہ نسا میں فرمایا: ﴿لَكِنَّ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ﴾ (۱۶۲-۳) لیکن (اے پیغمبر) ان میں سے جو علم میں بڑی پائے گاہ رکھتے ہیں۔

(ر س ل)

الرَّسُلُ: اصل میں اس کے معنی آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں اور نَاقَةٌ رِسْلَةٌ: نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں اور سبکی کے ساتھ اٹھنے والے اونٹوں کو اِبِلٌ مَرَّاسِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے رسول ہے جس کے معنی ہیں روانہ ہونے والا پھر کبھی رفق اور نرمی کے لحاظ سے عَلِيٌّ رِسْلِيٌّ کہہ دیتے ہیں یعنی اپنے حال پر سکون سے ٹھہرے رہے اور کبھی صرف روانہ ہونے کا معنی لے لیتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے اس سے رسول مشتق ہے مگر کبھی رسول کا لفظ صرف پیغام پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

(۱۸۲) اَلَا اَبْلِغُ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا

(ر س ن)
﴿وَأَصْحَابُ الرَّسِّ﴾ (۱۲-۵۰) اور رس کے رہنے والوں نے۔

بعض نے کہا ہے: رَسٌّ ایک وادی کا نام ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(الطويل)﴾ (۱۸۱) وَهِنَّ لِيُوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْقَمِّ اور وہ وادی رس کے لیے جیسے ہاتھ منہ کی طرف اصل میں رَسٌّ کسی چیز کے تھوڑے سے نشان کو کہا جاتا ہے۔ عام محاورہ ہے:

سَمِعْتُ رَسًّا مِنْ خَبِيرٍ: میں نے کچھ یوں ہی سنی خبر سنی رَسَّ الْحَدِيثِ فِي نَفْسِي: میرے دل میں تمہاری بات کا تھوڑا سا اثر ہوا۔
وَجَدَ رَسًّا مِنْ حُمَى: اس نے بخار کا تھوڑا سا اثر محسوس کیا۔

رَسَّ النَّمِيْتُ: میت دفن ہوگئی اور اس کی شخصیت کے بعد اب اس کے آثار باقی رہے۔

(ر س خ)

رَسُوخُ الشَّيْءِ: کسی چیز کا محکم اور جائے گیر ہو جانا۔ رَسَخَ الْعَدِيْرُ: جو بڑکاپانی خشک ہو کر زمین میں جذب ہو گیا۔

① ابن کثیر (۳: ۳۱۹) عن ابن عباس قریۃ من قرئ ثمود فی رویۃ ابن ابی حاتم عن ابن عباس انہا اسم بئر فی آذر بایحکان قبل ان قوماً دفنوا فیہا نبیہم وفی تفسیر الطبری ان اصحاب الرس ہم اصحاب الاحدود فی البخاری الرس معدن وجمعه ارساس وقیل قوم شعیب راجع البخاری مع الفتح.

② قالہ زہیر فی معلقته وکھینے صفحہ ۳۹۶ حاشیہ نمبر ۱.

③ قالہ زہیر بن ابی سلمیٰ واولہ: بکرن بکورا واستحرن بسحرة - والبیۃ فی الکامل ۸۱۴ ومختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۰۲) والبحر (۲: ۳۹۸) والعقد: ۵۴ وایام العرب ۲۷۲ والتبریزی فی العشر ۱۰۵ وابن الانباری ۵۰ وفی روايته فهن وادی الرس ۱۲.

اور جب ہمارے فرشتے لو ط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ غمزدہ ہوئے۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبَشْرَىٰ﴾
(۱۱-۶۹) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔

﴿وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا﴾ (۷۷-۱) قسم ہے ان فرشتوں کی جو پیام الہی دے کر بھیجے جاتے ہیں۔

﴿بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ﴾ (۳۳-۸۰) کیوں نہیں (ضرور سنتے ہیں) اور (سننے کے علاوہ) ہمارے فرشتے ان کے پاس (تینات ہیں) کہ وہ ان کی سب باتیں لکھے جاتے ہیں۔

اور کبھی اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں جیسے فرمایا:
﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ (۳-۱۳۳) اور محمد (ﷺ)

اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہے اور بس۔
﴿يَأْتِيهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ﴾
(۵-۱۶۷) اے پیغمبر! جو احکام تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلا کم وکاست) ان کو لوگوں تک پہنچا دو۔

اور آیت: ﴿وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ (۶-۲۸) اور پیغمبروں کو ہم صرف اس غرض سے بھیجا کرتے ہیں کہ (نیکوں کو خوشنودی خدا کی) خوشخبری سنائیں اور (بروں کو عذاب سے) ڈرائیں۔

ابو حفص (عمر بن الخطاب) کو میرا پیغام پہنچا دو۔

اور کبھی اس شخص پر جسے پیغام دے کر بھیجا گیا ہو اور واحد جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ (۹-۱۲۸)
لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آئے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۲۶-۱۶) ہم تمام جہان کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اور شاعر نے کہا ہے۔^①

(۱۸۳) الْكُنَىٰ إِلَيْهَا وَخَيْرُ الرُّسُولِ

أَعْلَمُ بِنَوَاحِي الْخَبْرِ

اسے میرا پیغام پہنچا دو اور بہتر پیغام بر تو وہ ہوتا ہے جو خبر کو اچھی طرح جانتا بھی ہو۔

اور رسول کی جمع رُسُلُ آتی ہے اور قرآن پاک میں رسول اور رُسُلُ اللّٰہ سے مراد کبھی فرشتے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ (۸۱-۱۹) کہ یہ (قرآن) بے شک معزز فرشتے (یعنی جبریل) کا (پہنچایا ہوا) پیام

ہے۔

﴿إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصْلُوا إِلَيْكَ﴾ (۱۱-۸۱) ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

﴿وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئَاءَ بِهِمْ﴾ (۱۱-۷۷)

① قاله جعدة بن عبدالله السلمی وتمامه: فدی لك من اخی ثقة ازاری - والبيت فی اللسان (ازر) فی ستة ابیات قال احد مصحح اللسان ولعل الاولی ان يقول قول نضيلة الاكبر الاشجعی بدل جعدة والبيت فی الوحشیات ۱۰۸ مع الخمسة قال فی زیله لبقيلة الاكبر والرجل من الانصار مع سلمة راجع الامدی ۶۳۰ وكنایات الثعالبی ۳ واللسان (قلص، ازر) والعمدة (۱: ۲۱۴) والفصول والغايات ۱۶۵ قال احمد شاکر ووهی ایضاً طبقات ابن سعد (۳: ۲۰۵) والفاقی (۲: ۱۳۱) والصناعتین ۳۰۳. قاله ابو ذؤیب الهذلی والبيت من شواهد الطبری (۳۶-۱۵۸) والطبرسی..... واللسان (رسل، الك) والمحكم (حی) ۱۲.

الْكَافِرِينَ تَوَضُّعُهُمْ أَزًّا ﴿١٩﴾ (۸۳-۱۹) (اے پیغمبر) کیا تم نے (اس بات پر) غور نہیں کیا کہ ہم نے شیاطین کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے اور وہ انہیں انگیخت کر کے اکساتے رہتے ہیں۔

اور کبھی (۴) یہ لفظ امساک (روکنا) کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكُ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ﴾ (۲-۳۵) تو اللہ جو اپنی رحمت (کے لنگر لوگوں کے لیے)

کھول دے تو کوئی اس کا بند کرنے والا نہیں اور بند کرے تو اس کے (بند کیے) پیچھے کوئی اس کا جاری کرنے والا نہیں۔ اور رَسُلٌ اس اونٹنی یا بکری کو کہتے ہیں جو پیہم اور نرم رفتاری سے چلے اور اگر لوگ کیے بعد دیگرے متواتر آئیں تو کہا جاتا ہے جَاؤْ أَرْسَالًا یعنی وہ کیے بعد دیگرے آئے۔ اور اسی سے رَسُلٌ اس زیادہ دودھ کو کہتے ہیں جو مسلسل آ رہا ہو۔

(رس و)

رَسَا الشَّيْءُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے کسی جگہ پر ٹھہرنے اور استوار ہونے کے ہیں اور أَرْسَى کے معنی ٹھہرانے اور استواء کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ﴾ (۱۳-۳۳) اور بڑی بھاری بھاری دیکھیں جو ایک جگہ پر جمی رہیں۔

﴿وَرَوَّاسِيَ شَامِخَاتٍ﴾ (۲۷-۷۷) اور اونچے

اونچے پہاڑ۔ یہاں پہاڑوں کو بوجہ ان کے ثبات اور استواری کے رَوَّاسِيَ کہا گیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَالْجِبَالِ أَرْسَاهَا﴾ (۳۲-۷۹) اور پہاڑوں

میں ملائکہ اور انسان دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور آیت: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُّوَا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ (۵۱-۲۳) (ہم تو اپنے پیغمبروں سے یہی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ اے گروہ پیغمبر! ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے تمام برگزیدہ اصحاب مراد ہیں اور صحابہ کرام پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ تبعاً رَسُلٌ کا لفظ بولا گیا ہے جیسا کہ مَهْلَبٌ اور ان کی اولاد کو مہالبہ کہا جاتا ہے۔

الرَّسَالُ: (افعال) کے معنی بھیجنے کے ہیں اور اس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور دوسری محبوب یا مکروہ چیزوں کے لیے بھی آتا ہے بھی (۱) یہ تغیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے ہوا، بارش وغیرہ کا بھیجنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا﴾ (۶-۶) اور (اوپر سے) ان پر موسلا دھار مینہ برسایا۔ اور کبھی (۲) کسی با اختیار و ارادہ شخص کے بھیجنے پر بولا جاتا ہے جیسے پیغمبر بھیجنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفِظَةً﴾ (۶۱-۶) اور تم لوگوں پر نگہبان (فرشتے) تعینات رکھتا ہے۔

﴿فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ﴾ (۵۳-۲۶) اس پر فرعون نے (لوگوں کی بھیڑ) جمع کرنے کے لیے شہروں میں ہر کارے دوڑائے۔

اور کبھی (۳) یہ لفظ کسی چیز کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینے اور اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَىٰ

درمیان صلح کو پختہ کر دیا۔

کو (اس میں گا ذکر) پلایا۔

(رشد)

الرَّشْدُ وَالرُّشْدُ: یہ غی کی ضد ہے اور ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ باب نَصَرَ وَعَلِمَ دونوں سے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ (۲-۱۸۶) تاکہ وہ سیدھے رستے پر لگ جائیں۔

اسی طرح معنی ثبات کے اعتبار سے پہاڑوں کو اذنا دفرمایا ہے۔ جیسے: ﴿وَالْجِبَالُ أَوْتَادًا﴾ (۵-۷۸) اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(البسيط)

(۱۸۴) وَلَا عِمَادَ إِذَا لَمْ تُرْسِ أَوْتَادًا

اور میخوں کے بغیر ستون نہیں ٹھہر سکتے۔ عام محاورہ ہے: أَلْقَتِ السَّحَابَةُ مَرَّاسِيهَا کہ بادل نے اپنے لنگر ڈال دیے یعنی جم کر برسنے لگا جیسا کہ اسی معنی میں أَلْقَتِ طُنْبُهَا کہا جاتا ہے اور قرآن پاک میں ہے: ﴿بِسْمِ اللَّهِ مُجْرَهَا وَمَرْسَهَا﴾ (۱۱-۱۳) اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہوتا ہے۔

﴿قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (۲-۲۵۶) گمراہی سے ہدایت الگ ہو چکی۔

﴿فَإِنْ أَنْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا﴾ (۳-۶) اور اگر تم ان میں صلاحیت دیکھو۔

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (۲۱-۶۱) اور ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی۔

تو یہ أَجْرِيْتُ وَأَرْسَيْتُ (باب افعال) سے ماخوذ ہے اور مُرْسَى كَالْفَصْلِ مصدر مہمی بھی آتا ہے اور صیغہ بظرف زمان و مکان اور اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت مذکورہ الصدر میں ایک قرأت مَجْرُهَا وَمَرْسَهَا بھی ہے۔ اور آیت:

﴿يَسْتَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا﴾ (۷-۱۸۷)

(اے پیغمبر! لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا تھل بیڑا بھی ہے؟ (یعنی کب واقع ہوگی۔

ان آیات میں ابراہیم اور یتیم دونوں کے متعلق رُشْدُ کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن دونوں میں بون بعید پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا کہ رَشْدٌ (فتح الراء والشین) رُشْدُ بضم الراء سے اخص ہے کیونکہ رُشْدُ کا لفظ امور دنیوی اور اخروی دونوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿أُولَئِكَ هُمُ الرَّاٰشِدُونَ﴾ (۳۹-۷) یہی لوگ

نیک چلن ہیں۔

﴿وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ﴾ (۱۱-۹۷) اور فرعون کی

میں مُرْسَاهَا سے اس کے پناہ ہونے کا زمانہ مراد ہے۔ عام محاورہ ہے: رَسَوْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ: میں نے قوم کے

① قاله الافوه الاودى (واسمه، صلاحة بن عمرو يكنى اباربيعة) وصدرة: والبيت لا يبنى الاماعمة وفى القالى الاله عمد- وفى المطبوع ولا جبال- اخنى ان يكون مصحفا والبيت من باب التمثيل اى لا ينال الامرالاتو فراسبابه وفى الطراف من شعر الافوه الاودى والبيت فى روضة العقد ۲۴۶ والبحر ۸: ۴۱۱ وانظر لتخرجه ايضا (امر).

② نسبة ابن كثير اى رجاء العطارى (۲: ۴۴۶).

بات کچھ راہ کی بات تو تھی نہیں۔

﴿يَسْأَلُكَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا﴾ (۷۲)۔

(۲۷) تو ان کے آگے اور ان کے پیچھے (فرشتوں سے)

پہرہ دینے والے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

تو یہاں رَصَدًا سے واحد اور جمع دونوں مراد ہو سکتے

ہیں۔

الْمَرَصِدُ: گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ﴾ (۹-۵) اور ہر گھات

کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔

اور مِرْصَاد بمعنی مَرَصِدٌ آتا ہے لیکن مِرْصَاد اس

جگہ کو کہتے ہیں جو گھات کے لیے مخصوص ہو۔ قرآن پاک

میں ہے:

﴿إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا﴾ (۷۸-۲۱) بے شک

دوزخ گھات میں ہے۔

تو آیت میں اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ جہنم کے

اوپر سے لوگوں کا گزر ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَأَنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ (۱۹-۷۱) اور تم میں

سے کوئی (ایسا بشر) نہیں جو جہنم پر سے ہو کر نہ گزرے۔

(ر ض ع)

رَضَعَ الْمَوْلُودُ: (رض س) رِضَاعًا وَرِضَاعَةً:

بچے کا دودھ پینا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر انتہائی کہینے کو

لَيْسِمٌ رَّاضِعٌ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس کنجوس شخص

پر بولا جاتا ہے جو انتہائی بخل کی وجہ سے رات کے وقت

اپنی بکریوں کے پستان سے دودھ چوس لے تاکہ کوئی

ضرورت مند دودھ دوہنے کی آواز سن کر سوال نہ کرے۔

پھر اس سے رَضَعَ فُلَانٌ بمعنی لَشِمٌ استعمال ہونے

(ر ص ص)

رَصٌّ (ن) کے معنی دو چیزوں کو باہم ملا کر جوڑ

دینے کے ہیں اور رَصَاصٌ سیسہ کو کہتے ہیں اور اسی سے

فرمایا:

﴿كَانَهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ (۶۱-۳) گویا ایک

مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے۔

اور رَصَصْتُهُ (ن) وَرَصَصْتُهُ (تفعیل) کے ایک ہی

معنی ہیں یعنی کسی چیز کو سیسہ پلا کر مضبوط کرنا اور جوڑنا اور

تَرَاصُّوا فِي الصَّلَاةِ کے معنی ہیں نماز میں صف میں

باہم پیوستہ ہو کر کھڑے ہونا اور تَرَصَّيْصُ النَّمْرَةِ کے

معنی ہیں عورت کا نقاب مضبوطی سے باندھنا اور اس میں

تَرَصَّيْصٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ر ص د)

الرَّصِدُ: گھات لگا کر بیٹھنا۔ اور رَصَدَلَهُ وَتَرَصَدَ کے

معنی ہیں کسی کے لیے گھات لگانا اور أَرَصَدْتُهُ: کسی کو

گھات لگانے کے لیے مقرر کرنا اور أَرَصَدَلَهُ کے معنی

پناہ دینا بھی آتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ مِنْ

قَبْلُ﴾ (۹-۱۰۷) اور ان لوگوں کو پناہ دیں جو اللہ اور

رسول کے ساتھ پہلے لڑ چکے ہیں۔

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (۳۹-۱۳) بے شک تیرا

پروردگار (نا فرمانوں کی) تاک میں (لگا رہتا ہے)

رَصَدٌ: (صیغہ صفت) یہ معنی فاعلی اور مفعولی دونوں کے

لیے آتا ہے اور واحد اور جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا

ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

راضی ہونا۔ واضح رہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ قضائے الہی سے اس پر وارد ہو وہ اسے خوشی سے برداشت کرے اور اللہ تعالیٰ کے بندے پر راضی ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے اپنے اوامر کا بجا لانے والا اور منہیات سے رکنے والا پائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ (۵-۱۱۹) اللہ تعالیٰ ان سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش۔

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳۸-۱۸) تو اللہ تعالیٰ ضرور ان مسلمانوں سے خوش ہوتا ہے۔

﴿وَرَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (۵-۳) اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا۔

﴿أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۹-۲۸) کیا تم آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر بیٹھے ہو۔

﴿يَرْضَوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ﴾ (۹-۸) اپنی زبانی باتوں سے تو تم کو رضا مند کر دیتے ہیں اور ان کے دل ہیں کہ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں۔

﴿وَلَا يَخْزَنَ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ﴾ (۳۳-۵۱) اور آرزوہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ (بھی) تم ان کو دو گے وہ (لے کر سب کی سب) راضی ہو جائیں گی۔

الرَّضْوَانُ: رضائے کثیر یعنی نہایت خوشنودی کو کہتے ہیں۔ چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہے اس لیے قرآن پاک میں خاص کر رضائے الہی کے

لگا ہے۔ رَاضِعَاتَانِ: بچے کے اگلے دو دانت جن کے ذریعہ وہ ماں کی چھاتی سے دودھ پھوستا ہے۔ اور أَرْضَاعُ (افعال) کے معنی دودھ پلانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (۲-۲۳۳) اور جو شخص پوری مدت تک دودھ پلانا چاہے تو اس کی خاطر مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ نیز فرمایا:

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾ (۶۵-۶) اگر وہ (بچے کو) تمہارے لیے دودھ پلانا چاہیں تو انہیں ان کی دودھ پلائی دو۔

عام محاورہ ہے:

فُلَانٌ أَخُوهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ: (بضم الزاء) وہ فلاں کا رضاعی بھائی ہے۔ حدیث میں ہے: ①

(۱۵۵) يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ: جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں وہ بوجہ رضاعت کے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔

الْإِسْتِرْضَاعُ: کسی سے دودھ پلوانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ﴾ (۲-۲۳۳) اگر تم اپنی اولاد کو (کسی دایہ سے) دودھ پلوانا چاہو۔ یعنی انہیں مزدوری دے کر دودھ پلوانے کا ارادہ ہو۔

(رَضِيَ وَرَضِيَ)

رَضِيَ (س) رَضًا فَهُوَ مَرْضِيٌّ وَمَرْضُوءٌ ②

① الحدیث فی (حس، ق، د، ک، ہ، عن عائشة حم، م، ک، ہ، عن ابن عباس) وفی روایة من الولادة بدل النسب وابن جریر عن عائشة

بمعناه (ت، حسن، صحیح) والطبرانی عن ابن عباس .

② قال فی الصحاح فحاء وابه علی الاصل والقیاس ۱۲ .

﴿وَهَزَىٰ إِلَيْكَ بِجِزْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطُ عَلَيْكَ رُطْبًا غَنِيًّا﴾ (۱۹-۲۵) اور کھجور کی شاخ کو اپنی طرف ہلا

تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں بھڑپڑیں گی۔
أَرْطَبَ النَّخْلُ کے معنی ہیں درخت خرما پکی کھجوروں والا ہو گیا۔ اس میں صاحب ماخذ ہونے کا خاصہ پایا جاتا ہے۔ جیسے أَمَرَ وَأَجْنَىٰ میں ہے۔ عام محاورہ ہے:

أَرَطَبْتُ الْفَرَسَ وَرَطَبْتُهُ: میں نے گھوڑے کو تازہ گھاس کھلائی اور رَطَبَ الْفَرَسُ: (باب عَلِمَ سے لازمی سے اور اس کے معنی گھوڑے کا تر گھاس کھانا کے ہیں۔

رَطَبَ الرَّجُلُ: ترو خشک ہر قسم کی باتیں کرنا خوش گویاں اڑانا یہ محاورہ رَطَبَ الْفَرَسُ کے ساتھ بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے۔

الرَّطِيبُ۔ نرم و ملائم کو کہتے ہیں۔

(ر ع ب)

الرُّعْبُ: اس کے اصل معنی خوف سے بھر کر کٹ جانے کے ہیں کہا جاتا ہے: رَعَبْتُهُ فَرَعَبَ رُعْبًا۔ میں نے اسے خوف زدہ کیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اور خوف زدہ شخص کو رَعَبَ کہا جاتا ہے۔ الرُّعْبُ: (صیغہ صفت) بہت زیادہ ڈر پوک۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ (۳-۱۵۱) ہم عنقریب تمہاری بیعت کافروں کے دلوں میں بٹھادیں گے۔

﴿وَلَمَلِسَتْ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ (۱۸-۱۸) اور ان کی (صورت حال سے) تجھ میں ایک دہشت سما جائے۔ پھر کبھی یہ صرف بھرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے

رَعَبْتُ الْحَوْضَ: میں نے حوض کو پانی سے پر کر دیا۔

لے رِضْوَانٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً نَزَّابَتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ﴾ (۵۷-۷۷) اور (لذت) دنیا کا چھوڑ بیٹھنا جس کو انہوں نے از خود ایجاد کیا تھا ہم نے وہ طریق ان پر فرض نہیں کیا تھا..... مگر (ہاں)

انہوں نے اس کو خدا (ہی) کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا۔

﴿يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾ (۳۸-۲۹) اور خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلب گاری میں لگے رہتے ہیں۔

﴿يُيَسِّرُهُم رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانًا﴾ (۹-۲۱) ان کا پروردگار ان کو اپنی مہربانی اور رضامندی کی خوشخبری دیتا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿إِذَا تَرَأَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ﴾ (۲-۲۳۲) جب جائز طور پر آپس میں وہ راضی ہو جائیں۔ میں تَرَأَوْا باب تفاعل سے ہے جس کے معنی باہم اظہار رضامندی کے ہیں۔

(ر ط ب)

الرَّطْبُ: (تر) یہ یابس (خشک) کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (۶-۵۹) اور (دنیا کی) تر اور خشک چیزیں (سب ہی تو) کتاب واضح (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہوئی موجود ہیں۔

اور رَطْبٌ کا لفظ (پختہ اور) تازہ کھجور کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

اور اپنی زبان میں مروڑ کر اور دین اسلام میں طعن کی راہ سے کہہ کر تم سے خطاب کرتے ہیں۔

اس کلمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بطور تمکیم خطاب کرتے تھے اور آپ ﷺ پر رعوت کا الزام دہرتے اور ظاہر یہ کرتے کہ ہم راعنا کا کلمہ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ہمارا خیال سمجھو اور راعنا (رعن سے مشتق ہے) اور رعن الرجل (ک) کے معنی کسی آدمی کے ست اور بے وقوف ہونے کے ہیں اس سے صیغہ صفت آرعن اور رعن آتا ہے جس کے معنی کم فہم آدمی کے ہیں یہ دراصل رعن کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے جس کے معنی بنی کوہ کے ہیں یعنی پہاڑ کا وہ حصہ جو باہر نکلا ہوا ہو اور آرعن کی مؤنث رعناء آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۱۸۵) لَوْ لَا ابْنُ عُبَيْةَ عَمْرٍو وَالرَّجَاءُ لَهُ

مَا كَانَتِ الْبَصْرَةَ الرَّعْنَاءُ لِي وَطَنًا

اگر عمرو بن عبیہ اور اس کے عطایا کی امید نہ ہوتی تو میں بصرہ رعنا کو بھی وطن نہ بناتا۔

بصرہ کو رعناء یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بادیت کی بنسبت نشیبی ہونے کے سبب کو یا رعناء (ست عورت) کے مشابہ ہے اور یا اس لیے کہ اس کی ہوا میں تغیر اور گھبر پایا جاتا ہے۔

سَيْلٌ رَاعِبٌ: سیلاب جو وادی کو پر کر دے۔ اور جَارِيَةٌ رُعْبُوبَةٌ کے معنی جوانی سے بھر پور اور نازک اندام ووشیزہ کے ہیں اور اس کی جمع رَعَائِبٌ آتی ہے۔

(ر ع د)

الرَّعْدُ: (اسم) بادل کی گرج مروی ہے۔
(۱۵۶) أَنَّهُ مَلَكٌ يَسُوقُ السَّحَابَ كَه رَعْدِ اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے۔^۱ کہا جاتا ہے: رَعَدَتِ السَّمَاءُ وَبَرَقَتْ: بادل گرجا اور چمکا۔ اور یہی معنی آرَعَدَتْ وَابْرَقَتْ کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے اور دھمکانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صَلَفٌ تَحْتَ رَاعِدَةٍ ضرب المثل ہے، جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو زبا توئی ہو اور کچھ کر کے نہ دکھاتا ہو۔^۲
الرَّعْدِيدُ: بزدی کی وجہ سے کاہنے والا نیز محاورہ ہے: أُرْعِدَتْ فَرَائِصُهُ خَوْفًا یعنی مارے خوف کے اس کے پٹھے کاہنے لگے۔

(ر ع ن)

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَقُولُوا رَاعِنًا﴾ (۲-۱۳۰) یعنی راعنا کہہ کر

خطاب نہ کیا کرو۔

﴿رَاعِنًا لِيَا بِالسِّيْتِهِمْ وَطَعْنَا فِي الدِّينِ﴾ (۳-۳۶)

۱ ہکذا ورد في الحديث مرفوع عن ابن عباس والحديث في الترمذی والنسائی واحمد والطبرانی فی الاوسط من رواية جابر وابی عمران الکوفی - عن ابن جریج راجع التفاسیر تحت الاية (۱۳-۱۳) و تخريج الکشاف رقم: ۲۲۵ وقد ذکر کلام معنیہ ابو عبیدة فی محازہ (۱: ۳۲۵).

۲ مثل فی حل المعاجم وفي الصحاح: لمن يكثر الكلام ولا يخبر فيه.

۳ قاله الفرزوق فی عمرو بن عبیة وفي اللسان (رعن) صدره: لولا ابو مالک المرجو نائله وفي رواية الحمقاء بدل الرعناء والبيت فی الاقتضاب ۴۰۱ وديوانه والبلدان (رسم: بصره) وفيه حجة تلقيها بالرعاء ۱۲.

(ر ع ی)

اور محکوم تو میں حاکم قوموں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔
 اور رَاعِي کی جمع رِعَاءٌ وَرِعَاةٌ آتی ہے۔ الْمُرَاعَاةُ:
 کسی کام کے انجام پر غور کرنا اور دیکھنا کہ اس سے کیا صادر
 ہوتا ہے کہا جاتا ہے: رَاعَيْتُ النَّجْمَ: میں نے ستاروں
 کے غروب ہونے پر نگاہ رکھی قرآن پاک میں ہے:
 ﴿لَا تَقْضُوا رِءَايَنَا وَقُولُوا انظُرْنَا﴾ (۲-۱۰۴)
 (مسلمانو! بیغیر سے) رَاعَيْنَا کہہ کر مت خطاب کیا کرو
 بلکہ انظُرْنَا کہا کرو۔

کہا جاتا ہے:

أَرَعَيْتُهُ سَمْعِي: میں نے اس کی بات پر کان لگایا یعنی
 غور سے اس کی بات کو سنا۔ اسی طرح محاورہ ہے: أَرَعَيْتُ
 سَمْعَكَ: میری بات سنیے۔

اور أَرَعَ عَلِيَّ كَذَا کے معنی کسی پر رحم کھانے کے اور اس
 کی حفاظت کرنے کے ہیں۔

(ر غ ب)

الرَّغْبَةُ: اس کے اصل معنی کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔
 کہا جاتا ہے کہ: رَغِبَ الشَّيْءُ كَيْفَ شَيْءٍ كَأَوْسَعٍ هَوَانًا
 حَوْضٌ رَغِيبٌ: کشادہ حوض کو کہتے ہیں۔ عام محاورہ
 ہے:

فُلَانٌ رَغِيبٌ الْجَوْفِ فُلَانٌ يَبُوءُ بِهِ۔

فَرَسٌ رَغِيبٌ الْعَدُوِّ: تیز رفتار اور کشادہ قدم گھوڑا
 الرَّغْبَةُ وَالرَّغَبُ وَالرَّغْبِيُّ: ارادہ اور خواہش کی

الرَّعْيُ: اصل میں حیوان یعنی جاندار چیز کی
 حفاظت کو کہتے ہیں۔ خواہ غذا کے ذریعہ ہو جو اس کی زندگی
 کی حافظ ہے۔ یا اس سے دشمن کو دفع کرنے کے ذریعہ ہو
 اور رَعَيْتُهُ کے معنی کسی کی نگرانی کرنے کے ہیں اور
 أَرَعَيْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اس کے سامنے چارا ڈالا اور
 رِعْيٌ چارہ یا گھاس کو کہتے ہیں مرعی (ظرف) چرا گاہ۔
 قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلُّوْا وَاْرَعَوْا أَنْعَامَكُمْ﴾ (۲۰-۵۳) تم بھی کھاؤ اور اپنے
 چارپاؤں کو بھی کھلاؤ ﴿أَخْرَجَ مِنْهَا مَائِهَا وَمَرَعَاهَا﴾
 (۷۹-۳۱) اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکلا۔

﴿وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَى﴾ (۸۷-۴) اور جس
 نے (خوش نما) چارہ (زمین سے) نکلا۔

رَعَى اور رِعَاءٌ کا لفظ عام طور پر حفاظت اور حسن انتظام
 کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَائِهَا﴾ (۵۷-۲۷) لیکن
 جیسے اس کی نگداشت کرنا چاہئے تھی انہوں نے نہ کی۔

اور ہر وہ آدمی جو دوسروں کا محافظ اور منتظم ہو اسے رَاعِي
 کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔^①

(۱۵۷) ﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ﴾

تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت
 کے متعلق سوال ہوگا شاعر نے کہا ہے۔^② (السرلیج)

(۱۸۶) وَلَا أَرْمَرَعِي فِي الْأَقْوَامِ كَالرَّاعِي

① اصل الحدیث متفق علیہ وایضاً فی الترمذی وابی داؤد والبیہقی من انس و ابن عباس والطبرانی من حدیث ابن عباس راجع
 لتخریجه احياء العلوم للغزالی بتخریج العراقي (۲: ۳۱) وکنز العمال (۶: ۱۹، ۱۳۱) والفتح الكبير (۲: ۳۳۰-۳۳۱)۔

② قاله ابوقیس بن الاسلم وتكملته لیس قطعاً مثل قطی والبيت من كلمة مفضلية (۲: ۵۸) جمهرة فی ۱۹ بیتاً راجع
 السمط ۸۳۷ والمیدانی (۲: ۱۰۹) واللسان (قطا) (رعی) وایام العرب ۸۳ وخصائص الخاص للثعالبی ۱۴ والمثل ایضاً فی المیدانی
 (۲: ۱۱۶، ۸۶) والعسکری (۱۷۹: ۲۰، ۱۷۶)۔

﴿وَكُنُوسًا مِنْهَا رَعْدًا﴾ (۲-۳۵) اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ۔

﴿يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَعْدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ (۱۶-۱۲) ہر طرف سے ان کا رزق بافراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

أَرْعَدَ الْقَوْمَ: آرام و راحت میں بسر کرنا۔

أَرْعَدَ مَا شِئْتَهُ: اس نے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔

ان میں اول یعنی أَرْعَدَ الْقَوْمَ جَدَبَ وَاجْدَبَ کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی أَرْعَدَ مَا شِئْتَهُ أَدْخَلَ کی طرح متعدی ہے۔

السَّمْرُ عَادُ: ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور دافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر دلالت کرتا تھا۔

(ر غ م)

الرُّغَامُ: اصل میں خاک کو کہتے ہیں اور رَغِمَ أَنْفٌ فُلَانٍ کے معنی اس کی ناک خاک آلود ہو یعنی وہ ذلیل ہو اور أَرْعَمَهُ: کسی کو ذلت کے ساتھ خاک میں ملا دینا مجازاً رَغِمَ أَنْفٌ فُلَانٍ کے معنی ناراض ہونا بھی آتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

(۱۸۸) إِذَا رَغِمَتْ تِلْكَ الْأَنْفُ لَمْ أَرْضِهَا

وَلَمْ أَطْلُبِ الْعُتْبَىٰ وَلَكِنْ أَرِيدُهَا

اگر وہ ناراض ہوں گے تو میں ان کو راضی کرنے کی کوشش

نہیں کروں گا بلکہ اس کی ناراضگی کو اور بڑھا دوں گا۔

یہاں رَغِمَ کو ارضاء کے بالمقابل لانا اس بات کی

وسعت کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا﴾ (۲-۹۰) اور وہ ہم کو (ہمارے فضل کی توقع اور ہمارے عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں۔

اور رَغَبَ فِيهِ وَالْيَهَ کے معنی کسی چیز پر رغبت اور حرص کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ﴾ (۹-۵۹) ہم تو اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن رَغَبَ عَنْ کے معنی کسی چیز سے بے رغبتی اختیار کرنا کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ رَغَبَ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۲-۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقے سے انحراف کرے۔

﴿أَرَاغِبُ أَنْتَ عَنِ الْهَيْئِ﴾ (۱۹-۳۶) (اے ابراہیم علیہ السلام) کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔

اور رَغِيْبَةً کے معنی بہت بڑے عطیہ کے ہیں (ج: رَغَائِبُ) یہ رغبت سے مشتق ہے یا تو اس لئے کہ وہ مرغوب فیہ ہوتی ہے اور یا اصل معنی یعنی وسعت کے لحاظ سے عطیہ کو رغیبہ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

(۱۸۷) "يُعْطَى الرغائب مَنْ يَشَاءُ وَيَمْنَعُ"

وہ جسے چاہتا ہے بڑے بڑے عطایا بخشتا اور جس سے چاہتا ہے روک دیتا ہے۔

(ر غ د)

رَعْدًا وَرَعِيدًا: آسودہ زندگی۔ قرآن پاک میں ہے:

① لعبدہ بن الطیب من قصبۃ یعظ فیہا بنیہ وصدرة : ارضیکم بتقی الالہ فانہ راجع للیبیت شرح شواہد التلخیص (۱: ۳۶)۔

② قد مرفی (انف) رقم ۳۱ وفيه غضب بدل اغمت۔

جاتا ہے:

مَا لِفُلَانٍ حَافٍ وَلَا رَافٍ: یعنی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اس پر کوئی شفقت کرنے والا نہیں رہا۔ مثل مشہور ہے۔^۱

مَنْ حَفِنًا أَوْ رَفِنًا فَلْيَقْتَصِدْ: جو ہم پر شفقت کرے اسے چاہیے کہ اعتدال سے کام لے۔
الرَّفْرَفُ: کے معنی درخت کے منتشر پتوں کے ہیں۔

اور قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلَى رَفْرَفٍ خُضِرٍ﴾ (۵۵-۷۶) وہ سبز قالینوں پر (تکیہ لگائے)

رَفْرَفٍ سے خاص قسم کے کپڑے مراد ہیں جو مرغزار کے مشابہ ہوتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ رَفْرَفٌ سے خیے کا کنارہ مراد ہے جو زمین پر پڑا رہتا ہے اور حسن (بصری) سے مردی ہے کہ اس سے گل نکلے مراد ہیں۔

(ر ف ات)

الرَّفْفُ: یہ باب نضر کا مصدر ہے اور رَفَفَتْ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کا چورا چورا کر دینے کے ہیں اور جو بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے اسے رفات کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالُوا إِنَّمَا كُنَّا عِظَامًا وَرِفَاتًا﴾ (۱۷-۳۹) اور کہا کرتے کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

اور استعارہ کے طور پر رِفَات اس رسی کو بھی کہتے ہیں جو بوسیدہ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہو۔

دلیل ہے کہ اس کے معنی سَخِطٌ یعنی غصے اور ناراض ہونے کے ہیں اسی بنا پر کہا جاتا ہے:

أَرْغَمَ اللَّهُ أَنْفَ فُلَانٍ أَوْ أَرْغَمَهُ: یعنی اللہ اسے ذلیل کرے اور رَاغِمَةً (باب مفاعلہ) کے باہم ناراض ہونے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کے ہیں بعد ازاں مُرَاغِمَةً کا لفظ منازعت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور آیت:

﴿يَجِدُ فِي الْأَرْضِ مُرَاغِمًا كَثِيرًا وَسَعَةً﴾ (۴-۱۰۰) تو روئے زمین میں اس کو رہنے سہنے کی وافر جگہ اور ہر طرح کی کشائش ملے گی۔

میں مُرَاغِمًا سے مراد پناہ گاہ ہے یعنی برائی کو دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کرے اگر اس سلسلہ میں اسے وطن بھی ترک کرنا پڑے تو ہر اسماں نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی اچھی پناہ گاہ دے گا۔ جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی اور یہ رَغَمْتُ إِلَيْهِ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پاس چلا جانا۔ جیسے غَضِبْتُ إِلَى فُلَانٍ مِنْ كَذَا یعنی ناراض ہو کر فلاں کے پاس چلا گیا۔

(ر ف ف)

رَفِيفُ الشَّجَرِ: درخت کی شاخوں کا ہوا سے

لہلہانا اور منتشر ہونا۔ کہا جاتا ہے:

رَفَّ الطَّيْرُ جَنَاحِيهِ: پرند کا اپنے پنجے کی حفاظت کے لئے دونوں بازو پھیلانا۔ یہ باب رَفَفَ يَرَفُّ (ن) سے ہے اور استعارہ کے طور پر رَفَفٌ کا لفظ کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام محاورہ میں کہا

۱ انظر للمثل النهائية لابن الاثير (۲: ۹۸) واللسان والصحاح (رفف) ومحاليس ثعلب (۲: ۴۱۱) وفي اتباع ابى الطيب ۴۸ فليترك بدل فليقتصد وكلهم جعل الكلمة من قبيل المثل الايا الطيب فانه قال جاء في الحديث - ۱۲.

(رَفَات)

اور رَفَاتٌ وَأَرْفَاتٌ دونوں ایک دوسرے کی جگہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ رَفَاتٌ کے معنی مباشرت کرنے کے ہیں اور اَرْفَاتٌ کے معنی رَفَاتٌ (ماخذ) کے ساتھ متصف ہونا کے اور یہ دونوں باتیں لازم ملزوم ہیں۔

(رَفَاد)

الرَّفَادُ: (ن) اس کے معنی عطا اور مدد کے ہیں اور رَفْدٌ مصدر (ض) ہے جس کے معنی مدد دینے کے اور عطا کرنے کے ہیں اور مَرَفْدٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس میں عطیہ ڈال کر دیا جائے عام طور پر پیالوں میں خیرات ڈال کر دی جاتی ہے اس لئے مَرَفْدٌ بمعنی پیالہ آتا ہے اور رَفْدَتُهُ کے معنی عطیہ دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَشِّرِ الرَّفِذُ الْمَرْفُودُ﴾ (۱۱-۹۹) بہت ہی برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا۔

اور اَرْفَاتُهُ کے معنی کسی کے لئے عطا مقرر کرنے کے ہیں کہ وہ مقررہ مقدار میں اس سے لیتا رہے۔ رَفْدُهُ وَأَرْفَدُهُ دونوں سَقَاهُ وَأَسْقَاهُ کی طرح متعدی بن کر استعمال ہوتے ہیں۔

اور رَفْدٌ فُلَانٌ فَهُوَ مَرَفْدٌ سے بطور استعارہ وہ شخص بھی مراد ہوتا ہے جسے ریاست (سرکاری) دی گئی ہو۔

الرَّفُودُ: اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک بار دودھ دوہنے سے پیالہ بھر دے لہذا یہ (فعل) بمعنی فاعل کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ مَرَأِیدُ ان اونٹنیوں اور بکریوں کو کہتے

الرَّفَاتُ: (ن) وہ بخش باتیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا یعنی جماع اور اس کے دواغی کا تذکرہ اور آیت کریمہ:

﴿أَجَلٌ لَّكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَاتُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ (۲-۱۸۷) مسلمانو! ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے۔

میں کنایہ جماع مراد ہے اور اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کو جماع کے لئے بلانا اور ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنا جائز ہے اور اسے بواسطہ الٰہی متعدی کر کے معنی افضاء کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور آیت:

﴿فَلَا رَنَتْ وَلَا فُسُوقٌ.....﴾ (۲-۱۹۷) (اور حج میں) نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ گناہ کی۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جماع کی ممانعت کی گئی ہو اور یہ بھی کہ اس کے متعلق گفتگو سے منع کیا گیا ہو کیونکہ یہ گفتگو جماع کے مقدمات میں شامل ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ دوران طواف میں یہ شعر پڑھا۔ ﴿(رجز)

(۱۸۹) وَهَنْ يَمْشِينَ بِنَا هَمِيْسًا

إِنْ تَصُدِّقِ الطَّيْرُ نَنْكَ لِمَيْسَا

اور اونٹ ہمیں لے کر آہستہ آہستہ نرم رفتاری سے چلتے ہیں اگر پرند چ بولتا ہے تو ہم ہمیں سے جماع کریں گے۔

① راجع للقصة والبيت الكشاف والمستدرک للحاكم والطبري (۲: ۲۶۵) وفي روايته خرجن يسرين مكان هن يمشين والرجز ايضاً في البحر (۱۶: ۲۷۱) والعمدة (۱: ۳۰) والمحاضرات للمؤلف (۱: ۷۹) وابن كثير (۱: ۲۳۷) والحيوان للجاحظ (۳: ۴۰) والعيون (۱: ۳۲۱/۲۲).

استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿وَأَذِيرُ فُجْعَ إِبرَاهِيمَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۲)
(۱۲۷) اور جب ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لئے جیسے فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (۹۳-۴) اور ہم نے تمہارے ذکر خیر کا آواز بلند کیا۔

اور کبھی مرتبہ کی بلندی بیان کرنے کے لئے۔ جیسے فرمایا:
﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ (۶)
(۱۶۶) اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلحاظ درجات کے فوقیت دی۔

﴿نَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأٍ﴾ (۱۲-۷۶) اور ہم جس کو چاہتے ہیں (حسن تدبیر میں) اس کے درجے بلند کر دیتے ہیں۔

﴿رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ﴾ (۳۰-۱۵) خدا بڑا عالی مرتبہ (اور) عرش (بریں) کا مالک ہے۔
اور آیت: ﴿بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ﴾ (۳-۱۵۸) بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔

میں رفع کے معنی آسمان کی طرف اٹھالے جانا بھی ہو سکتے ہیں اور رفع ﴿بلحاظ شرف بخشی بھی اور (قیامت کے متعلق) آیت:

ہیں جو موسم گرما اور سرما میں برابر دودھ دیتی ہوں اور ان کا دودھ کبھی خشک نہ ہوتا۔ ہوشاعر نے کہا ہے۔
(۱۹۰) أَطْعَمَتِ الْعِرَاقَ وَرَأْفِدِيَهٗ
فَنَزَارِيَا أَحَدًا يَدِ الْقَمِيصِ
یعنی تو نے عراق اور دجلہ و فرات پر ایک فزاری کو عامل بنا کر بھیجا ہے جو خیانت میں نہایت ماہر ہے۔

یہاں رافدیہ سے دجلہ اور فرات مراد ہیں کیونکہ ان کا پانی مسلسل جاری رہتا ہے۔

تَرَأْفِدُوا کے معنی ایک دوسرے سے تعاون کرنا کے ہیں اسی سے رفاہہ ہے یعنی وہ فنڈ جو قریش نادار حجاج کی مدد کے لیے جمع رکھتے تھے (رفع) اَلرَّفْعُ (ف) کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں یہ کبھی تو مادی چیز جو اپنی جگہ پر پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ﴾ (۲-۶۳) اور ہم نے طور پر پہاڑ کو تمہارے اوپر لاکھڑا کیا۔

﴿اللّٰهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (۱۳-۲) اللہ وہ قادر مطلق ہے جس نے آسمان کو بدوں کسی سہارے کے اونچا بنا کھڑا کیا۔

اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے

① قاله الفرزوق يهجو عمر بن حبيبة الفزاري ويخاطب يزيد بن عبد الملك لما ولاه العراق ۱۰۲ هـ وقبلة: تفهيق بالعراق ابو المشني وعلم قومه اكل الخبيص والبيت في السمت ۸۶۲ واللسان والمحكم والصحاح (حذ) ودبوانه (۲: ۴۸۸) رقم ۳۰۴ والحصري (۱: ۵۷) والجرجاني ۷۴ والكامل ۸۰۸ والرافدان: الدجلة والفرات والبيت ايضا في الحيوان (۵: ۶/۱۹۷: ۵۱۰) في اربعة آيات والخبر في الفاضل ۱۱۱ وادب الكاتب للصولي والبيت ايضا في محازات القرآن ۲۹۱ والمعارف للقتبي ۱۷۹ والمعاني للقتبي ۵۹۷ والرواية في معظم المصادر "أطعمت" وفي الاغانى (۱۹-۱۷) والامالي (۱۲۳) والصحاح أوليت وفي الحيوان والاساس واللسان (رفد) "بثت الي" فاطن ان الغاء في المطبوع مصحف قال القتيبي في المعاني الاحد معناه سريع اليد و اراد خفة يده في السرفة والحيانة (كذا في الصحاح) و زكر القميص لتسديد القافية وذكر الاخباريون: فعزله يزيد ۱۰۵ هـ ثم لم يسمع له ذكر.

② لكن الرفع الي السماء متعين في الآية لان الاحاديث تدل بالتواتر على هذا المعنى راجع (ي ق ن) .

دور کرے۔

میں رَجَس کے دور کرنے سے عز و شرف بخشا مراد ہے اور رَفَع کے معنی تیز رفتاری بھی آتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: رَفَعَ البَعِيرُ فِی سَبِيهِ: اونٹ تیز رفتاری سے چلا اَرَفَعْتُهُ اَنَا: میں نے اسے تیز چلایا بَعِيرٌ مَرْفُوعٌ السَّيْرِ: تیز رفتار اونٹ۔ اور رَفَعَ کے معنی کسی کے راز کو فاش کرنا بھی آتے ہیں جیسے: رَفَعَ فُلَانٌ عَلَي فُلَانٍ میں نے اس سے پردہ اٹھا دیا یعنی اس کے راز کو فاش کر دیا اور رِفَاعَةٌ اس چھوٹی سی گدی کو کہتے ہیں جسے عورتیں اپنی سرین پر باندھ لیتی ہیں تاکہ وہ بڑی معلوم ہوں۔

(ر ق ق)

الرِّقَّةُ: (باریکی) اور دِقَّةُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن رِقَّة بلحاظ کناروں کی باریکی کے استعمال ہوتا ہے اور دِقَّة بلحاظ عمق کے بولا جاتا ہے۔ پھر اگر رقت کا لفظ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد صفات آتی ہے جیسے ثَوْبٌ رَفِيقٌ: (باریک کپڑا) اور ثَوْبٌ صَفِيقٌ (موٹا کپڑا) اور دل کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد قساوت اور جفاء آتی ہے مثلاً نرم دل کے متعلق کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ رَفِيقٌ الْقَلْبِ اور اس کے بالمقابل سخت دل آدمی کو قَاسِي الْقَلْبِ کہتے ہیں۔

الرَّقِيْقُ: کاغذ کی طرح کی کوئی چیز جس پر لکھا جائے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِی رَقٍّ مَّنشُورٍ﴾ (۳-۵۲) (اور چوڑے چکے)

کاغذ پر لکھی ہوئی (کتاب کی تم ہے)

اور نر چکھوے کو بھی رَقِّ کہا جاتا ہے۔

﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ (۳-۵۶) بعض کو نیچا دکھانے کی اور بعض کو (بلحاظ درجہ) بلند کرے گی۔

(میں زمین بھی) رَّافِعَةٌ کا لفظ خافضة کے مقابلہ میں آیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رفع بلحاظ درجات مراد ہے۔ اور آیت:

﴿وَالسَّيِّءَاتُ كَيْفَ رُفِعَتْ﴾ (۱۸-۸۸) اور آسمان کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کیسا اونچا بنایا۔

میں دونوں قسم کی بلندی کی طرف اشارہ ہے یعنی بلندی بلحاظ محل اور بلندی بلحاظ شرف و منزلت اور آیت ﴿وَفُرشٍ مَّرْفُوعَةٍ﴾ (۳۴:۵۶) اور اونچے اونچے فرش میں فرش کی بلندی سے ان کے عمدہ اور نفیس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح آیت:

﴿فِی صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ (۸-۱۳) ان اوراق میں (لکھا ہوا ہے) جن کی تعظیم کی جاتی ہے اور وہ پاکیزہ اونچی جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔

میں بھی بلندی بلحاظ شرف و منزلت ہی مراد ہے۔ اور آیت:

﴿فِی بُیُوتٍ اِذْنُ اللّٰهِ اَنْ تَرْفَعَهُ.....﴾ (۲۲-۳۶) ایسے گھروں میں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کی جائے۔

میں بھی رَفَعَ بلحاظ عز و شرف مراد ہے یعنی ان کی تعظیم کی جائے اور ان کے اندر کوئی نازیبا حرکت نہ کی جائے جو ان کے ادب و احترام کے خلاف ہو اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

﴿اِنَّمَّا یُرِیدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلِ الْبَیْتِ﴾ (۳۳-۳۳) (اے پیغمبر کے) گھر والو! خدا

کو تو بس یہی منظور ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) گندگی کو

پر مارنے یا کسی کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلَّا وَا لَا ذِمَّةً.....﴾

(۹-۱۰) کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا پاس
ملوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی عہد و پیمان کا۔

اسی سے نگران کو رَقِيبُ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ
اس شخص کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی منظور ہوتی
ہے اور یا وہ نگرانی کے لئے بار بار اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا
ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَرَاتِقُبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ﴾ (۱۱-۹۳) تم بھی
منتظر ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

﴿إِلَّا لَذِيهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (۵۰-۱۸) مگر ایک چوکیدار
(اس کے لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔

الْمَرْقَبُ: بلند جگہ جہاں رقیب (نگران) بیٹھ کر چوکسی
کرتا ہے اور قمار بازوں کے محافظ کو بھی رَقِيبُ کہا جاتا
ہے جو قمار بازی کے بعد شراب نوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح
قمار بازی کے تیسرے درجے کے تیر کو بھی رَقِيبُ کہتے
ہیں۔

تَرَقَّبُ: (تفعل) کے معنی ہیں انتظار کرتے ہوئے کسی
چیز سے بچنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ﴾ (۲۸-۲۱) چنانچہ
موسیٰ (علیہ السلام) شہر سے نکل بھاگے اور دوڑتے ہوئے جاتے
تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

رَقُوبٌ: اس عورت کو کہتے ہیں جو کثرت اولاد کی وجہ
سے اپنے بچوں کی موت کی منتظر ہو۔ نیز وہ اونٹنی جو پانی
پینے کے لئے باری کے انتظار میں ہو اسے بھی رَقُوبُ کہا

الرَّقِيقُ کے معنی غلاموں کا مالک ہونے کے ہیں اسی سے
مملوک غلام کو رَقِيقُ کہتے ہیں اس کی جمع اَرْقَاءُ آتی ہے
اور اسْتَرْقَى فُلَانٌ فُلَانًا کے معنی کسی کو غلام بنانے
کے ہیں۔

الرَّفْرَاقُ: شراب کی چمک دمک کو کہتے ہیں اور رَفْرَقَةٌ
کے معنی شفاف شراب کے ہیں نیز ہر وہ قطعہ زمین جو پانی
سے متصل ہو اسے رِفْقَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ مرطوب ہونے
کی وجہ سے وہ نرم رہتی ہے مثال مشہور ہے۔

أَعْنُ صَبُوحٌ تُرْفِقُ: کیا تمہارا اشارہ صبح کی شراب
سے ہے۔ یہ حسن طلب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔^①

(ر ق ب)

الرَّقَبَةُ: اصل میں گردن کو کہتے ہیں پھر رَقَبَةُ کا
لفظ بول کر مجازاً انسان مراد لیا جاتا ہے اور عرف عام میں
الرَّقَبَةُ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے جیسا
کہ لفظ رَأْسٌ اور ظَهْرٌ بول کر مجازاً سواری مراد لی جاتی
ہے چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ يَرْبُطُ كَذَا ظَهْرًا أَوْ
كَذَا رَأْسًا..... یعنی فلاں کے پاس اتنی سواریاں ہیں۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ﴾
(۳-۹۲) کہ جو مسلمان کو غلطی سے (بھی) مار ڈالے تو
ایک مسلمان بردہ آزاد کرانے۔

اور رَقَبَةُ کی جمع رِقَابٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ (۲-۷۷) اور غلام کو آزاد کرنے
میں۔ مراد مکاتب غلام ہیں۔ کیونکہ مال زکوٰۃ کے وہی
مستحق ہوتے ہیں اور رَقَبَتُهُ (ن) کے معنی گردن

① راجع للمثل المعاجم.

(رق م)

الرَّقْمُ: کے معنی گاڑھے خط کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ رَقْمٌ کے معنی کتاب پر اعراب اور نقطہ لگانے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿كِتَابٌ مَّرْقُومٌ﴾ (۸۳-۹) وہ ایک کتاب ہے (وقتاً فوقتاً) اس کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے۔

میں مَرْقُومٌ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی گاڑھے اور جلی خط میں لکھی ہوئی یا نقطے لگائی ہوئی۔ اور جو شخص کسی کام کا ماہر اور حازق ہو اس کے متعلق ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے۔ فُسلانٌ يرقمُ في الماء: یعنی وہ ماہر ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ أَصْحَابَ الْكُفْهِفِ وَالرَّقِيمِ﴾ (۱۸-۹) کہ غار اور لوح والے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ رَقِيمٌ ایک مقام کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس پتھر کی طرف نسبت ہے جس میں ان کے نام کندہ تھے اور گدھے کے دونوں بازوؤں پر جو نشان ہوتے ہیں انہیں رَقِيمَتَا الْحِمَارِ کہا جاتا ہے اور اَرْضٌ مَرْقُومَةٌ تھوڑی گھاس والی زمین کو کہتے ہیں گویا وہ کتابت کے نشانات کی طرح ہے۔

الرَّقِيمِيَّاتُ: تیروں کو کہتے ہیں جو مدینہ کے ایک مقام کی طرف منسوب ہیں۔

(رق ی)

رَقِيٌّ (س) رَقِيًّا۔ فِي السَّلْمِ کے معنی سیڑھی پر چڑھنے کے ہیں اور رَاتَقِيٌّ (اعتعال) بھی اسی معنی میں

جاتا ہے اَرْقَبَ: (افعال) کے معنی رُقْبِيٌّ کرنے کے ہیں یعنی کسی کو اس کی زندگی بھر کے لئے مکان وغیرہ ہبہ کر دینا اور اس کی موت کے بعد اس عطا کو واپس لے لینا اور اسے رُقْبِيٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہبہ کے بعد گویا وہ اس کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور ایسے ہبہ کو عمری بھی کہا جاتا ہے۔^۱

(رق د)

الرَّقَادُ: خوشگوار اور ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے رَقَدَ (ن) رُقُودًا فَهُوَ رَاقِدٌ اور رَاقِدٌ کی جمع رُقُودٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَهُمْ رُقُودٌ﴾ (۱۸-۱۸) حالانکہ وہ (اصحاب کہف) سوئے ہوئے ہیں۔

اصحاب کہف کی گہری اور لمبی نیند کے باوجود ان پر رُقُودَا لفظ بول کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیند خواہ کتنی ہی گہری اور لمبی کیوں نہ ہو موت کے مقابلہ میں وہ نوم خفیف کی حیثیت رکھتی ہے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اصحاب کہف فوت ہو چکے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُمْ رُقُودٌ﴾ کہہ کر ان سے موت کی نفی کی ہے۔

اور مَرَقَدٌ (ظرف) خواب گاہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَا وَيَلْنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا﴾ (۳۶-۵۱) ہم پراسوس ہے کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے جگا اٹھایا۔

اور اَرْقَدَ الظَّلِيمِ: کے معنی شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے ہیں گویا اس نے تیز روی سے اپنی نیند کو دور کر دیا۔

۱ لیکن اصحاب غریب الحدیث فرقو ابین العمزی والرقیبی ۱۲۔

فرشتے اس کی روح لے کر اوپر جائیں یعنی ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب۔

التَّرْقُوتُ: ہنسی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس لحاظ سے کہ سانس پھول کر وہیں تک چڑھتی ہے اس کی جمع تَرَاقِیُ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ﴾ (۷۵-۲۶) سنو جی! جب جان بدن سے نکل کر گلے تک پہنچ جائے گی۔

(رکب)

الرُّكُوبُ: کے اصل معنی حیوان کی پیٹھ پر سوار ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَتَرَكُوبَهَا وَزِينَتَهَا﴾ (۱۶-۸) تاکہ ان سے سواری کا کام لو اور (سواری کے علاوہ یہ چیزیں) موجب زینت (بھی) ہیں۔

مگر کبھی کبھی وغیرہ پر سوار ہونے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ﴾ (۲۹-۶۵) پھر جب لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔

مگر عرف میں رَاكِبٌ کا لفظ شترسوار کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ اس کی جمع رُكْبٌ وَرُكْبَانٌ اور رُكُوبٌ تینوں آتی ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالرَّكِبَ أَسْفَلَ مِنْكُمْ﴾ (۸-۳۲) اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو (ہٹا ہوا) تھا۔

استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ﴾ (۳۸-۱۰) تو ان کو چاہیے کہ بیڑھیاں لگا کر آسمان پر چڑھیں۔

مثلاً مشہور ہے: ۱: اِرْقَ عَلِيٌّ ظَلْعِكَ: یعنی اپنی طاقت کے مطابق چلو اور طاقت سے زیادہ اپنے آپ پر بوجھ نہ ڈالو۔

اور رَقِيْتُ بمعنی رقی یعنی افسوس کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:

كَيْفَ رَقِيكَ أَوْ رَقِيْتُكَ: کہ تمہارا افسوس کیسا ہے۔ اس میں رُقِيٌّ مصدر ہے اور رُقِيَّةٌ اسم۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيكَ﴾ (۱۷-۹۳) یعنی ہم تیرے افسوس پر یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

میں رُقِيٌّ بمعنی رُقِيَّةٌ کے ہے اور آیت:

﴿وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ﴾ (۷۵-۲۷) اور کون افسوس کرے۔ میں اس بات پر متنبیہ ہے کہ اس وقت جھاڑ پھونک سے کوئی

اس کی جان نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ ۲: (اکامل)

(۱۹۰) وَإِذِ الْمَنِيَّةِ أَنْشَبَتْ أَظْفَارَهَا
أَلْفَيْتَ كُلَّ تَمِيمَةٍ لَا تَنْفَعُ

کہ جب موت اپنا نیچہ گاڑ دیتی ہے تو کوئی افسوس کارگر نہیں ہوتا۔

ابن عباس نے مَنْ رَاقٍ کے معنی کئے ہیں کہ کون سے

① المثل في حل المعاجم۔

② قاله ابو ذؤيب الهذلي يرفئ بنه والبيت من كلمة مفضلية (۲: ۲۲۰) جمهورية (۳۴۱) في ۶۲ بيتاً مذكوره بعضها في اللسان (نسب) والخزانة (۱: ۲۰۲) والسبوطي (۳۰۹۲/۴۹۳) وديوان الهذليين (۱: ۳) والمقد (۲: ۱۰) والاصابة ۲۰۰۷ والاسد (۵: ۱۹۰) والسبط (۴: ۸۸۸) والحمامسة للبحثري ۹۹ والكامل ۵۱۸ وشواهد الكشاف ونقد الشعر ۶۷ ومحاضرات المؤلف (۴: ۴۸۹) وخصائص الخاص ۱۸۲ والفاضل للمبرد ۵۱ وفي تاريخ الطبري ان معاوية تمثل به عند موته ۱۲.

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۝ إِنَّ يَسَاءَ يُسْكِنُ الرِّيحَ فَيَظْلِلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ﴾
 (۳۳-۳۲، ۳۳) اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے
 (بادبانی) جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (اونچے
 اونچے) دکھائی دیتے ہیں اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو
 جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔
 جَفَنَةً رَكُودًا: لہالب بھرا ہوا پیالہ۔

رکان

الرِّكَازُ: وہی آواز (یا آہٹ) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ
 قرآن پاک میں ہے:
 ﴿هَلْ تَحْسِبُ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾
 (۱۹-۹۸) اب تم ان میں سے کسی کو (بھی) دیکھتے ہو یا
 ان کی بھنک بھی سنتے ہو۔
 اور رَكَزْتُ كَذَا کے معنی ہیں: میں نے اسے مخفی طور پر
 دفن کر دیا اسی سے الرِّكَازُ ہے جس کے معنی دفینہ ہیں۔
 خواہ اسے کسی انسان نے دفن کیا ہو، جیسے خزانہ وغیرہ یا
 قدرتی طور پر زمین کے اندر پایا جائے جیسے معدنیات اور
 الرِّكَازِ كَالْفِظَانِ دُونِ كُوشَاثِلِ ہے۔ اور حدیث
 ہے۔^۱

(۱۵۹) وَفِي الرِّكَازِ الحُمْسُ: (رکان میں خمس
 ہے) میں رکان کے دونوں معنی بیان کئے گئے ہیں۔ عام
 محاورہ ہے: رَكَزْرُمَحَةً: اس نے اپنا تیزہ زمین میں گاڑ
 دیا۔ اور فوج کی فروگاہ کو مَرَكَزِ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ

﴿فَرَجَلًا أَوْرُكِبًا﴾ (۲-۲۳۹) تو پیادہ یا سوار ہو
 کر۔
 اور ”رکاب“ خاص کر مرکوب یعنی سواری پر بولا جاتا ہے۔
 أَرَكَبَ المُهْرُ: بچھیرا سواری کے قابل ہو گیا۔
 المُرْكَبُ خاص کر اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے کے
 گھوڑے پر سوار ہو یا جو شخص سواری نہ کر سکے یا سوار ہونا نہ
 جانتا ہو۔

المُتْرَاكِبُ: وہ چیز جو تہہ برتہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَصْرًا أُنْجِرُجُ مِنْهُ حَبًّا مُتْرَاكِبًا﴾
 (۶-۱۰۰) پھر ہم سبز کو نکلیں نکالتے ہیں کہ ان سے گتے
 ہوئے دانے نکالتے ہیں۔

رُكْبَةٌ کے معنی زانو کے ہیں اور رَكَبْتُهُ کے معنی ہیں: میں
 نے اس کے زانو پر مارا جیسے فَأَذْنُهُ (میں نے اس کے دل
 پر مارا) رَأْسُهُ میں نے اس کے سر پر مارا۔ اور نیز رَكَبْتُهُ
 کے معنی گھنے سے مارنا بھی آتے ہیں۔ جیسے يَدَيْتُهُ: میں
 نے اسے ہاتھ سے مارا۔ عِشْتُهُ: میں نے اسے نظر لگادی
 وغیرہ۔ پھر کنایہ کے طور پر عورت کے ستر کو بھی رَكَبٌ کہہ
 دیتے ہیں۔^۲ جیسا کہ مجازاً عورت کو مطیہ (سواری) یا
 مَعِيذَةٌ (بمعنی مَفْتَعِدَةٌ) کہا جاتا ہے۔

رکان

رَكَدَ (ن) رُكُودًا کے معنی پانی یا ہوا وغیرہ کے
 ٹھہر جانے کے ہیں۔ اسی طرح کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی
 رُكُودٌ كَالْفِظَانِ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

۱ وفی الصَّخَّاحِ: الرِّكَبُ (بالتحریر) منبت العانة وقال الخليل يختص بالمرئة وقيل يعم.

۲ الاول عند اهل الحجاز والثاني عند اهل العراق (القولان تحتلها اللغة (النهائية) والحديث رواه الجماعة عن ابي هريرة وله الفاظ وطرق راجع النبل ۴: ۱۵۷ ومالك في موطأه عن الزهري والشافعي في الام (۲: ۳۷) والرسالة رقم (۵۳۳) تحقيق احمد شاکر ومسنند احمد (۳: ۳۳۵) رقم (۴۶۴) (ایضاً عن ابن عباس (طَبَّ عن ثعلبة طس عن جابر وابن مسعود).

میں انہیں شکست خوردہ ہو کر بھاگنے سے منع کیا گیا ہے۔
(اور یہ نبی تہدید اور تعجیز کے لئے ہے)

(رک ع)

الرُّكُوعُ: اس کے اصل معنی انحناء یعنی جھک جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے معنی میں آتا ہے خواہ بطور عبادت ہو یا بطور عبادت نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ (۲۲-۷۷)
(مسلمانو! خدا کے حضور) سجدے اور رکوع کرو۔

﴿وَأَرْكَعُوا مَعَ الرَّائِعِينَ﴾ (۲-۴۳) جو (ہمارے حضور بوقت نماز) جھکتے ہیں تمہ بھی ان کے ساتھ جھکا کرو۔

﴿وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ (۲-۱۵۲) مجاوروں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے)
﴿الرَّائِعُونَ السَّاجِدُونَ﴾ (۹-۱۱۲) رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے۔

شاعر نے کہا ہے۔ (الطویل)

(۱۹۱) أَخْبِرْ أَخْبَارَ الْفُرُونَ الَّتِي مَضَتْ

أَدْبُ كَسَائِي كَلَّمَا قُمْتُ رَاكِع

میں گذشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے) ریک کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت کھڑا ہوتا ہوں۔

(رک م)

رَكْمٌ: (ن) کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا
قرآن پاک میں ہے: ﴿سَحَابٌ مَّرْكُومٌ﴾ (۵۲-۴۴)

جہاں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ وہاں زمین میں اپنے نیزے (جھنڈے) گاڑ دیتے ہیں۔

(رک س)

الرَّكْسُ: کے معنی کسی چیز کو اس کے سر پر الٹا کر دینا یا اس کے اول سرے کو موڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ ملا دینا کے ہیں۔ محاورہ ہے:
أَرْكَسْتُهُ: میں نے اسے الٹا کر دیا اور رُكْسَ اس کا مطاوع آتا ہے اور اَرْكَسَ فِي أَمْرِهِ کے معنی کسی معاملہ میں الجھ جانے کے ہیں (یعنی کسی مصیبت سے رہائی کے بعد دوبارہ اس میں پھنس جانا) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا﴾ (۳-۸۸) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا ہے۔

(رک ض)

الرَّكْضُ: اس کے اصل معنی ناگ کو حرکت دینے کے ہیں اگر سوار کے متعلق بولا جائے جیسے: رَكَضْتُ الْفَرَسَ: تو اس کے معنی گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لئے ایڑھ لگانا کے ہوتے ہیں اور پیادہ پا آدمی کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی پاؤں کے ساتھ زمین کو روندنا کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا: ﴿أَرْكَضْ بِسِرِّ جِلْدِكَ﴾ (۳۸-۴۳) یعنی اپنی ناگ زمین پر مارو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَرْكُضُوا وَأَرْجِعُوا إِلَيَّ مَا أَتَرَفْتُمْ فِيهِ﴾ (۲۱-۱۱۳)

مت بھاگو! اور ساز و سامان (دنیا کی) طرف لوٹ جاؤ جس میں تم چین کرتے تھے۔

۱) قاله لبيد في قصيدة له في الحكم راجع (۱: ۳۶) والمعمرين (۶۱) والشعراء ۱۵۲ والاغاني (۱۴: ۹۶، ۱۳۴) محاز القرآن (۱: ۵۴) واضد ادبي الطيب (۶۵۸) والمعاني للقتبي (۱۲۱۶) واللسان والتاج (ركع) ومجموعة المعاني ۱۲۳ في ثلاثة أبيات والبحر (۱: ۱۷۳) والعقد (۲: ۷۸).

ہیں اور ان کے ترک سے وہ باطل ہو جاتی ہیں۔

(ر م م)

الرَّمْمُ: (ن) کے معنی پوشیدہ چیز کی اصلاح اور مرمت کرنے کے ہیں رَمَمْتُ خاص کر بوسیدہ ہڈی کو کہا

جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ يُخِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ﴾ (۷۶-۷۸)
ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں گی تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔

﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ﴾ (۵۱-۵۲) جس چیز پر سے ہو کر وہ گزرتی ہے اسے پرانی ہڈی کی طرح (چورہ) کے بغیر نہ چھوڑتی۔
الرَّمْمَةُ: خاص طور پر بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے اور الرَّمْمُ: لکڑی، بھوسہ وغیرہ کے چورہ کو کہتے ہیں۔

رَمَمْتُ الْمَنْزِلَ: عمارت کی مرمت کرنا۔ جیسے تَفَقَّدْتُ (کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا) مشہور محاورہ ہے۔ (شکل)
(ادْفَعُهُ إِلَيْهِ بِرَمِيَّتِهِ) اسے کُلِّيَّةً اس کے سپرد کر دیجئے۔

الْأَرْمَامُ: اس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں اور
أَرَمْتُ عِظَامَهُ کے معنی ہڈیوں کا اس قدر بوسیدہ ہو کر
باریک ہو جانا کہ پھونکنے سے اڑ جائیں اور آواز نہ آئے
تَرَمَّرَمَ الْقَوْمُ کے معنی مہمل بڑبڑانے یا گھٹکے لئے
ہونٹ ہلا کر رہ جانے کے ہیں۔

الرَّمَانُ: (فعلان) اتار کو کہتے ہیں۔

(ر م ح)

الرَّمْحُ: کے معنی نیزہ کے ہیں اس کی جمع رِمَاحُ
آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

تہ بہ تہ بادل۔

الرُّكَّامُ: اوپر تلے رکھی ہوئی چیزیں جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ
يَجْعَلُهُ رُكَّامًا﴾ (۲۳-۲۴) پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا
ہے۔

اسی سے ریت کے ٹیلے اور لشکر کو بھی رُكَام کہا جاتا ہے اور
مُرْتَكَّمُ الطَّرِيقُ: شاہراہ کو کہتے ہیں جس میں
آمدورفت کے نشانات بکثرت ہوں۔

(ر ک ن)

رُكْنٌ: کسی چیز کی وہ جانب جس کے سہارے پر وہ
قائم ہوتی ہے استعارہ کے طور پر زور اور قوت کے معنی میں
استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ﴾
(۱۱-۱۸۰) اے کاش! (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی

طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔
اور رَكْنَتُ الْيُفْلَانِ أَرْكُنُ کے معنی کسی کی طرف
مائل ہونے کے ہیں۔ یہ فتح کاف کے ساتھ ہے مگر صحیح
رَكْنٌ يَرَكْنُ (ن) یا رَكْنٌ يَرَكْنُ (س) ہے۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ (۱۱-۱۱۳) اور
جن لوگوں نے ہماری نافرمانی کی ان کی طرف نہ جھکنا۔

نَاقَةٌ مُرَكَّنَةٌ الضَّرْعُ: بڑے تھنوں والی اونٹنی۔
لَهُ أَرْكَانٌ تُعْظَمُهُ: اس کی قوم اسے عزت کی نظر سے

دیکھتی ہے۔

السُّرُكُنُ: لگن۔ ثب اور أَرْكَانُ الْعِبَادَاتِ سے
عبادات کے وہ جوانب مراد ہوتے ہیں جو ان کا مبنی بنتے

(رمز)

الرَّمْزُ: (ن) ہونٹ کے ساتھ اشارہ کرنے یا ہلکی سی آواز کے ہیں۔ اور ابرو کے ساتھ اشارہ کرنے کو غمز کہا جاتا ہے۔ پھر استعارہ کے طور پر ہر وہ کلام جو اشارہ کی طرح ہو رَمَزٌ کہلاتی ہے۔ جیسا کہ شکایت کو غَمَزٌ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَيْتُكَ أَنْ لَا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمَزًا﴾ (۳۰-۳) نشانی (جو تم مانگتے ہو) یہ ہے کہ تین روز تک لوگوں سے بات نہ کرو مگر اشارہ سے۔

اور مَا أَرَمَّا زٌ کے معنی ہیں اس نے اشارہ سے بھی بات نہ کی اور كَتَبْتِيَّةٌ رَمَازَةٌ: بڑے لشکر کو کہتے ہیں کیونکہ بوجہ کثرت ازدحام کے اس میں آواز سنائی نہیں دیتی اور صرف اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔

(رمض)

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ (۲-۸۵) روزوں کا مہینہ یہ رَمَضٌ سے مشتق ہے جس کے معنی سورج کی سختی و تپش کے ہیں۔ اَرَمَضْنَهُ: سخت تپش نے اسے جھلس دیا۔ فَرَمَضَ چنانچہ وہ جھلسا گیا۔

أَرْضٌ رَمِيضَةٌ: سخت گرم سرزمین۔ رَمِيضَتِ الْغَنَمُ: سخت گرمی میں باہر چرنے کی وجہ سے بکریوں کے جگر زخمی ہو گئے۔

فُلَانٌ يَتَرَبَّضُ الطَّبَّاءَ: فلان سخت گرم جگہ میں ہرن کا شکار کرتا ہے۔

(رمی)

الرَّمْيُ: (ض) کے معنی پھینکنے کے ہیں یہ اجسام

﴿تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ﴾ (۵-۵۴) جہاں تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکیں۔

اور رَمَحَهُ کے معنی کسی کو نیزہ سے مارنے کے ہیں اور رَمَحَتُهُ الدَّابَّةُ: کے معنی جانور کے دوتی جھاڑنے کے ہیں۔ اَلرِّمَاحُ الرَّمِيحُ: ایک ستارے کا نام ہے۔ کیونکہ اس کے پیش پیش ایک دم دار ستارہ ہوتا ہے۔ جو دیکھنے میں نیزے جیسا معلوم ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔^①

أَخَذَتِ الْإِبِلُ رِمَاحَهَا: اونٹوں نے اپنے نیزے سنبھال لئے یعنی شیردار یا موٹا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو زخ سے بچالیا۔

أَخَذَتِ الْبَهْمِيُّ رِمَحَهَا: گھاس خاردار ہوگئی کیونکہ وہ بھی خاردار ہونے کی وجہ سے چرواہوں سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

(رمذ)

رَمَادٌ وَرَمْدَادٌ وَأَرَمْدٌ وَأَرَمْدَاءُ: (خاکستر)

راکھ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَسِرِمَادٍ اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ﴾ (۱۳-۱۸) گویا راکھ کا ڈھیر ہے جسے آندھی کے دن ہوا اڑا کر لے جائے۔

رَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کے بجھ کر راکھ بن جانے کے ہیں پھر استعارہ کے طور پر ہلاکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ هَمُودٌ کا لفظ مجازاً بمعنی ہلاکت آ جاتا ہے۔ اور رَمِدَ الْمَاءُ کے معنی پانی کے گدلا

ہو جانے کے ہیں۔ گویا اس میں راکھ ڈال دی گئی ہے اور

الْأَرَمْدُ: خاکستری رنگ کی چیز کو کہتے ہیں اور چھمکور رَمْدٌ

کہا جاتا ہے (جو اَرَمْدٌ کی جمع ہے) اور رَمَادَةٌ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔

① ویروی اسلحتھا المیدانی (۱: ۲۴)۔

مجھے کچھ خیرات دیجئے جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگی: هُنَّ سَافِيَةٌ رَهْبِيٌّ يَعْنِي يِهَابُ مِيرَى آسْتِينِ مِثْلِ ذَالِ دِجْتِجِ - (تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی رھب بمعنی آستین کے ہیں) لیکن پہلے معنی یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَعْبًا وَرَهْبًا﴾ (۲۱-۹۰) (ہمارے فضل کی توقع اور (ہمارے عذاب کے) خوف سے) ہمیں پکارتے رہتے ہیں۔

﴿تَرْهَبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ﴾ (۸-۶۰) اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھائے رکھو گے۔

اور آیت:

﴿وَاسْتَرْهَبُواهُمْ﴾ (۷-۱۱۶) اور ان کو دہشت میں ڈال دیا۔ میں استرہاب کے معنی دہشت زدہ کرنے کے ہیں۔

﴿وَأَيَّاءِ فَا رَهَبُونَ﴾ (۲-۴۰) اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور تَرْهَبٌ (تفعل) کے معنی تعبد یعنی راہب بننے اور عبادت میں خوف سے کام لینے کے ہیں اور فرط خوف سے عبادت گزاری میں غلو کرنے کو رَهْبَانِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُواهَا﴾ (۵۷-۲۷) اور رہبانیت (لذت دنیا کا چھوڑ بیٹھنا) جو انہوں نے از خود ایجاد کی تھی۔

اور رُهبان (صومعہ نشین لوگ) واحد بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی، جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی جمع رَهَابِيْنِ آتی ہے لیکن اس کی جمع رَهَابِيَّةٌ بنانا زیادہ

(مادی چیزیں) جیسے تیر اور پتھر وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَارَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ (۸-۱۷) اے پیغمبر! جب تو نے تیر چلائے تو تم نے تیر نہیں چلائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تیر چلائے۔

اور اقوال کے متعلق استعمال ہو تو ”قذف“ کی طرح اس کے معنی سب و شتم اور تہمت طرازی کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ﴾ (۲۳-۹) جو لوگ اپنی بیبیوں پر زنا کا عیب لگائیں۔

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ﴾ (۲۳-۴) جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔

محاورہ ہے: أَرَمَى عَلَيَّ مَائِدَةً: وہ سو سے زائد ہیں۔ خَرَجَ يَتْرَمِي: وہ نکل کر نشانہ بازی کرنے لگا۔

(ر ه ب)

الرَّهْبُ وَالرَّهْبَةُ: ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔ قرآن میں ہے:

﴿لَا تَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً﴾ (۵۰-۱۳) تمہاری بیعت تو (ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے) بڑھ کر ہے۔

﴿جَنَّا حَكَ مِنَ الرَّهْبِ﴾ (۲۸-۳۲) (اور دفع) خوف کے لئے اپنے بازو کھینچ لو۔

اس میں ایک قرأت رُهْب بضمہ الراء بھی ہے۔ جس کے معنی فزع یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔

مقاتل کہتے ہیں کہ میں رَهْب کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا۔ دریں اثناء کہ میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک اعرابی عورت آئی۔ اور اُس نے کہا ”اے اللہ کے بندے!

مناسب ہے۔

ذلیل کروں گا)

میں بعض نے رھط کے معنی اس چڑے کے لئے ہیں جو حائضہ عورتیں ایام ماہواری میں پہنا کرتی تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں رھط سے مراد وہ چھتڑا ہے جو حائضہ عورت جائے مخصوص میں رکھتی ہے۔ اور اسی سے مشہور محاورہ ہے: هُوَ اَذَلُّ مِنَ الرَّهْطِ وَهِيَضُ كَهِضِطْرَةٍ سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔

أَلَا رَهَابٌ: (افعال) کے اصل معنی اونٹوں کو خوف زدہ کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے ”رَهْبٌ“ ہے جس کے معنی لاغر اونٹنی (یا شتر نزوی وکلاں جث) کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔^۱

رَهْبُوتٌ خَيْرٌ مِنْ رَحْمُوتٍ: کہ رحم سے خوف بہت ہے۔

(رھط)

الرَّهْطُ: دس آدمیوں سے کم جماعت کو رھط کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق چالیس آدمیوں تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ﴾ (۲۷:۲۸) نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے۔

﴿وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ﴾ (۱۱:۱۹) اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔

﴿يَقَوْمٌ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ﴾ (۱۱:۹۲) میری قوم! کیا میری برادری کے لوگ تمہیں (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ عزیز ہیں۔

الرَّهْطَاءُ: جنگلی چوہے کا ٹیل اور اس کو رَهْطَةٌ بھی کہا جاتا ہے اور شاعر کے شعر^۲ (المتقارب)

(۱۹۲) أَجْعَلُكَ رَهْطًا عَلَيَّ حَيْضُ

(میں تجھے حیض والی عورتوں کا لٹہ بنا دوں گا یعنی نہایت

(رھق)

رَهْقَهُ (س) رَهْقًا أَلَا مُرٌ: کسی معاملہ نے اسے بزدل و جرد بالیا۔ اور رَهْقَهُ وَأَرْهَقَهُ: (مجرد و مزید فیہ) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں جیسے رَدَفَهُ وَأَرَدَفَهُ وَبَعَعَهُ وَأَبَعَعَهُ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرَاهُمْ ذَلَّةً﴾ (۱۰:۲۷) اور ان پر ذلت چھاری ہوگی۔

﴿سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا﴾ (۴:۱۷) ہم عنقریب اس کو عذاب سخت میں مبتلا کریں گے۔

اور اسی سے أَرَهَقْتُ الصَّلَاةَ ہے، جس کے معنی نماز کو آخر وقت تک مؤخر کرنے کے ہیں حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(رھن)

الرَّهْنُ: (گردی رکھی ہوئی چیز) اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی جائے۔ اور

۱ ای لان یفرق منک خیر من ان تحب راجع المیدانی ۳: ۷۷ رقم ۲۷۵۸ واللسان (رہب) وغریب القرآن للقتبی ۱۹ وفی الکامل ۱۷ رهبوتی اخیر لک من رحموتی .

۲ قاله ابو المنظم الهذلی وصدرة: متى ما أشاء غير زهو المملوك والبيت في اللسان (رھط زهو) والمقاييس (۲: ۴۵/۳: ۲۹) بغير عزو والمعاني الكبير (۱: ۴۸۴، ۵۹۳) والمشكل للقتبي (۱۱۹) في اربعة وتهذيب الالفاظ ۶۶۱ (باب الشياہ) وديوان الهذليين (۲: ۲۲۳- ۲۲۴) والشاعر من بني خزاعة بن سعد بن هذيل وترجمته في المؤلف (۲۷۷-۲۷۸) قال القتيبي في المعاني الرھط جلد يشق اسفله ويترك اعلاه فلبسه الصبيان وقد وكانوا في الحاهلية يطوفون عراة والنساء في ارهاط وهو شقة قدر ما بين الركبة الى السرة.

اس کے معنی بیجانہ کے طور پر کچھ سامان دے دینے کے ہیں۔ جو قیمت ادا کرنے تک بطور ضمانت بائع کے پاس رہتا ہے۔

(رہو)

الرَّهْوُ: ساکن چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَأَتْرَكَ الْبَحْرَ رَهْوًا﴾ (۲۳-۲۴) اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔

میں رَهْوُ کے معنی ساکن کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے راستہ کی کشادگی مراد ہے اور یہی معنی صحیح ہیں۔ اور اسی سے رَهَاءُ ہے جس کے معنی ہموار جنگل کے ہیں اور ہر وہ ہموار قطعہ زمین جہاں پانی جمع ہوتا ہوا سے رَهْوُ کہا جاتا ہے اسی سے ایک حدیث ہے۔

(۱۶۰) لَا شَفْعَةَ فِي رَهْوٍ کہ پانی کی گذرگاہ کی مشترک ہونے سے حق شفیع ثابت نہیں ہوتا۔

ایک اعرابی نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوئے اونٹ کو دیکھ کر کہا:

رَهْوٌ بَيْنَ سَنَامَيْنِ: کہ یہ دونوں بلند یوں کے درمیان رَهْوٌ یعنی کشادگی ہے۔

(روح ح)

الرَّوْحُ وَالرُّوْحُ: دراصل ایک ہی ہیں۔ رُوْحُ کا

اطلاق سانس پر ہوتا ہے۔ شاعر نے آگ کے متعلق کہا ہے۔ (طویل)

یہی معنی رِهَانٌ کے ہیں۔ لیکن رھان خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے اصل میں یہ دونوں لفظ مصدر ہیں جیسے رَهَنْتُ الرَّهْنَ وَرَاهَنْتُهُ رِهَانًا اور رَهَيْنُ وَمَرَّهُونٌ: صیغہ صفت ہیں اور رَهْنٌ کی جمع رِهَانٌ، رَهْنٌ اور رُهُونٌ آتی ہے۔ اور آیت:

﴿فَرِهَانَ مَقْبُوضَةً﴾ (۲-۲۸۳) تو کچھ رہن قبضہ میں رکھ لو۔

میں ایک قرأت رُهْنٌ بھی ہے۔ اور آیت: ﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ (۳۸-۷۳) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ رَهِيْنَةٌ فعلیل بمعنی فاعل سے ہے اور اس کے معنی ثابت اور قائم رہنے والی کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فعلیل بمعنی مفعول سے ہے اور اس کے معنی ہیں کہ ہر شخص اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکار ہے گا۔

پھر رَهْنٌ میں چونکہ جس (روکنے) کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے کبھی مجازاً رَهْنٌ بمعنی جس یعنی مطلق کسی چیز کو روکنے کے آجاتا ہے جیسا کہ آیت مذکور میں ہے۔ اور رَهَنْتُ فُلَانًا وَرَهَنْتُ عِنْدَهُ کے معنی کسی کے پاس گروی رکھنے کے ہیں اور ارادَتْهَنْتُ (اقتعال) کے معنی گروی لینے کے ہیں۔

اور آرَهَنْتُ (افعال) فی السِّلْعَةِ کے معنی بعض نے سامان تجارت کو گراں فروخت کرنا کئے ہیں۔ اصل میں

① قال الطبری (۲۵: ۱۲۱-۱۲۲) واولی الاقوال فی ذلك بالصواب ای الساکن.

② الحدیث فی الفائق (۳: ۱۲۲) وغریب ابی عبید (۳: ۱۲۱) وفی الصحاح (رہو) والتاج واللسان (رہا).

③ قاله ذولرمة وفی لسان العرب وحایبها وقت لها قیبة قدر ابدل واجعل لها الخ یقال وقت ضارک قیبة ای اطعمها والیبت من شواهد الطبری (۶: ۳۶) واللسان (قت، نفخ، حی) ودیوانہ ۲۴ من قصیدة له والمشکل للقتبی (۳۷۱) فی ثلاثة ابیات والبحر (۳: ۴۰۱).

موسوم کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا﴾ (۷۸-۷۸)

(۳۸) جس روز کہ روح (فرشتہ) اور دیگر ملائکہ صفیں باندھ کر کھڑے ہوں گے۔

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ﴾ (۷۰-۷۰) فرشتے اور جبریل علیہ السلام اس کی طرف چڑھتے ہیں۔

اور آیت: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ (۲۶-۱۹۳) اسے روح امین لے کر اترتا۔

میں روح امین سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور دوسری آیت میں جبریل علیہ السلام کو روح القدس بھی کہا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ﴾ (۲-۷۲) اس قرآن پاک کو روح القدس لے کر آتے ہیں۔

قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَرُوحٌ مِّنْهُ﴾ (۳-۱۷۱) وہ ایک روح تھی جو خدا کی طرف سے آئی۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کو روح اس لئے کہا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

اور قرآن پاک کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا﴾ (۲۲-۵۲) اس طرح ہم نے اپنے حکم سے (دین کی) جان (یعنی یہ کتاب) تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی۔

اس لئے قرآن پاک سے حیات اخروی حاصل ہوتی ہے جس کے متعلق فرمایا:

﴿وَأَنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (۲۹-۶۳)

اور دار آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

(۱۹۵) قُلْتُ لَهُ أَرَفَعَهَا إِلَيْكَ وَأَحْيَاهَا

بِرُوحِكَ وَأَجْعَلْ لَهَا قِيَمَةً قَدْرًا

تو میں نے کہا کہ اسے اٹھاؤ اور قدرے نرم پھونک مار کر اسے سلگاؤ اور اس میں تھوڑا سا ایندھن ڈال دو۔ اور سانس

بھی چونکہ روح کا ایک جزء ہے..... اس لئے مجازاً اسے روح کہہ دیا ہے۔ جیسا کہ نوع کو اسم جنس سے تعبیر کر لیتے

ہیں مثلاً: تَسْمِيَةُ الْإِنْسَانِ بِالْحَيَوَانِ: اور کبھی روح کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ زندگی حرکت،

منافع کا حصول اور مضرات سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ (۱۷-۸۵) اور تجھ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے

ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔ ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾ (۱۵-۲۹) اور میں

نے اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دی۔

میں روح کے یہی معنی مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافت ملک کے طور پر ہے جس سے اس کی شرافت کا اظہار مقصود ہے۔ جیسا کہ اللہ

تعالیٰ نے آیت کریمہ:

﴿وَوَهَبْنَا لِمُوسَىٰ إِسْرَافِيلَ﴾ (۲-۲۶۲) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿بِأَعْبَادِي الَّذِينَ أَنسَرَفُنَا﴾ (۳۹-۵۳) اے میرے بندو!

جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی۔

میں عباد کی نسبت بھی یا متکلم (ذات باری تعالیٰ) کی طرف اضافت تشریفی ہے۔

اور قرآن پاک میں ذوشرف ملائکہ کو بھی ارواح سے

الرِّيحُ کے معنی معروف ہیں۔ یعنی ہوا متحرک کو کہتے ہیں عام طور پر جن مواضع میں ارسال الرِّيح صیغہ مفرد کے ساتھ مذکور ہے وہاں عذاب مراد ہے اور جہاں کہیں لفظ جمع کے ساتھ مذکور ہے وہاں رحمت ۴ مراد ہے۔ چنانچہ ریح کے متعلق فرمایا:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا﴾ (۵۴-۱۹) ہم نے ان پر ایک زناٹے کی آندھی چلائی۔
﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا﴾ (۳۳-۹) تو ہم نے ان پر آندھی چلائی۔

﴿كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ﴾ (۳-۱۱۷) مثال اس ہوا کی ہے جس میں بڑی ٹھہری ہو۔
﴿اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ﴾ (۱۴-۱۸) اس کو سخت ہوا لے اڑی۔

اور رِيَاخ (جمع کا لفظ) کے متعلق فرمایا:

﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَّاحَ لَوَاقِحَ﴾ (۱۵-۲۲) اور ہم ہی ہوا کو چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی باردار کرتی ہے۔
﴿أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَّاحَ مُبَشِّرَاتٍ﴾ (۳۰-۳۶) کہ وہ ہواؤں کو اس غرض سے بھیجتا ہے کہ لوگوں کو بارش کی خوشخبری پہنچائیں۔

﴿يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ بُشْرًا﴾ (۷-۵۷) باران رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ لوگوں کو مینہ کی آمد

اور رَوْح (نفع الراء) کے معنی سانس کے ہیں اور آرَاحَ الْإِنْسَانُ کے معنی تنفس، یعنی سانس لینے کے اور آیت کریمہ:
﴿فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ﴾ (۵۶-۸۹) تو راحت اور رزق ہے۔ میں زیمان سے خوشبودار چیزیں مراد ہیں اور بعض نے رزق مراد لیا ہے اور کھانے کے اناج کو بھی ریمان کہتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ﴾ (۵۵-۱۲) اور ہر طرح کے اناج جو (بھوی کے) خول کے اندر ہوتے ہیں اور کھانے کا اناج۔

ایک اعرابی نے پوچھا گیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ تو اس نے جواب دیا: "أَطْلُبُ مِنْ رَيْحَانَ اللَّهِ" کہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں۔ لیکن اصل معنی وہی ہیں جو ہم پہلے بیان کئے ہیں۔ (یعنی خوشبودار چیز) ایک حدیث میں ہے: ﴿(۱۶۲) أَلْوَدُّ مِنَ رَيْحَانَ اللَّهِ﴾ کہ اولاد بھی اللہ کے ریمان سے ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ۴

(۱۹۶) يَا حَبَّذَا رِيحُ الْوَلَدِ
رِيحُ الْخِزَامِيِّ فِي الْبَلَدِ
اولاد کی خوشبو کیسی پیاری ہے یہ خزامی گھاس کی خوشبو ہے جو شہر میں مہکتی ہے اور اولاد کو ریمان اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے۔

① کلمة من حديث طويل راجع الفائق (۱: ۸۶) (حين) انكم لمن ريحان الله وفي (الحكيم عن نحوه بنت حكيم الولد من ريحان الجنة وفي

العيون (۳: ۹۴) والعقد (۲: ۴۳۸) الولد من ريحان الله راجع العراقي (۲: ۲۱۸) والطبراني في الصغير ۱۶۹ والفتح الرباني (۱: ۴۳۳).

② الاغرابيه كانت ترقص ولدها راجع ادب الدنيا والدين بشرحه لبخاز زاده والعيون (۳: ۹۴).

③ نسبة في الاتقان الي ابي ابن كعب يؤيده ماورد في الادعية المأثورة اللهم اجعلها رياحا ولا تجعلها ريحا (الفائق ۱: ۲۵۴) وقد رواه الخفاجي في شرح الدررة ۱۲۳-۱۲۴ ورد في القرآن خلافه ولسليمان الريح عاصفة (۱۴: ۱۸) وجرير بهم بريح طيبة (۱۰: ۲۲) وفي الحديث نصرت بالصباذي ريح الانبياء ۱۲.

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾
(۲-۱۸۸) اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔

(یعنی آسان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا حکم نہیں دیتا) (جس سے تم سختی میں مبتلا ہو جاؤ) اور کبھی ارادہ بمعنی قصد آتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۸-۸۳) وہ دنیا میں کسی طرح کی شہنی نہیں کرنا چاہتے۔

یعنی نہ اس کا قصد کرتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنا مطلوب بناتے ہیں پھر جس طرح یہ لفظ قوت اختیار یہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قوت تسخیری یعنی اضطراری اور غیر اختیاری امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ارادہ کا لفظ حیوانات اور جمادات دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں دیوار کے متعلق فرمایا:

﴿يُرِيدُ أَنْ يَنْفَضَّ﴾ (۱۸-۷۷) کہ وہ گرا چاہتی تھی۔ یعنی گرنے کے قریب تھی اور محاورہ ہے:
فَرَسِي تَرِيدُ التَّيْنَ: کہ میری گھوڑی بھوسہ کھانا چاہتی ہے۔

الْمُرَادُ: (مفاعله) یہ بھی رَادَ يَرُوذُ سے ہے اور اس کے معنی ارادوں میں باہم اختلاف اور کشیدگی کے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ کچھ ہو اور دوسرے کا کچھ اور رَاوَدْتُ فُلَانًا عَنْ كَذَا کے معنی کسی کو اس کے ارادہ سے پھسلانے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هِيَ رَاوَدَّتْنِي عَنْ نَفْسِي﴾ (۱۲-۲۶) اس نے مجھے میرے ارادے سے پھیرنا چاہا۔

﴿تُرَاوِدُهَا عَنْ نَفْسِهِ﴾ (۱۲-۳۰) وہ اپنے غلام

میں اونٹوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا کے ہیں پھر رونق کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: رَادَتْ الْإِبِلُ فِي مَشِيَّتِهَا يَرُوذُ رَوْدَانًا: اونٹ نرم رفتار چلے۔ اور اسی سے مَرُوذٌ ہے جس کے معنی سرمہ لگانے کی سلائی یا حلقہ لگام کے لوہا کے ہیں اور أَرُوذٌ يَرُوذُ (افعال) کے معنی ہیں نرمی کرنا اور اس سے رَوِيدًا (اسم فعل) ہے۔ جیسے رُوَيْدُكَ الشَّعْرُ بَغِيْبٌ: کل تک شعر کو مہلت دو یعنی اس پر غور کر لو۔

الْإِرَادَةُ: یہ رَادَ يَرُوذُ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادہ اصل میں اس قوت کا نام ہے جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھینچنا اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہیے یا نہیں بعد ازاں یہ کبھی دل کے کسی طرف کھینچنے کے لئے بولا جاتا ہے جو کہ ارادہ کا مبدأ ہے اور کبھی صرف منتهی کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی محض فیصلہ کے لئے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو منتهی کے معنی مراد ہوتے ہیں یعنی کسی کام کا فیصلہ نزوع نفس کا معنی مرا نہیں ہوتا کیونکہ ذات باری تعالیٰ خواہشات نفسانی سے مبرا ہے۔ لہذا أَرَادَ اللَّهُ كَذَا کے معنی ہوں گے۔ اللہ نے فلاں کلام کا فیصلہ کیا چنانچہ فرمایا:

﴿إِنْ أَرَادْتُمْ سُوءَ أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً﴾ (۳۳-۱۳) یعنی اگر خدا تمہاری برائی کا فیصلہ کرے یا تم پر اپنا فضل و کرم کرنا چاہے۔

اور کبھی ارادہ بمعنی امر کے آتا ہے مثلاً: أَرِيدُ مِنْكَ كَذَا کے معنی ہیں یہ کہ تجھے فلاں کام کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ جیسے فرمایا:

أَرَاضُهُمْ کے معنی ہیں ”اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا۔“
الرِّيَاضَةُ: کسی سے بکثرت کوئی کام لیجاتا کہ اسے اس
میں سدھاؤ اور مہارت پیدا ہو جائے۔ اسی سے رُضْتُ
الدَّابَّةَ ہے یعنی سواری کو سدھانا اور مطیع کرنا۔ اور أَفْعَلُ
كَذَا مَا دَامَتِ النَّفْسُ مُسْتَرَاضَةً کے معنی ہیں کہ
اس وقت تک یہ کام کرو جب تک نفس محنت کے قابل
رہے یا اس میں وسعت رہے اور یہ إِرَاضَةٌ يَارَوْضُ
سے مشتق ہوگا اور آیت کریمہ:

﴿فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ﴾ (۱۵-۳۰) میں رَوْضَةٌ
سے جنت کے سبزہ زار یعنی اس کے محاسن اور لذات مراد
ہیں اور آیت: ﴿فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ﴾ میں (صیغہ
جمع سے) ان ظاہری نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو آخرت
میں اصحاب جنت کے لئے تیار کی گئی ہیں اور بعض نے کہا
ہے کہ یہ ان علوم و اخلاق کی طرف اشارہ ہے جن میں
تخصّص حاصل کر لینے سے انسان کا دل پاکیزہ ہو جاتا
ہے۔

(رَوْع)

الرَّوْعُ: کے معنی خَلْدٌ یعنی دل کے ہیں جیسے

حدیث میں ہے۔^۱

(۱۶۴) إِنَّ رَوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي.....
کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔
اور رَوْعُ (بفتح الراء) خوف کے معنی میں استعمال ہوتا
ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ﴾ (۱۱-۷۷)

پھر جب ابراہیم علیہ السلام کے دل سے خوف دور ہوا۔

سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے درپے ہے۔

یعنی اسے اس ارادہ سے پھسلانا چاہتی ہے۔

﴿سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ﴾ (۱۲-۶۱) ہم اس کے باپ کو
اس سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔

(یعنی اسے آمادہ کریں گے کہ وہ برادر یوسف علیہ السلام کو
ہمارے ساتھ بھیج دے۔)

﴿وَلَقَدْ رَاوَدْتَهُ عَنْ نَفْسِهِ﴾ (۱۲-۳۳) بے شک
میں نے اس سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنا چاہا۔

(رَأْس)

الرَّأْسُ: سر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع رُؤُوسٌ

آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹-۴) اور سر بڑھا پے
(کی آگ) سے بھڑک اٹھا ہے۔

﴿وَلَا تَخْلِفُوا رُؤُوسَكُمْ﴾ (۲-۱۹۶) اپنے سر نہ
منڈاؤ۔ اور کبھی رَأْسٌ بمعنی رئیس بھی آتا ہے اور
أَرَأَيْتُمْ (اسم تفضیل) کے معنی بڑے سروالا کے ہیں اور
سیاہ سروالی بکری کو شاةٌ رَأْسَاءُ کہتے ہیں اور رِيَاسٌ
السَّيْفِ کے معنی ”دست شمشیر“ کے ہیں۔

(رَوْض)

الرَّوْضُ: اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی

جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ﴾ (۱۵-۳۰) باغ بہشت
میں ان کی خاطر دریاں ہورہی ہوں گی۔

اور پانی کے جمع ہونے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: أَرَاضٌ
الْوَادِي وَاسْتَرَاضٌ: وادی میں پانی وافر ہو گیا اور

۱ وفی الصحاح (تربع السراب) (ربع)۔

اور اصل میں اس کے معنی ہیں داؤ لگا کر کسی چیز کو حاصل کرنا اور علی (صلہ) کے لفظ سے معنی استیلاء کا اظہار مقصود ہے۔

(رؤم)

رُؤْمٌ: ایک مشہور قوم ہے۔ کبھی یہ لفظ رُؤْمِی کی جمع کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے جیسے عَجَمٌ وَعَجَوِیٌّ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الْمَ عُلْبَتِ الرُّؤْمِ﴾ (۳۰-۲۱) رومی مغلوب ہو گئے۔

(روی)

مَاءٌ رَوَاءٌ وَرَوِیٌّ: بہت زیادہ سیراب کرنے والے پانی کو کہتے ہیں اور رَوِیٌّ برون عدی اور سَوِیٌّ ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔^① (ربز)

(۱۲۲) مَنْ شَكَ فِی فَلَاحٍ فَهَذَا فَلَاحٌ
مَاءٌ رَوَاءٌ وَطَرِيقٌ نَهَجٌ
جسے مقام فلج میں شبہ ہو وہ دیکھ لے کہ یہی فلج ہے (یعنی سیراب کرنے والا پانی اور کھلا راستہ۔ اور آیت:

﴿هُمُ أَحْسَنُ أَثَانًا وَرِثِيًا﴾ (۱۹-۷۴) جن کے ساز و سامان اور جن کی (ظاہری) رواداری ان سے کہیں عمدہ تھی۔

جو لوگ اسے مہوز نہیں بناتے ان کے نزدیک رَوِیٌّ سے

مجاورہ ہے: رُغْتُهُ وَرَوَعْتُهُ: خوف زدہ کرنا، گھبرادینا۔ نَاقَةٌ رَوَعَاءٌ: ڈرپوک اونٹنی۔

أَرْوَعٌ: وہ چیز جو اپنے حسن و جمال سے دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دے گویا خوف زدہ کر رہی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔^②

(۱۹۸) يَهْوُلُكَ إِنْ تَلَقَّاهُ فِي الصَّدْرِ مَحْفَلًا:

کہ محفل میں اس سے ملاقات کرے تو دل میں ہول پیدا کر دے۔

(روغ)

الرَّوْعُ: کے معنی کسی حیلہ اور تدبیر کی خاطر ایک جانب مائل ہونے کے ہیں اسی سے رَاغُ الشَّعْلَبِ (ن) رَوَعَانًا ہے: یعنی لومڑا قریب دی کے طور پر ادھر ادھر جانا اور کج راستہ کو رائغ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے پیچ و خم سے فریب دے رہا ہے۔

رَاوَعٌ فُلَانٌ فُلَانًا: کسی سے فریب کھیلنا۔

اور رَاغٌ فُلَانٌ إِلَى فُلَانٍ کے معنی ہیں فلاں کی طرف اس طرح لوٹنا کہ اپنا مقصد حیلے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهِمْ﴾ (۵۱-۲۲) پھر وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچا۔

﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ﴾ (۳۷-۹۳) تو بڑی قوت سے ان کے مارنے کے لئے مائل ہوئے۔

① راجع للحديث اللالی ۴۰۸ واللسان وشرح السنة من رواية عبدالله بن مسعود والعسكري حنی الامثال والغزالی فی الاحیاء وفی رواية روح الامین قال العراقی فی تخریج الاحیاء اخرجہ ابن ابی الدنیا فی القناعة والحاکم (۳: ۳۳۸) وکنز العمال (۴: ۱۱۷-۱۱۹) لم اجدہ ویرجی ۱۲۔

② البیت لراجر من بنی العنبر من تمیم والفلاح ماء لهم قاله فی البلدان و ابو عبیدة البکری فی معجمه (رسم للبحر) ومحازالقران لابی عبیدہ (۱: ۱۶۸) والبیت فی السحاو ندی (۱: ۱۴۴) بغير عزو ۱۲۔

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ﴾ (۲-۲۵) اگر تم کو (قیامت کے دن) پھر جی اٹھنے میں کسی طرح کا شک ہو۔ اور آیت:

﴿فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا﴾ (۲-۲۳) (اگر تمہیں) مِمَّا نَزَّلْنَا میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔ اور آیت:

﴿رَيْبَ الْمُنُونِ﴾ (۵۲-۳۰) گردش زمانہ (کا انتظار کرتے ہیں)۔

گردش زمانہ کو رَيْب کہنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے وقوع میں شک و شبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے انہیں رَيْب کہا ہے کہ ان کے تعین اوقات میں انسان متردد رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے لہذا انسان نفس گردش کے وقوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے تعین اوقات کے لحاظ سے ہمیشہ رَيْبِ الْمُنُونِ میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی بناء پر شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۱۹۳) النَّاسُ قَدْ عَلِمُوا أَنْ لَا بَقَاءَ لَهُمْ

لَوْ أَنَّهُمْ عَلِمُوا مِقْدَارَ مَا عَلِمُوا

کہ لوگوں کو اس بات کا تو یقین ہو چکا ہے کہ ان کے لئے بقا نہیں ہے کاش انہیں اس کا وقت بھی معلوم ہوتا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔^۲

(۱۹۴) أَمِنَ الْمُنُونُ وَرَيْبَهَا تَوَجَّعَ

کہ کیا تو زمانہ اور اس کی گردشوں پر جزع فزع کرتا ہے

مشتق ہے اور خوبصورت کو ریٰ اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ حسن سے پر ہے۔ لیکن اگر اسے مہوز پڑھا جائے تو رِئِبًا سے مراد وہ چیز ہوگی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھتی ہوں بعض کے نزدیک بغیر ہمزہ کے بھی رُؤِيَّةٌ سے مشتق ہے اور ریٰ کے معنی منظر (ظاہری حالت) کے ہیں اور اسی سے رِوَاءٌ (خوش نمائی) ہے۔

لیکن بعض نے کہا ہے کہ رِوَاءٌ میں قلب ہوا ہے اور یہ رَأَيْتُ سے مشتق ہے۔ ابوعلی القسوی کہتے ہیں کہ لفظ مَرُوءَةٌ بھی حَسُنَ فِي مِرَّةِ الْعَيْنِ كَذَا: (ظاہر دیکھنے میں خوبصورت ہے) سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ مِرَاءَةٌ میں میم زائد ہے اور مَرُوءَةٌ بروزن فَعُولَةٌ ہے۔ اور اس میں میم اصلی ہے اور أَنْتَ بِمَرِيءٍ وَمَسْمَعٍ کے معنی ہیں کہ تم اس قدر میرے قریب ہو کہ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ اور تمہاری بات سن سکتا ہوں۔

بعض یاء کو حذف کر کے أَنْتَ مِنِّي مَرَأَى وَمَسْمَعٌ بولتے ہیں اور مَرْتَى بروزن مَفْعَلٌ ہے اور رَأَيْتُ سے ماخوذ ہے۔

(ری ب)

رَأْبِخِي كَذَا وَأَرَابِي کے معنی ہیں فلاں معاملہ نے مجھے رَيْب میں ڈال دیا اور رَيْب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہو مگر بعد میں اس توہم کا ازالہ ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

۱ قاله ديك الحن راجع المحاضرات للمؤلف (۴: ۴۹۱)۔

۲ قاله ابو ذؤيب الهذلي في مطلع رثاء نبيه راجع الانصاف ۷۶ وخاص بيتاً وتمايم البيت والدهر ليس بمعتب من يجزع والبيت في الاستيعاب ۶۶۷ والاعناني (۶: ۹۵) والحيزانة (۱: ۲۰۲) والسيوطي (۹۲) والبيهقي (۳: ۴۹۳) والعقد (۲: ۱۵) والاصابة (۴: ۴۵۴) واسد الغابة (۵: ۱۹۰) رقم (۲۵۰۷) ومحازات القران لرضي (۲۸۳) وتهذيب الالفاظ ۴۵۴ ونظام الغريب ۲۳۰ وشواهد المغني (۲: ۴۷۲) واضداد ابي الطيب ۶۲۳ وشرح السبع لابن الانباري ۴۶ والبحر (۷: ۴۹۴)۔

میں شک و شبہ نہ ہو۔

اور گردش زمانہ کو رَيْبُ الدَّهْرِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فریب کاری کا وہم ہوتا ہے (کَمَا مَرَّ) اور رَيْبَةُ رَيْب سے اسم ہے جس کے معنی شک و شبہ کے ہیں (جمع رَيْبُ) قرآن پاک میں ہے:

﴿بَسَنُوا رَيْبَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (۹-۱۱۰) کہ وہ عمارت ان کے دلوں میں رَيْبَةَ بنی رہے گی۔

یعنی ہمیشہ ان کے دلی کھوٹ اور خلجان پر دلالت کرتی رہے گی۔

(ری ش)

www.KitaboSunnat.com

رَيْشُ الطَّائِرِ: پرند کے پروں کو کہتے ہیں اور کبھی یہ لفظ خصوصیت کے ساتھ بازوؤں کے پروں پر بولا جاتا ہے اور چونکہ پرند کے پر اس کے لئے بمنزلہ لباس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے استعارہ کے طور پر یہ لفظ لباس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرِيْشًا وَّ لِيَاسُ التَّقْوٰى﴾ (۷-۲۶) اور موجب زینت اور پرہیزگاری کا لباس۔

عام محاورہ ہے:

أَعْطَاهُ إِسْلَامًا بِرَيْشِهَا: اسے سامان سمیت اونٹ دے دیئے۔ یعنی مال و متاع سمیت جو ان کے اوپر تھا۔

اور رَيْشُ السَّهْمِ أَرِيْشُهُ رَيْشًا کے معنی تیر کو پر لگانے کے ہیں اور تیر پر نہادہ کو مَرِيْشٌ (کمیج) کہتے ہیں پھر

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَفِي سَلَكٍ مِنْهُ مُرَيْبٌ﴾ (۱۱-۱۰) قرآن پاک کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جس نے انہیں حیران کر رکھا ہے۔

﴿مُعْتَدٍ مُرَيْبٍ﴾ (۵۰-۲۵) حد (عبودیت) سے بڑھے ہوئے اور شک و شبہ پیدا کرنے والے (کی اطاعت مت کر)

اور اَرَاتِيَابٌ (احتمال) اَرَابَةٌ کے ہم معنی ہے جس کے معنی شک و شبہ میں پڑنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿أَمْ اَرْتَابُوْا اَمْ يَخَافُوْنَ﴾ (۲۳-۵۰) یا شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں۔

﴿وَتَرَبَّصْتُمْ وَاَرْتَبْتُمْ﴾ (۵۷-۴) اور اس بات کے منتظر رہے (کہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو) اور (اسلام کی طرف سے) شک میں پڑے ہوئے۔

اور مومنین سے اریتیب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا يَرْتَابُ الَّذِيْنَ اٰتُوْا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (۴۲-۳۱) اور اہل کتاب اور مسلمانوں (ان باتوں میں کس طرح کا) شک و شبہ نہ لائیں۔

﴿ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ (۴۶-۱۵) پھر کسی طرح کا شک و شبہ نہیں کیا۔

ایک حدیث میں ہے: ﴿(۱۶۱) دَعَّ مَآئِرِيْبِكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ﴾ کہ شک و شبہ چھوڑ کر وہ کام کرو جس

① الحدیث بطولہ رواہ الترمذی فی آخر الطب و الحاکم فی الاحکام و البیوع و الطیرانی و البزار من حدیث الحسن بن علی و طس عن عمرو النسانی عن الحسن بن علی و ابن حبان فی زوائدہ رقم ۵۱۲ عن الحسن و الحدیث بطرقة و اختلاف الفاظہ فی کنز العمال (۲۴۵: ۲۴۶) و الکاف الشاف لابن حجر رقم ۱۷ و الفتح الباری (۴: ۲۳۴).

(رین)

الرَّيْنُ: اس رنگ کو کہتے ہیں جو کسی صاف چیز پر لگ جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَأَلَّا بَلَّ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ (۸۳-۱۴) نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر رنگ بیٹھ گیا ہے۔

یعنی ان کے مجلی قلوب پر رنگ بیٹھ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتے۔ شاعر نے کہا ہے۔ (البیض) (۱۹۹) إِذَا رَانَ النُّعَاسُ بِهِمْ

جب نیند نے ان پر غلبہ پایا۔

رَيْنَ عَلَى قَلْبِهِ: اس کے دل پر رنگ بیٹھ گیا۔

(رؤف)

الرَّأْفَةُ: یہ رَوْفَ (ک) سے ہے اور اس کے معنی شفقت اور رحمت کے ہیں صفت کا صیغہ رَوْفٌ اور رَيْفٌ مثل حَذِرٌ وَيَقِظُ آتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ﴾ (۲۴-۲)

اور اللہ کے حکم (کی تعمیل) میں تم کو ان کے حال پر کسی طرح کا ترس دامن گیر نہ ہو۔

(رؤی)

رَأَى: یہ مہوز العین اور ناقص یائی ہے کیونکہ اس سے اسم مشتق رُؤْيَةٌ آتا ہے چنانچہ اسی سے شاعر نے قلب

استعارہ کے طور پر اصلاح امر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لَهْدَارِ شَتُّ فُلَانًا فَارَعَا شَہ کے معنی ہیں: میں نے اس کی اصلاح کی تو اس کی حالت سدھر گئی۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۱۹۷) فَرَّ شَنِئِي بِحَالٍ طَالَمَا قَدْ بَرَّيْتَنِي
فَخَيْرُ الْمَوَالِي مَنْ يَرِيئُ وَلَا يَبْرِي
مجھے عرصہ دراز تک تم نے تراشا ہے کبھی تو میری اصلاح کیجئے۔ بہتر موالی وہ ہیں جو بگاڑتے نہیں بلکہ سنوارتے

ہیں۔

اور نیزہ کے پر سے کمزوری کے معنی کے تصور کی بنا پر کمزور معنہ معاورہ ہے: نیزہ کو رُمحِ راش کہہ دیتے ہیں۔

(ریع)

الرَّيْعُ: بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ جو دور سے ظاہر ہو اس کا واحد رَيْعَةٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿أَتَبْنُونُ بِكُلِّ رَيْعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ﴾ (۲۶-۲۸) کیا تم ہر اونچی جگہ پر بے ضرورت یادگاریں بناتے ہو۔ اور معنی ارتفاع کے لحاظ سے کنویں کی منڈیر کو رَيْعٌ کہا جاتا ہے پھر ہر چیز کے اوائل کو رَيْعَانٌ کہا جاتا ہے۔ اور استعارہ کے طور پر رَيْعٌ ہر چیز کے زائد حصہ اور بلندی کے لئے آتا ہے اور اسی سے تَرَيَعُ السَّحَابُ ہے جس کے معنی بادل کے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

① قاله سويد بن الصامت الانصاري لكامل في قومه راجع السيرة (۲: ۶۷) والاساس (۱: ۳۸۸) والاصابة () والعيون (۳: ۸۱) في اربعة ابيات وفي اللسان (نشر) في ستة ولسيه لمعر بن حباب قال احد مصححيه عبارة شارح القاموس قال سويد الانصاري هو الصواب ۱۲.

② قطعة من البيت قاله عبدة بن الطيب من كلمة مفضلية (۱: ۱۳۹) وتكلمته: اور دته القوم..... فقلت اذ انكحوا امن حمة قبلوا والبيت في الامالي (۱: ۲۷۰) والوسط ۶۰۵ والمفضليات وفي المطبوع اذا ابدل قد مصحف والتصويب من المراجع.

نے خدا پر جھوٹ بولا۔

کر کے کہا ہے۔

اور آیت:

(۲۰۰) وَكُلُّ خَلِيلٍ رَأَىٰ فُھُو قَائِلٌ

﴿فَسَيَّرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ﴾ (۹-۱۰۵) اللہ تعالیٰ بھی

مِنْ أَجْلِكَ هَذَا هَامَةٌ الْيَوْمِ أَوْ عَدِ

تمہارے کردار کو دیکھے گا۔

جو دوست مجھے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ بد حالی تمہاری وجہ سے ہے اور یہ آج یا کل مر جائے گا۔

میں اللہ تعالیٰ کے علم کو آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی طرح

اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کر کے تَسْرَى ، يَسْرَى اور

قرار دے کر يَسْرَى کا لفظ لایا گیا ہے ورنہ آنکھ سے دیکھنا

تَسْرَى کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

اللہ تعالیٰ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔

﴿فَأَمَّا تَرِينَ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا﴾ (۱۹-۲۶) اگر کوئی

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ کہ

وہ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھ لیتا ہے کہ تم

آدمی نظر پڑے۔

ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

اور آیت کریمہ:

(۲) وہم وخیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے: أَرَىٰ أَنْ

﴿أَرَانَا الَّذِينَ أَضَلْنَا مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ﴾ (۴۱-)

زَيْدًا مُنْطَلِقٌ مِيرَاخِيال ہے کہ زید جا رہا ہوگا۔ قرآن

(۲۹) شیطان اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ایک نظر

پاک میں ہے:

ان کو ہمیں بھی تو دکھاؤ۔

﴿وَلَوْ تَسْرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۸-۵۰)

میں ایک قرأت آنا بھی ہے۔

اور کاش تم اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ جب فرشتے

الرُّؤْيَةُ: کے معنی کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا کے ہیں

کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کے اعتبار سے رُؤْيَةُ کی

(۳) کسی چیز کے متعلق نظرا اور اندیشہ محسوس کرنا جیسے

چند قسمیں ہیں۔

فرمایا:

﴿إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ﴾ (۸-۴۹) میں دیکھتا ہوں

(۱) حاسہ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا جو حاسہ بصر

جو تم نہیں دیکھتے۔

کے ہم معنی ہے جیسے قرآن پاک میں ہے: ﴿لَتَرَوُنَّ

(۳) عقل و بصیرت سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے فرمایا:

الْجَحِيمِ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾ (۱۰۲-۶) تم

﴿مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى﴾ (۵۳-۱۱) پیغمبر نے جو

ضرور دروزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے (اگر دیکھو

دیکھا تھا اس کے دل نے اس میں کوئی جھوٹ نہیں ملایا۔

گے بھی تو غیر مشتبه) یقینی دیکھنا دیکھو گے۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ﴾

(۳۹-۶۰) اور تم قیامت کے روز دیکھو گے کہ جن لوگوں

۱ قاله كثير عزة يخاطب حبيته والبيت في اللسان (رى) هوم وامالي ابن الشحرى (۲: ۱۹) والکامل ۲۲۶-۱۱۳ والبحر (۶: ۲۱۱) واستشهد القلب في الكتاب (۲: ۱۳۰) وفي مصارع الشاق ۷۶ مثله ليدوقف على قبر جارية يقول وهناك وفيه عليل بدل خليل ۱۲.

﴿وَأَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ﴾ (۱۸-۶۳)
آپ نے یہ بھی دیکھا کہ جب ہم (دریا کے کنارے) اس
پتھر کے پاس ٹھہرے۔

ان تمام آیات میں تشبیہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔

رَأَى: غلبہ ظن کی بنا پر کسی معاملہ کے دو متناقض پہلوؤں
میں سے کسی ایک کی صحت کا یقین کر لینا رائے کہلاتا ہے
اور آیت کریمہ:

﴿يَسْرُونَهُمْ وَمِثْلَهُمْ رَأَى الْعَيْنِ﴾ (۳-۱۱۳) جن کو
آنکھوں دیکھتے مسلمانوں کا گروہ اپنے سے دو چند دکھائی
دے رہا ہے۔

میں ”يَسْرُونَ رَأَى“ سے مشتق ہے جس کے معنی گمان
کرنے کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ عینی مشاہدے کی رو سے وہ
انہیں اپنے سے دو چند خیال کرتے تھے جیسے کہا جاتا ہے:

فَعَلَ ذَلِكَ رَأَى عَيْنِي أَوْ رَأَاهُ عَيْنِي كَمَا اس نے
یہ کام میرے سامنے کیا ہے۔

الرَّوِيَّةُ وَالتَّرْوِيَّةُ کے معنی کسی چیز پر غور و فکر کرنے اور
ایک رائے اختیار کرنے کے لئے یکسوئی سے اس کی طرف
توجہ دینے کے ہیں۔ اور الْمُرْتَبِيُّ وَالْمُرْوِيُّ بمعنی
متفکر ہے اور رَأَيْتُ متعدی بہ الیٰ ہو تو اس کے معنی کسی
چیز کی طرف اس طرح نظر ڈالنے کے ہیں کہ اس کے
بعد انسان کو عبرت حاصل ہو جیسے فرمایا:

﴿الْمُ تَرَأَى رَيْتِكَ.....﴾ (۲۵-۲۵) (۱- پیغمبر) کیا

تو نے اپنے پروردگار کی (قدرت کی) طرف نظر نہیں کی۔

اور آیت: ﴿بِمَا آرَأَكَ اللَّهُ﴾ (۳-۱۱۵) میں آری
(افعال) بمعنی تعلیم کے ہے یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے
تمہیں سکھایا ہے۔

﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَى﴾ (۵۳-۱۳) ایک دفعہ اور
بھی (اصلی صورت پر) دیکھا۔

اور رائی کے جب دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنی
ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَيَرَى الَّذِينَ أُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (۳۴-۱۶) اور اے پیغمبر!
جن لوگوں کو صحف آسمانی کا علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں۔

﴿إِنْ تَرَنَا أَقْلَ مِنْكَ﴾ (۱۸-۳۹) اگر مال اور

اولاد کے اعتبار سے تو مجھ کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔ اور
آرَأَيْتَ (ہمزہ استفہام) أَخْبِرْنِي کے قائم مقام ہوتا

ہے اور اگر اس پر کاف (ضمیر خطاب) داخل ہو۔ تو حالت
تشبیہ، جمع اور تانیث میں تاء کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا

ہے اور ان حالتوں میں تاء کی بجائے کاف میں حسب
مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿أَرَأَيْتَكَ هَذَا الَّذِي﴾ (۱۷-۶۲) بھلا بتائیے یہی
وجہ ہے۔

﴿قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ﴾ (۶-۲۰) اے پیغمبر! ان سے پوچھو کہ
بھلا دیکھو تو سہی۔

﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى﴾ (۹۶-۹) (۱- پیغمبر) تم
نے اس شخص کے حال پر (بھی) نظر کی جو منع کرتا ہے۔

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ﴾ (۳۶-۴) (۱- پیغمبر)
ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ جن کو تم (اللہ کے

سوا) پکارتے ہو۔
﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ.....﴾ (۲۸-۹۰) اے پیغمبر!

ان سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اللہ تعالیٰ لے آئے۔
﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ﴾ (۳۶-۱۰) (۱- پیغمبر) ان

لوگوں سے) کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر یہ ہو۔

یعنی جب وہ باہم اس طرح آمنے سامنے ہوئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور اسی سے وہ حدیث ہے جس میں

فرمایا: ❶

(۱۶۶) لَا يَتْرَأَى نَارُهُمَا كَأَنَّ كَرَامًا
نظر نہ آئے محاورہ ہے:

مَنَازِلُهُمْ رِثَاءٌ كَرَامًا كَمَا كَرَامَاتُ بَاهِمٍ مُتَقَابِلٍ هِيَ -
فَعَلَّ ذَٰلِكَ رِثَاءَ النَّاسِ: اس نے نمودار اور دکھاوے کے لئے یہ کام کیا۔

یہ رأیت سے مفعلة کے وزن پر ہے جیسے صَحَفْتُ سے مَصْحَفَةٌ اور اس کی جمع مَرَائِي آتی ہے۔

الرِّثَةُ پھینچنا۔ اس کی جمع مِنْ لَفْظِهِ رِثَوْنٌ آتی ہے۔ اس پر ابوزید نے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔ ❷

(۱۲۱) حَفِظْنَا هُمُوًّا حَتَّىٰ آتَى الْغَيْظُ مِنْهُمْ
قُلُوبًا وَأَكْبَادًا لَهُمْ وَرِثِينًا

ہم نے انہیں غصہ دلایا حتیٰ کہ غیظ و غضب ان کے دل و جگر اور پھینچدوں میں سرایت کر گیا۔

اور اسی سے رِثَةٌ ہے جس کے معنی پھینچنے پر مارنے کے ہیں۔



الرَّيَّةُ اس علامت کو کہتے ہیں جو دیکھنے کے لئے نصب کی گئی ہو اور محاورہ ہے:

مَعَ فُلَانٍ رَيْيٌ مِّنَ الْجِنِّ: یعنی وہ آسیب زدہ ہے۔
أُورِزْتُ السَّاقَةَ فِيهِ مُرَّةٌ: اونٹنی کا حاملہ ہونا ظاہر ہو جانا۔

الرُّؤْيَا بمعنی خواب کے ہیں اور یہ ہمزہ کے ساتھ بروزن فُعْلَى ہے اور کبھی ہمزہ کو حذف کر کے واو کے ساتھ

الرُّؤْيَا کہہ دیتے ہیں ایک حدیث میں ہے۔ ❶
(۱۶۵) لَمْ تَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النَّبِيِّ إِلَّا الرُّؤْيَا
کہ مبشرات نبوت سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ﴾ (۳۸)۔

(۲۷) بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعی سچا خواب دکھایا تھا۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ﴾
(۱۷-۶۰) اور خواب جو ہم نے تم کو دکھایا تھا تو بس اس کو

لوگوں (کے ایمان) کی آزمائش (کا ذریعہ) ٹھہرایا۔

﴿فَلَمَّا تَرَأَى الْجَمْعَانَ﴾ (۸-۳۷) پھر جب

دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔

❶ رواہ ابو داؤد باب علی ما یقال للمشركون من حدیث جریر بن عبد اللہ والنسائی فی باب القود بغیر حدیثه مرسلًا والحدیث فی اللہی ۵۷ وانظر لتخریجه الکافی الشاف لابن حجر ۵۵ وتخریج العراقی علی الاحیاء (۱۶۹:۲) والفاقی (۲۱۹:۱) وغریب ابی عیید ۱۲.

❷ البیت فی اللسان (رای) بغیر عزوفیه فعضناهم بدل حفظناهم.

❸ رواہ ابو داؤد فی باب الدعاء فی الركوع والسجود من حدیث ابن عباس وفیه الرؤیا الصالحة راجع العون (۱:۳۲۷) والحدیث ایضاً رواہ مسلم (۱:۱۹۱) طبع هند والنسائی وابن ماجه ۱۲.

کتاب الزاء

اور ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط میں لکھی ہوئی ہو اسے زُبُور کہا جاتا ہے لیکن عرف میں زبور کا لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے مخصوص ہو چکا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَآتَيْنَا دَاوُدَ زُبُورًا﴾ (۱۶۳-۴) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ (۱۰۵-۹) اور ہم نصیحت (کی کتاب یعنی توراہ) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

اس میں ایک قرأت زُبُور (بضم زاء) بھی ہے جو یا تو زُبُور بفتح الزاء کی جمع ہے، جیسے ظریف کی جمع ظُرُوف آجاتی ہے اور یا زُبُر (بکسرہ زاء) کی جمع ہے۔ اور زبور گواصل میں مصدر ہے لیکن بطور استعارہ اس کا اطلاق کتاب پر ہوتا ہے جیسا کہ خود کتاب کا لفظ ہے کہ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے پھر جس طرح کتاب کی جمع کتب آتی ہے اس طرح زُبُر کی جمع زُبُور آجاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ زبور کتب الہیہ میں سے ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس پر واقفیت دشوار ہو۔

قرآن میں ہے:

﴿وَأَنَّهُ لَنَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ﴾ (۱۹۶-۲۶) اس میں شک نہیں کہ یہ (یعنی اس کی پیشین گوئی) اگلے پیغمبروں کی

(ز ب د)

الزَّبْدُ: جھاگ کو کہتے ہیں اور اَزْبَدَ الْمَاءُ کے معنی ہیں: پانی کے اوپر جھاگ آ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾ (۱۳-۱۷) سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے۔

پھر محض رنگ میں مشابہت کی وجہ سے مسکے کو بھی زَبْد کہا جاتا ہے اور زَبْدَتُهُ زَبْدًا کے معنی ہیں ”میں نے اسے جھاگ کی طرح بکثرت مال دیا“ یا ”میں نے اسے مسکے کھلایا“

الزَّبَادُ: پھول یا کھلی جو جھاگ کی طرح سفید ہوتی ہے۔

(ز ب ر)

الزَّبْرَةُ: لوہے کی بڑی سل کو کہتے ہیں اور اس کی جمع زُبُر آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أُتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ﴾ (۱۸-۹۶) (اچھا) لوہے کی سلیں ہم کو لا دو۔

اور کبھی زُبْرَةُ کا لفظ بالوں کے گچھا پر بولا جاتا ہے اس کی جمع ”زُبُر“ آتی ہے اور استعارہ کے طور پر پارہ پارہ کی ہوئی چیز کو زُبُر کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا﴾ (۲۳-۵۳) پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ کر کے اپنا (اپنا) دین جدا جدا کر لیا۔

زَبْرَتُ الْكِتَابِ: میں نے کتاب کو موٹے خط میں لکھا

① ہو مستعار من زبرت الفضة وقال قتادة ومجاهد الزبر بمعنى الكعب جمع زبور راجع تفسير الكشاف (ص ۶۶ ج ۲ معالم ج ۳ ص ۵۲)۔

(زج ر)

الزَّجْرُ: اصل میں آواز کے ساتھ دھکانے کو کہتے ہیں۔ زَجْرَتُهُ: میں نے اسے جھڑکا، روکا۔

انزَجَرَ: (جھڑکنے پر) کسی کام سے رک جانا۔ یہ زَجَرَ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا﴾ (۲۳۷) میں زَاجِرَات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ڈانٹ کر چلاتے ہیں۔ اور آیت: ﴿فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ﴾ (۱۳: ۷۹) اور قیامت تو ایک ڈانٹ ہے۔

﴿مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ﴾ (۴-۵۴) جس میں (کافی) تشبیہ ہے۔ میں مُزْدَجَرٌ سے ایسی باتیں مراد ہیں جو ارتکاب معاصی سے روکتی اور سختی سے منع کرتی ہیں۔ اور آیت: ﴿وَأَزْدَجِرُ﴾ (۹-۵۴) اور اسے جھڑکیاں دی گئیں۔ کے معنی ہیں: ڈانٹ کر نکال دیا گیا۔ یہاں زجر کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مار بھگانے کے وقت تہدید آمیز کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے جا چلا جا، دور ہو جا وغیرہ۔

(زج و)

الْتَّزْجِيَّةُ کے معنی کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تاکہ چل پڑے مثلاً: پیچھلے سوار کا اونٹ کو چلانا یا ہوا کا بادلوں کو چلانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يُزْجِي سَحَابًا﴾ (۲۴-۴۳) (اللہ ہی) بادلوں کو ہنکاتا ہے۔ ﴿يُزْجِي لَكُمْ الْفُلْكَ﴾ (۱۷-۶۶) جو تمہارے لئے (سمندروں میں) جہازوں کو چلاتا ہے۔ اور اسی سے کہا جاتا ہے کہ رَجُلٌ مُزْجِيٌّ: ہنکایا ہوا آدمی۔ یعنی کمزور اور ذلیل آدمی۔

کتابوں میں موجود ہے۔

﴿وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ﴾ (۳-۸۳) اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔

﴿أَمْ لَهُمْ بَرَائَةٌ فِي الزُّبُرِ﴾ (۵۴-۴۳) یا تمہارے لئے صحیفوں میں معافی (لکھی ہوئی) ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف حکم عقلیہ پر مشتمل ہو اور اس میں احکام شرعیہ نہ ہوں۔ اور الکتاب ہر اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو احکام و حکم دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد نَبِيًّا کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔

زَبْرُ الثُّوبِ: کپڑے کا راول۔ اسی سے کہا جاتا ہے: هَاجَ زُبَيْرُهُ: وہ غصہ سے بھڑک اٹھا۔ اور بڑے کندھوں والے شخص کو اَزْبُرٌ کہا جاتا ہے۔

(زج ج)

الزُّجَاجُ: ایک قسم کا شفاف پتھر (شیشہ) اس کا مفرد زُجَاجَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فِي زُجَاجِيَّةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ (۲۴-۳۵) ایک شیشہ میں ہے (اور) شیشہ گویا چمکتا ہوا تارا ہے۔

الزُّجُجُ: نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ جمع زُجَاجُ اور زَجَجْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں: میں نے اسے نیزہ کی نوک سے مارا۔ اَزَجَجْتُ الرَّفْعَ: میں نے نیزہ میں زج لگائی یا اس سے زج کو نکال لیا۔

الزُّجُّجُ: ابرو کی درازی اور باریکی جو نیزہ کی انی کے مشابہ ہو۔ ظَلِيمٌ اَزَّجٌ وَنَعَامَةٌ زَجَّاءُ: دراز گام شتر مرغ۔

(زخرف)

الزُّخْرُفُ: اصل میں زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہو۔ اسی سے سونے کو بھی زُخْرُفُ کہا جاتا ہے (کیونکہ یہ زینت کے کام آتا ہے۔) قرآن پاک میں ہے:

﴿أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا﴾ (۱۰-۲۲) یہاں تک

کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگی۔

﴿بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ (۱۷-۹۳) طلائی گھر۔

﴿وَزُخْرُفًا﴾ (۳۳-۳۵) اور سونے کے (دروازے)

اور ﴿زُخْرُفِ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ (۶-۱۱۲) کے معنی

ہیں ”لمع کی ہوئی باتیں“

(زرب)

الزَّرَابِيُّ: یہ زرب کی جمع ہے جو ایک عمدہ قسم کا

کپڑا ہے اور ایک مقام کی طرف منسوب ہے پھر تشبیہ

و استعارہ کے طور پر زَّرَابِيُّ بمعنی فرش کے بھی آ جاتا

ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَزَّرَابِيٌّ مَّبْثُوثَةٌ﴾ (۸۸-۱۶) اور بچھائے ہوئے

فرش۔

اور زَرْبٌ وَزْرِيَةٌ: بکریوں کے باڑہ اور تیر انداز کے

چھپنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں۔

(زرع)

الزَّرْعُ: اس کے اصل معنی انبات یعنی اگانے

کے ہیں اور یہ بھیتی اگانا دراصل قدرت کا کام ہے اور

انسان کے کسب و ہنر کو اس میں دخل نہیں ہے اسی بنا پر

آیت کریمہ:

﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ؕ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ

نَحْنُ الزَّارِعُونَ﴾ (۵۶-۶۲) بھلا بتاؤ کہ جو تم بولتے

أَزَجَيْتُمْ رِذْيَاءَ التَّمْرِ: میں نے ردی کھجوروں کو دور پھینک دیا۔ اور زَجَا (لازم) اَزَجِيٌّ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

رَجَا الْخَرَّاجُ (ن) خراج کا سہولت سے جمع ہو جاتا۔

اور ”خَرَّاجٌ رَّاجٌ“ اس خراج کو کہتے ہیں جو معمولی ہونے کی وجہ سے سہولت سے جمع ہو جائے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۲۰۳) وَحَاجَةٌ غَيْرُ مُزَجَّاةٍ عَنِ الْحَاجِ

اور حاجت مندوں کی بعض حاجتیں معمولی نہیں ہوتیں کہ

انہیں پورا کیا جاسکے۔

(زحزح)

الزَّحْزَحَةُ کے معنی ہیں دور ہٹانا اور برطرف

کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ زَحَّحَ عَنِ النَّارِ﴾ (۳-۱۸۲) پس جو شخص

آگ سے دور رکھا گیا۔

(زحف)

الزَّحْفُ: اصل میں اس کے معنی پاؤں کے گھسٹ

گھسٹ کر چلنا کے ہیں جیسا کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے

سے پہلے اور اونٹ ٹھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں گھسٹ کر

چلتا ہے یا فوج کثرت ازدحام کی وجہ سے آہستہ گھسٹ

گھسٹ کر آگے بڑھتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحَفَا﴾ (۸-۱۵) جب

کفار سے تمہاری مٹھ بھیلڑ ہو جائے۔

اور زَاحِفٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ سے ورے گر

جائے۔

گے۔

میں زُرْقًا کے معنی اندھے، جن کی آنکھوں میں نور نہ ہو۔
الزُّرْقُ: ایک پرند کا نام ہے (سفید شاہیں) محاورہ ہے
زُرْقُ الطَّائِرُ: پرند کا بیٹ کرنا اور زُرْقَهُ بِالْمُزْرَاقِ
کے معنی ہیں ”اسے چھوٹے نیزہ سے مارا“

(زری)

زَرَيْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر عیب لگانے کے ہیں اور
أَزْرَيْتُ بِهِ وَأَزْدَرَيْتُ (احتمال) کے معنی ہیں ”کسی کو
حقیر اور بے وقعت گردانا“ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ﴾ (۱۱-۳۱) (جنہیں تمہاری
نظریں حقیر دیکھتی ہیں۔

یہ اصل میں تَزْدَرِيهِمْ أَعْيُنُكُمْ ہے یعنی اس کا مفعول
محذوف ہے اور معنی یہ ہے کہ تم انہیں نظر حقارت سے
دیکھتے ہو۔

(زَعَق)

الزُّعَاقُ: سخت کھاری اور کڑوے پانی کو کہتے
ہیں اور جس کھانے میں حد سے زیادہ نمک ہو اسے طعام
مزعوق کہا جاتا ہے۔

زَعَقُ (ف) بہ کے معنی کسی پر چلا کر اسے گھبرا دینے کے
ہیں اور اِنْزَعَقُ (لازم) گھبرا جانا۔
الزَّعِيُّ: بہت چلانے والا۔

الزُّعَاقُ: بہت بلند آواز نکالنے والا۔

(زَعَم)

الزَّعَمُ: اصل میں ایسی بات نقل کرنے کو کہتے ہیں
جس میں جھوٹ کا احتمال ہو اس لئے قرآن پاک میں یہ
لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت

ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔ میں
حَرَثٌ (بونا) کی نسبت تو انسان کی طرف کی ہے مگر
زُرْعٌ (اگانے) کی انسان سے نفی کر کے اسے اپنی ذات
کی طرف منسوب کیا ہے اور کھیتی اگانے کے اسباب مثلاً
زمین کو تیار کر کے اس میں تخم ریزی کرنا اور مناسب
احتیاطیں برتنا چونکہ انسان سرانجام دیتا ہے اس لئے مجازاً
انسان کی طرف بھی زُرْع کی نسبت کر دیتے ہیں جیسا کہ
أَبْتُّ كَذَا كَمَا محاورہ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان منجملہ
اگانے کے اسباب سے ہے۔

زُرْعٌ اصل میں مصدر ہے اور اس سے مَزْرُوعٌ (اسم
مفعول) یعنی کھیتی مراد ہوتی ہے جیسے فرمایا:

﴿فَسَخَّرْهُ بِهِ زُرْعًا﴾ (۳۲-۲۷) پھر ہم اس (پانی)
کے ذریعہ کھیتی نکالتے ہیں۔

﴿وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ﴾ (۴۳-۲۶) اور کئی ہی
کھیتیاں اور کتنے ہی عمدہ عمدہ مکانات۔

اور تشبیہ کے طور پر جس طرح انسان کے متعلق أُنْبِتَهُ اللَّهُ
کا محاورہ ہے استعمال ہوتا ہے اس طرح محاورہ میں زُرْعٌ
اللَّهُ وَلَكَ (اللہ تمہاری اولاد کو نمونہ بخشنے) بھی کہہ دیتے
ہیں اور مُزْرِعٌ بمعنی زُرْع یعنی کسان کے ہیں اور
إِذْ دَرَعَ النَّبَاتُ کے معنی ہیں نباتات بڑھ گئی۔

(زرق)

الزُّرْقَةُ: (نیلا ہٹ) ایک رنگ جو سپیدی اور سیاہی
کے بین بین ہوتا ہے۔ محاورہ ہے: زُرَقَتْ عَيْنُهُ زُرْقَةً
وَزُرْقَانًا: اس کی آنکھ نیلی ہو گئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿زُرْقًا يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰-۱۰۳، ۱۰۲) نیلی
آنکھوں والے جو آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں

مقصود ہے۔ چنانچہ فرمایا:
 ﴿زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۶۳-۷۷) کفار (یہ) زعم کرتے ہیں۔
 ﴿بَلْ زَعَمْتُمْ﴾ (۱۸-۲۸) مگر تم یہ خیال کرتے ہو۔
 ﴿كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ﴾ (۶-۲۲) (جن کو تم شریک خدائی سمجھتے تھے۔
 ﴿زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِهِ﴾ (۱۷-۵۶) (جنہیں تم نے) اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا۔
 اور زَعَامَةٌ کے معنی ذمہ داری اٹھانے اور ریاست (سرمداری) کے ہیں اور کفیل (ضامن) اور رئیس کو زَعِيمٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی بات میں جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنسَابِهِ زَعِيمٌ﴾ (۱۲-۷۲) اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔
 ﴿أَيُّهُمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ﴾ (۶۸-۳۰) ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے۔ یہاں زَعِيمٌ یا تو زَعَامَةٌ بمعنی کفالة سے ہے اور یا زَعَمٌ بالقول سے ہے۔

(ز ف ر)

الزَّفِيرُ: اس کے اصل معنی سانس کی اس قدر تیزی سے آمد و شد کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ﴾ (۱۱-۱۰۶) ان کے لئے اس میں چیخنا ہے۔

إِذْ ذَفَرَ (إتعال) فُلَانٌ كَذَا: کسی چیز کو مشقت سے اٹھانا جس سے سانس پھول جائے اس لئے پانی لانے والی لونڈیوں کو زَوَافِرٌ کہا جاتا ہے۔

(ز ق م)

الزَّقُومُ: تھوہر کا درخت اور آیت کریمہ:
 ﴿إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُومِ﴾ (۲۳-۲۳) بے شک سینڈھ کا درخت۔ میں زَقُومٌ سے دوزخ کے کریہہ کھانے مراد ہیں۔ اور اس سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
 زَقَمَ فُلَانٌ وَتَزَقَّمَ: اس نے کوئی کریہہ چیز نگل لی۔

(ز ک و)

الزَّكَاةُ: اس کے اصل معنی اس (موا) (افزونی) کے ہیں جو برکت الہیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ

زَفَّ الْإِبِلُ يَزِفُّ زَفًّا وَزَفِيفًا کے معنی ہیں:
 اونٹ کا تیز چلنا اور أَرْزَفَهَا (افعال) کے معنی تیز چلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿إِلَيْهِ يَرْزُقُونَ﴾ (۳۷-۹۳) وہ اس کی طرف دوڑتے آئے۔

اور ایک قرأت میں يَرْزُقُونَ (بضم یاء) ہے یعنی وہ اپنے ساتھیوں کو تیز روی پر برا بھینٹتے کرتے ہیں۔

روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔

اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا قائل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿بَلِ اللّٰهُ يَزَكِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ﴾ (۴-۲۹) بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔

اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا﴾ (۹-۱۰۳) کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہو۔

﴿يَسْئَلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (۲-۱۵۱) وہ پیغمبر انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں بذریعہ تعلیم (اخلاقِ رذیلہ) سے پاک کرتا ہے۔

اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے چنانچہ سچی تائید اللہ کے متعلق فرمایا:

﴿وَحَسْبُنَا مِنَ لَدُنَّا وَزَكَاةٍ﴾ (۱۹-۱۳) اور اپنی جناب سے رحمدلی اور پاکیزگی دی تھی۔

﴿لَا هَبَ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ (۱۹-۱۹) تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتہاد حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم و مہارت سے نہیں بلکہ محض توفیق الہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ

کہا جاتا ہے۔

زَكَاَ النَّزْرُعُ يَزْكُو: کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا اور آیت کریمہ:

﴿اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا﴾ (۱۸-۱۹) کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔

میں ازکئی سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوٰۃ کا لفظ مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الہی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو امور کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوٰۃ میں موجود ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۲-۴۳) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصافِ حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا۔ اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے۔ اور فعل تزکیہ کی نسبت کبھی تو انسان کی طرف کی جاتی ہے، کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ (۹۱-۹) کہ جس نے اپنی

مٹھو بننا یہ عقلاً ہی درست نہیں ہے۔ اور نہ ہی شرعاً۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا۔ مَذْحُ الْإِنْسَانَ نَفْسَهُ کہ خود ستائی کرنا۔

(زَلَّ)

الزَّلَّةُ: کے اصل معنی بلا قصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: زَلَّتْ (ض) رَجُلٌ تَزَلُّهُ اور پھسلنے کی جگہ کو زَلَّةٌ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے تو اسے بھی بطور تشبیہ زَلَّةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنْ زَلَلْتُمْ﴾ (۲-۲۰۹) اگر تم لغزش کھا جاؤ۔

﴿فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ﴾ (۲-۱۳۶) انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔

إِسْتَزَلَّ: (استفعال) کسی کو پھسلانے کا قصد و ارادہ کرنا اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ﴾ (۳-۱۵۴) شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔

کے یہ معنی ہیں کہ شیطان انہیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہتا رہتا کہ وہ پھسل گئے۔ کیونکہ جب انسان صغائر سے بے پروا ہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے: ❶

(۱۶۶) مَنْ أُرِلَتْ إِلَيْهِ نِعْمَةٌ فَلْيَشْكُرْهَا کہ جسے بلا طلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلا قصد نعمت حاصل ہونے

ہوا ہے۔ اور آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہذا زَكِيًّا کا تعلق زمانہ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ﴾ (۲۳-۴) اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔

یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کر دے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں۔ وَالسَّامِ وَالْوَاحِدُ۔ لِهَذَا لَزَكَاةٍ میں لام تعلیل کے لئے ہے جسے لام علت و قصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتیٰ کہ یہ فَاعِلُونَ کا مفعول ہو۔

انسان کے تزکیہ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ (۹۱-۹) اور آیت: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ (۸۷-۱۴) میں تزکیہ سے یہی مراد

ہیں۔ دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان دوسرے کے اچھا ہونے کا دعویٰ کرے اور خود ستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿لَا تَزْكُوا أَنفُسَكُمْ﴾ (۵۳-۲۲) اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔

اور یہ نبی تادیبی ہے۔ کیونکہ انسان کا اپنے منہ آپ میاں

❶ فی الفائق مرفوعاً (۱: ۳۶۸) وفی غریب ابی عبید (۱: ۱۵) ہب - عن یحییٰ بن عبد اللہ بن صفیٰ مرسلًا بلفظ من اولیت الیہ ومن انزلت قال ابو عبید لیس هذا بمحفوظ فی ابن عساکر عنہ مرسلًا من انزلت الیہ یذ راجع کنز العمال (۶: رقم ۱۹۸۸، ۱۹۹۲)۔

﴿وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ﴾ (۱۱۳-۱۱) اور رات کے کچھ حصوں میں۔

شاعر نے کہا ہے۔ (رجز)

(۲۰۴) طَسَى السَّيِّئِ زُلْفًا فَزُلْفًا

اور راتوں کا تھوڑا تھوڑا کر کے گزرنے۔

الزُّلْفَى: قرب و مرتبہ۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِلَّا لِيُقْرَبُونا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ (۶۳-۳۶) کہ خدا

کے ہم کو قریب کر دیں۔

﴿وَأَزَلِفَتْ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۲۱-۵۰) اور بہشت

پر بہیز گاروں کے قریب لائی جائے گی۔

اور لَيْلَةُ الْمُرْدَلِفَةِ کو اس نام سے اس لئے پکارتے ہیں

کہ حجاج کرام عرفات سے لوٹنے کے بعد اس رات منیٰ

کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور حدیث میں ہے۔ *

(۱۶۷) إِذْ دَلِفُوا إِلَى اللَّهِ بِرُكْعَتَيْنِ: کہ دو رکعت

نماز سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔

زلق

زَلِقٌ اور زَلَلٌ تقریباً ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿صَعِيدًا زَلَقًا﴾ (۱۸-۴۰) صاف میدان۔

یعنی چکنی زمین جس میں کوئی سبزہ نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ

فرمایا: ﴿فَتَرَكَهُ صُلْدًا﴾ (۲۶۳-۲) اسے سپاٹ کر

(کے بہہ بہا) گیا۔

الْمُرْلِقُ: پھسلنے کی جگہ۔ اور آیت کریمہ:

پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکر یہ بالاولیٰ ضروری ہے۔

الْتَّرْلُزْلُ: اس کے معنی اضطراب کے ہیں اور اس میں

تکرار حروف تکرار معنی پر دال ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ (۱-۹۹) جب زمین

بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔

﴿إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ﴾ بے شک قیامت

کا زلزلہ (بڑی سخت) مصیبت ہوگی۔

﴿وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا﴾ (۱۱-۳۳) اور وہ

(دشمنوں کے رعب سے) خوب ہی جھڑجھڑائے گئے۔

زل ف

الزُّلْفَةُ: اس کے معنی قرب اور مرتبہ کے ہیں

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً﴾ (۶۷-۲۷) سو جب وہ قریب

دیکھیں گے۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ جب وہ موئین کے مراتب

قرب کو دیکھیں گے اور وہ ان سے محروم ہوں گے اور بعض

نے کہا ہے کہ یہاں زُلْفَةُ سے مراد عذاب کا قرب ہے

اور عذاب کو زُلْفَةُ کہنا، حالانکہ یہ مراتب محمودہ میں استعمال

ہوتا ہے۔ بطور تمکیم ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت یا

اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اور

منازل لیل یعنی رات کے حصوں کو بھی زُلْفُ کہا گیا ہے

جیسے فرمایا:

① وقيل: ناج طواه الاين هما وحفا وثالته: سماوة الهلال حتى احقوقفا - والشطر من ارجوزة للحجاج راجع اراجيز العرب للمسيد البكري ٥٢ ومحجز القران لابي عبيدة (٣٠٠:١) والطبرى (٨١:١٩) والكمال ١٢٩, ٨٢٤ فى ثلاثة اشطار وادب الكتاب للصولى (١٢٣) والصحاح

والناج واللسان (زلف) والشتمرى (١٨٠:١) ودويوانه ٨٤ والكتاب (١٥٠:١) والبحر (٨٣:١) وابن خالويه ٩٨ والعينى (٢٩:١).

② وفى النهاية (زلف) فى حديث مصعب بن عمير: فإذ زالت الشمس فازدلف الى الله بركعتين واحطب فيهما اى تقرب ١٢.

زَمَرَتِ النَّعَامَةُ تَزْمِرُ زِمَارًا کے معنی ہیں شتر مرغ نے سیٹی بجائی اور اس سے کنایہ کے طور پر فاجرہ عورت کو زَمْرٌ وَزَمَارَةٌ کہا جاتا ہے۔^۱

(ز م ل)

﴿يَا أَيُّهَا الْمَزْمُولُ﴾ (۷۳-۱) اے اوڑھنے والے۔ تو مَزْمُولٌ اصل میں مُتَزَمِّلٌ ہے جس کے معنی کپڑے میں لپیٹنے کے ہیں اور استعارہ کے طور پر سستی اور کوتاہی کرنے والے کو بھی تعریضاً مُتَزَمِّلٌ کہا جاتا ہے اسی سے زَمِيلٌ ہے جس کے معنی کمزور اور ناتواں کے ہیں تَابَطُ شَرًّا کے متعلق اس کی والدہ نے کہا ہے۔^۲

لَيْسَ بِزُمَيْلٍ شَرُوبٍ لِّغَيْلٍ

کہ وہ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ دوپہر کے وقت دودھ پینے کی ضرورت ہو۔

(ز ن م)

الزَّيْنِمُ يَأْمُرُ نَمًّا سے کہتے ہیں جو کسی قوم سے نسبتی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اس کے ساتھ یونہی ملحق ہو۔ جیسے زَنَمْنَا الشَّاةَ: یعنی گوشت کے دوڑاند کھڑے جو بکری کے گلے یا کان سے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عُتِلَّ بَعْدَ ذَلِكَ زَيْنِيمٌ﴾ (۶۸-۱۳) سخت جھگڑالو اس کے علاوہ بذوات بھی۔

﴿لَيْزِلُ لِقَوْمِكَ بِأَبْصَارِهِمْ﴾ (۶۸-۵۱) اپنی نظروں سے (گھور کر) تجھے تیرے مکان سے پھسلا دیں۔

میں البصار کے متعلق زَلَقٌ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔^۳ (اکمال)

(۲۰۵) نَظَرٌ يُزِيلُ مَوَاضِعَ الْأَقْدَامِ

ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔ کہا جاتا ہے زَلَقَهُ وَأَزَلَقَهُ: اسے پھسلا یا فزلق چنانچہ پھسل گیا۔

یونس لغوی کا قول ہے کہ زَلَقٌ اور از لاق کا یہ محاورہ صرف قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے اور ابی بن کعب نے أَزَلَقْنَا نَمَّ الْأَخْرَيْنِ (۶۳-۲۶) میں از لقنا (قاف کے ساتھ) پڑھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے وہاں دوسرے لوگوں کو لا کر ہلاک کر ڈالا۔

(ز م ر)

زُمْرَةٌ کے معنی چھوٹی سی جماعت کے ہیں۔ اس کی جمع زُمُرٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ (۳۹-۷۳) اور جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا وہ بہشت کی طرف گروہ گروہ کر کے چلے جائیں گے۔ اور اسی سے شَاةٌ زُمْرَةٌ ہے جس کے معنی کم اون والی بھیڑ کے ہیں اور بے مروت آدمی کو زُمُرٌ کہا جاتا ہے اور

۱ وفی اللسان انشدہ ابو اسحاق راجع (زلق قرض) وقد مرتخیرہ فی (دحض) والبيت فی المعانی للقبتي ۱۱۲۹۰۸۴۵ والصناعتین ۲۸۱ والطبرسی (۲۸: ۳۷) ۱۲۔

۲ وفی الحدیث نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الزمارة وہی التي تزمرا والزمانية (راجع غریب ابی عیید (۳۴۱: ۱) والفتق (۱: ۵۳۹)۔
۳ تریبہ انظر المعانی فی الکبیر ۱۲۳۰ وفیہ وفی اللسان (قیل) رثالها: وابناء، وابن اللیل - لیس بزمل شراب للقیل، کمقرب الخیل - ترید بابن اللیل - انه صاحب غارات والقیل اللبن الذی یشرّب وقت القیلوله ای نوم الظہیر والفعال من قال وقاتل ای لیس هو شراب للقیل مہیانا دقیق الحصر یتحتاج الی الشرب نصف النهار وفی المطبوع القیل مکان القیل والتصحیح من اللسان (زمل) ۱۲۔

(۱۶۸) لَا يَصْلِي الرَّجُلُ وَهُوَ زَنَاءٌ: کہ آدمی کو چاہیے کہ حائض ہونے کی صورت میں نماز نہ پڑھے۔

(زهد)

الزَّهِيْدُ کے معنی حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے یا حقیر سی چیز پر راضی ہو جانے والے کو زاهد فی الشیء کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ﴾ (۱۲-۲۰) اور اس کے بارہ میں وہ بے رغبت تھے۔

(زهدق)

زَهَقَتْ نَفْسُهُ کے معنی ہیں کسی چیز پر رنج و غم سے اس کی جان نکل گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَزَهَقَ أَنْفُسُهُمْ﴾ (۹-۵۵) اور ان کی جانیں (اس حال میں) نکلیں۔

(زیت)

زَيْتٌ وَزَيْتُونَةٌ مثل شجر و شجرة: ایک مشہور درخت کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ (۲۳-۱۳۵) زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے۔ جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔

الزَّيْتُ: زیتون کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ﴾ (۲۳-۳۵) قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی کرے۔

اور زَاتٌ طَعَامَةٌ کے معنی ہیں اس نے طعام میں زیتون

اور زَيْنَمٌ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف منسوب ہو۔ یعنی زَلَمَةٌ يَا زَلَمَةً کی طرح لٹک رہا ہو درحقیقت ان سے نہ ہو شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۰۷) فَأَنْتَ زَيْنِمٌ نِيْطٌ فِي آلِ هَاشِمٍ

كَمَا نِيْطٌ خَلْفَ الرَّايِبِ الْقَدْحِ الْفَرِّ

اور تو حرام زادہ ہے جو آل ہاشم کے ساتھ اس طرح معلق ہے جیسے لکڑی کا خالی پیالہ سوار کے پیچھے لٹک رہا ہوتا ہے۔

(زنی)

الزَّانِيَةُ: عقد شرعی کے بغیر کسی عورت سے ہم بستری کرنے کا نام زنا ہے یہ اسم مقصور ہے اگر اسے ممدود پڑھا جائے تو باب مفاعلہ کا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت زَنَوِيٌّ کہا جائے گا اور فَالَانُ لِزَنِيَّةٍ (بکسرہ زاو فتح آن) کے معنی ہیں: فلاں حرام زادہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ﴾ (۲۳-۴) زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرکہ عورت کے کسی سے نکاح نہیں کرتا اور فاجرہ عورت سوائے فاجر کے کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرتی۔

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي﴾ (۲۳-۲) زانیہ عورت اور زانی مرد۔ اور اگر مہوز اللام سے ہو جیسے: زَنَاءٌ فِي الْجَبَلِ زَنَاءٌ وَزُنُوءٌ: تو اس کے معنی پہاڑ پر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔

الزَّانَاءُ حَاقِنٌ: یعنی پیشاب روکنے والے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔^②

① قاله حسان بن ثابت يهجو ابا سفيان بن الحارث بن عبدالمطلب من شواهد الكشاف ۳۸ وديوانه ۸۹ والبحر (۲۰۵:۸) والحصرى (۶۳:۱) واللسان (زمن) وفيه وانت والمزروقي (۵۰۴).

② الحديث في اللسان (زنا) الفائق (۲۷۰:۱) وراجع لتاويله المرتضى (۲۸۵:۲-۲۸۶) وغريب ابى عبيد (۱۴۹:۱).

﴿أَحْسُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَوَّاجَهُمْ﴾ (۲۲-۳۷)
جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور
ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کرو۔

میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو ہر فعل میں
ان کی اقتدا کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:

﴿إِلَىٰ مَا مَتَعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا﴾ (۲۰-۱۳۱) اس کی طرف
جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے
رکھے ہیں۔

اشباہ و اقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد
ہیں۔ اور آیت:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ﴾ (۳۶-۳۶)
پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم) کی چیزیں پیدا کیں۔
نیز فرمایا:

﴿وَمَنْ كُنَّ شَيْءٌ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (۵۱-۳۹) اور
تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔

میں اس بات پر تشبیہ کی ہے کہ تمام چیزیں جو ہر ہوں یا
عرض، مادہ و صورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت
ترکیبی کے لحاظ سے ہمارے ہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور
اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز
تشبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس
(خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم
کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں
سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ
اس میں ترکیب پائی جاتی ہے۔ بلکہ نفس ترکیب سے تو

کا تیل ڈالا جیسے سمنہ اور دھنہ بہ کی طرح زات
رأسہ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا جس کے معنی ہیں۔ (اس
نے سر پر تیل لگایا) اور از ذات بمعنی اِدھن کے ہیں۔

(زوج)

الزَّوْجُ: جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے
ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ
دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات
کے علاوہ دوسری اشیاء میں جنت کو زَوْج کہا جاتا ہے جیسے
موزے اور جوتے وغیرہ۔ پھر ہر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل
یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا
زوج کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ (۷۵-۳۹)
اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور
عورت۔

﴿وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ (۲-۳۵) (تو) اور تیری بی بی
جنت میں رہو۔

اور بیوی کو زَوْجَةٌ (تاء کے ساتھ) کہنا عامی لغت ہے
اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے۔^۱
(۲۰۸) فَبَكَ بَنَاتِي شَجَوَهْنَ وَزَوْجَتِي
تو میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔

اور زَوْج کی جمع ازْوَاجٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک
میں ہے:

﴿هُمَّ وَأَزْوَاجُهُمْ﴾ (۳۶-۵۶) وہ اور ان کے
جوڑے۔ اور آیت:

۱ قاله عبد بن الطيب التميمي والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۷ في ۳۰ بيتاً ينصح فيها بنه حين كبر وتمامه: والاقربون الى ثم تصدعوا والبيت في اضداد ابن الانباري ۳۷۴ والمخصص (۱۷: ۳۴) واضداد ابى الطيب ۳۴۰.

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَةً﴾ (۸۹-۲۸، ۲۷) اے اطمینان پانے والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

میں بعض نے رَبِّكِ کے معنی صَاحِبِكِ یعنی بدن ہی کے کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زَوْجَت سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت کریمہ ہے:

﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ﴾ (۳۰-۳) جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائے گا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿زَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ﴾ (۷۲-۲۰) اور ہم انہیں حور عین کا ساتھی بنا دیں گے۔

میں زَوَّجْنَا کے معنی باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زَوَّجْنَا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بِحُورِ کی بجائے زَوَّجْنَا هُمْ حُورًا کہتا۔ جیسا کہ زَوَّجْتُهُ امْرَأَةً کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔^۱

کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے۔

لہذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت: ﴿أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتَّىٰ﴾ (۲۰-۵۳) طرح طرح کی مختلف روئید گیائیں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:

﴿مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ﴾ (۳۰-۱۰) ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)

اور آیت کریمہ: ﴿تَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ﴾ (۶-۴۴) (نزارو ماہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔ میں مراد ہیں اور آیت: ﴿كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً﴾ (۵۶-۷) میں ازواج کے معنی ہیں۔ فُرْنَا یعنی امثال و نظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو۔ چنانچہ اس کے بعد اصحاب المِیْمَنَةِ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذَا السُّفُوفُ سُ زُوِّجَتْ﴾ (۸۱-۷) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔

میں بعض نے زَوَّجْت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیرو کار کو اس کے پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ آیت: ﴿أَحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ﴾ (۳۷-۲۲) میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روجوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائے گا جیسا کہ آیت:

۱ ہذا ذہب الیہ یونس و ابو عبیدہ من علماء العربیة قال الواحدی و التزویل بدل علی ما قال یونس (راجع الفخر ۲۷-۲۰۳) و فی البخاری : زواجہم بحواری انکحناہم قال فی الفتح (۶: ۳۵۵) و تعقب بان زوج لا تعدی بالباء و فیہ نظر لان صاحب المحکم حکاہ لکن قال انہ قلیل واللہ اعلم .

(زود)

الزَّادُ: موجودہ ضرورت سے زائد اندوختہ کو کہتے ہیں اور التَّزْوُدُ (تفعل) کے معنی توشہ لینا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى﴾ (۲-۱۹۷) اور زاوِ راہ ساتھ لے جاؤ بے شک بہترین توشہ سوال سے بچنا ہے۔ اور اَلْمَزْوُودُ اس توشہ دان کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جاتا ہے۔ اور اَلْمَزَادَةُ مشکیزہ جس میں پانی بطور زاوراہ رکھا جاتا ہے۔

(زور)

الزُّورُ: سینہ کا بالائی حصہ اور زُرْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں: میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا، یا اس کے سینہ کا قصد کیا (اس کی ملاقات کی) جیسا کہ وَجَّهْتُهُ کا محاورہ ہے یعنی اس کے سامنے اپنا چہرہ کیا یا اس کے چہرہ کا قصد کیا۔ رَجُلٌ زَائِرٌ: ملاقاتی زائر کی جمع زُورٌ آتی ہے جیسا کہ سَافِرٌ کی جمع سَفَرٌ مگر کبھی رَجُلٌ زُورٌ بھی آجاتا ہے اس صورت میں یہ مصدر ہوتا ہے جیسا کہ ضَعِيفٌ کا لفظ ہے نیز اَلزُّورُ: کے معنی سینہ کے ایک طرف جھکا ہونا کے ہیں اور جس کے سینہ میں ٹیڑھا پن ہو اسے اَلْأَزُورُ کہتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ﴾ (۱۸-۱۷) کے معنی یہ ہیں کہ سورج ان کے غار سے ایک طرف ہٹ کر نکل جاتا ہے۔ یہاں ”تَزَاوَرُ“ میں حرف زاء پر تشدید بھی پڑی جاتی ہے اور بغیر تشدید کے بھی اور بعض نے تَزَوَّرَ (افعلال) پڑھا ہے۔ مگر اَحْسَنُ فِی اللُّغَةِ فرماتے ہیں کہ یہ قرأت یہاں موزوں نہیں ہے کیونکہ اَلْأَزُورُ اَرُّ کے معنی ہیں: منقبض ہونا۔ کہا جاتا ہے: تَزَاوَرَّ عَنْهُ وَازْوَرَّ عَنْهُ: اس نے اس سے پہلو تہی کی۔ اس سے ایک جانب ہٹ گیا اور جس کنویں کی کھدائی میں ٹیڑھا پن ہو اسے بَشْرٌ زُورٌ کہا جاتا ہے اسی سے جھوٹ کو اَلزُّورُ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جہت راست سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ظُلْمًا وَزُورًا﴾ (۲۵-۴) ظلم اور جھوٹ سے۔
﴿قَوْلَ الزُّورِ﴾ (۲۲-۳۰) جھوٹی بات سے۔
﴿وَمِنَ الْقَوْلِ وَزُورًا﴾ (۵۸-۲) اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔
﴿لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ (۲۵-۷۷) وہ جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔
اور شاعر کا قول ہے۔

(۲۰۹) وَجَاءُوا بِزُورِنِهِمْ وَجِئْنَا بِالْأَصْمِ
وہ اپنے دو جھوٹے خدا لے کر آگئے اور ہم اپنے بہادر سردار کو۔

میں زُورُ کے معنی بت کے ہیں۔ کیونکہ بت پرستی بھی

① بالتشدید قراۃ الحرمین وابی عمرو بالتخفیف قراۃ الکوفیین والاعمش وطلحة و ابن ابی لیلیٰ و امامتور فہی قراۃ قتادہ و ابن ابی اسحاق و ابن عامر و فہی قراۃ احرئی ای تزاور علی مثال تحمار روہی قراۃ ابی رجاء و ایوب السخنیانی و ابن ابی عبلة و جابر و قراۃ ابن مسعود راجع ابی حیان (۶: ۱۰۷-۱۰۸)۔

② الرجز للاعلیٰ الععلیٰ قالہ یوم الزورین حرب کانت بین بکر و بین بنی تمیم۔ والاصم لقب لعمرین قیس بن عامر الشیبانی رئیس بکر بن وائل یومئذ و یعنی بزورہم بکرین محللین فدقیدوہما وقالوہذاک زورانای الاہنا وبعده شیخ لناقد کان من عہد ارم۔ وفی المطبوع بزورہم بنہم مصحف والزجر فی الامالی (۲: ۱۸۰) والسقط (۸۰۱) والعقد (۳: ۲۴۳) (۵: ۲۰۶) وایام العرب ۲۱۴ والحماصہ و ابن الشحری ۳۷ و اللسان و التاج (زور، اصم) و فہی عن ابی عبیدہ و الرجز لیحییٰ بن منصور راجع ابدال ابی الطیب (۲: ۹۹) وابدال یعقوب ۶۵ و شرح السبع لابن الانباری ۴۹۲ وفی روايتہ بشیحہم وزاد الثالث: قد کدم الشیخ فقاہ و کدم و الاغلب الععلیٰ (۳۱: ۵) راجز جاہلی اسلامی احد المعمرین واستشهد فی وقعة نہا وند انظر المؤلف ۲۳ والخزانة البغدادیة (۱: ۳۳۳) والاعلام للزرکلی (۱: ۳۳۹) ۱۲۔

فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی زیادتی محمود ہوتی ہے جیسے

فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ﴾ (۱۰-۲۶)

جو نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر کئی طرق سے مروی ہے۔ (۱۶۹) کہ یہاں زیادہ سے نظر الہی وجہ اللہ مراد ہے اور اس سے ان انعامات اور احوال کی طرف اشارہ ہے جن کا اس زندگی میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور آیت:

﴿وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ (۲-۲۴۷)

اور علم و جسم میں اسے زیادہ کشائش بخشی۔ میں زیادہ سے مراد یہ ہے کہ وہ علم و جسم میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ (۱۹-۷۶)

اور اللہ ان کو روز بروز زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔ اور مذموم زیادتی کے متعلق فرمایا:

﴿مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا﴾ (۳۵-۳۲) ان کی نفرت میں

اضافہ ہی ہوتا ہے۔

﴿زَدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ﴾ (۱۶-۸۸) اور

ہم ان کے حق میں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے۔

﴿فَمَا تَزِيدُوْنِي غَيْرَ تَحْسِيْرٍ﴾ (۱۱-۶۳) (الثا)

میرا اور نقصان ہی کر رہے ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ (۲-۱۰) سوائے ان کے

مرض میں اور اضافہ کر دیا۔

جھوٹ اور حق سے ہٹ جانے کا نام ہے۔

(زول)

زَالَ الشَّيْءُ يُزْوَلُ زَوَالًا: کسی چیز کا اپنا صحیح رخ چھوڑ کر ایک جانب مائل ہو جانا (اپنی جگہ سے ہٹ جانا) اور اَزَلْتُهُ وَزَوَّلْتُهُ کے معنی ہیں: ایک جانب مائل کر دینا کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنْ تَزُولَا﴾ (۳۵-۴۱) کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

﴿وَالَّذِينَ زَالَتَا﴾ (۳۵-۴۱) اگر وہ ٹل جائیں۔

﴿لَتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (۱۳-۴۶) کہ اس سے پہاڑ ہی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔

(زیاد)

الزِّيَادَةُ: اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد بڑھایا جائے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: زِدْتُهُ:

میں نے اسے بڑھایا فازداد: چنانچہ بڑھ گیا اور آیت:

﴿وَنَزَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ﴾ (۱۲-۶۵) اور (اس کے حصہ

کا) ایک بار شتر غلہ اور لیں گے۔

میں نَزَادُ مَفْعُولٌ متعدی ہے حتیٰ کہ كَيْلَ بَعِيرٍ کو اس کا مفعول کہا جائے گا، بلکہ یہ اَزْدَدْتُ فَضْلًا کی طرح ہے جس کے معنی فضل میں زیادہ ہونے کے ہیں اور یہ باب سَفِهَ نَفْسَهُ کے قبیل سے ہے۔

اور زیادہ (زیادتی) کبھی مذموم ہوتی ہے یعنی کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ ہونا: مثلاً انگلیوں اور جانور کی ٹانگ میں زیادتی اور اسی طرح جگر میں جو گوشت کا زائد کھرا پایا جاتا ہے وہ چونکہ کھایا نہیں جاتا اس لئے اسے زائد اور بے

۱ قال ابن کثیر (۲: ۴۱۶) فی تفسیرہ و هذا هو المروى عن السلف والحلف وقد وردت فيه احاديث كثيرة عن السلف.

فَاجْمَعُوا أَمْرَكُمْ كَيْدًا فَكَيْدُ وِنِي
اور تم سو سے زیادہ آدمی ہو تو تم میرے خلاف جو تدبیر کر
سکتے ہو کرو۔

(زیغ)

الزَّيْغُ: کے معنی حالت استقامت سے ایک
جانب مائل ہو جانا کے ہیں اور التَّزَايُعُ کے معنی تَمَائِلُ
یعنی بہت زیادہ مائل ہو جانا ایک دوسرے سے مائل ہونا۔
رَجُلٌ زَائِعٌ: مائل ہونے والا۔ اس کی جمع زَاغَةٌ
وَزَائِعُونَ آتی ہے۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ: سورج مائل
بزوال ہو گیا۔ زَاغَ الْبَصَرُ: نگاہ نے غلطی کی ایک طرف
ہٹ گئی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ﴾ (۱۰-۳۳) کے یہ معنی بھی
ہو سکتے ہیں کہ خوف و ہراس کی وجہ سے انہیں کچھ نظر نہیں
آئے گا اور یہ بھی کہ یہ آیت:

﴿يَسِرُّونَهُمْ وَمِثْلِهِمْ رَأَى الْعَيْنُ﴾ (۱۳-۳) کے ہم
معنی ہو یعنی صحیح طور پر کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکیں
گی۔ نیز فرمایا:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى﴾ (۱۷-۳۵) نظر نہ تو
حقیقت سے ایک طرف ہٹی اور نہ ہی اس نے حد سے
تجاوز کیا۔

﴿وَمَنْ بَعْدَ مَا كَادَ يَزِيغُ﴾ (۹-۱۱۷) اس کے بعد
کہ..... پھر جانے کو تھے۔

میں مرض کے بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی سرشت
کچھ ایسی ہے کہ جب وہ کوئی برابرا اچھا فعل سرانجام دیتا
ہے تو جوں جوں اس فعل کو انجام دیتا رہتا ہے توں توں اس
فعل کا ملکہ اس میں قوی ہوتا رہتا ہے اور آیت:

﴿هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ﴾ (۵۰-۳۰) کیا کچھ اور ہے؟
میں طلب زیادہ بھی مراد ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
اس میں دوزخ کے بھر جانے پر تنبیہ ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ
نے جو دوزخ سے وعدہ کیا ہے کہ:

﴿لَا مَلْئَنَ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ (۱۱-۱۱۹)
کہ ہم (کیا) جنات اور (کیا) بنی آدم سب سے دوزخ
بھر دیں گے۔

وہ پورا ہو کر رہے گا اور زِدْتُهُ فعل متعدی ہے اور زَادَ
بمعنی اَزَادَ (لازم) بھی آیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا دَاوُوا تِسْعًا﴾ (۱۸-۲۵) اور نو (برس) اس کے
اوپر اور ہیں۔

﴿ثُمَّ إِذَا دَاوُوا كُفْرًا﴾ (۳-۹۰) پھر وہ کفر میں (اور)
بڑھ گئے۔

﴿وَمَا تَعْيُضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزَادُ﴾ (۱۳-۸) اور
نیز (ہر ماہ کے پیٹ کا گھٹنا اور بڑھنا) اور شَرٌّ، زَائِدٌ وَزَيْدٌ
دونوں طرح کہا جاتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۱۰) وَأَنْتُمْ مَعْشَرٌ زَيْدٌ عَلَى مِائَةٍ

① قاله ذوالاصبع العدواني واسمه حرثان بن محدث وفي الصحاح (زيد) والامالي (۲۵۳: ۱) طرأ بدل كيدا وفي المفضليات (۱):
(۱۶۱) والسيوطي ۱۴۸ شتى بدله - والبيت في اللسان (زيد) والمحكم (عشر) هو من قصيدة مفضلية ۳۶ والبيت ۲۹ والقصيدة
يشتمها في الامالي (۲۵۴-۲۵۲: ۱) والكامل (۴۵۰) وفيه كيد كم بدل امركم وانظر للقصيدة منتهى الطلب (۱۹۶: ۱-۱۹۷)
والاغاني (۳: ۸-۱۰) والشعراء (۶۳۶-۶۳۸) والبيت في الكتاب والحماصة لابن الشجري ۷۱ والخزانة (۲۲۶: ۳) والعين
(۲۸۷: ۳) والمرتضى ۲۵۲ ولترجمة الشاعر راجع الاشتقاق ۱۶۳ والمعمرين ۹ والشعراء (۲۸۸-۲۹۰) والخزانة (۲۰۶-۲۰۹).

اور آیت کریمہ: ﴿فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ﴾ (۱۰-۱۲۸) پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے۔

میں اگر زئٹسہ کو متعدی کہا جائے تو باب تفعیل تکثیر کے لئے ہوگا یعنی بالکل الگ الگ کر دینا جیسے: مَزَتْهُ وَمَيَّرَتْهُ اور مَازَالَ اور لَا يَزَالُ ہمیشہ حرف نفی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہ كَانَ فَعَلَ ناقص کی طرح اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں اور اصل میں یہ اجوف یائی ہیں کیونکہ عربی زبان میں زَيَّلْتُ (تفعیل) یاء کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور مَازَالَ کے معنی ہیں: مَا بَرَحَ یعنی وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَلَا يَسْأَلُونَ مُخْتَلِفِينَ﴾ (۱۱-۱۱۸) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

﴿لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمْ﴾ (۹-۱۱۰) وہ عمارت ہمیشہ (ان کے دلوں میں باعث اضطراب بنی) رہے گی۔

﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۲۳-۵۵) کافر لوگ ہمیشہ..... رہیں گے۔

﴿مَا زِلْتُمْ فِي سَلَكَ﴾ (۳۰-۳۳) تم برابر شبہ میں رہے۔ اور مجاورہ میں مَا زَالَ زَيْدٌ إِلَّا مُنْطَلِقًا کہا جاتا نہیں ہے۔ جیسا کہ مَا كَانَ زَيْدٌ إِلَّا مُنْطَلِقًا کہا جاتا ہے کیونکہ زَالَ میں نَبْتِ کی ضد ہونے کی وجہ سے نفی کے

اور آیت کریمہ: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ (۶۱-۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ از خود صحیح راہ سے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

(ز ی ل)

زَالَهُ يَزِيلُهُ زَيْلًا کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کرنا کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۲۱۱) "زَالَ زَوَالُهَا"

کہ اللہ تعالیٰ محبوبہ کے خیال کو میرے دل سے زائل کر دے۔

اور زَوَالَ کے معنی التصرف یعنی پھرنا بھی آتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْكَتَ اللَّهُ نَامَتَهُ کی طرح مجاورہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو ختم کر دیا۔

اور یہی معنی زَيْلٌ زَوِيلُهُ کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔^۲

(۲۱۲) إِذَا مَا رَأَتْنَا زَالَ مِنْهَا زَوِيلُهَا

جب وہ ہمیں دیکھتی ہے تو بدک کر بھاگ جاتی ہے اور جن کے نزدیک زال متعدی نہیں ہے وہ شعر اول میں زَوَالَهَا کو منسوب علی المصدر مانتے ہیں یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

تَزَيَّلُوا: وہ متفرق ہو گئے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ تَزَيَّلُوا﴾ (۲۸-۱۲۵) اگر وہ الگ الگ ہو جاتے۔

۱ قطعة بن عجز البيت قاله الاعشى وتكلمته: هذا النهار يدالها من همها۔ ما بالها بالليل زال زوالها۔ والبيت من قصيدة يمدح فيها قيس بن معديكرب مطلعها: (حلت . سمية غدوة اجمالها - غضبي عليك) فها تقول بدالها ديوانه (۱۰۵-۱۰۴) واللسان (زول) مثل للعرب قديم واختلف في اى زوالها منصوب اللام او مرفوعها ومن رواه برفع اللام (زط لها) قال فيه اقواء راجع اللسان (قوى) وفي ذيل الامالى ۵۷ يقال: زال زوالا وزيل زويله (دعاء) اى ذهب ومات .

۲ قاله ذو الرمة يصف بيضة وصدرة وبيضاء لاتعاش منا واما وفي رواية اللسان (منازول ، حوش ، زيل) منها بدل زال منها ومعناه ذعرت منا ونفرت والبيت فى ديوانه ۵۰۴ والاضداد لابن الانبارى ۲۷۷ والغائق (۱: ۱۰۶) والاضداد لابی الطيب (۱: ۳۲۴) والحيوان (۵: ۵۷۴) والمعاني للقتبي ۲۵۵ والغائق (۱: ۸۲، ۱۰۷) وفي كل المراجع زيل منها بدل زال منها ولكلا الروايتين محمل وان كان الاول اكثر ولم يروا الثاني سوى المؤلف .

اور آیت:

﴿زَيْنَ لِكْثِيرٍ مِّنَ الْمَشْرِكِينَ قَتَلَ أَوْلَادِهِمْ﴾
(۶-۳۷) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں

نے ان کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے۔

میں زین اصل میں زینہ شُرکائِہُمْ ہے اور آیات:

﴿زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ﴾ (۶-۵) ہم

نے آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی۔

﴿أَنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ بِزِينَةِ الْكُوكَبِ﴾ (۳۷-۳۷)

(۶) اور ہم ہی نے آسمان دنیا (ایک) زینت یعنی ستاروں

سے آراستہ کیا۔

﴿وَزَيْنَاَهَا لِلنَّظِيرِينَ﴾ (۱۵-۱۶) اور ہم نے دیکھنے

والوں کے لئے اسے خوبصورت بنایا۔

میں اس زینت کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق حاسہ بصر

سے ہے اور جسے عوام و خواص محسوس کرتے ہیں نیز اس میں

زینت معنوی یعنی ستاروں کی رفتار ان کے احکام کی طرف

بھی اشارہ پایا جاتا ہے جس کی معرفت خواص کو حاصل

ہو سکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت بخشنا تکوین

و ابداع سے ہوتا ہے یعنی ان کو آراستہ حالت میں پیدا کرنا

اور لوگوں کا کسی چیز کو زینت بخشنا یا تو طمع سازی سے ہوتا

ہے اور یا بذریعہ قول کے یعنی کسی چیز کی تعریف کرنا اور

اسے خوشنما صورت میں پیش کرنا۔



﴿وَزَيْنَةً فِي قُلُوبِكُمْ﴾ (۳۹-۷) اور اس ایمان کو

تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

اور کفار کے متعلق فرمایا:

﴿زَيْنَا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ﴾ (۳۷-۳) ہم نے ان کے

اعمال کو ان کے لئے عمدہ کر دکھایا۔

﴿زَيْنَا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلُهُمْ﴾ (۶-۱۰۹) اور ہم نے ہر

امت کے لئے ان کا عمل اچھا کر دکھایا۔

اور شیطان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَإِذْ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾ (۶۳-۱۶)

اور شیطان نے ان لوگوں کے اعمال بد ان کو اچھے کر

دکھائے۔

﴿لَا زَيْنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (۱۵-۳۹) میں دنیا

میں ساز و سامان زندگی کو انہیں عمدہ کر دکھاؤں گا۔

اور بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں فرمایا:

﴿زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ (۳-۱۳) (طبعی

طور پر) لوگوں کو (دنیا کی) مرغوب چیزوں کے ساتھ

و لہنگی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

﴿زَيْنَ لَهُمْ سِوَا أَعْمَالِهِمْ﴾ (۹-۳۷) ان کی بد

کرداریاں ان کو بھلی کر کے دکھائی گئیں۔

﴿زَيْنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾ (۲-۲۱۳)

جو لوگ دین حق کے منکر ہیں دنیا کی زندگی انہیں عمدہ

کر دکھائی گئی۔

کتاب السین

(س و ل)

ہے۔ پھر اسی مناسبت سے ہر اس شے کو سَبَب کہا جاتا ہے جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَأَتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا فَاتَّبَعَ سَبَبًا﴾ (۱۸-۸۴) اور اسے ہر قسم کے ذرائع بخشنے سو وہ ایک راہ پر چلا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر چیز کی معرفت اور سامان و ذرائع عطا کئے تھے جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ سکتا تھا چنانچہ اس نے ایک ذریعہ اختیار کیا اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلِّيْ أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ السَّمَوَاتِ﴾ (۴۰-۳۶، ۳۷) تاکہ جو آسمان تک پہنچنے کے ذرائع ہیں ہم ان تک جا پہنچیں۔

میں بھی اسباب سے مراد ذرائع ہی ہیں۔ یعنی تاکہ ہم ان اسباب و ذرائع کا پتہ لگائیں جو آسمان میں پائے جاتے ہیں اور ان سے موسیٰ (علیہ السلام) کے مرمومہ خدا کے متعلق معلومات حاصل کریں اور عمامہ، دوپٹہ اور ہر لمبے کپڑے کو طول میں رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر بھی سَبَب کہا جاتا ہے۔ اسی جہت سے شاہراہ کو بھی سَبَب کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ شاہراہ کو بھی خِنِيطُ (دھاگرہ) اور کبھی محدود کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

السَّبُّ: (مصدرن) کے معنی مغلظات اور فحش گالی دینا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

السُّؤْلُ: دراصل اس حاجت کو کہتے ہیں جس پر نفس حریص ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ أُوْتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَى﴾ (۲۰-۳۶) موسیٰ تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔ اور یہ سُؤْل وہی ہے جس کا تذکرہ آیت:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ (الایۃ) میں ہے السُّؤْل اور الأَمْنِيَّة کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن اَمْنِيَّة کا لفظ اس خواہش پر بولا جاتا ہے جو تاحال انسان کے دل میں ہو اور اس کا اظہار نہ کیا ہو۔ لیکن سُؤْل اس حالت کو کہتے ہیں جو مطلب بھی کی جا چکی ہو تو گویا سُؤْل کا درجہ اَمْنِيَّة کے بعد کا ہے۔

(س ب ب)

السَّبُّ: اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا (اور اس سے اتر) جاتا ہے اس کی جمع اسباب ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيَسِّرْتَفْوًا فِي الْأَسْبَابِ﴾ (۳۸-۱۰) تو ان کو چاہیے کہ میڑھیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھیں۔ اور یہ معنوی لحاظ سے آیت:

﴿أَمْ لَهُمْ سُلْمٌ يَسْتَمْعُونَ فِيهِ﴾ (۵۲-۳۸) یا ان کے پاس کوئی میڑھی ہے کہ اس پر چڑھ کر (آسمان سے باتیں) سن کر آتے ہیں۔ کے مضمون کی طرف اشارہ

جو ہڈیوں کو کاٹ ڈالتی ہو اور قصب یعنی بانس کو تراش دیتی ہو۔ ان اشعار میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کو دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔^①

نَشْتِمُ بِأَلْفِ عَمَالٍ لَا بِالتَّكْلِمْ

کہ ہم زبان کی بجائے افعال سے گالی دیتے ہیں۔ اور سب (فعل) بمعنی دشنام دہندہ کے لئے آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔^②

لَا تُسَبِّنِي فَلَسْتُ بِسِي

إِنَّ سِي مِنَ الرِّجَالِ الْكَرِيمِ

مجھے گالی نہ دو تم مجھے گالی دینے کے لائق نہیں ہو کیونکہ نہایت شریف درجہ کا آدمی ہی مجھے گالی دے سکتا ہے۔

الْسَّبَّةُ: ہر وہ چیز جو عار و ننگ کی موجب ہو اور کنایہ کے طور پر دربر کو بھی سب کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے سوء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

السَّابَّةُ: انگشت شہادت یعنی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی

کیونکہ گالی دیتے وقت اس کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے

جیسا کہ اس انگلی کو مُسَبِّحَةٌ (انگشت شہادت) کہا جاتا

ہے کیونکہ تسبیح کے وقت اشارہ کے لئے اسے اوپر اٹھایا جاتا ہے۔

﴿لَا تَسْبُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۶-۱۰۹) تو جو لوگ خدا کے سوا (دوسرے) معبودوں کو حاجت روائی کے لئے بلایا (یعنی ان کی پرستش کیا کرتے ہیں ان کو برانہ کہو کہ یہ لوگ بھی ازراہ نادانی ناسخ، خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

ان کے اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیں گے۔ کیونکہ اس طرح تو کوئی مشرک بھی نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جوش میں آ کر شان الہی میں گستاخی کریں گے۔ اور ایسے الفاظ استعمال کریں گے جو اس کی ذات کے شایان شان نہیں، جیسا کہ عام طور پر مجادلہ کے وقت ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔^③

فَمَا كَانَ ذَنْبُ بَنِي مَالِكٍ

بِأَنْ سَبَّ مِنْهُمْ غُلَامٌ فَسَبَّ

بِأَبِيضَ ذِي شَطْبٍ قَاطِعٍ

يَقْدُ الْعِظَامَ وَيَبْرِي الْقَصَبَ

بنی مالک کا صرف اتنا گناہ ہے کہ ان میں سے ایک لڑکے کو بچل پر عار دلائی گئی اور اس نے عار کے جواب میں سفید دھاری دار قاطع تلوار سے اپنی موٹی اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا

① قاله زوالحزق الطهوري واسمه قرط يتعصب لغالب بن صعصعة ابي الفرزدق وكان بينه وبين مسجين بن دشيل الرحاحي معاقرة يوم صوعر (موضع قريب من الكوفة) واختلف الروايات في القصيدة راجع الخبر والاختلاف في ذيل الامالي ٥٢-٥٤ والسمط ٧٤٧-٧٤٦ والابيات مقبلة القافية في اللسان (سب) والنقائض ١٠٧٠ والامالي (١١٧: ٢) والمؤتلف اللامدى ١٧٢ وايام العرب ٤٠١-٤٠٦ وفي رواية يبنسى عامر بدل بنى مالك وهو وهم نبه عليه ابن دريد والازهرى ورد البكرى في التنبينه راجع ايضا المعاني للفتي ١٠٨٧ والمحكم (عقرب) والثاني من الابيات: عراقيت كوم طوال الذرئ - تحربوا نكها للركب ١٢.

② قاله معبد بن علقمة يخاطب زهيراً واوله: تجهل ايدينا ويحلم رأينا - والبيت من كلمة في الحماسة رواه التبريزي (٩١: ٢) وفي السمط (١: ٣٤٣) في ثلاثة والتنبية للبكرى ٤٥ وفي العيون (١: ٢٨٦) والشطر منسوب لاياس بن قتادة وعجزه فيه: تعاقب ايدينا ويحلم رأينا والبيت في المصنوع ٨٣ والصناعتين ٤٩.

③ البيت في اصلاح يعقوب ١٤ (دار المعارف ١٣٧٥ هـ) ولم ينسبه التبريزي في تهذيبه ٢١ وهو لعبدالرحمان بن حسان يهجو مسكينا الداري قال والسب الذي يسابك ١٢.

(سبب بات)

السَّبْتُ کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے۔ سَبَّتَ السَّيْرَ اس نے تسمہ کو قطع کیا سَبَّتَ شَعْرَهُ: اس نے اپنے بال مونڈے سَبَّتَ أَنْفَهُ اس کی ناک کاٹ ڈالی۔

بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو بھی یَوْمَ السَّبْتِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سنبھ کے دن اسے ختم کر دیا تھا اسی سے سَبَّتَ فُلَانٌ ہے۔ جس کے معنی ہیں: وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَعًا﴾ (۸-۱۶۳) سنبھ کے دن (مچھلیاں) سینہ پر ہو کر ان کے سامنے آ جاتیں۔

میں بعض نے یَوْمَ سَبْتِهِمْ سے ان کے کاروبار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کاروبار نہ چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنی یہ کہے ہیں کہ جس روز سنبھ نہ ہوتا ان ہر دو معنی کا مال ایک ہی ہے اور آیت:

﴿أَنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ﴾ (۱۶-۱۲۴) میں سبت سے مراد سنبھ کے دن ترک عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سنبھ کے روز کام کاج چھوڑنے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا..... اور آیت:

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ (۸-۱۹) اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔ میں سبات کے معنی ہیں، حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:

﴿لَتَسْكُنُوا فِيهِ﴾ (۲۸-۱۷۳) تاکہ تم رات میں راحت کرو میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت و سکون کے لیے بنایا ہے۔

(سبب باح)

السَّبْحُ: اس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں۔ سَبَحَ (ف) سَبَحًا وَسَبَاحًا: وہ تیز رفتاری سے چلا پھر استعارہ کے طور پر یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿كُلُّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ (۲۱-۳۳) سب (اپنے اپنے) فلک یعنی دوار میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا﴾ (۹-۳) اور فرشتوں کی (قسم جو آسمانوں اور زمین کے درمیان) تیرتے پھرتے ہیں۔ اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ گزر کرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا﴾ (۳-۷) دن کے وقت تو تم بہت مشغول کار رہتے ہو۔

التَّسْبِيحُ کے معنی تزیہ الہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنی عبادت الہی میں تیزی کرنا کے ہیں..... پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پر ہونے لگا ہے جیسا کہ اِبْعَادَ كَالْفَرْشِ پر بولا جاتا ہے: اَبْعَدَهُ اللَّهُ. خدا سے ہلاک کر دے۔ پس تسبیح کا لفظ تولی، فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ﴾ (۳۷-۱۴۳) تو

میں ہے (سب) چار ونا چار اللہ ہی کے آگے سر بسجود ہے۔

اور آیت:

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ﴾ (۱۶-۳۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں (سب) اللہ ہی کے آگے سر بسجود ہیں۔

میں سجدہ کے ہیں یعنی تسبیح کے حقیقی معنی مراد ہیں جیسا کہ سجدہ کے ہیں مگر ان کا ادراک ہماری سمجھ سے بالاتر ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ کے استدراک اور آسمان وزمین کے ذکر کے بعد وَمَنْ فِيهِنَّ کے عطف سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے اس کی تقدیر یہ بیان کی ہے۔

يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَيَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي الْأَرْضِ مگر یہ صحیح نہیں ہے اولاً تو اس لئے کہ ”مَنْ“ یعنی ذوالعقول کی تسبیح کو ہم سمجھتے ہیں اور قرآن پاک نے وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ کہا ہے اور ثانیاً اس لئے کہ بعد میں وَمَنْ فِيهِنَّ عطف کے ساتھ مذکور ہے پھر اگر شروع آیت میں بھی مَنْ فِي السَّمَوَاتِ کی تقدیر کو مان لیا جائے (جیسا کہ بعض نے کہا ہے) تو اس عطف کا بے معنی ہونا لازم آتا ہے (لہذا صحیح یہ ہے کہ سب اشیاء (بشمول آسمان وزمین) کی تسبیح اور سجود کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں اور اس کے سامنے سر بسجود رہتی ہیں لیکن بعض تخریری طور پر اور بعض اپنے اختیار اور ارادہ سے اور یہ بات تو بلا

اگر یونس علیہ السلام اس وقت (خدا کی تسبیح و تقدیس) کرنے والوں میں نہ ہوتے۔

یہاں بعض نے مُسَبِّحِينَ کے معنی مُصَلِّينَ کے ہیں لیکن انب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی عبادت پر محمول کیا جائے۔

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾ (۲-۳۰) اور صبح و شام اسی کی تسبیح و تقدیس کرتے رہنا۔

﴿فَسَبِّحْهُ وَادْبَارَ السُّجُودِ﴾ (۵۰-۳۰) (اور رات میں بھی) اس کی تسبیح و تقدیس کرو اور نمازوں کے بعد بھی۔ ﴿لَوْ لَا تَسْبِيحُونَ﴾ (۲۸-۲۸) یعنی اس کی عبادت اور شکرگزاری کیوں نہیں کرتے ہو۔

بعض نے اسے استثناء کے معنی پر محمول کیا ہے یعنی تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے اور اس کی دلیل آیت کریمہ: ﴿إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ وَلَا يَسْتَأْذِنُونَ﴾ (۶۸-۱۷) ہے یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح ہوتے ہی پھل کاٹ لیں گے اور استثناء نہ کیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (۱۷-۲۳) ساتوں آسمانوں اور زمین اور جو (فرشتے اور آدمی) آسمان وزمین میں ہیں (سب) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے ہیں اور جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد و ثناء کے ساتھ اس کی تسبیح و تقدیس کر رہی ہیں مگر تم لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

میں تسبیح کے وہی معنی مراد ہیں جو کہ آیت کریمہ:

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ (۱۳-۱۶) اور جس قدر مخلوق آسمانوں وزمین

السُّبْحَةُ: بمعنی تسبیح ہے اور ان منکوں کو بھی سُبْحَةٌ کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

(س ب خ)

السَّبْحُ: کے معنی وسعت کے ہیں اور آیت:

﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا﴾ (۷۳-۷۴)
کہ تیرے لئے دن میں بڑا مشغلہ ہے۔ میں ایک قرأت سَبْحًا بھی ہے۔

سَبَّخَ اللَّهُ عَنْهُ الْحُمَى: اللہ تعالیٰ نے اس کا بخار ہلکا کر دیا۔

السَّبِيحُ: پرند کے پر اور دھکی ہوئی روئی وغیرہ کو کہا جاتا ہے جن میں اکتاز اور ثقل نہیں ہوتا۔

(س ب ط)

السَّبَطُ: اس کا اصل معنی سہولت کے ساتھ کسی چیز کا منبسط ہونا ہے اور سَبَطَ (س) سَبُوطًا وَسَبَاطَةً وَسَبَاطًا کے معنی بالوں کے سیدھا اور دراز ہونے کے ہیں اور سیدھے بالوں کو جن میں گھٹکت نہ ہوں سَبَطٌ یا سَبِطٌ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خوش قامت عورت کو بھی سَبِطَةٌ کہا جاتا ہے اور دراز کف دست آدمی کو سَبَطُ الْكُفَّيْنِ کہتے ہیں اور یہ سخاوت سے کہنا یہ ہوتا ہے۔ السَّبَطُ اس کے معنی اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور نواسے کے ہیں گویا اس میں فروع کے امتداد کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

اختلاف کبھی مانتے ہیں کہ آسمان وزمین اور دواب، جانوروں کی تسبیح تسخیری ہے یعنی ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ پر دال ہیں۔ البتہ اختلاف اس میں ہے کہ آیا آسمان وزمین تسبیح بالا اختیار کرتے ہیں؟ تو آیت اسی معنی کی مقتضی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

سُبْحَانُ یہ اصل میں عُفْرَانُ کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ﴾ (۳۰-۱۷) سو جس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔

﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا﴾ تو پاک ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔^۵ (سربج)

(۲۱۸) سُبْحَانَ مِنْ عِلْقَمَةِ الْفَاحِرِ

سبحان اللہ! علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سُبْحَانَ عِلْقَمَةِ ہے اس میں مِنْ معنی اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمہ کی طرف سبحان کی اضافت بطور جنکم ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "سُبْحَانَ اللَّهِ مِنْ أَجْلِ عِلْقَمَةِ" ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔ السُّبُوحُ الْقُدُّوسُ: یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فُعُولٌ کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے كَلُوبٌ وَسَمُودٌ۔

① قاله الاعشى في هجو علقمة وصدرة: اقول لساجاء في فخره - انظر الخبر وترجمة الشاعر في الاغانى (۱۵ و ۵۵) والخزانة (۲: ۴۲-۴۴) والبيت في ديوانه ۱۰۶ والجمهرة (۱: ۲۲۹) والشمسرى (۱: ۱۶۳) ومجاز القرائن رقم ۳۶ واللسان والتاج والاساس والمحکم (سبح) والسبط (۱: ۵۵۵) والقرطبي (۱: ۲۷۶) والطبري (۱: ۲۱۱) والصحاح (سبح) وغريب القرائن للفتي ۸ وعلقمة هو علقمة ابن علالثة صحابي قدم على رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو شيخ فاسلم وبايع وروى حديثاً واحداً واستعمله عمر بن الخطاب على حوران فمات بها والبيت في مجالس ثعلب (۱: ۲۱۶) وامالي الشجرى (۲: ۲۰۰) وابن خالويه (۵۴).

آیتیں (عطا فرمائیں) جو نماز کی ہر رکعت میں مکرر پڑھی جاتی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ السَّبْعُ الطَّوَالُ یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک ساتھ لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثالی کہا گیا ہے کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں اور جملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں۔ السَّبْعُ وَالنَّبِيعُ: اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرنا۔ الْأَسْبُوعُ: ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع آسَابِيعُ طُفْتُ بِالنَّبِيعِ اسْبُوعًا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے۔ سَبَعْتُ الْقَوْمَ: میں ان کا ساتواں بن گیا۔ أَخَذْتُ سُبْعَ أَمْوَالِهِمْ: میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔

السَّبْعُ: درندہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد ”عدد تام“ ہوتا ہے ہڈالی نے کہا ہے۔^۱

(۲۱۹) كانه عَبْدٌ لِّأَبِي رَيْبَعَةَ مُسْبِعٌ

گویا وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔

بعض نے کہا ہے کہ مُسْبِعٌ کا معنی مُهْمَلٌ مَعَ السَّبَاعِ کئے ہیں۔ یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مُسْبِعٌ (سَبْعُ) پڑھا ہے۔ اور یہ دَعِيٌّ سے

﴿وَعَقُوبَ وَالْأَسْبَابَ﴾ (۲-۱۴۰) اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد۔

یہاں اسباب سے مراد قبائل ہیں۔ ہر قبیلہ ایک شخص کی اولاد سے تھا۔ جیسے فرمایا:

﴿أَسْبَابًا أُمَّمًا﴾ (۷-۱۶۰) (الگ الگ) بارہ قبیلے بنا دیئے۔ الْأَسْبَابُ: وہ مسقف راستہ جو دو مکانوں کے درمیان ہو۔ اور أَخَذْتُ فَلَانًا سَبَابُ کے معنی ہیں فلاں کو بخار چڑھ گیا مثل مشہور ہے۔^۲ (مثل)

السَّبَابَةُ خَيْرٌ مِنْ قُمَامَةٍ کہ خاک رو بہ کوڑے سے بہتر ہے۔ سَبَطَتِ النَّاقَةُ وَلَدَهَا: اونٹی نے ناتمام بچہ گرا دیا۔

(س ب ع)

السَّبْعُ اصل میں ”سَبْعُ“ سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿سَبْعَ سَمَوَاتٍ﴾ (۲-۲۹)

سات آسمان، ﴿سَبْعًا شِدَادًا﴾ (۸-۱۴) سات مضبوط (آسمان بنائے)۔ ﴿سَبْعَ سُبُلَاتٍ﴾

(۱۲-۳۶) سات بالیں۔ ﴿سَبْعَ لَيَالٍ﴾ (۶۹-۳۶) سات راتیں۔ ﴿سَبْعَةَ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸-۲۲)

(وہ) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ ﴿سَبْعُونَ ذِرَاعًا﴾ (۶۹-۳۳) ستر گز۔ ﴿سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ (۹-۸۰) ستر مرتبہ۔ اور آیت:

﴿سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ (۱۵-۸۷) (الحمد کی) سات

① المثل فی حل المعامح ۱۲۔

② قاله ابو ذؤيب الهذلي يصف حماراً لوحشى واوله: صحب الشوايب لايزال والبيت من كلمة مفضلية في ۶۵ بيتاً وفي الحمهرة (۲: ۲۴۲) اور رد منها المؤلف (۳۶۶، ۳۷۵، ۳۷۶) راجع نظام الغريب للرعي ۱۳۳ واصلاح يعقوب ۲۴۷ والمحکم (سبع-ربيع) والسلسان (شرب) سبع والاغاني (۱: ۲۹) والمزهر (۱: ۳۵) والصاحي ۶۹ قال يعقوب في اصلاحه اسبع عبدى اذا هملته فهو سبع وفي الصاحي لفظه مسبع مفسر حتى الان تفسيراً شافياً.

کنایہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔

سَبَّحَ قُلَانَا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ الْمُسْبَعُ: درندوں کی سرزمین۔

(س ب غ)

دِرْعٌ سَبَائِعٌ پوری اور وسیع زرہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَنْ أَعْمَلَ سَبَائِعَاتٍ﴾ (۱۱-۳۴) کہ کشادہ (اور پوری) پوری زرہ ہیں بناؤ۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اسْبَاعُ الْوُضُوءِ (پورا وضو کرنا) اور اسْبَاعُ التَّعَمُّ: پورا پورا انعام کرنا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ﴾ (۲۱-۲۰) اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کیا۔

(س ب ق)

السَّبْقُ: اس کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھ جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا﴾ (۴-۳۹) پھر وہ (حکم الہی) کو سنے کے لئے لپکے ہیں۔

الْإِسْتِبَاقُ کے معنی سابق یعنی ایک دوسرے سے سبقت کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ﴾ (۱۲-۱۷) ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرنے لگ گئے۔

﴿وَأَسْتَبَقَا الْبَابَ﴾ (۱۲-۲۵) اور دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچے۔

مجازاً ہر شے میں آگے بڑھ جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَا سَبَقُونَا إِلَيْهِ﴾ (۱۱-۳۶) تو یہ ہم سے اس کی

طرف سبقت نہ کر جاتے۔

﴿وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ﴾ (۲۰-۱۲۹) اگر تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ فرمائی ہوتی۔ پھر استعارہ کے طور پر احرارِ فضیلت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ﴾ (۵۶-۱۰) اور آگے نکل جانے والے ہی اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔

تو سَابِقُونَ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمالِ صالحہ کے ذریعہ ثوابِ الہی اور جنت کی طرف پیش پیش جانے والے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:

﴿يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ﴾ (۳۳-۶۱) یہی لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے لئے لپکتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ﴾ (۵۶-۶۰) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہماری گرفت اور قبضہ سے باہر نہیں نکل سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا﴾ (۸-۱۵۹) کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے قابو سے نکل گئے ہیں۔

﴿وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ﴾ (۲۹-۲۹) اور نہ وہ (ہم سے کہیں) بھاگ کر جاسکے۔

(س ب ل)

السَّبِيلُ: اصل میں اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت سے چلا جاسکے، اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

اور دوسری آیت میں ان کو لے کر چلنے والے یعنی پیغمبر کی طرف۔

﴿قَتُلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۴۷-۴۸) جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو گئے۔

﴿إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ﴾ (۴۰-۴۹) اور وہی راہ دکھاتا ہوں جو سیدھی ہے۔

﴿وَلَتَسْتَبِينَ سَبِيلَ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۶-۵۵) تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔

﴿فَاسْأَلِكُنِي سُبُلَ رَبِّكَ﴾ (۱۶-۱۶۹) (مزے سے) اپنے پروردگار (کے تعلیم کئے ہوئے آسان) راستوں پر چل۔

اور سبیل کے معنی شاہراہ بھی آتے ہیں۔
جیسے فرمایا:

﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي﴾ (۱۲-۱۰۸) (اے پیغمبر) کہہ دو یہی میرا راستہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿سُبُلَ السَّلَامِ﴾ (۵-۱۶) سلامتی کے راستوں (کی طرف) میں سبل السلام سے جنت کے راستے مراد ہیں۔

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾ (۹-۱۹) محسنین پر کوئی الزام نہیں۔

﴿فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ﴾ (۳۱-۳۲) تو یہ لوگ (معذور ہیں) ان پر

کوئی الزام نہیں۔ الزام تو ان پر ہی ہے۔

﴿إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا﴾ (۱۷-۳۲) مالک عرش (یعنی خدا تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا۔)

عام محاورہ ہے:

﴿وَأَنهَارًا وَسُبُلًا﴾ (۱۶-۱۵) دریا اور راستے۔

﴿وَجَعَلْ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا﴾ (۷۱-۳۰) اور تمہارے لئے اس میں راستے بنا دیئے۔

اور آیت:

﴿وَأَنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ﴾ (۳۳-۳۷) اور وہ صحیح راہ سے روکتے ہیں۔

میں ”السَّبِيلُ“ سے مراد طریق حق ہے کیونکہ اسم جنس جب مطلق استعمال ہو تو حق (یعنی فرد کامل) ہی مراد ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ﴾ (۸۰-۲۰) پھر (اس پر) راہ آسان کر دی۔

اور راہ گیر کو سَابِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَابِلَةٌ ہے اور جس راہ پر بہت زیادہ آمد و رفت ہو اسے سَبِيلٌ سَابِلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر کا محاورہ ہے۔^۱

إِنَّ السَّبِيلَ اس مسافر کو کہتے ہیں جو اپنی منزل مقصود سے دور ہو اور سبیل کی طرف اس کی نسبت بوجہ مہارت کے ہے۔ پھر سبیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو عام اس سے کہ وہ چیز خیر ہو یا شر چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ﴾ (۱۶-۱۲۵) اللہ کے راستے کی طرف دعوت دو۔

﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي﴾ (۱۲-۱۰۸) (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سبیل سے مراد راہ حق ہی ہے لیکن پہلی آیت میں مبلغ (پہنچانے والے) کی طرف نسبت ہے

۱ و لمثل هذا الكلام يقال له محاز في الاستاد ۱۲.

﴿فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ (۵۴:۷) چھ روز میں۔ سِتِّينَ
مِسْكِينًا (۴:۵۸) ساٹھ مساکین کو۔
اور سِتُّ اصل میں سِدْسُ ہے جسے اس کی بحث میں
ذکر کیا جائے گا۔ (انشاء اللہ)

(س ت ر)

السِّتْرُ: (مصدر) اس کے اصل معنی کسی چیز کو
چھپا دینے کے ہیں سِتْرٌ وَسِتْرَةٌ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں
جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا﴾ (۱۸-۹۰)
جن کے لئے ہم نے اس (سورج) سے بچنے کے لئے کوئی
اوٹ نہیں بنائی۔

﴿حِجَابًا مَسْتُورًا﴾ (۱۷-۳۵) ایک گاڑھا پردہ
(حائل کر دیتے ہیں)

الْإِسْتِارُ: اس کے معنی چھپ جانے کے ہیں۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتِيرُونَ﴾ (۳۱-۲۳) اور اس لئے نہ
چھپتے تھے۔

(س ج د)

السُّجُودُ: (ن) اس کے اصل معنی فروتنی اور
عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس
کی عبادت کرنے کو سُجُودٌ کہا جاتا ہے اور یہ انسان
حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ)
سجود کی دو قسمیں ہیں سجود اختیاری جو انسان کے ساتھ خاص
ہے۔ اور اسی سے ثواب الہی کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:
﴿فَأَسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوهُ﴾ (۵۳-۶۲) سوال اللہ
کے لئے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

أَسْبَلُ السِّتْرَ وَالذَّلِيلَ: اس نے پردہ دامن لٹکا دیا۔
فَرَسٌ مُسْبِلُ الذَّنَبِ: دراز دم گھوڑا۔ سَبَلُ الْمَطَرُ
وَأَسْبَلُ: بارش برسا اور وہ بارش جو آسمان سے بہہ کر
زمین کی طرف آ رہی ہو اور نوز زمین پر نہ گری ہو اسے سَبَلٌ
کہا جاتا ہے اور سَبَلَةٌ خاص کر موچھوں کے بالوں کو کہا جاتا
ہے۔ کیونکہ وہ (بھی بڑھ کر) نیچے کو لٹکے پڑتے ہیں۔

السُّنْبَلَةُ: بال۔ اس کی جمع سنابل آتی ہے۔ قرآن پاک
میں ہے:

﴿سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ﴾ (۱۲-۴۶) سات سبز
بالیں۔

أَسْبَلُ الزَّرْعُ: کھیتی میں بالیں پڑ گئیں (ماخذ کے ساتھ
متصف ہونا کے معنی پائے جاتے ہیں) جیسے أَحْصَدَ
الزَّرْعُ واجنی النخل کا محاورہ ہے۔
الْمُسْبِلُ: جوئے کے تیروں سے پانچواں تیر۔

(س ب ا)

سَبَأٌ: ایک شہر کا نام ہے جو پرانے زمانے میں
(سبل العرم سے) تباہ ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجِئْتِكَ مِنْ سَبَأٍ نَبِيًّا يَاقِينُ﴾ (۲۷-۲۲) اور میں
سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔ اور اسی
سے ایک ضرب المثل ہے۔

ذَهَبُوا أَيَادِي سَبَأٍ: یعنی وہ تتر بتر ہو گئے اور اہل سبا کی
طرح ان کا نام و نشان مٹ گیا۔

سَبَاتُ الْحُمْرِ: میں نے پینے کے لئے شراب خریدی۔
السَّابِيَاءُ: مشیر یعنی وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے۔

(س ت ت)

سِتَّةٌ: چھ کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

میں بعض نے کہا ہے کہ آدم ﷺ کو سجدہ کرنے سے اس کو قبلہ بنانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آدم ﷺ کے سامنے انکساری اور ان کی اولاد کے مصالح کا بندوبست کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ سو بجز ابلیس کے تمام فرشتے یہ حکم بجالائے تھے۔ اور آیت:

﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ (۲-۵۸) اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انکسار و انقیاد کے ساتھ وہاں جانا اصطلاح شریعت میں سجود کو نماز کا خاص رکن قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا اطلاق سجود قرآن اور سجود شکر پر بھی ہوتا ہے جو سجدہ نماز کے حکم میں ہے اور کبھی اس سے مراد نفس نماز ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَأَذْبَارِ السُّجُودِ﴾ (۵۰-۴۰) اور نماز کے پیچھے بھی۔ یعنی نماز سے فالغ ہونے کے بعد اور چاشت کی نماز کو سُبْحَةُ الضُّحَىٰ اور سُجُودُ الضُّحَىٰ کہتے ہیں۔ اور آیت:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ (۵۲-۴۸) اپنے پروردگار کی حمد و ثناء کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں تسبیح سے نماز مراد ہے۔ الْمَسْجِدُ (ظرف) کے معنی جانے نماز کے ہیں اور آیت: ﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ﴾ (۷۲-۱۸) اور مسجدیں تو خدا ہی (کی عبادت کے لئے ہیں) میں بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے روئے زمین مراد ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کے لئے تمام زمین کو مَسْجِدًا اور طَهْرًا بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک

حدیث میں مروی ہے۔^①

اور سجود تسخیری جو انسان، حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي الْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظُلْمًا لَهُمْ بِالْعُدْوَةِ وَالْأَصَالِ﴾ (۱۳-۱۵) (فرشتے) جو آسمانوں میں ہیں اور جو (انسان) زمین میں ہیں چارونا چار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صبح و شام ان کے سایے (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور نیز فرمایا:

﴿يَتَفِيأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ﴾ (۱۶-۴۸) اس کے سائے (کبھی) دائیں طرف کو اور (کبھی) بائیں طرف کو جھکے (ہوتے ہیں گویا) اللہ کے آگے سر بسجود ہیں۔

تو اس سے مراد سجود تسخیری ہے یعنی وہ زبان حال سے گویا ہیں کہ ان کو کسی صالح حکیم نے بنایا ہے۔ اور وہ اس کی مخلوق ہیں۔ اور آیت:

﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةِ وَهُمْ لَا يُسْتَكْبِرُونَ﴾ (۱۶-۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں اور فرشتے (سب) اللہ ہی کے آگے سر بسجود ہیں اور (ذرا بھی) تکبر نہیں کرتے۔

دونوں قسم کے سجود یعنی تسخیری اور اختیاری پر مشتمل ہے اور آیت:

﴿وَالنَّجْمِ وَالشَّجَرِ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵-۴) اور نجم و شجر اس کے سامنے سر بسجود ہیں۔ میں سجود تسخیری مراد ہے۔ اور آیت:

﴿أَسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ (۲-۳۳) آدم ﷺ کو سجدہ کرو۔

① ولفظه: جعلت لى الارض مسجداً وطهوراً اخرجه الجماعة.

مارنے والے سمندر کی۔

شاعر نے کہا ہے۔ ﴿المختار﴾

(۱۲۲) إِذَا شَاءَ طَالَعَ مَسْجُورَةً

تَرَى حَوْلَهَا النَّبْعَ وَالسَّمْسِمَا

جب وہ چاہتا ہے تو پانی سے پڑ گڑھا اسے نظر آ جاتا ہے

جس کے گردا گرد نبج اور سسم کے درخت اُگے ہوئے

ہیں۔

اور آیت: ﴿وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ﴾ (۸۱-۶) اور

جس وقت دریا پاٹ دیے جائیں۔

کے معنی حسن بصری واللہ نے یہ کئے ہیں کہ جب دریا آگ

سے بھڑکانے لگے جائیں اور بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ جب

ان کے پانی خشک کر دیے جائیں اور یہ ان میں آگ

بھڑکانے کی غرض سے ہوگا۔ ﴿ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ﴾

(۳۰-۷۲) پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ جیسا کہ

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲-۲۳) جس کے

ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

سَجَرَتِ النَّاقَةِ: اونٹنی دوڑ میں بھڑک اٹھی یعنی سخت

(۱۷۰) اور بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے اعضاء سجود یعنی

پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ، دونوں زانوں اور دونوں پاؤں

مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ﴾ (۲۷-۲۵) (اور نہیں سمجھتے) کہ

اللہ کو..... سجدہ کیوں نہ کریں۔

میں لازماً سجدہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ میری قوم اللہ ہی کو سجدہ

کرو۔ اور آیت:

﴿وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا﴾ (۱۲-۱۰۰) اور اس کے سامنے

سجدہ ریز ہو گئے۔

میں اظہار عاجزی مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مراد

سجدہ خدمت ہے جو اس وقت جائز تھا اور شعر ﴿اکامل﴾

(۲۲۰) وَافِي بِهَا كَدَارِهِمُ الْآسْجَادِ

میں شاعر نے وہ دَرَاهِم مراد لئے ہیں جن پر بادشاہ کی

تصویر ہوتی تھی اور لوگ ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔

س ج ر

السَّجَرُ: اس کے اصل معنی زور سے آگ

بھڑکانے کے ہیں۔ اور سَجَرَتُ التَّنُورِ کے معنی ہیں

میں نے تور جلادیا اسے ایندھن سے بھردیا اسی سے فرمایا:

﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ﴾ (۵۲-۶) اور (نیز) جوش

① ابن عطاء کافی البحر (۸: ۳۵۲) واللسان (۱: ۴۰۴ و ۱۸۸) والکشاف (۴: ۱۷۸) وقد اشار اليه ابن قتيبه في غريبه ۱۲.

② قاله اسود بن يعفر النهشلي وصدرة: من حمزدي نطف اغن منطق والبيت في اللسان (سجد) والمفضليات (۲: ۱۸)

وفيه لدراهم بدل كدراهم والاسجد بكسر الهمزة السجود قال الاصمعي: وراهم الایجاد، وراهم الاكاسرة اي النصارى وهي

دراهم الحزبية التي اذلتهم ۱۲.

③ البيت لنمر بن تولب العكل والشاعر يصف دغلاً وفي رواية السماسما بدل السمسم وهو شجر يشبه الابدوس او نفسه والبيت من

شواهد الطبری (۲۷: ۱۹۰) والطبرسی (۲۹: ۴۵) والحزانة (۴: ۴۳۸) ومحازالقران لابی عبیده وتهذيب الالفاظ ۵۶۰ وكتاب

الابدال لابی الطیب (۱: ۳۵۱، ۴۷) واللسان والتاج (اسم) والمختارات الشجرية ۱۷۴ (مسورة بدل مسجورة) والاضداد

للاصمعي ۱۶۸ والقرطین (۲: ۴۱) والجمهرة ۲۱ وابن دريد (۲: ۷۶) والسيوطی ۹۶ وشرح السمع لابن انباری ۵۵۶ واضداد ابن

الانباری ۵۴ وابن السکیت ۱۶۸ والمجستانی ۲۶ واضداد لابی الطیب ۳۶۲ وغريب القران للقتبي ۴۲۴.

کہ اَلْسَجِلُّ کے اصل معنی اس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا بعدہ ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے، سَجِلُّ کہنے لگے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَطَيَّ السَّجِلَّ لِلْكِتَابِ﴾ (۲۱-۱۰۳) جیسے خطوں کا مکتوب لپیٹ لیا جاتا ہے یعنی لکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کے لئے اسے لپیٹ کر رکھ لیتے ہیں۔

(س ج ن)

السَّجْنُ: (مصدر ن) قید خانہ میں بند کر دینا۔ اور آیت: ﴿رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ﴾ (۱۲-۳۳) اے میرے پروردگار! قید خانہ میں رہنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ میں ایک قرأت السَّجْنِ (نفسحہ سین) بھی ہے۔

﴿لَيْسَ جُنَّتَهُ حَتَّىٰ حِينٍ﴾ (۱۲-۳۵) (ان کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ) ایک وقت خاص تک اس کو قید رکھیں۔

﴿وَدَخَلَ مَعَهُ السَّجْنَ فَتَيَانٍ﴾ (۱۲-۳۶) اور (اتفاق سے) یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو جوان (اور بھی) جیل خانہ میں داخل ہوئے۔

السَّجِينُ یہ عِلِّيِّينُ کے مقابلہ میں جنم کا نام ہے اور اس میں الفاظ کی زیادتی، معنی کی زیادتی پر دال ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ زمین کے ساتویں طبقہ کا نام ہے۔ قرآن

دوڑی جیسے اِسْتَعَلَّتِ النَّاقَةُ کا محاورہ ہے اور السَّجِيرُ کے معنی مخلص دوست کے ہیں گویا وہ محبت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

فَلَانٌ مُّحْرَقٌ فِي مَوْدَةٍ: کہ فلاں سوختہ محبت ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۲۲۲) سَجْرَاءُ نَفْسِي غَيْرُ جَمْعِ اُشَابَةِ

(س ج ل)

السَّجْلُ: بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور سَجَلْتُ الْمَاءَ فَانْسَجَلَ کے معنی ہیں: میں نے پانی بہایا تو وہ بہ گیا، اور اَسَجَلْتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے پانی سے بھرا ہوا ڈول دیا اور استعارہ کے طور پر عطائے کثیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

الْمَسَاجِلَةُ: کے اصل معنی ڈول کے ساتھ کھیتی سیراب کرنے کے ہیں اور پھر مبارات اور مناضلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۲۲۳) مَنْ يُسَاجِلُنِي يُسَاجِلْ مَا جِدَا

جو میرے ساتھ مقابلہ کرے گا تو وہ ایک شریف آدمی سے مقابلہ کرے گا۔ یعنی میں ماجد اور شریف ہوں۔

السَّجِيلُ: سَبْ گُل کو کہتے ہیں۔ اور اصل میں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ لفظ فارسی سے معرب ہے بعض نے کہا ہے

① قاله ابو كبير الهذلي (عمر بن الحليس) وتامه: حُشْدًا وَالاسْلَكُ الْمَفَارِشُ عَزَلُ وَالْبَيْتُ فِي تَهْذِيبِ الْاِصْلَاحِ ٤٦٧ مَعَ اَخْر دِيوانه دون الهدليين (٢: ٩٠) والمعاني الكبير ٥٢١ والمرزوقي ٢٣٣ والمحکم (عزل، حشد) وفيه قال ابن جنى: روى حشد مثلث الدال.

② قاله الاخضر اللبهي (فضل بن عباس) وتامه: يملأ الدلوالي عقد الكرب - والبيت في اللسان (سجل) وتفسير الطبري (٢: ٩٤) والامالي (٢: ٥٤) والسمط (٧٠٠) والكمال ٦٥ او الاغاني (١٤: ١٧١ / ١٥١: ٣) وكنيات العرجاني ٥١ والمعاني للقتبي ٧٩٥ والاضداد لابن الانباري ٣٣٥ وبعده: انا الاخضر من يعرفني - اخضر الجلد في بيت العرب واما قال انا الاخضر لانه كان شديدنا الامة والحضرة انما اتته من قبل جدته (وامه ام الفضل بنت العباس بن عبدالمطلب) وكانت حبشية وفي مصارع العشاق ٣٧٩ تامه: اخضر الجلدة في بيت العرب قال وتعنى به عبدالله بن جعفر في مجلس معاوية بالابطخ وفي الحصري (٣: ١٦١) واختلاط.

پاک میں ہے:

﴿لَيْسَ سَجِينٌ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَجِينٌ﴾ (۸۳-۸۷)
(بدکار لوگوں کے نامہ اعمال) سَجِين میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سَجِين کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو قرآن پاک نے مَا أَدْرَاكَ کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسے بعد میں بیان کر دیا گیا ہے اور جسے مَا يَذْرِيكَ کے ساتھ بیان کیا ہے اسے مبہم چھوڑ دیا ہے لیکن یہاں باوصف اس کے کہ سَجِينٌ اور عَلِيَيْنِ کو ماادراک کے بعد بیان فرمایا ہے پھر بھی انہیں مبہم رکھا گیا ہے اور کتاب کی تفسیر بیان فرمادی ہے۔ تو اس میں ایک باریک نکتہ ہے جسے اس کتاب کے بعد دوسری جگہ پر بیان کیا جائے گا۔

(س ج و)

سَجَا اللَّيْلُ: رات پرسکون ہوگئی۔ قرآن پاک

میں ہے:

﴿وَاللَّيْلُ إِذَا سَجَى﴾ (۹۳-۲) اور رات کی (قسم)
جب ساکن ہو جائے۔

اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ رات کے پرسکون ہونے کے لئے کہا جاتا ہے۔

هَدَاتِ الْأَرْجُلُ: یعنی پاؤں کی چاپ رک گئی۔ اور عَيْنٌ سَاجِيَةٌ کے معنی خاموش آنکھ کے ہیں اور سَجَى الْبَحْرُ کے معنی ہیں سمندر پرسکون ہو گیا اسی سے استعارہ کے طور پر میت کو کفن میں چھپانے کے لئے تَسْجِيَةٌ الْمَيِّتِ کہا جاتا ہے۔

(س ج ب)

السَّحْبُ: اس کے اصل معنی کھینچنے کے ہیں۔

چنانچہ دامن زمین پر گھسٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل گھسٹنے پر سَحْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اسی سے بادل کو سَحَابٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ اسے ہوا کھینچ کر لے چلتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ خود پانی کو کھینچ کر لاتا ہے۔ اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ﴾ (۵۴-۲۸)
جس دن ان کو ان کے منہ کے بل (دوزخ کی) آگ میں گھسیٹا جائے گا۔

اور فرمایا: ﴿يُسْحَبُونَ ۝ فِي الْحَمِيمِ﴾ (۴۰-۷۱، ۷۲)
انہیں دوزخ میں کھینچا جائے گا۔

مخاورہ ہے۔

فُلَانٌ يَتَسَحَّبُ عَلَىٰ فُلَانٍ: کہ فلاں اس پر

جرات کرتا ہے۔ جیسا کہ يَتَجَرَّءُ عَلَيْهِ کہا جاتا ہے۔

السَّحَابُ: ابر کو کہتے ہیں خواہ وہ پانی سے پر ہو یا خالی

اس لئے خالی بادل کو سَحَابٌ جَهَامٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿الَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَزْجِي سَحَابًا﴾ (۲۳-۲۴)
تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا﴾ (۷-۵۷)
وہ بھاری بادل کو اٹھالاتی ہیں۔

﴿وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ (۱۳-۱۲) اور وہ بھاری بادل اٹھاتا ہے۔

اور کبھی لفظ سحاب بول کر بطور تشبیہ کے اس سے سایہ اور تاریکی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوْ كَطَلَمَاتٍ فِي بَحْرِ لُجِّي يَعْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ﴾

حدیث میں ہے۔ ﴿(۱۷۱) کُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالْتَارُ اَوْلٰی بِہ..... جو گوشت مال حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ آگ کے لائق ہے اور اسی سے ”رشوت“ کو سُحْت کہا گیا ہے۔ ﴿(۱۷۲) ایک روایت میں ہے۔ ﴿(۱۷۳) کہ حجام (پچھنا لگانے والے) کی کمائی ”سحت“ ہے تو یہاں سُحْت بمعنی حرام نہیں ہے۔ جو دین کو برباد کرنے والا ہو بلکہ سُحْت بمعنی مکروہ ہے یعنی ایسی کمائی مروت کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ایسی کمائی سے اونٹنی کو چارہ ڈالنے اور غلاموں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے۔

(س ح ر)

السَّحَرُ کے معنی حلق کے کنارہ اور پھپھڑے کے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔
اِنْتَفَخَ سَحْرَةً: اس کا پھپھڑا پھول گیا (یعنی وہ بزدل ہے) اور بڑے حلق والے اونٹ کو بَعِیرٌ سَحْرٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز ذبح کے وقت زخروے سے اتار کر پھینک دی جاتی ہے اسے ”سَحَارَةٌ“ کہا جاتا ہے۔ اور یہ نَفَايَةٌ وَسُقَاطَةٌ کے وزن پر ہے اور فَعَالَةٌ کا وزن ردی اشیاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اسی سے سَحْرٌ مشتق ہے جس کے معنی گلے یا پھپھڑے پر مارنے کے ہیں۔ اور سَحْرٌ کا لفظ مختلف معانی میں

مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہ سَحَابٌ ظُلَمَاتٌ بَعْضُہَا فَوْقَ بَعْضٍ ﴿(۲۳-۴۰)﴾ یا (ان کے اعمال کی مثال) بڑے کھرے دریا کے اندرونی اندھیروں کی سی ہے کہ دریا کو لہرنے ڈھانپ رکھا ہے اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہران کے اوپر بادل (کی تاریکی غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک۔

(س ح ت)

السُّحْتُ: اصل میں اس جھپکے کو کہتے ہیں جو پوری طرح اتار لیا جائے۔ (اور اس سے ہلاک کر دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَيَسْحَتُكُمْ بِعَذَابٍ﴾ ﴿(۲۰-۶۱)﴾ ورنہ وہ (تم پر کوئی) عذاب (نازل کر کے اس) سے تم کو ملیا میٹ کر دے گا۔ اس میں ایک قرأت فَيَسْحَتُكُمْ (فتح یاء کے ساتھ) بھی ہے اور سَحْتَهُ (ض) وَأَسْحَتَهُ (افعال) کے ایک ہی معنی آتے ہیں یعنی بیخ کنی اور استیصال کرنا۔ پھر اسی سے سُحْتٌ کا لفظ ہر اس ممنوع چیز پر بولا جانے لگا جو باعث عار ہو کیونکہ وہ انسان کے دین اور مروت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿اَتَّكَلُونَ لِلسُّحْتِ﴾ ﴿(۵-۴۲)﴾ اور مال حرام کو کھاتے چلے جاتے ہیں۔
یعنی وہ چیز جو ان کے دین کا ناس کرنے والی ہے۔ ایک

- ① الحدیث بهذا اللفظ فی شعب الایمان من حدیث کعب بن عجرۃ باختلاف الفاظ فی الدارمی (۲: ۳۲۸) والمستدرک للحاکم والترمذی ولفظہ لا یروہ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالْتَارُ اَوْلٰی بِہ (ہب حل عن ابی بکر وابن جریر - عن ابن عمر کنز العمال (۴) رقم ۶۶ وبعناہ ۷۵۰، ۷۰، ۱۶/۷۹، ۵۲۷) راجع تخریج العراقی علی الاحیاء (ج ۱ ص ۲) وتخریج الکشاف رقم (۴۵۶)۔
- ② راجع للحدیث الفائق (۱: ۸۲) ابن جریر عن ابن عمرو (وابن مردویہ عن ابی ہریرۃ ست خصال من السحت رشوة الامام (الحدیث)۔
- ③ الطبرانی عن رافع بن خدیج والخطیب عن ابی ہریرۃ وابن النجار - عن السائب بن یزید ایضاً عن ابی ہریرۃ وضعفه. انظر ضمن حدیث رافع بن خدیج المذكور الآن والترمذی و ابو داؤد وحسنہ وابن ماجہ من حدیث محیصتہ تخریج احیاء العلوم (۲: ۱۱۴)۔

کرتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار پر۔

اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾
(۲-۱۰۲) بلکہ کفر (کیا تھا تو) شیاطین نے کیا تھا کہ وہ
لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔

اور اس کے تیسرے معنی وہ ہیں جو عوام مراد لیتے ہیں یعنی
سِحْرٌ وہ علم ہے جس کی قوت سے صور اور طہالغ کو بدلا جا
سکتا ہے۔ (مثلاً) انسان کو گدھانا دیا جاتا ہے۔ لیکن
حقیقت شناس علماء کے نزدیک ایسے علم کی کچھ حقیقت نہیں
ہے۔^①

پھر کسی چیز کو سِحْرٌ کہنے سے کبھی اس شے کی تعریف مقصود
ہوتی ہے جیسے کہا گیا ہے۔^② (۱۷۴) إِنَّ مِنَ الْبَيِّنَاتِ
لِلسِّحْرِ (کہ بعض بیان جادو اثر ہوتا ہے۔)

اور کبھی اس کے عمل کی لطافت مراد ہوتی ہے چنانچہ اطباء،
طبیعت کو "سَاحِرَةٌ" کہتے ہیں اور غذا کو سِحْرٌ سے
موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کی تاثیر نہایت ہی لطیف اور
باریک ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿بَلْ نَحْنُ
قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ﴾ (۳-۱۵) یہ تو نہیں کہ ہم پر کسی
نے جادو کر دیا ہے۔

یعنی سحر کے ذریعہ ہمیں اس کی معرفت سے پھیر دیا گیا

استعمال ہوتا ہے اول دھوکا اور بے حقیقت تخیلات پر
بولا جاتا ہے جیسا کہ شعبہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے
نظروں کو حقیقت سے پھیر دیتا ہے یا نَمَامٌ طمع سازی کی
باتیں کر کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک دیتا ہے
چنانچہ آیت:

﴿سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرَهُبُوهُمْ﴾ (۷-۱۱۶)
تو انہوں نے جادو کے زور سے لوگوں کی نظر بندی کر دی
اور ان سب کو دہشت میں ڈال دیا۔

﴿يُخَيِّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ﴾ (۲۰-۶۶) (تو)
موسیٰ علیہ السلام کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا۔

میں سِحْرٌ کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے اور بنا بریں انہوں
نے موسیٰ علیہ السلام کو سَاحِرٌ کہہ کر پکارا تھا چنانچہ قرآن پاک
میں ہے: ﴿فَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾
(۳۳-۳۹) تو ان لوگوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے
لئے اپنے پروردگار سے دعا کر۔

دوم: شیطان سے کسی طرح کا تقرب حاصل کر کے اس
سے مدد چاہنا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ
عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ (۲۶-۲۲۲) (کہ) کیا میں
تمہیں بتاؤں کس پر شیطان اتر کرتے ہیں (ہاں تو وہ اترتا

① وقد نقد عليهم ابن قتيبه في مشكله وتلف على عقول من انكره وقال في اختتام الحجة: فمن آمن بمحمد صلى الله عليه وسلم
وبان ما جاء به الحق بجميع هذا وشرح صدره به ومن انكره..... لانه لا يلا من الايمان وحده السير والقياس على ما شاهد وأرى نبي
الموات والحيوان..... فعماذا ابقى على المسلمين؟ وإى شيء ترك للملحدين انظر مستحبه من ۸۳..... ۹۲ وغرائب القرآن
للنيسابوري والطبري والفخر وبعابه ما كتب صاحب الكشاف والحافظ في الحيوان تجد ما بين التفریقين من خلاف ۱۲.

② قال صلى الله عليه وسلم حين وفد عليه عمرو بن الاهثم والزرقان بن بدر وقيس بن عاصم والمثل يضرب في استحسان المنطق
وايراد الحجة البالغة راجع للمثل الميداني (۱: ۷) والحديث في (مالك، حم، خ، د، ت)، عن ابن عمرو بدون اللام في (حم، د)
عن ابن عباس وفي (د) عن بريدة.

ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ﴾ (۱۵-۱۵) تم پر تو بس کسی نے جادو کر دیا ہے۔
بعض نے کہا ہے: مُسَحَّرٌ وہ ہے جس کے سَحَرٌ یعنی پھیرنا وغیرہ ہو اور مطلب یہ تھا کہ تم غذا کے محتاج ہو (پھر پیغمبر کیسے ہو سکتے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ (ان کے اعتراض کو نقل کرتے ہوئے قرآن نے) فرمایا:

﴿فَجَمَعَ السَّحْرَةَ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ﴾ (۲۶-۲۶)
(۳۸) غرض دن مقرر ہوا اور (اس) معین دن کے وعدے پر جادو جمع کئے گئے۔

﴿فَأَلْقَى السَّحْرَةَ سَاجِدِينَ﴾ (۲۶-۲۶) یہ دیکھ کر جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سجدے میں گر پڑے۔
السَّحْرُ وَالسَّحْرَةُ اصل میں تو اس کے معنی آخربخش کی تاریکی کے ہیں جو دن کی ابتدائی روشنی میں مخلوط ہو۔ پھر اس وقت کا نام ہی سَحَرٌ رکھ دیا گیا ہے۔ محاورہ ہے: لَقِيْتَهُ بِأَعْلَى السَّحَرِينَ: یعنی میں اسے صبح کاذب کے وقت ملا۔ اور مُسَحَّرٌ آدی کو کہتے ہیں جو سحری کے وقت گھر سے نکلا ہو اور السَّحُورُ اس طعام کو کہتے ہیں جو بوقت سحر تناول کیا جائے اور تَسْحَرُ کے معنی سحور تناول کرنے کے ہیں۔

(س ح ق)

السَّحْقُ: (ض ک) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔ زیادہ تر دوا کے پینے پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

سَحَقْتُهُ فَأَنْسَحَقُ: میں نے دوا کو پسا پسا چنا نچدوہ پس گئی
أَسْحَقُ التَّوْبُ کے معنی کپڑے کا پرانا ہو جانا کے ہیں اور پرانے کپڑے کو سَحَقٌ کہا جاتا ہے اسی سے أَسْحَقُ الضَّرْعُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں دودھ خشک ہو جانے کی وجہ سے تھن مرجھا گئے..... اور

﴿مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ﴾ (۲۵-۷) یعنی یہ تو ہماری طرح کا کھانے پینے والا انسان ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ (۲۶-۱۵۴) کہ تم بھی ہم ہی جیسے آدی ہو۔
اور بعض نے کہا ہے کہ مُسَحَّرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جسے جادو کا علم دیا گیا ہو اور وہ اپنے دعویٰ کو لطف و وقت سے ثابت کر سکتا ہو۔ اور آیت:

﴿إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا﴾ (۱۴-۱۴)
کہ تم مسحور آدی کے پیچھے پڑے ہو۔

میں مَسْحُورًا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اور فرمایا:

﴿فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَى مَسْحُورًا﴾ (۱۴-۱۰۱) تو فرعون نے ان سے کہا کہ

موسیٰ علیہ السلام! میں تیری نسبت ایسا خیال کرتا ہوں کہ کسی نے تجھ پر جادو کر کے تجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔

لیکن آیت:

﴿إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ (۵-۱۱۰) کہ یہ صریح جادو ہے۔

دوسرے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَجَاؤُا بِسِحْرِ عَظِيمٍ﴾ (۷-۱۱۶) اور (بہت ہی)

ہے۔

اور بلند آواز آدمی کو **مَسْحَلٌ** کہا جاتا ہے گویا وہ **سَجِيلٌ** **الْحِمَارِ** کے مشابہ ہے یعنی رفع صوت کے لحاظ سے نہ کہ آواز کے کرخت ہونے کے لحاظ سے جیسا کہ قرآن پاک نے گدھے کی آواز کے متعلق کہا ہے:

﴿إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ (۳۱)۔
 (۱۹) اور وہاں لگام کے دونوں طرف کے حلقوں کو **مَسْحَلَتَانِ** کہا جاتا ہے۔

(س خ ر)

التَّسْخِيرُ (تفعلیل) کے معنی کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَافِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۵۴)۔
 (۱۳) اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اس نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔

﴿سَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبِينَ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْآيِلَ وَالنَّهَارَ.....﴾ (۱۴-۳۳) اور (اسی طرح ایک اعتبار سے) سورج اور چاند کو تمہارے اختیار میں کر دیا کہ دونوں پڑے چکر کھارے ہیں اور (ایسے ہی ایک طرح سے) رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ الْفُلْكَ﴾ (۱۴-۳۳) اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَا هَآلَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (۲۲-۳۶) ہم نے یوں ان (جانوروں) کو تمہارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم (ہمارا) شکر کرو۔

ہو سکتا ہے کہ "اسْحَقُ" (علم) بھی اسی سے مشتق ہو اس صورت میں یہ اسمِ مضاف ہوگا۔ اور کپڑے کے بوسیدہ کر دینے پر **سَحَقَهُ** (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور مجاورہ میں **أَسْحَقَهُ اللَّهُ** کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اسی سے فرمایا:

﴿فَسُحِقًا لِّأَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (۶۷-۱۱) کہ دو زخیوں کے لئے دوری ہے۔ اور فرمایا:

﴿أَوْ تَهْوِي بِه الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ﴾ (۲۲)۔
 (۳۱) یا اس کو ہوا کسی دور جگہ لے کر ڈال دے گی۔

اور استعارہ کے طور پر جاری خون کو **مُنْسَحَقٌ** و **سَحُوقٌ** کہا جاتا ہے جیسے مزروء

(س ح ل)

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ (۲-۳۹) تو دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔

یہ اصل میں **سَحَلَ الْحَدِيدَ** سے ہے جس کے معنی ریتی سے لوہے کا برادہ بنانا اور پھیلنے کے ہیں۔ بعض کا خیال ہے دریا کے کنارے کو ساحل کی بجائے **مَسْحُولٌ** کہنا چاہیے تھا مگر اسمِ مفعول کی بجائے اسمِ فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ **هَمْ نَاصِبٌ** کہا جاتا ہے حالانکہ **هَمْ مَنْصُوبٌ** ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک **سَاحِلٌ** کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ پانی کو متفرق اور محدود کر دیتا ہے اس صورت میں ساحل بمعنی فاعل ہوگا۔

السُّحَالَةُ: برادہ کو کہتے ہیں اور گدھے کی ہنہناہٹ کو **سَجِيلٌ** یا **سَحَالٌ** کہا جاتا ہے گویا کرخت ہونے کے لحاظ سے اس کی آواز لوہے کو ہر گڑنے کی آواز کے مشابہ

الْأَشْرَارِ ۝ اتَّخَذْنَا هُمْ سِخْرِيًّا ﴿ (۳۸-۶۳) اور
دوزخی آپس میں یہ بھی کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم برے
لوگوں میں شمار کرتے تھے کیا بات ہے کہ ہم ان کو (یہاں
دوزخ میں) نہیں دیکھتے کیا ہم نے ان کی (ناحق) ہنسی
بنائی۔ میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں لیکن اس کے بعد
﴿وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ﴾ (۲۳-۱۱) سے
دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے۔

(س ح ط)

السَّخَطُ وَالسُّخُطُ: اس سخت غصہ کو کہتے ہیں جو
سزا کا مقتضی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ﴾ (۲۳-۱۱) تو وہ فوراً غصہ سے
بھر جاتے۔

اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد
انزال عقوبت ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا آسَخَطَ اللَّهُ﴾ (۲۷-۲۸)
(اور ان کی) یہ توبت اس لئے (ہو گئی) کہ جو چیز خدا کو
بری لگتی ہے یہ اسی (کے رستے) پر چلے۔

﴿أَنْ سَخَطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۵-۸۰) (نتیجہ یہ ہوا)
کہ (دنیا میں بھی) خدا ان سے ناراض ہوا۔

﴿كَمَنْ بَاءَ بِسَخِطِ مِنَ اللَّهِ﴾ (۳-۱۶۱) اس شخص
جیسا (فعل سرزد) ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں آ گیا
ہو۔

(س د ن)

السَّدُّ: (دیوار، آڑ)

بعض نے کہا ہے کہ سَدٌّ اور سُدٌّ کے ایک ہی معنی
ہیں اور بعض دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ سُدٌّ (بضمہ

﴿سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرْنَا هَذَا﴾ (۳۳-۱۳) پاک
ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا
ہے۔

تو مُسَخَّرٌ وہ ہے جسے کسی کام پر مجبور کر کے لگایا گیا ہو اور
سِخْرِيٌّ وہ جسے اولاً تو کسی کام پر مجبور کیا جائے پھر وہ
اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿لِيَتَّخِذَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ (۳۳-۳۲)
تاکہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنائے رہیں۔

اور سَخَّرْتُ مِنْهُ وَاسْتَسَخَّرْتُهُ کے معنی کسی سے
مذاق کرنے اور اس کی ہنسی اڑانا ہیں قرآن پاک میں ہے:
﴿قَالَ إِنَّ تَسْخِرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخِرُ مِنْكُمْ كَمَا
تَسْخَرُونَ﴾ (۱۱-۳۸) وہ (حضرت نوح علیہ السلام) ان کے
تمسخر کا یہ (جواب دیتے کہ اگر (آج) تم ہم پر
ہنستے ہو تو جس طرح تم (ہم پر) ہنستے ہو (اسی طرح) ہم
(ایک دن) تم پر نہیں گے۔

﴿بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ﴾ (۳۷-۱۲) (اے پیغمبر)
بات یہ ہے کہ تم (ان کے انکار قیامت سے) تعجب کرتے

ہو اور یہ (تمہاری باتوں پر) ہنستے ہیں۔ رَجُلٌ سُخْرَةٌ
ہنسی اڑانے والا۔ اور سُخْرَةٌ وہ ہے جس کی لوگ ہنسی
اڑائیں اور ہنسی اڑانے والے کے اس فعل کو سُخْرِيَّةٌ وَ
سِخْرِيَّةٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَاتَّخَذُوا هُمْ سُخْرِيًّا﴾ (۲۳-۱۱۱) تو تم نے ان
کی ہنسی بنائی۔ میں سُخْرِيًّا تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور
سُخْرِيَّةٌ یعنی ہنسی اڑانے کے معنی میں بھی۔ اور اسی طرح
آیت:

﴿وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ

﴿وَأَنْلِ وَ شَىءٌ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ﴾ (۱۶-۳۳) اور جن میں کچھ تو جھاڑ تھا اور تھوڑی سی پیریاں۔

اور کبھی (گا بھا دے کر) اسے بے کاٹا کر کے اس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے اسے جنت کے آرام اور اس کی نعمتوں کے لئے بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَسَى سِدْرٍ مَّخْضُودٍ﴾ (۲۸-۵۶) بے خار کی پیریوں میں (مزے کر رہے) ہوں گے۔

کیونکہ ایسا درخت بہت زیادہ سایہ دار ہوتا ہے اور آیت: ﴿إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى﴾ (۱۶-۳) جب کہ اس پیری پر چھارہا تھا جو چھارہا تھا۔

میں السِّدْرَةَ سے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں کہ آنحضرت ﷺ کو فیوض الہیہ اور بھاری انعامات سے خاص طور پر نوازا گیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت ﷺ نے بیعت رضوان لی تھی اور وہاں اللہ تعالیٰ نے موئین پر سکینت الہیہ نازل فرمائی تھی۔

السِّدْرُ کے معنی خیرہ چشم ہونے کے ہیں اور خیرہ چشم کو سَادِرٌ کہا جاتا ہے اور سَادِرٌ شَعْرَةٌ کے معنی بال لٹکانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ (دَسْر) سے منقول ہے۔

(س د س)

السُّدُسُ: (اسم عدد چھٹے حصے کو کہتے ہیں۔) قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا مِثْمَةَ السُّدُسِ﴾ (۱۱-۴) تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔

سین) اس آڑ کو کہتے ہیں جو قدرتی ہو اور سَدٌّ (بفتح سین) مصنوعی اور بنائی ہوئی روک کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سَدُّ ذُنْبُهُ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو بند کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا﴾ (۱۸-۹۴) کہ (آپ) ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔ اور تشبیہ کے طور پر ہر قسم کے موانع کو سَدٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾ (۹-۳۶) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی۔

ایک قرأت میں سَدٌّ بھی ہے۔ السُّدَّةُ: برآمدہ، جو دروازے کے سامنے بنایا جائے تاکہ بارش سے بچاؤ ہو جائے کبھی دروازے کو بھی سُنَّةٌ کہہ دیتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔^۱

الْفَقِيرُ الَّذِي لَا تَفْتَحُ لَهُ سَدُّ السُّلْطَانِ یعنی وہ فقیر جن کے لئے بادشاہ کے دروازے نہ کھولے جائیں السِّدَادُ وَالسَّدُّدُ کے معنی استقامت کے ہیں اور السِّدَادُ اسے کہتے ہیں جس سے رخنہ اور شکاف کو بھرا جائے۔ اور استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کو سَدَادٌ کہا جاتا ہے جس سے فقر کو روکا جائے۔

(س د ر)

السِّدْرُ: (پیری کا) درخت جس کا پھل بہت کم غذائیت کا کام دیتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۱ وفی واروی الحوض: هم الذین لا تفتح لهم السدد (النهاية: اسد).

اور اس کا استعمال اعیان و معانی دونوں میں ہوتا ہے۔

السِّرُّ: اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى﴾ (۲۰-۷) وہ چھپے بھید اور

نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

نیز فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ﴾

(۹-۷۸) کہ خدا ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے

واقف ہے۔

سَسَارَةٌ: (مفادلع) کے معنی ہیں کسی بات کو چھپانے کی

وصیت کرنا اور تَسَارَ الْقَوْمُ کے معنی لوگوں کا باہم ایک

دوسرے کو بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی

کرنے کے ہیں اور آیت:

﴿وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ﴾ (۱۰-۵۳) (پچھتاؤ گے) اور

ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اَسْرُوا کے معنی چھپانے کے ہیں اور بعض نے

اسکے معنی ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں

ہے:

﴿فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبُ بآيَاتِ رَبِّنَا﴾

(۶-۲۷) اور کہیں گے کہ اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹنا

دیئے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ

کریں۔

لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں کیونکہ آیت مذکورہ میں جس

ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد

نہیں ہے جس کے اظہار کی طرف آیت يَا لَيْتَنَا میں

اشارہ پایا جاتا ہے۔

اَسْرَرْتُ إِلَىٰ فُلَانٍ حَدِيثًا: کسی سے پوشیدہ طور پر

الْبَسْدُ: پیاسے اونٹوں کو چھٹے روز پانی پلانے کی باری

اور بَسْتُ بھی اصل میں بَسْدٌ ہی ہے۔ سَدَسْتُ

الْقَوْمِ کے معنی قوم میں چھٹا آدمی ہونے یا ان کے

اموال سے چھٹا حصہ وصول کرنے کے ہیں۔ اور جَاءَ

سَادِسًا وَسَاتَا وَسَادِيًا کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ

چھٹے درجہ پر آیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا خَمْسَةَ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ (۷۸-۷) اور

نہ کہیں پانچ کا (مجمع ہوتا ہے) مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا

ہے۔

﴿وَيَقُولُونَ خَمْسَةَ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (۱۸-۲۲)

اور (بعض) کہیں گے کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا

کتا تھا۔

محاورہ مشہور ہے: لَا أَفْعَلُ كَذَا سَدِيسَ عَجِيسٍ:

میں کبھی یہ کام نہیں کروں گا۔

اَلْسَدُوسُ: طیسان کو کہتے ہیں اَلْسَدُوسُ: باریک اور

اس کے مقابل اَسْتَبْرُقُ موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔

(س ر و)

الْاَسْرَارُ: کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿سِرًّا وَعَلَانِيَةً﴾ (۲-۲۷) اور پوشیدہ اور ظاہر اور

فرمایا:

﴿يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾ (۲-۷۷) کہ

جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں خدا کو سب

معلوم ہے۔

﴿وَأَسْرُوا قَوْلَكُمْ أَوِجْهَرُوا بِهِ﴾ (۶۷-۱۳) اور تم

لوگ بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

کی جاتی ہے اسے سُرُورٌ سُرُورٌ کہا جاتا ہے۔ ہتھیلی کی لکیروں کو اَسِرَةُ الرَّاحَةِ کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اَسَارِيرُ الْجَبْهَةِ کہا جاتا ہے اسی طرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند نظر نہیں آتا اسے سَرَارٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْسُرُورُ: قلبی راحت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا﴾ (۷۶-۱۱) (تو خدا) ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

﴿تَسْرُّ النَّظْرِينَ﴾ (۲-۶۹) (کہ) دیکھنے والے کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا﴾ (۸۴-۹) اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔

اور اہل نار کے متعلق فرمایا:

﴿إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا﴾ (۸۴-۱۳) یہ اپنے اہل و عیال میں مست رہتا تھا۔

تو اس میں تشبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔

اَلْسَرِيرُ: (تخت) وہ جس پر کہ (ٹھاٹھ سے) بیٹھا جاتا ہے یہ سُرُورٌ سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اَسِرَةٌ اور سُرُورٌ آتی ہے۔ قرآن پاک نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿مَتَكئينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ﴾ (۵۲-۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں۔ ٹکیر لگائے ہوئے۔

﴿فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ﴾ (۸۸-۱۳) وہاں تخت ہوں

راز کی بات کہنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَوْجِهٍ حَدِيثًا﴾ (۶۶-۱)

(۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر ﷺ نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

اور آیت:

﴿وَتُسْرُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰-۱) اور تم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تَسْرُونَ کے معنی تَظْهَرُونَ کئے ہیں اور یہی معنی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اَسْرَارُ اَلْسَى اَلْغَيْرِ: کسی سے بھید کی بات کہنا۔

جس طرح دوسروں سے اخفا کو مقضیٰ ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو مستلزم ہے جس سے وہ بھید کہا

جاتا ہے لہذا اَسْرَرْتُ اِلَىٰ فُلَانٍ یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا۔ میں من وجہ اخفا اور من وجہ

اظہار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:

﴿وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ اَسْرَارًا﴾ (۷۱-۹) (ظاہر) اور پوشیدہ ہر طرح سمجھا تا رہا۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اور کناہیہ کے طور پر اَلْسِرُّ کے معنی نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور سِرٌّ خالص

چیز کو کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے هُوَ مِنْ سِرِّ قَوْمِهِ وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سِرُّ اَلْوَادِي

وَسَرَارَتُهُ ہے۔ جس کے معنی وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔ سُرَّةُ اَلْبَطْنِ: ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے بعد باقی

رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ عکس بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سُرَّةُ اَلْبَطْنِ کہتے ہیں۔ اور وہ چیز جو ناف سے قطع

السِّقَاءِ: کے معنی مشکیزے سے پانی ٹپکانے کے ہیں اور وہ پانی جو مشکیزے سے ٹپک رہا ہو اسے مَاءٌ سَرَبٌ وَسَرَبٌ کہتے ہیں۔

السَّارِبُ: کسی راستہ پر (اپنی مرضی سے) چلا جانے والا۔ ﴿وَمَنْ هُوَ مُسْتَحْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ﴾ (۱۳-۱۰) یارات کو کہیں چھپ جائے یا دن کی روشنی میں کھلم کھلا چلے پھرے۔

سَارِبٌ کی جمع سَرَبٌ آتی ہے۔ جیسے رَكْبٌ وَرَاكِبٌ اور عرف میں اونٹوں کے گلے کو سَرَبٌ کہا جاتا ہے مثلاً محاورہ ہے زِعْرَتٌ سَرْبَةٌ: اس کے اونٹ ڈر کر متفرق ہو گئے (یعنی بد حال ہو گیا) اور هُوَ اَمِنْ فِى سِرْبِهِ: وہ خوش حال ہے میں سِرْبٌ کے معنی نفس کے ہیں اور بَعْضٌ نے کنایہ اہل و عیال مراد لیا ہے۔ اسی سے کنایہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

اِذْهَبِي فَلَا اَنْدَهْ سِرْبِكَ: جاؤ تجھے طلاق ہے اور اصل معنی یہ ہے کہ تمہارے اونٹ جدھر جانا چاہیں آزادی سے چلے جائیں میں انہیں نہیں روکوں گا۔

الْمَسْرَبَةُ: (بضم راء) سینہ کے درمیان کے بال جو نیچے پیٹ تک ایک خط کی صورت میں چلے جاتے ہیں۔ السَّرَابُ: (شدت گرما میں دوپہر کے وقت) بیاباں میں جو پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت نظر آتی ہے اسے "سَرَابٌ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بظاہر دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پانی بہ رہا ہے۔ پھر اس سے ہر بے حقیقت چیز کو تشبیہ کے طور پر سَرَابٌ کہا جاتا ہے اور اس

کے اونچے بچھے ہوئے۔

﴿وَلَبِئْسَ لِيَوْمِ ابْنِ مَرْجَانَ وَابْنِ مَرْجَانَ﴾ (۳۳-۳۳) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنا دیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔ اور میت کے جنازہ کو اگر سَرَبِيراً الْمَيِّتِ کہا جاتا ہے تو یہ سَرِير (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پا کر جو اربابی میں خوش و خرم ہے جس کی طرف کہ آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿۱۷۵﴾ الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

(س ر ب)

السَّرَبُ: (مصدرن) اس کے اصل معنی نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور اسم کے طور پر نشیبی جگہ کو بھی سَرَبٌ کہہ دیتے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا﴾ (۱۸-۱۶) تو اس نے دریا میں سرنگ کی طرح اپنا راستہ بنا لیا۔

سَرَبٌ (ن) سَرَبًا وَسَرُوبًا (جیسے مَرَّ مَرًّا وَمَرُورًا) اور اِنْسَرَبَ (انفعال) کے ایک ہی معنی آتے ہیں لیکن سَرَبٌ بالذات فاعل سے فعل صادر ہونے پر بولا جاتا ہے یعنی وہ فعل جو دوسرے سے متاثر ہو کر کیا جائے۔

سَرِبَ الدَّمْعُ: (س) آنسو رواں ہونا۔ اِنْسَرَبَتِ النِّحْيَةُ اِلَى حُجْرَتِهَا: سانپ کا اپنے بل میں اتر جانا۔ اسی طرح سَرِبَ (س) الْمَاءُ مَن

① وجنة الكافر للحديث راجع (حم، م، ت، ه) عن ابى هريرة وابن حبان فى زوائدہ رقم ۲۴۸۸ (طب، ك، عن سلمان البزار عن ابن عمر) وفى رواية سجن المؤمن وسنته راجع تحريج عراقى على الاحياء (۲: ۲۰۲)۔

﴿وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا﴾ (۷۱-۱۶) اور سورج کو چراغ ٹھہرایا ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَاجًا﴾ (۷۸-۱۳) اور روشن چراغ بنایا۔

تو یہاں ”روشن چراغ“ سے مراد سورج ہے۔

أَسْرَجْتُ السِّرَاجَ کے معنی چراغ روشن کرنے کے ہیں اور سَرَّجْتُ كَذَا کے معنی چراغ کی مثل کسی چیز کو خوبصورت بنانے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۲۲۴) وَفَاحِمًا وَمِرْسَنًا مُسْرَجًا

کوئلہ کی مثل سیاہ بال اور سراج کی مثل خوبصورت ناک أَلْسْرُجُ کے معنی زین کے ہیں اور زین ساز کو سَرَّاجُ کہا جاتا ہے۔

(س ر ج)

أَلْسْرُجُ: ایک قسم کا پھلدار درخت ہے اس کا واحد سَرَّحَةٌ ہے اور سَرَّحْتُ الْإِبِلَ کے اصل معنی تو اونٹ کو ”سرح“ درخت چرانے کے ہیں بعدہ چراگاہ میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دینے پر اس کا استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ﴾ (۱۶-۶) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو اور جب صبح کو جنگل چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔

اور چرواہے کو ”سَارِحُ“ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَرَّحُ

کے بالمقابل جو چیز حقیقت رکھتی ہو اسے سَرَّابُ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَسْرَابٍ بِقِيَعِهِ يَحْسَبُهُ الْظَّمَانُ مَاءً﴾ (۲۳-۱۲۹) جیسے میدان میں سراب کہ پیاسا سے پانی سمجھے۔

﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو کر رہ جائیں گے۔

(س ب ل)

السِّرْبَالُ: کرتہ، قمیص خواہ کسی چیز سے بنی ہوئی

ہو۔ جیسے فرمایا:

﴿سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطْرِانٍ﴾ (۱۴-۱۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔

﴿سَرَابِيلٌ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلٌ تَقِيكُمُ بَأْسَكُمْ﴾ (۱۶-۸۱) اور تمہارے (آرام کے) واسطے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور کرتے یعنی زرہیں جو تم کو (اسلمت) جنگ (کے ضرر) سے محفوظ رکھیں۔

تو بَأْسَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(س ر ج)

السِّرَاجُ: (چراغ) وہ چیز جو تیل اور تیل سے روشن ہوتی ہے۔ مجازاً ہر روشن چیز کو ”سِرَاجُ“ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

① قاله المعاج بصف امرئة وقيله: ازمان ابدت واضحا مفلحا۔ اغربا قاطرا وطرفا ابرجا ومقله وحاجبا مزححا وانظر في ديوانه ۸ وارجيز العرب ۷۳ والامالي وتهذيب الالفاظ ۲۰۷ والمعاهد ۶ والعيني (۱: ۲۹) وفي المتداولات ان لفظه المسرح في الشعر غريب وليت شعري ما الغربة فيه الا ان يقال ان ماخذة دقيق ولا ياباه الذوق .

سے جوڑو۔

اور صِرَاطٌ وَسِرَاطٌ وَزِرَاطٌ کی طرح سَرَدٌ كَوْزَرَدٌ
اور سَرَادٌ كَوْزَرَادٌ کہا جاتا ہے۔
الْمُسْرَدُ (اسم آلم) سوراخ کرنے کا اوزار۔

(س ر ذق)

السَّرَادِقُ: فارسی سے معرب ہے ۱ کلام عرب
میں کوئی ایسا اسم مفرد نہیں ہے جس کا تیسرا حرف الف ہو
اور اس کے بعد دو حرف ہوں۔ ۲ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَإِحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ (۱۸-۲۶) جس کے
شامیانے ان کو گھیر رہے ہوں گے۔
اور بَيْتٌ مُسْرَدَقٌ: اس مکان کو کہتے ہیں جو شامیانہ کی
طرز پر بنایا ہو۔

(س ر ط)

السِّبْرَاطُ کے معنی ”آسان راستہ“ کے آتے ہیں
اور اصل میں سَرَطْتُ الطَّعَامَ وَزَارَدْتُهُ سے مشتق
ہے جس کے معنی طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو
صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا
رہرو اس کو نگلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ قَتَلَ
أَرْضًا عَالِمُهَا وَقَتَلَتْ أَرْضٌ جَاهِلُهَا کہ واقف کار
رہرو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک
کر دیتی ہے۔ ابوتمام نے کہا ہے۔ ۱
رَعْتَهُ الْفَيَافِي بَعْدَ مَا كَانَ حِقْبَةً

ہے جیسے شَارِبٌ کی جمع شَرِبٌ اور رَاكِبٌ کی جمع
رَكْبٌ آتی ہے اور تَسْرِيحٌ کا لفظ طلاق دینے کے معنی
میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ (۲-۲۲۹) یا بھلائی کے
ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور اسی طرح آیت:

﴿وَسَرَّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا﴾ (۳۳-۳۹) اور
ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے
رخصت کر دو۔

میں بھی سَرَّحُوهُنَّ کے معنی طلاق دینے کے ہیں اور یہ
تَسْرِيحٌ سے مستعار ہے جس کے معنی جانوروں کو چرنے
کے لئے چھوڑ دینا کے ہیں۔ جیسا کہ خود طلاق کا لفظ
إِطْلَاقٌ الْإِبِلِ: (اونٹ کا پائے بند کھولنا) کے محاورہ
سے مستعار ہے۔ اور کبھی سَرَحٌ میں تیز روی کے معنی کا
اعتبار کر کے تیز رو اور سہل رفتار اونٹنی کو نَاقَةٌ سَرَحٌ کہا جاتا
ہے اور اسی سے بطور استعارہ شعر کے ایک بحر کا نام
مُنَسْرَحٌ رکھا گیا ہے۔

(س ر د)

السَّرْدُ: اصل میں اس کے معنی کسی سخت چیز کو سینے
کے ہیں جیسے زرہ بنانا اور چمڑے کو سینا پھر بطور استعارہ
لوہے کی کڑیوں کو مسلسل جوڑنے کے معنی میں استعمال
ہونے لگا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَدَّرَفْنِي السَّرْدُ﴾ (۳۳-۱۱) اور کڑیوں کو اندازہ

۱ میں سرابردہ ومن سرادر ۱۲۔

۲ الاحرفان وما علابط وحلاحل ۲۔

۳ قاله ابو تمام من قصيدته التي يمدح فيها عبدالله بن طاهر والبيت في ديوانه ۴۴ والحفاجي ۳۳ والامالي ۱: ۵۸۵ وفي المطبوع
دعته مصحف وفي رواية الديوان ماء الروض بدل ماء المزن وبعده فكم جزع واوجب ذروة غراب ومن قبل كانت اتمكنه مذابه
الاتمك الاسمان والمذانب مجارى الماء ۱۲)۔

اور کسی کام میں قوم سے آگے نکل جانے والوں کو سَرْعَانَ کہا جاتا ہے۔

مثلاً مشہور ہے ﴿سَرْعَانَ ذَا إِهَالَةٍ﴾ یہ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو قبل از وقت کسی واقعہ کی پیش گوئی کرے۔ تو یہ سَرَع سے مٹی برفتہ ہے۔ جیسا کہ وَشَكَتْ سے وَشَكَانَ اور عَجَلَ سے عَجَلَانُ آجاتا ہے اور آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ (۳-۹۹) اور خدا جلد از جلد عذاب دینے والا ہے۔

اور اسی طرح آیت ﴿إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ﴾ ”بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے۔“ میں سَرِيعُ کے لفظ سے اس معنی پر متنبہ کرنا مقصود ہے جو کہ آیت:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (۳۷-۸۲) اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرمادیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ سے مفہوم ہوتے ہیں۔

(س ر ف)

السَّرَفُ کے معنی انسان کے کسی کام میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں مگر عام طور پر اس کا استعمال اتفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کر جانے پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَهُمْ يَقْتُرُوا﴾ (۲۵-۶۷) اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ بنگلی کو کام میں لاتے ہیں۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ أَسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا﴾

رَعَاهَا إِذَا مَا الْمُرْنُ يَنْهَلُ سَاكِبُهُ
اس کے بعد کہ اُس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھا لیا یعنی دبلا کر دیا۔
اسی طرح راستہ کو لقمہ اور مُلْتَقَمٌ بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا ہر وہ اس کو لقمہ بنا لیتا ہے۔

(س ر ع)

السَّرْعَةُ: اس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں اور یہ بُطْأً (درنگ کردن) کی ضد ہے۔ اجسام اور افعال دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے: سَرَعٌ (ک) فَهُوَ سَرِيعٌ وَأَسْرَعُ (افعال) فَهُوَ مُسْرَعٌ: اس نے جلدی کی اور أَسْرَعُوا کے معنی سَارَتْ إِبِلُهُمْ سِرَاعًا: (ان کے اونٹ تیز رفتاری سے چلے گئے) آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل أَبْلَدُوا کے معنی ست ہونا آتے ہیں۔

سَارَعُوا وَتَسَارَعُوا: ایک دوسرے سے سبقت کرنا چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (۳-۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش (اور بہشت کی) طرف لپکو۔
﴿وَيَسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ﴾ (۳-۱۱۲) اور نیکیوں پر لپکتے ہیں۔

﴿يَوْمَ تَشَقُّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا﴾ (۵۰-۲۴) اس روز زمین ان پر پھٹ جائے گی اور جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔

﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ (۷۰-۲۴)

۱ اہالۃ منصوب علی الحال والتقدیر سرعان اہالۃ بہذہ (منتہی الادب)۔

(۵۳) (اے پیغمبر! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔ میں اَسْرَفُوا کا لفظ مال وغیرہ ہر قسم کے اسراف کو شامل ہے اور قصاص کے متعلق آیت:

﴿فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ﴾ (۱۷-۳۳) تو اس کو

چاہئے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے۔

میں اسرافِ فِى الْقَتْلِ یہ ہے کہ غیر قاتل کو قتل کرے اس کی دو صورتیں ہیں۔ مقتول سے بڑھ کر باشراف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ یا قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرے جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا۔

عام محاورہ ہے: مَرَزْتُ بِكُمْ فَسَرَفْتُكُمْ کہ تمہارے پاس سے بے خبری میں گزر گیا۔

تو یہاں سَرَفْتُ بمعنی جَهَلْتُ کے ہیں۔ یعنی اس نے بے خبری میں اس حد سے تجاوز کیا جس سے اسے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا اور یہی معنی جہالت کے ہیں۔

السُّرْفَةُ: ایک چھوٹا سا کھڑا جو درخت کے پتے کھا جاتا ہے اس میں اسراف کا تصور کر کے اسے سُرْفَةُ کہا جاتا ہے پھر اس سے اشتقاق کر کے کہا جاتا ہے۔

سُرِفَتِ الشَّجَرَةُ: درخت کرم خوردہ ہو گیا۔

اور ایسے درخت کو سُرْفَةُ (کرم خوردہ) کہا جاتا ہے۔

(س ر ق)

السَّرِقَةُ: (مصدر ض) اس کے اصل معنی خفیہ طور

پر اس چیز کے لے لینے کے ہیں جس کا لینے کا حق نہ ہو اور اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار

میں لے لینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّارِقِ وَالسَّارِقَةُ﴾ (۵-۳۸) اور جو چوری

(۳-۶) اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑے ہو کر تم سے اپنا مال واپس لے لیں گے) اسے فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔

اور یہ یعنی بے جا سرف کرنا مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے بولا جاتا ہے چنانچہ حضرت سفیان (ثوری رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک حبیہ بھی صرف کیا جائے تو وہ اسراف میں داخل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۶-۱۳۲) اور بے جا اڑانا کہ خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

﴿وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ﴾ (۴۰-۲۳) اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں۔

یعنی جو اپنے امور میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ (۲۸-۴۰) بے شک خدا اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے تجاوز کر جانے والا ہو اور جھوٹا ہو۔

اور قوم لوط علیہم السلام کو بھی مُسْرِفِينَ (حد سے تجاوز کرنے والے) کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کر کے جائز حدود سے تجاوز کرتے تھے اور عورت جسے آیت:

﴿نِسَائِكُمْ حَرَّتْ لَكُمْ﴾ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔

میں حَرَّتْ قرار دیا گیا ہے۔..... میں بیچ بونے کی بجائے اسے بے محل ضائع کر رہے تھے اور آیت:

﴿يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ﴾ (۳۹-۱۰)

اسی طرح اس کے بعد آیت میں النَّهَارَ سَرْمَدًا فرمایا ہے۔

(س ر ی و)

السَّرَىٰ کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں اور اسی معنی میں سَرَىٰ (ض) وَاَسْرَىٰ (افعال) دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَسْرِبَٰهُنَّ بِأَهْلِكُ بِقَطْعِ مَنْ أَيْلٍ﴾ (۸۱-۱۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا﴾ (۸۱-۱۷) وہ ذات (پاک) ہے جو ایک رات اپنے بندے کو..... لے گیا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْرَىٰ (باب افعال) سَرَىٰ سے نہیں ہے جس کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں۔ بلکہ یہ سَرَاةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی کشادہ زمین کے ہیں۔ اور اصل میں اس کے لام کلمہ میں واو ہے اور اسی سے شاعر نے کہا ہے۔ ﴿البسيط﴾

(۲۲۶) بِسَرٍّ وَحَمِيرٍ أَبْوَالِ الْبِغَالِ بِهِ
حمیر کی کشادہ زمین میں جہاں خچر ونگا پیشاب یعنی کہ سراب نظر آتے ہیں۔
پس اَسْرَىٰ کے معنی کشادہ زمین میں چلے جانا ہیں۔

﴿قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۲-۷۷) (برادران یوسف ؑ نے کہا) کہ اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی۔

﴿أَيُّهَا الْعَيْبَرُ أَنْكُمْ لَسَارِقُونَ﴾ (۱۲-۷۰) کہ قافلہ والو! تم تو چور ہو۔

﴿إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ﴾ (۱۲-۱۸) کہ آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔

اور اسْتَرْقَى السَّمْعَ کے معنی چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِلَّا مَنْ اسْتَرْقَى السَّمْعَ﴾ (۱۵-۱۸) ہاں! اگر کوئی چوری سے سنا چاہے۔

السَّرْقُ وَالسَّرْقَةُ: سفید ریشم۔

(س ر م د)

السَّرْمَدُ: کے معنی دائم ہمیشہ کے ہیں۔^۱

قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا﴾ (۲۸-۷۱) کہو بھلا دیکھو تو اگر خدا تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات (کی تاریکی) کئے رہے۔

۱ وفي الكشاف انه مشتق من السرد على وزن فَعْمَلٌ فالميم فيه زائدة وان كان رباعياً فوزنه فَعْمَلٌ (اكشاف والروح).

۲ من كلمة جمهرية (۳۰۶-۳۱۰) في ۵۰ بيتاً مطلعها طاف الخيال ركب اليمانيا ودون ليلسى عواد لو تعدينا قاله تميم بن مقبل العامري في مشوبته (ومشجبات العرب سبع قصائد وتماهه: انى اتسديت وهنأ ذلك الينا وسرو حمير من منا زلهم باليمن وابواب البغال يراد بها السراب تشبيهاً لان بول البغال كاذب لا يفتح وكذا السراب والبين: الارض الواسعة قد رمد البصر كمافى المعاجم راجع المقاييس واللسان (بين، سدى) واصلاح يعقوب ۵ واعراب ثلاثين ۴۶ والبيت ايضاً فى امالى المرتضى (۱: ۲۹۱) وتهذيب المنطق (۷: ۱) وفيه سرو حمير بدون الباء وسرو حمير مكان يوصف بالبعد وفى حديث عمر لئن عشت الى قابل لاسوين بين الناس حتى ياتى الراعى حقه بسر وحمير لم يعرق حبينه راجع للبيت السابع لابن الانبارى والاشتقاق ۷۰ والبلدان وراجع ايضاً غريب ابى عبيد (۳: ۲۶۷-۲۶۸).

ستون بھی آتے ہیں۔

(س ط ح)

السَّطْحُ: مکان کے اوپر کے حصے، یعنی چھت کو کہتے ہیں اور سَطَّحْتُ الْبَيْتَ کے معنی چھت ڈالنے کے ہیں۔ لیکن سَطَّحْتُ الْمَكَانَ کے معنی کسی جگہ کو چھت کی طرح ہموار کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِي الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِّحَتْ﴾ (۸۹-۲۰) اور زمین کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی۔ اِنْسَطَّحَ الرَّجُلُ کے معنی چٹ لینے کے ہیں اور (بنی زنب کے) ایک کاہن کا نام سَطِطِيحٌ مشہور ہو گیا تھا کیونکہ وہ زمانت (کی مرض میں مبتلا ہونے) کے باعث زمین پر پڑا رہتا تھا۔ الْمِسْطَاحُ: خیمہ کا ستون جس پر خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔ سَطَّحْتُ الشَّرِيذَةَ فِي الْقُصْعَةِ: میں نے پیالہ میں شریذ کو پھیلایا۔

(س ط ر)

السَّطْرُ وَالسَّطْرُ: قطار کو کہتے ہیں خواہ کسی کتاب کی ہو یا درختوں اور آدمیوں کی۔ اور سَطَّرْتُ فُلَانًا كَذًا کے معنی ایک ایک سطر کر کے لکھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾ (۲۸-۱) ن، قلم کی اور جو اہل قلم لکھتے ہیں اس کی قسم۔

﴿وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ﴾ (۵۲-۲) اور کتاب جو لکھی ہوئی ہے۔

﴿كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا﴾ (۳۳-۶)

جیسے اَجْبَلَ کے معنی ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا اور اَنْتَهُم کے معنی وہ تہامہ میں چلا گیا۔

لہذا آیت:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ﴾ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وسیع اور کشادہ سرزمین میں لے گیا۔ نیز سَرَآةُ ہر چیز کے افضل اور اعلیٰ حصہ کو بھی کہتے ہیں اسی سے سَرَآةُ النَّهَارِ ہے جس کے معنی دن کی بلندی کے ہیں اور آیت: ﴿قَدْ جَعَلَ رَبُّكَ تَحْتِكَ سَرِيًّا﴾ (۱۹-۲۳) تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔

میں سِسرَى سے نہر جاری مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سَرَوٌ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت کے ہیں اور بلند قدر آدمی کو رَجُلٌ سَرَوٌ کہا جاتا ہے تو لفظ سِسرَى سے عیسیٰ ﷺ اور ان کے اس شرف کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر نوازا تھا۔

مجاورہ ہے۔

سَرَوْتُ الشُّوبَ غَنِيٌّ: میں نے اپنے اوپر سے کپڑا اتار دیا۔

وَسَرَوْتُ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ: میں نے گھوڑے سے جھول اتار دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ اسی سے رَجُلٌ سَرِيٌّ ہے کیونکہ بلند قدر آدمی ہوشیار رہتا ہے گویا وہ کپڑے اتارے ہوئے ہے اس کے برعکس کاہل ست اور ناتوان آدمی کو مَتَدَبِّرٌ مُتَزَمِّلٌ اور زَمِيْلٌ وغیرہ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے کپڑوں میں لپٹا ہوا ہے اور السَّارِيَّةُ اس جماعت کو کہتے ہیں جو رات کو سفر کرتی ہو اور اس کے معنی رات کے بادل اور

ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ اور آیت:
﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَنْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيِّرٍ﴾
(۸۸-۲۲) تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے
والے ہی ہو تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔

میں لفظ مُسَيِّرٍ اور اسی طرح آیت:
﴿أَمْ هُمُ الْمُسَيِّرُونَ﴾ (۵۲-۳۷) یا یہ (کہیں
کے) داروغہ ہیں۔

میں مُسَيِّرُونَ، تَسَيَّرَ فُلَانٌ عَلَى كَذَا وَتَسَيَّرَ
عَلَيْهِ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حفاظت کے
لئے اس پر سطر کی طرح سیدھا کھڑا ہونے کے ہیں۔ پس
آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر (گنہداشت کے لئے)
مقرر نہیں ہو۔ اور یہاں مُسَيِّرٍ کا استعمال ایسے ہی ہے
جیسا کہ آیت:

﴿أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾
(۱۳-۴۳) تو کیا جو (خدا) ہر نفس کے اعمال کا نگران
(دیکھتا ہے) ہے۔

میں قَائِمٌ کا۔ اور آیت:

﴿وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِحَفِيظٍ﴾ میں حَفِيظٌ کا لفظ ہے۔
بلکہ بعض نے تو آیت: ﴿لَنْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيِّرٍ﴾
کے معنی ہی ﴿لَنْتَ عَلَيْهِمْ بِحَفِيظٍ﴾ کے ہیں لہذا
مُسَيِّرٍ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:

یہ حکم کتاب (یعنی قرآن پاک) میں لکھ دیا گیا ہے۔ یعنی
محفوظ اور ثابت ہے۔

اور سَطْرٌ کی جمع اَسَطْرٌ وَسَطُورٌ وَأَسَطَارٌ ہے۔
شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۲۷) اِنِّى وَاسَطَارِ سَطْرُنْ لَنَا سَطْرًا
یعنی تم ہے قرآن کی سطروں کی کہ میں..... اور آیت ہے:
﴿اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ﴾ (۶-۲۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں
ہیں۔ میں مرد نے کہا ہے کہ یہ اَسَطُورَةٌ کی جمع ہے
جیسے اَرْجُوْحَةٌ کی جمع اَرَاْجِيْحٌ اور اَثْفِيَةٌ کی جمع اَثَافِيٌّ
اور اُحْدُوْتَةٌ کی جمع اَحَادِيْثٌ آتی ہے۔

اور آیت:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَآذَا أَنْزَلِ رَبُّكُمْ قَالُوا اَسَاطِيرُ
الْاَوَّلِينَ﴾ (۱۶-۲۳) اور جب ان (کافروں سے) کہا
جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے۔ تو کہتے
ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔

یعنی انہوں نے بزم خود یہ کہا ہے کہ یہ جھوٹ موٹ کی لکھی
ہوئی کہانیاں ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے قول کی
حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ اَكْتَسَبَهَا فَهِيَ تُمَلِّى عَلَيْهِ بُكْرَةٌ
وَ اَصِيْلًا﴾ (۲۵-۵) (اور کہتے ہیں کہ یہ) پہلے لوگوں
کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے وہ صبح و شام

① قاله رؤبة بن العجاج وتماهه: الفائل يانصر نصرًا والشطرفى الغزاة (۲: ۱۹) وفى الشطر الثانى بحث قرءوه على ثلاثة اوجه
وفى الباب للضاغانى و (بالصاد المهمله) مصحف والصواب المعجمة وهو اسم الحاجب وتبعه صاحب القاموس ليكنه خطأ
والبيت من شواهد الكشاف ۵۲ والطبرى (۲۹-۱۸) ومحاز القرآن لآبى عبيدة (۲: ۲۳۰-۴۶۴) وفى رواية آيات بدل واسطا
والشتمرى (۱: ۳۰۴) والسبوطى ۷۴ وديوانه ۱۷۴ (ط لبيسك) واللسان والصحاح سطر والرجز مما استشهد به النحويون توابع
المنادى انظر السبوطى وابن يعش فى شرح المفصل وابن ليعون فى شرح آيات الايضاح وحاشية امير على المعنى (۲: ۵۱)
والدسوقى (۲: ۴۶) والشزور ۴۳۷ وابن هشام رقم ۷۲۷.

(س ع د)

السَّعْدُ وَالسَّعَادَةُ: (خوش نصیبی) کے معنی ہیں حصول خیر میں امور الہیہ کا انسان کے لئے ممد اور معاون ہونا۔ اس کی ضد شَقَاوَةٌ (بدبختی) ہے سَعِدَ (لازم کے معنی نیک بخت ہونے اور أَسْعَدَهُ اللَّهُ کے معنی نیت بخت کرنے کے ہیں۔ سَعِيدٌ (نیک بخت) جمع سَعْدَاءُ اور سب سے بڑی سعادت مندی جنت میں جانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا فِى الْجَنَّةِ﴾ (۱۱-۱۰۸) اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں (داخل کئے جائیں گے۔

اور فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ﴾ (۱۱-۱۰۵) پھر ان میں سے کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔

الْمُسَاعَدَةُ: (کار خیر میں مدد کرنا) کے معنی ایسے کام میں معاونت کے ہیں جس میں سعادت کا گمان ہو۔ اور لَيْبِكَ وَسَعْدِيكَ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت زیادہ سعادت بخشے اور تمہاری مساعدت فرمائے۔

لیکن پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔

الْإِسْعَادُ: خاص کر نوحہ خوانی میں کسی کی مدد کرنا۔

جیسے محاورہ ہے:

إِسْتَسْعَدْتُهُ فَاسْعَدْنِي: میں نے اس سے مدد مانگی تو

اس نے میری مدد کی۔

السَّاعِدُ: کلائی یا بازاو کو کہتے ہیں (کیونکہ انسان دفاع اسی کے زور سے کرتا ہے تو) گویا اس میں مُسَاعَدَةٌ کے

﴿وَرُسُلَنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ﴾ (۳۳-۸۰) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔

میں کتابت کا لفظ ہے اور یہ کتابت وہی ہے جو کہ آیت: ﴿أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَلِكَ فِى كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (۲۲-۷۰) کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے خدا اس کو جانتا ہے یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب کچھ آسان ہے۔ میں مذکور ہے۔

(س ط و)

السَّطْوَةُ: (تعدیہ بواسطہ باء) کے معنی کسی کو سخت

سے پکڑنے کے ہیں۔ جیسے سَطَابِه (ن) اس کو سخت پکڑا یا اس پر حملہ کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا﴾ (۲۲-۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنا تے ہیں ان پر حملہ کر دیں۔ یہ اصل میں سَطَا الْمَرْسُ (ن) عَلَى الرَّمَكَةِ سے مشتق ہے جس کے معنی نر گھوڑے کے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اپنی مادہ پر چڑھ جانے کے ہیں خواہ بوجہ نشاط کے ہو یا جنتی کی غرض سے۔ اسی طرح سَطَا الرَّاعِي عَلَى النَّاقَةِ کے معنی چرواہے کے اونٹنی کے فرج میں ہاتھ ڈال کر اس کے پیٹ سے مردہ بچر نکالنے کے ہیں۔ ۱

پھر استعارہ کے طور پر طَعُوْ کی طرح سَطْوَةٌ کا لفظ بھی پانی کی زیادتی پر بولا جاتا ہے اور طَعْنَى الْمَاءِ وَسَطَا کے معنی پانی کی طغیانی میں آ جانے کے ہیں۔

۱ وفى الحديث لا بأس ان يسطو الرجل على المرأة اذا حيف عليها ولم توجد امرأة تعالجها (النهاية).

قرآن پاک میں ہے:
﴿وَسَيَصْلُونَ سَعِيرًا﴾ (۲-۱۰) اور دوزخ میں
ڈالے جائیں گے۔

﴿وَأَذَا الْجَحِيمِ سُعَّرَتْ﴾ (۸۱-۱۲) اور جب
دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی۔

﴿عَذَابُ السَّعِيرِ﴾ (۶۷-۵) ذکریٰ آگ) کا
عذاب (تیار کر رکھا ہے۔

تو یہاں سَعِيرٌ بمعنی مَسْعُورٌ ہے۔

نیز قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ﴾ (۷۴-۷۳)
(۴۷) بے شک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (بتلا

ہیں۔

السُّعْرُ کے معنی مرجزخ کے ہیں اور یہ استعارہ النار
(آگ کا بھڑکنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

(س ع ی)

السَّعَى: تیز چلنے کو کہتے ہیں اور یہ عَدُوٌّ (سرپٹ
دوڑ) سے کم درجہ (کی رفتار) ہے) (مجازاً) کسی اچھے یا
برے کام کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿وَسَعَى فِي خَرَابِهَا﴾ (۲-۱۱۳) اور ان کی ویرانی
میں ساعی ہو۔

﴿ثَوْرُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ﴾ (۶۶-۸) (بلکہ)

معنی پائے جاتے ہیں اسی بنا پر پند کے بازوں کو
سَاعِدِينَ کہا جاتا ہے جیسا کہ (معنی قوت کے لحاظ
سے) انہیں بَدِينِ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

السَّعْدَانَةُ: ایک خاردار گھاس جس کے کھانے سے اونٹنی
کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے مثال مشہور ہے۔^۱

مَرَعَى وَلَا كَالسَّعْدَانَةِ کہ گھاس تو ہے لیکن سعدانۃ
کی سی نہیں۔ السَّعْدَانَةُ کے معنی کبوتر، تمہ کی گرہ اور

اونٹ کے سینے کے بھی آئے ہیں۔ اور سَعُوذُ
الْكُوَاكِبِ مشہور دس ستارے ہیں جن میں سے ہر ایک

کو سَعْدٌ کہا جاتا ہے۔

(س ع ر)

السُّعْرُ: کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں۔ اور
سَعَرَتُ النَّارُ وَأَسَعَرْتُهَا کے معنی آگ بھڑکانے

کے۔ مجازاً لڑائی وغیرہ بھڑکانے کے لئے استعمال ہوتا
ہے۔ جیسے اسْتَعْرَأَ لِحَرْبٍ: لڑائی بھڑک اٹھی اسْتَعْرَرَ

اللِّصُّوَصُ: ڈاکو بھڑک اٹھے۔ یہ اشتعل کے ہم معنی
ہے اور نَاقَةٌ مَسْعُورَةٌ کے معنی دیوانی اونٹنی کے ہیں

جیسے موقدۃٌ ومہیجۃٌ کا لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے۔
السُّعْرُ: آگ بھڑکانے کی لکڑی (کھرنی) لڑائی

بھڑکانے والا۔

السَّعَارُ: آگ کی تپش کو کہتے ہیں اور سَعَرَ الرَّجُلُ
کے معنی آگ یا گرم ہوا سے تھلس جانے کے ہیں۔

۱) انظر للمثل الكامل (۹-۱۰) كالسعدان بدون الهاء قال الشاعر: ماء والاكصدا مرعى ولا كالسعدان يضرب للشيء الذى فيه فضل وغيره افضل اول من قال ذلك خنساء بنت عمرو بن الشريد وحكى انه لامرأة من طي تزوجها امرؤ القيس (لا) حجر الكندي انظر المثل والقصة الميداني رقم ۳۸۳۷ و ۳۸۴۳ والسمط ۳۶۴ والفاجر رقم ۱۲۱ والعسكري ۱۸۷/۲۰۲/۲۰۲ والضحى ۶۹، ۵۴ والالفاظ ۵۵۷ والنويرى ۵۱:۳ والمستقصى ۱۲.

کے حسن کردار کا بدلہ نہیں دے سکتا اور قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ﴾ (۳۷-۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا۔

یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بنا سکے اور مناسب جج میں سَعْيُ کا لفظ صفا اور مروہ کے درمیان چلنے کے لئے مخصوص ہو چکا ہے اور سَعْيَاة کے معنی خاص کر چغلی کھانے اور صدقہ وصول کرنے کے آتے ہیں اور مَكَاثِبُ غلام کے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے مال کمانے پر بھی سَعْيَاة کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مُسَاعَدَةٌ کا لفظ فسق و فجور اور مُسَاعَدَةٌ کا لفظ اچھے کاموں کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ﴾ (۲۲-۵۱) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں اپنے زعم باطل میں ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی۔ میں سعی کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات میں ہمارے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کر ڈالی۔

(س غ ب)

الْمَسْغَبَةُ: (س ن) بھوک۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ (۹۰-۱۳) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا۔

میں مَسْغَبَةٌ سَغَبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی بھوک سے در ماندہ ہو جانے کے ہیں اور پیاس سے ٹھہال ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے: سَغَبٌ

ان کا نور (ایمان) ان کے آگے..... چل رہا ہوگا۔

﴿وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾ (۵-۳۳) اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں۔

﴿وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾ (۲-۲۰۵) اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں (فتنہ انگیزی کرنے کے لئے) دوڑتا پھرتا ہے۔

﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَسْعَىٰ وَأَنْ سَعِيَّةٌ سَوْفَ يَرَىٰ﴾ (۵۳-۳۹، ۴۰) اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

﴿وَأَنْ سَعِيكُمْ لَسْتِي﴾ (۹۲-۴) تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔

﴿وَسَعَىٰ لَهَا سَعِيهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعِيَهُمْ مُّشْكُورًا﴾ (۱۷-۱۹) اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

﴿فَلَا تُكْفِرْ أَنْ لَسَعِي﴾ (۲۱-۹۴) تو اس کی کوشش رانگاں نہ جائے گی۔

لیکن اکثر طور پر سَعَى کا لفظ افعال محمودہ میں استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۲۲۸) إِنَّ أَجْرَ عَلْقَمَةَ بْنِ سَيْفِ سَعِيَّةٍ

لَا أَجْرَ لَهُ بِبِلَاءِ يَوْمٍ وَاحِدٍ

اگر میں علقمہ بن سیف کو اس کی مساعی کا بدلہ دوں تو اک دن

۱ قاله الغدكي في مدح علقمة بن سيف العنابي وللشعر قصة انظر التبريزي والبيت في الحماسة (۲: ۲۶۷) والعزوقي رقم ۶۷۹ واللسان (لسم) والبيان (۳: ۱۳۸) والمعجم للمرزباني والبيت معزول للمرنان الطائي وفي المطبوع بن سعد والتصحيح من البيان وشرح الحماسة والبيت ايضا في الحيوان (۳: ۴۶۷) في ثلاثة ۱۲.

جمع سَفَرٌ آتی ہے۔ جیسے رَاكِبٌ کی جمع رَاكِبُونَ اور صفت کا القیاس)

اور سَافِرٌ کے معنی ہیں ”اس نے سفر کیا“ یہ خاص کر باب مفاعلہ سے آتا ہے گویا اس میں جانین یعنی وطن اور آدمی کے ایک دوسرے سے دور ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور سَفَرٌ سے ہی سَفْرَةٌ کا لفظ مشتق ہے جس کے معنی طعام سفر یا توشہ دان ہیں جس میں سگری کھانا رکھا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ﴾ (۴-۳۳)

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

السَّفَرُ: اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حقائق کا بیان ہو گویا وہ حقائق کو بے نقاب کرتی ہے اس کی جمع اَسْفَارٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ (۲۲-۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوئی ہوں۔

یہاں مُثَمِّلٌ بہ میں خصوصیت کے ساتھ اَسْفَارٌ کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تورات اگرچہ اپنے مضامین کو محقق طور پر بیان کرتی ہے لیکن جاہل (یہود) پھر بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ لہذا ان کی مثال بعینہ اس گدھے کی سی ہے جو علم و حکمت کے پستارے اٹھائے ہوئے ہو اور آیت: ﴿بِأَيِّدِنَا سَفَرَةَ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۸۰-۱۵۰، ۱۰۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار نیکو کار ہیں۔ میں سَفْرَةَ سے مراد وہ

(س) سَغْبًا وَسُغْبًا وَهُوَ سَاغِبٌ اور صفت کا صیغہ سَغْبَانٌ مثل عَطْشَانٌ بھی آتا ہے۔

(س ف ر)

السَّفَرُ: اصل میں اس کے معنی ”کشف غطاء یعنی پردہ اٹھانے کے ہیں اور یہ اَعْيَان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے سَفَرَ الْعِمَامَةَ عَنِ الرَّأْسِ: اس نے سر سے عمامہ اتار دیا۔ سَفَرَ عَنِ الْوَجْهِ: چہرہ کھولا اور سَفَرُ الْبَيْتِ کے معنی گھر میں جھاڑ دینے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے ہیں اور جھاڑو کو میسْفَر اور اس گردوغبار کو سَفِيرٌ کہا جاتا ہے جو جھاڑو دے کر دور کی جاتی ہے۔

الْاَسْفَارُ: (افعال) یہ الوان کے ساتھ مختص ہے یعنی کسی رنگ کے ظاہر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالصُّبْحُ إِذَا أَسْفَرَ﴾ (۴-۳۴) اور تم ہے۔ صبح کی جب روشن ہو۔ اور فرمایا: ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ﴾ (۸۰-۳۸) کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔

اور حدیث ①

(۱۷۶) اَسْفَرُوا بِالصُّبْحِ ثَوَجَرُوا: صبح خوب روشن ہونے کے بعد نماز پڑھا کرو تو زیادہ ثواب ملے گا۔ میں اَسْفَرُوا اَسْفَرْتُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی روشنی میں داخل ہونے کے ہیں۔ جیسے اَصْبَحْتُ (میں صبح میں داخل ہوا)

سَفَرَ الرَّجُلُ: اس نے سفر کیا اور سَافِرٌ (مسافر) کی

① کذا رواه الشافعي في اختلاف الحديث (۲۰۷) والمعروف من الفاظ الجديث اسفر وابل لفر فانه اعظم للاجر من حديث رافع بن خديج رواه الترمذي والشافعي في الرسالة رقم ۴۷۳ وابن حبان في زوائد رقم ۲۶۴ - ۲۶۵ وفي ۲۶۳ اصحوا بالصبح .

(اَنَافِيٌّ) کو بھی سُفْعُ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے: بِهْ سُفْعَةٌ غَضَبٍ اس کے چہرہ پر غصے کا اثر ہے کیونکہ سخت غصہ کے وقت چہرہ کا رنگ دھانی سا ہو جاتا ہے۔ اور شکرے کو اَسْفَعُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پردوں میں سیاہ چمک سی پائی جاتی ہے۔ اور اَمْرَأَةٌ سَفْعَاءُ اللَّوْنِ سیاہ رنگ عورت کو کہتے ہیں۔

(س ف ک)

السَّفْكُ (ض) کے معنی خون ریزی کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَفْكُ الدِّمَاءِ﴾ (۲-۳۰) اور کشت و خون کرتا

پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی

استعمال ہوتا ہے۔

(س ف ل)

السُّفْلُ یہ عَلُوٌّ کی ضد ہے اور سَفْلٌ (سَفْوَلًا)

فَهُوَ سَافِلٌ کے معنی پست اور حقیر ہونے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ (۵-۹۶) پھر (رفتہ

رفتہ) اس کی حالت کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔

نیز فرمایا:

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَى﴾ (۹-۳۰)

اور کافروں کی بات کو پست کر دیا۔

کبھی اَسْفَلُ "فَوْقُ" کے بالمقابل بھی استعمال ہوتا

فرشتے ہیں جنہیں دوسری جگہ ﴿كِرَامًا كَاتِبِينَ﴾ (۸۲-۱۱) (عالی قدر لکھنے والے) کہا ہے اور یہ سَافِرٌ کی جمع ہے۔ جیسے كَاتِبٌ کی جمع كَاتِبَةٌ۔

السَّفِيرُ: اس فرستادہ کو کہا جاتا ہے جو مُرْسِلٌ کی غرض کو مُرْسَلٌ اِلَيْهِ پر کھولتا اور فریقین سے منافرت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ فَحِيلٌ بمعنی فاعل سے ہے اور سَفَارَةٌ بمعنی رسالت آتا ہے پیغمبر، فرشتے اور (سامی) کتابیں لوگوں پر حقائق کی کشادگی کرنے میں باہم شریک ہیں (اس لئے ان سب کو سَفِيرٌ کہہ سکتے ہیں)۔ اور سَفِيرٌ (فعلیل) بمعنی مفعول ہو تو اس کے معنی کوڑا کرکٹ کے ہوتے ہیں۔ جو جھاڑو دے کر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور شاعر کے قول ❶

(۲۲۹) وَمَا السَّفَارُ فُجِحَ السَّفَارِ

میں بعض نے سَفَارِ کے معنی اس لوہے کے کئے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالا جاتا ہے اور اس معنی پر اگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہ سَفَارَتٌ (مفاعلہ) کا مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ ❷

(س ف ع)

السَّفْعُ: کے معنی گھوڑے کو سوار ناصیہ یعنی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾ (۹۶-۱۵) تو ہم (اس کی) پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے۔ اور سیاہی کے معنی کے اعتبار سے چولہے کے پتھروں —

❶ لم اجده .

❷ كما قال حسان رضى الله عنه : لولا السفر وبعدة حرق مهمه - لتركها تحبوعلى العروق وقول الاحتل يؤيد قول البعض وموقع

اثر السفر بخطمه من سود عقة اوبنى الحوال ۱۲ .

سَفَنٌ کہا جاتا ہے۔ جیسے تیشہ وغیرہ۔ اور چھیلنے کے معنی کے لحاظ سے کشتی کا نام سَفِينَةٌ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی سطح آب کو چرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَمَّا السَّفِينَةُ﴾ (۷۹-۱۸) لیکن کشتی پھر مجازاً کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر آرام دہ سواری کو سَفِينَةٌ کہا جاتا ہے۔

(س ف ہ)

السَّفَهُ: اس کے اصل معنی جسمانی ہلکا پن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زِمَامٌ سَفِيَةٌ کہا جاتا ہے اور ثوبٌ سَفِيَةٌ کے معنی ردی کپڑے کے ہیں۔ پھر اس سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے سَفِيَةٌ نَفْسُهُ جو اصل میں سَفِيَةٌ نَفْسُهُ ہے پھر اس سے فعل کی نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے۔ جیسے بَطِرَ مَعِيشتُهُ کہ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِيشتُهُ ہے۔^①

اور سَفَهُ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دنیوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَوْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ﴾ (۴-۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال..... مت دو۔

ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِذْ جَاءَ وَكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ﴾ (۸-۳۳) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر (چڑھ) آئے۔

سُفَالَةُ الرِّيحِ: ہوا کی بائیں جانب یعنی جدھر کو چل رہی ہو۔ اس کی ضد عَلَاوَةٌ ہے جس کے معنی اوپر کی جانب کے ہیں یعنی جس طرف سے آ رہی ہو۔

السُّفْلَةُ: کینے لوگ۔ جیسے دُونٌ۔

أَمْرُهُمْ فِي سَقَالٍ: ان کا معاملہ انحطاط میں ہے یعنی ان کی حالت دگرگوں ہے۔

(س ف ن)

السَّفْنُ: اس کے اصل معنی چوب اور چڑا وغیرہ کو چھیلنے کے ہیں۔ اور سَفَنَ الرِّيحُ التُّرَابَ عَنِ الْأَرْضِ کے معنی ہیں، ہوا نے زمین سے مٹی کو گھس ڈالا۔ شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۳۰) فَجَاءَ خَفِيًّا يَسْفِنُ الْأَرْضَ صَدْرَهُ

وہ زمین پر اپنا سینہ رگڑتے ہوئے پوشیدہ طور پر وہاں جا پہنچا۔ اور تراشی ہوئی چیز کو يَسْفِنُ (فعل بمعنی مفعول) کہتے ہیں جیسے نَقَضُ بمعنی منقوض آ جاتا ہے اور السَّفْنُ خاص کر اس کھر درے چڑے کو کہا جاتا ہے جس کو تلوار کے قبضہ پر لگاتے ہیں اور چوب تراشی کے اوزار کو بھی

① قاله امرء القيس يصف ربيماً يسفن اى يمسح وعجزه: ترى التراب منه لاصقاً كل ملصق والبيت فى اللسان (سفن) ودويانه ۹۰ (صنعة السنديوبى) والعقد الثمين ۱۴۱ والمعانى الكبير ۷۷۷ ومختار الشعر الجاهلى (۱: ۶۱) ونقد الشعر (۵۶) وفيه لازقا كل ملزق وحضيا بالمهملة) والبيت ايضا فى تهذيب اصلاح المنطق (۱: ۹۷) وفى الاصلاح ۵۴۰ وبرىوى لبعض الطالبيين ۱۲.

② وفى الاية (۲: ۱۳۰) الامن سفه نفسه.

③ وفيه اختلاف قال المبرد انه متعد بنفسه فلاناويل كماورد فى الحديث الكبير ان تسفه الحق وعند البعض منصوب على التمييز كما ذَهَبَ اليه المؤلف راجع الكشاف.

پھر چونکہ سَقْر اپنے اصل کے لحاظ سے تھلسا دینے کے معنی کو متقاضی ہے اس لئے آیات:

﴿وَمَا أَذْرَاكَ مَا سَقَرٌ ۚ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۚ
لَوَاحِيَةٌ لِلْبَشَرِ﴾ (۷۴-۲۹۶) اور تم کیا سمجھتے ہو کہ
سقر کیا ہے؟ (وہ آگ ہے کہ) نہ باقی رکھے گی اور نہ
چھوڑے گی اور بدن کو جھلس کر سیاہ کر دے گی۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ سقر کے جو احوال تم مشاہدہ سے
جاتے ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔

(س ق ط)

السَّقُوطُ: (ن) اس کے اصل معنی کسی چیز کے
اوپر سے نیچے جھک جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَأَنْ يَرَوْا عَلَيْنَا كَسَفًا مِنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا﴾
(۵۲-۲۴) اور اگر یہ آسمان (سے عذاب) کا کوئی ٹکڑا
گرتا ہوا دیکھیں۔

﴿فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كَسَفًا مِنَ السَّمَاءِ﴾ (۲۶-
۱۸) تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا گراؤ۔

اور اس کے معنی قدر و قیمت اور مرتبہ کے لحاظ سے گر جانا
بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا﴾ (۹-۲۹) دیکھو یہ آفت
میں پڑ گئے۔

السَّقَطُ وَالسَّقَاطَةُ: ناکاری اور رومی چیز کو کہتے ہیں اور
اسی سے رَجُلٌ سَاقِطٌ ہے جس کے معنی کمینے آدمی کے
ہیں۔ اسْقَطَهُ كَذًا: فلاں چیز نے اس کو ساقط کر دیا۔

اور اسْقَطَ الْمَرْءَةَ: (عورت نے نا تمام حمل گرا دیا) میں
اوپر سے نیچے گرنا اور رومی ہونا دونوں معنی اکٹھے پائے
جاتے ہیں۔ کیونکہ اسْقَطَتِ الْمَرْءَةَ: اس وقت بولتے

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:

﴿وَأَنَّهُ كَانَ يَقُولُ سَفِينًا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا﴾
(۷۲-۴) اور یہ کہ ہم میں سے بعض بے وقوف خدا کے
بارے میں جھوٹ افتراء کرتے ہیں۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے
اور آیت کریمہ:

﴿أَتُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ
السُّفَهَاءُ﴾ (۲-۱۳) تو کہتے ہیں کیا اسی طرح ہم بھی
ایمان لے آئیں؟

میں ان کو سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو
سُفَهَاءُ کہنا بنا بر حماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل
ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَا لَهُمْ عَن
قِبَلَتِهِمُ الَّذِينَ كَانُوا عَلَيْهَا﴾ (۲-۱۳۲) احمق لوگ
کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر (پہلے چلے آتے تھے)
اب اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے۔

(س ق ر)

سَقَرٌ: (جہنم) یہ اصل میں سَقَرَتُهُ الشَّمْسُ
وَصَقَرَتُهُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اسے دھوپ
نے جھلس دیا اور پگھلا دیا۔ پھر جہنم کا علم بن گیا ہے۔ چنانچہ
قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ﴾ (۷۴-۲۲) کہ تم دوزخ میں
کیوں پڑے۔

اور نیز فرمایا:

﴿ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ﴾ (۵۴-۲۸) اب آگ کا مزہ
چکھو۔

کی (قسم) میں مراد آسمان ہے جیسا کہ آیت:
﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَفًّا مَحْفُوظًا﴾ (۲۱-۳۲)
میں آسمان کو محفوظ چھت فرمایا ہے۔
اور ہر وہ جگہ جو مُسَقَّف ہو اسے سقیفہ کہا جاتا ہے۔ جیسے
صُفَّة (چھوڑا مکان وغیرہ)۔
اور چھت کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس لمبی چیز کو جس میں خم
سا پایا جائے سَقْف کہہ دیتے ہیں۔

(س ق م)

السَّقْمُ وَالسَّقْمُ: خاص کر جسمانی بیماری کو کہتے
ہیں۔ بخلاف مَرَضٌ کے کہ وہ جسمانی اور قلبی دونوں قسم
کی بیماریوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک
میں ہے:
﴿فَنَسِيَ قُلُوبِهِمْ مَرَضًا﴾ (۲-۱۰) ان کے دلوں میں
(کفر کا) مرض تھا۔ اور آیت:

﴿فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ﴾ (۳۷-۸۹) اور کہا میں تو بیمار
ہوں۔ میں سَقِيمٌ کا لفظ یا تو تعریض کے طور پر استعمال
ہوا ہے اور یہ زمانہ ماضی یا مستقبل کی طرف اشارہ کے لئے
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہلکی سی بدنی تکلیف کی طرف
اشارہ ہو جو اس وقت ان کو عارض تھی۔ کیونکہ انسان
بہر حال کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا رہتا ہے اگرچہ وہ اسے
محسوس نہ کرے اور خوف ناک جگہ کو مَسْكَانٌ سَقِيمٌ کہا
جاتا ہے۔

(س ق ی)

السَّقْيُ وَالسَّقْيَا کے معنی پینے کی چیز دینے کے

ہیں جب عورت ناتمام بچہ گرا دے اور اسی سے ناتمام بچہ کو
سَقَطٌ یا سَقِطٌ کہا جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے
کر چمقاق کی ہلکی سی (ناقص) چنگاری کو سَقِطُ الزَّئِدِ کہا
جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کبھی اس کے ساتھ بچہ کو بھی
موسوم کیا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَلَمَّا سَقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ﴾ (۷-۱۲۹) اور جب وہ
نادم ہوئے۔

میں پشیمان ہونا مراد ہے۔ اور آیت:

﴿تَسْقِطُ عَلَيْكَ رَطْبًا جَنِينًا﴾ (۹-۲۵) تم پر تازہ
بھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
میں ایک قرأت تَسَاقَطٌ بھی ہے اور اس کا فاعل نَحْلَةٌ
ہے اور ایک قرأت میں تَسَاقَطٌ ہے جو اصل میں
تَسَاقَطٌ فعل مضارع کا صیغہ ہے اس میں ایک تاء
مخذوف ہے اس صورت میں یہ باب تفاعل سے ہوگا اور
یہ اگرچہ فاعل کا مطاوع آتا ہے لیکن کبھی متعدی بھی
ہو جاتا ہے۔ اور ایک دوسری قرأت میں يَسَاقَطُ (صیغہ
مذکر) ہے اس صورت میں اس کا فاعل جَذْعٌ ہوگا۔

(س ق ف)

سَقْفُ النَّبِيِّ: مکان کی چھت کو کہتے ہیں اس کی
جمع سَقْفٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَلْيَبُوءْتَهُمْ سَقْفًا مِّنْ فِضَّةٍ﴾ (۲۳-۲۳) (ہم)
ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالسَّقْفُ الْمَرْفُوعُ﴾ (۵۲-۵) اور اونچی چھت

① راجع (بدی)۔

② راجع للفرات التاج (سقط)۔

چیزیں بھی مفعول بنتی ہیں اس لئے سَقَى کا لفظ ان دونوں چیزوں پر بولا جاتا ہے۔

الْأَسْتِسْقَاءُ کے معنی کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذْ أَسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ مِنَ اللَّهِ﴾ (۲۰-۶۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے (اللہ سے) پانی مانگا۔

الْسَّقَاءُ: (مشکیزہ) وہ برتن جس میں پینے کی چیز رکھی جائے اسی سے ہے: أَسْقَيْتَكَ جَلْدًا کہ میں نے تمہیں (مشکیزہ بنانے کے لئے چڑا دیا) اور آیت کریمہ:

﴿جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ﴾ (۱۲-۷۰) (تو) اپنے بھائی کے شلیتے میں پینے کا برتن رکھ دیا۔

میں سَقَايَةً سے مراد وہی ہے جسے (بعد کی آیت میں) صُوعِ الْمَلِكِ کہا گیا ہے اس ایک ہی برتن کے یہ دو نام دواعتبار سے ہیں یعنی اس کے ساتھ پانی پینے کے لحاظ سے اسے سَقَايَةً کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے ساتھ غلہ پایا جاتا ہے صُوعِ کہہ دیا ہے۔

(س ک ب)

مَاءٌ مَسْكُوبٌ کے معنی بہائے ہوئے پانی کے

ہیں۔^۱

اور تیز رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ سَكَبُ الْجَبْرِ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے: سَكَبَتْهُ فَنَسَكَبَتْ: میں نے اسے بہایا تو وہ بہہ پڑا اور دَمَعٌ (آنسوؤں) کو بصورت فاعل تصور کر کے۔ سَاكِبٌ (بہنے والے) کہا جاتا ہے اور کبھی دَمٌ مَسْكِبٌ بھی بولتے ہیں اور باریک کپڑے کو بھی سیال چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَوْبٌ سَكَبٌ کہہ دیتے

ہیں۔ اور اسْقَاءُ کے معنی پینے کی چیز پیش کر دینے کے ہیں تاکہ حسبِ منشاء لے کر پی لے لہذا اسْقَاءُ نسبت سَقَى کے زیادہ بلوغ ہے کیونکہ اسْقَاءُ میں مَاسَقَى مِنْهُ کے پیش کر دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمائے۔ مثلاً: أَسْقَيْتَهُ نَهْرًا کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک سَقَى کے متعلق فرمایا:

﴿وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا﴾ (۶-۲۱) اور ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

﴿وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا﴾ (۳۷-۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

﴿وَالَّذِي هُوَ يُطْعَمُنِي وَيَسْقِينِي﴾ (۸۲-۲۶) اور وہ مجھے کھاتا اور پلاتا ہے۔

اور اسْقَاءُ کے متعلق فرمایا:

﴿وَأَسْقِينَاكُمْ مَاءً فُرَاتًا﴾ (۷۷-۲۷) اور تم لوگوں کو بیٹھا پانی پلایا۔

﴿فَأَسْقِينَاكُمْوه﴾ (۱۵-۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ میں:

﴿نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا﴾ (۲۳-۲۱) (کہ) جو ان کے پیٹوں میں ہے اس سے ہم تمہیں (دودھ) پلاتے ہیں۔ میں ایک قرأت فتح نون کے ساتھ بھی ہے۔

سَقَى کے معنی پانی کا حصہ اور سیراب شدہ زمین دونوں آتے ہیں کیونکہ سَقَى بمعنی مَسَقَى (اسم مفعول) کے ہے۔ جیسے نَقَضٌ بمعنی مَنْقُوضٌ ہے۔ اور یہ دونوں

۱ وفی الفرقان وماء مسكوب (۵۶-۳۱)۔

اور اسی سے سَكَرَاتُ الْمَوْتِ (موت کی بے ہوشی)

ہیں گویا وہ بہتا ہوا پانی ہے۔

ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (۱۹-۵۰)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہو گئی۔

السَّكْرُ: (فتح السین والکاف) نشہ آور چیز۔ قرآن پاک

میں ہے:

﴿تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا.....﴾ (۱۶-)

(۶۷) کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق (کھاتے

ہو)

اور شراب سے انسان اور اس کی عقل کے درمیان بھی

چونکہ دیوار کی طرح کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے اس اعتبار

سے سَكْرٌ کے معنی پانی کو بند لگانے اور روکنے کے

آ جاتے ہیں اور اس بند کو جو چوری روکنے کے لئے لگایا

جائے سَكْرٌ کہا جاتا ہے۔ (یہ فعل بمعنی مفعول ہے) اور

آیت:

﴿إِنَّمَا سَكَّرَتْ أَبْصَارُنَا.....﴾ (۱۵-۱۵) کہ ہماری

آنکھیں مخمور ہو گئی ہیں۔ میں سَكَّرَتْ بعض کے نزدیک

سُكِّرَ سے ہے اور بعض نے سَكْرَ سے لیا ہے اور پھر سَكْرٌ

سے سکون کے معنی لے کر پرسکون بات کو لَيْلَةٌ سَاكِرَةٌ

کہا جاتا ہے۔

(س ک ن)

السُّكُونُ: (ن) حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو

سُكُونٌ کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی

یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سَكَنَ فُلَانٌ مَكَانًا كَذَا کے

معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار

(س ک ت)

السَّكُوتُ: (ن) اس کے اصل معنی تو ترک کلام

یعنی خاموش ہونے کے ہیں۔ اور بہت زیادہ چپ رہنے

والے آدمی کو رَجُلٌ سَكِيْتٌُّ وَسَاكُوتٌ کہا جاتا ہے

اور سَكْتَةٌ يَأْسُكَاتُ مرض سکتہ کو کہتے ہیں اور موسیقی

میں سَكْتُتٌ کا لفظ سکون نفس کے ساتھ مخصوص ہے اور

افتتاح صلوة کی حالت اور قرأت سے فارغ ہونے کے

بعد سکوت کرنے کو سَكْتَاتٌ فِي الصَّلَوَاتِ کہا جاتا

ہے۔

السُّكَيْتُ: دوڑ میں سب سے آخر آنے والا گھوڑا۔ پھر

چونکہ سَكُوتٌ میں ایک گونہ سکون پایا جاتا ہے۔ اس

لئے آیت:

﴿وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ﴾ (۱۵۳-۷)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا۔

میں بطور استعارہ غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَتَ

کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(س ک ر)

السَّكْرُ: اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان

اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اس کا نام

استعمال شراب کی مستی پر ہوتا ہے اور کبھی شدت غضب یا

غلبہ عشق کی کیفیت کو سُكْرَ سے تعبیر کر لیا جاتا ہے اسی

لئے شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۲۳۱) سَكْرَانِ سَكْرَ هَوَىٰ وَسَكْرَ مَدَامِ

نشہ دو ہیں ایک نشہ محبت اور دوسرا شراب۔

۱ وتمامہ: فعنی یفیع فتی بہ سُكْرَانِ وَالْبَيْتِ فِي الرِّسَالَةِ بغير عَزْوِ وَفِي الْمَطْبُوعِ مَدَامِ بغير هاء ۱۲۔

اور ہر وہ چیز جس سے راحت حاصل ہو اسے ”سَكْنٌ“ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا﴾ (۱۶)۔

(۸۰) اور خدا ہی نے تمہارے لیے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا۔ اور فرمایا:

﴿إِنَّ صَلَوَاتِكَ سَكْنٌ لَّهُمْ﴾ (۹-۱۰۳) تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔

﴿وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا﴾ (۶-۹۷) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام ٹھہرایا۔

اور سَكْنٌ اس آگ کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ سکون حاصل کیا جاتا ہے۔

السُّكْنِي: کسی کو بغیر کرایہ کے رہائش کے لئے جگہ دینے کو سَكْنِي کہا جاتا ہے اور ایک مکان میں رہنے والے لوگوں کو سَكْنٌ کہا جاتا ہے یہ ساکن کی جمع ہے جیسے سَافِرٌ کی جمع سَفَرٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سَاكِنٌ کی جمع سَكَاَنٌ (بضم سین) آتی ہے اور سَكَاَنٌ (بفتح سین) کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کشتی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

السَّكِينُ: (چھری) کو سکین اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مذبح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے (تو یہ سکون سے فَعِيلٌ کے وزن پر اسم مشتق ہے) اور آیت:

﴿أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۴۸)۔

(۴) (وہی تو ہے) جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سَكِينَةٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومن کے دل کو تسکین دیتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المؤمنین

سے جائے رہائش کو مَسْكَنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَسَاكِنٌ آتی ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يُرَى إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ.....﴾ (۲۶-۲۵) کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا:

﴿وَلَهُ مَسَاكِنٌ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ (۶-۱۱۳) اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

﴿وَلَتَسْكُنُوا فِيهِ﴾ (۲۸-۷۳) تاکہ تم اس میں آرام کرو۔

تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سَكَّنْتُهُ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اسَكَّنْتُهُ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ (۱۴-۳۷) اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد..... لایا ہے۔

﴿أَسْكِنُوهُمْ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ﴾ (۶۵-۶) (مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے

مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو۔ اور آیت:

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْكَنَّا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۳-۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے ساتھ

پانی نازل کیا۔ پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔ میں اس بات پر تشبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وجود میں لانے اور

پھر ایجاد کے بعد اس کے نابود کر دینے پر قادر ہے (جیسا کہ آیت کے تتمہ: ﴿وَأَنَا عَلَىٰ ذَهَابٍ بِهِ لَقَادِرُونَ﴾

سے معلوم ہوتا ہے) السَّكْنُ کے معنی سَكُونٌ کے ہیں

مَا يُؤْوُلُ کے لحاظ سے ہے یعنی کشتی کے چلے جانے کے بعد کی حالت کے لحاظ سے انہیں مسکین کہا گیا ہے۔ یا اس لئے کہ ان کی احتیاج اور مسکنت کے مقابلہ میں کشتی کی کچھ بھی حیثیت نہ تھی۔ اور آیت:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ (۲-۶۱)
(اور آخر کار) ذلت (ورسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی)
ان سے چھٹادی گئی۔

میں اصح قول کے لحاظ سے مَسْكَنَةُ کی میم زائد ہے (اور یہ سکون سے ہے)

(س ل ل)

سَلُّ (ن) الشَّيْءِ مِنَ الشَّيْءِ کے معنی ایک چیز کے دوسری سے کھینچ لینے کے ہیں، جیسے تلوار کا نیا م سے سونمتا، یا گھر سے کوئی چیز چوری کھسکا لینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسْتَلْلُونَ مِنْكُمْ لِيُؤَادُوا﴾ (۲۳-۶۳) جو تم میں سے آنکھ بچا کر چل دیتے ہیں۔

اسی مناسبت سے باپ کے نطفہ پر بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مِنْ سَلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ﴾ (۳۲-۸)
خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی۔

وہ ہر جوہر جو غذا کا خلاصہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بطور کنایہ نطفہ مراد ہے۔ اور نطفہ پر اس کا اطلاق اس جوہر کے لحاظ سے ہے۔ جس سے نطفہ بنتا ہے۔

السُّلُّ: سل کی بیماری کیونکہ یہ انسان سے گوشت اور قوت کو کھینچ لیتی ہے اور أَسْلَهُ اللّٰهُ کے معنی ہیں 'اللہ

(حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے (أَنَّ السَّكِينَةَ لَتَسْطِقُ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ) (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سَکِينَةُ گویا ہے اور بعض نے اس سے عقل انسانی مراد لی ہے اور عقل کو بھی جب کہ وہ شہوات کی طرف مائل ہونے سے روک دے سَکِينَةُ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَتَطْمِئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۱۳-۲۸)

اور جن کے دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں۔ بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَکِينَةُ اور سَكَنٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی رعب اور خوف کا زائل ہونا۔ اور آیت:

www.KitaboSunnat.com

﴿أَنْ يَأْتِيَكُمْ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (۲-۲۳۸) کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی ہوگی۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور بعض مفسرین نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ وہ چیز تھی جس کا سرہلی کے سر کے مشابہ تھا وغیرہ تو ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔

الْمَسْكِينُ: بعض نے اس کی تفسیر مِّن لَّا شَيْءَ لَهُ (یعنی جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو) کے ساتھ کی ہے۔

اور یہ فقیر سے ابلغ ہے (یعنی بنسبت فقیر کے زیادہ نادار ہوتا ہے) لیکن آیت:

﴿وَأَمَّا السَّقِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينٍ﴾ (۱۸-۷۹)

اور کشتی غریب لوگوں کی تھی۔
میں (باوجود کشتی کا مالک ہونے کے) انہیں مسکین قرار دینا

(۲۳۲) أَشْهَىٰ إِلَيَّ مِنَ الرَّحِيقِ السَّلْسَلِ

وہ مجھے شفاف شراب سے زیادہ مرغوب ہے۔

اور آیت: (۶-۱۸) میں سَلْسَلِيْلًا (سلسیل) کے

معنی تیزی سے بہتے ہوئے صاف، لذیذ اور خوشگوار پانی

کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جنت کے ایک چشمہ کا نام

ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سَلُّ اور سَبِيْل سے بنا

ہے اور حَوْقَلَةٌ وَبَسْمَلَةٌ وغیرہ کی طرح الفاظ مرکبہ

کے قبیل سے ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر تیز رو چشمے کو سَلْسَبِيْل کہا جاتا ہے۔

اور زبان کے باریک سرے کو أَسَلَةُ اللِّسَان کہتے ہیں۔

(س ل ب)

السَّلْبُ: اس کے معنی کسی سے کوئی چیز چھین لینا

کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَن يَسْلَبَهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَفِئُوهُ مِنَّهُ﴾

(۲۲-۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے

تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔

السَّلْبُ: لٹا ہوا آدمی۔ وہ اونٹنی جس کا بچہ چھین گیا اور

السَّلْبُ کے معنی چھینی ہوئی چیز اور درخت سے اتاری

ہوئی چھال کے ہیں۔ اور شاعر کے قول ④

فِي السَّلْبِ السُّودِ وَفِي الْأَمْسَاحِ

(سیاہ ماتمی لباس اور ٹاٹا پہنے ہوتے ہیں)

تعالیٰ نے اسے سل کی بیماری میں مبتلا کر دیا“ حدیث میں ہے۔ ①

(۱۷۷) لَا إِسْلَالَ وَلَا إِغْلَالَ کہ چوری اور خیانت نہیں ہے۔

تَسْلَسَلِ الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے

ہیں۔ گویا اس میں بار بار کھسک جانے کا تصور کر کے لفظ کو تکرار

کر دیا ہے تاکہ تکرار لفظ تکرار معنی پر دلالت کرے اسی سے

سِلْسِلَةٌ ہے جس کے معنی زنجیر کے ہیں۔ قرآن پاک میں

ہے ﴿فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا﴾ (۲۹-۳۲)

پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے۔ (جکڑو)

سِلْسِلَةٌ کی جمع سِلْسِلَاتٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿سَلَا سِلًّا وَأَغْلَالَ وَسَعِيرًا﴾ (۶-۱۳)

زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ (تیار کر رکھی ہے)

﴿وَالسَّلَا سِلُّ يُسْحَبُونَ﴾ (۴۰-۷۱) اور زنجیریں

ہوں گی اور گھسیٹے جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے۔ ②

(۱۷۸) يَاعَجَبًا لِقَوْمٍ يُقَادُونَ إِلَى الْجَنَّةِ

بِالسَّلَا سِلِّ: اس قوم پر تعجب ہے جو زنجیروں میں

جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں۔

اور مَاءَ سَلْسَلٍ اس پانی کو کہتے ہیں جو اپنی قراگاہ میں

مضطرب ہو کر صاف ہو جائے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ③

① غریب ابی عبید (۱: ۱۹۸) و ابو داؤد فی الجہاد والحاکم (۴: ۳۲۵) والفائق (۲: ۲۱۳) والطبرانی عن کثیر بن عبد اللہ عن ابیہ عن جده عن عمرو بن عوف سیاتی فی (غزل).

② الحدیث باختلاف الفاظہ فی (حم، خ، و عن ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال (۳: ۱۷۸).

③ قالہ ابو کبیر الہذلی (عامر بن الحلین) و صدرہ ام لاسبیل الی الشباب و ذکرہ و البیت فی اللسان (سلسل).

④ قالہ لیبید حین شرب عامر بن مالک و غنت لہ قینتان و اختلف فی قرینہ ففی اللسان (سلب) یخمشن حرا و ارجہ صحاح و فی المحبر (۷۷۳) ہذا اول البیت و عجزہ۔ ابنا ملاعب الرماح و بعدہ: یا عامراً! یا عامر الصحاح۔ و عامر الکتبۃ الرواح۔ و لہ قصۃ راجع

المحر و الشطر فی الاشتقاق ۳۵۴ و اللسان (نوح).

اِسْلِيحْ گھاس کھانے کے بعد کرتا ہے پھر بطور کتایہ ہر فضلہ پر بولا جاتا ہے حتیٰ کہ حباری جانور کے متعلق مشہور محاورہ ہے۔

سِلَاحُهُ سِلَاحُهُ کہ اس کا فضلہ ہی اس کا ہتھیار ہے۔

(س ل خ)

اَلْسَلْحُ: اس کے اصل معنی کھال کھینچنے کے ہیں۔

جیسے محاورہ ہے:

سَلَخْتُهُ فَاَنْسَلَخَ: میں نے اس کی کھال کھینچی تو وہ کھچ گئی پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ کے گزر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے سَلَخْتُ دِرْعَهُ: میں نے اس کی زرہ اتاری۔ سَلَخَ الشَّهْرَ وَاَنْسَلَخَ: مہینہ گزر گیا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَاِذَا اَنْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرْمُ﴾ (۹-۵) جب عزت کے مہینے گزر جائیں۔

﴿نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ...﴾ (۳۶-۳۷) کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

اور محاورہ ہے:

اَسْوَدُ سَالِحٌ، سَلَخَ جِلْدَهُ: زریاہ سانپ نے اپنی کینچی اتار دی۔ اور کھجور کے جس درخت کی کچی کھجوریں جھڑ جائیں اسے نَخْلَةٌ مَسْلَاخٌ کہا جاتا ہے۔

(س ل ط)

اَلْسِلَاطَةُ: اس کے معنی غلبہ حاصل کرنے کے

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاہ ماتی لباس مراد ہے جو مصیبت زدہ شخص پہن لیتا ہے اور ماتی لباس کو سلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اصل لباس اتار کر اسے پہنا جاتا ہے۔ پھر جیسا کہ اَحَدَاتِ الْمَرْثَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی ماتی لباس پہننے کے ہیں ایسے ہی تَسَلَّبَتِ الْمَرْثَةُ بھی کہا جاتا ہے اَلْاَسْلُوبُ طَرِيقَةٌ، رُوشٌ، جمع اَسَالِيْبٌ۔

(س ل ج)

اَلْسِلَاحُ: (ساز جنگ) یعنی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لڑائی کی جائے جیسے تلوار، کمان، نیزہ، چوب دستی وغیرہ (اس کی جمع) اَسْلِحَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلِيَاخُذُوا جِدْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ﴾ (۴-۱۰۲) اور ہوشیار اور مسلح ہو کر (تمہارے ساتھ نماز ادا کریں)

اَلْاَسْلِيحُ: ایک قسم کی گھاس ہے جس کے کھانے سے اونٹ موٹے ہو جاتے ہیں۔ مادہ اوٹنی کھالے تو اس کا دودھ بڑھ جاتا ہے گویا وہ موٹے ہو کر مسلح ہو گئے اور ذبح ہونے سے بچ گئے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

(۲۳۴) اَزْمَانَ لَمْ تَأْخُذْ عَلَيَّ سِلَاحَهَا

اِبْلِي بِجِلَّتْهَا وَلَا اَبْكَارَهَا

اس زمانہ میں جب کہ میرے بڑے اور جوان اونٹوں نے ہتھیار نہیں پہنے تھے یعنی موٹے نہیں ہوئے تھے۔

اَلْسِلَاحُ: اصل میں اونٹ کے اس گوبر کو کہتے ہیں جو

① قاله النمر بن تولب في وصف الابل والبيت في اللسان والمحكم (سطح، جلد) وامالي المرتضى (۲: ۱۱۹) والثمار ۲۷۹ والمعاني للفتي (۳۹۱-۲۳۱) والميداني ۱: ۲۰، ۱۶، ۲۲، ۴۹، ۳۷، ۵۰) وفي اللسان ايام بدل ازمان وفي المطبوع على بدل الى مصحف والمراد من سلاح الابل سمها وحسنها وانه يمنع صاحبها من العقر والذبح وفي المرتضى في سلاح الابل اشعار والبيت ايضا في اللاليء مع السط ۶۳۲، ۷۸۳ وغريب ابى عبيد (۱: ۲۰۵)۔

﴿يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ
آتَاهُمْ﴾ (۳۵-۳۰) جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے

پاس کوئی دلیل آئی خدا کی آیتوں میں جھڑتے ہیں۔

﴿فَاتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ﴾ (۹۶-۱۱) اور ہم نے
موسیٰ ﷺ کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔

﴿أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا
مُؤْمِنًا﴾ (۱۳۳-۳) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر خدا کا

صریح الزام لو۔ اور آیت:

﴿هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِي﴾ (۲۹-۲۹) (ہائے) میری
سلطنت خاک میں مل گئی۔

میں سلطان کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں یعنی اس سے
مراد دلیل بھی ہو سکتی ہے اور غلبہ بھی۔

السَّلِيْطُ: اہل یمن کی زبان میں زیتون کے تیل کو کہتے
ہیں۔ اور سَلَاطَةُ اللِّسَانِ کے معنی گفتگو پر قدرت

کے ہیں اور یہ عموماً مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور
زبان دراز عورت کو امْرَأَةٌ سَلِيْطَةٌ کہا جاتا ہے اور

سَنَابِكُ سَلْطَاتٍ کے معنی تیز سبوں کے ہیں گویا قوت
اور طول کی وجہ سے انہیں تسلط حاصل ہے۔

(س ل ف)

السَّلْفُ: کے معنی متقدم یعنی پہلے گزر جانے والا

کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَجَعَلْنَاهُمْ سَلْفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِيْنَ﴾ (۵۶-۴۳)

ان کو گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لئے عبرت بنا دیا۔

﴿فَلَمَّا سَلَفَ﴾ (۲۷۵-۲) تو جو پہلے ہو چکا وہ اس

کا۔ یعنی اس کے پہلے گناہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اس

ہیں اور سَلَطْتُهُ فَتَسَلَّطَ کے معنی ہیں ”میں نے اسے
مقبور کیا تو وہ مقبور ہو گیا“ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطْنَاهُمْ﴾ (۸۹-۳) اگر خدا چاہتا
تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا۔

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ يَسْلُطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ﴾
(۶۰-۵۹) لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط

کر دیتا ہے۔

اور اسی سے بادشاہ کو ”سلطان“ کہا جاتا ہے۔ اور سلطان کا
لفظ تسلط اور غلبہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيَّهِ سُلْطَانًا﴾
(۳۳-۱۷) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس

کے وارث کو اختیار دیا ہے۔

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ
رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ

يَتَوَلَّوْنَهُ﴾ (۱۶-۹۹-۱۰۰) کہ جو مومن ہیں اور اپنے
پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا۔

اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رقیق بناتے ہیں۔
﴿لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ﴾ (۳۳-۵۵) اور زور

کے سوا تم نہیں نکل سکتے۔

عام طور پر صاحب سلطنت کو سلطان کہا جاتا ہے اور حجت
(دلیل) کو بھی سلطان کہا گیا ہے۔ ❶ کیونکہ دلوں پر اس

کا دباؤ ہوتا ہے لیکن عام طور پر اس کا تسلط ان اصحاب علم و
حکمت پر ہوتا ہے جو ایمان دار (دیانتدار) ہوں۔ قرآن

پاک میں ہے۔

❶ وعن ابن عباس: قد جاء السلطان بمعنى الحجة في جميع القرآن ۱۲۔

پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اسی طرح آیت:

﴿إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ (۲۲-۳) مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا)۔

میں مَاسَلَف سے مراد یہ ہے کہ جو گناہ اس سے قبل ہو چکے ہیں وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ تو یہاں استثناء جو از فعل سے نہیں ہے کہ جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ جائز اور مباح ہیں بلکہ یہاں استثناء گناہ سے ہے یعنی اس سے قبل جو نکاح ہو چکے ہیں ان کا گناہ معاف کر دیا جائے گا اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ ❶ اور لُفْلَان سَلَفٌ كَرِيمٌ کے معنی ہیں اس کے آباؤ اجداد کریم تھے۔ سَلَفٌ کی جمع اَسْلَافٌ اور سُلوْفٌ آتی ہے۔

اور کسی چیز کی پیٹنگی قیمت ادا کرنے کو بھی سَلَفٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْسَالِفَةُ: گردن کے کنارے کو کہتے ہیں اور لڑائی میں ہر اول دستہ یا سفر میں قافلہ سے آگے جانے والے لوگوں کو سَابِقَةٌ اور سَلَفٌ کہا جاتا ہے۔

سَلَاةُ الْحَمْرِ: باقی ماندہ عصیرہ۔ اَلْسُلْفَةُ: (ناشتہ) یعنی وہ طعام جو مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کیا جاتا ہے۔

مجاورہ ہے:

سَلَفُوا ضَيْفَكُمْ وَلَهُنَّوْهُ: اپنے مہمان کو نکل کھلاؤ۔

(س ل ق)

اَلسَّلَقُ: قہر و غلبہ کے ساتھ دست یا زبان وارزی کرنا کے ہیں اور اسی سے تَسَلَّقُ عَلٰی الْحَائِطِ ہے جس کے معنی دیوار پھاندنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿سَلِّقُوا كُفْرًا تَلْفَحًا﴾ (۱۹-۳۳) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں زبان درازی کریں گے۔

مجاورہ ہے: سَلَّقَ امْرَأَتَهُ: اپنی عورت کو زبردستی لٹا کر اس کے ساتھ جماع کیا۔ مسئلہ نے ایک عورت سے کہا۔ ❷

(۲۳۵) اِنْ شِئْتَ سَلِّقْنَاكَ

وَ اِنْ شِئْتَ عَلٰی اَرْبَعٍ

چاہو تو چت لیٹ جاؤ اور چاہو تو پٹ لیٹو۔ اور سَلَّقُ کے معنی شلیقے کے ایک حلقے کو دوسرے میں داخل کرنے کے ہیں اور میدہ کی روٹی کو سَلِيْقَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَلَاتِقُ آتی ہے۔ اور سَلِيْقَةٌ معنی طبیعت بھی آتا ہے اور سَلَّقُ کے معنی ہموار اور عمدہ زمین کے ہیں۔

(س ل ك)

اَلسَّلُوْكُ: (ن) اس کے اصل معنی راستہ پر چلنے کے ہیں۔ سَلَّكَ الطَّرِيْقَ: اور یہ فعل متعدی بن کر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی راستہ پر چلانا چنانچہ پہلے معنی کے متعلق فرمایا:

﴿لَتَسْلُكُوْا مِنْهَا سَبِيْلًا فِجَا جَا﴾ (۴۱-۲۰) تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ راستوں میں چلو پھرو۔

﴿فَاَسْأَلُكُمْ سَبِيْلَ رَبِّكَ ذُلًّا﴾ (۱۶-۶۹) اور اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔

﴿يَسْأَلُكَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾ (۲۷-۷۳) اور اس کے آگے..... مقرر کر دیتا ہے۔

❶ وفي البيضاوي: الاستثناء من المعنى اللزوم للنهي ويحتمل الانقطاع (لاناوار التنزيل ج ۱ ص ۸۳ بحالين على الهوامش).

❷ في اربع ابيات مفيدة القافية خاطب بها سجاح التي تنبأت من بني تغلب في خلوة ثم واقعتها فصدقت بنبوته انظر القصة في الطبري (۲: ۴۹۹) والمحاضرات (۴: ۴۳۱) وفي روايته علقناك بدل سلقناك محرف ۱۲.

سلامتی کے متعلق فرمایا:

﴿مُسَلِّمَةً لَا شَيْئَةَ فِيهَا﴾ (۲-۷۱) اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو۔

پس سَلِيمٌ يَسْلَمُ سَلَامَةً وَسَلَامًا کے معنی سلامت رہنے اور سَلَمَهُ اللَّهُ (تفصیل) کے معنی سلامت رکھنے

کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ﴾ (۸-۴۳) لیکن خدا نے تمہیں اس سے بچالیا۔

﴿أَدْخَلُوهَا بِسَلَامٍ أَمِينٍ﴾ (۱۵-۴۶) ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہو جاؤ۔

اسی طرح فرمایا:

﴿أَهْبِطُ بِسَلَامٍ مِّنَّا.....﴾ (۱۱-۴۸) ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ..... اتر آؤ۔

اور حقیقی سلامتی تو جنت ہی میں حاصل ہوگی جہاں کہ بقا ہے۔ فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے، ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں چنانچہ اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ﴾ (۶-۱۲۸) ان کے لئے..... سلامتی کا گھر ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ﴾ (۱۰-۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

﴿يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ﴾ (۵-۱۶) جس سے خدا اپنی رضا مندی پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے۔

ان تمام آیات میں سلام بمعنی سلامتی کے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں السَّلَامُ اسمائے حسنیٰ سے ہے اور یہی معنی آیت "لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ" میں بیان کئے گئے

﴿وَسَلِّكَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا﴾ (۲۰-۵۳) اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے۔

اور دوسرے معنی یعنی متعدی کے متعلق فرمایا:

﴿مَا سَلَكَمْ فِي سَقَرٍ﴾ (۴۳-۴۴) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

﴿كَذَلِكَ نَسَلُّكَ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۱۵-۱۲) اس طرح ہم اس (تکذیب و ضلال) کو گنہگاروں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

﴿كَذَلِكَ سَلَكْنَاهُ﴾ (۲۶-۲۰) اسی طرح ہم نے انکار کو..... داخل کر دیا۔

﴿فَأَسَلْنَا فِيهَا﴾ (۲۳-۲۷)..... کشتی میں بٹھالو۔

﴿يَسَلُّكَ عَذَابًا صَعَدًا﴾ (۲۲-۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

بعض نے سَلَكَتُ فُلَانًا فِي طَرِيقِهِ کی بجائے سَلَكَتُ فُلَانًا طَرِيقًا کہا ہے اور عَذَابًا صَعَدًا کو يَسَلُّكَ کا دوسرا مفعول بنایا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عَذَابًا فعل محذوف کا مصدر ہے اور یہ اصل میں نَعَدْبُهُ ہے اور نیزے کی بالکل سامنے کی اور سیدھی ضرب کو طَعْنَةٌ سَلَكَةٌ کہا جاتا ہے۔ (سَلَكِي سِيدْهَا نِزَه) اور سَلَكَةٌ مادہ کَبَّ کو کہتے ہیں اس کا مذکر سَلَكَتُ ہے۔

(س ل م)

السَّلْمُ وَالسَّلَامَةُ کے معنی ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِقَلْبٍ سَلِيمٍ.....﴾ (۲۶-۸۹) پاک دل (لے کر آیا وہ بیخ جائے گا۔ یعنی وہ دل جو دغا اور کھوٹ سے پاک ہو تو یہ سلامت باطن کے متعلق ہے اور ظاہری عیوب سے

ہیں۔ اور آیت: ﴿السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ﴾ (۵۹-۲۳) نے بھی (جواب میں) سلام کہا۔

میں دوسرے سلام پر رفع اس لیے ہے کہ یہ باب دعا سے ہے اور صیغہ دعا میں رفع زیادہ بلند ہے گویا اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس ادب کو ملحوظ رکھا ہے جس کا کہ آیت: ﴿وَإِذَا حُيِّتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِأَحْسَنِّ مِمَّا هُمْ﴾ (۴: ۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دو۔

میں حکم دیا گیا ہے اور ایک قرأت میں یسلم ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ سَلَامٌ یسلم (صلح) کو چاہتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے خوف محسوس کر چکے تھے پھر جب انہیں سلام کہتے ہوئے سنا تو اس کو پیغام صلح پر محمول کیا اور جواب میں یسلم کہہ کر اس بات پر تنبیہ کی کہ جیسے تم نے پیغام صلح دیا ہے۔ ایسے ہی میری جانب سے بھی پیغام صلح قبول ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا یَسْمَعُونَ فِیْهَا لَغْوًا وَ لَا تَأْتِیْمًا ۝ إِلَّا قِبْلًا سَلَامًا سَلَامًا﴾ (۵۶-۲۵، ۲۶) وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ۔ ہاں ان کا کلام سلام (ہوگا)

کے معنی یہ ہیں کہ بات صرف بذریعہ قول ہی نہیں ہوگی۔ بلکہ قولاً اور فعلاً دونوں طرح ہوگی۔ اسی طرح آیت: ﴿فَسَلَامٌ لِّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْیَمِیْنِ﴾ (۵۶-۹۱) تو (کہا جائے گا کہ) تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔ میں بھی سلام دونوں معنی پر محمول ہو سکتا ہے اور آیت: ﴿وَقُلْ سَلَامٌ﴾ (۳۳-۳۹) اور سلام کہہ دو۔

سلاستی امن دینے والا تمہاں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وصف سلام کے ساتھ موصوف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ عیوب و آفات مخلوق کو لاحق ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ اور آیت:

﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِیْمٍ﴾ (۳۶-۵۸) پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)

﴿سَلَامٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ﴾ (۱۳-۲۳) اور کہیں گے تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے۔

﴿سَلَامٌ عَلَی الْیَاسِیْنِ﴾ (۳۷-۱۳۰) کہ الیاسین پر سلام اور اس مفہوم کی دیگر آیات میں سلام علی آیا ہے تو ان لوگوں کی جانب سے تو سلاستی بذریعہ قول مراد ہے یعنی سَلَامٌ عَلَی..... کے ساتھ دعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے سلاستی بالفعل مراد ہے۔ یعنی جنت عطا فرمانا۔ جہاں کہ حقیقی سلاستی حاصل ہوگی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اور آیت:

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ (۲۵-۶۳) اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔ میں قَالُوا سَلَامًا کے معنی ہیں ہم تم سے سلاستی چاہتے ہیں۔ تو اس صورت میں سَلَامًا منصوب بالفعل مضمر ہوگا۔ یعنی نَطْلُبُ مِنْكَ السَّلَامَ اور بعض نے قَالُوا سَلَامًا کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ اچھی بات کہتے ہیں تو اس صورت میں یہ مصدر محذوف (یعنی قولاً) کی صفت ہوگا۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِذْ دَخَلُوا عَلَیْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ﴾

کی طرف مائل ہوں۔

اس میں ایک قرأتِ سَلَم (بفتح سین) بھی ہے۔

﴿وَأَلْقُوا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ﴾ (۱۶-۸۷)

اور اس دن خدا کے سامنے سرگرم ہو جائیں گے۔

﴿يُذْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ﴾ (۶۸-۲۸)

(۲۳) (اس وقت) سجدے کے لئے بلائے جاتے تھے۔

جب کہ صحیح و سالم تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ﴾ (۳۹-۲۸) اور ایک

آدمی خاص ایک شخص کا (غلام) ہے۔

میں ایک قرأتِ سَلَمًا وِسَلَمًا بھی ہے اور یہ دونوں

مصدر ہیں اور حَسَنٌ وِنَحْدٌ کی طرح صفت کے صیغے

نہیں ہیں کہا جاتا ہے۔

سَلِمٌ سَلَمًا وِسَلَمًا جیسے رِبِحٌ وِرِبِحًا اور

بعض نے کہا ہے کہ سَلِمٌ اسم ہے اور اس کی ضد حَرْبٌ

ہے۔

الْإِسْلَامُ: اس کے اصل معنی سِلْمٌ (صلح) میں داخل

ہونے کے ہیں اور صلح کے معنی یہ ہیں کہ فریقین باہم ایک

دوسرے کی طرف سے تکلیف پہنچنے سے بے خوف ہو

جائیں اور یہ أَسْلَمْتُ الشَّيْءَ إِلَى فُلَانٍ (باب

افعال) کا مصدر ہے اور اسی سے صلحِ سَلَمٌ ہے۔

شرعاً اسلام کی دو قسمیں ہیں کوئی انسان محض زبان سے

اسلام کا اقرار کرے، دل سے معتقد ہو یا نہ ہو اس سے

انسان کا جان و مال اور عزت محفوظ ہو جاتی ہے مگر اس کا

درجہ ایمان سے کم ہے۔ اور آیت:

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ

میں بظاہر تو سلام کہنے کا حکم ہے لیکن فی الحقیقت ان کے شر

سے سلامتی کی دعا کرنے کا حکم ہے اور آیات سلام جیسے۔

﴿سَلَامٌ عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ﴾ (۳۷-۷۹)

(یعنی) تمام جہاں میں..... نوح علیہ السلام پر سلام۔

﴿سَلَامٌ عَلَى مُوسَى وَهَارُونَ﴾ (۳۷-۱۲) کہ

موسیٰ اور ہارون پر سلام۔

﴿سَلَامٌ عَلَى إِبْرَاهِيمَ﴾ (۳۷-۱۰۹) ابراہیم علیہ السلام

پر سلام۔

میں اس بات پر تشبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء اور

ابراہیم علیہ السلام کو اس قدر مرتبہ عطا کیا تھا کہ لوگ ہمیشہ ان

کی تعریف کرتے اور ان کے لئے سلامتی کے ساتھ دعا

کرتے رہیں گے اور فرمایا:

﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ﴾

(۲۳-۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر

والوں) کو سلام کیا کرو۔ یعنی تم ایک دوسرے کو سلام کہا

کرو۔

﴿السَّلَامُ وَالسَّلَامُ وَالسَّلَامُ﴾ کے معنی صلح کے

ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَى إِلَيْكُمْ

السَّلَامَ لَسْتُمْ مُؤْمِنًا﴾ (۴-۹۳) اور جو شخص تم سے

سلام علیک کہے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔

بعض نے کہا ہے: یہ آیت اس شخص کے حق میں نازل ہوئی

جسے باوجود اظہارِ اسلام اور طلبِ صلح کے قتل کر دیا گیا تھا

اور فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (۲-۲)

(۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

﴿وَأَنْ جَسَحُوا لِلسَّلَامِ﴾ (۸-۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح

﴿إِنْ تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ﴾
(۵۳-۳۰) تم تو انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں
پر ایمان لاتے ہیں سو وہی فرمانبردار ہیں۔

میں مُسْلِمُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے تابع اور
فرمانبردار ہیں۔ اور آیت:

﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا﴾ (۴۴-۵)
اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے..... حکم
دیتے رہے ہیں۔

میں وہ انبیاء مراد ہیں جو اگرچہ اولوالعزم پیغمبروں کے تابع
تھے لیکن حکم الہی سے ہدایت پاتے تھے اور مستقل شرائع
لے کر مبعوث ہوئے تھے۔

السُّلَّمُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ
بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے۔ تاکہ سلامتی حاصل ہو پھر
سَبَبُ کی طرح ہر اس چیز کو سُلَّمُ کہا گیا ہے جو کسی بلند
جگہ تک پہنچنے کا وسیلہ بنے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ﴾ (۵۲-۳۸) یا ان
کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر آسمان سے باتیں
سن آتے ہیں۔

﴿أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ﴾ (۶-۳۵) یا آسمان میں
سیڑھی (تلاش کرو)
اور شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۲۳۶) وَلَوْ نَالَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمٍ
گو سیڑھی لگا کر آسمان پر کیوں نہ چڑھ جاتے اور سُلَّمٍ
وَسَلَامٍ ایک قسم کے بڑے درخت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ

قُولُوا أَسْلَمْنَا ﴿ (۱۳-۳۹) دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم
ایمان لے آئے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں)
کہو اسلام لائے ہیں۔

میں أَسْلَمْنَا سے یہی معنی مراد ہیں۔ دوسرا درجہ اسلام کا وہ
ہے جو ایمان سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے
اعتراف کے ساتھ ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو اور عملاً اس کے
تقاضوں کو پورا کرے۔ مزید برآں یہ کہ ہر طرح سے قضا
و قدر الہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ جیسا کہ آیت:

﴿إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْتُ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ﴾ (۲-۱۳۱) جب ان سے ان کے رب
نے فرمایا: کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کی کہ میں
رب العالمین کے آگے سراسر اطاعت خم کرتا ہوں۔

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے اور فرمایا:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ (۳-۱۹) (کہ)
دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔ اور آیت: ﴿وَتَوَفَّيْنِي
مُسْلِمًا﴾ (۱۲-۱۰۱) تو مجھے اپنی اطاعت (کی حالت)
کیسے جینو۔ اٹھائیو۔ کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں
داخل کیسے جینو جو تیری رضا کے تابع ہیں اور بعض نے اس
کے یہ معنی بیان کئے ہیں۔ کہ کلیۃً شیطان کے پنجے سے
آزاد کر دے۔ جیسا کہ شیطان نے کہا تھا۔

﴿لَا غُيُوبَ لَهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ
الْمُخْلِصِينَ﴾ (۳۸-۸۳) میں ان سب کو بہکاتا
رہوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں۔ اور
آیت:

۱ لُزْهَرِیْ وَاوْرِدَ (رہن) اسباب المنیۃ یسلنہ وفی اللسان وام بدل نال وقد مر فی (برج) وفی السبع لابن الانباری ۲۸۳

ولورام ان یرقی السماء بسلم ۱۲.

کے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان کا سوراخ ہوتا ہے۔ اس کی جمع سُموُم آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ يَلْبِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (۷۰-۷۱)

(۳۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور سَمَّه (ن) کے معنی کسی چیز میں گھس جانا کے ہیں۔ اور اسی سے ”السَّمَامَةُ“ ہے یعنی وہ خاص لوگ جو ہر معاملہ میں گھس کر اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں دُخَلَ بھی کہا جاتا ہے۔

السَّمُّ: زہر قاتل کو کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے۔

السُّمُومُ: (لُو) گرم ہوا جو زہر کی طرح بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَوَقَّانَا عَذَابَ السَّمُومِ﴾ (۵۲-۵۳) اور ہمیں لو کے عذاب سے بچالیا۔

﴿فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ﴾ (۵۶-۵۷) (یعنی دوزخ کی) لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں۔

﴿وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾ (۱۵-۱۶) اور جنوں کو اس سے بھی پہلے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

(س م د)

السَّمِيدُ: غافل تکبر سے سر اٹھانے والا۔ یہ سَمَدَ البَعِيرُ فِي سَبْرِهِ کے محاورہ ہے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گردن اٹھا کر تیز چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنْتُمْ سَامِدُونَ﴾ (۵۳-۶۱) اور تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔

ہر قسم کی آفت سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔

السَّلَامُ: ایک قسم کا سخت پتھر (اس کا واحد سَلِمَةٌ ہے)

(س ل و)

السَّلْوَى: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے تسلی کا باعث ہو، اسی سے السَّلْوَانُ وَالتَّسْلِيَةُ ہے جس کے معنی اطمینان اور راحت ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَى﴾ (۲)

(۵۷) اور (تمہارے لئے) من و سلوئی اتارتے رہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بئیر کی قسم کے جانور مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ من ایک چیز ہے جو آسمان سے اترتی تھی اور سَلْوَى ایک پرند کا نام ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مَنْ اور سَلْوَى کے الفاظ بطور مثال کے ذکر کئے گئے ہیں اور مراد وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے گوشت اور سبزیوں کی صورت میں انہیں دیا تھا۔ اصل میں سَلْوَى کا لفظ تَسْلِيَةٍ سے ماخوذ ہے اور

سَلَيْتُ عَنْ كَذَا وَسَلَوْتُ عَنْهُ وَتَسَلَيْتُ کے معنی کسی چیز سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا

دینے کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ سَلْوَانُ اسے کہتے ہیں جو انسان کو تسلی دے اور ایک قسم کے مہرے کو بھی سَلْوَانُ کہا جاتا ہے جسے عرب لوگ محبت اور عشق سے تسلی حاصل کرنے کے لئے گھس کر پیتے تھے۔

سَلْوَى سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا دینے کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ سَلْوَانُ اسے کہتے ہیں جو انسان کو تسلی دے اور ایک قسم کے مہرے کو بھی سَلْوَانُ کہا جاتا ہے جسے عرب لوگ محبت اور عشق سے تسلی حاصل کرنے کے لئے گھس کر پیتے تھے۔

سَلْوَى سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا دینے کے ہیں۔

(س م م)

السَّمُّ: (فجر، حسین و ضمہ آں) کے معنی تنگ سوراخ

اور سَمِيرِي ایک قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

(س م ع)

السَّمْعُ: قوتِ سامعہ، کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنی سننا (مصدر) بھی آتے ہیں۔ اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ﴾ (۲-۷) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

اور کبھی لفظ سماع کی طرح اس سے مصدری معنی مراد لیا جاتا ہے (یعنی سننا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعَزُونَ﴾ (۲۶-۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے) سننے (کے مقامات) سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔

﴿أَوَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ (۵۰-۳۷) یاد دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

اور کبھی سَمْعُ کے معنی فہم و تدبر اور کبھی طاعت بھی آجاتے ہیں مثلاً تم کہو: أَسْمَعُ مَا أَقُولُ لَكَ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ لَكَ تم نے میری بات سمجھی نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا تَلَّسَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا.....﴾ (۸-۳۱) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی

اور سَمَدَ رَأْسَهُ وَسَبَدَ کے معنی سر کے بالوں کو جڑ سے موٹا ڈالنے کے ہیں۔

(س م ر)

السُّمْرَةُ: گندمی رنگ کو کہتے ہیں اور کنایہ کے طور پر سَمْرَاءُ گندم کو کہا جاتا ہے اور السَّمَارُ: پتلا دودھ جس میں بکثرت پانی کی آمیزش ہو۔

السُّمْرَةُ: ببول کا درخت۔ غالباً اس کی رنگت کے اعتبار سے یہ نام رکھا گیا ہے۔

السَّمْرُ: اصل میں رات کی تاریکی کو کہتے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔ ﴿لَا آتِيكَ السَّمْرَ وَالْقَمَرَ﴾ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا پھر رات کو باتیں کرنا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اور سَمْرٌ فُلَانٌ کے معنی ہیں: اس نے رات کو باتیں کیں۔ اسی سے مشہور محاورہ ہے۔ ﴿

لَا آتِيكَ مَا سَمَرَ ابْنَا سَمِيرٍ﴾ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا اور آیت کریمہ:

﴿مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ﴾ (۲۲-۶۷) ان سے سرکشی کرتے کہا نیوں میں مشغول ہوتے۔ اور بے ہودہ بکواس کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سَامِرٌ کے معنی تاریک رات کے ہیں۔ سَامِرٌ کی جمع سُمَارٌ، سَمْرَةٌ اور سَامِرُونَ آتی ہے۔ اور سَمَرْتُ الشَّيْءَ (ن) کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر مضبوط اور استوار کرنے کے ہیں۔ اور مہمل چھوڑے ہوئے اونٹوں کو اِسْلٌ مُسْمَرَةٌ کہا جاتا ہے

① انظر للمثل المستقصى والثمار ۲۲۴ و لمسکری ۱۹۶، ۲۰، ۲۲۶: ۲۲۶ واللسان والتاج (سم).

② اناسیسر اللیل والنهار فالمراد الدهر فعنی المثل لا تیک ابدأ راجع السط ۵۳۰.

کہہ دیں۔

اور آیت: ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (۲-۹۳) (وہ کہنے لگے) ہم نے سن تو لیا۔ مگر ماننے نہیں۔ کے معنی ہیں ہم نے تمہاری بات سمجھ لی ہے مگر ماننے کے نہیں۔ اسی طرح

آیت:

﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ (۲-۲۸۵) کے معنی ہیں ”ہم نے

تیرا حکم سمجھ لیا اور قبول کیا“

اور آیت: ﴿لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ﴾ (۸-۲۱) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم خدا) سن لیا مگر (حقیقت میں) نہیں سنتے۔

میں سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہم نے سمجھ لیا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں۔ اور یہ

بھی کہ ہم نے سمجھ لیا مگر وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ جب انہوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو گویا اس شخص کی طرح ہیں جو سرے سے سنتا ہی نہیں۔ پھر اس

کے بعد فرمایا: ﴿وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا

لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا.....﴾ (۸-۲۳)

اگر خدا ان میں نیکی (کامادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق

بخشتا اور اگر (بغیر صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو

وہ..... بھاگ جاتے۔

تو یہاں بھی وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ کے معنی ہیں اگر وہ انہیں

تو توفیق نہم بخشتا جس سے وہ سمجھتے، اور آیت: ﴿وَأَسْمَعُ

غَيْرَ مُسْمِعٍ﴾ (۳-۳۶) میں (سننے نہ سنوائے جاؤ) کا

مجاورہ دو طرح بولا جاتا ہے۔ ایک بددعا کے طور پر کہ وہ

بہرا ہو جائے۔ دوم دعا کے طور پر پہلے معنی کے لحاظ سے کہا

جاتا ہے: أَسْمَعَكَ اللَّهُ: اللہ تجھے بہرہ کر دے اور دوسرا

معنی کے لحاظ سے أَسْمَعْتُ فُلَانًا بولتے ہیں یعنی میں

نے فلاں کو خوب سنائیں۔ یعنی گالیاں دیں تو یہ گالی دینے

کے معنی میں متعارف ہے۔

مروی ہے کہ اہل کتاب نبی ﷺ کو یہ کلمہ کہا کرتے اور

اس سے آنحضرت کو اس فریب میں ڈالنے کی کوشش

کرتے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے حق میں

دعا کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ آپ کے حق میں بددعا

کرتے تھے۔

ہر وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے سماعت کو

ثابت کیا ہے یا کفار سے اس کی نفی کی ہے یا اس کی کوشش

پر رغبت دلائی ہے تو اس سے مقصود اس کلام کے معنی کی

طرف توجہ دینا اور اس میں غور و فکر کرنا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿أَمْ لَهُمْ أَذَانٌ يَسْمَعُونَ بَهَا﴾ (۷-۱۹۵) یا ان

کے لئے کان ہیں جن سے سنیں؟

اور (کفار سے نفی کرتے ہوئے) فرمایا:

﴿صُمُّ بُكْمٌ﴾ (۲-۱۸) (یہ) بہرے ہیں گونگے

ہیں۔

﴿وَفِي أَذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (۳۱-۴۳) اور ان کے کانوں

میں گرانی (یعنی بہرا پن) ہے۔

اور جب سح کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس

سے مراد تو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مسوعات کا علم

ہے یا یہ کہ اس نے جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ

قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَآ﴾

(۵۸-۱) (اے پیغمبر!) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے

اور فرمایا:

﴿خُذُوا مَا آتَيْنَكُمْ بِقُوَّةٍ وَأَسْمِعُوا﴾ (۹۳-۲۰)
کہ جو کتاب تم کو دی گئی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو
(اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے) اس کو سنو۔

﴿سَمَاعُونَ لِلْكَذِبِ﴾ (۵-۴۲) (یہ) جھوٹی باتیں
بنانے کے لئے جاسوسی کرنے والے۔

یعنی دوسروں کے سامنے جھوٹی باتیں بنانے کے لئے
تمہاری باتیں سنتے ہیں اور جو ابھی تمہارے پاس نہیں
آئے۔

یعنی وہ تمہاری باتوں کو ان تک پہنچانے کے لئے سنتے ہیں
أَلَا سَمِعَ: اس کے معنی غور سے سننے کے ہیں جیسے فرمایا:
﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ
إِلَيْكَ.....﴾ (۱۷-۲۷) یہ لوگ جب تمہاری طرف کان
لگاتے ہیں تو جس نسبت سے یہ سنتے ہیں ہم سے خوب
جاننے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ﴾ (۶-۲۵) اور ان میں
سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری (باتوں کی) طرف کان
رکھتے ہیں۔

﴿وَأَسْتَمِعُ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ﴾ (۵۰-۴۱) اور سنو
جس دن پکارنے والا..... پکارے گا۔

اور آیت: ﴿أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ﴾
(۱۰-۳۱) یا (تمہارے) کانوں اور آنکھوں کا مالک کون
ہے۔

یعنی ان کا پیدا کرنے والا اور ان کی حفاظت کا متولی کون
ہے۔

اور مَسْمَعٌ يَأْمُرُ السَّمْعَ بِالْمَسْمَعِ: اس کے معنی کان کے سوراخ کے ہیں

بارے میں بحث و جدال کرتی ہے..... خدا نے اس کی
التجاسس کی۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا﴾ (۳-۱۰۱)
خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ..... اور
آیت کریمہ:

﴿إِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمَعُ الصُّمَّ
الدُّعَاءَ﴾ (۲۷-۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات)
نہیں سنا سکتے اور بہروں کو..... آواز نہ سنا سکتے ہو۔

میں لا تَسْمَعُ کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں کچھ بھی سمجھا
نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ اپنی بد عملی کی وجہ سے قوت حافظہ کو جو
کہ انسانیت کے لئے مخصوص سرمایہ حیات ہے کھو بیٹھنے
میں مردوں کی طرح ہیں۔ اور آیت:

﴿أَبْصَرَ بِهِ وَأَسْمِعُ﴾ (۱۸-۲۶) وہ کیا خوب دیکھنے
والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔ میں اس شخص کے متعلق
فرمایا کہ یہ شخص حکمت الہی کے عجائبات سے کس قدر آگاہ
ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق مَا أَبْصَرَهُ وَمَا
أَسْمَعَهُ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے
کہ ذات باری تعالیٰ کو صرف انہی صفات کے ساتھ
موصوف کیا جا سکتا ہے جو بطریق مع ثابت ہوں۔ اور کفار
کے متعلق جو یہ فرمایا ہے۔

﴿أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصُرْ يَوْمَ يَأْتُونا﴾ (۱۹-۳۸) وہ
جس دن ہمارے سامنے آئیں گے، کیسے سننے والے اور
کیسے دیکھنے والے ہوں گے۔

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو باتیں ان کے اپنے نفوس پر ظلم
کرنے اور نظر و فکر ترک کر دینے کی وجہ سے آج ان پر مخفی
ہیں وہ اس روز ان کو سن اور دیکھ رہے ہوں گے۔

سِمَانٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ﴾ (۱۲-۳۶) ہمیں

(اس خواب کی تعبیر) بتائیے کہ سات موٹی گایوں..... اور

أَسْمَتُهُ وَسَمَّتُهُ کے معنی موٹا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾ (۸۸-۷) جو

نہ فریبی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔

أَسْمَتُهُ: فریبہ جانور خریدنے یا دینے کے ہیں۔ اور

إِسْمَتُهُ کے معنی فریبہ پانے کے۔

أَلْسَمَةُ: ایک دوا جو فریبہ ہونے کے لئے کھائی جاتی ہے۔

أَلْسَمُنُ: گھی کیونکہ گھی بھی فریبی کی قسم سے ہے اور اس

کے کھانے سے انسان موٹا ہوتا ہے أَلْسَمَانِي: ایک پرند

کا نام ہے۔

(س م و)

سَمَاءٌ: ہر شے کے بالائی حصہ کو سَمَاءٌ کہا جاتا

ہے شاعر نے ایک گھوڑے کے وصف میں کہا ہے۔

(۲۳۸) وَأَحْمَرُ كَالذَّبِيحِ أَمَّا سَمَائُهُ

فَرِيًّا وَأَمَّا أَرْضُهُ فَمَحْوُولٌ

وہ دیباچ کی طرح سرخ ہے اس کا بالائی حصہ موٹا اور گداز

ہے اور زیریں حصہ لاغر اور سخت ہے۔ بعض نے کہا ہے

(کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر "سما" اپنے ماتحت

اور اسی کے ساتھ تشبیہ دے کر ڈول کے دستہ کو جس میں رسی

باندھی جاتی ہے مَسْمَعُ الْغُرْبِ کہا جاتا ہے۔

(س م ک)

السَّمَكُ: چھت کو کہتے ہیں اور سَمَكُهُ (دن)

کے معنی بلند کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّاهَا﴾ (۲۸-۷۹) اس کی چھت

کو اونچا کیا پھر اسے برابر کیا۔

شاعر نے کہا ہے۔

(۲۳۷) إِنَّ الَّذِي سَمَكَ السَّمَاءَ بَنَى لَنَا

وہ ذات جس نے آسمان کو بلند بنایا۔

اور ایک دعاء ماثورہ میں ہے (۱۷۹) يَا بَارِيءَ

السَّمَوَاتِ الْمَسْمُوكَاتِ اے بلند آسمان کے پیدا

کرنے والے۔

اور سَنَامٌ سَمَاكٌ: بلند کو بان کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو

جس سے کوئی چیز بلند کی جائے۔

اِسے سِمَاكٌ (بکسرہ سین) کہا جاتا ہے اور سِمَاكٌ

ایک ستارے کا نام بھی ہے اور السَّمَكُ کے معنی مچھلی

کے ہیں۔

(س م ن)

السَّمِينُ کے معنی موٹاپے کے ہیں اور یہ هَزَالٌ کی

ضد ہے اور سَمِينٌ (صیغہ صفت کے معنی ہیں فریبہ) ج

① البيت للفرزدق من نقبته المشهور مطلعها هذا البيت وتماه: بيتا دعائمه اعزوا طولا - والقصيدة في ديوانه (۷۱۴: ۷۱۵-۷۲۵)

والنقائض (۱۸۲: ۱-۲۱۱) والبيت في العمدة (۱: ۲۵۲) وفي قصة الفرزدق مع الطرماح ومحازالقران (۲: ۱۲۱) وشرح الدرر

للخفاجي ۷۳ والمرزبانى في المعجم ۴۶۷ والمواشع ۱۲۳ وابن عقيل رقم ۲۷۸ ومصارع العشاق ۷۷ والصاحبي ۲۵۷ والطبرى

(۲۱: ۳۷) والقرطبي (۱۴: ۲۱) والخزانة (۳: ۱۴۷-۴۸۰) والاشباه النحوية (۳: ۱۹۳) والکامل (۶۹۷) ولعینی (۴: ۴۷) .

② وفي النوادر ۱۷۳ اللهم واحي المدحوات وباري المسموكات الخ وهذه الصلوة في ۱۰ اسطار وهذه من جملة من الصلوة على

النبي التي كان على يعلم اصحابه ۱۲ .

③ قاله طفيل الغنوي وقد مرني (ارض) ۱۲ .

پوچھو کہ آسمانوں..... کا پروردگار کون ہے؟
اور آیت: ﴿السَّمَاءُ مُنْقَطِرَةٌ﴾ (۷۳-۱۸) جس
سے آسمان پھٹ جائے گا۔

میں سماء کو مذکور استعمال کیا ہے لیکن کئی ایک آیات جیسے:
﴿إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ﴾ (۸۴-۱) جب آسمان پھٹ
جائے گا۔

اور آیت: ﴿إِذَا السَّمَاءُ انفطرت﴾ (۸۲-۱) جب
آسمان پھٹ جائے گا۔

میں مؤنث استعمال ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سماء کا لفظ
اشجار میں نخل یا اس قسم کے دوسرے اسماء جنس کی طرح
ہے جو مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں اور
سَّمَاء کے معنی بارش ہوں تو یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوگا اور
اس کی جمع اَسْمِیَّة آئے گی۔ اور کسی بلند چیز کے کالمبد کو
سَمَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۳۹) سَمَاوَةٌ الْهَلَالِ حَتَّىٰ أَحْضَوْفًا

(راتیں تدریجاً) افق پر ابھرے ہوئے چاند کو (لیپٹی
رہیں) حتیٰ کہ وہ ٹیڑھا ہو گیا۔

اور سَمَالِی السَّیء کے معنی ہیں: دور سے کسی چیز کا بلند
شکل میں ظاہر ہونا۔

اور سَمَا الْفَحْلُ عَلَى السَّوْلِ سَمَاوَةٌ: ساٹھ
اونٹ اونٹنی پر چڑ گیا۔

الْإِنْسَمُ: کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔
یہ اصل میں سَمُو ہے کیونکہ اس کی جمع اَسْمَاء اور تغییر
سُمِی آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس

کے لحاظ سے سَمَاء ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے
أَرْضُ کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ
ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔ اور
آیت:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ
مِثْلَهُنَّ﴾ (۶۵-۱۲) خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان
پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں
کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

نیز مَطَر (بارش) کو بھی سَمَاء کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اوپر
سے آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سماء اس بارش کو کہا جاتا
ہے جو ہنوز زمین پر نہ گری ہو تو اس میں بھی بلندی کے معنی
مطوظ ہیں۔

اور نباتات کو بھی سَمَاء کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ وہ
بارش سے اگتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ زمین سے بلند
ہوتے ہیں پھر لفظ سماء جو ارض کے بالمقابل ہے مؤنث
ہے لیکن کبھی مذکر بھی آ جاتا ہے اور واحد جمع دونوں کے
لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ﴾ (۲-۲۹)

پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا
دیا۔

اور کبھی اس کی جمع سَمَوَات بھی بنا لیتے ہیں چنانچہ فرمایا:
﴿خَلَقَ السَّمَوَاتِ﴾ (۳۱-۱۰) اسی نے آسمانوں
کو..... پیدا کیا۔

﴿قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ﴾ (۱۳-۱۶) ان سے

① قاله العجاج واوله ناج طواه الاين همأ وحفا طى الليالى زلفا وزلفا والشطرفى اللسان (زلف) والحكم حفت وقد مرفى (زلف) ۱۲.

سے ثابت ہوا کہ اسماء کی معرفت مسیات کی معرفت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی محض اسم سے سمنی کی صورت ذہن میں حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا آیت:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ﴾ میں اسماء سے کلام کو انواع تلاش اور صور مسیات بمع ان کی ذوات کے مراد ہیں اور آیت:

﴿مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءَ سَمَّيْتُمُوهَا﴾ (۱۲-۲۰) جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو ان کے مسیات نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف سے عاری تھے۔ جن کا وہ ان اسماء کے اعتبار سے ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔ اور آیت:

﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلُوبًا سَمَّوْهُمْ﴾ (۱۳-۳۳) اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں۔ ان سے کہو کہ (ذرا) ان کے نام تولو۔

میں سَمَّوْهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزی وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن کو تم آلہ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق کر کے یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ تم انہیں موسوم کرتے ہو (یعنی نہیں) اسی لئے اس کے بعد فرمایا: ﴿أَمْ تَسْتَشْنُونَهِ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ.....﴾ (۱۳-۳۳) (کہ) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جس کو وہ زمین میں (کہیں بھی) معلوم نہیں کرتا یا (محض) ظاہری (باطل اور جھوٹی) بات کی (تقلید کرتے ہو) اور آیت:

﴿تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ﴾ (۵۵-۷۸) تمہارے پروردگار.....

سے سمنی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِيهَا﴾ (۱۱-۳۱) اور (نوح علیہ السلام نے) کہا کہ خدا کا نام لے کر (کہ اسی کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔

﴿أَنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ (۲۷-۳۰) وہ سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور (مضمون یہ ہے) کہ شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اور آیت: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ﴾ (۲-۳۱) اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔

میں اسماء سے یہاں الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔ خواہ مفرد ہوں یا مرکب، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک اصطلاحی معنی میں اور اس صورت میں ہمیشہ خبر عنہ بنتا ہے۔ جیسے رَجُلٌ وَفَوْسٌ دوم وضع اول کے لحاظ سے اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع تلاش یعنی خبر عنہ (اسم) خبر اور رابطہ (حرف) تینوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں کیونکہ آدم علیہ السلام نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی طرح افعال و حروف کا علم بھی انہیں حاصل ہو گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا۔ مثلاً اگر ہم ہندی یا رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کر لیں تو ان چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسیات کو نہیں پہچان سکیں گے۔ بلکہ ہمارا علم انہی چند اصوات تک محدود رہے گا اس

کا نام بڑا بابرکت ہے۔

میں اسم رب کے بابرکت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صفات، الکریم، العظیم، الباری، الرحمن، الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ (۸۷-۱) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو۔
﴿وَرَلِّهُ الْأَسْمَاءَ الْحُسْنَى﴾ (۷-۱۸۰) اور خدا کے نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔

(س ن ن)
السِّنُّ: دانت۔ اس کی جمع اَسْنَانٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:
﴿السِّنُّ بِالسِّنِّ﴾ (۵-۳۵) دانت کے بدلے دانت۔

﴿سَانَ الْبَعِيرِ النَّاقَةَ﴾ تراویح نے دانت سے کاٹ کر اونٹنی کو نیچے بٹھالیا۔

السُّنُونُ: دانتوں کا منجن ایک دو جس سے دانتوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

سَنُّ الْحَدِيدِ کے معنی لوہے کو تیز کرنے (اور پگھلانے کے ہیں) اور جس چیز سے لوہے کو تیز کرتے ہیں اسے مِسْنُ (سان) کہا جاتا ہے اور السِّنَانُ: (بھالا) خاص کر اس لوہے کو کہتے ہیں جو نیزے کے سرے میں لگایا جاتا ہے۔ پھر سَنُّ الْحَدِيدِ: (تیز کرنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر سَنَنْتُ الْبَعِيرَ کہا جاتا ہے جس کے معنی اونٹ کو سخت ہنکا کر دبل کر دینے کے ہیں اور پگھلانے کے معنی کے لحاظ سے سَنَنْتُ الْمَاءَ بولتے ہیں جس کے معنی پانی بہانے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔

تَنْحَ عَنْ سَنَنِ الطَّرِيقِ: (ہسین مثلہ) راستہ کے کھلے حصے سے ہٹ جاؤ۔ پس سُنْنٌ كَالْفَرْسِ کی جمع ہے اور سُنَّةُ الْوَجْهِ کے معنی دائرہ رو کے ہیں اور سُنَّةُ النَّبِيِّ سے مراد آنحضرتؐ کا وہ طریقہ ہے جسے آپ ﷺ اختیار فرماتے تھے۔ اور سُنَّةُ اللَّهِ سے مراد حق تعالیٰ کی حکمت

اور آیت:
﴿اسْمُهُ يَحْيَى لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ (۱۹-۷) جس کا نام یحییٰ ہے۔ اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔

میں سَمِيًّا کے معنی ”ہم نام“ کے ہیں اور آیات:
﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ (۱۹-۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔

میں سَمِيًّا کے معنی نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور ھَيْتًا اللَّهُ کی صفات کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کیا تم کسی کو ایسا بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالیٰ پر اطلاق کے وقت ہوتے ہیں۔ اور آیت:

﴿يُسْمَوْنَ الْمَلَائِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنثَى﴾ (۵۳-۲۷) اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم

بعض نے کہا ہے کہ تَسْنِيمِ جنت میں ایک اعلیٰ قسم کے چشمے کا نام ہے جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ﴾ (۸۳-۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

(س ن و)

السَّنَا: (اسم مقصور) چمک دار روشنی کو کہتے ہیں۔ اور السَّنَاءُ (ممدود) کے معنی رفعت کے ہیں۔ اور معنی رفعت کے اعتبار سے آب کشی کے جانور کو "سَانِيَةٌ" کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:

﴿يَكَادُ سَنَابِرُوهُ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ﴾ (۲۴-۲۳) اور بادل میں جو چمک آنکھوں کو (خیرہ کر کے بینائی کو) اچکے لئے جاتی ہے۔

اور سَنَنْبِ السَّنَاقَةِ تَسْنُوْكَ کے معنی ہیں اونٹنی نے کنویں سے پانی نکالا اور زمین کو سیراب کیا اور ایسی اونٹنی کو سَانِيَةٌ کہا جاتا ہے (والجمع السواني)

السَّنَةُ: (سال) اس کی اصل دو طرح بیان کی جاتی ہے ایک یہ کہ اصل میں سَنَهَةٌ ہے کیونکہ محاورہ ہے سَانَهَتْ فُكَلَاتًا کہ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کیا۔ نیز اس کی تفسیر سُنَيْهَةٌ آتی ہے اور ایک قول کے مطابق اسی سے ﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ (۲-۲۵۹) ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ سالہا سال گزر جانے سے بھی متغیر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی تازگی ختم ہوئی ہے۔

اور اطاعت کا طریقہ مراد ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ (۲۸-۲۳) (یہی) خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت کبھی بدلتی نہ دیکھو گے۔

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا﴾ (۵-۲۳) اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔

تو آیت میں اس بات پر تشبیہ پائی جاتی ہے کہ شراعیع کے فروعی احکام کی گونگ مختلف صورتیں چلی آئی ہیں لیکن ان سب سے مقصد ایک ہی ہے یعنی نفس کو پاک کرنا اور اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب اور اس کا جواز حاصل کرنے کے لئے تیار کرنا اور یہ مقصد ایسا ہے کہ اس میں اختلاف یا تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور آیت:

﴿مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ (۱۵-۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مسنون کے معنی متغیر کے ہیں۔ اور آیت:

﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ.....﴾ (۲-۲۵۹) (سڑی) بسی نہیں۔ میں لَمْ يَتَسَنَّهْ کے معنی بھی لَمْ يَتَغَيَّرْ ہیں اس میں ہائے استراحت یعنی سکتے کے ہے۔^۱

(س ن م)

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ﴾ (۸۳-۲۷) اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی۔

۱ بیناہ علی قرأۃ حمزۃ والکسانی واصلہ عندهم لم یسنی (من الواو) ویحتمل ان یکون اصلہ لم یسنن ماخوذاً من سنن فابدلّت نونہ الاخیرۃ حرف علة وسقطت بالحزم (راجع انوار التنزیل ۱۲)۔

ہونے کی وجہ سے اسے ستون لگا کر کھڑا کیا گیا ہے۔
واضح رہے کہ اس شعر میں ہاء اصلی ہے۔ ایک اور شاعر نے
کہا ہے۔^۱

(۲۴۲) يَا أَكْلُ أَرْمَانَ الْهَزَالِ وَالسَّيْنِي

جو ہزال اور قحط سالی کے زمانہ میں چرتا رہا ہو۔

یہاں السَّيْنِي سَنَّة سے مرخم نہیں ہے۔ بلکہ یہ فَعُولُ
کے وزن پر جمع ہے جیسے مَائَةٌ کی جمع مِثْنِينَ
وَمِثْوَنَ آتی ہے اور عَصِيٌّ کی طرح فاء کلمہ مکسور ہے مگر
برعایت قافیہ تخفیف کر کے ایک یا کو ساقط کر دیا گیا ہے۔

اور آیت:

﴿لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ (۲-۲۵۵) اسے نہ اونگھ

آتی ہے اور نہ نیند۔

میں سِنَّةٌ وَسَنٌّ سے ہے اور اس باب سے خارج ہے۔

(س س)

السَّاهِرَةُ کے معنی میدان یاروئے زمین کے

ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ (۷۹-۱۱۳) اس وقت وہ

(سب) میدان (حشر) میں آج جمع ہوں گے۔

بعض کے نزدیک اس کی اصل سَنَوَةٌ ہے۔ کیونکہ اس کی
جمع سَنَوَاتُ آتی ہے اور اسی سے سَانِيْتُ فعل ہے اس
صورت میں سَنَّةٌ میں ہاء برائے وقف ہوگی۔ جیسا کہ
کِتَابِيَّةٌ وَحِسَابِيَّةٌ میں ہے۔^۱ قرآن میں ہے:

﴿أَرْبَعِينَ سَنَةً﴾ (۵-۲۶) چالیس برس کے لئے۔

﴿سَبْعَ سِنِينَ ذَا بَابٍ﴾ (۱۲-۳۷) سات سال متواتر

﴿ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ﴾ (۱۸-۳۵) تین سو برس۔ اور آیت:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ﴾ (۷-۱۳۰)

اور ہم نے فرعونوں کو کوئی سال تک قحط میں مبتلا رکھا۔

میں سین سے مراد قحط سالی ہے اور زیادہ تر سَنَّةٌ کا لفظ قحط

سالی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

أَسَنَتِ الْقَوْمُ: لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔

شاعر نے کہا ہے۔^۲

(۲۴۰) لَهَا أَرْجٌ مَا حَوْلَهَا غَيْرٌ مُسْنِتٌ

جس کی خوشبو مہک رہی ہو اور اس کے ارد گرد تازگی پھیلی

ہوئی ہو۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔^۳

(۲۴۱) فَلَيْسَتْ بِسِنِّهَاءٍ وَلَا رُجِّيَّةٍ

اسے نہ تو خشک سالی نے نقصان پہنچایا ہے اور نہ ہی کمزور

۱ اصحاب المعاجم ذکرہ فی (س، ک، ہ) و (س، و، ی) ۱۲.

۲ قاله الشنفرى الأزدي وصدرة: بریحانة من حلية نورت والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۰ فی ۳۶ بیتا انظر الاغانی

(۲۱: ۹۰) والبيت فی اللسان (حلا) والمحكم (روح).

۳ قاله سويد بن الصامت الانصارى وقد نسب الى احيحة بن الحلاح قال فی السمط (۱: ۳۶۱) والاول اثبت وتامه ولكن
عربائى السنين الحوائج فی ابیات له یصف نخلا بالعودة یقول: نخلی لیست بسنهاء ولا ممنوعة الثمر ولكن اعربها الناس و"رجیة"
یروى بفتحه الحیم بالتحفیف والتشدید وكلاهما نَسَبٌ نَادِرٌ والتشدید اذهب فی الشدود وفى مجالس ثلث السنه النخلة التى تحمل
سنة وسنة لا والرجیة التى یخاف سقوطها فیعمل لها رجیة وفى السمط الرجیة الخطیرة تبنى حول النخلة یمنع بها من ثمرها ای لیست
ممنوعة الثمر واللفظان اختلف فی تفسیرهما راجع اللسان (رجب، سنة، عری) ومجالس ثلث (۲: ۲۸۵) والقرطبی (۳: ۲۹۳)
والقالی (۱: ۱۲۰) وازداد ابی الطیب ۶۹۴ ومعانی القرآن المنسوب الى الفراء (۱: ۱۷۳) وغریب القرآن للقتبی ۹۴.

۴ والبيت فی اللسان (حتم) بغیر عز وقال ابن بری الشطر لامرئة من بنی عقیل تفخر باخوالها من الیمن ودكر ابو زيد انه للعامرية
وصلته: حیده خالی ولقیط وعلی وحاتم الطائی وهاب المثنی ولم یکن كخالک العبد الدعی هیاب عمیر غیر ذکی .

اس وقت قرعہ ڈالا تو انہوں نے زک اٹھائی۔ اور اسْتَهْمُوا (افتعال) کے معنی قرعہ اندازی کرنے کے ہیں اور بُرْدٌ مَسْهَمٌ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر تیر کی تصویر ہو۔

سَهْمٌ (ف) سَهْمًا۔ اَلْوَجْهُ لِاَغْرِبِنِ كِي وَجْهٍ سِ چہرے کا متغیر ہونا۔ اور اَلْسَهَامُ (بالضم وفتح) اس مرض کو کہتے ہیں جس سے چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔

(س ۵ و)

اَلْسَهْوُ: (ن) وہ غلطی جو غفلت کی وجہ سے سرزد ہو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اسباب اور مولدات انسان کے اپنے اختیار سے پیدا کردہ نہ ہوں جیسے مجنون آدمی کا کسی انسان کو گالی دینا۔ دوم یہ کہ اس کے مولدات انسان کے خود پیدا کردہ ہوں جیسے کوئی شخص شراب نوشی کرے اور پھر اس سے (نشہ میں) بغیر ارادہ کے کوئی برائی صادر ہو پہلی قسم کی خطا تو عفو کے حکم میں ہے لیکن دوسری قسم کی خطا پر مواخذہ ہوگا۔ اور اس دوسری قسم کے سہو کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ﴾ (۵۱-۱۱) بے خبری میں

بھولے ہوئے ہیں۔

﴿عَنْ صَلَوْتِهِمْ سَاهُونَ﴾ (۵-۱۰۷) نماز کی

طرف سے غافل رہتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ سَاهِرَةٌ سے مراد روئے زمین (یعنی یہی زمین) ہے اور بعض کے نزدیک اَرْضِ آخِرْتِ مراد ہے اور اصل میں سَاهِرَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کثرت سے آمدورفت ہو۔ گویا وہ آمدورفت سے بیدار ہو چکی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔^۱

(۲۴۳) تَحْرَكُ يَقْظَانُ التُّرَابِ وَنَائِمَةٌ

تو بیدار اور سوئی زمین بل جاتی ہے۔

اور ناک کی دونوں رگوں کو اَسْهَرَانِ کہا جاتا ہے۔

(س ۵ ل)

اَلْسَهْلُ کے معنی نرم زمین کے ہیں اس کی جمع سُهُولٌ آتی ہے۔ اور یہ حَزْنٌ کی ضد ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا﴾ (۷۴-۷)

(کہ) نرم زمین سے (مٹی لے کر) محل تعمیر کرتے ہو۔

اور اَسْهَلٌ کے معنی نرم زمین میں جانے کے ہیں اور رَجُلٌ سَهْلِيٌّ کے معنی میدانی علاقہ میں رہنے والا آدمی کے ہیں نَهْرٌ سَهْلٌ: جوئے ریگ ناک اور نرم خوا آدمی کو رَجُلٌ سَهْلٌ اَلْخُلُقِ کہا جاتا ہے۔ (اس کی ضد) حَزْنٌ اَلْخُلُقِ ہے اور سُهَيْلٌ ایک ستارے کا نام ہے۔

(س ۵ م)

اَلْسَهْمُ: وہ تیر جو چلایا جاتا ہے نیز قرعہ اندازی کے تیر وغیرہ کو سَهْمٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ﴾ (۳۷-۱۳۱)

^۱ قاله ابان بن عبدہ فی قصیدة وصدرة : ودانحن سرنابین شرق وغرب راجع الحماسة بشرح التبریزی (۲: ۹۴) والمرزوقی ۲۰۸

والحمان لابن نایاص (۳۶۹).

(س ی ب)

پانی کی طرح زمین میں چکر کاٹنا کے ہیں اور قرآن پاک

میں ہے:

﴿فَسَيَبْحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ﴾ (۹-۱۲)

تو (مشرکوں) زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔

اور اسی سے ہمیشہ سفر کرنے والے آدمی کو سَائِحٌ يَا سَيَّاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت: ﴿السَّائِحُونَ﴾ (۹-۱۱۲) روزہ رکھنے والے۔

میں سَائِحُونَ بمعنی صَائِمُونَ کے ہے۔ اسی طرح

﴿السَّائِحَاتُ﴾ (۲۶-۵) سے روزہ رکھنے والی

عورتیں مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو قسم پر ہے ایک حقیقی روزہ جو

کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنے سے عبارت ہوتا ہے

اور دوسرا روزہ حکمی ہے۔ جو کہ جو ارجح یعنی آنکھ، کان اور

زبان وغیرہ کو معاصی سے روکنے کا نام ہے۔ تو سَائِحُونَ

سے دوسری قسم کے روزہ دار مراد ہیں۔ اور بعض نے کہا

ہے کہ سَائِحُونَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو آیت:

﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُوا لَهُمْ قُلُوبٌ

يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا﴾ (۲۲-۳۶)

کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل

(ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے)

ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔

کے متعلق کے تحت زمین میں سفر کرتے ہیں۔ (یعنی

﴿السَّائِبَةُ﴾ (۵-۱۰۳) وہ جانور ہے جو چراگاہ

میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اسے پانی اور چارہ سے کسی قسم

کی رکاوٹ نہ ہو (جاہلیت میں) اس قسم کی آزادی اس

جانور کو دی جاتی تھی جو پانچ بچوں کو جنم دے چکا ہوتا۔ ❶

اور السَّائِبَةُ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو آزاد کیا جائے اور

اس کی ولاء کا حق دار معتق (آزاد کنندہ) ہو۔ ❷ اور اسے

حق حاصل ہو کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف

کرے اور اسی کے متعلق نہیں وارد ہوئی ہے۔ ❸

السَّيْبُ عطا کو کہتے ہیں اور السَّيْبُ (بکسرہ سین) پانی

کے جاری ہونے کی جگہ اصل میں یہ سَيِّبُهُ فَسَابَ سے

مشفق ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا

چنانچہ وہ چلا گیا۔ اور انسَابَتِ (انفعال) السَّيْبَةُ کے معنی

سانپ پانی کی طرح تیزی سے اپنے بل میں اتر گیا۔

(س ی ج)

السَّاحَةُ کے معنی فراخ جگہ کے ہیں۔ اسی اعتبار

سے مکان کے صحن کو سَاحَةُ الدَّارِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ﴾ (۳۷-۱۷۷) مگر جب وہ

ان کے میدان میں آترے گا۔

اور وسیع مکان میں ہمیشہ جاری رہنے والے پانی کو سَائِحٌ

کہا جاتا ہے اور سَاحٌ فُلَانٌ فِي الْأَرْضِ کے معنی

❶ فی الصحاح: عشرة ابطن وقد نهى عنه القرآن ولا سائبة (۱۰۳: ۵)۔

❷ كذافي المطبوع وفي الصحاح: ولا يكون ولاءه وهو الصحيح۔

❸ راجع المعاجم وابن الاثير. راجع المستدرک الحاكم عن ابی هريرة (انظر كنز العمال ج ۲ رقم ۲۲ وفي الطبری (۱۱: ۲۸)

مرفوعاً عن ابی هريرة وفي اللسان قال الزجاج في قول اهل التفسير واللغة جمعياً السالحوں بمعنى الصائمون قارن غريب

القران للفتی ۱۹۳۔

﴿وَوُجُوهُ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ﴾ (۲۳-۷۵) اور بہت سے منہ اس روز اداں ہوں گے۔

﴿وَوُجُوهُ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾ (۸۰-۴۰، ۴۱) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی)۔

﴿وَتَرَهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَّا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطْعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا﴾ (۱۰-۲۷) اور ان کے منہ پر ذلت چھا جائے گی اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا ان کے مونہوں (کی سیاہی) کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر گویا اندھیری رات کے ٹکڑے اوڑھادیئے گئے ہیں۔

اسی طرح مومنین کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔^۱
(۱۸۰) يَحْشُرُونَ عُرًا مُحَجَّلِينَ مِنْ اَثَارِ النُّوضِءِ
کہ قیامت کے دن آثار وضوء سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔

اور دور سے جو چیز نظر پڑے اسے بھی سَوَاد کہا جاتا ہے اسی طرح آنکھ کی سیاہی کو بھی سَوَادُ الْعَيْنِ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے لَا يُفَارِقُ سَوَادِي سَوَادَهُ مِيرِي آنکھ اس کے شخص سے جدا نہیں ہوتی اور بڑی جماعت کو بھی سَوَادُ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مروی ہے۔^۲

عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ: مسلمانوں کی بڑی جماعت کا ساتھ نہ چھوڑو (نہ اس سے علیحدگی اختیار کرو) اور سَيِّدُ کے معنی بڑی جماعت کا سردار کے ہیں چنانچہ

قدرت الہی کے آثار و عجائبات دیکھتے اور ان پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

(س و د)

السَّوَادُ: (ضد بیاض) سیاہ رنگ کو کہتے ہیں۔ اور اِسْوَدَّ (افعال) وَاِسْوَادًا (افعیلال) کے معنی کسی چیز کے سیاہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌُ﴾ (۳-۱۰۶)
جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ۔ تو چہروں کے سفید ہونے سے اظہار مسرت اور سیاہ ہونے سے مراد اظہار غم ہے اسی طرح آیت:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنثَىٰ أَظْلًا وَجْهَهُ مَسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ (۱۶-۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے۔

میں بھی مَسْوَدًّا سے بھی مغموم ہونا مراد ہے۔ بعض نے آیت:

﴿تَبْيَضُّ﴾ میں حَسَنِي سفیدی اور سیاہی کے معنی مراد لئے ہیں۔ لیکن پہلا معنی زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ یہ چیز تو قیامت کے دن اعمال کے اعتبار سے حاصل ہوگی عام اس سے کہ وہ دنیا میں سیاہ فام ہوں یا سفید فام اور اسی سفیدی اور سیاہی کو دوسری آیات میں یوں فرمایا:
﴿وَوُجُوهُ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ﴾ (۲۳-۷۵) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔

۱ اخبر حه الشیخان عن ابی ہریرة و فی روايتهم جميعاً : ان امتی یدعون یوم القیامة غرا..... راجع کنز العمال (۱۹ رقم ۷۹۷)۔

۲ رواه ابن ماجة و تمتع ان امتی لن تحتتم علی ضلالة عن انس و ذکر النبھانی فی الفتح (۱: ۳۷۰)۔

(الغرض سَيَّرٌ کا لفظ چار طرح استعمال ہوتا ہے) چنانچہ پہلے معنی کے متعلق فرمایا:

﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱۲-۱۰۹) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر (وسیاحت) نہیں کی۔

﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (۶-۱۱) کہو کہ (اے منکرین رسالت) ملک میں چلو پھرو۔

﴿سِيرُوا فِيهَا لِيَالِي﴾ (۳۳-۱۸) کہ رات..... چلتے رہو۔ اور دوسرے معنی یعنی سِرْتُ بِفُلَانٍ کے متعلق فرمایا:

﴿سَارَ بِأَهْلِيهِ﴾ (۲۸-۲۹) اور اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر چلے۔

اور تیسری قسم یعنی سِرْتُهُ (بدوں صلہ) کا استعمال قرآن پاک میں نہیں پایا جاتا اور چوتھی قسم (یعنی معنی تکثیر) کے متعلق فرمایا:

﴿وَسِيرَتِ الْجِبَالِ﴾ (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۱۰-۲۲) وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلتے پھرنے اور سیر کرانے کی توفیق دیتا ہے۔

اور آیت: ﴿سِيرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (۶-۱۱) کہ ملک میں چلو پھرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاحت جسمانی ملک میں سیر (وسیاحت کرنا مراد ہے) اور بعض نے سیاحت فکری یعنی عجائبات قدرت میں غور و فکر کرنا اور حالات سے باخبر رہنا مراد لیا ہے جیسا کہ اولیاء کرام کے متعلق مروی ہے۔

أَبْدَانُهُمْ فِي الْأَرْضِ سَائِرَةٌ وَقُلُوبُهُمْ فِي الْمَلَكُوتِ جَائِلَةٌ (کہ ان کے اجسام تو زمین پر چلتے

اضافت کے وقت سَيِّدُ الْقَوْمِ تو کہا جاتا ہے۔ مگر سَيِّدُ الثَّوْبِ يَا سَيِّدُ الْفَرَسِ نہیں بولا جاتا اور اسی سے سَادَ الْقَوْمِ يَسُوذُهُمْ کا محاورہ ہے چونکہ قوم کے رئیس کا مہذب ہونا شرط ہے اس اعتبار سے ہر فاضل انفس آدمی کو سَيِّدٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت: ﴿وَسَيِّدًا وَحَصُورًا﴾ (۳-۳۹) اور سردار ہوں گے اور عورت سے رغبت نہ رکھنے والے۔

میں بھی سَيِّدٌ کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت: ﴿وَالْفِيَا سَيِّدَهَا﴾ (۱۲-۲۵) اور دونوں کو..... عورت کا خاوند مل گیا۔

میں خاوند کو سید کہا گیا ہے کیونکہ وہ بیوی کا نگران اور منتظم ہوتا ہے۔ اور آیت:

﴿رَبَّنَا إِنَّا أَعْطَعْنَا سَادَتَنَا وَكِبْرَانَنَا﴾ (۳۳-۶۷) اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا۔

میں سَادَتْنَا سے ولایت اور حکام مراد ہیں۔

(س ي ر)

السَّيْرُ: (ض) کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں۔ اور چلنے والے آدمی کو سَائِرٌ وَسَيَّارٌ کہا جاتا ہے اور ایک ساتھ چلنے والوں کی جماعت کو سَيَّارَةٌ کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ﴾ (۱۲-۱۹) (اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنویں کے قریب) ایک قافلہ وارد ہوا۔

سِرْتُ: (ض) کے معنی چلنے کے ہیں اور سِرْتُ بِفُلَانٍ نیز سِرْتُهُ کے معنی چلانا بھی آتے ہیں اور معنی تکثیر کے لئے سِرْتُهُ کہا جاتا ہے۔

فلاں قَبِيحُ السَّيْرِ: اس کی سیرت بری ہے اور آیت:
﴿سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَى﴾ (۲۰-۲۱) ہم اس کو
ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔
میں سیرۃ اولیٰ سے اس عصا کا دوبارہ لکڑی بن جانا ہے۔

(س و ر)

السَّوْرُ: اس کے اصل معنی بلندی پر کودنے کے
ہیں اور غصہ یا شراب کی شدت پر بھی سَوْرَةٌ کا لفظ
بولا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے: سَوْرَةُ الْعَصَبِ اور
سَوْرَةُ الشَّرَابِ: (شراب کی تیزی) سِرتُ إِلَيْكَ
کے معنی ہیں: میں تیری طرف چلا اور سَاوَرْنِي فُلَانٌ
کے معنی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے ہیں۔ اور سَوَارٌ
بمعنی وَتَابٌ یعنی عربہ گر کے ہیں اور الْآسْوَارُ
أَسَاوِرَةُ الْفَرَسِ کا مفرد ہے جس کے معنی تیر انداز
کے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔

سَوَارُ الْمَرْأَةِ: (عورت کا بازو بند) یہ بھی معرب
ہے اور اصل میں دَسْتَوَارٌ ہے بہر حال اس کی اصل جو
بھی ہو اہل عرب اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے
اشتقاق کر کے کہا جاتا ہے۔

سَوْرَتُ الْمَرْأَةِ: میں نے عورت کو گلن پہنائے
اور جَارِيَةٌ مَسُورَةٌ وَمُحَلَّخَلَةٌ: اس لڑکی کو کہتے
ہیں جس نے بازو بند اور پازیب پہن رکھی ہو۔ قرآن
پاک میں ہے:

پھرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی روحیں عالم ملکوت میں
جولانی کرتی رہتی ہیں) بعض نے کہا ہے اس کے معنی
ہیں: عبادت میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس کے ذریعہ
ثواب الہی تک رسائی ہو سکے اور آنحضرت ﷺ کا
فرمان ہے۔^۱

(۱۸۱) سَافِرُوا تَغْنَمُوا: سفر کرتے رہو غنیمت حاصل
کر لو گے بھی اسی معنی پر محمول ہے پھر تسییر دو قسم پر ہے
ایک وہ جو چلنے والے کے اختیار و ارادہ سے ہو، جیسے فرمایا:
﴿هُوَ الَّذِي يُسِيرُكُمْ﴾ (۱۰-۲۲) وہی تو ہے جو تم
کو..... چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

دوم وہ جو بذریعہ تخییر کے ہو اور سَائِرٌ یعنی چلنے والے کے
ارادہ و اختیار کو اس میں کسی قسم کا دخل نہ ہو جیسے جبال کے
متعلق فرمایا:

﴿وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ (۷۸-۷۹)
اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں
گے۔

﴿وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ﴾ (۸۱-۸۳) اور جب پہاڑ
چلائے جائیں گے۔

السَّيْرَةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان زندگی بسر
کرتا ہے عام اس سے کہ اس کی وہ حالت طبعی ہو یا
اکتسابی۔ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ حَسَنُ السَّيْرِ: فلاں کی سیرت اچھی ہے۔

۱ ولفظة الحديث سافر واتصحوا ونگنموا والحديث في (هق عن ابن عباس) الشيرازي في الالقاب ملس وابو نعيم في الطب
والقضاعي عن ابن عمر وفي رواية: وترزقوا (عب، عن محمد بن عبدالرحمن مرسلًا) راجع للحديث باختلاف الفاظه كتر العمال ج
(ص ۲۸۸۸-۲۸۹۲) فانه ذكره بطريقة المختلفة وقد عقده ابو الفتح بن ابي حصين في بيت سافر واتغنموا وقد قال عليه السلام
صومواتصحوا (راجع خاص الخاص للثعالبي ۱۶۰) وفي المعاهد (۲: ۸۵) اتمام الحديث بدل عليه السلام وقد نسبة الي
عبدالمحسن بن محمد الصوري ۱۲۔

منازل قمری طرح ایک منزلت ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہو سکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سُورۃ مہموزا مانا جائے تو یہ اَسَارَتُ سے مشتق ہوگا جس کے معنی کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں۔ اور سورۃ بھی چونکہ قرآن پاک کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت:

﴿سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا﴾ (۱-۲۴) یہ (ایک) سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام و حکم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَسَارَتُ فِی الْقَدْحِ سے مشتق ہے جس کے معنی پیالہ میں کچھ باقی چھوڑنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۲۴۵) لَا بِالْحَصُورِ وَلَا فِيهَا بِسَارٍ

نہ تک دل اور نیکل ہے اور نہ عربدہ گر۔

ایک روایت میں وَلَا بِسَوَّارٍ ہے جو سورۃ بمعنی شدت غضب سے مشتق ہے۔

(س و ط)

السَّوْطُ (چمڑے کا کوڑا) بنے ہوئے چمڑے کو

﴿أَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ (۴۳-۵۳) سونے کے ننگن۔

﴿أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ (۷۱-۷۲) چاندی کے ننگن۔ اور قرآن پاک میں سونے کے ساتھ اَسْوِرَةٌ جمع لاکر پھر خاص کر اَلْقِي كَاصِينَا استعمال کرنا اور فِضَّةٌ سے قبل اَسَاوِرٌ کا لفظ لاکر اس کے متعلق حُلُوا كَاصِينَا استعمال کرنے میں ایک خاص نکتہ ملحوظ ہے جس کی تفصیل دوسری کتاب میں بیان ہوگی۔^①

السُّورَةُ کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۲۴۴) اَللَّم تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَعْطَاكَ سُورَةَ

تَرَى كُلَّ مَلِكٍ دُونَهَا يَتَدَبَّدَبُ

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا مرتبہ بخشا ہے جس کے درے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔

اور سُورُ الْمَدِينَةِ کے معنی شہر پناہ کے ہیں اور سُورَةُ الْقُرْآنِ (قرآن کی سورت) یا تُوَسُّورُ الْمَدِينَةِ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورہ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن پاک کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے۔ اور یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے اور سورۃ بھی

① اشارة الى تفسير القران الذى الفه بعد مفرداته .

② قاله النابغة فى مدح نعيان بن المنذر معتذراً انظر ديوانه ۱۳ ومختار الشعر الجاهلى ۱۷۵ وتفسير الطبرى (۳۳۵: ۵) وامالى المرتضى (۴۸۷: ۱) والصناعتين (۷۰۵) مع آخر ونقد الشعر ۲۶۱ والحيوان (۹۵: ۳) والعقد (۵) والحصري (۹۲: ۳) والسيوطى ۸۰ والعقد الفريد (۱۶۳: ۲) والصاحى ۱۹۸ .

③ قاله الاخطل التغلبى واوله : وشارب مريح بالكاس ناومنى والبيت من قصيدة حمهريه ۳۲۶-۳۳۰ فى ۵۰ بيتاً فيها يزيد بن معاوية والبيت فى ديوانه ۱۱۶ (ط بيروت ۱۸۹۱ء والبحر ۱: ۱۰۱/۲: ۴۴۸) ومجالس ثعلب ۱: ۳۱۵ والطبرى ۳: ۱۵/۲۵۵: ۴۶ وشواهد الكشاف ۴۳ واللسان والمحكم والصباح (حصص) والفرطى ۴: ۷۸ ومجاز القرآن ۱: ۹۲ وتهذيب الالفاظ ۲۲۶ وتهذيب الاصلاح ۱: ۲۵ مجموعة المعانى ۱۹۸ والقنبي المعانى ۴۶۴ وفى روايته ولا بسواروهى رواية يعقوب فى اصلاحه ۱۴۲، ۲۳۰ وابن قتيبه فى المعانى والجوهري فى صحاحه ۱۲ .

﴿وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ﴾ (۶-۲۲) اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔

اور یا اس معنی کے پیش نظر اسے سَاعَةٌ کہا ہے جس پر کہ آیت کریمہ:

﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَسُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا﴾ (۸۰-۳۶) جب وہ اس کو دیکھیں گے تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے ہیں۔

﴿لَمْ يَلْبَسُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ﴾ (۳۶-۳۵) (تو خیال کریں گے) کہ گویا دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھردن۔

اور آیت:

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ﴾ (۳۰-۱۳) اور جس دن قیامت برپا ہوگی۔ میں تشبیہ فرمائی ہے۔ اور پہلی آیت یعنی ﴿يَوْمَ يَرَوْنَهَا﴾ میں ”ہا“ ضمیر سے مراد قیامت ہے اور دوسری آیت میں سَاعَةٌ مِّنْ نَّهَارٍ سے وقت قلیل مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ سَاعَات جن سے قیامت مراد ہوتی ہے تین ہیں۔

(۱) السَّاعَةُ الْكُبْرَى: یعنی لوگوں کو محاسبہ کے لئے اٹھانا یا دوبارہ زندہ کرنا اور اسی کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

(۱۸۲) لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَظْهَرَ الْفُحْشُ

وَالنَّفَحُشُ وَحَتَّى يُعْبَدَ الذَّرْهَمُ وَالذِّينَارُ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا نہ ہونے لگ جائے اور درہم و دینار کی پرستش نہ ہونے لگے اور آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بہت سی

کہتے ہیں جس کے ساتھ پینا جاتا ہے۔ اصل میں سَوَطٌ کے معنی کسی چیز کو خلط ملط کرنا کے ہیں اور اس سے فعل سَطَطَهُ وَسَوَطَطَهُ آتا ہے اور کوڑے کو سوط اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی چند تھے بننے سے باہم خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اور آیت:

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوَاطِبَ﴾ (۸۹-۱۳) تو تمہارے پردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا۔

میں عذاب الہی کو دنیاوی سزا کے ساتھ تشبیہ دے کر سوط سے تعبیر کیا ہے کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوڑے سے سزا دی جاتی تھی بعض نے کہا ہے کہ سَوَاطِبَ عَذَابٍ لفظ سے انواع عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف کہ آیت: ﴿حَمِيمًا وَعَسَاقًا﴾ (۷۸-۲۵) میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

(س و ع)

السَّاعَةُ: (وقت) اجزاء زمانہ میں سے ایک جزء کا نام ہے اور السَّاعَةُ بول کر قیامت بھی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ (۵۳-۱) قیامت قریب آ پونجی۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ﴾ (۸۰-۴۲) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے دن کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

﴿وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۴۳-۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

تو قیامت کو سَاعَةٌ کہنا یا تو سرعت حساب میں تشبیہ کے طور پر ہے جیسے فرمایا:

دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت: ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَنَا كُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَنتُمْ كُمْ السَّاعَةِ﴾ (۶-۲۰) (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آ موجود ہو۔ میں السَّاعَةِ سے مراد موت ہی ہے ایک حدیث میں ہے۔

(۱۸۳) کہ جب سخت آندھی چلتی تو آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور فرماتے تَخَوَّفْتُ السَّاعَةَ کہ مجھے قیامت کا اندیشہ ہے۔ نیز فرمایا:

(۱۸۵) وَمَا أَحَدٌ طَرَفَنِي وَلَا اغْضُهَا إِلَّا وَأَظُنُّ أَنَّ السَّاعَةَ قَدْ قَامَتْ کہ جب میں اپنی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ بس قیامت آجکی یعنی مجھے اپنی موت کا ہر لمحہ خیال رہتا ہے جس طرح کہ عامَلْتُهُ مُعَاوَمَةً وَيَا مُشَاهِرَةً کا محاذ رہ ہے جس کے معنی سال یا مہینہ کے حساب سے معاملہ کرنے کے ہیں اسی طرح ساعات کے حساب سے معاملہ کرنے کے معنی میں عامَلْتُهُ مُوَاعَةَ استعمال ہوتا ہے اور جَاءَنَا بَعْدَ سَوْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَسَوْعٍ کے معنی ”سکون شب کے بعد وہ ہمارے پاس آیا“ اور پھر سَاعَةً سے کبھی اجمال (ضائع کرنا) کے معنی بھی

علامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو نہ آپ کے زمانہ میں ظاہر ہوئیں اور نہ بعد میں اب تک ان کا ظہور ہوا ہے۔ ① (۲) السَّاعَةُ الْوَسْطَى: جو کہ ایک قرن کے لوگ گزر جانے سے عبارت ہے جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے عبد اللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا: ② (۱۸۳) إِنْ يَطْلُ عُمُرُ هَذَا الْغُلَامِ لَمْ يَمُتْ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ: اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ قیامت سے پہلے نہیں مرے گا۔ چنانچہ بعض کا قول ہے کہ وہ صحابہ کرام میں سب سے آخر فوت ہوئے ہیں۔

(۳) السَّاعَةُ الصُّغْرَى: جو کہ انسان کی موت سے عبارت ہے پس اس معنی کے لحاظ سے ہر انسان کی موت اس کے لئے قیامت ہے۔ ③ چنانچہ اسی معنی کی طرف آیت:

﴿وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ﴾ (۶۳-۱۰) جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو (اس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ

① منها خروج الدابة ونزول المسيح وظهور الدجل وطلوع الشمس من مغربها والى ذلك ۱۲۔

② وفي صحيح مسلم (۴۰۶:۲) والبخاری من حديث النبي صلى الله عليه وسلم: ان يعش هذا الغلام فعسى ان لا يدركه الهرم حتى تقوم الساعة واما اسم هذا الغلام اراه في رعاية صحيحة وفي صحيح مسلم الى غلام من ازد شوننة وقال انس وكان من اترابي ومعنى الحديث يموت ذلك القرن واولئك المخاطبون قال النووي ويحتمل انه علم ان هذا الغلام لا يبلغ الهرم راجع للبحث الفتح للحافظ (۱۴۹: ۱۴۹-۵۰)۔

③ وفي الحديث من مات فقد قامت قيامته. كما روى في الحديث من مات فقد قامت قيامته انظر الفردوس لابي شجاع الديلمي وسمعناه في الطبري من حديث المغيرة بن شعبة وابن ابي الدنيا من حديث انس بسند ضعيف راجع تخريج الكشاف رقم ۵ و تخريج الاحياء للعراقي (۶۴: ۴)

(س و ف)

سَوْفٌ: (حرف تسويف) یہ حرف ہے جو فعل مضارع کو معنی حال سے مجرد کر کے معنی استقبال کے لئے خاص کر دیتا ہے (اسی لئے سے حرف استقبال بھی کہتے

ہیں) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَوْفَ اسْتَغْفِرُكُمْ رَبِّي﴾ (۲-۹۸) میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا۔

اور آیت: ﴿فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ (۶-۱۳۶) عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔

میں متنبہ کیا ہے کہ جس بات کا وہ مطالبہ کرتے ہیں اگرچہ فی الحال وہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن وہ لامحالہ ہو کر رہے گی۔

اور اس میں مَمَّا طَلَّةً (نال مٹول) اور تاخیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور چونکہ وعدہ کرنے والا سَوْفَ

أَفْعَلُ كَذَا کا محاورہ استعمال کرتا ہے اس لئے اَلتَّسْوِيفُ (تفصیل) کے معنی نال مٹول کرنا بھی

آجاتے ہیں۔

السَّوْفُ (ن) کے معنی مٹی یا بول کی بوسو گھسنے کے ہیں پھر اس سے اس ریگستان کو جس میں راستہ کے نشانات

مٹے ہوئے ہوں اور (تافلہ کا) رہنما اس کی مٹی سوگھ کر راہ دریافت کرے اسے ”مَسَافَةٌ“ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا

ہے۔^۵

(۲۴۶) إِذَا الدَّلِيلُ اسْتَأْفَ أَخْلَاقَ الطَّرِيقِ

لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

أَسَعَتْ الْإِبِلُ: (افعال) میں نے اونٹوں کو بے کار چھوڑ دیا یا ضائع کر دیا۔ هُوَ ضَائِعٌ سَائِعٌ: وہ مہمل اور بے کار ہے۔

سَوَاعٌ: ایک بت کا نام ہے۔^۶ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَدَا وَلَا سَوَاعًا﴾ (۷۱-۲۳) اور وہ اور سَوَاعٌ..... کو کبھی ترک نہ کرو۔

(س و غ)

سَاعَ الشَّرَابِ فِي الْحَلْقِ: کے معنی شراب

کے آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتر جانا کے ہیں وَأَسَاعَهُ كَذَا (افعال) کے معنی حلق سے نیچے اتارنے

کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿سَائِعًا يُشْرِبِينَ﴾ (۱۶-۶۶) پینے والوں کے لئے خوش گوار ہے۔

﴿وَلَا يَكَادُ يَبْسِغُهُ﴾ (۱۳-۱۷) اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ سَوَّغْتُهُ مَا لَا میں نے اس کے لئے مال خوشگوار بنا دیا یعنی مباح

کر دیا اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ سَوَّغَ أَخِيهِ کا محاورہ اس بچے کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو

اپنے بھائی کے بعد جلدی ہی پیدا ہو (یہ مذکر و مؤنث دونوں کے حق میں بولا جاتا ہے)

① سواع لم يوجد اصله في كلام العرب ويمكن ان يكون مشتقاً من السوع بمعنى الزمان وانظر لود (ورد) وهما من الآلهة التي كانت قوم نوح تبعدها.

② قاله رؤية بن العجاج الراجز الاسلامي في ارجوزة له ۱۷۴ بيتاً وهي في ديوانه (۱۰۴-۱۰۸) وقبله، مسودة الاعطاف من وسم العرق وبعده: كانها حقباء بلفاء الزحق والشطر وحده في خزنة الادب (۸۸: ۱) وديوانه (۱۰۵) والاقطص (۳۱۲) وادب الكتاب ۵۱ واضداد ابي الطيب ۶۹۸ واصلاح يعقوب ۳۱۶.

﴿وَأَنْتَفَتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴾ (۷۵-۲۹) اور پنڈلی

سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قبض روح کے وقت پنڈلیوں کا لپٹنا مراد ہے اور بعض نے پنڈلیوں کا کفن میں لپٹنا مراد لیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اُن کے لپٹنے سے مراد موت ہے کہ زندگی میں وہ اس کے بوجھ کو اٹھا کر چلتی تھیں لیکن موت کے بعد وہ اس بار کی متحمل نہیں ہو سکیں گی۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک شدت کا دوسری شدت سے لپٹنا مراد ہے اسی طرح آیت: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (۶۸-۳۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا۔ میں پنڈلی سے کپڑا اٹھانا صعوبت حال سے کنایہ ہے۔ اور یہ کَشَفَتْ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی لڑائی کے سخت ہو جانے کے ہیں۔ بعض نے اس کی اصل یہ بیان کی ہے کہ جب اونٹنی کے پیٹ میں بچہ مر جاتا ہے تو مُزْرَمَر (جنوانے والا) اس کے رحم کے اندر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے پنڈلیوں سے پکڑ کر زور سے باہر نکالتا ہے اور یہ کَشَفَ عَنْ سَاقِهَا کے اصل معنی ہیں پھر ہر ہولناک امر کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہونے لگا ہے تو یہاں بھی شدت حال سے کنایہ ہے اور آیت:

﴿فَأَسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوْقِهِ﴾ (۲۹-۲۸) اور پھر اپنی

نال پر سیدھی کھڑی ہوئی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سُوْقِ سَاقٍ کی جمع ہے جیسے لَابَةٌ کی جمع لُوبٌ اور فَارَةٌ کی جمع فُورَاتٌ ہے اور اسی طرح آیت:

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ﴾ (۳۸-۳۳)

جب رہنما بے نشان راستوں پر سوگھ سوگھ کر چلے۔

السُّوْفُ: اونٹوں کے ایک مرض کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں اور اس سے موت کی بوسوگھ لیتے ہیں یا موت ان کو سوگھ لیتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے جلدی ہی ان کی موت آ جاتی ہے۔

(س و ق)

سَوَّقُ الْإِبِلِ: کے معنی اونٹ کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں یہ سَقَّتَهُ (ن) کا مصدر ہے اور اِنْسَاقٍ (انفعال) کے معنی ہنکانے کے بعد چل پڑنے کے ہیں۔ ان جانوروں کو جو ہنکائے جاتے ہیں، سَيْقَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور عورت کو مہر ادا کرنے کے لئے سَقَّتُ الْمَهْرَ إِلَى الْمَرْأَةِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ عرب حق مہر میں (عام طور پر) اونٹ دیا کرتے تھے۔ اور آیت: ﴿إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ﴾ (۷۵-۳۰) میں مساق کے معنی پروردگار کی طرف چلنا کے ہیں جیسا کہ آیت:

﴿إِنَّ السَّيِّئِينَ وَالْمُتَّعِينَ بِكُلِّ بَشَرٍ مَّا خَلَقْنَا مِنْهُمْ لَآئِمٌّ﴾ (۵۱-۴۲) میں ہے یعنی تمہیں اپنے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔

اور آیت: ﴿مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ﴾ (۵۰-۲۱) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک (اس کے عملوں کی) گواہی دینے والا۔

میں سائق سے وہ فرشتہ مراد ہے جو اسے چلا کر حساب کے لئے پیش کرے گا اور دوسرا فرشتہ شہید (بطور گواہ) کے اس کے ساتھ ہوگا جو اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿كَأَنَّهُمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ﴾ (۸-۶) گویا موت کی طرف دھکیلے جاتے ہیں۔ کے ہم معنی ہے اور آیت:

مطالبہ کیا)

میں کہا ہے کہ یہاں سَأَلْتُ بمعنی طَلَبْتُ ہے اور یہ سَأَلَ (مہوز) سے نہیں ہے جیسا کہ اکثر ادباء نے خیال کیا ہے۔

(س ی ل)

سَالِ الشَّيْءُ يَسِيلُ کے معنی کسی چیز کے بننے کے ہیں۔ اور أَسَلْنَا کے معنی بہا دینے کے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ﴾ (۱۲-۳۴) اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔

یہاں أَسَلْنَا کے معنی پگھلا دینے کے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت إِسَالَةٌ کا لفظ قطر کی اس حالت پر بولا جاتا ہے جو پگھلانے کے بعد ہوتی ہے۔

السَّيْلُ؛ (ض) یہ اصل میں سَالٌ يَسِيلُ کا مصدر ہے جس کے معنی بننے کے ہیں اور بطور اسم اس پانی پر بولا جاتا ہے جو دور سے بہہ کر کسی جگہ پر آجائے اور وہاں برسانہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاخْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا﴾ (۱۳-۱۷) پھر (برساتی) نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔

﴿سَيْلٍ الْعَرِمِ﴾ (۱۶-۳۴) زور کا سیلاب۔

السَّيْلَانُ؛ (دنبالہ شمشیر و کاردر وغیرہ) اس لے لے لوہے کو کہتے ہیں جو نصاب کی جانب سے تلوار، چھری وغیرہ کے

پھران کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

میں بھی سُوقٌ صیغہ جمع ہے اور رَجُلٌ أَسْوَقٌ کے معنی بڑی پنڈلیوں والے آدمی کے ہیں اس کی مؤنث سُوقَاءٌ آتی ہے اور سُوقٌ کے معنی بازار بھی آتے ہیں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے اور فروخت کے لئے وہاں سامان لے جایا جاتا ہے۔ اس کی جمع أَسْوَاقٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْسُ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (۲۵-۷) یہ کیا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

السَّوِيقُ کے معنی ستو کے ہیں کیونکہ وہ بغیر چبائے حلق سے نیچے اتر جاتے ہیں۔

(س و ل)

التَّسْوِيلُ: کے معنی نفس کے اس چیز کو مزین کرنا کے ہیں جس پر اسے حرص بھی ہو اور اس کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا﴾ (۸-۱۲) بلکہ تم اپنے دل سے (یہ) بات بنا لائے۔

﴿الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ﴾ (۲۵-۲۷) شیطان نے (یہ کام) انہیں مزین کر دکھایا۔

بعض ادباء نے ①

(۲۶۷) سَأَلْتُ هُدَيْلٌ رَسُولَ اللَّهِ فَاحِشَةٌ

(بنی ہذیل نے آنحضرت ﷺ سے ایک فحش امر کا

① قاله حسان بن ثابت الانصاری وتمامه: ضلت هذيل بما جئت ولم نصب والبيت في ديوانه ۳۴ والكتاب (۲: ۳۰) وقال اصله مہموز۔ و زكر المؤلف في محاضراته (۲: ۲۵۹) ان اباكبير الهذلي جاء الي رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأله ان يحل الزنا فقال اتحب ان يوتي اليك في حرمك مثل ذلك قال لائم قال فادع الله ان يذهب مني الشيق فدعا له فقال حسان..... وانظر للقصة ايضا اسد الغابة (۵: ۲۸۲) ذكر ابو كبير الهذلي وبعده اشعار.

لئے ہوتا ہے اور کبھی محض سرزنش کے لئے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ﴾ (۸۱-۸) جب لڑکی سے جو زندہ دفنالی گئی ہے پوچھا جائے گا۔

اور کبھی صرف مسؤل (جس سے سوال کیا جائے) کو جتلانے کے لئے (نہ کہ خود کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے)

اور سوال جب کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف کبھی تو وہ متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی حرف جار کے ذریعہ چنانچہ تم کہو گے: سَأَلْتُهُ كَذَا وَسَأَلْتُهُ عَنْ كَذَا وَبِكَذَا: لیکن زیادہ تر بواسطہ عن کے متعدی ہوتا ہے جیسے کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾ (۱۷-۸۵) اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقُرْنَيْنِ﴾ (۱۸-۸۳) اور تم سے ذی القرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ﴾ (۸-۱) (۱-۸) محمد ﷺ! مجاہد لوگ! تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي﴾ (۲-۸۲) اور (۱-۷۰) پیغمبر! جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں۔

﴿سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ﴾ (۷۰-۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔

دستہ میں لگا ہوتا ہے۔

(س و ل)

السُّؤَالُ کے معنی کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں جو مؤدی الی المعرفة ہو۔ نیز مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سُّؤَالُ کہا جاتا ہے جو مؤدی المال ہو پھر کسی چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل میں تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام بن سکتا ہے پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سوال کے معنی استدعا معرفت کیسے صحیح ہو سکتے ہیں جب کہ یہ ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے سوال کرے گا۔

جیسے فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يُعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ﴾ (۵-۱۱۶) اور (اس وقت) کو بھی یاد رکھو۔ جب اللہ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم ﷺ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سوال کرنا کسی قسم کی معرفت حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ تو اعلام الغیوب ہے۔ (وَلَا تَخْفَىٰ عَلَيْهِ خَافِيَةٌ) بلکہ لوگوں کو بتلانے اور انہیں سرزنش کرنے کی غرض سے ہوگا لیکن پھر بھی یہ سوال سوال عن المعرفة، کبھی کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے

کے لئے چلے گئے۔ اور ان اونٹوں کو جو باہر چرنے کے لئے جاتے ہیں سَائِمَةً کہا جاتا ہے اور کبھی صرف طلب کے معنی پائے جاتے ہیں جیسے سُمْتُ كَذَا: میں نے اسے فلاں تکلیف دی چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَسْؤُمُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ﴾ (۲-۴۹) وہ لوگ تم کو بڑا دکھ دیتے ہیں۔ اور يَسِيمٌ فَلَانَ الْخَسْفِ (فلاں کو خسف کا عذاب دیا گیا) يَاهُ وَيَسَامُ الْخَسْفِ کا محاورہ بھی اسی سے ماخوذ ہے اور اسی سے بَيْعٌ فِي السَّؤْمِ ہے جس کے معنی نرخ کرنا کے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے۔^۱

(۱۸۶) صَاحِبُ السِّلْعَةِ أَحَقُّ بِالسَّؤْمِ: سامان کا مالک نرخ کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔

اور سُمْتُ الْإِبِلِ فِي الْمَرْعَى کے معنی چراگاہ میں چرنے کے لئے اونٹ بھیجنے کے ہیں۔ اور اسی معنی میں أَسَمْتُ الْإِبِلَ (افعال) وَسَوَمْتُهَا (تفعیل) آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ﴾ (۱۶-۱۰) اور اس سے درخت بھی (شاداب) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔

السَّيْمَاءُ وَالسَّيْمِيَاءُ کے معنی علامت کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔^۲ (الطویل)

اور جب سوال طلب مال کے لئے ہو تو وہ متعدی بنفسہ بھی ہوتا ہے۔ اور بذریعہ "مِنْ" کے بھی چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾ (۳۳-۵۳) اور جب پیغمبروں کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔

﴿وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَلُوا مَا أَنْفَقُوا﴾ (۶۰-۱۰) اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہو تم ان سے طلب کرو۔ اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کر لیں۔

﴿وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۴-۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (و کرم) مانگتے رہو۔

فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو اسے سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۹۳-۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

﴿لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (۵۱-۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے۔

(س و م)

السَّؤْمُ: کے معنی کسی چیز کی طلب میں جانے کے ہیں پس اس کا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے یعنی طلب اور جانا پھر کبھی صرف ذہاب یعنی چلے جانا کے معنی ہوتے ہیں۔ جیسے سَامَتِ الْإِبِلُ: اونٹ چراگاہ میں چرنے

① البخاری فی ترجمۃ الباب۔

② فی اللسان (سوم) قالہ ابن عقیق الفزازی فی عمیلۃ الفزازی واولہ : غلام رمہ اللہ بالخیر بافعا..... وفی روایۃ ابن الانباری بالحسن بدل الخیر وانظر الخبر والشعر فی الحماسة (۴: ۶۸ ط مصر) والمرزوقی ۵۸۸ او الحصری (۴: ۱۰۴) والکامل (۱: ۲۲) والاغانی (۱۷: ۱۱۷) والطبری (۳: ۱۹۸/۴: ۸۱/۱۹۶: ۱۹۶) وشواہد الکشاف ۵۲ وابن ولاد ۶۲ والبحر (۲: ۳۱۶: ۸/۱۰۲) والمعجم للمرزبانی (۱۹۹) فی خمسة آیات والمؤلف للأمدی ۲۳۸ وبعده کان الثریاعلمت فی حیثہ وفی انفہ الشعری وفی جیدھا القمر وفی روایۃ فوق نحرہ وعقیق امہ واسمہ قیس بن بحیرہ الفزازی المخضرمی والبیہت الثانی قالہ علی بن طلحہ حین قال فیہ قوم راجع العقد (۴: ۳۲۲)۔

نیز فرمایا:

(۲۴۸) لَهُ سِيمَاءٌ لَا تَشُقُّ عَلَى الْبَصْرِ

اس کے چہرے پر نشان ہے جو آنکھوں پر گراں نہیں گزرتا
قرآن پاک میں ہے:

﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾
(۲۹-۳۸) (کثرت سجدے کے اثر سے) ان کی پیشانیوں

پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔

اور سَوَمْتُهُ کے معنی نشان زدہ کرنے کے ہیں۔

اور ﴿مُسَوِّمِينَ﴾ (۳-۱۲۵) کے معنی مُعَلِّمِينَ کے
ہیں یعنی نشان زدہ اور مُسَوِّمِينَ (بصیغہ فاعل) کے معنی

ہیں: اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑوں پر نشان امتیاز بنانے
والے یا ان کو چھوڑنے والے۔

آنحضرت ﷺ سے ایک روایت میں ہے: ﴿
(۱۸۷) تَسَوَّمُوا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَدْ تَسَوَّمَتْ
کہ تم بھی نشان بنا لو کیونکہ فرشتوں نے اپنے لئے نشان
بنائے ہوئے ہیں۔

(س و م)

السَّامَةُ: اس کے معنی کسی چیز کے زیادہ عرصہ تک
رہنے کی وجہ سے اس سے کبیدہ خاطر یا دل برداشتہ
ہو جانے کے ہیں اور یہ فعلاً (کسی کام کو زیادہ عرصہ تک
کرنے) اور انفعلاً (کسی چیز سے زیادہ متاثر ہونے)
دونوں طرح ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَهُمْ لَا يَسْتَمُونُ﴾ (۳۱-۳۹) اور (کبھی) تھکتے
ہی نہیں۔

﴿لَا يَسْأَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ﴾ (۳۱)
(۳۹) انسان بھلائی کی دعائیں کرتا کرتا تو تھکتا نہیں۔ شاعر
نے کہا ہے۔ ﴿(الطویل)

(۲۴۹) سَمَّيْتُ تَكَالِيفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَعِشْ
تَمَائِنَ حَوْلًا لَا أَبَالَكَ يَسْأَمُ
میں زندگی کی خوشگوار یوں سے اکتا چکا ہوں۔ ہاں جو شخص
اسی کو پہنچ جائے وہ لامحالہ اکتا ہی جاتا ہے۔

(س ی ن)

طُورٍ سَيْنَاءَ: یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے چنانچہ قرآن
پاک میں ہے:

﴿تَخْرُجُ مِنْ طُورٍ سَيْنَاءَ﴾ (۲۳-۲۰) (اور وہ
درخت بھی ہم ہی نے پیدا کیا) جو طور سیناء میں پیدا ہوتا
ہے۔ یہ حرف اول یعنی سین کے فتح اور کسرہ دونوں کے
ساتھ آتا ہے۔ فتح کی صورت میں قطعی طور پر الف ممدودہ

برائے تانیث ہوگا کیونکہ عربی زبان میں فَعْلَالٌ کا وزن
صرف کلمہ مضاعف کے ساتھ مختص ہے جیسے زَلْزَالٌ
وَقَلْقَالٌ اور سین کے مکسور ہونے کی صورت میں یہ بھی ہو
سکتا ہے کہ اس کا الف عِلْيَاءَ اور حِرْبَاءَ کی طرح
(برائے تانیث) ہو اور یہ بھی صحیح ہے کہ الف سِرْوَاخٍ
کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ہو اور اسی کو (دوسری جگہ)
﴿طُورٍ سَيْنِينَ﴾ (۲-۹۵) بھی کہا گیا ہے۔

السَّيْنُ: حروف ہجاء میں سے ایک حرف کا نام ہے۔

① أخرجه الطبري عن عمير بن اسحاق (۸۲: ۴) وفي النهاية (سوم) سَوَمَاتُ الْمَلَائِكَةِ قَدْ سَوَّمَتْ ۱۲.

② قاله زهير بن ابي سلمى والبيت في مختار الشعر الجاهلي (۱: ۱۵۷) والبحر (۲: ۳۵۱) والمحاضرات (۴: ۴۹۸) والحمهرة
۱۱۰ والعقد الثمين ۹۶ وایام العرب ۲۷۶ والجامع الكبير للجزري ۱۲۰ والمعلقات لابن الانباري ۲۸۷ وفي روايته عاماً بدل
حولاً وابن السحري (۱: ۳۶۲) والسويطي ۱۳۲.

(س و ی)

الْمَسَاوَاةُ کے معنی وزن، کھیل یا مساحت کے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:

هَذَا الثَّوْبُ مَسَاوٍ لِدَاكِ الثَّوْبِ يَكْبُرُ اس کپڑے کے مساوی ہے۔ هَذَا الدِّرْهَمُ مَسَاوٍ لِدَاكِ الدِّرْهَمِ: یہ درہم اس درہم کے مساوی ہے اور کھمی لحاظ کیفیت کے برابری ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے: هَذَا السَّوَادُ مَسَاوٍ لِدَاكِ السَّوَادِ کہ یہ سیاہی اس سیاہی کے برابر ہے مگر اصل میں یہاں مساوات بلحاظ ذات سواد کے مراد نہیں ہوتی بلکہ بلحاظ محل کے ہوتی ہے اور معنی معادلت (برابر) کے لحاظ سے یہ لفظ یوں عدل وانصاف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ (الطویل)

(۲۵۰) آيِنَا فَلَا نُعْطِي السَّوَاءَ عَدْوَنَا

ہم انکار کر دیتے ہیں اور اپنے دشمن کو عدل وانصاف نہیں دیتے۔ اِسْتَوَى: اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک دو یا دو سے زیادہ فاعل کی طرف اس کی اسناد ہو جیسے: اِسْتَوَى زَيْدٌ وَعَمْرُو فِي كَذَا کہ زید اور عمر و فلاں چیز میں برابر ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۹-۱۹) یہ لوگ خدا کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔

دوم: یہ کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى﴾ (۶-۵۳) (یعنی جبرائیل علیہ السلام)

طاقتور نے۔ پھر وہ پورے نظر آئے۔

﴿فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ﴾ (۲۳-۲۸) جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاؤ۔

اور محاورہ ہے:

اِسْتَوَى اَمْرُ فُلَانٍ کہ فلاں کا معاملہ ٹھیک اور صحیح ہو گیا اور جب عَلِيٌّ کے ذریعہ متعدی ہو تو اس کے معنی کسی چیز پر (چڑھنے، قرار پکڑنے اور) مستولی ہونا کے ہوتے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:

اِسْتَوَى فُلَانٌ عَلٰی عَمَالَتِهِ فلاں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ قرآن میں ہے:

﴿لَتَسْتَوِي عَلٰی ظُهُورِهِ﴾ (۴۳-۱۳) تاکہ تم ان کی سواری کرو۔

﴿فَاسْتَوَى عَلٰی سَوْفِهِ﴾ (۴۹-۲۹) اور پھر وہ اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

اور اسی سے آیت:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ (۲۰-۵) (خدائے) رحمن، جس نے عرش پر قرار پکڑا ہے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کے سامنے مساوی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ان کو درست بنانے سے سب اس کے ارادہ کے مطابق ٹھیک اور درست

ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ آیت:

﴿ثُمَّ اسْتَوَى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوَّاهُنَّ﴾ (۲-۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک (سات آسمان)

بنادیا۔

میں ہے بعض نے آیت: ﴿اِسْتَوَى عَلٰی الْعَرْشِ﴾

① قاله عترة وتسامه: قیماً باعضاء السراء المعطف والبيت في مختار الشعر الجاهلي (۱: ۲۹) والعقد اللعين.

وہ فعل محتاج ہوتا ہے۔ جیسے سَيْفٌ قَاطِعٌ (کہ یہاں فعل قطع کی نسبت تلوار کی طرف ہے جو آلہ قطع ہے) اور آیت کی یہ توجیہ جو ہم نے بیان کی ہے اس قول سے بہتر ہے جو مَسَا سَوَّأَهَا سے اللہ تعالیٰ مراد لیتے ہیں کیونکہ لفظ مَاضٍ کے لئے موضوع ہے اور سَمِعَ (یعنی کسی دلیل سمعی) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق میں استعمال ہوا ہو۔ لہذا اس سے ذات باری تعالیٰ مراد نہیں ہو سکتی۔ اور آیت:

﴿سَبَّحَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى﴾ (۸۷-۲۰) (اے پیغمبر) اپنے پروردگارِ جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے (انسان کو) بنایا پھر اس کے اعضاء کو درست کیا۔

میں سَوَّى فعل (بلا اختلاف) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾ (۱۵-۲۹) جب اس کو (صورتِ انسانیہ میں) درست کر لوں اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔ اور اسی طرح دوسری آیت:

﴿رَفَعَ سَمَكَهَا فَسَوَّأَهَا﴾ (۷۹-۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کر دیا۔

میں بھی فعل تَسْوِيَةِ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے اور آیت فَسَوَّأَهَا میں آسمان کا تسویہ اس کی بناوٹ اور تزئین دونوں کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿أَنَا زِينَةُ السَّمَاءِ الدُّنْيَا بَرِيَّةٌ نِ الْكَوَاكِبِ﴾ (۳۷-۶) بے شک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔ میں مذکور ہے۔

السَّوَّى: اسے کہتے ہیں جو مقدار اور کیفیت دونوں کے

کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ بنسبت دوسری چیز کے اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اجسام پر قیاس نہیں کر سکتے جو ایک جگہ موجود ہوتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں ہوتے۔

اور جب یہ لفظ (استوی) متعدی بالی ہو تو اس کے معنی کسی چیز تک بالذات یا بالذات بغير پہنچ جانے کے ہوتے ہیں اور آیت:

﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ﴾ (۳۱-۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی الْأَنْتِهَاءُ إِلَيْهَا بِالتَّدْبِيرِ: یعنی تدبیر کرنا۔

التَّسْوِيَةُ کے معنی کسی چیز کو ہموار کرنے کے ہیں اور آیت:

﴿الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ﴾ (۸۲-۷) (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سَوَّاكَ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت: ﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّأَهَا﴾ (۹۲-۷) اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قویٰ کو برابر بنایا۔

میں لفظ ”ہا“ سے ان تو اے نفسانیہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نفس کے لئے مَقْوَمٌ بنایا ہے چنانچہ فعل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ بحث دوسرے مقام پر مذکور ہو چکی ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعل حقیقی کی طرف ہوتی ہے اسی طرح آلہ اور ان تمام چیزوں کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوتی ہے جن کا کہ

﴿لَوْ تَسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ﴾ (۴-۴۲) کہ کاش ان کو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی۔

میں مذکور ہے اور یہ کفار کے اس قول کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت: ﴿وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا﴾ (۷۹-۴۰) اور کافر کہے گا: اے کاش! میں مٹی ہوتا۔ میں مذکور ہے۔

مَكَانٌ سُوءٍ وَسَوَاءٌ كَالسُّوءِ وَمَعْنَى وَسَوَاءٌ كَالسُّوءِ هِيَ - اور سَوَاءٌ وَسُوءٌ وَسَوَاءٌ: اسے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سَوَاءٌ وصف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور طرف بھی۔ لیکن اصل میں یہ مصدر ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي سَوَاءِ الْجَحِيمِ.....﴾ (۳۷-۵۵) (تو اس کو) وسط دوزخ میں۔

﴿سَوَاءَ السَّبِيلِ.....﴾ (۲-۱۰۸) (تو وہ) سیدھے راستے سے۔

﴿فَأَنبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ﴾ (۸-۵۸) تو (ان کا عہد) انہی کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔

تو یہاں عَلَىٰ سَوَاءٍ سے عادلانہ حکم مراد ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (۳-۱۴) (اے اہل کتاب!) جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ۔

اور آیات:

﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ﴾ (۲-۶) انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ (۲-۶) انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔

لحاظ سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا.....﴾ (۱۹-۱۰) سالم تین رات اور دن.....

﴿مَنْ أَضْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ﴾ (۲۰-۱۳۵) (دین کے) سیدھے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔

اور رَجُلٌ سَوِيٌّ: اس مرد کو کہا جاتا ہے جس میں خلق و خلقت دونوں اعتبار سے اعتدال پایا جائے اور افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ اور آیت:

﴿عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ.....﴾ (۷۵-۴) ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی پور پور درست کر دیں۔

میں تَسْوِيَةُ الْبَنَانِ سے مراد تھیلی کو اونٹ کے پاؤں کی طرح بنا دینا مراد ہے کہ اس کی انگلیاں نہ ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ تَسْوِيَةُ الْبَنَانِ سے تمام انگلیوں کو یکساں بنا کر بے کار کر دینا مراد ہے کیونکہ انگلیوں کے قدر و ہیبت میں متفاوت ہونے کی حکمت ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں کسی چیز کے پکڑنے میں باہم تعاون کرتی ہیں اور اگر وہ سب برابر ہوتیں تو یہ تعاون ناممکن تھا اور آیت:

﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَحَسَوْهَا﴾ (۹۲-۱۴) تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا، سب کو (ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔

میں سَوَاءٌ سے ان کے شہروں کو برباد کر کے زمین کے ساتھ برابر کر دینا مراد ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا﴾ (۲-۲۵۹) جو کہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہوئی تھیں۔

اور بعض نے فسوآھا کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ان کے شہروں کو ان پر برابر کر دیا جیسا کہ آیت:

سیسی کی جمعِ اسواء آتی ہے جیسے نَقَضُ کی جمع انْقَاضٌ اور بہت سے ہم مرتبہ یا برابر کے لوگوں کے لئے قَوْمٌ اسواءٌ وَمُسْتَوُونَ کہا جاتا ہے۔

الْمَسَاوِةُ: عرف میں ٹھنی اشیاء کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے هَذَا الثَّوْبُ يُسَاوِي كَذَا كَرَسِيٍّ اس کپڑے کی اتنی قیمت ہے اصل میں یہ سَاوَاهُ فِى الْقَدْرِ یا مرتبہ میں برابر ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ﴾ (۱۸-۹۶)
جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کر دیا۔

(س و ۵)

السُّوءُ: ہر وہ چیز جو انسان کو نغم میں مبتلا کر دے اسے سوء کہا جاتا ہے خواہ وہ امور دنیوی کے قبیل سے ہو یا اخروی کے۔ اور عام اس سے کہ اس کا تعلق احوال نفسانیہ سے ہو یا بدنیہ سے یا ان امور خارجہ سے ہو جن کا تعلق جاہ و جلال کے چلے جانے یا کسی قریبی رشتے دار یا دوست کے فوت ہو جانے سے ہوتا ہے اور آیت:

﴿بَيضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ﴾ (۲۰-۲۲) وہ کسی عیب کے بغیر (چمکتا دمکتا) نکلے گا۔

میں سوء سے مراد آفت یعنی بیماری ہے بعض نے سُوءٌ سے برص مراد لی ہے لیکن یہ منجملہ ان امراض کے ایک ہے

لَهُمْ ﴿۶۳-۳﴾ تم ان کے لئے مغفرت مانگو یا نہ مانگو ان کے حق میں برابر ہے۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرُ غَنَاءِ أَمْ صَبْرَانَا﴾ (۱۳-۲۱) اب ہم گھبراہٹیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

میں سَوَاءٌ سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں عدم نفع میں برابر ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿سَوَاءٌ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ﴾ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔

اور کبھی سَوِيٌّ وَسَوَاءٌ بمعنی غیر (حرف استثناء) بھی آجاتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۵۱) قَلَمٌ يَبْقَىٰ مِنْهَا سَوِيٌّ هَامِدٌ

جسم مردہ کے سوا ان میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔^② (الطویل)

(۲۵۲) وَمَا قَصَدَتْ مِنْ أَهْلِهَا لِسَوَائِكَا:

اور اس اونٹنی نے اس شہر کے اہل میں سے تیرے سوا کسی کا قصد نہیں کیا۔

وَعِنْدِي رَجُلٌ سَوَاكُ: تیرے علاوہ میرے پاس دوسرا آدمی ہے۔

السِّي: کے معنی مساوی کے ہیں۔ جیسے عَدْلٌ بمعنی مُعَادِلٌ اور قِتْلٌ بمعنی مُقَاتِلٌ کے آجاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے:

سَيَانٌ زَيْدٌ وَعَمْرٌو زَيْدٌ اور عمرو دونوں برابر ہیں۔ اور

① لم أجده ويرجى.

② البيت من قصيدة لاعشى ميمون مدح بها هودة بن علي بن ثمامه رئيس اليمامة وصدرة: تحائف عن جواليمامة ناقتى وفى رواية اللسان والتاج (سوى) عدلت بدل قصدت وفى رواية ابن الشحرى (۱: ۳۵۰) جل اليمامة بدل اليمامة وفى الخزانة (۳: ۳۹۹) عمدت بدل قصدت والبيت أيضاً فى اللسان (جحف) وامالى ابن الشحرى (۲: ۴۵، ۲۵۳) وشرح الديوان لثعلب ۶۴ وابن ولاد ۶۲ والاشباه (۳: ۶۹۰) وديوانه ۱۳۱ والكامل ۱۱۸ والبحر (۱: ۴۹۸) والصاحي ۱۵۴ وشرح شواهد للشنتمرى (۱: ۱۳) والكتاب (۱: ۲۰۳) والبلدان (جو) واضداد ابى الطيب ۳۵۸ وفيه تراور بدل تبجانف واضداد ابن الانبارى وفى روايته عدلت بدل قصدت والبيت من شواهد النحاة على ان لفظه سواء قد يكون اسماً بمعنى غير وفيه بحث ۱۲.

﴿فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا وَعَمِلُوا﴾ (۱۶-۳۴)
 ﴿إِذْفَعُ بِالنِّسَاءِ هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةِ﴾ (۲۳-۹۶) اور
 بری بات کے مقابلہ میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔
 اور حدیث میں ہے۔ ﴿(۱۸۶)﴾

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا حَسَنَاتِ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۱۰۱-۲۴)
 برائی کے بعد نیکی کرو جو نیکی برائی کے اثر کو مٹا ڈالے گی۔
 حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو عقل اور
 شریعت دونوں کی رو سے بھلی یا بری ہو۔ چنانچہ اس معنی
 کے لحاظ سے فرمایا:

﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَمَنْ
 جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا﴾ (۶-۱۶۱)
 جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی
 دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی
 ملے گی۔

دوسری حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ وہ ہے جو باعتبار طبیعت کے
 ہے یعنی وہ چیزیں جو طبیعت کو سبک یا گراں محسوس ہوتی
 ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا جَاءَ تَهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَذِهِ وَإِنْ
 تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ﴾ (۷-۷)
 (۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس
 کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے
 رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔

﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ﴾ (۷-۹۵) پھر
 ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔
 اور سَاءَ فِي كَذَا وَسُوَّتَيْ كَمَا جَاءَتْ - اور آسائش

جو ہاتھ لوگ جاتے ہیں اور (عذاب) اخروی کے متعلق فرمایا:
 ﴿إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾
 (۱۶:۲۳) ان کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔
 اور ہر وہ چیز جو قبیح ہو اسے ”سُوْأَى“ سے تعبیر کرتے
 ہیں۔ اسی لئے یہ لفظ ”الْحُسْنَى“ کے مقابلہ میں آتا
 ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:
 ﴿ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ آسَأُوا السُّوءَ﴾ (۳۰-۱۰)
 (۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی انکا انجام بھی برا ہوا۔
 جیسے اس کے مقابلہ میں فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ﴾ (۱۰-۲۶)
 جن لوگوں نے نیکو کاری کی ان کے لئے بھلائی ہے اور
 مزید برآں اور بھی۔
 اور سَيِّئَةٌ کے معنی برائی کے ہیں اور یہ حَسَنَةٌ کی ضد ہے
 قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ (۲-۸۱) ہاں! جو برے
 کام کرے۔۔

﴿لَمْ تَسْتَعِجَلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ (۲۷-۲۷)
 (۲۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی کرتے
 ہو۔

﴿يُدْهِبَنَّ السَّيِّئَاتِ﴾ (۱۱-۱۱۳) گناہوں کو دور کر دیتی
 ہے۔

﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ
 مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ﴾ (۳-۷۹) (۱) آدم زاد!
 تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان
 پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔

۱ وفی روایۃ قالہ لابی ذر وبعده وخالق الناس بخلق حسن وایضاً بمعاد راجع ابن اللاتیرج (۲ ص ۶۶۴)۔

﴿سَيِّئَتْ وَجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۶۷-۶۷) (تو)
کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

میں سَيِّئَتْ کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ وزن
دروار کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور آیت:

﴿سَيِّئَآءَ بِهِمْ وَصَاقَ بِهِمْ ذُرْعًا﴾ (۱۱-۷۷) (تو وہ
(ان کے آنے سے) غم ناک اور متعطل ہوئے۔

یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے
اسے صدمہ لاحق ہوا اور فرمایا:

﴿لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ﴾ (۱۳-۱۸) ایسے لوگوں کا
حساب بھی برا ہوگا۔

﴿وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾ (۱۳-۳۵) اور ان کے لئے
گھر بھی برابر ہے۔

اور کنایہ کے طور پر سُوءٌ كَالْفَرْعِ عَوْرَتِ يَامْرَأَتِ شَرِّ مَرَاةٍ
بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَيْفَ يُؤَارِي سُوءَ آخِيهِ﴾ (۵-۳۱) اپنے بھائی
کی لاش کو کیونکر چھپائے۔

﴿فَأُوَارِي سُوءَ آخِيهِ﴾ (۵-۳۱) کہ اپنے بھائی کی
لاش چھپا دیتا۔

﴿يُوَارِي سَوَاتِكُمْ﴾ (۷-۲۶) کہ تمہارا ستر
ڈھانکے۔

﴿بَدَّتْ لَهُمَا سَوَاتِهِمَا﴾ (۷-۲۲) تو ان کے ستر کی
چیزیں کھل گئیں۔

﴿لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوَاتِهِمَا﴾
(۷-۲۰) تاکہ ان کے ستر کی چیزیں جو ان سے پوشیدہ

تھیں کھول دے۔



إِلَىٰ فُلَانٍ (بصلہ الی) بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن
پاک میں ہے:

﴿سَيِّئَتْ وَجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا.....﴾ (۶۷-۶۷)
تو کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔

﴿لَيْسُوا وَا وَجُوهُكُمْ﴾ (۷-۷۷) تاکہ تمہارے
چہروں کو بگاڑیں..... اور آیت:

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزِيهِ﴾ (۳-۱۲۳) جو شخص
برے عمل کرے گا اسے (اسی طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔

میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:

﴿زَيْنٌ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ﴾ (۹-۳۷) ان کے
برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور آیت:

﴿عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ﴾ (۹-۹۸) انہیں پر بری
مصیبت (واقع) ہو۔

میں دَائِرَةُ السَّوْءِ: سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جو انجام
کار غم کا موجب ہو اور آیت:

﴿وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ (۳-۱۱۵) اور وہ بری جگہ ہے۔
﴿سَاءَتْ مُسْتَقْرَأًا﴾ (۲۵-۲۶) (دوزخ) ٹھہرنے کی

بری جگہ ہے۔ میں بھی یہی معنی مراد ہے۔
اور کبھی سَاءَ بِنَسْ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ یعنی معنی ذم
کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ﴾
(۷۷-۳۷) مگر جب وہ ان کے مکان میں آتے گا۔

تو جن کو ڈر سنایا گیا تھا ان کے لئے برادن ہوگا۔ ﴿سَاءَ
مَا يَعْمَلُونَ﴾ (۵-۶۶) ان کے عمل برے ہیں۔
﴿سَاءَ مَثَلًا.....﴾ (۷-۷۷) مثال بری ہے۔

اور آیت:

کتاب الشین

چلتے ہیں۔

میں ان کے قلوب کا گمراہی اور جہالت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے۔ اور آیت:

﴿وَأَخْرَجْنَا مَثَابَهُت﴾ (۳-۶) اور بعض متشابہ ہیں۔ میں مَثَابَهُت سے مراد وہ آیات ہیں جن کی لفظی یا معنوی مماثلت کی وجہ سے تفسیر بیان کرنا مشکل ہو۔ عام فقہاء کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری معنی سے مقصود کا علم نہ ہو سکے۔

اصل میں آیات تین قسم پر ہیں۔

(۱) بعض علی الاطلاق محکم ہیں۔

(۲) بعض علی الاطلاق متشابہ ہیں۔

(۳) اور بعض من وجہ محکم اور من وجہ متشابہ ہیں۔

پھر متشابہات بھی تین قسم پر ہیں۔

متشابہ بلحاظ لفظ، متشابہ بلحاظ معنی اور متشابہ بلحاظ لفظ و معنی اور متشابہ بلحاظ لفظ پھر دو قسم پر ہے ایک وہ تشابہ جو الفاظ

مفرده میں ہوتا ہے۔ دوم وہ جو کلام مرکب میں پایا جاتا

ہے۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت الفاظ کے ہوگا

جیسے آبٌ وِيزِفُونٌ کے دونوں غریب معنی ہیں اور یا بوجہ

لفظ کے مشترک ہونے کے، جیسے يَسَدٌ وِعَيْنٌ کہ یہ دونوں

مختلف معانی کے لئے موضوع ہیں اور کلام مرکب

میں تشابہ تین قسم پر ہے۔

بوجہ اختصار، جیسا کہ آیت: ﴿وَأَنْ خِفْتُمْ أَلَّا

(ش ب ہ)

الشيبة والشبه والشبيه کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں مماثل ہونا یا عدل و ظلم میں اور دو چیزوں کا حسی یا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو سکیں شبہة کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:

﴿وَأَتُوا بِهِ مَثَابَهُت﴾ (۲-۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔ میں مَثَابَهُت کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔ بعض کے نزدیک کمال اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿مَثَابَهُتٌ غَيْرٌ مَثَابِهِ﴾ (۶-۱۰۰) جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

میں ایک قرأت مَثَابَهُت ہے مگر دونوں کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں اور آیت کریمہ:

﴿أَنَّ الْبَقْرَ تَشَابَهُ عَلَيْنَا﴾ (۲-۷۰) کیونکہ بہت سے تیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

میں تَشَابَهُ فعل ماضی مذکر کا صیغہ بھی ہو سکتا ہے اور تَشَابَهُ فعل مضارع مؤنث بھی جو اصل میں تَشَابَهُ ہے اور تاء شین میں مدغم ہے۔ اور آیت: ﴿تَشَابَهُتٌ

قُلُوبُهُم﴾ (۲-۱۱۸) ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے

ہو جائے چنانچہ فرمایا:

﴿اَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ﴾ (۹-۵) تو مشرکوں کو..... قتل کر دو۔

دوم: بلحاظ کیفیت کے مثلاً کسی حکم کے واجب یا مندوب

ہونے میں شک و شبہ پایا جاتا ہو چنانچہ فرمایا:

﴿فَاَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ﴾ (۳-۴) تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔

سوم: بلحاظ زمانہ کے یعنی کسی آیت کے ناخ یا منسوخ

ہونے میں تشابہ پایا جاتا ہو جیسے فرمایا:

﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ (۳-۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

چہارم: تشابہ بلحاظ مکان اور اسباب نزول کے جیسے فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا﴾ (۲-۱۸۹) اور یہی اس بات میں نہیں ہے کہ تم (احرام کی حالت) میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔ ﴿اِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ﴾ (۹-۳۷) مہینے کو پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ جو شخص ان کے رسم و رواج اور جاہلی عادات سے واقف نہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر کو نہیں سمجھ سکتا۔

پنجم: وہ تشابہ جو کسی فعل کے صحت و فساد کی شرط کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز اور نکاح کی شرط نہ جاننے سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔

الغرض تشابہ کے یہ چند اقسام ہیں جن کا تصور کر لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ مفسرین نے تشابہ کی جتنی بھی تشریحات بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی مندرجہ بالا اقسام سے خارج نہیں ہے۔ مثلاً بعض کا قول ہے کہ الم

تُقَسِّطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ (۴-۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ (یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں..... ان سے نکاح کر لو۔

دوسرے بوجہ بطل کلام کے، جیسے فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (۲۲-۱۱) اس جیسی کوئی بھی چیز نہیں۔

کیونکہ اگر یہاں کاف نہ بڑھایا جاتا اور لَيْسَ مِثْلَهُ شَيْءٌ کہا جاتا تو مطلب زیادہ صاف اور واضح ہو جاتا۔

تیسرے وہ اشتباہ جو ترتیب کلام میں تفسیر کی وجہ سے پیدا جاتا ہے جیسا کہ آیت:

﴿اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهٗ عِوَجًا قَيِّمًا﴾ (۱۸-۲۰) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر اپنی کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں رکھی (بلکہ) سیدھی، (اور سلیس اتاری) یہ اصل ترتیب کے لحاظ سے قَيِّمًا وَلَمْ يَجْعَلْ لَهٗ عِوَجًا تھا۔ نیز فرمایا:

﴿لَوْ لَا رَجَالٌ مُّؤْمِنُونَ..... النّٰیٰ قَوْلَهُ..... لَوْ تَزَيَّلُوا﴾ (۲۸-۲۵) اور اگر ایسے مرد اور (عورتیں) نہ ہوتیں..... اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے۔

تشابہ بلحاظ معنی جیسے صفات باری تعالیٰ اور احوال قیامت کہ یہ اوصاف نہ محسوس ہیں اور نہ محسوسات کی جنس سے ہیں اور جو چیز محسوس یا اس کی جنس سے نہ ہو اس کا تصور ہمارے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ اور تشابہ من حیث اللفظ والمعنی کی پانچ قسمیں ہیں اول تشابہ بلحاظ کیت کے مثلاً کسی حکم کے عام یا خاص ہونے کے متعلق شبہ پیدا

ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا﴾
(۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں
(یعنی) کتاب (جس کی آیتیں) ملی جلی ہیں۔

میں مُتَشَابِهًا کے معنی یہ ہیں کہ احکام حکمت اور استقامت نظم
کے لحاظ سے قرآن مجید کی تمام آیات ایک جیسی ہیں اور
آیت کریمہ:

﴿وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (۳-۱۵۷) بلکہ ان کو ان کی سی
صورت معلوم ہوئی۔

میں شُبِّهَ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا شخص
مسح علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا تھا جسے انہوں نے مسیح سمجھ
(کرتل کر دیا تھا)

الشَّبَّهُ: (پتیل) جو اہر میں سے اسے کہا جاتا ہے جس کا
رنگ سونے کے مشابہ ہوتا ہے۔

(ش ت ت)

الشَّتُّ کے معنی قبیلہ کو متفرق کر نیکیے ہیں۔ محاورہ
ہے۔

شَتَّ جَمْعُهُمْ شَتًّا وَشَتَاتًا: ان کی جمعیت متفرق
ہو گئی۔ جَاءَ وَاشْتَاتَا: وہ پراگندہ حالت میں آئے۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَصُدُّرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا﴾ (۹۹-۶) اس دن
لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔
﴿مِنْ نِّبَاتٍ شَتَّى﴾ (۲۰-۵۳) (یعنی انواع

(حروف مقطعات) تشابہات سے ہے اور قوادہ نے کہا
ہے کہ تاخ محکم ہیں اور منسوخ تشابہ میں داخل ہیں اور
الاصم کا قول ہے کہ جس آیت کی تفسیر متفق علیہ ہو وہ محکم
اور جس کی تفسیر میں اختلاف ہو وہ تشابہ ہے پھر جملہ
تشابہات تین قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کا علم ہمارے لئے
ناممکن ہے جیسے قیامت کا وقت اور ولایت الارض کا خروج اور
اس کی کیفیت وغیرہ۔ دوم وہ جن کا علم ہمیں ہو سکتا ہے۔

جیسے الفاظ غریبہ اور احکام مشکلہ۔ سوم وہ جو ان دونوں کے
بین بین ہیں۔ جن کا علم صرف راہنہ فی العلم کو ہی
ہو سکتا ہے ہر ایک کے لئے ان تک رسائی ممکن نہیں۔ اسی
قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: (۱۸۷) ((اَللّٰهُمَّ
فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَعَلِّمْهُ التَّوْبِيلَ)) کہ اے اللہ!
اسے دین میں سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما یہی دعا
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی مروی ہے۔^۱

(۱۸۸) پس اس بحث کے پیش نظر رکھ لینے سے یہ حقیقت
واضح ہو جاتی ہے کہ آیت کریمہ:

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي
الْعِلْمِ﴾ (۳-۷) حالانکہ مراد، اصلی خدا کے سوا کوئی
نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ میں
اِلَّا اللّٰهُ پر بھی وقف صحیح ہے اور الرَّاسِخُونَ کے ساتھ
ملا کر پڑھنا بھی جائز ہے اور ہر ایک یعنی وقف اور وصل کی
ایک خاص وجہ ہے جو مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہو سکتی

^۱ واما دعاءه صلى الله عليه وسلم لابن عباس فمعمروف (متفق عليه) من حديث ابن عباس دون قوله "وعلمه التاويل" فانه اخرجه
بهذه الزيادة احمد وابن حبان والحاكم وصححه (تخريج العراقي على الاحياء (۲: ۲۴) وفي رواية الترمذى لابن عباس: اللهم علمه
الحكمة (۲۲۲: ۳) مع التحفة ۱۲.

واقسام) کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

شَجَرَةٌ جیسے ثَمْرٌ وَ ثَمْرَةٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَذْيَابُهُمْ شَتَّى﴾ (مگر) ان کے دل

مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔۔

﴿أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا﴾ (۷۲-۵۶) کیا تم نے

اس کے درخت کو پیدا کیا۔

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۶-۵۵) اور

بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔

﴿مِنْ شَجَرٍ مِنْ زَقُومٍ﴾ (۵۲-۵۶) تھوہر کے

درخت سے۔

﴿إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُومِ﴾ (۴۳-۴۳) بلاشبہ تھوہر کا

درخت۔

وَإِدْ شَجِيرٌ: گنجان درختوں والی وادی۔ بہت درختوں

والی جگہ۔

هَذَا الْوَادِي أَشَجَرٌ مِنْ ذَلِكَ: اس وادی میں اس

سے زیادہ درخت ہیں۔

الشَّجَارُ وَالْمَشَاجِرُ وَالشَّجَرُ: باہم جھگڑنا اور

اختلاف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيَمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ (۶۵-۳) اپنے تنازعات

میں۔

شَجَرْنِي عَنْهُ: مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک

دیا۔ حدیث میں ہے۔ ﴿(۱۸۹)﴾ فَإِنْ اشْتَجَرُوا

فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهُ: اگر تنازع ہو جائے تو

جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے۔

﴿وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى﴾ (۱۳-۵۹) (مگر) ان کے دل

پھٹے ہوئے ہیں۔

یعنی ان کی حالت مسلمانوں کی حالت کے برعکس ہے جن

کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ﴾ (۶۳-۸) مگر خدا ہی

نے ان میں الفت ڈال دی۔

شَتَّانٌ: یہ اسم فعل بروزن و شَكَّانٌ ہے۔ محاورہ ہے۔

شَتَّانَ مَا هُمَا وَشَتَّانَ مَا بَيْنَهُمَا ان دونوں میں کس

قدر بعد اور تفاوت ہے۔

ش ت و

قرآن مجید میں ہے:

﴿رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۲-۱۰۶) (یعنی) ان

کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب۔

اور شَتَّى اور اَشْتَى کے معنی کسی جگہ موسم سرما گزارنے

یا موسم سرما میں داخل ہونے کے ہیں۔ جیسے صَاف

وَاصَاف کے معنی موسم سرما گزارنے یا موسم گرما میں

داخل ہونے کے ہوتے ہیں۔

الْمَشْتَى وَالْمَشْتَا (جاڑے کا زمانہ) اسم ظرف ہے اور کبھی

مصدر بن کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے: ﴿

(۲۵۳) نَحْنُ فِي الْمَشْتَا تَدْعُوا الْجَفَلِي

ہم موسم سرما یعنی قحط سالی میں و عدت عام دیتے ہیں۔

ش ج ر

الشَّجَرُ: (درخت) وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد

① قاله عشرة وتامه: لاترى الأدب فيها ينتقر والبيت في الكامل (۲: ۷۷۸) وديوانه ۶۸ واللسان (جفل، نفر، ادب) والافتضاب ۳۴۶ والبخلاء ۳۱۶ واصلاح يعقوب ۳۸۱ والمرتضى في اماليه (۱: ۳۵۴) ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۲۴۴) وابن دلاو ۱۲ وتهذيب الانفاظ (۶۱۴ رقم ۴۹۰) والعقد الثمين ۶۲ والمعاني للقتبي ۳۷۷.

② اخرج ابن حبان في زوائله من حديث عائشة رقم ۲۴۷ وفي البارقظي عنها بلفظة: فان اشجروا بادل تشاجروا (راجع النيل (۶: ۱۲۴-۱۲۵))

شَحْمَةُ الْأُذُنِ: کان کا نرم حصہ جس میں بالیاں پہنی جاتی ہیں۔ یہ نرم ہونے کے لحاظ سے چونکہ چربی جیسا ہوتا ہے اس لئے اسے شَحْمَةُ کہا جاتا ہے اور شَحْمَةُ الْأَرْضِ: (کیچوا) گرگٹ کی قسم کا ایک جانور، جو زمین یا ریت میں گھس کر رہتا ہے۔

رَجُلٌ مُشْحَمٌ: گھر میں بہت زیادہ چربی رکھنے والا۔ شَحْمٌ: چربی کھانے کا حریص۔ لیکن جو اپنے دوستوں کو بہت چربی کھلانے والا ہو اسے شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ اور شَحِيمٌ کے معنی مٹے تازے اور چربی دار کے ہیں۔

(ش ح ن)

الشَّحْنُ: کشتی یا جہاز میں سامان لا دینا، بھرنانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فِي الْفُلِّ الْمَشْحُونِ﴾ (۱۱۹-۲۶) بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے۔ الشَّحْنَاءُ: کینہ و عداوت جس سے نفس پُر اور بھرا ہوا ہو۔ عَدُوٌّ مُشَاحِنٌ: بہت سخت دشمن گویا وہ دشمنی سے پُر ہے۔ اشْحَنَ لِلْبُكَاءِ: غم سے بھر کر رونے کے لئے آمادہ ہونا۔

(ش خ ص)

(الشَّخْصُ) کھڑے انسان کا جسم جو دور سے نظر آئے اسے شَخْصٌ کہا جاتا ہے اور شَخْصٌ مِنْ بَلَدِهِ کے معنی شہر سے چلے جانا کے ہیں۔ شَخْصَ بَصْرُهُ: اس کی آنکھ پتھرا گئی۔ شَخْصَ سَهْمُهُ: تیر نشانے سے اونچا نکل گیا۔ اور اشْحَصَ (افعال) اس نے نشانے سے اونچا نکال دیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ﴾ (۱۳-۲۴) جب کہ

الشَّجَارُ: ہودہ کی لکڑی، چھوٹی پاکی۔ الْمَشْجَرُ: لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔ شَجَرَةٌ بِالرَّمْحِ: اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مار کر اسی میں چھوڑ دیا۔

(ش ح ح)

الشُّحُّ: (اسم) کے معنی حرص کے ساتھ بخل کے ہیں جو انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَحْضَرْتَ الْأَنْفُسَ الشُّحَّ﴾ (۱۲۸-۳) اور طبائع تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

﴿وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ﴾ (۹-۵۹) اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا۔

رَجُلٌ شَحِيحٌ: بخیل آدمی۔ قَوْمٌ أَشْحَةٌ: بخیل لوگ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَشْحَةٌ عَلَى الْخَيْرِ﴾ (۹-۳۳) مال میں بخل کریں۔ ﴿أَشْحَةٌ عَلَيْكُمْ﴾ (۱۹-۳۳) (یہ اس لئے کہ)

تمہارے بارے میں بخل کرتے ہیں۔

خَطِيبٌ شَحِيحٌ: خوش بیان اور بلیغ لیکچرار یہ شَخْشَ الْبَعِيْرُ فِي هَدْيِهِہ کے محاورہ ہے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے مستی میں آواز کو پھرانے کے ہیں۔

(ش ح م)

الشَّحْمُ: (چربی ج شَحْمُومٌ) قرآن مجید میں ہے: ﴿حَرَمْنَا عَلَيْهِمْ شَحْمَهُمَا.....﴾ (۱۳۷-۲) انکی چربی حرام کر دی تھی۔

﴿وَأَنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾ (۱۰۰-۸) اور وہ تو مال کی سخت محبت والے ہیں۔

یہاں شَدِيدٌ بمعنی مفعول بھی ہو سکتا ہے۔ گویا وہ خرچ کرنے سے باندھ دیا گیا ہے کہ اس معنی میں غُلٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ﴾ (۵-۶۳) یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہی کے ہاتھ باندھے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شَدِيدٌ بمعنی فاعل کے ہو تو گویا مُتَشَدِّدٌ وہ ہے جس نے تھیلی کو (بوجر بخیل کے) مضبوطی سے باندھ رکھا ہوا۔ اور آیت کریمہ:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً﴾ (۴۶-۱۵) یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جب انسان اس عمر یعنی چالیس (برس کو پہنچ جاتا ہے) جس میں اس کے قوی مضبوط ہو جاتے ہیں تو اس کی عادات پختہ ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں ترک نہیں کر سکتا شاعر نے کیا ہی خوب اشارہ کیا ہے۔ ﴿۵۵، ۲۵۴﴾

وَإِذَا الْمَرْءُ وَافَى الْأَرْبَعِينَ وَلَمْ يَكُنْ
لَهُ دُونَ مَا يَهْوَى حَيَاءٌ وَلَا سِتْرٌ
فَدَعَهُ وَلَا تَنْفُسَ عَلَيْهِ الَّذِي مَضَىٰ
وَأِنْ جَرَّ سَبَابَ الْحَيَاةِ لَهُ الْعُمْرُ

(دہشت کے سبب) آنکھ کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔

﴿شَاحِصَةً أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۲۱-۹۷) کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(ش د ن)

الشَّدُّ یہ شَدَدْتُ الشَّيْءِ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنی مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَشَدَدْنَا آسْرَهُمْ﴾ (۷۶-۲۸) اور ان کے مفاصل کو مضبوط بنایا۔

﴿شُدُّوا النُّوْثَاقِ﴾ (۴۷-۲۸) ان کی مضبوطی سے قید کر لو۔

اور شِدَّةٌ کا لفظ عہد، بدن، قوائے نفس اور عذاب، سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ (۵-۴۳) وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔

﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى﴾ (۵۳-۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا۔

نہایت قوت والے سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ ﴿۶۲-۶﴾ تند خو اور سخت مزاج

(فرشتے)

﴿بِأَسْهُمٍ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ﴾ (۵۹-۱۳) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

الشَّدِيدُ وَالْمُتَشَدِّدُ: بخیل۔ قرآن پاک میں ہے:

۱ فی سبعة آیات نسبتها القالی ۱۷۷ الی ایمن بن حریم بن فاتک الاسدی قال البکری ۲۶۱ والصحيح انها لاقيش مغيرة بن اسود من بنی اسد بن خزيمه وفي الوحشيات ۲۷۷ منسوبة لاعرابی نزل بيحيى بن جبريل - يقال من لم يرو هذه الايات فلأمروثة له انظر لتخرجه السمس ۲۶۱ والشعراء ۴۴۴ (تحقيق احمد شاكر) وفي رواية الوحشيات (الحماسة الصغرى) وفي بدل وافي ويأتي بدل بهوى واتى بدل مضى والدهر بدل العمر والبيت فى الروح آلوس (۶۲-۱۷).

برے لوگ۔ اَشْرَرْتُهُ: کسی کی طرف شرکی نسبت کرنا بعض نے کہا ہے کہ اَشْرَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔^①

(۲۵۶) إِذَا قِيلَ أَى النَّاسِ شَرُّ قَبِيلَةٍ

أَشْرَرْتُ كَلْبِيبٍ بِالْأَكْفِ الْأَصَابِعَا

جب یہ پوچھا جائے کہ کونسا قبیلہ سب سے برا ہے تو ہاتھ انگلیوں سے بنی کلیب کی طرف اشارہ کر دیتے مگر اس شعر کے علاوہ اس معنی پر اگر اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہاں اَشْرَرْتُ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہاتھ انگلیوں سے ان کی طرف شرکی نسبت کر دیتے ہیں۔

الشَّرُّ: (بضمہ الشین) شرمکروہ چیز۔ شَرَارُ النَّارِ: آگ کی چنگاری۔ آگ کی چنگاری کو شَرَارٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿تَرَوْنِي بِسَرِيرٍ كَأَنَّكَصْرٍ﴾ (۷۷-۳۲) اس سے آگ کی (اتی اتی بوی) چنگاریاں اڑتی ہیں جیسے گل۔

(ش ر ب)

الشَّرْبُ: کے معنی پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

﴿وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا﴾ (۷۲-۲۱) اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

جب انسان چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور اسے اس کی خواہش سے حیا کا پردہ مانع نہ ہو تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دے اور گزشتہ پر کسی قسم کا دروغ نہ کر اگرچہ عمر اس کے لئے زندگی کے تمام اسباب کھینچ کر کیوں نہ لے آئے۔

شَدَّ فُلَانٌ وَاشْتَدَّتْ تیزی سے چلنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شَدَّ جِزَامَةً لِلْعَدُوِّ کے محاورہ سے مشتق ہو جس کے معنی دوڑنے کے لئے کمر بستہ ہونے کے ہیں جیسا کہ اسی معنی میں اَلْقَى ثِيَابَهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اشتدَّتِ الرِّيحُ کے محاورہ سے ماخوذ ہو جس کے معنی زور کی ہوا چلنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ﴾ (۱۳-۱۸) کہ اس پر زور کی ہوا چلے۔

(ش ر ر)

الشَّرُّ: وہ چیز ہے جس سے ہر ایک کراہت کرتا ہو۔ جیسا کہ خیر اسے کہتے ہیں جو ہر ایک کو مرغوب ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا﴾ (۱۹-۷۵) کہ مکان کس کا برا ہے۔ ﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضَّمُّ﴾ (۸-۲۲) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے..... ہیں۔

شر کا اصل معنی اور اس کے جملہ اقسام خیر کی بحث میں بیان ہو چکے ہیں۔

رَجُلٌ شَرِيْرٌ وَشَرِيْرٌ: شریر آدمی وَقَوْمٌ أَشْرَارٌ:

① قاله الفسزوق في محو جرير ولفظه كليب بالجرعلى حذف الحار وبقاء عمله وبيروني بالرفع على تقدير هذه كليب فقي البيت حذف وقلب واصله: اشرت الاكف بالاصابع الى كليب وفي رواية اشارت والبيت في ابن عقيل رقم (۲۱۸) والخزانة (۳: ۶۶۹) وديوانه ۵۲۰ والمعنى ۳ في الخطبة والسبوطي ۴ والعيني (۲: ۵۴۲) وكليب هي كليب بن يربوع قبيلة جريري.

ہے۔ ہڈلی نے گورخ کے متعلق کہا ہے۔ ﴿(اکال)﴾

(۲۵۷) ”صَحْبُ الشَّوَارِبِ لَا يَزَالُ كَاثَةً“

اس کی موٹھیں سخت گویا وہ.....

اور آیت کریمہ:

﴿وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ (۲-۹۳) اور

ان (کے کفر کے سبب) پھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَشْرَبْتُ البَعِيرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گلے میں ری

باندھنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿

(۲۵۸) وَأَشْرَبْتُمَا الْآفْرَانَ حَتَّى وَقَصْتُمَا

بِقُرْحٍ وَقَدْ أَلْقَيْنَ كُلَّ جَنِينِ

میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتیٰ کہ قُرْح (منڈی) میں لا ڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرا دیئے تھے۔ تو

آیت کے معنی یہ ہیں کہ گویا پھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ پھڑے کی

محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے

تو اس کے لئے لفظ شَرَابٌ کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(الوافر)﴾

اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:

﴿لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ.....﴾ (۶-۷۰) ان

کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

شَرَابٌ کی جمع اَشْرِبَةٌ ہے اور شَرِبْتُهُ شَرَبًا وَشَرَبًا کے معنی پینے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي إِلَىٰ قَوْلِهِ

فَشَرِبُوا مِنْهُ﴾ (۲-۲۳۹) جو شخص اس میں سے پانی پی

لے گا وہ مجھ سے نہیں ہے چنانچہ انہوں نے اس سے پی

لیا۔ نیز فرمایا:

﴿هَذَا نَاقَةٌ لَّهَا شَرِبٌ وَلَكُمْ شَرِبٌ يَوْمَ

مَعْلُومٍ﴾ (۲۶-۱۵۵) یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی

پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔

﴿كُلُّ شَرِبٍ مُحْتَضَرٌ﴾ (۵۳-۲۸) ہر باری والے

کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔

الْمَشْرَبُ: (مصدر) پانی پینا (ظرف زمان یا مکان پانی

پینے کی جگہ یا زمانہ) قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ (۲-۶۰) تمام

لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر کے پانی پی لیا۔

الْشَّرِيبُ: ہم پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے

بالوں اور حلق کے اندرونی رگ کو شَرَابٌ کہا جاتا ہے گویا

ان کو پینے والا تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شَّوَارِبٌ آتی

① قاله ابو ذؤيب وتسامه - عبدالال ابى ربيعة مسيع - والبيت فى اللسان (سبع) وقد مر.

② انشده فى هذا المعنى ايضا ثعلب والبيت لبعض بنى اسد من اللصوص انظر محاسن ثعلب (۳۱۱) واللسان (شرب) والبلدان والمحکم (فرح) فى اربعة ابیات مع خلاف فى الترتيب والفرح اسم سوق وادى القرى وقصبتها والعائد زود الکلابى وقبله: لقد علمت ذورا الکلابى انتى ينهن باجواز الفلاة مهين والذو واسم جماعة من الابل اذا كانت اناثا.

③ قاله عبدالله بن عبدالله بن عتبة بن مسعود احد الفقهاء السبعة فى المدينة فى زوجته عثمة وله فيها اشعار كثيرة والبيت فى الحماسة مع المرزوقى رقم (۵۵۰) ومحاسن ثعلب ۲۸۴ وامالى المرتضى (۱: ۲۱۷-۴۰۰) والقالى (۳: ۲۱۹) فى خمسة والاغانى (۸: ۹۳) والسمط (۷۸۱) والحماسة بالنيرىزى (۳: ۱۶۷) والاصبهانى (۸ص ۹۴) والحصرى (۱: ۲۱۲) فى ثلاثة اشعار ومجموعة المعانى (۱۶۲) وعزاه فى المحاضرات (۳: ۴۴) الى ابى عبدالله بن طاهر وقبله: شقت القلب ثم ذرات فيه هواك فليم فالترام الفطور.

(ش رد)

شَرَدَ الْبَعِيرُ کے معنی ہیں: اونٹ بدک کر بھاگ نکلا۔ شَرَدَتْ فُلَانًا فِي الْبِلَادِ میں نے شہروں میں بھگا دیا و شَرَدْتُ بِهِ: یعنی میں نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام نہ کریں جیسے: نَحَلْتُ بِهِ کہ میں نے اسے دوسروں کے لئے عبرت بنا دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَشَرَّ ذَبِيهِمْ مَنْ خَلَفَهُمْ﴾ (۸-۵۷) تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہوں وہ ان کو دیکھ کر بھاگ جائیں۔

مشہور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ طَرِيْدٌ شَرِيْدٌ: فلاں راندہ درگاہ ہے۔

(ش ر ذ م)

اَلشَّرِيْمَةُ: تھوڑی سی جماعت جو لوگوں سے الگ ہوگئی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شَرِيْمَةٌ قَلِيْلُوْنَ﴾ (۲۶-۲۵) یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں۔

یہ ثَوْبٌ شَرَاذِمٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پھٹے پرانے چیتھڑوں کے ہیں۔

(ش ر ط)

اَلشَّرْطُ: وہ معین حکم جس کا وقوع کسی دوسرے امر پر معلق ہو اسے شرط کہتے ہیں۔ وہ دوسرا امر اس کے لئے بمنزلة علامت کے ہوتا ہے اور شَرِيْبٌ بمعنی شرط آتا ہے

(۲۵۹) تَغْلَغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابٌ
وَلَا حُزْنَ وَلَمْ يَبْلُغْ شُرُوْرٌ

اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن و سرور پہنچ سکتا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تنبیہ کی ہے کہ پھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہوگئی تھی کہ محو نہیں ہو سکتی تھی مثل مشہور ہے۔ اَشْرَبَ بِنَسِيٍّ مَا لَمْ اَشْرَبْ: یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔

(ش ر ح)

شَرَحْتُ اللَّحْمَ وَشَرَحْتُهُ کے معنی گوشت وغیرہ کے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ کر پھیلانے کے ہیں اور اسی سے شرح صدر ہے یعنی نور الہی اور سکون و الطمینان کی وجہ سے سینے میں وسعت پیدا ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ اَشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ (۲۰-۲۵) (کہا) اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (۹۳-۱۱) (اے محمدؐ) ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا؟

﴿اَقَمْنَ شَرَحَ اللّٰهِ صَدْرَهُ﴾ (۳۹-۲۲) بھلا جس کا سینہ اللہ نے..... کھول دیا ہو۔

شَرَحُ الْمَشْكَلِ مِنَ الْكَلَامِ کے معنی مشکل کلام کی تشریح کرنے اور اس کے مخفی معنی کو ظاہر کرنے کے ہیں۔

۱ و اشراط الساعة بمعنی العلامات او البیانات ثم الاشراف بمعنی العلامات علی نوعین وہی التی لم تبق الدنیا بعد وقوعها الا بامر یسر کخروج المهدی وظهور الدجال وخروج الدابة وطلوع الشمس من مغربها وغير ذلك وغير مضیقة وہی اکثر الاشراف راجع الفتح والفت فیہا کتب مختصرة و مطولة ولسیوطی رسالة سماها "الكشف" عن مجاوزة هذه الامة الالف وبحور الزاخرة فی علوم الاخرة للسفارینی .

بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴿۳۳﴾ اور ہر ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے دوسرا راستہ دین کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے مقرر فرمایا کہ انہیں حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس پر چلے جس کے بیان میں شراعی کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نسخ ہوتا رہا ہے اور جس پر کہ آیت:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾ (۳۵-۱۸) پھر ہم نے تمہیں دین کے کھلے راستے پر قائم کر دیا تو اسی (راستے) پر چلے چلو۔ دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ شَرَعَةٌ وہ راستہ ہے جسے قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔ اور مِنْهَا ج وہ ہے جسے سنت نے بیان کیا ہے اور آیت کریمہ:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ﴾ (۲-۱۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔

میں دین کے ان اصول کی طرف اشارہ ہے جو تمام مل میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ان میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ جیسے معرفت الہی اور وہ امور جن کا بیان آیت: ﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ﴾ (۳-۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور انکی کتابوں اور اس کے پیغمبروں سے انکار کرے۔ میں پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شریعت کا لفظ شَرِيْعَةٌ النَّمَاءِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پانی کے گھاٹ کے ہیں اور شریعت

اس کی جمع شرائط ہے۔ اِشْتَرَطْتُ كَذَا: کوئی شرط لگانا۔ اور اسی سے شَرَطٌ بمعنی علامت ہے۔ اور اَشْرَاطُ السَّاعَةِ کے معنی علامت قیامت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَقَدْ جَاءَتْ أَشْرَاطُهَا﴾ (۳۷-۱۸) سواس کی نشانیوں (وقوع میں) آچکی ہیں۔

اور پولیس کو شَرَطٌ کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بھی ایسی علامت لگالیتے ہیں جس سے ان کی پہچان ہو سکتی ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ شرائط الامل سے مشتق ہے جس کے معنی رذیل اونٹوں کے ہیں۔ اور پولیس میں بھی چونکہ (عام طور پر) رذیل لوگ ہوتے تھے اس لئے انہیں شَرَطٌ کہہ دیا گیا ہے۔

اَشْرَطَ نَفْسَهُ لِلْهَلَكَةِ: اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یا کسی کام میں ہلاکت کی بازی لگانا۔

(ش ر ع)

الشَّرْعُ: سیدھا راستہ جو واضح ہو، یہ اصل میں شَرَعْتُ لَهُ طَرِيقًا: (واضح راستہ مقرر کرنا) کا مصدر ہے اور بطور اسم کے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ واضح راستہ کو شَرْعٌ وَشَرِيْعَةٌ کہا جاتا ہے پھر استعارہ کے طور پر الہیہ پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شَرَعَةٌ وَمِنْهَا جَاءَ﴾ (۵-۲۸) ایک دستور اور طریق۔ اس میں دو قسم کے راستوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر کر رکھا ہے کہ انسان اسی راستہ پر چلتا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور شہروں کی آبادی سے ہے چنانچہ آیت:

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ

الشَّرْعُ: بربط کے وہ تار جن سے راگ شروع کیا جاتا ہے۔

(ش ر ق)

شَرَقَتْ (ن) شَرُوقًا الشَّمْسِ: آفتاب طلوع ہوا۔ مثل مشہور ہے (مثل)

لَا أَفْعَلُ ذَلِكَ مَا ذُرَّ شَارِقٌ وَأَشْرَقَتْ: جب تک آفتاب طلوع ہوتا رہے گا میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یعنی کبھی بھی نہیں کروں گا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِالْعِشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ﴾ (۱۸-۳۸) صبح اور شام۔ یہاں اشراق سے مراد وقت اشراق ہے۔

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ: جب مفرد ہوں تو ان سے شرقی اور غربی جہت مراد ہوتی ہے اور جب مشنہ ہوں تو موسم سرما اور گرما کے دو مشرق اور دو مغرب مراد ہوتے ہیں اور جمع کا صیغہ ہو تو ہر روز کا مشرق اور مغرب مراد ہوتا ہے یا ہر موسم کا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۹-۷۳) وہی مشرق اور مغرب کا مالک (ہے)

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۱۷-۵۵) وہی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک ہے۔۔

﴿وَرَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ (۵-۳۷) اور مشرقوں کا رب ہے۔

﴿مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾ (۱۶-۱۹) مشرق کی طرف (چلی گئی) الْمَشْرِقَةُ: جاڑے کے زمانہ میں دھوپ میں بیٹھنے کی جگہ

جہاں سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی دھوپ پڑتی ہو۔ شَرَقْتُ اللَّحْمَ: گوشت کے ٹکڑے کر کے دھوپ میں خشک کرنا۔ الْمَشْرِقُ: عید گاہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں

طلوع شمس کے بعد نماز ادا کی جاتی ہے۔ شَرَقَتْ

کو شریعت اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی صحیح حقیقت پر مطلع ہونے سے سیرابی اور طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ سیرابی سے مراد معرفت الہی کا حصول ہے جیسا کہ بعض حکماء کا قول ہے کہ میں پیتا رہا لیکن سیر نہ ہوا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی تو بغیر پینے کے سیری حاصل ہوگئی اور طہارت سے مراد وہ طہارت ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿إِنَّمَا يَرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (۳۳-۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کی میل پچھل صاف کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے، میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيَتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَعًا﴾ (۷-۱۶۳) (یعنی) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔

میں شُرَعًا، شَارِعٌ کی جمع ہے۔ اور شَارِعَةُ الطَّرِيقِ کی جمع شُورَاعٌ آتی ہے جس کے معنی کھلی سڑک کے ہیں۔

أَشْرَعْتُ الرُّمَحَ قِبَلَهُ: میں نے اس کی جانب نیزہ سیدھا کیا۔ بعض نے شَرَعْتَهُ فَهُوَ مَشْرُوعٌ کہا ہے اور

شَرَعْتُ السُّفِينَةَ کے معنی جہاز پر بادبان کھڑا کرنے کے ہیں جو اسے آگے چلاتے ہیں۔ هُمْ فَسَى هَذَا

شِرْعٌ: یعنی وہ سب اس میں برابر ہیں۔ یعنی انہوں نے اسے ایک ہی وقت میں شروع کیا ہے اور شَرَعْتُكَ مِنْ رَجُلٍ زَيْدٌ بمعنی حَسْبُكَ ہے یعنی زید ہی اس قابل

ہے کہ تم اس کا قصد کرو یا اس کے ساتھ مل کر اپنا کام شروع کرو۔

خدا کی فرمانبرداری اور رسول خدا کی اطاعت کرتے رہو۔
قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ﴾ (۳۷-۲۳) (اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔

شَرِيكَ: سا جھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكَ فِي الْمُلْكِ﴾ (۱۷-۱۱۱) اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔

اس کی جمع شُرَكَاءُ ہے جیسے فرمایا:

﴿شُرَكَاءُ مَتَّسَا كِسْفًا﴾ (۲۹-۲۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں۔ (مختلف المزاج) اور بد خو۔

﴿شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ﴾ (۳۲-۲۱) کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین منفرد کیا ہے۔

﴿أَيْنَ شُكَّاءِي﴾ (۳۱-۳۷) میرے شریک کہاں ہیں۔ دین میں شرک دو قسم پر ہے۔ شریک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا اور اَشْرَكَ فُلَانًا بِاللَّهِ کے معنی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے ہیں اور یہ سب سے بڑا کفر ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ.....﴾ (۳-۱۱۶) خدا اس گناہ کو نہیں بخشنے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور فرمایا:

﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (۴-۱۱۵) اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا۔

﴿أَنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ.....﴾ (۵-۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شریک

الشَّمْسُ آفتاب کا غروب کے وقت زردی مائل ہونا اسی سے أَحْمَرُ شَارِقٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی نہایت سرخ کے ہیں۔

أَشْرَقَ الثَّوْبَ: کپڑے کو خالص گہرے رنگ کے ساتھ رنگنا۔

لَحْمٌ شَرِقٌ: سرخ گوشت جس میں بالکل چربی نہ ہو۔

(ش ر ک)

الشِّرْكَةُ وَالْمَشَارِكَةُ کے معنی دو ملکیتوں کو باہم ملادینے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ ایک چیز میں دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے شریک ہونے کے ہیں۔ خواہ وہ چیز مادی ہو یا معنوی، مثلاً انسان اور فرس کا حیوانیت میں شریک ہونا یا دو گھوڑوں کا سرخ یا سیاہ رنگ کا ہونا اور شِرْكَتُهُ وَشَارِكَتُهُ وَتَشَارَكُوا اور اَشْرَكَ كُفَا کے معنی باہم شریک ہونے کے ہیں۔ اور ﴿أَشْرِكُهُ فِي أَمْرِي﴾ (۲۰-۳۲) اور اسے میرے کام میں شریک کر۔ اور حدیث میں ہے۔ (۱۹۱)

((اللَّهُمَّ أَشْرِكْنَا فِي دُعَاءِ الصَّالِحِينَ)) اے اللہ! ہمیں نیک لوگوں کی دعا میں شریک کر۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کو فرمایا:

(۱۹۲) ((إِنِّي شَرَفْتُكَ وَفَضَّلْتُكَ عَلَى جَمِيعِ خَلْقِي وَأَشْرَكْتُكَ فِي أَمْرِي)) کہ میں نے تمہیں تمام مخلوق پر شرف بخشا اور تجھے اپنے کام میں شریک کر لیا۔ یعنی میرے ذکر کے ساتھ تمہارا ذکر ہوتا رہے گا اور میں نے اپنی طاعت کے ساتھ تمہاری طاعت کا بھی حکم دیا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ (۵-۹۲) اور

ہوگا پس لفظ شِرْكُ الفاظ مشترک سے ہے اور آیت کریمہ:
﴿وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ (۱۸-۱۱۰) پروردگار
کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

میں دونوں قسم کا شرک مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿أَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ﴾ (۹-۵) مشرکوں کو..... قتل
کردو۔ میں اکثر فقہاء نے تمام کفار مراد لئے ہیں۔ کیونکہ
یہود بھی (اہل کتاب تھے) عزیزِ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے
تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ﴾ (۹-۳۰)
یہود کہتے ہیں کہ عزیزِ خدا کے بیٹے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار
مراد ہیں کیونکہ آیت:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ
وَالنَّصَارَى وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾
(۲۲-۱۷) جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو
یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور
مشرک۔

میں مشرکین کو یہود و نصاریٰ سے الگ عطف کے ساتھ
بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب
مشرکین سے خارج ہیں۔

(ش ر ی)

شِرَاءٌ اور بَيْعٌ دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ

کرے گا خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔

﴿يَا بَعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكَ بِاللَّهِ شَيْئًا﴾
(۶۰-۱۲) اس بات پر بیعت کرنے آئیں کہ خدا کے
ساتھ نہ شرک کریں گے۔

﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا
أَشْرَكْنَا﴾ (۶-۱۳۹) جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں
گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔

دوم: شرک صغیر کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی
دوسرے کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرنا اسی کا دوسرا نام ریا
اور رفاق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَلَىٰ اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾
(۷-۱۹۰) تو اس (بچے) میں جو وہ ان کو دیتا ہے اس کا
شریک مقرر کرتے ہیں جو وہ شرک کرتے ہیں خدا کا
(رتبہ) اس سے بلند ہے۔

﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾
(۱۲-۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس
کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔

بعض نے اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ کے معنی یہ کئے ہیں کہ
مگر وہ شِرْكُ یعنی دنیا کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں
اور اسی سے علیہ السلام نے فرمایا: ﴿(الْشِرْكُ

فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ أَخْفَىٰ مِنْ دَيْبِ النَّمْلِ.....)﴾
یعنی اس امت میں شرک چوٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی

① اللسان والنهاية (شرك) والحكيم عن ابن عباس وعائشة وعن ابى بكر وحل عن ابى عباس وفى جميع الروايات فى امتى بدل هذه الامة وفى رواية الدررiddel النمل وفى تخريج العراقى (۳۰۶: ۳) اتقوا هذا الشرك فانه اخفى من ديب النمل رواه ابن حبان فى الضعفاء من حديث ابى بكر الصديق والطبرانى من حديث ابى موسى الاشعري ونزهة المجالس للصفورى ص ۷ راجع كنز العمال ج ۳: رقم ۰۲۳۷۶، ۰۲۳۷۷، ۰۲۳۷۸، ۰۲۳۷۹.

﴿اَشْتَرُوْا الصَّالَاةَ﴾ (۲-۱۶) جنہوں نے گمراہی خریدی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۹-۱۱۱) خدا نے مومنوں سے..... خرید لئے ہیں۔

اور جس چیز کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانیں خرید کی ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يُقْتَلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾

(یعنی خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوتے ہیں) اور خوارج اپنے آپ کو شہداء کے نام سے موسوم کرتے تھے اور آیت کریمہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ (۲-۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہو۔

سے استدلال کرتے تھے کہ یہاں یشری بمعنی بیع ہے۔ جیسا کہ آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى﴾ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ش ط ط)

الشَّطَطُ: کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے کے ہیں۔ جیسے شَطَطِ الدَّارِ وَأَشَطَّ (گھر کا دور ہونا) اور یہ کسی مقام یا حکم یا بزنس میں حد مقررہ سے تجاوز کرنے پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ ﴿البسيط﴾

(۲۶۰) شَطَطُ الْمَزَارُ بِجَدْوٰى وَأَنْتَهٰى الْأَمَلُ

یعنی جدوی (محبوبہ) کی زیارت مشکل ہوگئی اور ہر قسم کی

مُشْتَرِي کے معنی قیمت دے کر اس کے بدلے میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے ہیں جو چیز دے کر قیمت لے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو۔ لیکن جب خرید و فروخت جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیع اور شراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر سَرِيَتْ بمعنی بَعْتُ اور اِبْتَعْتُ بمعنی اشْتَرَيْتُ آتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ﴾ (۲-۲۰) اور اس کو تھوڑی سے قیمت پر بیچ ڈالا۔

﴿يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ﴾ (۴-۷۴) جو لوگ آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں۔

پھر شراء اور اشتراء کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے عوض میں دوسری چیز لی جائے۔ چنانچہ

فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ﴾ (۳-۷۷) جو لوگ خدا کے اقرار کو بیچ کر اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

﴿لَا يَشْتَرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾ (۳-۱۹۹) وہ خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔

﴿اَشْتَرُوْا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ﴾ (۲-۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔

① وتعامه : فلاحیال ولاعهد ولاطلل وبعده الارحاء فماندری اندرکہ ۔ ام یستمرفیاتی دونہ الاحل والبییت من قصیده لابن احمر مدح بها النعمان بن بشیر بن سعد الانصاری وهو اول ولد فی الاسلام من الانصار و آخر من ولی الکوفة لمعاویة بن ابی سفیان قتلته بنو کلب فی فتنه مروان وکان عثمانیا وابوه بشر بن سعد عقبی بدری والشطرا فی الذیل ۸ والبییت فی التاج (شطط) واللسان (جدا) والالفاظ ۳۳۹ والسمط ۳: ۷ و جدوی اسم امرئة .

امیدیں منقطع ہو گئیں۔
اور کبھی شَطَطٌ بمعنی جَوْر بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَقَدْ قُلْنَا إِذَا شَطَطًا﴾ (۱۸-۱۴) تو ہم نے بعید از عقل بات کہی۔

شَطُّ النَّهْرِ: دریا کا کنارہ۔ جہاں سے پانی دور ہو۔

(ش ط ر)

شَطْرُ الشَّيْءِ کے اصل معنی نصف یا وسط شے کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۲-۱۴۳)

اور اپنا منہ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی طرف پھیر لو۔

یہاں شطر بمعنی سمت ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿قَوْلُوا وَجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ (۲-۴۴) (نماز کے وقت)

اس مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو۔

شَاطِرْتُهُ شَطَارًا: آدھا آدھا تقسیم کر لینا۔

شَطْرَ بَصْرَةَ: اس طرح دیکھنا کہ تمہاری طرف بھی نظر رہے اور دوسرے کی طرف بھی۔

حَلَبٌ فُلَانٌ الدَّهْرَ أَشْطَرَهُ: اس نے زمانہ کے خیر و شر کو پہچان لیا۔ اصل میں یہ لفظ اونٹنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اونٹنی کے اگلی طرف کے تھنوں سے دودھ نکال لے اور پچھلی طرف کے چھوڑ دے تو اس کے متعلق حَلَبٌ أَشْطَرَهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور شَطُورٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے ایک

جانب کے تھن خشک ہو گئے ہوں اور شَطُورٌ اس بکری کو بھی کہا جاتا ہے جس کا ایک تھن دوسرے سے لمبا ہو۔ شَطْرَ کے معنی ایک جانب ہو جانے کے ہیں۔ اور شَاطِرٌ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو دو رہتا ہو اس کی جمع شَطْرٌ آتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے۔ (المقارِب)

(۲۶۱) أَشَاقَكَ بَيْنَ الْخَلِيْطِ الشُّطْرُ

دوستوں میں تجھے رہنے والوں نے اپنا مشتاق بنا لیا ہے۔ اور شاطر بعید عن الحق کو بھی کہتے ہیں اور اس کی جمع شَطَارٌ آتی ہے۔

(ش ط ن)

الشَّيْطَانُ: اس میں نون اصلی ہے اور یہ شَطْنِ

سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں۔ اور

بِئْرٌ شَطُونٌ (بہت گہرا کنواں)

شَطْنَتِ الدَّارِ: گھر کا دور ہونا۔ غُرْبَةٌ شَطُونٌ:

(وطن سے دوری) وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ شَيْطَانٌ میں نون زائدہ ہے اور

یہ شَاطِطٌ بِشَيْطٌ سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے

سوختہ ہو جانے کے ہیں اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے

کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (۵۵-۱۵)

اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ اس سے قوت غصیبہ

① وتمامہ: وفیمن اقام من الحی و البیت لامریء القیس رواه فی اللسان (شطرن) وفی رواية "اشاقتك" وفی رواية اللدیوان (صنعة السندیوی)

② وفیمن اقام من الحی هر۔ ام الطاعنون بهنفی الشطر وهذا البیت مع آخر قد نقد علیه رسائل البلاء (۳۳-۳۲) وفیه شاعذ بدل شاقك .

③ راجع محازہ ۱: ۳۲ و اللسان (شطرن) وفیہما کل عاتب متعمد مکان کل عارم .

سلطنت میں) شیاطین پڑھا کرتے تھے۔
میں شیاطین سے سرکش جن مراد ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ سرکش انسان بھی مراد ہوں شاعر نے کہا ہے۔^①
(۲۶۲) لَوْ أَنَّ شَيْطَانَ الدُّنْيَا الْعُسْلُ
اگر سرکش تیز رو بھیڑیا۔

یہاں عُسْلُ، عَاسِلٌ کی جمع ہے اور عَاسِلٌ کے معنی
نہایت سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے ہیں اور
عَسَلَانٌ کالفظ بھیڑیے کی تیز روی کے ساتھ مخصوص
ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے۔^② (الزجر)
(۲۶۳) مَا لَيْلَةُ الْفَقِيرِ إِلَّا شَيْطَانٌ
کہ مقام فقیر میں رات شیطان کی طرح بھیانک ہوتی
ہے۔

اور انسان کی ہربری خصلت کو شیطان کہا جاتا ہے چنانچہ ﷺ
نے فرمایا ہے۔^③ اَلْحَسَدُ شَيْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَيْطَانٌ
کہ حسد بھی شیطان ہے اور غصہ بھی شیطان ہے۔

(ش ط ء)

شَاطِطِيءُ الْوَادِي کے معنی وادی کے کنارہ کے
ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:
(نُودِي مِنَ شَاطِطِيءِ الْوَادِي الْاَيْمَنِ) (۳۰-۲۸)
تو میدان کے دائیں کنارے سے آواز آئی۔
شَاطِطُتٌ فُلَانًا کے معنی ہیں اس کے ساتھ ساتھ
وادی کے کنارے پر چلا۔

اور حمیت مذمومہ افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے اس بنا پر
اس نے آدم ﷺ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا
تھا۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے۔^④ کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں
خواہ وہ جن و انس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن
پاک میں ہے:

﴿شَيْطَانِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ (۶-۱۳) شیطان
(سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔
﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ﴾ (۶-۱۲۲) اور شیطان
(لوگ)..... دلوں میں (یہ بات) ڈالتے ہیں۔
﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيْطَانِيهِمْ﴾ (۲-۱۱۳) اور جب
اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

یعنی جب جنوں اور انسانوں میں سے اپنے اصحاب کے
پاس جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:
﴿كَأَنَّهُ رُفُوسُ الشَّيَاطِينِ﴾ (۳۷-۶۵) جیسے
شیطانوں کے سر۔

میں بعض نے کہا ہے کہ شیاطین سے باریک جسم کے
سانپ مراد ہیں اور بعض نے سرکش جن مراد لئے ہیں اور
(ناگ پھین تھوہر کے چوں کو) بدناما ہونے کی وجہ سے بطور
تشبیہ رؤس الشیاطین کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:
﴿وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينِ﴾ (۲-۱۰۲) اور ان
(ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو (سلیمان ﷺ) کے عہد

① فعلى هذا يكون وزنه فيعلا واذا كانت نونه زائدة فوزنه فعلا من شاط (اعراب ثلاثين لابن خالويه ۷-۸).

② لم اجدہ.

③ وتسامه محنونة تووی روح الانسان والبيت في اللسان (فقر) بغیر عزرو فی البلدان (فقر) عجزه محبوب توذی فريح الانسان
وسياتی فی (فقر).

④ لم اجدہ ۱۲.

اون اور ریشم اور بالوں سے۔

شَعْرَتُ کے معنی بالوں پر مارنے کے ہیں۔ اور اسی سے شَعْرَتُ كَذَا مستعار ہے جس کے معنی بال کی طرح باریک علم حاصل کر لینے کے ہیں اور شاعر کو بھی اس کی فطانت اور لطافت نظر کی وجہ سے ہی شاعر کہا جاتا ہے تو لَيْتُ شَعْرِي كَذَا کے محاورہ میں شعر اصل میں علم لطیف کا نام ہے پھر عرف میں موزون اور مقفل کلام کو شعر کہا جانے لگا ہے اور شعر کہنے والے کو شاعر کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿بَلْ اَفْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ (۲۱-۵) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے نہیں۔ بلکہ (یہ شعر ہے جو اس) شاعر (کا نتیجہ طبع) ہے۔

نیز آیت کریمہ:

﴿لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ﴾ (۳۷-۳۶) ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے۔

اور آیت: ﴿شَاعِرٌ تَتَّبِصُّ بِهٖ﴾ (۵۲-۳۰) شاعر ہے اور ہم اس کے حق میں انتظار کر رہے، میں بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ پر شعر بمعنی منظوم اور مقفل کلام بنانے کی تہمت لگائی تھی۔ حتیٰ کہ وہ قرآن پاک میں ہر اس آیت کی تاویل کرنے لگے جس میں وزن پایا جاتا ہے جیسے ﴿وَجَفَّانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ﴾ اور ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾

لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے ان کا مقصد منظوم اور مقفل کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن پاک اسلوب شعری سے مبرا ہے اور اس حقیقت کو عوام عجمی بھی سمجھ سکتے ہیں پھر فصحاء

شَطَأُ الزَّرْعِ کھیتی کی سوئی جو زمین سے نکل کر دونوں جانب پھیل جاتی ہے ج شَطَأُ قرآن پاک میں ہے جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی۔

ایک قرأت میں شَطَأُهُ ہے جیسے: سَمِعُ وَ سَمِعَ وَ نَهْرٌ وَ نَهْرٌ وَ غَيْرُ ذَالِكِ۔

(ش ع ب)

الشَّعْبُ: اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم سے پھیلا ہو۔ اس کی جمع شُعُوبٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿شُعُوبًا وَقَبَائِلَ﴾ (۳۹-۱۲) تو میں اور قبیلے (بنائے) الشَّعْبُ مِنَ الْوَادِي وَادِی کا وہ مقام جہاں اس کا کنارہ ملتا اور دوسرا جدا ہوتا ہو جب تم اس جگہ کو دیکھو جہاں اس کا کنارہ جدا ہورہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا اس سے ملتا ہے تو ایسا محسوس ہو کہ دونوں سرے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ شُعْبُ کے معنی جمع کرنا اور متفرق کرنا دونوں آتے ہیں اور شُعَيْبٌ یا تو شُعْبُ کی تصغیر ہے جو مصدر یا اسم ہے اور یا شُعْبُ کی تصغیر ہے۔ الشَّعْبِيُّ: پرانی مشک جو مرمت اور درست کی گئی ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿اِلَىٰ ظِلِّ ذِي ثُلُثِ شُعْبٍ﴾ (۷۷-۳۰) اس سائے کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں۔

کی تشریح اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔

(ش ع ر)

الشَّعْرُ: بال۔ اس کی جمع اشْعَارٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ اَصْوَابِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا﴾ (۱۲-۸۰)

﴿عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ (۲-۱۹۸) مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ﴾ (۲-۵) خدا کے نام چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔

میں شَعَائِرُ اللَّهِ سے مراد قربانی کے وہ جانور ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ اور قربانی کو شَعِيرَةٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ شَعِيرَةٌ (یعنی تیز لوہے) سے اس کا خون بہا کر اس پر نشان لگادیا جاتا تھا۔

الشِّعَارُ: وہ لباس جو انسان کے جسم کے ساتھ ملا رہتا ہے نیز لڑائی میں فوجی اشارہ کو بھی شِيعَارٌ کہا جاتا ہے اشْعَرَةٌ الْحُبِّ: محبت اس کا لباس بن گئی۔

أَلَا شَعْرٌ: لمبے بالوں والا آدمی یا وہ گھوڑا جس کے گھر کے ارد گرد لمبے بال ہوں اور سخت مصیبت کو کہا جاتا ہے اور شَعْرَاءُ کتے کبھی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اس کے بالوں پر بیٹھی رہتی ہے۔

الشَّعِيرُ: جو کا دانہ۔ الشِّعْرِيُّ ایک ستارے کا نام ہے (جو سخت گرمی کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے) اور آیت کریمہ: ﴿هُوَ رَبُّ الشِّعْرِيِّ﴾ (۵۳-۳۹) وہی شعری کا مالک ہے، میں شعری کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ وہ ایک قوم کا معبود تھا۔

(ش ع ف)

آیت کریمہ: ﴿قَدْ شَعَفَهَا حَبًّا﴾ (۱۲-۳۰) میں ایک قرأتِ قَدْ شَعَفَهَا بعین مہملہ ہے۔ جو کہ

عرب کا کیا ذکر ہے۔ بلکہ وہ آپ ﷺ پر (نسعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب اور شاعر بمعنی کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جھوٹے دلائل کو اَدْلَةٌ شَعْرِيَّةٌ کہا جاتا ہے اسی لئے قرآن پاک نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾ (۲۶-۲۲۳) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے۔ اس لئے مقولہ مشہور ہے کہ أَحْسَنُ الشُّعْرِ أَكْذَبُهُ: سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو اور کسی حکیم نے کہا ہے کہ میں نے کوئی متدین اور راست گوانسان ایسا نہیں دیکھا جو شعر گوئی میں ماہر ہو۔

الْمَشَاعِرُ: حواس کو کہتے ہیں۔ لہذا آیت کریمہ:

﴿وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ (۲۹-۲) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور اکثر مقامات میں جہاں لَا تَشْعُرُونَ کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے لَا يَعْقِلُونَ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتیں لیکن عقل سے ان کا ادراک ہو سکتا ہے اور مَشَاعِرُ الْحَجِّ کے معنی رسوم حج ادا کرنے کی جگہ کے ہیں اس کا واحد مَشْعَرٌ ہے اور انہیں شَعَائِرُ الْحَجِّ بھی کہا جاتا ہے اس کا واحد شَعِيرَةٌ ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُعْظِمِ شَعَائِرَ اللَّهِ﴾ (۲۲-۳۲) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے۔

۱ وفی صحاح ابو عبیدہ وبقراءہ قوم (قد شعفا) وهو من المشعوف قال فی الطبری (۲: ۱۱۰، ۱۱۱) قرء بالمهملۃ ابورجاء والاعرج وعرف وزویت عن علی والجمهور بالمعجمه (راجع الفتح ۸: ۲۷۲)۔

(ش غ ف)

الشُّغْلُ وَالشُّغْلُ: ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے انسان دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي شُغْلٍ فَآكِهُونَ﴾ (۵۵-۳۶) عیش و نشاط کے مشغلے میں ہوں گے۔

ایک قرأت میں شُغْلٌ ہے یہ شُغِلَ فَهُوَ مَشْغُولٌ (باپ مجرد) سے آتا ہے اَشْغَلَ استعمال نہیں ہوتا شُغْلٌ شَاغِلٌ مصروف رکھنے والا کام۔

(ش ف ع)

الشَّفْعُ: کے معنی کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں اور جفت چیز کو شَفْعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (۳-۸۹) اور جفت اور طاق کی۔

بعض نے کہا ہے کہ شَفْعٌ سے مراد مخلوق ہے کیونکہ وہ جفت بنائی گئی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (۵۱-۳۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

اور وتر سے ذات باری تعالیٰ مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے یگانہ ہے بعض نے کہا کہ شَفْعٌ سے مراد یَوْمَ السَّنْهِرِ ہے کیونکہ اس کے بعد دوسرا دن اس کی مثل ہوتا ہے اور وَتْرٌ سے مراد یَوْمَ عَرَفَةَ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شَفْعٌ سے اولادِ آدم اور وتر سے آدم ﷺ مراد ہیں

شَعْفَةُ الْقَلْبِ سے مشتق ہے اور شَعْفَةُ الْقَلْبِ دل کے اس سرے کو کہتے ہیں جو شہ رگ کیساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے اور شَعْفَةُ الْجَبَلِ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:

فُلَانٌ مَشْعُوفٌ بِكَذَا: فلاں اس پر فریفتہ ہے گویا محبت اس کے شعفہ قلب تک پہنچ گئی ہے۔

(ش ع ل)

الشَّعْلُ: آگ کا بھڑکنا یا بھڑکانا کہا جاتا ہے شُعْلَةٌ مِنَ النَّارِ: آگ کا شعلہ اور قَدْ أَشْعَلْتَهَا کے معنی ہیں: میں نے آگ بھڑکائی۔

ابوزید کے نزدیک شَعْلَتْهَا (فعل مجرد) کہنا بھی جائز ہے۔ الشَّعِيلَةُ: جلتی ہوئی بتی۔ بعض نے سفیدی کے چمکنے کے لئے بھی بَيَاضٌ يَشْتَعِلُ کا محاورہ استعمال کیا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ (۴-۱۹) اور سرد ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے شعلہ مارنے لگا ہے۔

یہاں رنگت کے لحاظ سے بالوں کی سفیدی کو آگ کے ساتھ تشبیہ دے کر اشتعال کا لفظ استعمال کیا ہے اَشْتَعَلَ فُلَانٌ غَضَبًا: فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا۔ یہاں غصہ کو حرکت کے لحاظ سے آگ کے بھرنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اسی سے اَشْعَلْتُ الْخَيْلَ فِي الْعَارَةِ کا محاورہ ہے یعنی میں نے غارت گری کے لئے سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ جیسا کہ اَوْقَدْتُهَا وَهَيْجَتُهَا وَأَضْرَمْتُهَا کے محاورات ہیں۔

① قول ابن عباس وعكرمة والضحاك.

دوست نہیں ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات قبول کی جائے۔

﴿وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا﴾ (۸۵-۴) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس فعل کے نفع و نقصان میں اس کا شریک ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرے تو وہ ایک طرح سے اس کا شفیق بن جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وَزَرَّهَا وَوَزَرَ مَنْ عَمِلَ بِهَا))﴾ کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَنْ شَفَّعَ لِي مِنَ الْإِسْلَامِ بَعْدَ إِذْ نَبَّأْتُ﴾ (۳-۱۰) کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لئے بغیر کسی کی سفارش نہیں

کیونکہ وہ بن باپ کے پیدا کئے گئے تھے۔ ❶

الْشَّفَاعَةُ: کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا سفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں عام طور پر کسی بڑے باعزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے شامل ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہوگی۔ ❷ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا﴾ (۱۹-۸۷) (تو لوگ) کسی کی سفارش کا اختیار رکھیں گے مگر جس نے خدا سے اقرار لیا ہو۔ ﴿لَا تَسْتَفْعُ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ أَدْنَىٰ لَهُ الرَّحْمَنُ﴾ (۱۹-۲۰) اس روز کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔ مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے۔

﴿لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا﴾ (۲۶-۵۳) جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔

﴿وَلَا يَنْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ﴾ (۲۱-۲۸) وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ (۴-۲۸) (اس حال میں) سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوا سفارش کے لئے پکارتے ہیں وہ ان کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔

﴿مَنْ حَمِيمٌ وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ﴾ (۴۰-۱۸) کوئی

❶ مجاهد والحسن وفي تفسير الآية قول اخري (الطبري- ۳: ۱۷۰-۱۷۲).

❷ انكر الشفاعة المعتزله وقالوا اخلاف العدل وانكر ولا حادith الواردة في اثباته وهي اول فرقة انكر الحدith (راجع كتب الاصول).

❸ رواه الحاكم ومسلم والترمذى والنسائى وابن ماجه - عن جرير وباختلاف الفاظه - عن ابى جحيفة (راجع الفتح ۳: ۲۰۰).

سرخی کی قسم!

کر سکتا۔

أَلَا شَفَاقٌ: کسی کی خیر خواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا کیونکہ مشفق ہمیشہ مشفق علیہ کو محبوب سمجھتا ہے اور اسے تکلیف پہنچنے سے ڈرتا رہتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ﴾ (۲۱-۳۹) اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا سا بھی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

إِسْتَشْفَعْتُ بِفُلَانٍ عَلَى فُلَانٍ فَتَشَفَّعَ لِي: میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔

اور جب یہ فعل حرفِ مَن کے واسطے سے متعدی ہو تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور اگر بواسطہِ فِی کے متعدی ہو تو عنایت کے معنی نمایاں ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

شَفَّعَهُ کے معنی کسی کی سفارش قبول کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے نبی ﷺ کا فرمان ہے۔ ﴿(۱۹۶) (الْقُرْآنُ شَافِعٌ وَمُشَفَّعٌ)﴾ کہ قرآن شافع اور شفیع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

﴿إِنَّا كُنَّا قَبْلَ فِیْ أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ﴾ (۵۲-۲۶) اس سے قبل ہم اپنے گھر میں خدا سے ڈرتے رہتے تھے۔ ﴿مُشْفِقُونَ مِنْهَا﴾ (۳۲-۱۸) وہ اس سے ڈرتے ہیں۔

الشَّفْعَةُ: کے معنی ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کر لینا یہ شَفْعٌ سے مشتق ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(۱۹۷) (إِذَا وَقَعَتِ الْخُدُودُ فَلَا شَفْعَةَ)﴾ جب حدود مقرر ہو جائیں تو حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

﴿مُشْفِقِينَ وَمَا كَسَبُوا﴾ (۳۲-۲۲) وہ اپنے اعمال (کے وبال سے) ڈر رہے ہوں گے۔ ﴿أَلَسَفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا﴾ (۵۸-۱۳) کیا تم اس سے کہ..... پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔

(ش ف ق)

الشَّفَقُ: غروب آفتاب کے وقت دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں مل جانے کو شفق کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

شفقا: کنوئیں وغیرہ کے کنارہ کو کہتے ہیں۔ یہ قرب ہلاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلَى شَفَا جُرْفٍ هَارٍ﴾ (۹-۱۰۹) گر جانے والی

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ﴾ (۶۳-۱۶) ہمیں شام کی

① الحدیث أخرجه ابن حبان من رواية جابر والحاكم من حديث معقل بن يسار والطبرانی من حديث ابن مسعود وابو عبيدة في فضائل القرآن (راجع لتاريخه الكافي ۹۲ وكنز العمال ج ۱ رقم ۲۳۰۷ و ۲۳۶۳).

② رواه الترمذی من حديث جابر بن عبد الله قال وقد رواه بعضهم مرسلًا عن ابی سلمة والمسئلة مختلف فيها بين الفقهاء راجع التحفة شرح الترمذی (ص ۲۹۴) باختلاف الفاظه في البخاری ومسنند احمد وابی داؤد وابن ماجه والشافعی عن الزهري عن ابی سلمة وسعيد بن المسيب مرسلًا (راجع كنز العمال ۳: ۷).

زمین کو چیرا پھاڑا۔

﴿يَوْمَ تَشَقُّقُ الْأَرْضُ﴾ (۵۰-۴۴) اس روز زمین (ان پر سے) پھٹ جائے گی۔

﴿وَأَنْشَقَّتِ السَّمَاءُ﴾ (۶۹-۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا۔

﴿وَنَشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (۸۳-۱) اور چاند شق ہو گیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے انشقاق القمر کے معنی وَضَحُ الْأَسْرِ: کئے ہیں۔ یعنی معاملہ واضح ہو گیا۔

الْشَّقَّةُ: پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے:

طَارَ فُلَانٌ مِنَ الْغَضَبِ شِقَاقًا: فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔ جیسا کہ قُطِعَ غَضَبًا کا محاورہ ہے۔ طَارَتْ مِنْهُمْ شَقَّةٌ ان کا ایک حصہ اڑ گیا یعنی غضب ناک ہوئے۔

الْشَّقُّ: اس مشقت کو کہتے ہیں جو تک دو سے بدن یا نفس کو لاحق ہوتی ہے جیسا کہ الاكسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی در ماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَشِقُّ الْأَنْفُسَ﴾ (۱۶-۷) زحمت شاقہ کے بغیر۔

الْشَّقَّةُ: وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشَّقَّةُ﴾ (۹-۴۲) لیکن مسافت

ان کو دور (دراز) نظر آئی۔

الْشِقَاقُ: (مفاعلہ) کے معنی مخالفت کے ہیں گویا ہر فریق

جانب مخالف کو اختیار کر لیتا ہے اور یا یہ شَقَّ الْعَصَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی باہم افتراق پیدا کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

کھائی کے کنارہ پر۔

﴿عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ﴾ (۳-۱۰۳) (اور تم)

آگ کے گڑھے کے کنارے تک.....

أَشَقِي فُلَانٌ عَلَى الْهَلَاكِ: فلاں ہلاکت کے

قریب پہنچ گیا۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے

مَا لَقِيَ مِنْ كَذَا إِلَّا شَقِي کہ فلاں چیز تھوڑی

سی باقی رہ گئی ہے (یہ چاند یا سورج کے غروب ہونے یا

کسی کی موت کے وقت بولا جاتا ہے) شَقَا شَيْءٌ

شَفْوَان اور جمع أَشْفَاءُ آتی ہے۔

(ش ف ی)

الْشِّفَاءُ (ض) مِنَ الْمَرَضِ: سلامتی سے

ہمکنار ہونا۔ یعنی بیماری سے شفا پانا۔ یہ مرض سے صحت

یاب ہونے کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن

پاک میں شہد کے متعلق فرمایا:

﴿فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ﴾ (۱۶-۶۹) اس میں لوگوں کے

(امراض کی) شفا ہے۔

﴿هُدًى وَ شِفَاءً﴾ (۳۱-۴۳) وہ ہدایت اور شفا ہے۔

﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾ (۱۰-۵۷) وہ دلوں کی

بیماریوں کی شفا ہے۔

﴿وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ﴾ (۹-۱۳) اور

مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشنے گا۔

(ش ق ق)

الْشَّقُّ: شگاف کو کہتے ہیں، شَقَّقْتَهُ بِنَصْفَيْنِ میں نے

اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شِقَاقًا﴾ (۸۰-۲۶) پھر ہم نے

﴿وَأَنْ حِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ (۳-۳۵) اگر تم کو

معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے۔

﴿فَأَنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾ (۲-۱۳) تو وہ تمہارے

مخالف ہیں۔

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي﴾ (۱۱-۸۹) میری مخالفت

تم سے کوئی ایسا کام نہ کرادے۔

﴿لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾ (۲-۱۷۶) وہ ضد میں (آ کر

نیکی سے) دور ہو گئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۸-۱۳) اور جو

شخص خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے۔ یعنی اس

کے اولیاء کی صف کو چھوڑ کر ان کے مخالفین کے ساتھ مل

جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۹-۶۳) یعنی جو

شخص خدا اور رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ﴾ (۳-۱۱۵) اور جو شخص

پیغمبر کی مخالفت کرے۔

﴿أَلْمَالُ بَيْنَنَا شَقٌّ الشَّعْرَةَ أَوْ شَقَّ الْأَبْلَمَةَ﴾ یعنی

مال ہمارے درمیان برابر ہے۔

﴿فُلَانٌ شَقٌّ نَفْسِي أَوْ شَقِيقٌ نَفْسِي﴾ یعنی وہ میرا

بھائی ہے میرے ساتھ اسے گونہ مشابہت ہے۔

﴿شَقَائِقُ النُّعْمَانِ﴾ گل لالہ یا اس کا پورا۔^①

شَقِيقَةُ الرَّمْلِ: ریت کا ٹکڑا۔

الشَّقَشَقَةُ: اونٹ کا ریبہ جو مستی کے وقت باہر نکالتا ہے

اس میں چونکہ شگاف ہوتا ہے اس لئے اسے شَقَشَقَةُ

کہتے ہیں۔^②

بَيْدِهِ شَقُوقٌ: اس کے ہاتھ میں شگاف پڑ گئے ہیں

شِقَاقٌ: سم کا شگاف فَرَسٌ أَشَقٌّ: راستہ سے ایک

جانب مائل ہو کر چلنے والا گھوڑا۔

الشُّقَّةُ: اصل میں کپڑے کے نصف حصہ کو کہتے ہیں اور

مطلق کپڑے کو بھی شُقَّةً کہا جاتا ہے۔

(ش ق و)

الشَّقَاوَةُ: بدبختی۔ یہ سعادت کی ضد ہے اور شَقِيءَ

(س) شَقْوَةٌ وَشَقَاوَةٌ وَشَقَاءٌ کے معنی بدبخت

ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿عَلَّيْنَا عَلَيْنَا نَشَقُوتُنَا﴾ (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری

کم بختی غالب آگئی۔

میں ایک قرأت شَقَاوَتُنَا ہے۔^③ تو شَقْوَةٌ بروزن

رِدَّةٌ ہے۔ سعادت کی طرح شقاوت بھی امور اضافی سے

ہے۔ جیسا کہ سعادت دو قسم پر ہے، دنیوی و اخروی اور پھر

سعادت دنیوی تین قسم پر ہے۔ نفسانی، بدنی، اور خارجی،

اسی طرح شقاوت بھی انہی اقسام طرف منقسم ہوتی ہے۔

چنانچہ شقاوت اخروی کے متعلق فرمایا:

① والابلمة الخوصة ای نحن متساوون فيه لان الخوصة اذاشت طولاً انشت نصفين .

② واحده شقيقة واضيف الى النعمان بن المنذر لانه حمى ارضاً فكثرت فيها وقيل النعمان اسم الدم فشهدت حمرتها لجمرة الدم

واللسان: شق.

③ وفي اللسان: ولا تكون الا للجمال العربي والجمع اشق ومن سميت الخطب شقا وفي حديث علي ان كثير امن الخطب شقائق

الشیطان لان الشيطان يدخل فيها من الكذب وفي الفائق القول منسوب لمعر.

④ وهي قرأة ابن مسعود والاول قرأة اهل المدينة (اللسان).

پس ہر شک جھل ہے مگر ہر جھل شک نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَفِي شَكِّ مَنَّهُ مُرِيبٌ﴾ (۱۱-۱۰) وہ تو اس سے قوی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿بَلْ هُمْ فِي شَكِّ يَلْعَبُونَ﴾ (۴۳-۹) لیکن یہ لوگ شک میں کھیل رہے ہیں۔

﴿فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكِّ﴾ (۱۰-۹۴) اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں کچھ شک ہے۔

اور یہ (شک) یا تو شَكَّكَ الشَّيْءُ سے مشتق ہے جس کے معنی چاک کر ڈالنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ (اکال)

(۲۶۴) وَشَكَّكَتُ بِالرُّمْحِ الْأَصَمِّ نِيَابِهِ

لَيْسَ الْكَرِيمُ عَلَى الْفَنَاءِ بِمُحَرَّمِ

میں نے ٹھوس نیزے سے اس کا دل (یا درع کو) چاک کر ڈالا اور شریف آدمی نیزے پر حرام نہیں ہوتا۔

تو گویا شک کے معنی کسی چیز میں شکاف ڈالنے کے ہیں اور کسی شے کے اس طرح ہونے کے ہیں کہ اس میں رازے کو قرار حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس پر اعتماد ہو سکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس شَكِّ سے مستعار ہو جس کے

معنی بازو کے پہلو سے چٹ جانے کے ہیں اس طرح شک کا مفہوم یہ ہوگا کہ دو متضاد چیزوں کا باہم دیگر اس طرح مل جانا کہ رائے اور فہم ان میں داخل ہو کر ایک دوسری سے الگ نہ کر سکے اور التَّبَسَّ الْأَمْرُ وَاخْتَلَطَ وَأَشْكَلَ وغیرہا استعارات سے بھی اس اشتقاق کی

﴿فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى﴾ (۲۰-۱۲۳) وہ نہ گمراہ اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔

﴿رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب آگئی۔

اور شقاوت دنیوی کے متعلق فرمایا:

﴿فَلَا يُخْرِجَنَّكَمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَى﴾ (۲۰-۱۱۷) تو یہ کہیں تو دونوں کو جنت سے نکلوانہ دے پھر تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی شِقَاءٌ کا لفظ تَعَبٌ کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے شَقِيْتُ فِي كَذَا: یعنی میں نے فلاں معاملہ میں مشقت اٹھائی اور ان دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے۔ ہر شقاوت کو تعب کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تعب شقاوت نہیں ہوتی لہذا تعب شقاوت سے عام ہے۔

(ش ک ک)

الشَّكُّ: کے معنی دو فیضوں کے ذہن میں برابر و مساوی ہونے کے ہیں یہ یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ ان دونوں کی علامتیں یکساں طور پائی جاتی ہیں اور یا اس لئے کہ دونوں میں سے کسی پر بھی دلیل نہیں ہوتی۔

الشَّكُّ: کبھی تو نفس شے میں ہوتا ہے کہ کون سی جنس سے ہے اور کبھی اس کی صفت میں اور کبھی اس غرض کے بارے میں جس کے لئے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہے۔

شک جہالت ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے تقيضین کا علم ہی نہیں ہوتا

① قاله عنصرة انظر اللسان (شك) والطبرسي (۱۰۷: ۲۹) ومحاضرات المؤلف (۱۶۰: ۳) والجمهرة ۱۶۷ والمعلقات لابن

الانباري ۴۶، ۳۴۷، والمعرش للتبريزي ۱۹۶ والمعاني للفتي ودويانوه ۲۱.

﴿أَنْ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (۱۳-۳۱) کہ میرا بھی

شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

﴿وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ﴾ (۳-۱۳۵) اور ہم شکر

گزاروں کو عنقریب (بہت اچھا) صلہ دیں گے۔

﴿وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ﴾ (۲۷-۳۰)

اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے۔ اور آیت

کریمہ:

﴿قَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرُونَ﴾ (۱۳-۳۳) اور

میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔

میں تشبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کما حقہ شکر گزار ہونا

بہت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے

اولیاء میں سے شکر گزاری پر صرف دو پیغمبروں کی تعریف کی

ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جیسے فرمایا:

﴿شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ﴾ اس کی نعمتوں کا شکر گزار تھوڑے

تھے۔ دوم حضرت نوح علیہ السلام کی جیسے فرمایا:

﴿إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَاكِرًا﴾ (۱۷-۶) بے شک نوح

ہمارا شکر گزار بندہ تھا۔

اور جب شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسے: ﴿إِنَّهُ

شَاكِرٌ حَلِيمٌ﴾ (۱۷-۶۳) بے شک خدا قدر شناس

اور بردبار ہے۔

تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام کرنا اور ان کی

عبارت گزاری کی پوری پوری جزا دینا مراد ہوتا ہے نَاقَةٌ

شَاكِرَةٌ: دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں والی اونٹنی (یہ

شکر سے صیغہ صفت ہے) مقول مشہور ہے۔ ❶

هُوَ أَشْكُرُّ مِنْ بَرُّوقٍ: وہ بروق گھاس سے بھی زیادہ

تائید ہوتی ہے۔

الشَّكَّةُ: ہتھیار، جس سے کسی چیز کو پھاڑا جاتا ہے۔

(ش ک ر)

الشُّكْرُ کے معنی کسی نعمت کا تصور اور اسکے اظہار

کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کَشْرٌ سے مقلوب ہے

جس کے معنی کشف یعنی کھولنا کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے

جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے

ہیں اور دَابَّةٌ شَاكِرَةٌ اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی

فریبی سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی

خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ عَيْنٌ شَاكِرَةٌ سے ماخوذ ہے جس

کے معنی آنسوؤں سے بھر پورا آنکھ کے ہیں اس لحاظ سے

شکر کے معنی ہوں گے منعم کے ذکر سے بھر جانا۔

شکر تین قسم پر ہے شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا۔ شکر لسانی

یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا۔ شکر بالجوارح یعنی بقدر

استحقاق نعمت کی مکافات کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا﴾ (۱۳-۳۳) اے داؤد

کی آل میرا شکر کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں شُكْرًا منسوب علی

التمیز ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو عمل کرو وہ اللہ تعالیٰ کی شکر

گزاری کے لئے کرو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شُكْرًا

اعْمَلُوا کا مفعول ہے۔ اور اَشْكُرُوا کی بجائے اَعْمَلُوا

اس لئے کہا گیا ہے تاکہ شکر کی انواع ثلاثہ یعنی شکر قلبی،

شکر لسانی، اور شکر بالجوارح کے التزام پر تشبیہ ہو جائے۔

قرآن پاک میں ہے:

❶ انظر للمثل اللسان (برق) والمیدانی رقم (۲۰۵۳) وفيه تحصر من غير مطربل ثبت بالسحاب ادانشا ۱۲.

طرح کے اور بہت سے (عذاب ہوں گے) میں بیت اور تعاطی فعل کے لحاظ سے مماثلت مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ سُكُلٌ کے معنی دَلٌّ یعنی عورت کے ناز و انداز کے ہیں لیکن اصل میں اس نسبت کو کہتے ہیں جو دو ہم مشرب وہم پیشہ شخصوں میں پائی جاتی ہے چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔ اَلنَّاسُ اَشْكَالٌ وَاَلْاَفُ كِرْلُوكٌ بَاهِمٍ مشابہ اور الفت کروالے ہیں۔

اصل میں مُشَاكَلَةٌ شکل سے ہے اور سُكَلْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہیں ”میں نے جانور کی ٹانگیں (اشکال سے) باندھ دیں اور شکل اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اس کی ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں پھر اس سے استعارہ کے طور پر فَيَدْتُ الْكِتَابَ كِي طَرَحٍ سُكَلْتُ الْكِتَابَ كَمَا مَحَاوَرَهُ اسْتِعْمَالٌ ہوتا ہے جس کے معنی کتاب کو اعراب لگانے کے ہیں۔ دَابَّةٌ بِهَيَا شِكَاَلٌ: وہ جانور جس کے ایک اگلے اور ایک پچھلے پاؤں میں شِكَالٌ یعنی پائے بند کی طرح سفیدی ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ﴾ (۱۷-۱۸۳) کہو

کہ ہر ایک اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔

یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے جو اسے پائے بند کے ہوئے ہے کیونکہ فطرت انسان پر سلطان قاہر کی طرح غالب رہتی ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب ”اَلدَّرْبَعَةُ السِّیِّئَاتُ مَكَارِمِ الشَّرِیْعَةِ“ میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ ایسے

شکر گزار ہے۔ بروق گھاس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہلکی سی بارش سے ہری بھری ہو جاتی ہے اور سُكْرٌ کے معنی کنایہ کے طور پر عورت کی شرمگاہ اور اس سے جماع کے بھی آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے۔^۱

اِنْ سَاَلْتَكُ تَمْنَنَ سَكْرَهَا وَشَبْرَكَ اَنْشَاَتُ تَطْلُهَا: اگر وہ تجھ سے اپنی شرمگاہ اور جماع کی اجرت طلب کرتی ہے تو تو اس میں حیلے بہانے کرتا ہے۔

اَلشَّكِيْرُ: تروتازہ گھاس جو درخت کے تنہ میں ہو۔ اور شِكْرَتٌ (س) اَلشَّجْرَةُ کے معنی درخت کی شاخوں کے گنجان ہونے کے ہیں۔

(ش ک س)

اَلشَّكِيْسُ: بد مزاج کو کہتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ﴾ (۳۹-۲۹) جس میں کوئی آدمی شریک ہیں (مختلف المزاج) اور بد خو۔ یعنی اپنی بد مزاجی کی وجہ سے باہم جھگڑا کرنے والے ہیں۔

(ش ک ل)

اَلْمُشَاكَلَةُ: کے معنی شکل و صورت میں مشابہ ہونے کے ہیں اور نسد کے معنی جنس میں شریک ہونے کے ہیں اور شَبَّةٌ کے معنی کیفیت میں مماثلت کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَاٰخِرُ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ﴾ (۳۸-۵۸) اور اس

۱ قاله يحيى يعمر لرجل خاصته اليه امرته في مهرها اوروه القتيبي في ادب الكتاب ص ۱۲ مثلاً للتقريب والتعقيب وفيه الخبر ومحالس نعلب (۴۶۵) قال وانشكر: الفرج والكمال للمبرد ۶۸ وكتب تراجم النحويين مع اختلاف في الرواية وفي اللسان (ضهل) ، طليل) والفاوق (۱: ۲۳۳) بزيادة تضهلها اي تعطيلها القليل من حقها والنهاية (شكر) وفيه ان بزيادة همزة الاستفهام وفي المطبوع تصحيف وارتباك .

شکایت کی لیکن آپ ﷺ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہ کیا۔

اصل میں شُكُو کے معنی شُكُوَةٌ یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھولنے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں لہذا یہ دراصل بَشْتٌ لَهٗ مَا فِي وَعَائِي اور نَقَضْتُ مَا فِي جِرَابِي کی طرح استعارہ ہے جس کے معنی دل کی بات کو ظاہر کر دینے کے ہیں۔ الْمَشْكُوتَةُ: طاق جو آر پار نہ ہو قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمْ مَشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ﴾ (۲۴-۳۵) گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہو۔

تو مشكُوَةٌ سے مراد مومن کا دل اور مصباح سے نور الہی مراد ہے۔

(ش م ت)

الشَّمَاتَةُ: کے معنی دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کے ہیں اور یہ شَمِيتٌ بِهِ فَهُوَ شَامِتٌ کا مصدر ہے اور أَشَمَّتَ اللَّهُ بِهِ الْعَدُوَّ: کے معنی ہیں اللہ سے مصیبت پہنچانے جس سے اس کے دشمن خوش ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ﴾ (۷-۱۵۰) تو ایسا نہ کیجئے کہ دشمن مجھ پر نہیں۔

تُشْمِتُ کے معنی چھینکنے والے کو دعا دینے کے ہیں۔ گویا ازالہ شماتۃ کی دعا ہے جیسے تَعْرِيفُصُّ کے معنی مرض کو

ہی جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(۱۹۹) كُلُّ مَتَسِّرٍ لِمَا خُلِقَ لَهُ (فکر ہر کسی بقدر ہمت اوست)

الْأَشْكَالَةُ: حاجت جو انسان کو پابند کر دے اور الْإِشْكَالُ کے معنی (بطور استعارہ) کسی کام کے پیچیدہ ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ اشتباہ کا لفظ شَبَهٌ سے مشتق ہے اور مجازاً کسی امر کے مشتبہ ہونے پر بولا جاتا ہے۔

(ش ک و)

الشُّكُوُ وَالشُّكَايَةُ وَالشُّكَاةُ وَالشُّكُوِيُّ کے معنی اظہار غم کے ہیں اور شُكُوْتُ وَأَشْكَيْتُ دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ (۱۲-۸۶) کہ میں تو اپنے غم اور اندوہ کا اظہار (خدا سے کرتا ہوں۔

﴿وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ﴾ (۱-۵۸) اور خدا سے شکایت (رنج و ملال) کرتی ہے۔

أَشْكَاهُ: (انفعال) کے معنی کسی کو صاحب شکوہ کر دینے کے آتے ہیں جیسے أَمْرَضَهُ (اس کو صاحب مرض کر دیا) اور کسی کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

(۱۰۰) شَكُونَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ حَرَ الرَّمَضَاءِ فِي جِبَاهِنَا وَأَكْفَيْنَا فَلَمْ يُشْكِنَا: کہ ہم نے آنحضرت کے پاس اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں میں گرمی کی شدت کی

① رواہ الحاكم و ابوداؤد واصله متفق عليه عن عمران بن حصين و الترمذی عن عمرو و الحاكم أيضاً عن ابی بكر فی حدیث طویل.

② اخرجہ مسلم بعد ان اور در احادیث ابراد الظھر و البیهقی من حدیث حباب راجع النیل (۲: ۳۲۹) و الزرقانی علی الموطأ (۱: ۴۰۱)

و الحدیث فی حل کتب الحدیث و فی الفائق (۱: ۲۵۲) و النہایة (شکو) ۱۲.

اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔

﴿الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ (۵۵-۵) سورج

اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔

شَمْسٌ يَوْمَنَا وَأَشْمَسَ: دن کا دھوپ والا ہونا۔

شَمَسَ فُلَانٌ شِمَاسًا: گھوڑے کا بد کتنا ایک جگہ پر

قرار نہ پکڑنا۔ گویا قرار نہ پکڑنے میں سورج کے ساتھ تشبیہ

دی گئی ہے۔

(ش م ل)

الشِّمَالُ: بائیں۔ ضد یَمِين۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ﴾ (۵۰-۱۷)

جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔

نیز چھوٹی چادر جس سے بائیں جانب ڈھانپ لی جائے

اسے بھی شِمَالٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ عربی زبان

میں دوسرے اعضاء کی مناسبت سے لباس کے مختلف نام

رکھے گئے ہیں۔ مثلاً قمیص کی آستین کو يَدٌ (ہاتھ) اور جو

حصہ سینہ اور پشت پر آئے اسے صَدْرٌ اور ظَہْرٌ کہا جاتا

ہے اور پانچامہ کے پائنتے کو رِجْلٌ سے موسوم کر دیتے

ہیں۔ وغیر ذالک

اور الا شَمْتَمَالِ بِالْثَوْبِ: کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ اس

کا بالائی سر بائیں جانب ڈالا جائے حدیث میں ہے۔^①

(۱۰۱) ((نَهَى عَنْ اِسْتِمَالِ الصَّمَاءِ)) کہ

استمالة السماء ممنوع ہے۔

زائل کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔^①

(۲۶۵)..... قَبَاتٌ لَهُ

طَوَعِ الشَّوَامِتِ.....

تو اس نے خوف و ہراس اور سردی میں کھڑے ہو کر رات

گزاری۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شوامت سے قوائم یعنی ٹانگیں

مراد ہیں، لیکن یہ معنی محل نظر ہیں اس لئے کہ اس بیت کے

علاوہ اس معنی پر اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

(ش م خ)

الشَّمَاخُ: بلند، مؤنث شَامَخَاتُ قرآن

پاک میں ہے:

﴿رَوَّاسِي شَامَخَاتٍ﴾ (۷۷-۲۷) اونچے اونچے

پہاڑ۔ اور اسی سے شَمَخٌ بِأَنْفِهِ، کا محاورہ ہے جس کے

معنی تکبر کرنے کے ہیں۔

(ش م و ن)

الْاِسْمَازَاؤُ: منقبض و گرفتہ ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِسْمَازَاتٌ قُلُوبُ الدِّينِ﴾ (۲۹-۳۵) (تو) ان

لوگوں کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔

(ش م س)

الشَّمْسُ: کے معنی سورج کی تکیہ یا دھوپ کے

ہیں: شَمُوسٌ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا﴾ (۳۶-۳۸)

① قاله النابغة والبيت بتسامه: فارتاع من صوت كلاب حباب له طوع انشوامت من خوف ومن بردا والبيت في اللسان (شمت)

ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۷۵) والمحكم (طوع) وفيه "من صرد" والكلاب صاحب الكلاب والشوامت القوائم اي بات الثور طوع

قوائم (يعني قائما) وهذا على رواية من روى طوع بالنصب ومن رفعه فانه يريد من طوع الشوامت اي ماتشبهه اعداده راجع للبيت ايضا

البحر (۵: ۲۳۷) والمقدّمين ۶ والعشر للبريزي ۲۹۴ والبيت من ابیات المعاني راجع اللسان والمعاني الكبير للفتي (۲۳۹).

② متفق عليه وابدواؤد واليهي من حديث ابن عمر راجع ايضا الزرقاني على الموطأ (۴: ۲۸۷) والفاق (۲: ۲۰).

تم عمدہ اخلاق کو پہچان لو گے اور تم پشیمانی اٹھاؤ گے لیکن وہ وقت پشیمانی کا نہیں ہوگا۔
میں مَسْمُوْلَةٌ سے مراد پاکیزہ اخلاق ہیں گویا بادشمالی نے (شراب کی طرح) انہیں ٹھنڈا اور خوش گوار بنا دیا۔

(ش ن ۵)

شَيْئَةٌ: (فس) کے معنی بغض کی وجہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں۔ اسی سے اَزْدِ شَيْئُوْتَةٌ مشتق ہے جو ایک قبیلہ کا نام اور آیت کریمہ: ﴿شَنَانُ قَوْمٍ﴾ (۲-۵) لوگوں کی دشمنی۔
میں شَنَانُ کے معنی بغض اور دشمنی کے ہیں ایک قرأت میں شِنَانٌ بسکون نون ہے۔ پس تخفیف (یعنی سکون نون) کی صورت میں اسم اور فتح نون کی صورت میں مصدر ہوگا۔^۵ اور اسی سے فرمایا:
﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ (۳-۱۰۸) کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔

(ش ہ ب)

الشَّهَابُ: کے معنی بلند شعلہ کے ہیں خواہ وہ چلتی ہوئی آگ کا ہو یا فضا میں کسی عارضہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿فَاتَّبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ﴾ (۱۰-۳۷) تو جلتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگتا ہے۔
﴿شِهَابٌ مُّبِينٌ﴾ (۱۵-۱۸) روشنی کرنے والا انگارہ۔
﴿شِهَابًا رَّصَدًا﴾ (۹-۷۲) انگارہ تیار۔

اور استعارہ کے طور پر کبیل کو جو جسم پر لپیٹا جاتا ہے۔
شَمْلَةٌ وَمَشْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شَمَلَهُمُ الْأَمْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کے سب کو شامل اور عام ہو جانے کے ہیں۔ پھر شَمَال کے لفظ سے مجازاً کہا جاتا ہے۔

شَمَلْتُ الشَّاةَ: بکری کے تھنوں پر غلاف چڑھنا۔ اور شَمَال کے معنی عادت بھی آتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی چادر کی طرح انسان پر مشتمل ہو جاتی ہے۔

الشَّمُولُ: شراب۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور شراب کو شمول کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ عقل کو ڈھانپ لینے کی وجہ سے خمر کہا جاتا ہے۔

الْإِسْمَالُ: (بکسر اشئین) وہ ہوا جو کعبہ کی بائیں جانب سے چلتی ہے اور اس میں ایک لفت شَمَالٌ (بفتح اشئین) بھی ہے۔

شَامِلٌ وَاشْمَلٌ کے معنی شمال کی جانب میں جانے کے ہیں۔ جیسے جنوب سے اجنب (جنوب کو جانا) کنایہ کے طور پر تلوار کو مشتمل کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے رِداءً سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے مُرْتَدٌ بِالسَّيْفِ وَمُتَدَرِّعًا لَهُ کی طرح جَاءَ مُشْتَمِلًا بِسَيْفِهِ کا محاورہ ہے۔

نَاقَةٌ شَمْلَةٌ وَشِمَالٌ: بادشمال کی طرح تیز روانہ ہونے اور شاعر کے قول۔^۵ (الکامل)

(۲۶۶) وَلَتَعْرِفَنَّ خَلَائِقًا مُشْمُولَةً
وَلَتَنْدَمَنَّ وَلَاتِ سَاعَةٍ سَنَدَمًا

۱ والبیٹ من شوہد الطبری (۲۲-۲۳) وراجع له ایضاً اَضداد ابی الطیب (۴۱۳) والاصمعی (۱۸) وابن السکیت ۱۷۳ وابن الاباری ۱۶۸ وفی کل المراجع بغير عزو والخزانة البغدادیة ۲: ۱۴۸۔

۲ الاسم مثل سکران وعطشان من سکر وعطش والمصدر مثل طیران ونسلان وعسلان ورملان قال الطبری (۱۶۴: ۶) واولی القرائین قراءۃ من یفتح النون لان المصادر یاتی علی فعلان۔

الشُّهْبَةُ: سفیدی۔ جس میں کچھ سیاہی ملی ہوئی ہو۔

جیسا کہ انگارہ کی روشنی کے ساتھ دھواں ملا ہوتا ہے اسی سے کَتِيْبَةٌ شُهْبَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی مسلخ لشکر کے ہیں کیونکہ اس میں ہتھیاروں کی چمک سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ سیاہی اور سفیدی ملی ہوئی ہیں۔

(ش ۵ د)

الْمَشْهُودُ وَالشَّهَادَةُ کے معنی کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۱۴-۵۹) پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا۔

لیکن اولیٰ یہ ہے کہ شَهُوْدُ کے معنی صرف حاضر ہونا ہوں اور شَهَادَةُ میں حاضر ہونے کے ساتھ مشاہدہ کا بھی اعتبار کیا جائے۔ الْمَحْضَرُ: بمعنی مشہد یعنی حاضر ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے مُشْهِدٌ وہ عورت جس کا خاوند حاضر ہو اور مُشْهِدٌ کی جمع مَشَاهِدُ آتی ہے اسی سے مَشَاهِدُ الْحَجِّ ہیں یعنی وہ مواضع شریفہ جہاں کہ فرشتے اور نیک لوگ حاضر ہوتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ مَشَاهِدُ الْحَجِّ کے معنی مناسک حج کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۲۲-۲۸) تاکہ وہ اپنے فائدہ کے لئے حاضر ہوں۔

﴿وَلِيَشْهَدَ عَدَابَهُمَا﴾ (۲-۲۳) اور ان کی سزا کے وقت..... موجود ہو۔

﴿مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهَا﴾ (۲۷-۳۹) ہم تو اس

کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔

﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ (۲۵-۷۲) اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

یعنی نہ تَوَزَّرُ کے موقع پر خود ہی حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا قصد یا ارادہ کرتے ہیں۔

الشَّهَادَةُ: وہ بات جو کامل علم و یقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدہ بصر سے حاصل ہوا ہو یا بصیرت سے۔ اور

آیت کریمہ:

﴿أَشْهَدُوا خَلْقَهُمْ﴾ (۳۳-۹) کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے۔

میں مشاہدہ بصر مراد ہے اور پھر سَتَكْتَبُ شَهَادَتَهُمْ (عقریب ان کی شہادت لکھ لی جائے گی) سے اس بات پر تشبیہ کی ہے کہ شہادت میں حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے اور

آیت کریمہ:

﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ (۲-۷۲) اور تم اس بات کے گواہ ہو۔

میں تَشْهَدُونَ کے معنی تَعْلَمُونَ کے ہیں یعنی تم اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا أَشْهَدُهُمْ خَلْقَ السَّمَوَاتِ﴾ (۱۸-۵۲) میں نے نہ تو ان کو آسمان کے پیدا کرنے وقت بلا یا تھا۔

میں تشبیہ کی ہے کہ اس لائق نہیں ہیں کہ اپنی بصیرت سے خلق آسمان پر مطلع ہو جائیں اور آیت کریمہ:

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۲۳-۹۳) وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔

میں غائب سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کا ادارک نہ تو ظاہری حواس سے ہو سکتا ہو اور نہ بصیرت سے اور شہادت

کہ فرمایا:

﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا﴾ (۱۲-۲۶) اس کے

قبیلہ میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کیا۔

اور جب شہادت اپنی ذات کے متعلق ہو تو اس کے معنی

اقرار کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ

أَحَدِهِمْ أَرْبَعٌ شَهَادَاتٌ بِاللَّهِ﴾ (۲۳-۶) اور خود

ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے

کہ چار بار خدا کی قسم کھائے۔

اور آیت کریمہ: ﴿مَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا﴾ (۱۲-۸۱)

اور ہم نے تو اپنی دانست کے مطابق (اس کے لے

آنے کا) عہد کیا تھا۔

میں شَهِدْنَا بمعنی أَخْبَرْنَا کے ہے اور آیت کریمہ:

﴿شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِم بِالْكَفْرِ﴾ (۹-۱۷)

جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں گے۔

میں شَاهِدِينَ بمعنی مُقِرِّينَ کے ہیں یعنی کفر کا اقرار

کرتے ہوئے۔

﴿لِمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا﴾ (۳۱-۲۱) تم نے ہمارے

خلاف کیوں شہادت دی۔

اور آیت کریمہ: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ

وَالْمَلٰئِكَةُ وَأَلْوَالُوا الْعِلْمِ﴾ (۳-۱۸) خدا تو اس بات

کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے

اور علم والے لوگ۔

میں اللہ تعالیٰ کے اپنی وحدانیت کی شہادت دینے سے مراد

سے مراد وہ اشیاء ہیں جنہیں لوگ ظاہری آنکھوں سے

دیکھتے ہیں۔

شَهِدْتُ کا لفظ و طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) علم کی جگہ آتا ہے اور اسی سے شہادت ادا ہوتی ہے مگر

أَشْهَدُ بِكَذَا کی بجائے اگر أَعْلَمُ کہا جائے تو شہادت

قبول نہیں ہوگی بلکہ أَشْهَدُ ہی کہنا ضروری ہے۔

(۲) قسم کی جگہ پر آتا ہے چنانچہ أَشْهَدُ بِاللَّهِ أَنَّ زَيْدًا

مُنْطَلِقٌ میں أَشْهَدُ بمعنی أَقْسِمُ ہے بعض نے کہا

ہے کہ اگر أَشْهَدُ کے ساتھ بِاللَّهِ نہ بھی ہو تب بھی یہ قسم

کے معنی میں ہوگا اور کبھی عَلِمْتُ بھی اس کے قائم مقام

ہو کر قسم کے معنی دیتا ہے اور اس کا جواب بھی جواب قسم کی

طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(اکامل)

(۲۶۷) وَلَقَدْ عَلِمْتُ كِتَابَيْنِ مِّنِّي

مجھے یقین ہے کہ میری موت ضرور آ کر رہے گی۔

شَاهِدٌ اور شَهِيدٌ کے ایک ہی معنی ہیں شَهِيدٌ کی جمع

شُهَدَاءُ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يَأْبُ الشُّهَدَاءُ﴾ (۲-۲۸۲) اور وہ مردوں کو

گواہ کر لیا کرو۔

شَهِدْتُ کے معنی کسی جگہ پر حاضر ہونے کے ہیں اور

شَهِدْتُ عَلَى كَذَا کے معنی کسی واقعہ کی شہادت دینے

کے قرآن پاک میں ہے:

﴿شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ﴾ (۳۱-۲۱) ان کے کان

ان کے خلاف (ان کے اعمال کی) شہادت دیں گے۔

اور کبھی شہادت کے معنی فیصلہ اور حکم کے ہوتے ہیں۔ جیسا

① والسبوطی ۲۸۰ البیت منسوب للبلید ولم اجدہ فی دیوانہ وتماہ ان المنايا لاتطیش سہامہا وقد روی عجزہ ماخوف علی

ولاعدم ۱۲ کذاقال العینی فی شرح الشواہد راجع رقم ۲۰۲۔

کے پیدا کرنے کے وقت۔ اور آیت کریمہ:
﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (۳۵)۔
(۳۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں
جو صاحب علم ہیں۔

میں بھی اسی معنی پر تشبیہ کی ہے اور آیت:
﴿وَالصّٰدِقِيْنَ وَالشّٰهِدَاءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ (۳)۔
(۶۹) اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔
میں بھی شہداء سے یہی لوگ مراد ہیں۔

شہید: یہ کبھی شاہد یعنی گواہ آتا ہے۔ چنانچہ آیت:
﴿سَٰئِقٌ وَ شَٰهِيْدٌ﴾ (۵۰-۲۱) اس کے ساتھ (ایک
چلانے والا) اور ایک گواہ ہوگا۔ میں شہید بمعنی گواہ ہی ہے
جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دے گا۔ اسی طرح آیت:
﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَٰهِيْدٍ وَ جِئْنَا
بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَٰهِيْدًا﴾ (۳-۴۱) بھلا اس دن
کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے
والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو گواہ
طلب کریں گے۔

میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ:
﴿اَوَ اَلْقٰى السَّمْعَ وَ هُوَ شَٰهِيْدٌ﴾ (۵۰-۳۷) یا
دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی
شہادت دیتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق
فرمایا ہے: ﴿اَوَلَيْكَ يٰنَا دُوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ﴾

عالم اور انفس میں ایسے شواہد قائم کرنا ہے جو اس کی
واحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا
ہے۔^۱

(۲۶۸) فَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَّهٗ اٰيَةٌ

تدل علىٰ اَنَّهُ وَاٰحَدٌ

ہر چیز کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اس کے یگانہ
ہونے پر دلالت کر رہے۔

بعض نے کہا ہے کہ باری تعالیٰ کے اپنی ذات کے لئے
شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو نطق بخشا
اور ان سب سے اس کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ ﴿اَلَسْتُ
بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾ اور فرشتوں کی شہادت سے مراد
ان کا ان افعال کو سرانجام دینا ہے جن پر وہ مامور ہیں۔
جس پر کہ آیت:

﴿فَاَلْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا﴾ (۹-۵) پھر دنیا کے کاموں

کا انتظام کرتے ہیں۔ دلالت کرتی ہے اور اولو العزم
کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ مخلوق کے رموز و اسرار پر
مطلع ہوتے اور ان کا اقرار کرتے ہیں۔ اور شہادت بایں
معنی اہل علم کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ جہلاء اس قسم
کی شہادت سے کوسوں دور ہیں اسی لئے کفار کے متعلق
فرمایا:

﴿مَا اَشْهَدْتُهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا

خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ﴾ (۱۸-۵۱) میں نے ان کو نہ تو آسمان

اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان

۱ البیت فی البحر (۲/۴۰۲: ۳/۱۳۹: ۴/۴۳۲) ومحاضرات المؤلف (۴: ۳۹۸) فی ثلاثة ابیات والطبرسی (وفی ابن کثیر قبلہ
(فواصلاً کیف بعضی الالہ۔ ام کیف یحجده الجاہد۔ ونسبہ الی ابن المعتز وفی طبقات ابن المعتز ۲۰۷ انہ لابی العتاهیة وفیہ قصة
ابی نواس حجارته ایاہ وهو الصواب کما فی زهر الآداب للحصری (۲: ۴۹) وطرار المجالس ۱۱۶۔

ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا علم تک نہیں ہوتا اور آیت:

﴿وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا﴾ (۲۸-۷۵) اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔

میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ﴾ (۱۰۰-۱۷) اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔

﴿إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (۱۸-۲۸) اور (حق ظاہر کرنے کو) خدا ہی کافی ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ﴾ (۲۰-۱۶) اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔

﴿يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَىٰ﴾ (۲۰-۷) وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنی (یعنی علم باری تعالیٰ) کے محیط ہونے پر دال ہیں۔ اور قریب المرگ شخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿تَنْزِيلٌ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا﴾ (۳۱-۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔

میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور فرمایا:

﴿وَالشَّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ﴾ (۵۷-)

(۳۱-۳۲) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَقِمْ الصَّلَاةَ..... إِنَّ قُرْآنَ الْقَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ (۷۸-۱۷) کیونکہ صبح کے وقت..... قرآن

پاک کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔

میں قرآن پاک کے مشہود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قرأت کرنے والے پر شفا، رحمت، توفیق، سکینت، اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔ جن کا کہ آیت:

﴿وَنُنزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۸۲-۱۷) اور ہم قرآن پاک کے ذریعہ

سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ﴾ (۲-۲۳) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلاؤ۔ میں شہداء کی تفسیر میں مختلف

اقوال ہیں جن پر معنی شہادت مشتمل ہے چنانچہ ابن عباس نے اس کے معنی اَعْوَان یعنی مددگار کے لئے ہیں اور مجاہد

نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں اور بعض نے شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں جن کے

موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق کہا گیا ہے۔ ﴿البسيط﴾

(۲۶۹) مُخْلِفُونَ وَيَقْضِي النَّاسُ أَمْرَهُمْ

وَهُمْ بَغِيْبٌ وَفِي عَمِيَاءَ مَا شَعَرُوا

وہ چھپے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے

① قاله الاخطل في كليب بن يربوع رهط حرير وبعده: الاكلون حيث الزادو حدهم - والمسائلون بظهر الغيب: ما الخبر والبیت فی الكامل ومحاضرات المؤلف (۱: ۳۱۱) وديوانه ۱۰ والسيوطي ۳۲۸ وفيه يعصى بدل يقضى وقيله: اما كليب بن يربوع فليس لها عند التفاحر ايراد ولاصدر.

ش ۵

الشَّهْرُ: (مہینہ) وہ مدت معینہ جو چاند کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ یا دورانِ شمس کے بارہ کے حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ہے جو ایک نقطہ سے شروع ہو کر دوسرے نقطہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي﴾ (۲-۱۸۵) (روزوں کا

مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں.....

﴿الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ﴾ (۲-۱۹۷) حج کے

مہینے معین ہیں جو معلوم ہیں۔

﴿إِنَّ عِلَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ إِنْنَا عَشْرَ شَهْرًا﴾

(۹-۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں۔

﴿فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ﴾ (۹-۲) تو

مشرکوں! زمین میں چار مہینے چل پھرو۔

الْمُشَاهِرَةُ کے معنی ہیں مہینوں کے حساب سے معاملہ کرنا۔

جیسے مُسَانَهَةٌ (سال وار معاملہ) کرنا اور مِيَاوَمَةٌ (دونوں

کے حساب سے معاملہ کرنا) أَشْهَرْتُ بِالْمَكَانِ: کسی جگہ

مہینہ بھر قیام کرنا۔ شَهْرٌ فُلَانٌ وَاشْتَهَرَ کے معنی مشہور

ہونے کے ہیں خواہ وہ شہرت نیک ہو یا بد۔

ش ۵ ق

الشَّهِيقُ کے معنی لمبی سانس کھینچنے کے ہیں لیکن

شَهِيْقٌ سانس لینے اور زَفِيْرٌ سانس چھوڑنے پر بولا جاتا

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَسَمِعُوا لَهَا تَغِيْظًا وَرَفِيْرًا﴾ (۷-۶۷) اور

چیننے چلانے کو سنیں گے۔

اصل میں یہ لفظ جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ماخوذ ہے جس کے

معنی انتہائی بلند پہاڑ کے ہیں۔

(۱۹) اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔ اور شَهْدَاءُ كُوشَهْدَاءُ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کو مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالیٰ کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا﴾

(۳-۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو

مردہ مت سمجھنا اور آیت کریمہ:

﴿وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۵۷-۱۹) اور پروردگار

کے نزدیک شہید ہیں۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے اور

آیت کریمہ:

﴿وَشَهِدٍ وَ مَشْهُودٍ﴾ (۸۵-۳) اور حاضر ہونے

والے کی اور جو اس کے پاس حاضر کیا جائے اس کی قسم۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَشْهُودٌ سے یوم جمعہ مراد ہے اور

بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے اور بعض نے یوم قیامت اور

شَهِدٌ سے ہر وہ شخص مراد لیا ہو سکتا جو اس روز میں حاضر

ہوگا اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ مَشْهُودٍ﴾ (۱۱-۱۰۳) (اور یہی وہ دن ہے

(جس میں خدا کے روبرو) حاضر کئے جائیں گے۔ میں

مَشْهُودٌ بمعنی مُشَاهِدٌ ہے اور اس میں تمبیہ ہے کہ

وہ دن ضرور آ کر رہے گا۔

التَّشَهُدُ کے معنی أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

وَأَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ پڑھنے کے ہیں

اور عرف میں تشہد کے معنی التَّحِيَّاتُ اور ان اذکار کے

ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے ہیں۔

﴿فِيمَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُكُمْ﴾ (۲۱-۱۰۲) اور جو کچھ ان

کا جی چاہے گا اس میں
رَجُلٌ شَهْوَانٌ وَشَهْوَانِيٌّ: خواہش کا بندہ شہیہ
شہیہ: لذیذ چیز، مرغوب شے۔

(ش و ب)

الشَّوْبُ: (ن) کے معنی ہیں: خلط ملط کرنا۔
قرآن پاک میں ہے:
﴿لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ﴾ (۳۷-۶۷) گرم پانی ملا کر۔
اور عَسَلٌ یعنی شہد کو شَوْبٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ
وہ تمام مشروبات میں ملایا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ اس
کے ساتھ موم ملا ہوا ہوتا ہے مثل مشہور ہے۔
مَا عِنْدَهُ شَوْبٌ وَكَأَنَّ رُوبٌ: نہ اس کے پاس شہد ہے
اور نہ دودھ بالکل تلاش ہے۔

(ش و ر)

الشَّوَارُ: کے معنی ظاہری سامان آرائش کے ہیں
اور کنایہ کے طور پر اندام نہانی پر بولا جاتا ہے اور شَوْرَتْ
بہ کے معنی ہیں: میں نے اسے شرمندہ کیا۔ گویا اس کے
ستر کو ننگا کر دیا۔
شِرْتُ الْعَسَلَ وَأَشْرْتُهُ: چھتے سے شہد کا لانا شاعر نے
کہا ہے۔
(۲۷۰) وَحَدِيثٌ مِّثْلُ مَا ذِي مُشَارٍ

(ش و ہ)

الشَّهْوَةُ کے معنی نفس کا اس چیز کی طرف کھینچ جانا
جسے وہ چاہتا ہے خواہشات دنیوی دو قسم پر ہیں صادقہ اور
کاذبہ۔

سچی خواہش وہ ہے جس کے حصول کے بغیر بدن کا نظام مختل
ہو جاتا ہے۔ جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا اور جھوٹی
خواہش وہ جس کے عدم حصول سے بدن میں کوئی خرابی
پیدا نہیں ہوتی۔ پھر شَهْوَةٌ کا لفظ کبھی اس چیز پر بولا جاتا
ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور کبھی خود اس قوت
شہویہ پر اور آیت کریمہ:
﴿رُزِينٌ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ (۳-۴) لوگوں
کو ان کی خواہشوں کی چیزیں (بڑی) زینت دار معلوم
ہوتی ہیں۔

میں شہوت سے دونوں قسم کے خواہشات مراد ہیں۔ اور
آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبِعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ (۹-۵۹) اور خواہشات
نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔

میں جھوٹی خواہشات مراد ہیں یعنی ان چیزوں کی خواہش
جن سے استغنا ہو سکتا ہو۔ اور جنت کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَى أَنْفُسُكُمْ﴾ (۲۱-۳۱)
اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گا۔

① کذافی النوادر لابی سهل ۵۱ وراجع للمثل اللسان (روب۔ شوب) ومنه في الحديث: لا شوب ولا روب ای انی بری منهن عیبها
قال ابن الاثیر فی تفسیر هذا الحديث ای لاغش والتخلیط۔

② قاله عدی بن زید العبادی وهو من اشهر شعرائهم ذکره برد کلن فی تاریخہ (۱: ۱۲۴) وايضاً الخزانة (۲: ۲۰) واوله فی سماع یاذن
الشیخ له والبيت فی اللسان (اذن، شوذ، موز)، والفاق (۱: ۱۳، ۱: ۲۳۷) والطبرسی (۳۰: ۷۷) والترجمه الاغانی (۲: ۱۸، ۴۳)
وجمهرة اشعار العرب (۱۰۳) وتاریخ الطبری والبيت فی الامالی المرتضی (۱: ۴۲۳) بغیر عزرو والصحاح (مود) وملاب قد تلبیت
بها۔ قصرت اليوم فی بیت غداره والقصيدة مقبلة القافية. وفي الصحاح: اياك والخطب فانها: مشوار كثر العشار ۱۲۔

﴿غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ﴾ (۸-۷) کہ جو قافلہ بے شان و شوکت (یعنی ہتھیار) ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بچھو کے ڈنگ کو بھی شَوْكُ کہا جاتا ہے اور خاردار درخت کو شَجَرَةٌ شَاكَةٌ وَشَاكَةٌ کہہ دیتے ہیں۔ شَاكِنِي الشَّوْكُ: مجھے کانٹا چھو گیا شَوْكُ الفَرْخُ: چوزے نے کانٹے اور پر نکال کے شَوْكُ نَدِي المَرْأَةُ: عورت کی چھاتی ابھرائی۔ شَوْكُ البَعِيرُ: اونٹ کے انیب کا لمبا اور کانٹے کی طرح تیز ہونا۔

(ش و ی)

شَوَيْتُ اللَّحْمَ وَاشْتَوَيْتُهُ کے معنی گوشت بھوننا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَشْوِي الْوُجُوهُ﴾ (۱۸-۲۹) ان کے چہروں کو جھلس دے گا۔

شاعر نے کہا ہے۔ (الکامل)

(۲۷۱) فَاشْتَوِي لَيْلَةَ رِيحٍ وَاجْتَمَلَ

تو اس نے ٹھنڈی رات (یعنی قحط سالی) میں گوشت بھونا اور چربی گھلا کر کھائی۔

الشَّوَى: جسم کے اطراف، ہاتھ، پاؤں، وہ اعضاء جن پر زخم لگنے سے موت واقع نہ ہو۔ محاورہ ہے: رَمَاهُ فَاَشْوَاهُ: اسے تیر مارا تو اس کے اطراف پر لگا یعنی ایسے عضو پر نہیں لگا جس پر زخم لگنے سے انسان مر جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوَى﴾ (۷۰-۱۶) کھال ادھیر ڈالنے والی۔

اور باتیں جو چھتے سے نکالے ہوئے تازہ شہد کی طرح شیریں تھیں۔

اور شہد نکالنے کے اعتبار سے شَرْتُ الدَّابَّةِ کے معنی ہوئے: گھوڑے کی دوڑ معلوم کرنا کہ کس قدر دوڑ سکتا ہے اور خطیبوں کے متعلق کہا جاتا ہے: مشوار کثیر العثار کے خطبے ایسی منڈی ہے جہاں بہت زیادہ لغزش کا خطرہ ہے۔

اور التَّشَاوُرُ وَالمُشَاوَرَةُ وَالمَشُورَةُ کے معنی ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لونا کر رائے معلوم کرنا یہ بھی شَرْتُ العَسَلِ سے مشتق ہے جس کے معنی چھتے سے شہد نکالنا کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِى الْأَمْرِ﴾ (۳-۱۵۹) اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

الشُّورَى: ہر وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۲-۳۸) اور اپنے کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

(ش و ظ)

الشُّوَاطُ: آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿شُوَاطٍ مِّن نَّارٍ وَنَحَاسٍ﴾ (۵-۳۵) آگ کے شعلے اور دھواں۔

(ش و ک)

الشَّوَاكُ: کانٹا اور کبھی شَوْكُ اور شَيْكَةٌ کے لفظ سے اسلمہ اور شدت مراد ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

۱۔ قاله ليد اوله : اونتهه فاتاه رزقه وقبله : و غلام ارسلته امه۔ بالوك فيذلنا مسائل۔ وفي رواية واحتمل البحاء بدل العجم وقال في شواهد الكشاف ۱۰ ورواية العجم انسب وافيد والبيت في تهذيب الالفاظ (۶۱۱) وديوانه ۳۹ والمعاني للقتبي ۴۱۰ (ط، حيدرآباد ۱۳۳۸)۔

ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت: ﴿فَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (۱۳-۲۳) (تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے) میں ذات باری تعالیٰ کو أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کہا گیا ہے۔

الْمَشِيئَةُ: اکثر متکلمین کے نزدیک مشیت اور ارادہ ایک ہی صفت کے دونام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق ہے۔ (۱) مشیت کے اصل معنی کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پالینے کے ہیں۔ اگرچہ عرف میں مشیت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے معنی اشیاء کو موجود کرنے کے ہیں اور لوگوں کی مشیت کے معنی کسی چیز کو پالینے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔

(مَا شَاءَ اللَّهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَاءَ لَمْ يَكُنْ) کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔

ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کو نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمْ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمْ الْعُسْرَ﴾ (۲-۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔

﴿وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (۳۰-۳۱) اور خدا تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عُسْر اور ظلم پائے جاتے ہیں۔

(۲) مشیت اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہو سکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا

اور اسی سے غیر اہم معاملہ کو بھی شَوَىٰ کہا جاتا ہے کیونکہ شَوَىٰ مَقْتَلٌ: یعنی حضور نہیں ہوتا (جس پر زخم لگنے سے انسان مر جائے)

الْشَّاءُ: بھیڑ۔ یہ اصل میں حَاطِيَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع شِيَاهٌ اور تصغير شَوِيهَةٌ آتی ہے۔

(ش ی ۵)

الشَّيْءُ: بعض کے نزدیک شی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہو سکے اور اس کے متعلق خبری دی جاسکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترک ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے اور موجودات اور معدومات سب کو شی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ شی صرف موجود چیز کو کہتے ہیں یہ اصل میں شَاءٌ کہ مصدر ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق شے کا لفظ استعمال ہو تو یہ معنی شَاءٌ یعنی اسم فاعل کے ہوتا ہے اور غیر اللہ پر بولا جائے تو مَشِيءٌ (اسم مفعول) کے معنی میں ہوتا ہے۔ پس آیت کریمہ:

﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۳۹-۶۲) خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

میں لفظ شی چونکہ دوسرے معنی (اسم مفعول) میں استعمال ہوا ہے اس لئے یہ عموم پر محمول ہوگا اور اس سے کسی قسم کا استثناء نہیں کیا جائے گا کیونکہ شی مصدر بمعنی المفعول ہے مگر آیت کریمہ:

﴿قُلْ أَيْ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً﴾ (۶-۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت

www.KitaboSunnat.com ہے۔

میں شی اسم فاعل ہے اور اللہ تعالیٰ کو أَكْبَرُ شَهَادَةً کہنا

نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے: ﴿وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُوذَ فِيهَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ...﴾ (۷۸-۷۹) اور ہمیں شایان نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں ہاں خدا جو ہمارا پروردگار ہے وہ چاہے تو (ہم مجبور ہیں)۔ ﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِسَيِّءِ أَمْرٍ فَاعِلٌ ذَلِكَ غَدَا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (۱۸-۲۳) اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) خدا چاہے۔

(ش ی ب)

الشَّيْبُ وَالْمَشِيْبُ: بڑھاپا۔ بالوں کی سفیدی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا﴾ (۱۹-۲۰) اور بڑھاپے سے سر شعلہ مارنے لگا۔ يَأْتِي الْمَرْءَ بِلَيْلَةٍ شَيْبَاءَ: عورت نے شب زفاف گزاری۔ یعنی جس میں اس کی بکارت زائل کی گئی ہو اس کے برعکس بَأْتِي الْمَرْءَ بِلَيْلَةٍ حَرَّةً: وہ رات جس میں اس کی بکارت زائل نہ کی گئی ہو۔

(س ی ت)

شَيْئٌ: اصل میں وَشِيئَةٌ ہے اس کی بحث باب الواو میں بیان ہوگی۔

(ش ی خ)

الشَّيْخُ: معنی معمر آدمی کے ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی کے چونکہ تجربات اور معارف زیادہ ہوتے ہیں اس مناسبت سے کثیر العلم شخص کو بھی شیخ کہہ دیا جاتا ہے۔ محاورہ ہے: شَيْخٌ بَيْنَ الشَّيْخُوخَةِ وَالشَّيْخِ وَلَيْشَيْخٌ یعنی وہ

ہے لیکن مشیت انسانی مشیت الہی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ جیسے فرمایا:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (۸۱-۲۹) اور تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر وہی جو خدائے رب العلمین چاہے۔

ایک روایت ہے کہ جب آیت: ﴿لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ﴾ (۸۱-۲۸) یعنی اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔ نازل ہوئی تو کفار نے کہا ہے یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کر دیں اس پر آیت کریمہ:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ نازل ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾ (۳۷-۱۰۲) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پاؤ گے۔ ﴿سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا﴾ (۱۸-۶۹) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

﴿يَأْتِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ...﴾ (۱۱-۳۳) اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کرے گا۔

﴿أَدْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ﴾ (۱۲-۹۹) مصر میں داخل ہو جائیے خدا نے چاہا تو.....

﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ (۷-۱۸۸) کہہ دو کہ میں اپنے فائدہ اور

شِيعَةَ كِي جمع شَيْعٍ وَأَشْيَاعٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿وَأَنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ﴾ (۲۷-۸۳) اور ان
ہی یعنی نوح علیہ السلام کے پیروں میں ابراہیم علیہ السلام تھے۔
﴿هَذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَذَا مِنْ عَدُوِّهِ﴾ (۲۸-۱۵)
ایک تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں
میں سے تھا۔

﴿وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيعًا﴾ (۲۸-۴) وہاں کے باشندوں
کو گروہ و گروہ کر رکھا تھا۔
﴿فَسِي شِيعِ الْأَوَّلِينَ﴾ (۱۵-۱۰) پہلے لوگوں میں
(بھی)۔

﴿وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ﴾ (۵۴-۱۵۱) اور ہم
تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

(ش و ن)

شَأْنٌ: کے معنی حالت اور اس اتفاقی معاملے کے
ہیں جو کسی کے مناسب حال ہو اس کا اطلاق صرف اہم
امور اور حالات پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ (۵-۴۹) ہر روز کام میں
مصروف رہتا ہے۔

شَأْنُ الرَّأْسِ: کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے
کی جگہ جس سے انسان کا توام ہے اس کی جمع شُؤُنٌ
آتی ہے۔

تَمَّتِ الْجَزَالُؤُلُ



www.KitaboSunnat.com

بہت بڑا عالم ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
﴿هَذَا بَعْلَى شَيْخًا﴾ (۱۱-۲۷) یہ میرے میاں
(بھی) بوڑھے ہیں۔
﴿أَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ﴾ (۲۸-۲۳) ہمارے والد بڑی عمر
کے بوڑھے ہیں۔

(ش ی د)

الْمَشِيدُ: (پلستر کیا ہوا، بلند) قرآن پاک میں ہے:
﴿وَقَصْرٍ مَشِيدٍ﴾ (۲۲-۴۵) اور بہت سے بلند محل
ہیں۔ تو مَشِيدٌ کے معنی یا تو پلستر کی ہوئی عمارت کے ہیں
اور یا مُطَوِّئٌ یعنی بلند کے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی مآل کے
لحاظ سے پہلے معنی کی طرف راجع ہے محاورہ ہے: شَيْدٌ
قَوَاعِدُهُ: اس کی بنیادوں کو اسی طرح محکم بنایا جیسے گچ کی
ہوئی ہوتی ہیں۔

الْإِسَادَةُ: (افعال) کے معنی بلند آواز سے شعر پڑھنا یا
گانا کے ہیں۔

(ش ی ط)

الشَّيْطَانُ: اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

(ش ی ع)

الشِّيَاعُ: کے معنی منتشر ہونے اور تقویت دینا کے
ہیں۔ کہا جاتا ہے:

شَاعَ الْقَوْمُ: قوم منتشر اور زیادہ ہو گئی۔
شِيعَتُ النَّارِ بِالْحَطْبِ: ایندھن ڈال کر آگ تیز کرنا۔
الشَّيْعَةُ: وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔
اور وہ اس کے ارد گرد پھیلے رہتے ہیں۔ اسی سے بہادر کو
مَشِيْعٌ کہا جاتا ہے۔

